سلسلۂ مطبوعات علم معاشیات جامعہ عثمانیہ

معاشیات ہند

جلد اول

تصنیف

جی، بی، جتھار، ام، اے۔ پروفیسر تاریخ و معاشیات کرناٹک کالج دھارواڑ

و

یس، جی، بیری، ام، اے۔ پروفیسر معاشیات سڈنہم کالج آف کامرس اینڈ اکنامکس بمبئی

ترجمہ (ایڈیشن ۱۹۳۷ء)

مولوی رشید احمد صاحب بی۔ اے (علیگ) ایف۔ آر۔ ای یس (لندن)

رکن سررشتۂ تالیف و ترجمہ جامعۂ عثمانیہ سرکار عالی

سنہ ۱۳۵۹ھ م سنہ ۱۳۴۹ف م سنہ ۱۹۴۰ء

فہرست مضامین

معاشیات ہند (جلد اول)

باب ۱

از صفحہ ۱ تا ۱۰

معاشیات ہند: وسعت اور تعریف

باب ۲

از صفحہ ۱۱ تا ۸۶

ہندوستان کا طبیعی ماحول اور قدرتی ذرائع

باب ۳

از صفحہ ۵۷ تا ۱۴۶

آبادی

مضمون	صفحہ

باب ۳

از صفحہ ۱۴۷ تا ۱۸۸

معاشرتی و مذہبی آئین و رواج

باب ۵

از صفحہ ۱۸۹ تا ۲۴۸

ہندوستان کی معاشی حالت میں تغیر

باب ۶

از صفحہ ۲۴۹ تا ۳۱۶

زراعت

پیداوار اور برآمد

باب ۷

از صفحہ ۳۱۷ تا ۳۷۱

زراعت

زمین اور اس کے مسائل

باب ۸

از صفحہ ۳۷۲ تا ۴۴۲

زراعت

محنت، ساز و سامان اور تنظیم

باب ۹

از صفحہ ۴۳۳ تا ۴۹۰

(۹) قرض داری

باب ۱۰

از صفحہ ۴۸۱ تا ۵۲۶

ہندوستان میں امداد باہمی کی تحریک

باب ۱۱

از صفحہ ۵۷۷ تا ۶۰۴

حکومت اور زراعت سے اس کا تعلق

باب ۱۲

از صفحہ ۶۰۵ تا ۶۹۰

مالگزاری

باب ۱۳

از صفحہ ۶۹۱ تا ۷۴۱ ختم

صنعتوں پر ایک عام نظر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

معاشیات ہند، وسعت اور تعریف

۱ - تعریف

"معاشیات ہند" کی مختصر، سادہ اور جامع تعریف، عام مفہوم کے لحاظ سے، یوں کی جا سکتی ہے کہ "اس میں ہندوستان کے اہم معاشی مسائل اور ان کے مختلف اسباب کی تحقیق و تحلیل کی جاتی ہے اور ان مسائل کے حل کے متعلق اختیار کی ہوئی اور اختیار کرنے کے قابل تدبیروں سے بحث کی جاتی ہے"۔ یہ بالکل فطری امر ہے کہ ملک کی معاشی حیثیت کو جانچتے ہوئے حکومت کی پالیسی کی یا تو نکتہ چینی کی جائے یا داد دی جائے، اور ملک کی معاشی حالت کی اصلاح و ترقی کے لیے تجویزیں مرتب اور پیش کی جائیں۔ اس جانچ کے دوران میں نقطۂ نظر تمام تر "قومی" ہوگا اور مقصد شروع سے آخر تک اہل ہند کی مادی فلاح و ترقی رہے گا۔ سر جان اسٹریچی نے مالیے کا میزانیہ پیش کرتے ہوئے اس اصول کی مخالفت کی تھی کہ حکومت ہند کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ وہ محض ہندوستان کے اغراض اور مفاد کو پیش نظر رکھے، اور یہ خیال ظاہر کر کے اپنے من کی بات کہہ ڈالی کہ اپنے ملک کی خدمت ہی ان کے نزدیک سب سے اولیٰ اور ارفع فرض تھا۔ یہ خیال در اصل اس نو آبادیاتی پالیسی کی صدائے بازگشت ہے جو انگلستان کے مستند ترجمانوں کی تصنیفات کے بارے میں یہ قرار دیتی تھی کہ ان کا اولین مقصد انگلستان کے اغراض اور مفاد کو پورا کرنا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے

باب

زاویہ نگاہ سے ہمارا کوئی سروکار نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان سلطنت برطانیہ کا ایک جزو ہے، لیکن وہ سلطنت برطانیہ کی شان اور عظمت بڑھانے کی خاطر کوئی قربانی کرنے پر اس وقت تک راضی اور آمادہ نہیں ہو سکتا جب تک اس کو اس بات کا کامل اطمینان نہ ہو جائے کہ جو قربانی اس سے مانگی جا رہی ہے وہ آخر میں اس کے اپنے قومی مفاد کے لیے ہے۔ ہم کو چاہیے کہ عام اصول کے لحاظ سے اپنے ملکی اغراض کو ہمیشہ پیش و مقدم رکھیں اور سلطنت برطانیہ سے ہماری وسیع تر اور کمتر ضروری وفاداری کو دوسرے درجے پر۔ سچ پوچھو تو بعینہ یہی حالت ان حکمران نوآبادیات کی بھی رہی ہے جنھوں نے اپنے قومی اغراض کی ترقی کی کوشش کو مقدم رکھا؛ اور مادر وطن (برطانیہ) سلطنت برطانیہ کے عناصر ترکیبی یا بحیثیت مجموعی کل دنیا کی خیر خواہی ان کے اس پختہ ارادے کی تابع رہی کہ وہ اپنی مادی خوشحالی اور بہبود کو بحد امکان بلند ترین معیار پر پہنچائیں گے۔ چنانچہ یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ اس مقصد کے حاصل کرنے میں مثلاً اپنے محصولوں کے انتظامات کے سلسلے میں انھوں نے بعض اوقات ایسی تدبیریں اختیار کیں جن سے مادر وطن یعنی برطانیہ کو فوری نقصان پہنچا۔ یہ بیان نوآبادیات کی حالت اور ان کے طرز عمل کی بابت، اب بھی صادق آتا ہے اور اس واقعہ کے باوجود بڑی حد تک صحیح ہے کہ وہ جنگ عظیم کے تجربوں کی بنا پر اس بات پر پہلے سے کسی قدر زیادہ آمادہ ہو گئے ہیں کہ سلطنت برطانیہ کے باہمی رشتۂ اتحاد کو مضبوط بنانے کی خاطر ضرورت کے وقت کچھ نہ کچھ قربانی کریں۔ پس ہندوستان بھی اسی قسم کی آزادی چاہتا ہے، تاکہ اپنے معاشی نظام کو زیادہ تر اپنے مفاد اور اغراض کے لیے منظم کرے۔

خلاصہ یہ کہ "معاشیات ہند" ہندوستانی قومی نقطۂ نظر سے ہندوستان کی موجودہ معاشی حالت اور حیثیت کی تحقیق ہے[1]

---

[1] اصطلاح "معاشیات ہند" کے ساتھ یہ مفہوم منسوب کرنے میں ہمیں بظاہر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ انگریزی زبان کے ساتھ کوئی تشدد یا زیادتی کی جا رہی ہے؛ علاوہ ازیں دیرینہ رواج اس کو جائز قرار دیتا ہے کہ ہم اس مفہوم کے حق بجانب ہونے کا اقرار کریں۔ پرنسپل پرسی آنسٹی آنجہانی یہ خیال کرتے تھے کہ "معاشیات ہند" کی اصطلاح "غلط"، "بدنما"، "ناپسندیدہ" تھی اتنی ہی "گمراہ کن" بھی تھی۔ ہمارا یہ گمان ہے کہ اس تنقید کو حوالے اور سند کے طور پر زیادہ تر اس لیے پیش کیا جاتا ہے کہ اس میں چند صنفوں کا خوش اسلوبی سے مظاہرہ کیا گیا ہے ورنہ اس میں سچائی کی بو باس تک نہیں۔ اصطلاح کا بدنما اور ناپسندیدہ ہونا خالصتاً ذوق کا معاملہ ہے۔ رہا اس کا "گمراہ کن" ہونا تو وجہ اس کی تعریف

باب ۱

۲ - دوسرا ممکنہ مفہوم

"معاشیات ہند" کی اصطلاح کو عام رواج کے مطابق، ہم نے جس مفہوم میں استعمال کرنے کی تحریک کی وہ بالکل فطری اور بصورت دیگر حق بجانب ہے، لیکن ایک خاص مفہوم میں کسی اصطلاح کے استعمال کو حق بجانب قرار دینے کے لیے یہ ثابت کرنا کہ یہ اصطلاح دوسرے مفہوم پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی، در اصل غیر ضروری ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ "معاشیات ہند" کی اصطلاح اس کے علاوہ دو اور مفہوم ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے[۱]۔ سب سے اول، اس کے معنی قدیم ترین زمانے سے اب تک "ہندوستانی معاشی تخیل کی تاریخ" کے ہو سکتے ہیں۔ اگر، جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے، تخیل کی مسلسل نشو و نما کا سراغ نہ مل سکے، کوئی تحریک خیال قابل یادداشت نہ ہو، اور اگر ایک صدی کا رائج تخیل متعاقب صدیوں کے رائج تخیلات کے کم و بیش مثل ہو، یہاں تک کہ حال کا زمانہ آجائے جس میں مغربی اثرات کو شمار کرنا پڑے، تو ممکن ہے کہ ایسی تاریخ کا مطالعہ کسی قدر غیر دلچسپ ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایسی تاریخ اس معنی میں غیر مربوط ہو کہ اس میں لاعلمی کے اعتراف سے وقتاً فوقتاً رخنہ پڑے؛ اس لیے کہ بحالت موجودہ گزشتہ تاریخ کے اکثر دوروں کے حالات کا علم نہیں ہے؛ گو یہ ممکن ہے کہ تحقیق کی ترقی، رفتار زمانہ کے ساتھ اس وقت گہری تاریکی میں لپٹے ہوئے حالات کے بڑے حصہ کو روشنی میں لانے میں کامیاب ہو۔ یوں تو یہ اعتراضات "معاشیات ہند" کی اصطلاح کو "ہندوستانی معاشی تخیل کی تاریخ" کے مفہوم میں استعمال کرنے کی راہ میں کسی حال مانع نہیں ہیں؛ تاہم موخر الذکر مکمل اصطلاح استعمال کر کے پیچیدگی آسانی کے ساتھ رفع کی جا سکتی ہے۔

۳ - تیسرا مفہوم

اگر یہ بات مبنی بر صداقت ہو کہ ہندوستانی معاشرہ اور ہندوستانی حالات، مغرب کے معاشروں اور حالات سے بنیادی طور پر مختلف ہیں، یہاں تک کہ معاشیات کے معمولی ابتدائی مفروضات کا اطلاق ہندوستان پر مطلق نہ ہو سکتا ہو تو، ماننا پڑے گا کہ جہاں تک کہ وہ محض زبان کا مسئلہ ہے، "معاشیات ہند" کے معنی بجا طور پر مغرب کے مروجہ معاشی اصول سے مختلف معاشی نظریوں کے ایک بالکل نئے نظام کے بھی

۵

بقیہ صفحہ گزشتہ۔ کردی گئی ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس سے کوئی گمراہ ہو۔

[۱] دیکھو وی۔ جی کالے کی کتاب موسوم بہ (Indian Economics) معاشیات ہند جلد اول مقدمہ۔

باب

ہو سکتے ہیں[1] لیکن "معاشیات ہند" کوئی ایسا جدید علم تو ہے نہیں جو "ہندوستانی حالات اور مواد" سے تیار کیا گیا ہو" اس لیے اس مخصوص مفہوم میں "معاشیات ہند" کی اصطلاح کو استعمال کرنے کی کبھی نوبت ہی نہ آئے گی۔ ہندوستان اور مغربی ملکوں میں انسانی فطرت لازمی طور پر ایک ہے اور اساسی معاشی مفروضات دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان پر بھی صادق آتے ہیں۔ اگر مغربی ملکوں میں ذاتی مفاد و اغراض کا محرک معاشیات کی بنیاد کے طور پر کام میں لائے جانے کے لیے کافی طاقتور اور مسلسل کارفرما خیال کیا جاتا ہو تو ہندوستان کے بارے میں یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ اس کے باشندے معمولی طور پر معاشی محرک (یعنی ذاتی مفاد) کے تابع ہونے کے بجائے اخوانی محرک کے تابع ہیں۔ یہی حال دوسرے مفروضات مثلاً آزادانہ مسابقت، محنت و اصل کی نقل پذیری وغیرہ کا بھی ہے۔ گو یہ مفروضات مغرب کی طرح ہندوستان کے حالات کے بارے میں اسی مقررہ اعتماد کے ساتھ غالباً نہیں قایم کیے جا سکتے، لیکن اس کے باوجود وہ کافی طور پر صحیح ہیں اور ہندوستان کی معاشی صورت حال کے سمجھنے میں مغربی مفکروں کے بنائے ہوئے عام معاشی نظریوں کو بیش قدر ثابت کرتے ہیں۔ چنانچہ عملی معاشیات کے میدان میں مغرب کا تجربہ ہندوستان کے لیے قیمتی سبقوں سے مالامال ہے۔

چونکہ فطرت انسانی ہر جگہ ایک ہی ہے اور علم معاشیات انسانی فطرت کی بعض عام اور ہمہ گیر خصوصیات پر مبنی ہے، اس لیے واقعہ یہ ہے کہ معاشیات کا علم سارے عالم کے لیے اسی طرح ایک ہی ہوگا جس طرح کہ ریاضی، طبیعیات، کیمیا وغیرہ۔ پس اگر کوئی طالب علم جو مغربی معاشی نظریے سے واقف ہو "معاشیات ہند" کی کسی کتاب کا مطالعہ اس نظرے کرے کہ وہ کلیتہً نئے قسم کے معاشی نظریوں سے دوچار ہوگا تو اسے مایوسی ہوگی۔ زیادہ سے زیادہ وہ کتاب کے مطالعے کے بعد اس بات کو کامل طور پر محسوس کرے گا کہ بقول مارشل "معاشی اصول میں یکسانی ہے گو ان کی شکلیں مختلف ہیں" اور معاشی اصول کی اضافی نوعیت کے متعلق بھی اس کے احساس کو خاصی حد تک تقویت پہنچے گی۔

[1] چنانچہ یہی خیال ان لوگوں کا تھا جنھوں نے پہلے "معاشیات ہند" کی اصطلاح وضع کی تھی لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس کا موجودہ استعمال جیسا کہ متن میں تشریح کی جا چکی ہے، غیر حق بجانب ہے۔

باب ۱

۴۔ معاشیات ہند: ایک جداگانہ موضوع بحث

لیکن یہ اعتراف کہ معاشیات کا علم سارے عالم کے لیے ایک ہی ہے، ہمیں یہ کہنے سے باز نہیں رکھتا کہ ہر ملک کے معاشی حالات کی جداگانہ تحقیق نہ صرف حق بجانب بلکہ ناگزیر ہے۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ ایسی تحقیق کی عدم موجودگی میں اس کا قرینہ ہے کہ غلط معاشی پالسی اختیار کی جائے، اور یہ ملک کے حقیقی اغراض کے منافی ہوگا۔ چنانچہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ معاشیات ہند کو ایک جداگانہ موضوع تحقیق قرار دینا چاہیے تو اس کا منشا و مفہوم ہمارے ذہن میں یہی ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں اس غلط خیال کو ذہن میں جگہ نہ دینی چاہیے کہ ہندوستان کے معاشی حالات کی تحقیق کی بنیاد کسی نہ کسی طرح دوسرے ملک کے معاشی حالات کی تحقیق کی بنیاد سے سراسر مختلف ہے۔

۵۔ معاشیات ہند محض معاشی اصول کی تشریح نہیں جس میں ہندوستانی مثالیں ہوں

معاشیات ہند کے متعلق اکثر نصابی کتابوں میں مختلف مسائل کو "زمین" "محنت" "عمل" "پیدائش" "تقسیم" مبادلے وغیرہ کے عام عنوانوں کے تحت بیان کیا جاتا ہے۔ اس میں یہ خاصہ ہے کہ بحث میں بظاہر زیادہ باقاعدگی اور خوش اسلوبی پیدا ہو جاتی ہے اور تمام اہم مضامین زیر بحث آجاتے ہیں لیکن بحث کی ایسی ترتیب کی بنا پر یہ خیال قائم نہ کرلینا چاہیے کہ "معاشیات ہند" محض معاشی اصول کی ایسی تشریح ہے جس میں ہندوستان کی معاشی زندگی کے واقعات محض نظریے کی مثال کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ یوں تو معاشی نظریے کا بیان ہندوستانی مثالوں کے ساتھ ہندوستانی طالب علم کی تفہیم میں بے شبہ زیادہ سہولت پیدا کرے گا، بہ نسبت اس کے کہ مثالیں غیر مانوس حالات سے پیش کی جائیں، لیکن اس کو "معاشیات ہند" لقب دینا حق بجانب نہ ہوگا؛ اس لیے کہ "معاشیات ہند" ایک ایسی تحقیقی بحث ہے جس کا تعلق از سرتاپا ہندوستان کی معاشی زندگی کے واقعات و مسائل سے ہے، اور خالص "عالمی معاشیات" کے نظریے کا حوالہ دینا صرف اس وقت موضوع سے متعلق اور بجا ہوگا جب کہ ان واقعات و مسائل کو سمجھنے میں اس سے مدد ملے۔

ہندوستانی حالات کی ایسی جداگانہ تحقیق کو ہم "معاشیات ہند" کے نام سے اسی طرح موسوم کرتے ہیں جس طرح علمائے معاشیات انگلستان کے حالات کی تحقیق کو "معاشیات انگلستان" کے نام سے بجا طور پر تعبیر کرسکتے ہیں۔ انگلستان کی معاشی زندگی کے مختلف پہلو مثلاً بنک کاری نظ

باب نقل و حمل اور زراعت کے متعلق بے شمار تصنیفوں کے بارے میں نہایت مناسبت و موزونیت کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ "معاشیات انگلیشیہ" کے متعلق ہیں۔

۶۔ رانا ڈے کی قابل قدر خدمت۔

انیسویں صدی کے بڑے حصے میں ہمارے ملک کی سرکاری پالیسی مطلق اصول پرستی پر نا واجب طریقے سے مبنی تھی اور حکومت اس بات کی مدعی تھی کہ وہ اِن عام معاشی اصول کی پیرو تھی جن کی تشریح مقبول عام انگریزی نصابی کتب میں کی گئی تھی، اور معاشی قوانین کی مفروضی نوعیت کو فراموش کر دیا گیا تھا۔ چونکہ آزاد تجارت انگلستان کے حق میں مفید تھی، اس لیے اس پر زور دیا جاتا تھا کہ ہندوستان کے لیے بھی آزاد تجارت ہی لازمی طور پر مفید ہوگی۔ عدم مداخلت کا اصول بہ حیثیت مجموعی انگلستان کے حالات کے لحاظ سے مناسب تھا، لہٰذا یہ استدلال کیا گیا کہ اس اصول کو ہندوستان کے لیے بھی مساوی طور سے مفید ہونا چاہیے، حالانکہ واقعہ یہ تھا کہ ہندوستان میں خانگی مہم پسندانہ کاروبار کا جوش عملاً مفقود تھا یا بہت ہی کم ترقی یافتہ حالت میں پایا جاتا تھا۔ معاشی نظریے کے نتائج کی بنا پر حکومت بعض اوقات نیک نیتی کے ساتھ استدلال کرتی تھی اور بعض اوقات بدنیتی کے خلاف۔ چنانچہ اکثر مفکر اشخاص کی رائے میں حکومت کی پالیسی معاشی معاملات میں ایسی ہوتی تھی کہ اس سے ہندوستان کے حقیقی اغراض پورے نہ ہوتے تھے۔ ماہران سیاسیات نے اس روش اور پالیسی پر حملہ کیا اور حکومت پر قطعی طور سے یہ الزام عاید کیا کہ وہ برطانیہ یا سلطنت برطانیہ کے اغراض کو ترقی دینے کے لیے ہندوستانی قومی مفاد کو قربان کر رہی تھی۔ نیز معاشیات دانوں نے بھی اس پر حملہ کیا، اور ان میں سب سے پیش پیش جسٹس رانا ڈے آنجہانی تھے۔ رانا ڈے کا حملہ معاشی نقطۂ نظر سے تھا۔ انھوں نے اپنے عادی عالمانہ انداز میں، پُرزور اور بے نظیر الفاظ میں مخالفت کی، کم از کم جوش و خروش اور استدلال کی شوکت کے لحاظ سے اِن کے مقابلے میں کوئی ہندوستانی مصنف نہ تھا۔ انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ معاشیات کے موضوع کے متعلق کل اصول پرستانہ بحث کے بنیادی مفروضات میں سے اکثروں کا اطلاق ہندوستان پر نہ ہوسکتا تھا؛ اور یہ کہ اگر مقصود ملک کی معاشی ترقی کی رفتار کو سریع کرنا تھا تو، حکومت اپنی پالیسی میں اُن متعدد خصوصیات کو بآسانی نظرانداز نہ کرسکتی تھی جو ہندوستانی حالات پیش کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنی حسب ذیل عبارت میں جس کو عام طور سے بطور سند و حوالہ پیش کیا جاتا ہے، یہ جتلایا کہ وہ کونسی اہم اور خاص

خصوصیات ہیں جنھیں ان کی رائے میں حکومت نے نظرانداز کیا تھا: "چونکہ یہ مفروضات د ہرانا ڈے کا مطلب ان مفروضات سے روشن خیال انفرادیت، آزاد مسابقت، محنت و اصل کی نقل پذیری وغیرہ ہے) سب سے زیادہ ترقی یافتہ معاشروں پر بھی قطعی طور پر صادق نہیں آتے، اس لیے ظاہر ہے کہ ہمارے معاشرے کے مثل معاشروں میں وہ زیادہ تر نمایاں طور سے مفقود ہیں۔ ہمارے ملک کا ایک اوسط درجے کا فرد بڑی حد تک "معاشی انسان" کا بالکل ضد ہوتا ہے۔ زندگی میں کسی فرد کی حیثیت کو متعین کرنے میں فرد سے زیادہ طاقت ور، خاندان اور ذات پات ہیں۔ دولت کی خواہش کی تکمیل میں ذاتی مفاد یا خودغرضی مفقود نہیں ہے، لیکن یہی سب سے بڑا محرک بھی نہیں ہے۔ دولت کا حاصل کرنا ہی وہ واحد مقصد نہیں ہے جو پیش نظر ہو۔ آزاد اور غیر محدود مسابقت کی نہ تو خواہش ہے نہ اس کا حوصلہ بجز اس کے کہ چند خاص جماعتوں یا کونوں گوشوں میں اس کا وجود پایا جائے۔ رسم و رواج اور سرکاری قواعد وضوابط، مسابقت سے زیادہ قوی اور پُراثر ہیں؛ اور معاہدے کے مقابلے میں حیثیت کا اثر زیادہ قطعی اور فیصلہ کن ہے۔ محنت اور اصل میں سے کوئی بھی نقل پذیر نہیں ہے، اور نہ اتنا بے باک، مہم پسند اور واقف ہے کہ ایک مقام سے دوسرے مقام کو جلد منتقل ہو۔ اجرت اور نفع کی شرحیں متعین ہیں، اور حالات کے تغیرات کے لحاظ سے ان میں تناسب تبدیلی نہیں ہوتی۔ آبادی اپنے ہی قانون کی تابع ہے، چنانچہ امراض و قحط اس میں قطع بُرید کرتے رہتے ہیں؛ برخلاف اس کے پیدائش پر کم و بیش حالت سکون و جمود طاری ہے، اور ایک سال کی فصل کے وافر حاصل کو باری باری سے آنے والے خراب موسموں کی تیز نگیوں سے تحفظ کے طور پر فراہم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس ترکیب کے معاشرے میں حقیقت متعارف و فرض کیے ہوئے میلانات نہ صرف عملی طور پر رُونما نہیں ہوتے بلکہ سچ پوچھو تو اپنے اصلی رُخ سے منحرف ہوجاتے ہیں۔ میلان کو حقیقت مان لینا ایسا ہی ہے جیسا کہ یہ کہنا کہ یہ میلانات کہ پہاڑ دھل دھل کر سمندر میں بہ جائیں گے، یا وادیوں کا نشیب فراز سے بدل جائے گا، یا آفتاب سرد ہوجائے گا، ایک مقررہ مدت کے اندر ہمارے اہم ترین عملی اسباب ہیں گے۔"[1]

---

[1] دیکھو ایک کتاب موسوم بہ Essays on Indian Economics (دوسرے ایڈیشن صفحہ ۱ تا صفحہ ۱۱) میں ایک عنوان "معاشیات ہند کے متعلق رانا ڈے کا نقطۂ نظر"۔

باب

۷ - مغربی معاشی نظریہ اور معاشیات ہند

انیسویں صدی میں، انگلستان کے برابر مختلف اہل کے لیے جو معاشی پالسی مناسب و موزوں پائی گئی تھی اس کی کورانہ تقلید ہندوستان میں کرنے کے خلاف پوری قوت اور شدت کے ساتھ احتجاج کر کے رانا ڈے نے اپنے ملک کی بہت بڑی خدمت انجام دی لیکن ان کے الفاظ پر ایک مدت دراز کے بعد اب غور کرنے پر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس خیال کو رائج کرنے کے بظاہر وہی ایک حد تک ذمہ دار ہیں کہ مغرب کا معاشی نظریہ ہندوستان کے معاشی مظاہر کی تشریح کرنے اور معاشی ترقی کے طریقوں کی رہنمائی کرنے میں بالکل بے کار ہے۔ رانا ڈے کی حد تک یہ کہنا ٹھیک ہے کہ اس خیال کو حد سے زیادہ زور دے کر اور موثر طور پر بیان کرنا معاملے کی اہمیت کے مدنظر ضروری تھا۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ حکومت وقت قدیم اور معتبر معاشیات کے احترام میں مبالغے سے کام لے رہی تھی اور اس بات کی مدعی تھی کہ وہ تمام عالم اور حالتوں پر یکساں طور سے صادق آتے تھے۔ غرض ایک سمت میں کیے ہوئے مبالغے کی اصلاح کا واحد طریقہ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ مخالف سمت میں غلو بیانی کی جائے۔ رانا ڈے نے ایسے زمانے میں کتاب لکھی جب کہ عملی سوالات کو حل کرنے کے لیے نام نہاد دوامی معاشی قوانین کی بنیاد پر حد سے زیادہ اعتماد کے ساتھ استدلال کرنے کا طریقہ عام تھا اور نظری نتائج کو تاریخی و استقرائی تحقیق کے ذریعے سے محفوظ کرنے کی ضرورت کا کافی احساس نہ تھا جس سے کسی خاص انسانی معاشرے پر ان نتائج کے اطلاق کی وسعت کا حال معلوم ہوتا۔ رانا ڈے نے ہندوستان میں جو خدمت انجام دی وہ جرمنی میں فریڈرش لسٹ کے متوازی کارنامے سے قریبی مشابہت رکھتی ہے۔ چنانچہ لسٹ نے اپنی کتاب موسوم بہ (National System of Political Economy) شائع شدہ ۱۸۴۱ء میں قدیم و معتبر معاشیات کے دقیانوسی اصول اور ان کی نام نہاد عالمگیر صداقت کی شدومد کے ساتھ مخالفت کی۔ اور خاص کر موجودہ معاشی نظام کے اصول عالمیت اور تجارت آزاد کے اس اصول مطلق کے خلاف اس نے احتجاج کیا جو اول الذکر اصول کے ہم آہنگ تھا۔ اس نے قومیت کے خیال کو بہت نمایاں کیا اور اس پر زور دیا کہ ہر قوم کی خاص ضرورتیں، اس کے مخصوص حالات اور خاص کر اس کی ترقی کے درجے کے لحاظ سے ہوتی ہیں۔[1] واقعہ یہ ہے کہ رانا ڈے میں زیادہ تر

---

[1] دیکھو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (گیارہواں اڈیشن) "فریڈرش لسٹ" پر مضمون۔

باب ۱

لسٹ کی تصانیف کے مطالعے سے جوش و خروش پیدا ہوا' اور اپنے زمانے اور اپنی نسل میں انھوں نے اپنے ملک کے لیے بعینہ وہی خدمت انجام دی جو لسٹ نے جرمنی کے لیے انجام دی تھی۔ بلکہ اس معاملے میں راناڈے نے دوسروں کے لیے نمونہ قایم کیا اور دوسرے اس کی تقلید مناسب حد اور مدت سے زیادہ کرتے رہے۔ چنانچہ یہ خیال جو آجکل بھی بعض اوقات پیش کیا جاتا ہے بہت کم حق بجانب ہے کہ معاشی مفروضات میں سے کسی مفروضے کا اطلاق ہندوستانی حالات پر بمشکل کیا جا سکتا ہے؛ اور یہ کہ "عظیم اصول لذتیت صرف یہی نہیں چاہتا کہ اس میں کہیں کہیں مناسب ترمیم کرلی جائے' بلکہ ہندوستان میں وہ کہیں بھی کارآمد نہیں ہے"[۱] ۲ اس نوعیت کے خیالات لوگوں کے دلوں میں بعض اوقات یہ تصور قایم کرانے کی جانب رہبری کرتے ہیں کہ ہندوستان کے معاشی مسائل کی مخصوص تحقیق از سرتاپا جدید معاشی اسلوب کی طالب ہے اور اس مقصد کے لیے مغربی اسلوب بالکل غیر مفید ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے معاشی مسائل پر بحث کرتے وقت ہمیں ہر ہر قدم پر مغربی معاشی نظریے سے مدد طلب کرنی پڑتی ہے۔ علاوہ ازیں' جیسا کہ پروفیسر برج نارائن نے اپنی تالیف موسومہ "مضامین بر معاشیات ہند" (Essays on Indian Economics) میں بتلایا ہے' راناڈے کی تحریروں کے بعد سے معاشیات اور ہندوستان دونوں کی نوعیت بدل گئی ہے۔ معاشیات نے اپنے نتائج کی مفروضی نوعیت پر زور دینے کے بارے میں مناسب تجربہ حاصل کرلیا ہے اور ان نتائج کو تمام دنیا کے لیے عام طور سے صحیح قرار دینے سے محترز ہو گئی ہے[۲] نیز چونکہ معاشی مفروضات میں اس طرح ترمیم کرلی گئی ہے کہ وہ واقعات و حقائق کے زیادہ مطابق بن گئے ہیں اس لیے معاشیات زیادہ انسانی اور زیادہ عملی بن گئی ہے' اور اپنی دیرینہ غیر فطری سادگی کو ترک کر کے بہت زیادہ کارآمد ہو گئی ہے۔ گزشتہ چالیس سال کی مدت میں ہندوستانی حالات بھی بڑی حد تک

---

[۱] دیکھو پی اکنس شے کا مضمون جو انھوں نے تیسری ہندوستانی معاشی کانفرنس میں بمقام مدراس پڑھا تھا۔

[۲] معاشیات کا نظریہ ایسے معین نتائج کا مجموعہ پیش نہیں کرتا جن کا اطلاق عملی طور پر براہ راست یا فوراً ہو سکتا ہو۔ نظریہ اصول کے بجائے ایک طریقہ ہے یا دماغ کے لیے ایک آلۂ کار اور فکر کا ایک اسلوب ہے جو مفکر کو صحیح نتائج اخذ کرنے میں مدد دیتا ہے' دیکھو جے' ایم کینس کا عام مقدمہ جو انھوں نے کیمبرج کی معاشیات کی چھوٹی کتابوں پر لکھا ہے

اسلب

بدل گئے ہیں اور مغربی حالات کے مشابہ بننے کی جانب بہت زیادہ تیزی کے ساتھ مائل ہیں۔ ہمارے خیال میں وقت آگیا ہے کہ ہندوستانی اور یوروپی معاشی ارتقا کے باہمی اختلافی امور کا راگ مسلسل اور بے فائدہ طریق پر الاپنے کے بجائے مماثلتی و مشابہتی امور پر زور دے کر زیادہ فائدہ حاصل کیا جائے۔

باب ۲

ہندوستان کا طبیعی ماحول اور قدرتی ذرایع

۱۔ قدرتی ذرایع اور ان کی اہمیت

کسی قوم کی معاشی زندگی کو متعین کرنے میں قدرتی ذرایع جو اہم حصّہ رکھتے ہیں ان میں کسی مبالغے کی مشکل گنجائش ہے۔ مارشل کا قول ہے کہ خود انگلستان کی حد تک بھی[1] باوجود اس کے کہ انگلستان کی تجارت وصنعت کو غلبہ حاصل ہے' اور وہ نمایاں حیثیت رکھتی ہے' قدرتی حالات بہت بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ساحلی خطہ اور دریا' کوئلے اور لوہے کی زرخیز کانوں کا قرب' معتدل ومرطوب آب وہوا' اور زمین کی زرخیزی' یہ سب اب بھی قومی دولت کی اساس ہیں"۔ اگرچہ یہ ممکن ہے کہ معلومات وذہانت کی ترقی کے ساتھ ساتھ قدرت پر انسانی دسترس بڑھ جائے' پھر بھی یہ تدریجی عمل قطعی طور پر محدود ہے' اور آخری چارہ کار کے طور پر انسان کے لیے قدرتی قوتوں اور سازوسامان پر انحصار کرنا ضروری ہے۔ اس لحاظ سے ہم اس باب میں ہندوستان کے طبیعی ماحول کو اجمالی طور پر بیان کرکے اس ملک کے بارے میں اپنی

[1] اصول معاشیات مارشل ص ۲۲

باب ۲

معاشی تحقیق شروع کریں گے۔[1]

۲۔ ہندوستان: رقبہ اور آبادی

برطانوی ہند کا رقبہ ۱،۰۹۶،۱۷۱ مربع میل اور آبادی ۲۷۱،۵۲۶،۹۳۳ نفوس ہے، اور دیسی ریاستوں اور ایجنسیوں کا رقبہ ۷۱۲،۵۰۸ مربع میل اور آبادی ۸۱،۳۱۰،۸۴۵ نفوس ہے۔[2] ملک کا طول شمالاً جنوباً قریب قریب دو ہزار میل اور شرقاً غرباً تقریباً ۲۵۰۰ میل ہے۔ اس طرح ہندوستان بجائے خود ایک دنیا ہے، چنانچہ برطانیہ عظمیٰ سے وہ پندرہ گونہ بڑا ہے اور روس کو نکال کر پورے یورپ کے برابر ہے۔ اس کی بری سرحد ۶۰۰۰ میل طویل ہے اور ساحلی خط کا طول ۵۰۰۰ میل ہے۔

۳۔ جغرافی محل وقوع

یوں تو جغرافی محل وقوع ہمیشہ اہم ہوتا ہے لیکن معاشی ترقی کے آخری مرحلوں میں اس کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ ہندوستان کو تجارت بین الاقوام کے اغراض کے لیے باقی دنیا کے مقابلے میں بہت موافق محل وقوع حاصل ہے۔ وہ مشرقی نصف کرۂ ارض کے عین مرکز میں واقع ہے، اور تجارتی راہوں پر جو ہر سمت میں جاتی ہیں دسترس رکھتا ہے۔ چونکہ اس کا ساحلی خط طویل و وسیع ہے، اس لیے بحری راہیں بدرجہا زیادہ اہمیت رکھتی ہیں اور اگر اس کو ضروری بحری ساز و سامان مہیا کر دیا جائے تو قوی امید ہے کہ وہ دنیا کی تجارت کی نقل و حمل کرنے والے بڑے ملکوں میں سے ایک بن جائے گا۔

۴۔ بندرگاہوں کی کمی

ہندوستان اس اعتبار سے بہت گھاٹے میں ہے کہ ایسی قدرتی گودیوں یا بندرگاہوں کی یہاں بہت کمی ہے جن میں جدید طرز کے جہاز آکر ٹھیر سکیں۔ مغربی ساحل کے بندرگاہ، بجز کراچی، بمبئی اور مارماگوا کے، برسات کے کل موسم میں جہازی آمد و رفت کے لیے بند رہتے ہیں۔ مشرقی

---

[1] یہ بیان زیادہ تر تیب ناگلہ فلر کی کتاب موسوم بہ "دی امپائر آف انڈیا" یا "سلطنت ہندوستان" اور "دی امپیریل گزیٹیر آف انڈیا" جلد اول، اور ڈی ایچ ملنگٹن کی کتاب موسوم بہ سلطنت برطانیہ کا معاشی جغرافیہ (The Economic Geography of the British Empire) پر مبنی ہے۔

[2] یہ اعداد ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہیں۔

باب ۲

...حل پر توڑ پھوڑ بہت شدید ہے اور قدرتی بندرگاہیں مفقود ہیں۔ تاہم مدراس کے بندرگاہ میں میں
...چ بحری دیواریں تعمیر کر کے بہت کچھ اصلاح و توسیع کر دی گئی ہے اور مشرقی ساحل پر دندانہ دار
...حوں کی عدم موجودگی سے جو مشکلات پیدا ہو گئی ہیں ان پر عہدہ برآ ہونے کی ایک مزید کوشش
...طار پر ویزاگاپٹم کے بندرگاہ کا ذکر کیا جا سکتا ہے جس کی ترمیم و توسیع کا کام سرعت سے جاری
...ہے۔ یوں تو کلکتے کا محل وقوع بہت اچھا ہے لیکن ہوگلی میں ریت کی وجہ سے رکاوٹیں پیدا ہو جاتی
...یا جو بہت خرابی پیدا کرتی ہیں؛ اور چٹاگانگ کی بھی حالت اسی کے مثل ہے۔ رنگون، مولمین،
...ین اور ٹاٹ سمندر سے دور واقع ہیں؛ علاوہ ازیں ایک اور خرابی ان میں یہ ہے کہ یہاں سے
...درون ملک تک آمد و رفت کے وسائل کی حالت بہت غیر اطمینان بخش ہے۔ اس لحاظ سے یہ بات
...سانی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ ہندوستان کی تجارت خارجہ کا ۹/۱۰ حصہ کیول پانچ بندرگاہوں یعنی بمبئی۔
...لتہ، رنگون، مدراس اور کراچی تک محدود ہے، جن کے منجملہ صرف بمبئی، اور کراچی قدرتی بندرگاہ
...ہیں۔ ایسی غیر اطمینان بخش حالت میں، ایک ایسی سرگرم پالیسی کی ضرورت بخوبی واضح ہے جس کی
...وجہ سے مناسب بندرگاہوں کی تعداد میں اضافہ ہو، نئی گودیوں کی تعمیر عمل میں آئے اور قدیم
...بڑے بڑے بندرگاہوں کی تجدید ہو، تاکہ ساحلی و خارجی تجارت کی ضرورت موثر طریقے سے
...پوری ہو سکے۔ جہاز رانی کی صورت حال بھی بڑی حد تک غیر اطمینان بخش ہے، اس لیے کہ ہندوستان کے
...پاس ایسے بحری تجارتی جہاز ہی نہیں جو اس کے شایانِ شان ہوں اور اس کی بحری تجارتی بوجھ
...مقدمہ رعایات کو برقرار رکھ سکیں۔

...۔ اندرونی وسائل آمد و رفت

ہندوستان کے بڑے بندرگاہ، اندرون ملک کے تجارتی مرکزوں سے ریلوں اور سڑکوں کے جال کے ذریعے ملحق ہیں۔ اندرونی وسائل آمد و رفت کی حالت جزیرہ نمائے ہند
...مقابلے میں شمالی ہند میں زیادہ بہتر اور سہولت بخش ہے۔ شمالی ہند کو یہ سہولت حاصل ہے کہ
...جہاز رانی کے قابل دریاؤں کی موجودگی کے علاوہ بڑے بڑے میدانوں میں سڑکیں اور ریلیں
...آسانی بنائی جا سکتی ہیں۔ برخلاف اس کے جزیرہ نما میں سطح زمین ناہموار اور کوہستانی ہونے کی وجہ
...سے شدید مشکلات پیش آتی ہیں جنہیں صرف کثیر خرچ برداشت کر کے ہی رفع کیا جا سکتا ہے؛ ریلوں
...کی تعمیر کا جہاں تک تعلق ہے، جزیرہ نما اور شمالی ہند میں نمایاں اختلاف پایا جاتا ہے،
...کی صورت حال موافق ہے لیکن ہم ان کی کامل صورت حال کے بارے میں مفصل بحث

جلد دوم میں کی گئی ہے۔

۶ ۔ طبیعی محل و قوع کی مشکلات کو دور کرنے کی کوششیں ۔

طبیعی محل و قوع کی مشکلوں اور خرابیوں کو دور کرنے کے امکان کا حوالہ دیتے ہوئے سیلنگ من صاحب تین اصلاح و ترقی کا ذکر کرتے ہیں، یعنی (۱) انسانوں اور اشیا کی نقل و حمل کے بارے میں؛ (۲) ترسیل قوت کے بارے میں؛ اور (۳) مراسلت کے انتظام کے بارے میں؛ ہم ان میں سے پہلے موضوع کا سرسری ذکر کر چکے ہیں۔ ترسیل قوت کے مسئلے پر اس باب میں متعاقب بحث کی جائے گی۔ جہاں تک مراسلت یا ترسیل خیالات کے انتظام یا خبر رسانی کا تعلق ہے، ڈاکخانہ، برقی تار، ٹیلیفون اور لاسلکی نے جغرافی محل و قوع کے اثر کو کم کرنے میں بہت بڑا کام کیا ہے؛ اور جدید تجارت اور معاشی جد و جہد کے نہایت اہم لوازم بن گئے ہیں۔ ان عاملوں میں سے بعض عامل مثلاً ڈاکخانہ اور ٹیلی گراف اس وقت ہندوستان میں کافی طور پر پھیلے ہوئے ہیں؛ اور لوگ ان سے بخوبی روشناس ہیں، چنانچہ نقل و حمل کی اصلاح و ترقی سے مل جل کر انھوں نے بھی ملک کی معاشی زندگی میں اکثر صورتوں میں تبدیلی پیدا کر دی ہے مہذب دنیا سے گاؤں کی علٰحدگی اب اسی طرح زیادہ تر گزرے ہوئے زمانے کی بات ہے جس طرح باقی دنیا سے ہمارے ملک کی بحیثیت مجموعی علٰحدگی۔ لیکن اس کے باوجود تجارتی معلومات و اطلاعات کی اشاعت کے لیے لاسلکی کے استعمال کی حد تک، ہمارا ملک اب بھی پسماندہ حالت میں ہے؛ دوسری جانب ٹیلیفون، بجز بڑے شہروں کے، دوسرے مقاموں پر ابھی تک عام طور پر رائج نہیں ہوا ہے۔

۷ ۔ ہندوستان کی تقسیم چار نمایاں حصوں میں ۔

ہندوستان کو چار نمایاں حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) جزیرہ نمائے ہند، جس میں وہ کل رقبہ شامل ہے جو کراچی سے دہلی تک اور دہلی سے کلکتے تک خط کھینچنے کی صورت میں اس خط کے جنوب میں واقع ہے؛ (۲) دریائے سندھ و گنگا کا میدان، جو جزیرۂ نما اور کوہ ہمالیہ کے درمیان واقع ہے، اور دنیا کا وسیع ترین مسطح زرعی خطہ ہے؛ (۳) ہمالیہ کا کوہستانی سلسلہ جو میدان گنگا کے شمال میں واقع ہے؛ اور (۴) برما جو مشرق میں واقع ہے۔

۸ ۔ جزیرہ نمائے ہند

اس علاقے کی سطح مرتفع ہے، اور اس کو دریائے سندھ و گنگا کے میدان سے بندھیاچل اور ست پڑرہ کے [illegible]

سلسلے جدا کرتے ہیں۔ اس سطح مرتفع کی مشرقی سرحد "مشرقی گھاٹ" اور مغربی سرحد "مغربی گھاٹ" ہے۔ موخر الذکر پہاڑ زیادہ قابل لحاظ ہیں اور ایک دیو پیکر مسلسل بحری دیوار کا کام دیتے ہیں جن کے درمیان نہ تو کوئی وسیع وادی ہے اور نہ کوئی وسیع رخنہ بجز اس نمایاں رخنے کے جو اس کی جنوبی حد سے دو سو میل اوپر واقع ہے۔ مشرقی گھاٹ بلندی اور بزرگی میں بہت کم ہیں، اور ان میں بڑی اور وسیع وادیاں رخنہ ڈالتی ہیں؛ چنانچہ یہی وادیاں، مہاندی، گوداوری، کشٹنا اور کاوری جیسے دریاؤں کے ذریعے سے خلیج بنگال میں پانی کی نکاسی کا راستہ تیار کرتی ہیں۔

مغربی گھاٹ اور سمندر کے درمیان صرف ایک تنگ خطۂ زمین ہے جو احاطۂ بمبئی کے بحری ساحل کی جانب واقع ہے؛ اس واقعے کی بناء پر سمندر سے ملک کے اندرونی حصے میں داخلہ بہت دشوار ہے، حتیٰ کہ موسم برسات میں ابر بھی اس پہاڑی سد راہ کے اُدھر بری اپنا بوجھ ہلکا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے؛ اور اس طرح اندرونی علاقے میں بارش کم ہوتی ہے اور آئے دن قحط و خشک سالی کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔ اس کے برخلاف مشرقی گھاٹ اور مشرقی ساحل کے مابین وسیع خطۂ زمین موجود ہے۔ چونکہ مشرقی گھاٹ کی بحری دیواریں مقابلتہً زیادہ پست ہیں؛ اس لیے موسمی ہوائیں ملک کے اندر زیادہ آسانی کے ساتھ پہنچ سکتی ہیں اور اس کے نتیجے کے طور پر جزیرہ نما کے مشرقی حصے، جو دریاؤں کی بدولت زرخیز نشیبی زمین سے مالامال ہیں، گنجان آبادی کی کفالت کرتے ہیں؛ اور اس لحاظ سے شمالی ہند کے میدانوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔

جزیرہ نما کی سطح، عام طور سے ناہموار اور پتھریلی ہے؛ پہاڑیوں کی چوٹیاں جنگلی درختوں سے کم و بیش ڈھکی ہوئی ہیں؛ اور نباتات اور مناظر کے لحاظ سے متعدد تضادات پیش کرتی ہیں۔ مشرق میں پست پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ چاول کی زمین کے وسیع خطے ہیں؛ مغرب میں زمین کی چڑھائی کے ساتھ ساتھ (اس لیے کہ جزیرہ نما میں مغرب سے مشرق کی جانب ایسا ہی ڈھال ہے جیسا کہ مکان کی چھت کا ہوتا ہے) بارش مقابلتہً کم ہوتی ہے، اور چاول کے بجائے باجرہ اور روئی کی کاشت وسیع مرتفع سطحوں پر ہوتی ہے جہاں درختوں کا نام و نشان تک نہیں ہے۔

۹۔ میدان گنگا و سندھ یہ شروع سے آخر تک دریاؤں اور طلائم دریائی مٹی پر مشتمل ہے؛ اور اس میں دو بڑے دریائی نظام پھیلے ہوئے ہیں جن کا رُخ مختلف سمتوں میں ہے۔ مغرب کے پانچ دریا، جن کی بناء پر پنجاب اپنے نام سے موسوم ہے، دریائے سندھ کے زیریں حصے میں شامل ہو کر بحیرۂ عرب میں جا گرتے ہیں۔ مشرق میں دریائے

باب ۲

بڑے دریا، بشمول گنگا و جمنا، اسی طریقے سے گنگا میں جا ملتے اور خلیج بنگال میں گرتے ہیں سمندر کے قریب پہنچ کر ان کا پانی دریائے برہم پتر کے پانی سے مل جاتا ہے جو مشرق سے نکل کر آسام کی وادی سے ہوتا ہوا آتا ہے۔ ان دریاؤں کے پانی میں جو ملائم مٹی بہ کر آتی ہے وہ بتدریج ایک وسیع ڈلٹا کو بڑھا رہی ہے جو خلیج بنگال کے سرے پر قائم ہو گیا ہے اور جس پر شہر کلکتہ واقع ہے۔

۱۰ - ہمالیہ اور جزیرہ نما کے دریا

ہمالیہ کے دریاؤں میں پانی سال تمام بہتا رہتا ہے، اس لیے کہ موسم گرما میں بھی ہمالیہ کی برف پگھلنے کی وجہ سے ان کو پانی وافر مقدار میں ملتا ہے۔ وسیع میدانوں میں بہنے کی وجہ سے دریا کے دونوں جانب نرم زرخیز مٹی کے بڑے بڑے خطے قائم ہو گئے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ یہ زرخیز سطح خطے قدیم آریائی تہذیب کا گہوارہ رہے ہیں، اور آجکل بھی زرعی پیداوار کے قدرتی گوداموں کا کام انجام دیتے ہیں۔ ان میں سے بعض دریا مثلاً اراوتی، گنگا اور سندھ، کشتی رانی کے قابل ہیں؛ اور ریلوں کے رواج سے قبل کے زمانے میں تجارتی نقل و حمل کی شاہ راہ کا کام انجام دیتے تھے۔ ان دریاؤں کے پانی سے ایک اہم پیداآور کار رائے آبرسانی میں کام لیا جاتا ہے جن پر پنجاب، سندھ، اور صوبہ متحدہ کی خوش حالی کا بڑی حد تک دار و مدار ہے۔ اس کے برخلاف جزیرہ نمائے ہند کے دریا، موسم بارش میں بڑے زور و شور کے ساتھ بہتے ہیں؛ لیکن گرمی کے موسم میں ان میں پانی کی مقدار بہت کم ہوتی ہے اور ان کی حیثیت محض گدلے پانی اور کیچڑ سے بھرے ہوئے نالوں کی سی ہو جاتی ہے۔ ان میں سے اکثر دریا تنگ اور ناہموار پتھریلے راستوں سے گزرتے ہیں اور بذریعہ کشتی عبور و مرور کو ناممکن بناتے ہیں۔ آب پاشی کا انتظام ان کے ذریعے سے بھی کیا جاتا ہے لیکن وہ اول الذکر صورت سے مختلف اور زیادہ بیش خرچ ہوتا ہے، چنانچہ دریاؤں کی وادیوں میں بارش کے پانی کو جمع کرنے کے لیے بڑے بڑے مخزن تعمیر کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور یہ سب تدبیریں قلت بارش کو رفع کرنے کے لیے اختیار کی جاتی ہیں جس سے یہ خطہ وقتاً فوقتاً متاثر ہوتا ہے۔

19

۱۱ - کوہستان ہمالیہ

دریائے سندھ و گنگ کے بالائی حصے پر ملک اس کوہ ہمالیہ واقع ہے، جس کی بعض چوٹیوں کی بلندی تیس ہزار فٹ ہے۔ ہندوستان کو باقی ایشیا سے ... ۲۰ میل طویل کوہستانی سلسلہ جدا کرتا ہے جس کے منجملہ ایک کوہ ہمالیہ ہے جس کا طول ۱۵۰۰ میل ہے۔ شمالی ہند کے میدانوں کی آب پاشی کرنے والے بڑے

باب

دریاؤں کے ضروری پانی کی رسد ہمالیہ کے پگھلے ہوئے برف سے مہیا ہوتی ہے۔ ہمالیہ کے دونوں سروں پر، پہاڑوں کے رخ میں اچانک تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ ان کا پھیلاؤ شرقاً و غرباً ہونے کی بجائے شمالاً جنوباً ہے اور اس طرح ہمالیہ کے کوہستانی سلسلے کو ملا کر وہ تین طرف سے ہندوستان کے میدانی خطے کو گھیرے ہوئے ہیں اور ہندوستان کو افغانستان و بلوچستان سے جدا کرتے ہیں۔ گو ہمالیہ کو سیاسی حیثیت سے بھی یوں اہمیت حاصل ہے کہ وہ ایک ناقابل عبور سدِّ راہ ہے؛ لیکن اس سے قطع نظر کرتے ہوئے وہ ہواؤں، گرمی، سردی، رطوبت اور کاشت پر بھی اثر ڈالتا ہے، اور اس طرح معاشی حالات کو بہت نمایاں طریقے پر متاثر کرتا ہے۔

۱۲ - برما

آخر میں، برما، جو مشرق میں واقع ہے، در اصل ایک جداگانہ جزیرہ نما کا جزو ہے۔ اس کی حالت ہندوستان خاص سے اکثر صورتوں میں مختلف و متضاد ہے، اور وہ حال حال تک سیاسی لحاظ سے بھی ہندوستان سے الگ رہا۔ اراوڑی کی زرخیز وادی، برمی قوم کا اصل وطن ہے۔ یوں تو برمی، ارتباط قومی کے ذریعے سے اطراف و اکناف کے پہاڑی علاقوں کی جنگلی قبائلی آبادی سے ملتے جلتے ہیں؛ لیکن ان میں ایک اعلیٰ درجے کی تہذیب و مدنیت پائی جاتی ہے جو عام نقطۂ نظر سے اور معاشرتی تنظیم کے لحاظ سے ہندوؤں کی تہذیب و تمدن سے مختلف ہے۔ برما میں جنگلوں اور معدنی دولت کے وسیع قدرتی ذرائع موجود ہیں جن سے بے شمار معاشی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔

۱۳ - طبعی و موسمی اختلافات

ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بہت بڑے طبعی و موسمی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ شمال میں برف سے ڈھکی ہوئی خوش نما پہاڑی بلندیاں اور دائمی عزلت میں بہنے والے برفانی دریا ہیں۔ ان بلندیوں کے دامن میں نشیبی دریائی وادیوں کے ہموار اور وسیع خطے یا تو ریتیلے، خشک اور گرمی سے تپتے ہوئے میدان ہیں یا مرطوب ہوا کے تحت سرسبز اور پر از آب علاقے۔ جنوب میں ایک بڑی مرکزی سطح مرتفع ہے جہاں خود رو جنگل اب بھی قدیم وحشی منتشر قبائل کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں۔ مغربی حصے میں شکستہ اور ناہموار پہاڑیاں اور برج نما کھڑی اونچی چٹانوں کے سلسلے بحرِ ہند کے کنارے کنارے چلے گئے ہیں؛ اور جنوب میں سبزے سے ڈھکے ہوئے مرتفع، ہموار اور ڈھلواں خطے ہیں[1]۔ چنانچہ ایک ایسے شخص کے نزدیک جس نے ہندوستان کے متعلق جنوبی بنگال میں

18

[1] امپیریل گزیٹیر جلد اول صفحہ ۱

معلومات حاصل کی ہوں، ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جس کی آب و ہوا تقریباً ویسی ہی طور سے گرم اور مرطوب ہے: نباتات بکثرت ہے: دریاؤں، تالابوں، چاول کے کھیتوں اور ناریل کے درختوں کی بہتات ہے؛ شہروں کی تعداد کم ہے، لیکن آبادی بہت گنجان ہے اور باشندے نرم دل اور کم ہمت ہیں"۔ یہاں سے آگرہ یا لاہور کی جانب بڑھیے تو "دنیا کے بہترین سبزہ زاروں اور مرطوب ترین ممالک میں سے کوئی ملک ملنے کے بجائے اوائل گرما میں سب سے زیادہ خشک اور بھورے رنگ کا علاقہ نظر آئے گا، جس کو لُو اور گرم ہوائیں جھلس کر رکھ دیتی ہیں، جس کے موسم سرما میں سردی اچھی اور صحت بخش ہوتی ہے لیکن یہاں کے ہزاروں مربع میل خطوں پر بنگال کی جاری نباتات کی جگہ گیہوں، جو اور کرۂ معتدل کی پیداوار کی کاشت لیتی ہے۔ یہ مشہور شہروں اور خوشنما یادگاروں کا ملک ہے، جس کے باشندے طاقتور اور بلند حوصلہ ہیں۔

حوادث فضائی کے لحاظ سے ہندوستان کے حالات دنیا کے کسی دوسرے علاقے کے مقابلے میں بہت زیادہ نوعی اختلافات رکھتے ہیں یعنی ایک ہی ملک میں گرم و معتدل ممالک کے حالات نہایت نمایاں طریقے پر ساتھ ساتھ پائے جاتے ہیں۔ باہر کی جانب سے دو ملحقہ رقبے ہندوستان کو متاثر کرتے ہیں۔ شمال میں کوہستان ہمالیہ اور سطح مرتفع افغانستان وسط ایشیا کی آب و ہوا پیدا نہیں ہونے دیتے، اور براعظم کی سی آب و ہوا پیدا کرتے ہیں، جس کی خصوصیات میں ارضی ہواؤں کا چلنا، بہت زیادہ خشک ہوا، ان کے بڑے حصے میں حرارت کی موجودگی، رطوبت و بارش کی کمی یا عدم موجودگی داخل ہیں۔ جنوب میں سمندر بحری آب و ہوا پیدا کرتا ہے، جس کی خاص خصوصیات میں حرارت کی عظیم یکسانی، دن کے قلیل حصے میں حرارت، ہوا کی کثیر رطوبت، اور کم و بیش جلد جلد بارش شامل ہیں۔ سردی کے موسم میں حرارت کا اوسط جنوبی ہند کے مقابلے میں پنجاب میں تقریباً تیس درجے کم ہوتا ہے۔ پنجاب، صوبۂ متحدہ اور شمالی ہند کی آب و ہوا عام طور سے رَبی و یرا کی آب و ہوا سے مشابہت رکھتی ہے، جس کا خطہ بے ابر صاف اور روشن ہوتا ہے، اور موسم ٹھنڈا اور خشک رہتا ہے۔ جنوبی ہند میں مشرقی ساحل کے مقابلے میں مغربی ساحل زیادہ گرم ہوتا ہے اور کرشنا کے منبع کے اردگرد حرارت انتہائی حالت میں پائی جاتی ہے۔ کلکتہ، بمبئی اور

ـلـه دیکھو سرجان اسٹریچی کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان: اس کا نظم و نسق اور اس کی ترقی"، چوتھا ایڈیشن صـ۳ تا صـ۷۔

باب ۲

مدراس کی آب و ہوا سمندر کے قرب کے باعث معتدل ہے، لیکن کلکتے میں موسم سرما میں خوب سردی ہوتی ہے جس سے احاطہ ہائے مدراس و بمبئی کے دوسرے شہر ناآشنا ہیں، برخلاف اس کے گرمی کے موسم میں کلکتے کی گرمی نسبتہً زیادہ ناقابل برداشت ہوتی ہے۔

۱۴ - ہندوستان کے موسم

پنجاب میں موسم گرما کا آغاز باضابطہ طور پر ۱۵ مارچ سے ہوتا ہے اور اسی تاریخ سے جون میں بارش کے آنا تک حرارت بتدریج بڑھتی جاتی ہے جس کا باعث یہ ہوتا ہے کہ سورج کی شعاعیں ساکرنیں زمین کو تپا دیتی ہیں۔ اس موسم میں جزیرہ نما کے اندرونی حصے اور شمالی ہند میں گرمی زیادہ ہوتی ہے؛ اور حرارت کی حد تک شمالی ہند اور جنوبی ہند کے مابین تضاد نہیں ہے، بلکہ اندرونی ملک اور ساحلی خطے بشمول ملحقہ رقبہ جات

14

ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ دکن اور صوبہ متوسط کے بڑے حصے کو گرم ترین علاقوں میں شمار کیا جاتا ہے، گو مئی کے مہینے میں سب سے زیادہ حرارت بالائی سندھ، شمال مغربی راجپوتانے اور جنوب مغربی پنجاب میں ہوتی ہے جبکہ جیکب آباد میں درجۂ حرارت بعض اوقات سایہ میں ۱۲۵ درجے گرمی بتلاتا ہے۔ ہندوستان میں جہاں کہیں واضح طور سے متعین موسم پائے جاتے ہیں ان کی تعداد تین ہے:- (۱) سرد و خشک موسم یعنی موسم سرما، جبکہ شمالی تجارتی ہوائیں چلتی ہیں اور بجز شمالی صوبوں کے، جہاں ابر و باد کے معتدل قسم کے طوفان گاہ گاہ رونما ہوتے ہیں، دوسرے مقاموں پر بارش نہیں ہوتی یا کم ہوتی ہے؛ (۲) مرطوب موسم جس میں گرما کی جنوب مغربی موسمی ہواؤں کی آمد آمد کے ساتھ ہی سخت تکلیف دہ گرمی ہوتی ہے؛ اور (۳) عام طور پر اچانک اور موسلا دھار بارش کے آغاز سے پیشتر کا گرم و خشک موسم۔

۱۵ - بارش

معمولی سالانہ بارش کی مقدار مختلف مقاموں پر مختلف درجے ہوتی ہے، مثلاً چیراپونجی میں جو آسام کے پہاڑوں میں واقع ہے، ۴۶۰ انچ، تو شمالی سندھ میں تین انچ سے بھی کم ہوتی ہے۔ موسمی اعتبار سے جزیرہ نمائے ہند، ایشیا کے عظیم مون سونی رقبے کا ایک جزو ہے، اور اس رقبے کے کسی دوسرے جزو کے مقابلے میں "مون سونی" تنظیم کو بہت زیادہ مکمل شکل میں ظاہر کرتا ہے۔ "مون سون" کی اصطلاح فنی حیثیت سے ہواؤں کی اس رجعت پر صادق آتی ہے جو کل "مون سونی" رقبے میں واقع ہوتی ہے اور جو سال کے موسموں کو دو نمایاں دوروں میں تقسیم کرتی ہے، ایک جنوب مغربی مون سون کا دور، اور دوسرے شمال مشرقی مون سون کا دور۔ حقیقت یہ ہے کہ جنوب مغربی مون سون، جنوب مشرقی تجارتی ہواؤں کا پھیلاؤ ہے جو خط استوا کو عبور کرنے کے بعد

دائیں جانب مڑ جاتی ہیں اور اس طرح جنوب مغربی ہوائیں بن جاتی ہیں۔ جولائی تک یہ سارے ہندوستان پر پوری طرح چھا جاتی ہیں؛ دکن میں ہوائیں عام طور پر جنوب مغربی، گنگا کے ڈیلٹا میں جنوبی، اور اوپر ہٹ کر گنگا کی وادی میں جنوب مشرقی ہوتی ہیں۔ دریائے سندھ کی وادی میں سب سے آخر میں یہ ہوائیں پہنچتی ہیں اور سب سے پہلے یہاں سے ہٹ جاتی ہیں؛ چنانچہ یہاں بارش کی سالانہ مقدار بہت ہی کم ہے۔ برسات سب سے زیادہ مغربی گھاٹ، ہمالیہ اور برما میں ہوتی ہے جہاں زمین کی بلندی کی وجہ سے اس میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ ستمبر میں مون سون کی شدت میں تیزی کے ساتھ کمی شروع ہو جاتی ہے اور اس مہینے کے تقریباً وسط کے بعد شمال مغربی ہندوستان کے بڑے حصے میں بارش ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد معتدل قسم کی شمال مشرقی ہوا استقلال کے ساتھ چلنا شروع ہوتی اور بتدریج سارے خلیج بنگال پر پھیل جاتی ہے۔ اس طرح اس کو "شمال مشرقی مون سون" کہتے ہیں۔ اس "مون سون" تنظیم کی بدولت ہندوستان کی بارش میں معین دوریت پائی جاتی ہے؛ اور اس کے باعث موسمی اعتبار سے سال کو حسب ذیل حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:-

(الف) جنوب مغربی مون سون کا موسم: (۱) وسط جون سے وسط ستمبر تک یعنی عام بارش کا موسم۔ (۲) وسط ستمبر سے وسط دسمبر تک موسمی ہواؤں کے لوٹنے کا زمانہ۔

(ب) شمال مشرقی مون سون کا موسم:- (۱) جنوری اور فروری یعنی موسم سرما۔ (۲) مارچ تا وسط جون یعنی موسم گرما۔ جون میں خاص قسم کی فصلیں بوئی جاتی ہیں اور خزاں میں کاٹی جاتی ہیں، مثلاً چاول، روئی، باجرہ وغیرہ۔ اسے "فصل خریف" کہتے ہیں۔ فصلوں کی دوسری قسم اس وقت بوئی جاتی ہے جبکہ مون سون ختم ہو جاتا ہے یعنی تقریباً وسط ستمبر میں، مثلاً گیہوں، جو، السی وغیرہ۔ یہ فصل جنوری و مارچ کے مابین کاٹی جاتی ہے؛ اس کو "فصل ربیع" کہتے ہیں۔

۱۶۔ بارش کی اساسی اہمیت

یہ سارے ہندوستان کی موسمی زرعی حالت کا مختصر بیان ہے جو ملک کے کسی خاص حصے پر چند شرائط و مستثنیات کے ساتھ صادق آتا ہے؛ لیکن اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بحیثیت مجموعی ملک کے لیے موسمی بارش کتنی اہمیت رکھتی ہے؛ چنانچہ اس کی مقدار، تقسیم اور بروقت آمد پر لاکھوں انسانوں کی تباہی و خوشحالی کا دارومدار ہوتا ہے[1]۔ غالباً دنیا کے کسی خطے میں ہر شعبۂ زندگی پر بارش کا اس قدر

[1] سال کے بارہ مہینوں میں سے کچھ مہینے ہندوستان کے بقاء حیات کی آزمائش ہوتی ہے اور وہ بہت شاذ

گہرا اثر نہیں پڑتا جس قدر کہ ہندوستان میں۔ یہاں زندگی سب سے اول زراعت پر منحصر ہے، زراعت کا انحصار سر بسر بارش پر ہے، اور بارش قریب قریب سب کی سب جنوب مغربی موسمی ہواؤں کے ذریعے سے ہوتی ہے؛ چنانچہ ہندوستان میں ۹۰ فیصد بارش اسی طریقے سے ہوتی ہے۔ جنوب مغربی مون سون اس نقطۂ نظر سے شمال مشرقی مون سون کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ اہم ہے، اور اس لحاظ سے اس کو ہندوستانی زندگی کا مرکز و محور کہا جا سکتا ہے۔

ہندوستان کی بارش کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تسلسل نمایاں طور پر غائب ہوتا ہے۔ انگلستان کو لیجئے، یہاں سال کے کسی حصے میں بھی بارش کی توقع ہو سکتی ہے، لیکن ہندوستان میں وہ بعض معین موسموں تک محدود رہتی ہے۔ علاوہ ازیں یہاں بارش کا بیشتر حصّہ موسلا دھار ہوتا ہے، اور پانی زمین میں جذب ہوئے بغیر اوپر ہی اوپر بہ جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے زمین پوری طرح تر یا نم نہیں ہونے پاتی، جگہ جگہ پھیل جاتی ہے اور پانی گڑھوں میں اس طرح جمع ہو جاتا ہے کہ بہنے نہیں پاتا۔

مختلف مقامات میں بارش کی سالانہ مقدار کی عدم یکسانی، مندرجۂ ذیل تقسیم کی بنیاد قرار دی گئی ہے:- (۱) ایسے رقبے جن میں حتمی طور پر بارش ہوتی ہے، مثلاً برما، آسام، مشرقی و جنوبی بنگال، اور وہ خطہ جو مغربی گھاٹ اور بحیرۂ عرب کے مابین اور جزیرہ نما کے انتہائی جنوبی نقطے سے شروع ہو کر ضلع سورت کی جنوبی سرحد تک پھیلا ہوا ہے؛ (۲) وہ رقبے جن میں بارش پُر خطر طریقے پر کم ہوتی ہے، یعنی دس انچ سے لیکر تیس انچ تک مثلاً اودے پور، اجمیر، اور مغربی گھاٹ کو خارج کر کے، بمبئی دکن؛ (۳) وہ رقبے جو خشک سالی سے متاثر رہتے ہیں، جہاں آب پاشی کے بغیر کاشت بڑی حد تک پُر خطر اور بعض صورت میں غیر ممکن ہے، مثلاً شمالی سندھ، مغربی راجپوتانہ مغربی پنجاب وغیرہ۔

16 **۱۷ - آب و ہوا** ہندوستان کی آب و ہوا کے متعلق کوئی عام کلیہ اس لیے نہیں قرار دیا جا سکتا کہ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، اس کے حدود کے اندر تقریباً ہر اس قسم کی انتہائی آب و ہوا پائی جاتی ہے جس سے خط سرطان و جدی کا درمیانی خطہ یا منطقہ معتدل مانوس ہے لیکن بحیثیت مجموعی ہندوستان کی آب و ہوا کے متعلق

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ ـ کسی نقصان کے بغیر اس سے بچ نکلتا ہے۔ ایل، سی، اے، نولس (L. C. A. Knowles) کی کتاب موسوم بہ "برطانوی سلطنت ماورائے بحر کی معاشی ترقی" (the Economic development of the British overseas Empire) سنہ ۱۹۲۴ء، صفحہ ۲۰۰۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ نیم گرم یا نیم حاری ہے؛ انسانی جسم پر اس کا تھکا دینے والا اثر پڑتا ہے؛ اس کے برخلاف منطقہ ہائے معتدل کی آب و ہوا کا صحت بخش اثر پڑتا ہے؛ اسی لیے اس کے مقابلے میں اول الذکر آب و ہوا میں آدمی کی صحت و تندرستی خراب ہوتی ہے۔ چنانچہ آب و ہوا کا زیادہ موافق ہونا ہی ہندوستانی مزدور کے مقابلے میں یورپی مزدور کی کارکردگی کے تفوق کے اسباب میں سے کم از کم ایک سبب ہے۔ اس سلسلے میں آب و ہوا کے اثر کو گو مبالغے کے ساتھ بیان نہ کرنا چاہیے پھر بھی یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ اس کا اثر پڑتا ہے۔

۱۸۔ گرم آب و ہوا معاشی ترقی کے اعتبار سے یہ بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ خطوط سرطان و جدی کے درمیانی خطوں میں قدرت ذریعۂ معاش مقابلۃً بہت آسانی کے ساتھ مہیا کرتی ہے اور انسان کو بہت کم محنت کرنی پڑتی ہے؛ علاوہ ازیں ان خطوں میں انسان کی ضرورتیں منطقۂ معتدلہ کے ملکوں کے مقابلے میں بہت مختصر ہوتی ہیں؛ چنانچہ قدرت انسان کو اچھی طرح پر جد و جہد کرنے اور اپنی قوت و قابلیت اور عاقبت اندیشی سے پوری سرگرمی کے ساتھ کام لینے سے باز رکھتی ہے۔ برخلاف اس کے منطقہ ہائے معتدلہ میں ہر چیز کی ویسی افراط و بہتات نہیں ہوتی جیسی کہ گرم ممالک میں؛ اور سخت محنت کیے بغیر کوئی شے حاصل نہیں ہوتی۔ چونکہ کام کرنا عام طور پر اور ہر حیثیت سے ضروری ہوتا ہے؛ اس لیے محنت کا وقار بڑھ جاتا ہے؛ اس کی اجرت زیادہ ملتی ہے اور کام کرنے والے ذہین اور آزاد ہوتے ہیں۔ چونکہ سرما میں کڑاکے کا جاڑا ہوتا ہے اور تیز و تند ہوائیں چلتی ہیں اس لیے موسم گرما ہی میں لباس، غذا اور مکان کی تیاری کے لیے پیش خیالی کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان علاقوں کی بود و باش، منظم کام، استقلال اور مشقت چاہتی ہے؛ اور اگر یہ شرطیں پوری ہوں تو ان سے ایک اعلیٰ درجے کی تہذیب و تمدن کی ترقی کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

بایں ہمہ پروفیسر کار ساؤنڈرس نے حال میں اس خیال کی مخالفت کی ہے کہ "جب قدرت بہت زیادہ آسانی کے ساتھ صلہ دیتی ہے تو معاشی ترقی اور تہذیب و تمدن پسماندہ حالت میں رہتے ہیں"۔ اس کے برخلاف وہ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ان مقامات میں جہاں کمیت و کیفیت کے لحاظ سے مفید اور کارآمد اشیا کی بہتات و افراط ہوتی ہے وہاں، ان کے افادے کو محسوس کرنے کا زیادہ موقع ہوتا ہے اور یہ کہ مہارت کی اصلاح و ترقی کے باعث وہیں ان کو زیادہ سے زیادہ حاصل وصول کیا جائے گا۔ اس لحاظ سے زرخیزی جتنی زیادہ ہوگی اتنی ہی مہارت کی

باب ۲

زیادہ ترغیب ہوگی"۔[1] خواہ کچھ ہی ہو، واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی گرم آب و ہوا یا زرخیزی، اس ملک کی گزشتہ شاندار تہذیب اور تمدن کی ترقی کی راہ میں مانع نہیں رہی۔ اہل ہند کی موجودہ پسماندہ حالت اور عدم توجہی، غفلت اور بے پروائی وغیرہ خصوصیات کی توجیہ ملک کی آب و ہوا یا قدرت کی فراوانی سے کرنے کے بجائے دوسرے اسباب سے کرنی چاہئے۔

۱۹۔ جنگلات

ہندوستان کے عمدہ جنگلات اس کے سب سے زیادہ قیمتی قدرتی ذرائع میں شمار کرنے چاہئیں۔ ملک کے جنگلوں کا انحصار بہ لحاظ نوعیت زیادہ تر بارش اور بلندی پر ہے۔ جہاں بارش بہت زیادہ ہوتی ہے وہاں تاڑ، فرن، بانس اور ربڑ وغیرہ کے سدابہار جنگل پائے جاتے ہیں۔ جہاں اس سے کم تر ہوتی ہے وہاں، ساگوان، سال اور دوسری انواع و اقسام کی قیمتی لکڑی کے جنگل ملتے ہیں۔ جہاں بارش بہت کم ہوتی ہے وہاں، نباتات کمیاب ہوتے ہیں اور وہ بھی تمر ہندی اور اقاقیا وغیرہ کے درختوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ہمالیہ، قطب شمالی سے نیچے سے گرم ممالک کے حالات پائے جاتے ہیں اور جنگلات میں بلندی کے لحاظ سے سرو، صنوبر، بلوط، شاہ بلوط، کمزیلیا بانس وغیرہ کے درخت ہوتے ہیں۔ تمام ممالک کا یہ تجربہ ہے کہ جنگلوں کی ازسرنو روئیدگی و ترقی کے قدرتی عمل انسان کی تباہ کاری کے قدم بہ قدم چلنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، اس لحاظ سے حکومت نے اس کو عام طور پر ضروری پایا ہے کہ ملک کے مستقبل اغراض کے لیے خاص تدبیریں اختیار کرے، تاکہ جنگل خلاف احتیاط تباہ کاری سے محفوظ رہیں۔ اگرچہ یہ سوال کہ آیا جنگلات کو کسی خاص ملک میں محفوظ رکھنے کی ضرورت ہے یا نہیں، اور اگر ہے تو کس حد تک ہے، اس کا انحصار بعض خاص حالات پر ہے، مثلاً ملک کی حیثیت و حالت، اس کے وسائل آمد و رفت، زمین کو جنگل اگانے کے علاوہ دوسرے کاموں میں لانے کے امکانات، آبادی کی ناگزیر ضروریات اور شغل اصل کے لیے سرمائے کی ممکنہ مقدار وغیرہ۔ لیکن پھر بھی اتفاق آرا اس پر ہے کہ ہندوستان کے جنگل ایک بیش قیمت قومی اثاثہ ہیں اور ان کی مناسب طریقے پر حفاظت کرنا حکومت ہند کے اہم ترین معاشی فرائض میں سے ایک ہے۔

۲۰۔ جنگلات کا افادہ

انسانی و قدرتی سیشتہ میں جنگلات براہ راست اور بالواسطہ قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ جنگلوں کے بالواسطہ

---

[1] دیکھو اے ایم کار سانڈرس کی کتاب موسوم بہ "مسئلہ آبادی" (The Population Problem) صفحہ ۲۴۲

۲ ب

فوائد حسبِ ذیل ہیں: — (۱) یہ آب و ہوا میں اعتدال پیدا کرتے ہیں، ہوا کی اضافی رطوبت میں اضافہ کرتے ہیں، بخارات میں کمی کرتے ہیں اور بارش کی مقدار میں اضافہ کرتے ہیں؛ (۲) پانی کی رسد کی تنظیم میں مدد دیتے ہیں، چشموں میں پانی کی رسد کو بہتر طریق پر برقرار رکھتے ہیں، طغیانی اور سیلاب کو روکتے ہیں اور دریاؤں میں پانی کے بہاؤ کو زیادہ تسلسل کے ساتھ جاری رکھتے ہیں؛ (۳) وہ زمین کی زرخیزی کو بڑھاتے ہیں اس لیے کہ وہ معدنی زمینوں کو بھی زراعت کے لیے موزوں زرخیز چکنی مٹی بنانے میں مدد دیتے ہیں؛ (۴) وہ ہوائی لہروں کی شدت میں کمی کر دیتے ہیں، ملحقہ کھیتوں کو خشک یا سرد ہوا سے محفوظ رکھتے ہیں، اور مویشیوں، وحشی جانوروں، چرندوں اور کارآمد پرندوں کو محفوظ رکھتے ہیں؛ (۵) بعض شرائط و حالات کے تحت وہ کسی ملک کی آب و ہوا کو خوشگوار اور صحت بخش بنانے اور اس کی حفاظت کرنے میں مدد دے سکتے ہیں؛ (۶) وہ ملک کے حُسن کو دوبالا کرتے ہیں اور باشندوں پر مفید جمالیاتی اثر ڈالتے ہیں۔

18

جنگلات کا براہِ راست افادہ ان کی پیداوار کے باعث ہے، مثلاً جلانے کی لکڑی، چوبینہ اور اشیائے خام جو مختلف صنعتوں میں استعمال کی جاتی ہیں۔ ایک اور اہم فائدہ خاص کر ہندوستان میں یہ ہے کہ وہ مویشی کی چراگاہ کا بھی کام دیتے ہیں۔ لیکن ممکن ہے کہ اس کی وجہ سے جنگلوں کی حفاظت میں سخت خلل واقع ہو۔ لہذا ان دونوں ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ہندوستان میں یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ جنگل کے رقبے کے ایک جزو کو چرائی کے لیے پوری طرح مسدود کیا جاتا ہے، ایک جزو میں صرف بعض جانوروں مثلاً بھیڑ بکریوں اور اونٹوں کے چرانے کی ممانعت کر دی جاتی ہے، اور ایک وسیع رقبے کو ہر قسم کے جانوروں کے چرنے کے لیے کھلا رکھا جاتا ہے۔ معمولی سالوں میں جو رقبے مسدود کئے جاتے ہیں ان میں خشک سالی اور قحط کے زمانے کے لیے چارہ کے ذخائر محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس زمانے میں یا تو چرانے کی ممانعت ہٹالی جاتی ہے یا گھاس کاٹ لی جاتی ہے اور ان علاقوں میں روانہ کی جاتی ہے جہاں اس کی سخت ضرورت ہو۔ یہ شکایت عام طور سے سنی گئی ہے کہ ہندوستان میں جنگلات کا انتظام، زرعی آبادی کے حق میں غیر ہمدردانہ ہے اور جنگل کی حفاظت و ترقی کے فرض کو مناسب طریق پر انجام دینے میں کوتاہی کیے بغیر آبادی کی ضرورتوں کو جیسا کہ چاہیے پورا نہیں کیا جاتا، مگر یہ جنگلات اور زراعت و امداد باہمی کے سررشتوں میں جن کا تعلق مزارعین کی بہبود سے ہے، تعاون

باب ۱

وتعاون کی ضرورت ہے، تاکہ دو متضاد نقطہ ہائے خیال میں مطابقت پیدا ہو۔ اگرچہ صحرا داری کا اصلی کام جنگلات کی حفاظت و ترقی ہے لیکن ہمیں اس واقعے کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ ایک اہم پیشے اور ذیلی صنعت کے طور پر وہ زراعت سے بھی وابستہ ہے؛ اس لیے کہ جنگلات سے کسان کی اکثر ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں، مثلاً جلانے کی لکڑی جو ایندھن کے طور پر استعمال ہونے والے کھاد کی جگہ لے گی۔ مکانوں کے لیے معمولی چوبینہ آلات اور اوزار کے لیے لکڑی اور مویشیوں کے لیے چارے کی بہم رسانی۔ یہ وہ مراعات اور سہولتیں ہیں جن کا کسان صدیوں سے خوگر رہا ہے اور جن کی اچانک موقوفی کے خلاف وہ غم و غصے کا اظہار کرتا ہے کہ وہ خلاف قاعدہ اور حد سے زیادہ ناگوار ہے۔

جنگلات کے افادے کو کسان کے لیے بڑھانے اور اس کو جنگلات کے نظم و نسق پر روشن خیالی کے ساتھ نظر ڈالنے کے قابل بنانے کے مدنظر کمیشن نے سفارشیں پیش کی ہیں[1] جن میں سے چند حسب ذیل ہیں:۔ (۱) ہر صوبے میں جنگلات سے استفادے کے لیے ایک افسر کا تقرر، جس کا سب سے بڑا کام جنگلات کی صنعتوں کو فروغ دینا ہو، اس لیے کہ یہ معاملہ کسانوں کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے، خاص کر ان کے لیے جو جنگلات کے قرب و جوار میں رہتے بستے ہیں۔ (۲) جنگل کے رقبوں کی از سر نو تقسیم، مثلاً: (ا) ایک بڑا ڈویژن جو تجارتی جنگلات یا ایسے جنگلوں کی نگرانی کرے جن کا وجود طبیعی و موسمی اعتبارات سے ضروری ہو (ب) چھوٹا ڈویژن جس کی نگرانی میں چھوٹے جنگل ایندھن کے نخلستان، دیہاتی بن، اور افتادہ زمینیں ہوں؛ اور لکڑی سے کم و بیش بھرے ہوئے رقبوں کو جو اس وقت محکمۂ جنگلات کے تحت ہیں، دیہی انتظام کے تفویض کر دیا جائے، اور حکومت مدراس کے اختیار کیے ہوئے طریقوں کے مطابق عوام کی نمایندہ کمیٹیاں یا پنچایتیں ان کی نگرانی کریں۔ (۳) محکمے میں بھرتی شدہ افسران جنگلات کے لیے زرعی کالجوں میں کچھ مدت کے واسطے نصاب کی تکمیل لازمی کر دی جائے تاکہ محکمہ جات جنگلات و زراعت کے مابین زیادہ قریبی تعلق و تعاون پیدا ہو سکے۔

۲۱۔ جنگلات کی حفاظت

ہندوستان میں برطانوی دور حکومت سے پیشتر ہی سے صدیوں تک جنگلوں کی خلاف احتیاط

15

[1] دیکھو شاہی زرعی کمیشن کی رپورٹ شائع شدہ ۱۹۲۸ء پیراگراف ۲۲۹ تا ۲۳۳۔

تباہ کاری کا سلسلہ جاری رہا۔ برطانوی حکومت کے ابتدائی سالوں میں یہ تباہ کاری متعدد عاملوں کے باعث بہت بڑھ گئی، مثلاً اضافۂ آبادی، مویشیوں کی تعداد میں اضافہ، زراعت کی توسیع، اور ریلوں کی جانب سے چوبینہ اور جلانے کی لکڑی کی مانگ کی کثرت۔ آخر میں حکومت نے جنگلات کی تباہی کے اس خلاف احتیاط عمل کو روکنے کی ضرورت کو محسوس کیا؛ چنانچہ جنگلوں کی حفاظت کی پہلی منظم تدبیریں لارڈ ڈلہوزی کے دورِ حکومت میں تقریباً ۱۸۵۵ء میں اختیار کی گئیں۔ اُس زمانے میں جنگلات کے محافظوں کے عہدے بمبئی، مدراس اور برما میں موجود تھے اس کے فوراً بعد ہی دوسرے تقررات بھی عمل میں آئے، اور ۱۸۶۴ء میں ایک منظم سرکاری محکمہ صدر ناظم جنگلات کے تحت قائم ہوا۔ اس کے بعد سے ہندوستان کا محکمۂ جنگلات ترقی کر رہا ہے؛ چنانچہ اس وقت برطانوی ہند کے مجموعی رقبے کے $\frac{1}{5}$ حصے سے زیادہ اس کی نگرانی میں ہے۔ ۱۸۹۴ء میں حکومت ہند نے ایک اہم گشتی جاری کی جو جنگلات کے بارے میں سرکاری پالیسی کی بنیاد قرار پاتی ہے۔ اس کی رو سے جنگلوں کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا، (۱) وہ جنگل جن کا تحفظ موسمی یا طبیعی بنیادوں پر ضروری ہے؛ (۲) وہ جنگل جن سے تجارتی اغراض کے لیے قیمتی چوبینہ دستیاب ہو؛ (۳) چھوٹے جنگل یا ان جن میں ایسے قطعے شامل ہیں جو اگرچہ حقیقت میں جنگل ہوں، لیکن ان میں گھٹیا قسم کا چوبینہ پیدا ہوتا ہو یا اعلیٰ قسم کی لکڑی کم مقدار میں پیدا ہوتی ہو؛ اور (۴) چراگاہیں اور رمنے جو عام طور پر محض برائے نام جنگل ہوتے ہیں[1]۔

۲۴۔ ہندوستان میں جنگلات کا رقبہ

تمام صوبوں[2] کا مجموعی رقبہ ۱۱۰۱۹۰۲ مربع میل ہے، جس کے منجملہ جنگلات کا رقبہ ۱۹۲۱ء تا ۱۹۲۲ء میں ۲۴۵۸۱۳۱ مربع میل یا ۳۱۲۲ فی صد تھا۔ جنگلات کے اس رقبے میں سے ۱۰۵۹۶۰ مربع میل "محفوظ (Reserved) جنگلات"، ۶۹۵۲ مربع میل "مامون (Protected) جنگلات" اور ۱۳۲۱۸۹ مربع میل "غیر تبویب یافتہ سرکاری جنگلات"[3] تھے۔ جنگلات کی تقسیم تین حصوں میں یعنی محفوظ، مامون اور غیر تبویب یافتہ

[1] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ شائع شدہ ۱۹۲۸ء پیراگراف ۲۱۵۔

[2] ان صوبوں سے دہلی کے اطراف کا علاقہ اور مانی پور (راس ہند) کا برطانوی پرگنہ خارج ہے۔

[3] غیر تبویب یافتہ سرکاری جنگلات یا "جنگلات عامہ کی زمینیں" عموماً اکثر صوبوں میں بجلہ غیر آباد بنجر زمین جو

باب

سرکاری جنگلات اسی ترتیب کے لحاظ سے ہے جس ترتیب سے حکومت استعمال کرنے والے افراد اور عوام کے حقوق کے بارے میں اپنے اختیارات سے کام لیتی ہے۔ ۱۹۳۱-۳۲ء تا ۱۹۳۲-۳۳ء میں مختلف صوبوں میں جنگلات کے رقبوں کی اضافی اہمیت کا اندازہ مندرجۂ ذیل جدول سے ہوتا ہے جس سے یہ بات صاف طور پر ثابت ہوتی ہے کہ برما اور آسام اس اعتبار سے اہم ترین بڑے صوبے ہیں۔

صوبہ	صوبے کے کل رقبے کے مقابلے میں جنگلات کا تناسب	صوبہ	صوبے کے کل رقبے کے مقابلے میں جنگلات کا تناسب
مدراس	۱۱٫۲	سی، پی و برار	۱۹٫۶
بمبئی	۱۲٫۰	آسام	۳۷،۵
بنگال	۱۴٫۰	شمال مغربی سرحدی صوبہ	۱٫۸
صوبۂ متحدہ	۴٫۹	برطانوی بلوچستان	۱٫۸
پنجاب	۵٫۴	اجمیر مرواڑا	۵۲۱
برما	۵۳٫۵	کرگ	۳۳٫۹
بہار و اڑیسہ	۳٫۶	انڈمان اور نکوبار	۶۹٫۶

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ بالعموم درختوں سے عاری ہوتی ہے شامل ہے۔ اس لحاظ سے مذکورۂ بالا اعداد و شمار ملک کے جنگلوں کے رقبے کی لازمی طور سے نمایندگی نہیں کرتے۔

باب ۲

ہندوستان کے بڑے جنگلات کے رقبے زیادہ تر پہاڑیوں میں واقع ہیں لیکن میدانوں میں بھی نخلستان اور بن موجود ہیں جن کے درمیان کہیں کہیں کاشت کی زمین ہوتی ہے۔ جیسا کہ مذکورہ بالا جدول سے ظاہر ہوتا ہے جنگل کی بین صوبہ جاتی تقسیم نمایاں طور پر بے قاعدہ ہے۔ علاوہ ازیں بیشتر حصہ بنجر زمین پر مشتمل ہے جو عام طور پر سب کاب درختوں سے عاری ہے۔ یہ دو خصوصیات زرعی آبادی کی کل ضرورتوں کو پورا کرنے کی مشکلات میں اضافہ کر دیتی ہیں۔

۲۳۔ جنگلات کے نظم و نسق کا مقصد۔

جنگلات کے انتظام کا مقصد یہ ہے کہ ان کی تباہی کی رفتار کو ان کی روئیدگی کی رفتار سے متجاوز نہ ہونے دیا جائے اور اس کے ساتھ ہی پیداآور صلاحیت کی اصلاح کی جائے۔ چنانچہ ان دونوں مقصدوں کی تکمیل میں حکومت بحیثیت مجموعی پوری طرح کامیاب رہی ہے۔ ہندوستان کے محکمۂ جنگلات کے وجود میں آنے کے بعد ابتدائی پچاس سال تک معاشیات جنگلات کی تحقیق کی امکانی قدر و قیمت کو تسلیم نہیں کیا گیا، اور تحقیق کو فروغ دینے کے لیے حکومت نے کسی قسم کی بھی تدابیر اختیار نہیں کیں۔ تاہم ۱۹۰۶ء میں بمقام ڈیرہ دون ایک فارسٹ ریسرچ انسٹیٹیوٹ[1] کا قیام عمل میں آیا؛ اور اس کے بعد سے ۱۹۱۸ء کے ہندوستانی صنعتی کمیشن کی سفارشوں کی بموجب اس انسٹیٹیوٹ میں کچھ سال ادھر بہت کچھ توسیع ہوئی ہے۔ اس کے نتیجے کے طور پر متعدد بیش بہا تحقیقاتی کام شروع کئے گئے ہیں اور سائنسی اور عملی معلومات میں مستقل ترقی ظاہر ہو رہی ہے جو آخرکار ہندوستانی جنگلات کی خام پیداوار کے بہتر اور زیادہ مکمل استفادہ کی جانب رہبری کرے گی۔[2] ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۲ء میں جنگلات سے چوبینہ اور جلانے کی لکڑی کی اوسط پیداوار ۳۰۵۹۱۱۵۲۸ مکعب فٹ تھی۔ گھٹیا پیداوار کی فروخت سے ۱،۱۳،۴۷،۲۹ روپیہ وصول ہوئے؛ اور سرکار کو ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۰ء کے دو کروڑ ۶۵ لاکھ روپیہ کے مقابلے میں

21

[1] Forest Research Insitute

[2] فارسٹ ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے کاروبار کی تفصیلات کے لیے دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ ہندوستان ۱۹۱۸ء تا ۱۹۲۰ء میں صفحہ ۱۲۱ تا صفحہ ۱۲۳؛ ہندوستان ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۰ء، صفحہ ۱۰ تا صفحہ ۱۵۰؛ ہندوستان ۱۹۲۲ء تا ۱۹۲۳ء میں صفحہ ۷۸ تا صفحہ ۸۰؛ اور ہندوستان ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء میں۔

ایک کروڑ ۶۹ لاکھ روپیہ خالص منافعہ وصول ہوا۔ آمدنی کی اس کمی کا باعث تجارتی کساد بازاری تھی۔ برما کے جنگل ہندوستانی جنگلات میں سب سے بڑے اور اہم ترین ہیں۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۹ء تا سنہ ۱۹۳۰ء میں ساگوان کی پیداوار ہی سے ایک کروڑ ۲۵ لاکھ روپیہ کی خالص آمدنی وصول ہوئی۔

۲۴۔ ہندوستانی جنگلات، اشیائے خام کی فراہمی کے اعتبار سے۔

ہندوستانی جنگلات مختلف صنعتوں کے لیے ضروری اشیائے خام فراہم کرکے اور اشخاص کی کثیر تعداد کے لیے روزگار پیدا کرکے بھی ایک اہم کام انجام دیتے ہیں۔ چنانچہ جنگل میں ایسی آبادی کثیر ہے جس کا ذریعہ معاش براہ راست جنگلات کی پیداوار ہے۔ علاوہ ازیں لکڑہاروں، آرہ کشوں، گاڑی بانوں، حمالوں اور چوکھٹا تیار کرنے والوں وغیرہ کی تعداد بھی خاصی بڑی ہے جو جنگلوں میں یا ان کے نزدیک کام کرتے ہیں۔ آخر میں وہ لوگ ہیں جو جنگلات کی پیداوار خام سے کام لینے میں مصروف ہیں، مثلاً نجار، چھپا بنانے والے، کشتی ساز، رسی بانٹنے والے، دباغت کرنے والے اور لاکھ بنانے والے وغیرہ۔

۲۵۔ جنگل کی پیداوار کبیر و صغیر

جنگل کی پیداوار کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ (۱) پیداوار کبیر یعنی چوبینہ اور جلانے کی لکڑی؛ اور (۲) پیداوار صغیر، جس میں دوسری تمام پیداوار شامل ہے، مثلاً لاکھ، اشیائے دباغی، چپلیں، تارپین اور رال۔ ہندوستانی جنگلات کی پیداوار صغیر کی اہمیت روز افزوں ہے اور ان میں سے اکثروں کی مانگ دنیا کے بازاروں میں مستقل ہوگئی ہے۔ یوں تو کلکتے کے کاغذ سازی کے کارخانوں میں سبائی[1] اور جانجر جیسی گھاس استعمال کی جارہی ہے لیکن تحقیقات کے اہم نتائج میں سے ایک یہ ثابت کرنا رہا ہے کہ کاغذ کے گودے کی تیاری کے لیے ان گھاسوں کے علاوہ بانس بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ہمارے یہاں بانس اور سوئنا کے وسیع جنگل موجود ہیں اور ان کی موجودگی میں ہم یہ توقع کرسکتے ہیں کہ آخرکار کل مطلوبہ کاغذ ملک ہی کے اندر تیار کرلیں گے۔

---

[1] (Sabai)

[2] (Bhabar)

[3] (Savanna)

باب ۲

ان امکانات کا لحاظ کرتے ہوئے حکومت نے "ٹیرف بورڈ کی سفارشوں کے مطابق" کاغذ سازی کے لیے ہندوستانی بانس کے گودے کی صنعت کو حال میں تامین دی ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے زرعی کمیشن نے یہ سفارش کی ہے کہ ہر صوبے میں جنگلات سے استفادہ کرنے کے لیے ایک افسر کا تقرر کیا جائے تاکہ جنگل کے صنائع کی نشو و نما ایک افسر کی معین اور مخصوص ذمہ داری بن جائے[1]

22

۲۶ - ہندوستانی جنگلات کے امکانات

جنگ کے زمانے میں عراق وغیرہ میں برسرپیکار برطانوی فوجوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ہندوستان کو اپنے ہی ذرائع پر انحصار کرنا پڑا، اور اس کام کو انجام دینے کے لیے جو خاص تدبیریں کافی وسیع پیمانے پر اختیار کی گئیں انھوں نے ہندوستانی جنگلات کے عظیم پوشیدہ امکانات کو نمایاں طریقے پر واضح و ثابت کر دکھایا، اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ جنگلات سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے ایک نئے دور کا افتتاح کیا، چنانچہ یہ توقع پورے اعتماد کے ساتھ کی جا سکتی ہے کہ جنگلات پر منحصر صنائع کو مستقبل قریب میں وسیع اور مستقل ترقی ہوگی[2]

۲۷ - ارضیاتی ترکیب

ملک کی ارضیاتی ترکیب کی مساحت میں، زمین کی بالائی سطح اور سطح کے نیچے کے حصے کا بیان شامل ہوگا۔ اول ہم بالائی سطح سے بحث کریں گے، اور ان وسیع فرقوں کو ظاہر کریں گے جو تین بڑی ارضی ترکیبوں سے پیدا شدہ اہم قسموں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ (۱) نرم دریائی مٹی کے خطے بہت وسیع، اور زرعی لحاظ سے اہم ترین ہیں۔ یہ سندھ، گجرات، راجپوتانہ، پنجاب، صوبۂ متحدہ اور بنگال کے بڑے حصے میں؛ اور مدراس کے بعض علاقوں مثلاً کرشنا گوداوری

[1] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ پیراگراف ۲۲۴

[2] حسب ذیل سے مقابلہ کیا جائے:- (۱) انڈین ایر بک شائع شدہ ۱۹۳۵ء؛ (۲) ان سائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں مضمون بعنوان جنگلات اور ہندوستانی جنگلات؛ (۳) صنعتی کمیشن کی رپورٹ فقرہ ۱۶ تا ۲۰؛ اور (۴) ایک رپورٹ موسوم بہ (Work of the Forest department in India) زیر ترتیب آر ایس ٹروپ شائع شدہ ۱۹۱۶ء ص۴ تا ص۶۔

باب ۲

اور تنجور کے اضلاع میں پائے جاتے ہیں۔ نرم مٹی کا خطہ جو کہیں بڑا اور کہیں چھوٹا ہے جزیرہ نما کے مغربی و مشرقی ساحلوں کے برابر پھیلا ہوا ہے اور جزیرہ نما کے بڑے دریاؤں کے دہانے پر ڈیلٹا کے آس پاس اکثر مقامات میں کشادہ ہو جاتا ہے۔ ان نرم دریائی مٹی کے خطوں پر بارش معتدل ہوتی ہے اور اس کی تقسیم ہر جگہ مساوی ہے۔ یہ بات خاص کر ان خطوں پر صادق آتی ہے جو دریائے گنگا و سندھ کے میدانوں میں واقع ہیں۔ یہاں کی مٹی مسام دار ہوتی ہے اس کو آسانی کے ساتھ بوتا جاسکتا ہے اور اس میں قدرتاً کیمیائی و نامیاتی اجزا کی کافی مقدار میں آمیزش ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ سب خطے خریف و ربیع کی اکثر فصلوں میں قابل کاشت ہوتے ہیں۔ (۲) دکنی ٹریپ (سنگریزہ زمین) میں احاطۂ بمبئی کا کل علاقہ برار، صوبۂ متوسط کا مغربی ایک ثلث حصہ اور حیدر آباد دکن کا مغربی علاقہ شامل ہے۔ اس کل رقبے کی زمین بہ لحاظ زرعیت و زرخیزی مختلف قسم کی ہے۔ دکنی ٹریپ میں اصلی سیاہ ریگڑ کی زمین واقع ہے جس کی سطح ناہموار اور ڈھلوان ہے اور پہاڑیوں کے دامن کی عام سطح سے پست ہے۔ محل وقوع کے لحاظ سے اس کی گہرائی میں کمی بیشی پائی جاتی ہے اور عمق جہاں زیادہ ہے تو اس کا باعث یہ ہے کہ نرم دریائی مٹی تہ بہ تہ جم گئی ہے۔ اور بعض مقامات مثلاً تپتی اور نربدا کی وادیوں وغیرہ میں بہت زیادہ گہرائی کے باعث شدید بارش میں یہ خطے بے کار ہو جاتے ہیں اور فصل ربیع میں گیہوں، السی اور چنے کی کاشت کے لیے زیادہ موزوں ہوتے ہیں۔ دکنی ٹریپ کی سیاہ ریگڑ کی زمین میں موسم خریف میں زیادہ تر روئی اور جوار بوئے جاتے ہیں۔ ریگڑ کی گہرائی بالعموم تین چار فٹ ہوتی ہے اور اس میں چونے کا کنکر اور روڑہ ملا ہوا ہوتا ہے۔ سطح کے نیچے کی زمین میں چونے کی اچھی خاصی مقدار ہوتی ہے اور مٹی طبق در طبق جمی ہوئی ہوتی ہے اس لیے پانی بہ کر نیچے کے پتھریلے حصے میں چلا جاتا ہے۔ (۳) بقیہ زمینوں کو "قلم نما خطے" (crystalline tracts) کہا جاتا ہے اور تقریباً کل مدراس، میسور، بمبئی کا جنوبی مشرقی علاقہ، حیدر آباد کا مشرقی نصف حصہ اور صوبۂ متوسط کا دو ثلث علاقہ اس خطے پر مشتمل ہے۔ گو بحیثیت مجموعی کیمیائی اجزا کی قلت ہے اور فصلیں بہت ناقص تیار ہوتی ہیں پھر بھی مٹی کی بعض قسمیں مثلاً سرخ چکنی مٹی یا بھورے رنگ کی چکنی مٹی کے خطے اور مدراس و میسور کی چکنی مٹی کے پنڈول بہت زرخیز ہیں۔ متوسط درجے کی زرخیزی والی زمینیں بھی بہت مختلف زرعیت کی پائی جاتی ہیں اور مناسب یا اچھی گہرائی کی زمین میں فائدے کے ساتھ آب پاشی کی جاسکتی ہے اور اس سے چاول خاص فصل کے طور پر

باب ۲

اگایا جاسکتا ہے کیونکہ یہاں نہروں کے ذریعے سے آب پاشی ممکن ہے اور دوسری قیمتی فصلیں تالابوں اور کنووں کے ذریعے سے پیدا کی جاسکتی ہیں ۔ اس ساخت کی سُرخ اور بھورے رنگ کی یا زرد اور سُرخ رنگ کی زمینیں بڑگام دھاڑ واڑ وغیرہ میں پائی جاتی ہیں اور میووں کے درختوں کے لیے اور سب سے زیادہ آم کے لیے خاص طور سے موزوں ہیں ۔

۲۸ ۔ معدنی پیداوار

۱۹۱۸ء میں صنعتی کمیشن نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ہندوستان کی معدنی دولت اس کی اکثر کلیدی صنعتوں کو برقرار رکھنے کے لیے کافی ہے بجز ان صنعتوں کے جن میں ونیاڈیم (Vanadium) نکل اور مولب ڈینیم (Molybdenum) کی ضرورت ہو ۔ لیکن یہ خیال ایک مدت دراز تک عام تھا کہ یہ دولت عام طور پر اتنی قلیل تھی کہ وہ جدید ترین پیمانے پر منفعت کے ساتھ نہیں نکالی جاسکتی ۔ انیسویں صدی کے آٹھویں عشرے کی ابتدا تک ہندوستانی معدنیات کو ترقی دینے کے سلسلے میں کوئی تجربے عمل میں نہیں لائے گئے تھے اور اسی لیے ہندوستان کے معدنی امکانات کے بارے میں کوئی معتبر و صائب رائے قائم کرنا ممکن نہ تھا ۔ لیکن بعد کی تحقیقات نے مختلف قسموں کی معدنی دولت کے انکشاف اور برآمد کی جانب رہبری کی ہے چنانچہ اب ہم وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ گو ہندوستان کے معدنی ذرائع کو غیر محدود یا بے نظیر نہیں کہا جاسکتا پھر بھی وہ کسی طرح نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہیں اور ملک میں ان کی بنیاد پر متعدد نظر آتی صنائع کا قیام عمل میں آسکتا ہے ۔ جدید نقل و حمل کے نظام کی توسیع ، بنک کاری کی ترقی اور ملک میں صنعتوں کے روز افزوں قیام و فروغ کی بدولت کان کنی کے کاروبار میں روز بروز زیادہ ترقی ہو رہی ہے ۔ جنگ عظیم نے متعدد معدنیات کی پیدائش کے حق میں محرک کا کام کیا اور اگرچہ اس وقت جو ترقی کی گئی تھی وہ پوری طرح برقرار نہیں رکھی گئی ہے پھر بھی ملک کو دیرپا فوائد حاصل ہوئے ہیں اور جنگ سے پیشتر معدنی پیدائش کی جو حالت تھی اس کے مقابلے میں اب نمایاں طور سے زیادہ موافق معلوم ہوتی ہے ۔

مندرجۂ ذیل جدول[1] سے ۱۹۱۲ء اور ۱۹۳۱ء کی بابتہ ہندوستان کی خاص معدنی پیداوار کا

---

[1] یہ جدول ایک رپورٹ موسوم بہ (Statistical Abstract for British India) بابت سنہ ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۵ء اور ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۲ء سے مرتب کی گئی ہے ۔

سرسری اندازہ ہوگا۔ اس میں ہندوستانی ریاستیں بھی شامل ہیں۔

معدنی پیداوار کا نام	۱۹۱۴		۱۹۲۱	
	مقدار	قیمت (روپیہ)	مقدار	قیمت (روپیہ)
کوئلہ (ٹن)	۱۶,۴۹۳,۲۶۳	۵,۸۶,۱۰,۹۹۵	۲۱,۷۱۶,۴۲۵	۵,۲۶,۹۸,۳۶۴
نمک (ٹن)	۱,۴۳۸,۲۲۵	۷۲,۴۹,۳۴۷	۱,۸۳۹,۴۰۰	۱,۳۹,۳۰,۹۵۹
سونا (اونس)	۵۹۶,۳۸۸	۲,۳۰,۷۵,۴۳۰	۴۳۰,۳۸۸	۱,۶۰,۸۰,۹۴۳
پٹرولیم (گیلن)	۲۵۹,۳۴۲,۷۱۰	۱,۴۹,۰۵,۸۹۲	۳۰۵,۳۱۸,۷۵۱	۵,۹۱,۴۵,۲۵۰
شورا (ہنڈرڈ ویٹ)	۳۱۶,۲۱۱	۴۲,۰۱,۴۷۶	۱۲۳۱۱۷ [1]	۹۹۱۰۸۷
کرومائٹ (Chromite) ٹن	۵,۸۸۸	۳۹,۱۶۰	۱۹,۹۱۳	۲۱۵۰۲۶
مس خام (ٹن)	۵,۳۴۴	۱,۰۹,۴۱۰	۱۹۷۰۴۳	۵۴۹۵۹۴۳
ہیرا (قیرٹ)	۵۵	۱۱,۸۹۶	۹۳۹	۴۴۶۸۳

[1] یہ برآمد کے اعداد وشمار ہیں جو تقریباً کل پیداوار پر مشتمل ہیں۔

باب ۲

خام لوہا (ٹن)	۴۴۱۵۵۴	۵۴۴۷۴۰	۱۶۲۴۸۰۳	۴۱۵۸۷۳۷
سنگ یشب Jade Stone [1] (ہنڈرڈ ویٹ)	۴۹۷۱	۱۰۵۷۷۱	۲۵۵۱	۲۵۲۲۶۴
سیسہ (ٹن)	۱۰۵۴۸	۳۰۴۴۱۸۵	۷۴۷۸۵	۱۲۸۸۸۲۷۰
مگنی سائٹ Magnesite (ٹن)	۱۶۸۰	۸۳۵۳	۵۳۳۳	۲۷۳۴۸
خام منگنیز Manganese (ٹن)	۶۸۲۸۹۸	۱۲۱۵۸۹۶۵	۵۳۷۸۴۴	۹۸۱۳۸۷۹
ابرق (ہنڈرڈ ویٹ)	۴۰۵۰۶	۱۳۲۱۳۵۱	۳۸۹۶۳	۲۰۳۷۶۳۳
مونازائٹ Monazite (ٹن)	۱۱۸۶	۶۲۱۱۶۵	۹۰	۱۲۰۱۵
پلے ٹی نم (اونس)	۳۷	۳۱۹۵	—	—
یاقوت برما (قیراط)	۳۰۴۸۷۲	۶۴۶۹۸۸	—[2]	۴۲۸۶۳
چاندی (اونس)	۲۳۶۴۴۶	۴۰۳۴۶۰	۵٫۹۲۳٫۰۰۵	۵۲۲۹۲۳۳
خام ٹن (ہنڈرڈ ویٹ)	۵۳۹۵	۲۲۹۷۷۴	۸۵۱۰۴	۳۵۰۷۳۸۰

[1] برآمد بذریعہ بر و بحر

[2] اعداد دستیاب نہیں ہوئے۔

ولفرام (ٹن) Tungsten ore (ٹنگسٹن خام)	۲۳۲۶	۲۶۷۸۱۵۲	۲۲۴۸	۸۸۱۶۶۵
جست خام (ٹن)	۸۵۵۳	۱۶۱۴۳۰	۸۵۵	۱۰۷۸۵۵[۱]

سنہ ۱۹۳۲ء اور سنہ ۱۹۳۳ء کے دو سالوں میں جتنی معدنی پیداواروں کے اعداد دستیاب ہوئے ان کی کل قیمت علی الترتیب ۲۰٫۲۶ کروڑ روپیہ اور ۲۱٫۱۰ کروڑ روپیہ تھی۔ سنہ ۱۹۳۴ء میں اس میں مزید اضافہ ظاہر ہوا اور وہ ۲۲٫۵۴ کروڑ روپیہ ہوگئی۔ اس کو گزشتہ چھ سال کی سخت تجارتی کساد بازار کے بعد ایک حد تک ملک کی معاشی بحالی کی علامت خیال کیا جا سکتا ہے۔

اب ہم اہم ترین معدنی پیداواروں میں سے بعض کا مختصر حال بیان کریں گے جن کا استحصال ہندوستان میں تجارتی بنیاد پر کیا جاتا ہے[۲]:۔

۲۹۔ کوئلہ

ہندوستان میں کوئلے کے کاروبار کے پھلنے پھولنے کا باعث ملک کی ریلوں کی تعمیر ہے؛ چنانچہ ریلوں نے فوراً کثیر طلب پیدا کی اور گزشتہ صدی کے نصف دوم میں ہندوستان کے کوئلے کی کانوں کے کھولنے کی جانب رہبری کی۔ ایسٹ انڈین ریلوے کمپنی نے گراں برطانوی کوئلہ درآمد کرنے کے بجائے کوئلے کی ارزاں اور قریب تر رسد مقامی طور پر حاصل کرنے کی

۱ ہر قسم کی جست کی برآمد بذریعہ بحر۔

۲ معدنی پیداوار کی تفصیل مرتب کرنے میں حسب ذیل مآخذ سے مواد اخذ کیا گیا ہے۔

(۱) کاٹن کی کتاب موسوم بہ (Hand Book of Commercial Information for India) دوسرا ایڈیشن۔ (۲) جے سی براؤن کی تصنیف موسوم بہ (India's mineral wealth) (۳) (Report) (of the Geological Survey of India) شائع شدہ سنہ ۱۹۳۴ء۔ (۴) (Annual Report) (of the Chief Inspector of Mines in India) شائع شدہ سنہ ۱۹۳۴ء (۵) (Statistical) (Abstract for British India) اور (۶) (Indian year book) شائع شدہ سنہ ۱۹۳۵ء

باب ۲

جستجو شروع کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کوئلے کے کاروبار کی ترقی کا راستہ کھل گیا اور متعدد مشترک سرمایہ کی کمپنیاں جو زیادہ تر یورپ والوں کی ملکیت و نگرانی میں تھیں قائم ہو گئیں۔ چنانچہ ۱۸۸۰ء اور ۱۹۱۰ء کے مابین کوئلے کی پیداوار ۱٫۰۲ ملین ٹن سے بڑھ کر ۱۲٫۶ ملین ٹن ہو گئی[1]۔ یہی نہیں کہ اس کوئلے کو بنگال میں اجارہ حاصل ہو گیا بلکہ بعض مشرقی بازاروں مثلاً کولمبو، برطانوی ملایا اور جزائر شرق الہند میں بھی یہیں سے کوئلہ جانے لگا۔ اندرون ملک اس کا صرف بڑھ جانے کی وجہ سے جنگ سے پیشتر کے پانچ سال میں سالانہ اوسط پیداوار بڑھ کر ۱۴ ملین ٹن ہو گئی۔ اسی زمانے میں درآمد کی اوسط مقدار جس میں زیادہ تر برطانوی کوئلہ تھا ۵۰۰۰۰۰ ٹن تھی اور برآمد کا اوسط تھا ۱۰۵۰۰۰۰ ٹن رہی۔ مملکت متحدہ کو مستثنیٰ کر کے سلطنت برطانیہ کے کسی دوسرے علاقے کے مقابلے میں ہندوستان سب سے زیادہ کوئلہ پیدا کرتا ہے۔ ہندوستانی کوئلے کی پیداوار کا بیشتر حصہ بنگال، بہار و اڑیسہ (گونڈوانہ کی کانوں) سے نکلتا ہے۔ ان صوبوں کے علاوہ اہم ترین کانیں حیدرآباد دکن (سنگاریٹی) اور ساستی اور صوبہ متوسط، برما، آسام، پنجاب اور بلوچستان میں واقع ہیں۔ ہندوستان کی مجموعی کوئلے کی رسد میں راجپوتانہ، بیکانیر اور وسطی ہند کا بھی حصہ ہے۔ اس طرح کوئلے کی تقسیم ہندوستان میں بہت ناہموار اور غیر مساوی ہے، اور جزیرہ نما میں اس کی کمی سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ چنانچہ مدراس میں کوئلے کی رسد کی عدم موجودگی اور اسی کے ساتھ ریلوں کی نقل و حمل کے اعلیٰ مصارف، مدراس پریسیڈنسی میں خام لوہے کے کامیاب استعمال میں بہت بڑی رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ بمبئی میں بھی مقامی طور پر کوئلے کی رسد دستیاب نہ ہو سکنے کے باعث اس قسم کی دقتوں کو برقابی قوت کے استعمال اور جنوبی افریقہ کے کوئلے کی درآمد کے ذریعے سے رفع کرنا پڑا۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ ہندوستانی کوئلہ بیرونی کوئلے کے مقابلے میں خراب قسم کا ہوتا ہے۔ عمدہ فلزاتی کوک کی پیداوار کی حد تک صرف بنگالی کوئلہ بیرونی کوئلے کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

زمانۂ جنگ عظیم اور زمانۂ بعد از جنگ کے ابتدائی حصے میں خاصکر ۱۹۱۶ء تا ۱۹۲۱ء کے سالوں میں اس صنعت میں بہت نمایاں توسیع و ترقی ہوئی۔ باربرداری کے جہازوں کی قلت کی بنا پر برطانوی رسد کا رک جانا، کوئلے کی قیمتوں کا اضافہ، حکومت ہند کی جانب سے

[1] دیکھو ویرا آنسٹے کی کتاب بحر ہند کی تجارت (The Trade of the Indian Ocean) ۱۹۲۹ء صفحہ ۱۸۶

باب ۲ 28

اپریل سنہ ۱۹۲۱ء تک کوئلے کی مانگ اور زمانۂ بعد از جنگ میں صنعتی گرم بازاری کے دور میں اندرون ملک کوئلے کے صرف میں اضافہ' یہی ان عاملین میں سے چند عامل تھے جنھوں نے اس صنعت کی ترقی کے حق میں محرک کا کام کیا۔ اس کے برخلاف رکاوٹ پیدا کرنے والے عامل صرف یہ تھے :۔ (۱) کوئلے کی نقل و حمل کے لیے واگنوں کی قلت' اور (۲) کان کنی کے لیے مزدوروں کی رسد کی کمی[۱]۔ اس اثنا میں جنوبی افریقہ سے مشرقی بازاروں کو بہ شمول ہندوستان کوئلے کی برآمد تیزی کے ساتھ ترقی کر رہی تھی' جس کا باعث ایک تو یہ تھا کہ جنوبی افریقہ کی حکومت برآمد کی فراخدلی کے ساتھ مالی مدد کر رہی تھی' دوسرے یہ کہ مشرقی بازاروں اور ہندوستان میں برطانوی کوئلے کی درآمد رک گئی تھی' اور تیسرے یہ کہ ہندوستان میں کوئلے کی رسد کی قلت تھی اور ریلوں میں مانگ زیادہ تھی۔ چنانچہ اسی روز افزوں ضرورت کے مدنظر ہندوستان سے کوئلے کی برآمد پر قیود عائد کی گئی تھیں۔ ان مشکلات کے راستے سے ہٹ جانے کے بعد بھی ہندوستانی کوئلے کی بیرونی فروخت کی مقدار سابق کے ایک جزو سے زیادہ دوبارہ نہ ہو سکی' اور دوسری جانب ملکی بازار میں اس کو روز افزوں مسابقت سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن چونکہ گزشتہ چند سالوں سے جنوبی افریقہ کی تجارت کا توازن بدل گیا ہے اور کوئلے کی نقل و حمل روڈ ہ یا گنٹی کی شرح سے اب بآسانی ممکن نہیں رہی ہے اس لیے جنوبی افریقہ کا کوئلہ مشرقی بازاروں میں سابقہ سہولتوں سے بتدریج محروم ہوتا جا رہا ہے[۲]۔ کوئلے اور کوک کی تجارت درآمد و برآمد کی تبدیلیاں مندرجۂ ذیل جدول سے واضح ہوتی ہیں :۔

	قبل جنگ اوسط	زمانۂ جنگ کا اوسط	مابعد جنگ اوسط	سنہ ۱۹۲۶ء تا سنہ ۱۹۲۷ء	سنہ ۱۹۳۰ء تا سنہ ۱۹۳۱ء	سنہ ۱۹۳۴ء تا سنہ ۱۹۳۵ء
درآمد						
مقدار (ایک ہزار ٹن میں)	۴۵۵	۱۳۳	۹۳۰	۱۵۵	۱۷۹	۷۱
قیمت (ایک ہزار روپیہ میں)	۸۰۸۹	۳۰۴۱	۳۰۴۱	۳۵۶۹	۴۴۶۹	۱۲۵۰

[۱] دیکھو ٹیرف بورڈ کی رپورٹ (کوئلے کے کاروبار کے بارے میں) شائع شدہ سنہ ۱۹۲۶ء پیراگراف (۱۱)۔
[۲] دیکھو انسٹے کی کتاب محولۂ سابق صفحہ ۵۵

ب

برآمد						
مقدار (ایک ہزار ٹن)	۸۲۵	۵۲۶	۴۳۴	۶۴۵	۴۲۰	۳۱۱
قیمت (ایک ہزار روپیہ)	۷۵۷۷	۴۸۴۶	۵۷۴۴	۸۱۳۴	۷۹۳۵	۲۹۲۲[۱]

زمانۂ جنگ عظیم و بعد از جنگ میں کوئلے کے کاروبار کی ترقی کا اندازہ اس واقعے سے ہو سکتا ہے کہ ۱۹۱۵ء میں ہندوستان میں کوئلے کی مجموعی پیداوار ۱۷،۱۰۳،۹۳۲ ٹن تھی جس کی قیمت ۵،۹۹،۰۱۰،۹۸۵ روپیہ وصول ہوئی؛ اس کے برخلاف ۱۹۳۰ء میں اس کی مقدار بڑھ کر ۲۳،۸۰۳،۰۴۸ ٹن اور قیمت ۳،۳۲،۵۲،۶۶۲،۹ روپیہ ہو گئی۔ ۱۹۳۲ء میں مقدار گھٹ کر ۱۹۷۸۹،۱۶۳ ٹن اور قیمت ۲،۳۰،۸۰،۹۸،۱۱۰،۹ روپیہ ہو گئی۔ اس طرح اب تک پیداوار کی سب سے بڑی مقدار یعنی ۲۳،۸۰۳،۰۴۸ ٹن ۱۹۳۰ء میں حاصل ہوئی۔ ۱۹۳۴ء میں کوئلے کی پیداوار میں پھر کچھ اضافہ ہوا؛ چنانچہ مقدار ۲۲ ملین ٹن اور قیمت ۶۲۰ لاکھ تھی۔ گویا ۱۹۳۴ء میں مقدار کے ۴۱ فیصد اضافے کے ساتھ مجموعی قیمت میں صرف ۱۳ فیصد اضافہ ہوا۔ سال مؤخر الذکر میں بہار و اڑیسہ سے ۱۱،۲۵۷،۹۰۴ ٹن اور بنگال سے ۵،۹۹۱،۱۸۹ ٹن کوئلہ نکلا۔ ٹیرف بورڈ نے اندازہ لگایا تھا کہ کوئلے کا ناپ اندرونی صرف ۱۹۲۵ء میں ۲۰،۴ ملین ٹن تھا؛ اور اندرونی طلب کو پورا کرنے میں کل رسد میں ہندوستان کا حصہ ۵،۷،۹ ملین ٹن تھا۔ کوئلے کے اندرونی صرف کی مقدار ۱۹۱۱ء کے ۸،۹ ملین ٹن سے ۱۹۲۵ء کے ۲۰،۴ ملین ٹن تک بڑھ جانے کا باعث یہ تھا کہ ریلوں میں اس کی طلب بڑھ گئی تھی؛ چنانچہ کوئلہ ریلوں ہی میں انفرادی طور سے سب سے زیادہ مقدار میں صرف ہوتا تھا؛ اور ریلوں کے علاوہ لوہے اور فولاد کی روز افزوں ترقی پذیر صنعت میں اور دوسری صنعتوں میں بھی کوئلے کی مانگ بڑھ گئی تھی۔ گو برقی قوت کی رسد اور روغنی ایندھن کا استعمال ہندوستان میں بڑھ رہا ہے اس کے باوجود کوئلہ حسب سابق بکثرت استعمال ہوتا ہے؛ اور ممکن ہے کہ آیندہ بھی اس کا استعمال بہت زیادہ وسیع پیمانے پر ہو۔ اس لیے کہ جیسا کہ درآمد و برآمد اور اندرونی صرف کے

۱ برآمد کی تخفیف کسی حد تک خراب تجارتی حالات کا نتیجہ خیال کی جا سکتی ہے۔ نیٹال اور جاپانی کوئلہ ہندوستانی کوئلے کے بڑے بازاروں مثلاً سیلون، ہانگ کانگ، اسٹریٹس سٹلمنٹس، چین اور سیام میں ہندوستانی کوئلے کی جگہ لے رہا ہے۔

باب ۲

اعداد و شمار سے ظاہر ہوگا، کوئلے کے کاروبار کو سب سے زیادہ تقویت پہنچانے والی شے خود ملک کے اندر کوئلے کا روز افزوں وسیع بازار ہے۔

جنوبی افریقہ کے کوئلے کی درآمد بہت کچھ بے اطمینانی کا سبب رہی ہے، چنانچہ مارچ ۱۹۲۴ء میں مجلس قانون ساز نے ایک قرارداد منظور کی جس کی رو سے یہ سفارش کی گئی کہ ہندوستانی کوئلے کی تامین کی غرض سے جنوبی افریقہ کے کوئلے پر محصول درآمد عائد کیا جائے۔ اس کے نتیجے کے طور پر ہندوستانی کوئلے کی کمیٹی (انڈین کول کمیٹی) کا تقرر عمل میں آیا تاکہ ہندوستانی کوئلے کو بیرونی مسابقت سے محفوظ کرنے کے مسئلے کو ٹیرف بورڈ میں پیش کرنے سے پیشتر صورت حالات کے فنی پہلوؤں پر غور و خوض اور ان کی تحقیق کر لی جائے[1] اس کمیٹی نے ہندوستانی کوئلے کے کاروبار کو تقویت پہنچانے اور خاصکر کلکتے سے ہندوستانی اور غیر ملکی بندرگاہوں کو کوئلے کی برآمد کو ترقی دینے کے مد نظر متعدد سفارشیں پیش کیں۔ کمیٹی مذکور نے یہ محسوس کیا کہ خوبی اور قیمت کا مسئلہ اہم ترین مسئلہ تھا۔ کمیٹی نے سفارش کی کہ خوبی کا اطمینان کرنے کی غرض سے کوئلے کی درجہ بندی کی ایک مجلس (کول گریڈنگ بورڈ)[2] قائم کی جائے تاکہ متعلقہ کوئلے کی خوبی کی ضمانت کے طور پر اس مجلس کے جاری کردہ صداقت نامے تسلیم کیے جا سکیں۔ اس سفارش کو حکومت نے منظور کر لیا۔ چنانچہ کول گریڈنگ ایکٹ بابت ۱۹۲۵ء کی شکل میں ضروری قانون وضع کیا گیا، اور اس کی رو سے ۲۰ جنوری ۱۹۲۶ء کو ایک باقاعدہ مجلس مرتب و قائم کی گئی۔ کمیٹی نے یہ بھی سفارش کی کہ صداقت نامہ قابل برآمد مصدقہ کوئلہ کلکتے روانہ کیا جائے اس کے نقل و حمل کے مصارف میں تخفیف کی جائے یعنی ریلوں کے کرایے میں $\frac{1}{2}$ ۳۷ فیصد رعایتی منہائی اور دریائی کرایوں میں بحساب ۴ آنہ فی ٹن منہائی کی جائے۔ ان سفارشوں کو متعلقہ ریلوے کمپنیوں اور بندرگاہ کے محکموں نے منظور کر لیا ہے۔

جیسا کہ حال میں شایع شدہ رپورٹ موسومہ Trade Review بابت ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء میں بتلایا گیا ہے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گو سنہ ۱۹۲۳ء تا سنہ ۱۹۳۰ء میں صنعتی ترقی کم و بیش عام طور پر برقرار رہی لیکن اس کے باوجود کوئلے کے کاروبار کے حالات میں زیادہ اصلاح و ترقی نہیں ہوئی۔ اس اساسی صنعت کی افسوسناک حالت کا باعث یہ واقعہ رہا ہے کہ فوری پیدا آور قابلیت کے مقابلے میں

[1] کوئلے کے کاروبار کو تامین دینے کے مسئلے پر جلد دوم باب فصل ۲۱ میں بحث کی گئی ہے۔

[2] Coal Grading Board

28

باب ۱

طلب میں کمی ہوگئی اور اس کی وجہ سے قیمتیں بڑی حد تک گھٹ گئیں۔ کوئلے کے کاروبار کی اس تجویز کو کہ کوئلے کی پیداوار پر روک قائم کرنی چاہیے حکومت نے منظور نہیں کیا لیکن کوئلے کی طلب کو بڑھانے اور اس کاروبار کی بحالی میں عام طور سے مدد دینے کے لیے کوئلے کی بار برداری بذریعۂ ریل کے زائد کرایے میں یکم اپریل ۱۹۱۸ء سے کمی کر دی گئی ہے۔ اس سلسلے میں جنوبی افریقہ کے کوئلے کی درآمد پر محصول متوازن عائد کرنے کی موافقت میں اسوشئیٹڈ چیمبرز آف کامرس کی جانب سے حال (۱۹۲۵ء) میں پیش کی ہوئی پرزور دلیل بھی قابل ذکر ہے۔ اسوشئیٹڈ چیمبرس آف کامرس (متحدہ ایوان ہائے تجارت) نے ہندوستان سے کوئلہ کی برآمد کے لیے ریلوں کے کرایے میں خاص طور پر منہائی کرنے کی بھی تائید کی۔ اسی کے ساتھ سر لوئی فرمر ناظم ارضی مساحت ہند کی حال میں شایع کردہ سرکاری اطلاع میں آیندہ دو سو سال کے اندر ہندوستان کے عمدہ کوئلے کے کامل طور سے ختم ہو جانے کے امکان کے متعلق جو انتباہ ہے اس کے مدنظر ہندوستانی کوئلے کے ذرایع کی حفاظت کی تدبیریں نکالنا ضروری ہے۔

۴۰ - لوہا

آہنی فلزیات کی معلومات بہت قدیم ہیں اور یورپ سے کوئلے کی درآمد کی مسابقت شروع ہونے سے پیشتر دیسی آہنی صنعت سرسبزی کی حالت میں تھی اور ملک کے تمام حصوں میں پھیلی ہوئی تھی۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ لوہے کی مصنوعات تیار کرنے کے جدید طریقے بڑے پیمانے پر ۱۸۷۵ء سے استعمال کیے جانے لگے؛ چنانچہ باراکار آئرن ورکس[۱] کا کام اسی سال سے شروع ہوا اس کارخانے کا نام بعد میں بنگال آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی ہو گیا اور یہ موجودہ بنگال آئرن کمپنی کا پیش خیمہ تھا۔ ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی کا افتتاح ۱۹۱۱ء میں بہار و اوڑیسہ میں بمقام ساکچی عمل میں آیا۔ ہندوستانی فولاد تیار کرنے کا کارخانہ تقریباً ۱۹۱۳ء کے ختم پر کامیابی کے ساتھ قائم ہوا اور بہار و اوڑیسہ کی کوئلے اور لوہے کی معدنوں کے قرب سے اس کو سہولت حاصل رہی۔ لوہے اور فولاد کی صنعت کی مزید ترقیوں کی بحث کے لیے مناسب مقام وہ باب ہے جس میں ہندوستانی صنعتوں پر بحث کی گئی ہے۔

[۱] Barakar Iron Works.

باب ۲
29

ہندوستان میں خام لوہے کی پیدائش کی ترقی مندرجۂ ذیل اعداد سے ظاہر ہوتی ہے:-

۱۹۱۴		۱۹۲۱		۱۹۲۰[1]		۱۹۲۲	
مقدار (ٹن)	قیمت (روپیہ)	مقدار (ٹن)	قیمت (روپیہ)	مقدار (ٹن)	قیمت (روپیہ)	مقدار (ٹن)	قیمت (روپیہ)
۳۳۱۵۶۳	۵۳۳۳۳	۹۳۳۰۸۳	۲۱۰۸۳۳۵	۱۳۳۹۶۲۵	۳۸۲۳۵۳	۱۱۲۳۸۶۲۵	۳۳۹۶۷۹۱۳

غالباً اہم ترین لوہے کی کانیں وہ ہیں جو سنگ بھوم میں' اور کیونجھار' بونائی اور مایور بھانج کی اوڑیسائی ریاستوں میں واقع ہیں جہاں حال کی انکشافات سے پتا چلا ہے کہ تقریباً مسلسل طور سے ۴۰ میل تک خام لوہے کا زنجیرہ پھیلا ہوا ہے"۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مقام پر جہاں اس خام لوہے کے زنجیرے کو ایک پہاڑی دریا کاٹتا ہوا گیا ہے اعلیٰ درجے کا ہیماٹائٹ پایا جاتا ہے جس کی مسلسل موٹائی ۷۰۰ فٹ ہے اور جس میں ۶۰ فیصد سے زائد خالص لوہا ہے؛ اور اندازہ کیا گیا ہے کہ اس زنجیرے میں ۲ر۸۰۰ر۰۰۰ر۰۰۰ ٹن خام لوہے سے کم نہیں ہے۔ ریاست میسور میں بھی خام لوہے کی تہیں پائی جاتی ہیں جن کو آہنی کارخانہ واقع بھدراوتی نکال رہا ہے۔ ایسے آہنی معادن سے جب مرور زمانہ کے ساتھ لوہا برآمد ہونے لگے گا تو لوہے کی بیرونی رسد پر ہندوستان کا انحصار انجام کار ختم ہو جائے گا۔

۲۱ - منگنیز

یہ ایک بہت ہی قیمتی صنعتی معدنی پیداوار ہے۔ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اس دنیا کے خام منگنیز کی پیداوار کا کم از کم ۹۰ فیصد جزو فولاد تیار کرنے کے "بسی مر" اور کھلے چولھے کے طریقوں کے لیے درکار ہوتا ہے۔ منگنیز' بھاری کیمیائی' برقی اور شیشے کی صنعتوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

منگنیز کی صنعت کی ابتدا ہندوستان میں سنہ ۱۸۹۲ع سے ہوتی ہے جبکہ اس کی کھدائی

[1] سنہ ۱۹۲۰ع اور سنہ ۱۹۲۲ع میں جو کساد بازاری رہی اس کا اثر اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیداوار اور قیمت میں کمی ہوگئی۔ لیکن سنہ ۱۹۲۳ع میں خام لوہے کی پیداوار ۱۹۱۲۰۰۰ ٹن تک بڑھ گئی گویا سنہ ۱۹۲۲ع کے مقابلے میں ۶۵ فیصد اضافہ ہوا۔ پگ آئرن اور فولاد کی پیداوار میں بھی معقول اضافہ ہوا۔

باب

احاطۂ مدراس میں بمقام وزاگاپٹم شروع ہوئی تھی۔ سنہ ۱۹۰۰ء تا سنہ ۱۹۰۱ء میں ۹۰ ہزار ٹن بذریعہ جہاز روانہ کیا گیا، لیکن اس کے بعد سے صوبۂ متوسط کو یہ فخر و امتیاز حاصل ہو گیا ہے کہ وہاں منگنیز کی سب سے بڑی مقدار نکلتی ہے۔ سنہ ۱۹۱۲ء تا سنہ ۱۹۱۵ء میں ہندوستان میں مجموعی پیداوار ۶۸۲۸۹۸ ٹن تھی جس کی قیمت ۱۳۱۵۸۹۶۵ روپیہ تھی، اس کے مقابلے میں سنہ ۱۹۲۹ء میں مقدار ۹۹۴۲۷۹ ٹن اور قیمت ۲۱۰۵۱۸۰۲ روپیہ ہو گئی۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں پیداوار گھٹ کر ۲۱۸۳۰۷ ٹن اور قیمت گھٹ کر ۲۶۳۸۱۷۴ روپیہ ہو گئی۔ سنہ ۱۹۰۱ء کے بعد سے یہی پہلا سال ہے جس میں مقدار اور قیمت قلیل ترین بتلائی گئی ہے۔ سرد بازاری کے اثرات جتنی شدت سے منگنیز کے کاروبار میں محسوس کیے گئے اتنی شدت سے ہندوستان کی بڑی معدنی صنعتوں میں سے کسی میں بھی محسوس نہیں کیے گئے۔ صوبۂ متوسط کے اکثر معادن سنہ ۱۹۳۲ء اور سنہ ۱۹۳۳ء میں بند رہے۔ سنہ ۱۹۳۴ء میں کچھ بحالی ہوئی، جیسا کہ اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیدائش ۴۰۶۰۰۰ ٹن تک بڑھ گئی۔ خام منگنیز ہندوستان کی تین بڑی آہنی کمپنیوں کے کارخانوں میں نہ صرف فولادی بھٹیوں میں آہنی منگنیز تیار کرنے کے لیے بلکہ جھکڑ بھٹیوں میں شریک کر کے بیٹر تیار کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جا رہا ہے۔

منگنیز پیدا کرنے والے بڑے علاقے صوبۂ متوسط، مدراس، بمبئی اور میسور ہیں۔ سنہ ۱۹۰۷ء میں یہ صنعت اپنے انتہائی عروج پر پہنچی؛ چنانچہ ہندوستان نے روس کی جگہ لے لی اور دنیا میں اس دھات کے پیدا کرنے والے ملکوں کی صف اول میں آ گیا، گو سنہ ۱۹۱۲ء تا سنہ ۱۹۱۳ء میں ہندوستان پر روس پھر سبقت لے گیا لیکن سنہ ۱۹۱۳ء کے بعد روسی برآمد بالکل موقوف ہو گئی۔ روس کچھ سال ادھر پیداوار حاصل کرنے اور قرضہ دینے کے غیر معاشی طریقے اختیار کر کے خام دھات کی کثیر مقدار کم قیمت پر بازار میں پیش کرنے کے قابل ہوا ہے۔ جنوبی افریقہ کی کانوں کو بھی ترقی دی جا رہی ہے۔ جنگ عظیم کے زمانے میں ہندوستان میں آہنی منگنیز کی روز افزوں تیاری اور قیمتوں کے کثیر اضافے نے منگنیز کی پیداوار کے حق میں بہت بڑے محرک کا کام کیا۔ سنہ ۱۹۲۹ء تا سنہ ۱۹۳۰ء میں خام دھات کی قابل برآمد مقدار ۸۱۹۰۰۰ ٹن اور اس کی قیمت ۲ کروڑ ۴۹ لاکھ روپیہ تھی۔ برآمد کی اس انتہائی مقدار میں سنہ ۱۹۳۱ء تا سنہ ۱۹۳۳ء میں کمی ہو گئی، چنانچہ ۱۹۸۰۰۰ ٹن دھات برآمد ہوئی اور اس کی قیمت ۸۴ لاکھ روپیہ وصول ہوئی۔ اس کمی کی وجہ یہ تھی کہ تمام دنیا میں منگنیز کے ذخیرے میں اضافہ اور فولاد کی تیاری میں کمی ہو گئی تھی اور اس لحاظ سے منگنیز کی طلب گھٹ گئی تھی۔ سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء میں خام منگنیز کی برآمد کی مقدار ۲۶۶۰۰۰ ٹن اور قیمت ۱۰۱ لاکھ روپیہ اور

80

باب ۲

سنہ ۱۹۲۳ء تا سنہ ۱۹۲۵ء میں مقدار ۰۰۰،۴۰ ۹ ٹن اور قیمت ۰ ۸ لاکھ روپیہ تھی جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آہن و فولاد و اسلحہ سازی کی صنعتوں میں گرم بازاری کی وجہ سے مگنیز کی طلب کسی قدر بحال ہو گئی۔

۴۲ - سونا ہندوستان، دنیا کے سونے کی پیداوار کا صرف تقریباً تین فیصد پیدا کرتا ہے۔ ہندوستان میں سونا پیدا کرنے والا اہم ترین رقبہ کولار کی کان ہے جو مشرقی میسور میں واقع ہے اور ہندوستان کی مجموعی پیداوار کا ۸۰ فیصد سونا یہیں سے پیدا ہوتا ہے لیکن کولار کی پیداوار مائل بہ زوال ہے؛ سب سے بڑی مقدار یعنی ۸،۵۰۰،۶۱۶ اونس سنہ ۱۹۰۵ء میں حاصل ہوئی۔ باقی جزو کا بیشتر حصہ اننتاپور کی کانوں سے برآمد ہوتا ہے جو احاطۂ مدراس میں واقع ہے۔ ممالک محروسہ سرکار عالی میں سنہ ۱۹۰۳ء میں ہٹی کی کان میں کام شروع ہوا لیکن سنہ ۱۹۲۰ء کے بعد سے کام موقوف ہے۔ دریائے ارا واڈی کی تہ سے کیچڑ نکال کر اور چھان کر سونا نکالنے کا عمل اس لیے مایوس کن ثابت ہوا کہ اس سے بہت ہی کم مقدار حاصل ہوتی ہے۔ پنجاب، صوبۂ متوسط اور صوبۂ متحدہ میں بھی مٹی دھو کر سونا نکالنے سے قلیل مقدار نکلتی ہے۔ سنہ ۱۹۳۳ء میں سونے کی مجموعی مقدار ۳۲۶،۰۰۰ اونس پیدا ہوئی اور اس کی قیمت دو کروڑ ۶۰ لاکھ ۴۰ ہزار ۱۰ روپیہ تھی؛ اس کے مقابلے میں سنہ ۱۹۳۲ء میں مقدار ۳۲۹،۶۸۱ اونس اور قیمت ۲،۵۳،۵۱،۴۳۸ روپیہ ہوئی تھی۔ سونے کی قیمت کی زیادتی حال میں ہندوستان میں سونے کی پیدائش کے حق میں کسی حد تک محرک ثابت ہوئی ہے۔ سنہ ۱۹۳۴ء میں پیداوار کی مقدار ۰۰۰،۳۲۲ اونس تک گھٹ گئی، لیکن قیمت ۲ کروڑ ۹۲ لاکھ تک بڑھ گئی جو سنہ ۱۹۲۰ء کے بعد سے بحوالہ اسٹرلنگ بیش ترین قیمت ہے۔

۴۳ - چاندی، سیسہ، جست سلطنت ہند کے حدود کے اندر جو دھاتیں پیدا ہوتی ہیں ان کی فہرست میں صرف سنہ ۱۹۱۰ء کے بعد سے چاندی کا اضافہ ہوا ہے۔ تقریباً کل پیداوار بالائی برما میں باڈون سے حاصل ہوتی ہے اور ملک کی ضرورتوں کے مقابلے میں (کیونکہ ہندوستان میں سب سے زیادہ چاندی صرف ہوتی ہے) اس کی مقدار بہت ہی حقیر ہے۔ باڈون کے خام سیسے اور جست کو پگھلانے سے ذیلی پیداوار کے طور پر چاندی حاصل ہوتی ہے۔ برما کے خام دھات کے عظیم ذخائر کا پتا لگ جانے کے بعد سے یہ توقع ممکن ہو گئی ہے کہ برما بہت قریب زمانے میں دنیا کی سیسے کی

31

پیداوار میں اہم ترین دنیا عامل بن جائے گا؛ چنانچہ ۱۹۳۳ء میں تقریباً ۵۴۰۲ ٹن سیسہ نکلا جس کی قیمت ایک کروڑ پندرہ لاکھ اٹھ ہزار نو سو پندرہ روپیہ تھی۔ ہندوستان میں اس کا صرف تقریباً بقدر . . . ۴ ٹن سالانہ ہوتا ہے اور کثیر مقدار برآمد کے لیے بچ رہتی ہے۔ سیسے کی کان جست کا بھی ایک اہم ذریعہ ہے؛ چنانچہ جست بہ مقدار کثیر برآمد کیا جاتا ہے۔ سیسے کی طرح جست کے بارے میں بھی یہ توقع ہے کہ ہندوستان دنیا کی رسد کا اہم جزو مہیا کرے گا۔ باڈون کی کانوں کا ایک اور سلسلے میں بھی ذکر ضروری ہے؛ اور وہ یہ کہ سیسہ، چاندی اور جست کے سلفائڈ گندھک کا اتنا بڑا ذخیرہ فراہم کرتے ہیں کہ اس سے ہندوستان کی گندھک کے ترشے کی ضرورت سر دست پوری ہو سکتی ہے جو صنعتی ترقی کے لیے نہایت ضروری ہے؛ لیکن اس توقع نے ابھی تک عملی جامہ نہیں پہنا۔

۳۴۔ پٹرولیم[1]

ہندوستان میں تیل پیدا کرنے والے دو نمایاں رقبے ہیں اور وہ کوہ ہمالیہ کی قوس کے دونوں کناروں پر واقع ہیں۔ مشرقی کنارے پر جو رقبہ واقع ہے اور جو غالباً بدرجہا زیادہ اہم ہے اس میں آسام اور برما شامل ہیں اور ان سے مجموعی پیداوار کا ۹۵ فیصد تیل نکلتا ہے۔ مغربی کنارے پر جو رقبہ ہے اس میں پنجاب اور بلوچستان شامل ہیں۔ سب سے کامیاب تیل کے چشمے برما میں وادی اراوادی میں پائے جاتے ہیں جہاں سے دیسی پٹرولیم کا $\frac{9}{10}$ حصہ پیدا ہوتا ہے۔

پٹرولیم کی پیداوار ۱۹۰۳ء میں تقریباً ۱۸ ملین گیلن تھی، لیکن ۱۹۳۲ء میں وہ بڑھ کر ۲۲۲ ملین گیلن ہو گئی۔ ملک میں مٹی کے تیل کی عظیم طلب اب اس رسد سے بھی بدرجہا متجاوز ہو گئی ہے جو برما سے حاصل ہوتی ہے، جس کی وجہ سے بیرونی ممالک سے یہ بہ مقدار کثیر درآمد کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء میں ۱۵۰۸ ملین گیلن، ۱۹۲۸ء میں ۴۴۰ ملین گیلن اور ۱۹۳۰ء میں ۵۸۰ ملین گیلن، ۱۹۳۲ء میں ۱۰۸ ملین گیلن اور ۱۹۳۳ء میں ۸۷۵ ملین گیلن درآمد کیے گئے۔ ٹیرف بورڈ نے اندازہ کیا ہے کہ "ملکی رسد کی مقدار مجموعی طلب کی مقدار کے مقابلے میں ۲۵ تا ۴۰ فیصد کم ہے[2]۔" ہندوستان کی پٹرولیم کی پیداواروں کے منجملہ

---

[1] پٹرولیم کی صنعت کی ترقی کا دلچسپ حال معلوم کرنے کے لیے دیکھو ٹیرف بورڈ کی رپورٹ صنعت روغن کے بارے میں شائع شدہ ۱۹۲۸ء باب، جس پر ہماری کتاب جلد دوم میں مسائل ہند کے باب "بیرونی تیل سے شرحوں کی جنگ" کے سلسلے میں بحث کی گئی ہے۔

[2] دیکھو ٹیرف بورڈ کی رپورٹ صنعت روغن کے بارے میں پیراگراف (۴۴)۔

جو مٹی کا تیل نکلتا ہے اس کا کوئی حصہ برآمد نہیں کیا جاتا۔ لیکن جن اشیا کی زیادہ تر برآمد ہوتی ہے
وہ یہ ہیں:۔ پٹرول بنزین (Benzine) موم اور موم بتیاں۔ خاص کر ملکی صرف
میں اضافے کے باعث پٹرولیم کی برآمد بشمول بنزین، بنزول (Benzol) اور پٹرول
بسرعت زوال پذیر ہے۔ ملکی پٹرول کی کثیر پیداوار کے باوجود رسد اتنی کافی نہیں ہوتی جس سے
ملکی طلب پوری ہو سکے۔ چنانچہ اندازہ کیا گیا تھا کہ سنہ ۱۹۲۲ء تا ۱۹۲۵ء میں طلب بقدر
۲۱۵ ملین گیلن یا سنہ ۱۹۲۳ء تا ۱۹۲۴ء کے اندازے کے مقابلے میں ۹۰ ملین گیلن زیادہ تھی۔
پٹرول کی برآمد اب تقریباً ترک کی گئی ہے اور ٹیرف بورڈ اس بات کا اندیشہ محسوس کرتا ہے کہ ہندوستان
میں عنقریب اس کی قلت ہو جائے گی جس کو پورا کرنے کے لیے باہر سے کثیر مقدار درآمد کرنی پڑے گی
چنانچہ سنہ ۱۹۲۲ء تا سنہ ۱۹۲۳ء میں ۱۵ ملین گیلن پٹرول درآمد کیا گیا۔

سنہ ۱۹۲۷ء تک پٹرولیم کے اعداد و شمار سے یہ پتا چلتا ہے کہ پیداوار میں تدریجی تخفیف کا
قطعی میلان پایا جاتا ہے، جس کا خاص باعث یہ ہے کہ نیانگ یانگ کی پیداوار گھٹ گئی ہے
جو برما کے تیل کے چشموں میں قدیم ترین اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ چشمہ ہے۔ ان اعداد
سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان بشمول برما کی پیداوار کو سنہ ۱۹۱۹ء اور سنہ ۱۹۲۱ء کی اعلیٰ سطحوں تک
(جبکہ ۳۰۵ ½ ملین گیلن سے زیادہ پیداوار حاصل ہوتی تھی) برقرار رکھنے میں روزافزوں
دقت محسوس ہو رہی ہے، چنانچہ اس کے بعد سنہ ۱۹۲۲ء میں پیداوار گھٹ کر
۲۵۱،۱۱۳،۹۰۹ گیلن ہو گئی۔ پھر بھی حالیہ سالوں میں پیداوار کے اعداد سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ
اس میلان میں اصلاح ہو گئی ہے۔ پٹرولیم کی پیداوار سنہ ۱۹۲۸ء میں ۳۰۵،۹ ملین سنہ ۱۹۲۹ء میں
۳۰۶ ملین، سنہ ۱۹۳۰ء میں ۲۱۱،۰ ملین اور سنہ ۱۹۳۴ء میں ۲۲۲،۰ ملین گیلن تھی، موخرالذکر
مقدار سب سے بڑی انتہائی مقدار ہے جس کا حال اب تک معلوم ہو سکا ہے۔ سنہ ۱۹۳۰ء
تا سنہ ۱۹۳۴ء کا اضافہ آسام کی پیداوار کے بہت ہی کثیر متناسب اضافے اور برما کی پیداوار کی
قلیل سی زیادتی کا نتیجہ ہے۔ آسام کی زائد پیداوار نے اسی زمانے کی برما کی پیداوار کی کمی اور پنجاب
کی پیداوار کی عظیم تخفیف کو تقریباً زائل کر دیا ہے۔ لیکن نئے اہم چشمے دریافت ہونے تک
یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سابقہ کاموں میں زیادہ سرمایہ لگانے کے بجائے احتیاط
اور کفایت شعاری کے اصول پر کام کیا جائے۔ ٹیرف بورڈ یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ اٹک
اور آسام کے چشموں کے امکانات بہت بڑے ہیں[1]۔ ہندوستانی پٹرولیم کی پیداوار کا

[1] ٹیرف بورڈ کی رپورٹ (صنعت مذکور) پیراگراف (۵)

تناسب دنیا کی مجموعی پیداوار کے مقابلے میں بہت ہی حقیر ہے۔ دنیا کی مجموعی پیداوار کچھ سال ادھر سے سرعت کے ساتھ بڑھ گئی ہے چنانچہ سنہ ۱۹۱۰ء کے مقابلے میں جبکہ پیداوار ۴۶٫۰ ملین لانگ ٹن تھی وہ بڑھ کر سنہ ۱۹۲۲ء میں ۸۵٫۱ ملین لانگ ٹن ہو گئی۔ ہندوستان کا حصہ باوجود اس کے کہ پیداوار میں قطعی طور پر اضافہ ہوا اس زمانے میں ۱٫۱ فیصد سے گھٹ کر ۰٫۶۴ فیصد ہو گیا۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں دنیا کی پیداوار میں ایک اور نمایاں اضافہ ہوا یعنی مقدار ۱۸۰ ملین ٹن سے زائد تھی سنہ ۱۹۲۹ء میں مزید اضافہ ہوا اور پیداوار ۲۰۲ ملین ٹن سے زائد ہو گئی لیکن سنہ ۱۹۳۰ء میں دنیا کی پیداوار گھٹ کر ½ ۱۹۹ ملین ٹن ہو گئی۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں تقریباً ۱۸۰ ملین ٹن تک گر گئی اور اس کے برخلاف سنہ ۱۹۳۳ء میں پیداوار پھر ۱۹۸ ملین ٹن تک بڑھ گئی۔ موخر الذکر سال میں دنیا کی رسد کے منجملہ ریاستہائے متحدہ امریکہ سے ۶۲٫۵ فیصد اور روس سے ۱۰٫۶ فیصد جزو حاصل ہوا۔ ہندوستان کا حصہ سنہ ۱۹۲۸ء میں ۴۲٫۰ فیصد تھا جو سنہ ۱۹۲۹ء میں گھٹ کر ۰٫۶۰ فیصد ہو گیا۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں کچھ بڑھ کر ۶۴٫۰ ہو گیا۔ اور سنہ ۱۹۳۳ء میں پھر ۶۲٫۰ فیصد تک گھٹ گیا۔ موخر الذکر سال میں ہندوستان کا درجہ دنیا کے پٹرولیم پیدا کرنے والے ملکوں میں بارہواں تھا[1]۔

۳۵۔ ابرق

ابرق زیادہ تر برقی صنعت میں حاجز واسطے[3] کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور جنگ عظیم کے زمانے میں لاسلکی پیام رسانی علم ہوائی جہاز رانی اور نقل و حمل بذریعہ موٹر کی ترقیوں کے سلسلے میں اس نے بہت اہمیت حاصل کر لی چنانچہ اس کے بغیر یہ ترقیاں ناممکن ہوتیں۔

ہندوستان میں سالہا سال سے ابرق کثیر مقدار میں پیدا ہو رہی ہے چنانچہ اس کی مقدار دنیا کی مجموعی مقدار کے ⅗ سے زیادہ ہے۔ ابرق زیادہ تر بہار، نیلور، سیلم، مدراس پریسیڈنسی کے اضلاع ملیبار، ٹراونکور اور اجمیر مرواڑہ اور راجپوتانہ کے دوسرے علاقوں میں دستیاب ہوتی ہے سنہ ۱۹۳۲ء تا سنہ ۱۹۳۵ء میں ۵۰۰۰ ۔ ۱ ہنڈرڈ ویٹ ابرق برآمد کی گئی جس کی قیمت ۶۹ لاکھ روپیہ تھی۔ یہ غالباً ہندوستان کی مجموعی سالانہ پیداوار کی نمایندگی کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ پیداوار کے اعداد غیر مکمل ہیں چنانچہ اس کی مقدار برآمد[2] تقریباً نصف ہے۔

---

[1] دیکھو انس کی تصنیف محولہ بالا صفحہ ۱۸۹

[2] دیکھو "انڈین ایربک" بابتہ سنہ ۱۹۳۶ء صفحہ ۴۰۰۔

[3] Insulating Medium

باب ۲

۳۶ - ولفرام

ٹنگس ٹن (Tungsten) میں سب سے بڑی خام دھات یہی (ولفرام) ہوتی ہے اور تیز تراش فولاد کی تیاری میں جو جنگی اغراض کے لیے بے بہا ہے اس کا استعمال ناگزیر ہے۔ ٹنگس ٹن بھی دوسرے اہم کاموں میں استعمال ہوتا ہے، مثلاً تاباں لمپ کے رشتوں کے تار تیار کرنے رنگریزی اور اگن روک سامان وغیرہ کے لیے۔ ولفرام کی کان کنی ہندوستان میں ۱۹۱۰ء میں شروع ہوئی اور دوسرے ہی سال برما سے ..۳۴۱ ٹن پیداوار کی برآمد نے برما کو دنیا کے ولفرام پیدا کرنے والے ملکوں کی پہلی صف میں کھڑا کر دیا۔ برما اور خاصکر ٹوائے کی کانوں میں ولفرام کی تہیں زمانۂ جنگ عظیم میں سلطنت کے لیے اہم ترین ثابت ہوئیں۔ اختتام جنگ کے بعد سے زمانۂ جنگ کے محرک کی عدم موجودگی کے باعث صنعت میں انحطاط پیدا ہوگیا ہے۔

۳۷ - شورا

شورے کی طلب صنعتی اغراض مثلاً شیشہ سازی، غذا کے تحفظ اور کھاد کی تیاری کے لیے بہت زیادہ ہے۔ ہندوستان میں اس کی پیداوار عملاً بہار، صوبۂ متحدہ، اور پنجاب تک محدود ہے۔ کسی زمانے میں ہندوستان کو تمام دنیا میں نائٹریٹس (Nitrates) کی رسد کا عملی اجارہ حاصل تھا جو دھماکو اشیا اور کیمیاوی کھاد کی تیاری کے لیے نہایت اہم ہیں لیکن ایک حد تک حکومت ہند کے محصول کی پالیسی کے باعث اور ایک حد تک دوسرے اسباب کی بنا پر ہندوستان کو دوسرے رقیبوں یعنی غیر ممالک نے اس حیثیت سے ہٹا دیا۔ حکومت ہند نے مالی اغراض کے لیے ایک بھاری محصول برآمد عائد کرکے کچھ زمانے تک ہندوستانی اجارے سے نفع حاصل کرنے کی کوشش کی۔ جنگ کے زمانے میں ہندوستانی شورے کی پیدائش اپنی سابقہ حالت پر کسی حد تک عود کر آئی، اس لیے کہ سامان جنگ کی تیاری کے سلسلے میں اس کی ضرورت تھی۔ بیرونی بازاروں میں جنگ کے زمانے کی طلب کی موقوفی اور چائل کے نائٹریٹ اور فرانس کے پوٹاش کے نمکوں کے مقابلے نے اس صنعت پر مخالف اثر ڈالا؛ چنانچہ جنگ کے زمانے میں اوسط پیداوار ۴۴۰۰۰۰ ہنڈرڈ ویٹ اور قیمت ۹۰ لاکھ روپیہ تھی لیکن ۱۹۲۲ء تا ۱۹۲۵ء میں مقدار ۱۷۳۰۰۰ ہنڈرڈ ویٹ اور قیمت ۱۴ لاکھ تک گھٹ گئی۔[1]

---

[1] دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ ریویو آف دی ٹریڈ آف انڈیا، ۱۹۲۲ء تا ۱۹۲۵ء
(Review of the Trade of India)

34

تقریباً کل پیداوار برآمد کر دی جاتی ہے اور صرف ایک خفیف جز و کھاد کے طور پر استعمال کرنے کی غرض سے اور وہ بھی خاص کر آسام کے چائے کے باغوں کے لیے ملک میں رکھ لیا جاتا ہے۔

۲۸۔ دوسری معدنی پیداوار دوسری معدنی پیداوار جو ہندوستان کی معدنی پیداوار میں بہ لحاظ اہمیت دوسرے درجے پر ہے، سیسہ، ٹن، تانبا، جست، المونیم، کرومائٹ، شب، پوٹاش، عنبر، الماس، یاقوت، گندھک وغیرہ ہے۔

۲۹۔ نمک ہندوستان میں نمک کے سالانہ صرف کا تقریباً تین چوتھائی حصہ خود ملک ہی میں پیدا ہوتا ہے اور مجموعی صرف کی مقدار دو ملین ٹن سے زائد ہے۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں نمک کی مجموعی پیداوار ۱۷،۱۲۲۰۰۴۳ ٹن اور اس کی قیمت ایک کروڑ ۲۱ لاکھ ۴۴ ہزار ۶۰۰ سو چھیاسٹھ روپیہ تھی۔ اسی سال ہندوستان میں ۳۹۶۰۱۸ ٹن نمک درآمد ہوا جس کا بڑا حصہ عدن اور ماتحت علاقوں سے آیا، برخلاف اس کے سنہ ۱۹۳۰ء میں ۵۵۲۰۷۱۴ ٹن نمک درآمد ہوا تھا۔ سنہ ۱۹۳۴ء میں نمک کی پیداوار بہت بڑھ گئی یعنی ۱۹۶۳۰۰۰ ٹن ہوگئی۔ ہندوستانی نمک کا تقریباً ۶۰ فیصد حصہ بمبئی، مدراس اور برما کے ساحل پر سمندر کے پانی کی تبخیر کے ذریعے سے حاصل کیا جاتا ہے۔ نمک کا دوسرا منبع پنجاب میں سالٹ رینج اور کوہاٹ کی کانیں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کوہاٹ میں نمک کے ذرائع اس قدر وافر ہیں کہ بہت طویل زمانے تک وہ کام دیتے رہیں گے۔ دوسرے دو ذرائع یہ ہیں کہ راجپوتانے میں جھیل سانبھر کے کھارے پانی سے نمک بنایا جاتا ہے اور ران آف کچھ خوروگی سرحد پر کھارے پانی کو گڑھے کھود کر جمع کیا جاتا ہے، جب پانی خشک ہو جاتا ہے تو نمک نکال لیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں نمک کی پیداوار کو بڑھانے اور ملک کو خود کفیل بنانے کا مسئلہ سنہ ۱۹۲۹ء میں ٹیرف بورڈ کے روبرو پیش ہوا جس کی رپورٹ سنہ ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی۔ اندازے سے کہا جا سکتا ہے کہ بیرونی نمک کی معمولی طلب بنگال کے بازار کے لیے تقریباً ۵۰۰،۰۰۰ ٹن اور برما کے بازار کے لیے ۸۰،۰۰۰ ٹن ہوگی۔ بنگال کے بازار میں (جس کو زیادہ تر ہندوستان خاص خیال کیا جا سکتا ہے) "سفید، کنکریوں کی بھاری اور رطوبت کی عدم موجودگی کو بہت اہمیت دی جاتی ہے، قیمت بھی طلب کا متعین کرنے والا عامل ہے۔ کلکتے کے بازار میں قیمتوں میں بہت شدید تغیرات واقع ہوتے ہیں، جن کا باعث کسی حد تک تو نقل و حمل کی شرحوں کے تغیرات ہیں لیکن زیادہ تر کاروباری اتحادوں اور سوداگروں

باب

حاصل ہے۔ ٹیرف بورڈ یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ بنگال کے بازار کی کل طلب ہندوستان اور عدن مل کر پوری کر سکتے ہیں، چنانچہ تنہا عدن میں سالانہ ۳,۰۰,۰۰۰ ٹن نمک پیدا ہوتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ جو نمک سمندر کے راستے کراچی اور اوکھا سے اور بذریعۂ ریل کھیورا، سانبھر اور پچ بھدرا سے آتا ہے اس کے ذرائع کو مناسب ترقی دی جائے۔

بنگال کے لیے کھیورا وغیرہ سے جو نمک بذریعۂ ریل آتا ہے اس کی رسد قومی اغراض کے نقطۂ نظر سے کراچی اور اوکھا سے بذریعۂ بحر لائے ہوئے نمک کے مقابلے میں قابل ترجیح ہے، اگرچہ موخرالذکر مرکزوں کو بعض خاص قدرتی سہولتیں حاصل ہیں۔ بذریعۂ ریل جو نمک آتا ہے وہ زمانۂ جنگ میں قلت نہ ہونے دینے کا ضامن ہے۔ اضافۂ پیداوار کے نتیجے کے طور پر ریلوں کی نقل و حمل بڑھے گی اور نمک کی قیمتوں میں کمی ہوگی لیکن ریل سے جو نمک آتا ہے اس کی کمی کو سمندر سے نمک لاکر پورا کرنا چاہیے۔ بورڈ یہ سفارش کرتا ہے کہ حکومت رسد کے ان ذرائع کو ترقی دینے کے خیال سے ان کی مکمل جانچ کرے اور نمک کے لیے ریلوں کی شرحوں کی تخفیف کے مسئلے کی پوری تحقیقات کرے۔ قیمتوں میں ثبات پیدا کرنے کے لیے جو ہندوستانی رسد کے ذرائع کی ترقی کے لیے نہایت ضروری ہے، بورڈ یہ سفارش کرتا ہے کہ درمیانی تدبیر کے طور پر حکومت بنگال میں نمک کی درآمد کی نگرانی اپنے ہاتھ میں لے۔ حکومت کو چاہیے کہ مناسب قیمت فروخت پر اس ہندوستانی نمک کو خریدے جو بذریعہ بحر لایا جاتا ہے اور بذریعہ ریل لائے ہوئے نمک کا استعمال عوام میں بڑھائے۔ مزید ضرورت ظاہر ہو تو اس کو بیرونی تیار کرنے والوں سے خرید کر پورا کیا جائے۔ یہ پالیسی کراچی، اوکھا بلکہ عدن کے چھوٹے کارخانوں کو بھی بیرونی مقابلے کی زد سے محفوظ رکھے گی۔ لیکن چونکہ حکومت، درآمدہ نمک کی فروخت اور تقسیم کی بہترین ایجنسی نہیں ہے لہذا بورڈ یہ سفارش کرتا ہے کہ ایک مجلس فروخت **Marketing Board** رفاہ عام کمپنی کے طور پر ترتیب دی جائے جو شمالی ہند میں نمک کی خرید و فروخت کا انتظام اپنے ذمے لے۔ خریداری کرتے وقت بورڈ کو چاہیے کہ مطلوبہ خوبی کے ہندوستانی نمک کو ترجیح دے، اور ایک مناسب قیمت فروخت مقرر کی جائے جو کرایۂ نقل و حمل کی تبدیلی کے تابع رہے۔ بورڈ آف ڈائرکٹرس میں حکومت کو مستقل نمائندگی حاصل ہونی چاہیے اور حکومت کو نامنظوری (**Veto**) کا حق حاصل ہونا چاہیے[1]۔ درآمدہ نمک کی قیمت میں معتدبہ کمی اور اس کے نتیجے کے طور پر مجوزہ

[1] دیکھو ٹیرف بورڈ کی رپورٹ (صنعت نمک سازی) شائع شدہ ۱۹۳۰ء۔

(ب) حکومتی نگرانی سے زیادہ سادہ و مستعدانہ کارروائی کی ضرورت کے مدنظر مجلس قانون ساز کی ایک مالیہ کمیٹی نے یہ سفارش کی کہ تمام بیرونی نمکوں پر ۴-۱/۲ آنے فی من کا زائد محصول عارضی طور پر عائد کیا جائے، عدن کا نمک اس سے مستثنیٰ رہے اور عدن کو اس غرض کے لیے ہندوستان کا جزو سمجھا جائے۔ اس سفارش کو قانون (زائد) محصول درآمد نمک (Salt Additional Import Duty Act) بابتہ ۱۹۳۱ء میں شریک کر لیا گیا اور یہ قانون ۱۸ مارچ ۱۹۳۱ء کو نافذ کر دیا گیا۔ اس قانون کی مدت ابتداً ایک سال رکھی گئی تھی، لیکن متعاقب توسیعی قوانین کے ذریعے سے وقتاً فوقتاً اس میں توسیع کی گئی جو ۳۰ اپریل ۱۹۳۶ء کو ختم ہونے والی تھی۔ قانون تتمۂ مالیہ بابتہ ۱۹۳۱ء کی رو سے نمک کی کروڑگیری اور چنگی پر ۲۵ فیصد کا اضافہ کیا گیا[1]۔ مجلس قانون ساز کی صنعت نمک سازی کی کمیٹی کی سفارش کے مطابق ۱۹۳۳ء میں زائد محصول فی من ۴-۱/۲ آنے سے گھٹا کر ۲-۱/۲ آنے کر دیا گیا۔ بنگالی ممبروں نے زائد محصول کی مخالفت اس بنیاد پر کی کہ وہ بنگالی صارفین کو نقصان پہنچا کر عدن کے پیدا کرنے والوں کی امداد کا اثر پیدا کرتا ہے۔ بہرصورت عدن اور برما کی ہندوستان سے قریب الوقوع علیحدگی کے مدنظر محصول پر غور کرنا ہی چاہتا ہے۔

۴۔ عمارتی پتھر ہندوستان میں تعمیر کے کام کے لیے جو اہم ترین پتھر دستیاب ہو سکتے ہیں ان میں سے ایک ریت پتھر ہے جو بندھیاچل کے پہاڑی نظام سے تعلق رکھتا ہے۔ ریت پتھر ایک وسیع رقبے میں پائے جاتے ہیں جو دیہری (موقوعہ دریائے سون) سے ہوشنگ آباد اور گوالیار تک اور یہاں سے آگرہ اور نیمچ تک پھیلا ہوا ہے۔ اشوک کے زمانے سے موجودہ زمانہ تک ہندوستانی فن تعمیر کے متعدد عظیم شاہکار اسی پتھر سے تیار ہوئے ہیں۔ جزیرہ نما کے جنوبی حصے میں مختلف قسم کے آتشی پتھروں کو زیادہ تر استعمال کیا جاتا ہے۔ جنوبی ہند کے مرکز میں دوسرے قسم کے تعمیری مسالے سلیٹ (Slate) اور چونے کا پتھر ہیں؛ صوبۂ متوسط اور وسطی ہند وغیرہ میں باسلٹی (Basalt) چٹان پائی جاتی ہے؛ لیٹرائٹ یا خشتی پتھر ہندوستان میں تقریباً ہر جگہ پایا جاتا ہے؛ مشہور پور بندری پتھر بمبئی اور کراچی میں بکثرت استعمال ہوتا ہے؛ ضلع جبل پور اور صوبۂ متوسط کے دوسرے علاقوں میں سنگ مرمر موجود ہے؛ اس کے

[1] دیکھو باب متعلقہ "مالیہ" جلد دوم۔

علاوہ پتھروں کی بے شمار قسمیں ملک میں پائی جاتی ہیں ۔

۴۱ سمنٹ سازی کی اشیا سمنٹ سازی کے لیے اہم ترین خام اشیا کھریا یا چونے کا پتھر، اور چکنی مٹی درکار ہوتی ہیں جو ہندوستان میں بکثرت دستیاب ہوتی ہیں؛ مثلاً ریاست بنڈی راجپوتانہ میں لاکھیری کے قریب اور کٹنی میں بھی، جہاں چونے کا پتھر اور چکنی مٹی عمدہ ملتی ہے ۔ دوسرے علاقے کاٹھیاوار میں پوربندر اور صوبۂ متحدہ میں لکھنو اور کانپور کے نواح ہیں ۔ ہندوستان میں بنی ہوئی پورٹ لینڈ سمنٹیں بہترین انگریزی قسموں کے مساوی خیال کی جاتی ہیں ۔ بحیثیت مجموعی ہندوستانی سمنٹ سازی کی صنعت کا مستقبل بظاہر بہت روشن معلوم ہوتا ہے ۔

۴۲ ۔ چونا چونے کا سب سے اہم سرچشمہ چونے کا پتھر ہے جس کا ذکر اس کے دوسرے مفید کاموں کے سلسلے میں کیا جا چکا ہے ۔ اس کی رسد تقریباً غیر محدود ہے اگرچہ صرف ان بتوں اور طبقوں میں کام کیا جاتا ہے جن کا محل وقوع نقل و حمل کے اغراض کے لیے بالکل اور خاص مقامی سبب سے بہت مناسب ہے ۔

37

۴۳ ۔ نباتی ذرائع ملک کا وسیع رقبہ، بلندی کے اختلافات، عرض البلد کی وسعت، آب و ہوا اور مختلف خواص رکھنے والی زمینیں، ہندوستان کو انواع و اقسام کی نباتی پیداوار اگانے کے قابل بناتی ہیں جو منطقہ حارہ کے جنوب اور منطقہ معتدلہ میں پیدا ہوتی ہیں چنانچہ مندرجہ ذیل بیان سے اس کی توضیح ہو گی ۔ (۱) کھانے کے اجناس :۔ چاول بنگال، بہار و اوڑیسہ اور برما اور ایک حد تک بمبئی اور مدراس میں؛ گیہوں شمال و مغربی ہند میں؛ جوار اور باجرا بمبئی اور مدراس میں؛ مکائی بہار و اوڑیسہ، صوبۂ متحدہ اور پنجاب میں؛ چنا پنجاب، بہار و اوڑیسہ، صوبۂ متحدہ اور صوبۂ متوسط میں ۔ (۲) جڑی بوٹی :۔ گرم مسالے اور بگھار مدراس، بمبئی اور بنگال میں؛ نیشکر کل ہندوستان میں، خاصکر صوبۂ متحدہ میں؛ قہوہ مدراس اور کورگ میں؛ چائے آسام اور بنگال میں؛ (۳) تخم :۔ السی، تل، سرسوں، رائی، مونگ پھلی اور ارنڈی وغیرہ جیسے روغندار تخم مدراس، صوبۂ متحدہ، صوبہ جات متوسط، بمبئی اور برما میں ۔ (۴) ریشے :۔ روئی بمبئی، برار، پنجاب اور مدراس میں؛ سن بنگال میں ۔ (۵) متفرق :۔ افیون صوبۂ متحدہ میں؛ تمباکو بنگال، بہار، بمبئی اور مدراس میں؛ چارہ کی فصلیں پنجاب اور صوبۂ متحدہ میں؛ جنوبی ہند اور برما میں سن کونا (کوئنین)؛ انڈیا ربر آسام، خاصہ پہاڑی اور برما میں : ان کے علاوہ دوسری جنگل کی پیداوار ۔

۔ حیوان

ہندوستان جیسے زرعی ملک کے لیے حیوانات کی موجودگی کی اہمیت پر
زور دینے کی مشکل ضرورت ہے۔ ہندوستانی حالات کے تنوع نے فطری طور
انات میں بھی بہت کچھ تنوع پیدا کر رکھا ہے۔ چنانچہ یورپ کے مقابلے میں ہندوستانی حیوانات
اع و اقسام کی تعداد بدرجہا زیادہ ہے۔ گائے اور بھینس کی قدر زیادہ تر دودھ دینے والے
وں کی حیثیت سے کی جاتی ہے۔ زرعی معیشت کے نظام میں بیل اہم کام انجام دیتا ہے، نہ صرف
اری کے جانور کی حیثیت سے بلکہ کھیتوں میں کام کرنے کی حیثیت سے بھی؛ اور گھوڑوں یا میکانکی
کے استعمال سے کسان عملاً بے بہرہ ہے۔ زرعی کاروبار میں استعمال کیے جانے والے جانوروں
یثر بجریوں کا فضلہ، ہندوستانی کسان کو اس کا مطلوبہ کھاد قریب قریب سب کا سب مہیا کرتا ہے؛
نوعی کھاد کا رواج ابھی بہت ہی ابتدائی حالت میں ہے۔ غریب گدھا ہر جگہ پایا جاتا ہے اور
سے باربرداری کا کام لیا جاتا ہے۔ اونٹ، ملک کے ریتیلے علاقوں میں پایا جاتا ہے اور ریگستانوں میں حمل و نقل کے
لایا جاتا ہے۔ مچھلی بہت اہمیت رکھتی ہے بالخصوص بنگال، آسام اور جزیرہ نما کے ساحلی خطوں جیسے علاقوں
نانچہ یہاں کے رہنے والوں کی غذا میں وہ نائٹروجن کے عناصر مہیا کرتی ہے جو دوسرے مقامات میں
سے پورے ہوتے ہیں۔ ہندوستانی سمندروں میں کھانے کے قابل مختلف قسم کی مچھلیاں دستیاب
ہیں۔ لیکن یہ ذرائع ابھی اس بات کے محتاج ہیں کہ جدید طریقوں سے مناسب اور باقاعدہ طور پر کام لے کر فوائد حاصل کیے جائیں۔
ہندوستان کے وسیع جنگلات میں مختلف قسموں کے وحشی جانوروں اور پرندوں کی بہتات
۔ وہ شکاری کے لیے بہت اچھا شکار مہیا کرتے ہیں۔

۔ قوت کے ذرائع

ہندوستان میں قوت کے اہم ذرائع کوئلہ، جلانے کی
لکڑی، تیل اور الکحل، ہوا اور پانی ہیں۔ کوئلہ کا ذکر معدنی
کے تحت کیا جا چکا ہے۔ جنگلات کے افادے کا حال بھی جلانے کی لکڑی کی رسد کا
نے کی حیثیت سے بیان ہو چکا ہے۔ لیکن اکثر ہندوستانی جنگلات، پہاڑی علاقوں میں پائے جاتے
ان سے نقل و حمل بہت دقت طلب اور بیش خرچ ہوتی ہے۔ اگر اس دقت کو بھی مؤثر طریقے
فع کر لیا جائے تب بھی یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا جلانے کی لکڑی کی رسد طلب کا ساتھ صنعتی اغراض
، اس وقت تک دے سکتی ہے جب تک کہ وسیع پیمانے پر تخم بندی نہ کی جائے۔ صنعتی کمیشن

باب ہو سکتی ہے جس کو فروخت کرنے سے لکڑی کے کوئلے کی مقامی قیمت میں بہت بڑی حد تک کمی ہو جائے گی۔ کمیشن مذکور یہ بھی مشورہ دیتا ہے کہ قوت کے چھوٹے کارخانوں کو چھوڑ کر سب کارخانوں میں اِنتصاصی گیس پلانٹ Suction Gas Plant سے کام لیا جائے کہ اس سے انتہائی سہولت ہوگی اور کام اچھا ہوگا؛ اور اس نقطۂ نظر سے کمیشن ایسے طریقے اختیار کرنے کے بارے میں سفارش کرتا ہے جن کی بناء پر ایسے پلانٹ کے لیے ایندھن کی قیمت میں کمی ہونے کا قرینہ ہے۔ ہندوستان کی حیثیت تیل کے ذرائع کی حد تک معدنی پیداوار کے تحت جانچی جا چکی ہے اور اس بات پر زور دیا جا چکا ہے کہ اس سے کام لینے میں بڑی احتیاط کے ساتھ کفایت کی جائے لیکن چونکہ بلوچستان، پنجاب، آسام وغیرہ میں تیل کی موجودگی کے امکان کو اب بھی مشتبہ قرار دینا ضروری ہے اور چونکہ برما کے چشموں سے بسرعت استحصال کیا جا رہا ہے لہٰذا ہم اس خاص قسم کی قوت پر بہت زیادہ اعتماد نہیں کر سکتے۔

جس حد تک صنعتی اغراض کے لیے الکحل سے بطور قوت محرکہ استفادہ کرنے کے امکان کا تعلق ہے وہاں تک بعض قسم کی نباتی پیداوار اس قابل معلوم ہوتی ہے کہ اس سے الکحل کی مطلوبہ مقدار نکالی جاسکے۔ لیکن یہ پھر بھی ایک قیاسی چیز ہے اور احتیاط کے ساتھ تحقیق اور تجربہ چاہتی ہے۔ اس کام میں سہولت پیدا کرنے کی خاطر کمیشن نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ چنگی کی بندشوں کو کسی حد تک نرم کر دیا جائے۔

۴۶۔ آبی قوت

ازاں قوت محرکہ کی رسد، کامیاب صنعتی ترقی کے اساسی شرائط میں سے ایک ہے۔ صنعتی اغراض کے لیے قوت کی تکوین کی غرض سے کوئلہ، جلانے کی لکڑی یا تیل کی رسد کے بارے میں ہندوستان کی صورت حال مذکورہ اسباب کی بناء پر خاطر خواہ طریقے پر موافق نہیں ہے۔ لیکن آبی قوت کے ترقی پانے کے اچھے خاصے توقعات ہیں۔ اب تک آبی قوت، بارش کی موسمی نوعیت کے باعث محدود رہی ہے اور اس کے لیے پانی کے بیش خرچ ذخائر تعمیر کرنا ناگزیر ہے جو مقامات دور واقع ہیں ان میں برقی قوت پہنچانے کا طریقہ کامیاب ثابت ہونے سے پیشتر، روئی کی صرف دو ایک خاصی بڑی گرنیاں جیسی کہ مقام گوکاک بمبئی میں ہیں اور متعدد چھوٹے کارخانے جو نخل بندوں کی زمینوں میں پہاڑیوں میں واقع ہیں کسی بڑی حد تک آبی قوت سے استفادہ کرتے تھے۔ علاوہ ازیں پہاڑی دریاؤں پر اور آب پاشی کی نہروں میں آبشاروں پر پن چکی آٹے کی گرنی چلانے کے لیے استعمال کیے جاتے تھے لیکن حالیہ زمانے میں بڑی بڑی برقابی تجاویز پر بہت کچھ توجہ مبذول کی گئی ہے۔ چنانچہ دربار میسور نے پہلا برقابی

باب ۲

کارخانہ مشرق میں بمقام سیواسمودرم دریائے کاویری پر ۱۹۰۲ء میں قائم کیا جس کا اولین مقصد معدنِ طلا واقع
کولار کو قوت مہیا کرنا تھا۔ اس کے فوراً ہی بعد دربار کشمیر نے اسی کے مماثل کارخانے دریائے جہلم پر قائم کیے
جن میں بیس ہزار برقی اسپی قوت کی تکوین کے لیے کافی پانی لینے کی صلاحیت موجود ہے۔ احاطۂ
بمبئی میں مغربی گھاٹ اس قسم کی تجاویز کے لیے خاص طور پر موزوں ہیں؛ چنانچہ یہ کوئی حیرت کی بات
نہیں کہ ہندوستان کے عظیم ترین برقابی کارخانے ان ہی علاقوں میں واقع ہیں۔ ٹاٹا ہائڈرو الکٹرک
اسکیم یعنی برقابی تجویز ہندوستان کی صنعتی ترقی میں ایک بہت بڑی پیشقدمی کو ظاہر کرتی ہے۔
چنانچہ ٹاٹا ہائڈرو الکٹرک پاور سپلائی کمپنی نے اس قسم کے کارخانوں میں سے پہلا کارخانہ ۱۹۱۵ء
میں لوناولا کے نواح میں کھولا لیکن بمبئی کی گرنیوں کی عظیم صنعتی طلب پھر بھی ایک حد تک تشنہ ہی رہی؛
اور برقی رسد کو مزید ترقی دینا اشد ضروری ہے۔ اس کے بعد کی تجویز جو وادیٔ آندھرا کی برقی اسکیم
(بابتہ ۱۹۲۲ء) کے نام سے موسوم ہے اس بات کو پیش نظر رکھ کر بنائی گئی ہے کہ اس سے پوری
ترقی کی حالت میں ایک لاکھ اسپی قوت مہیا ہوگی۔ ایک اور اہم منصوبہ جس پر "نیلا مولا کی تجویز"
کے نام سے ٹاٹا پاور کمپنی ۱۹۲۷ء سے کام کر رہی ہے اس کے متعلق یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ ڈیڑھ لاکھ اسپی قوت مہیا ہوگی؛
اور دریائے کونا کی کشادہ وادی میں ٹاٹا کی ایک اور عظیم الشان تجویز زیر غور ہے۔ ان تجاویز
کے روبہ عمل آنے کے نتیجے کے طور پر بمبئی کو اس کے قرب و جوار میں کوئلے کی عدم موجودگی کی وجہ سے
جو گھاٹا تھا وہ بالکل رفع ہو جائیگا؛ اس لیے کہ یہ سب کارخانے معمولی طور پر ۲۴۶۰۰۰ اسپی قوت مہیا کر سکتے ہیں۔ دوسری
جانب بھاپ کی جگہ برقی قوت لے لینے کی وجہ سے بمبئی کی صحت عامہ کے حالات کی بھی
بہت کچھ اصلاح ہو جائے گی۔ چنانچہ بمبئی کی سوتی کپڑے کی گرنیاں اور دوسرے کارخانے کم و بیش
ڈیڑھ لاکھ اسپی قوت صرف کرتے ہیں۔ تھانہ، کلیانی اور عظیم تر پونہ بھی اپنی برقی قوت کی رسد اسی ذریعے سے حاصل
کرتے ہیں۔ ایک اور اہم برقابی مہم پنجاب کی مانڈی کی تجویز ہے جس کے مکمل طور پر عملی صورت اختیار کر لینے کے بعد
توقع ہے کہ قوت کی عظیم مقدار مہیا ہوگی جس سے صنعتی مرکزوں کی بہت بڑی تعداد کام لے سکے گی اور دہلی
جیسے دور افتادہ مقامات بھی اس سے استفادہ کر سکیں گے۔ ۱۹۳۳ء میں اس اسکیم کا کام شروع ہوا۔ مدراس میں جو بمبئی کے
مقابلے میں کوئلے کی عدم موجودگی کی بنا پر بہت زیادہ مشکلات میں گھرا ہوا ہے کچھ سال ادھر بعض　40
دلچسپ ترقیاں رونما ہوئی ہیں۔ پائیکارا برقابی تجویز پر ۱۹۲۹ء کے اختتام پر حکومت مدراس نے
عمل شروع کیا اور اس پر اب کام ہو رہا ہے۔ اس تجویز کی نشو و نما کے لیے پائیکارا ندی کے پانی سے
استفادہ کیا جاتا ہے جس کا منبع نیلگری کی سطح مرتفع ہے۔ "میٹر برقابی تجویز" جس کو مشہور "میٹر کی

آب پاشی کی تجویز سے ملا دیا گیا ہے، اس پر کام جاری ہے؛ اور مکمل ہونے کے بعد وہ ۶۰ ہزار اسپی قوت کی بیش ترین پیداوار تیار کرنے کے قابل ہوگی[1]۔ اس تجویز پر ۱۹۲۳ء سے عمل شروع ہوا صنعتی کمیشن کی سفارشوں کے مطابق حکومت ہند نے ۱۹۱۸ء میں ہندوستان کی ایک مکمل آبی مساحت کی۔ اس مساحت کے نتائج سے متعدد دلچسپ امکانات برقابی قوت کی ترقی کے سلسلے میں معلوم ہوئے ہیں۔ مثلاً یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ دریائے سندھ میں بجانب مشرق سات بڑے دریاؤں کے پانی کا اقل ترین بہاؤ یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ ہمالیہ سے ہزار فٹ کے ڈھال پر کم از کم تین ملین اسپی قوت مہیا کرے۔ علی ہٰذا دوسرے علاقوں کے دریاؤں کے بارے میں بھی یہی بات کم و بیش صادق آتی ہے۔ یہ توقع کی گئی ہے کہ برقابی تجاویز نہ صرف صنعتوں کو قوت مہیا کرنے کے لیے بلکہ ہندوستان میں آب پاشی کی سہولتوں میں وسعت پیدا کرنے کی حد تک بھی مفید ثابت ہوں گی۔

ممکن ہے کہ ہمیں ایسے زمانے کی آمد کی خوش آیند توقع قائم کرنے کی ترغیب ہو جبکہ ہر گاؤں کو جو برقابی قوت کے مستقر سے مناسب فاصلے پر واقع ہو برقی لہروں کی رسد مہیا کی جائے گی جس سے اس کو اپنی دیہی صنعتوں کو ترقی دینے اور دیہی زندگی کے آرام و آسائش میں اضافہ کرنے میں مدد ملے گی۔ ان خوشگوار توقعات کے پورا ہونے کی راہ میں سب سے بڑی مزاحمت یہ ہے کہ ہندوستان کی اکثر تجاویز کے ابتدائی مصارف نہایت کثیر ہوتے ہیں۔ بارش چونکہ موسم پر موقوف ہے، اس لیے بیش قیمت ذخیرہ ہائے آب کی تعمیر ضروری ہے اور اس طرح جو مصارف عائد ہوں گے ان کی بنا پر قوت کا فی ارزاں نرخ پر مہیا کرنا دقت طلب ہوگا۔ بمبئی جیسے صنعتی مرکزوں میں بھی جہاں کوئلہ گراں ہے ابھی تک برقابی قوت مقابلتہً کافی ارزاں ثابت نہیں ہوئی ہے۔ آیا سائنس اس دقت کو رفع کرے گی یا نہیں اس کو صرف مستقبل ہی ثابت کر دکھا سکتا ہے[2]۔

۲۴۔ دولتمند ملک کے مفلس باشندے

مذکورۂ بالا بیان سے معلوم ہوا کہ ہندوستان نہایت زرخیز ملک ہے اور انواع و اقسام کے قدرتی ذرائع رکھتا ہے۔ یہ ایک پامال مقولہ ہے کہ گو قدرت نے اپنی نعمتیں فراخدلی کے ساتھ ملک کو دے رکھی ہیں، لیکن اس کے باوجود اہل ہند ان سے پوری طرح بہرہ ور ہونے اور استفادہ

---

[1] دیکھو انڈین ایربک بابتہ ۱۹۲۵ء صفحہ ۳۴۶۔

[2] دیکھو گاڈگل کی اصل تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۲۲۸ تا صفحہ ۲۲۹۔

باب ۲

کرنے سے قاصر رہے۔ یہاں قدرت کے وافر عطیے کے مقابلے میں انسان کا افلاس بہت نمایاں ہے۔ اسی وجہ سے یہ مقولہ عام طور سے مشہور ہو گیا اور تقریباً کہاوت بن گیا ہے کہ ہندوستان ایک دولتمند ملک ہے جس کے باشندے نادار اور مفلس ہیں۔

باب ۳

آبادی

41

۱۔ مجموعی آبادی

سنہ ۱۹۳۱ء کی گزشتہ مردم شماری کے مطابق ہندوستان کی کل آبادی ۳۵ کروڑ ۲۸ لاکھ ۳۷ ہزار ۷ سو ۷۸ ہے جس کے منجملہ برطانوی ہند میں ۲۷ کروڑ ۱۵ لاکھ ۲۶ ہزار ۹ سو ۳۳ نفوس اور دیسی ریاستوں میں ۸ کروڑ ۱۳ لاکھ ۱۰ ہزار آٹھ سو ۴۵ نفوس آباد ہیں۔ گو ہندوستان رقبے میں ریاستہائے متحدہ امریکا کا نصف ہے؛ لیکن ریاستہائے متحدہ کی آبادی کے قریب قریب تگنی آبادی رکھتا ہے۔ ہندوستان کی آبادی، کل دنیا کی آبادی کا تقریباً ۱/۵ ہے۔

۲۔ صوبوں اور ریاستوں میں آبادی اور مذاہب کے اعداد و شمار

صفحہ ۱۵۰ الف پر مندرجہ جدول میں صوبوں اور ریاستوں کے متعلق حسب ذیل تفصیلات

باب ۳

دئے گئے ہیں (۱) مجموعی آبادی اور گنجانی فی مربع میل ؛ (۲) عورتوں کی تعداد فی ہزار مرد ؛ (۳) آبادی کی تقسیم بہ لحاظ مذہب ؛ (۴) ۱۸۸۱ء تا ۱۹۳۱ء میں مجموعی آبادی میں فی صد تغیر اور (۵) ۱۹۲۱ء تا ۱۹۳۱ء میں بعض مذاہب میں فی صد تغیر۔ آبادی کے مختلف پہلوؤں پر جو اس جدول میں اعداد کی شکل میں پیش کئے گئے ہیں ذیل میں بحث کی گئی ہے۔

۳۸۔ آبادی کی گنجانی کو متعین کرنے والے عامل

آبادی کی گنجانی (یعنی تعداد نفوس جن کی کفالت ایک مربع میل میں ہوتی ہے) آب و ہوا کے حالات، جان و مال کے تحفظ، آرام و آسائش کے معیار، معاشی ذرایع اور معاشی ترقی کی حالت پر منحصر ہے ؛ دوسرے الفاظ میں گنجانی کا مدار خارجی ماحول پر اور انسان کی جانب سے اس کے استفادے پر ہے۔ اگر کسی ملک کے معاشی ذرایع وافر اور زرخیز ہوں تو، دوسرے حالات مساوی رہنے کی صورت میں، ظاہر ہے کہ وہ قلیل اور کم زرخیز تر معاشی ذرایع رکھنے کی صورت کے مقابلے میں زیادہ گنجان آبادی کی کفالت کی صلاحیت رکھتا ہے۔ علیٰ ہذا دوسرے حالات مساوی رہنے کی صورت میں کوئی قوم اپنے تہذیب و تمدن کے فنون کے لحاظ سے جتنی زیادہ ترقی یافتہ ہوگی اتنی ہی زیادہ صلاحیت اس میں ایک گنجان آبادی کی کفالت کی ہوگی۔ صنعتی و تجارتی حیثیت سے ایک اعلیٰ درجے کا ترقی یافتہ ملک جس میں کاشت عمیق ہو رہی ہو، معمولی طور پر گنجان آبادی رکھتا ہے، مثلاً انگلستان اور ویلس (۶۸۵ فی مربع میل) اور بلجیم (۶۵۴ فی مربع میل)۔ اگر ملک خالصاً زرعی ہو تو، اس سے بدرجہا کم آبادی کی وہ کفالت کر سکے گا۔ یہ واقعہ کہ ہندوستان اساسی حیثیت سے ایک زرعی ملک ہے یہاں کی آبادی کی گنجانی کے قلیل اوسط کی توجیہ کر دیتا ہے۔

علاوہ ازیں اگر ملک گلہ بانی کے دور میں سے گزر رہا ہو تو، وہ زرعی دور کے مقابلے میں فی مربع میل قلیل تر تعداد میں نفوس کی کفالت کرے گا، اور شکار کے دور میں تو اس سے بھی بدرجہا کم۔ زرعی ملک میں آبادی کی گنجانی کا انحصار زراعت کی نوعیت پر بھی ہوگا۔

باب ۳

محض یہ امر کہ کتنے نفوس کی فی مربع میل کفالت ہوتی ہے کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تاوقتیکہ ہم زیر بحث آبادی کے آرام و آسائش کے معیار کو بھی ملحوظ نہ رکھیں۔ مثلاً بنگال کی گنجانی کا اوسط ۶۴۶ فی مربع میل ہے، جو بلجیم یا انگلستان اور ویلس کے اوسط کے قریب قریب ہے۔ لیکن جہاں تک خوش حالی کے معیار کا تعلق ہے وہاں تک بنگال ان دو مذکورۂ بالا ممالک میں سے کسی سے بھی مقابلہ نہیں کرتا۔ بنگال میں گنجان آبادی کی موجودگی صرف اس کے افلاس کو ظاہر کرسکتی ہے، اس لیے کہ بنگال بڑی حد تک زرعی ملک ہے؛ چنانچہ یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ بہترین حالات کے تحت "زراعت"، آرام و آسائش کے مناسب معیار پر ۲۵۰ نفوس فی مربع میل سے زیادہ کی کفالت نہیں کرسکتی۔

44

۴۔ گنجانی اور خوش حالی

قریب ترین زمانے کی مردم شماری کے بموجب کل ہندوستان میں آبادی کی گنجانی کا اوسط ۱۹۵ نفوس فی مربع میل ہے۔ مندرجۂ ذیل جدول میں مقابلے کی غرض سے بعض دوسرے ملکوں کی اوسط گنجانی کے اعداد پیش کئے جاتے ہیں:-

ملک	اوسط آبادی فی مربع میل	ملک	اوسط آبادی فی مربع میل
بلجیم	۶۵۴	آسٹریا۔	۱۹۹
انگلستان و ویلس	۶۸۵	اسپین	۱۰۷
فرانس	۱۸۴	جاپان	۲۱۵
جرمنی	۳۳۲	ریاستہائے متحدہ امریکا	۴۱
ہالینڈ	۵۴۴	نیوزی لینڈ	۱۱۰۸
		مصر	۳۴
		چین	۲۰۰

باب ۳

مندرجۂ بالا جدول پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے واضح ہوگا کہ اوسط گنجانی کی بنا پر معاشی حالت وحیثیت کے متعلق نتائج اخذ کرنا ممکن نہیں ہے۔ مثلاً ریاستہائے متحدہ اور مصر دونوں ادنیٰ گنجانی ظاہر کرتے ہیں، لیکن ریاستہائے متحدہ کا تمول مقابلتہً بدرجہا بڑھا ہوا ہے۔ اس کے برخلاف ایک جانب ریاستہائے متحدہ اور دوسری جانب انگلستان و ویلز کے مابین گنجانی کے لحاظ سے تو بہت بڑا فرق ہے، لیکن یہ فرق ان کی معاشی حیثیت کے اعتبار سے، ان کے مساوات پر رہنے میں مانع نہیں ہے۔ اس لحاظ سے ہر ملک کی حالت کی جداگانہ تحقیق کرنی چاہیئے تاکہ اس کی آبادی کی گنجانی اور اس کی معاشی حالت کا باہمی تعلق، اگر کچھ ہو تو، معلوم ہوجائے۔

صفحہ ۵۸ الف پر مندرجہ جدول سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں اور ریاستوں میں آبادی کی گنجانی میں بہت ہی عظیم اختلافات ہیں۔

یوں تو آبادی کی گنجانی پر متعدد عوامل اثر انداز ہوتے ہیں لیکن ان کے منجملہ کسی ایک عامل کے حوالے سے آبادی کی عدم مساواتوں کی توجیہ کرنا بہت شاذ ہی ممکن ہے۔ مثلاً یہ کہنا غلط ہوگا کہ ہندوستان میں بارش ہی اساسی طور سے کثرت آبادی کا تعین کرتی ہے؛ اس لیے کہ ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ بارش جنوبی برما میں ہوتی ہے، لیکن اس کے باوجود آبادی کے لحاظ سے وہ سب سے کم آباد خطوں میں سے ایک خطہ ہے۔ اگر بارش مقررہ حد سے متجاوز ہوجائے تو، بجائے نفع بخش ہونے کے قطعاً نقصان رساں ہوتی ہے۔ ہندوستان کے اکثر علاقوں میں بہترین حالات پیدا کرنے کے لیے بارش کا سالانہ اوسط تقریباً ۸۰ انچ ہونا ضروری ہے، بشرطیکہ بارش کی تقسیم مناسب ہو۔ صرف اس صورت میں جبکہ بارش اس سے کم ہو یا اس کی تقسیم ناقص ہو، بارش کی مقدار کے اختلافات زراعت پر اور اس طرح آبادی کی گنجانی پر قابل لحاظ اثر ڈالتے ہیں۔ کاشت کی کامیابی کا انحصار جس حد تک پانی پر ہو، اس حد تک آب پاشی بدیہی طور سے وہی اثر ڈالے گی جو بارش ڈالتی ہے؛ اور اس لحاظ سے جہاں آب پاشی کا انتظام ہو وہاں گنجانی کو متعین کرنے میں وہ ایک اہم عامل ہوتی ہے۔

46

باب ۲

لیکن اس واقعے کا لحاظ کرتے ہوئے کہ آب پاشی کا اثر ہندوستان کے مجموعی رقبے کے بہت ہی چھوٹے جزو پر پڑتا ہے، گنجانی پر اس کے اثر کو نظرانداز کیا جا سکتا ہے۔ اگر ملک کو بحیثیت مجموعی لیا جائے تو، سطح کی شکل اس سے بدرجہا زیادہ اہم عامل ہے۔ اگر دوسرے حالات مساوی رہیں تو، کامیاب زراعت کا انحصار زیادہ تر سطح کی شکل پر ہوتا ہے۔ زمین ہموار و مسطح ہو تو، ہر ہر انچ پر کاشت ممکن ہے اگر زمین غیر مسطح و ناہموار ہو تو، کاشت عام طور پر دقت طلب اور پرخطر ہوتی ہے، خواہ نشیبی علاقے بہت ہی زرخیز کیوں نہ ہوں۔ ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ گنجان آباد خطے مسطح میدان ہیں، مثلاً بنگال، مشرقی صوبۂ متحدہ اور جنوبی جزیرہ نما میں مشرقی ساحل پر نشیبی خطے۔ وسیع میدان، جن میں زرخیز زمین کے طویل و عریض خطے موجود ہوں اور بارش بھی خاصی ہوتی ہو، بدیہی طور سے کثرتِ آبادی کے موئد ہیں، جیسے بنگال اور صوبۂ متحدہ۔

یہ واقعہ کہ ان اعتبارات سے حالات اس قدر موافق نہیں ہیں ابھی کی نسبتہً ادنیٰ گنجانی کی توجیہ کرتا ہے۔ برما میں چونکہ جنگلات کا بہت بڑا رقبہ موجود ہے، اس لیے اس کی آبادی مقابلتہً کم ہے (بلکہ بحالت موجودہ گنجائش کے لحاظ سے آبادی بہت کم ہے) بعض اوقات ناموافق آب و ہوا، دوسرے فوائد اور دوسری سہولتوں کو زائل کر دیتی ہے اور مقابلتہً ادنیٰ گنجانی کی جانب رہبری کرتی ہے، جیسا کہ آسام میں۔

زمین کی نوعیت، صرف اس وقت اہم عامل بن جاتی ہے جبکہ زمین کی خوبی کے ساتھ ساتھ بارش بھی وہاں ضروری مقدار میں ہو۔ فی نفسہٖ زمین کی نوعیت کا اثر ہندوستان میں بہت نمایاں اور قابل لحاظ نہیں ہے۔ علاوہ ازیں اختلافات بحیثیت مجموعی اس قدر باریک ہیں کہ بڑے رقبوں سے بحث کرتے وقت ان کا لحاظ نہیں کیا جا سکتا۔

آبادی کی گنجانی کی عدم مساواتوں کا باعث ایک حد تک لوگوں کی یہ عادت بھی ہے کہ وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر باہر نہیں جاتے، اور آزادانہ اندرونی نقل پذیری کی راہ میں متعدد دوسری دقتیں بھی حائل ہیں۔ دہلی کی مثال (جس کی گنجانی کا اوسط فی مربع میل = ۱۱۰ ہے) اپنی آپ نظیر ہے، اس لیے کہ شہر دہلی کی کثیر شہری آبادی

باب ۲

سے دہلی ڈویژن کی مجموعی آبادی کا بڑا جزو مرتب ہوتا ہے۔

۵۔ آبادی کی تقسیم بلحاظ مذہب [۱]

خام اندازے کے بموجب برطانوی ہند میں بسنے والے ہر سنو اشخاص میں سے ۶۸ ہندو، ۲۲ مسلمان، ۳ بدھ مت کے پیرو ۳ مظاہر پرست، ۱ سکھ اور ۱ عیسائی ہیں۔ اس کا مساوی قرینہ ہے کہ بقیہ دو میں سے ایک عیسائی یا بدھ مت کا پیرو اور دوسرا اجنبی ہو جیسا کہ صفحۂ ۵۸ الف کی جدول سے ظاہر ہوتا ہے، وسطی و جنوبی ہند میں دوسری قوموں کے مقابلے میں ہندوؤں کی تعداد بدرجہا زیادہ ہے، اور یہ حالت خاص کر احاطۂ مدراس میں زیادہ نمایاں ہے۔ جہاں ہندوؤں کی آبادی کل آبادی کے ۸۹ فی صد سے کم نہیں ہے۔ دوسرے صوبے جہاں ہندو آبادی کی کثرت ہے آسام، بہار و اڑیسہ، صوبۂ متحدہ، وسطی ہند راجپوتانہ اور بمبئی ہیں۔ اس کے برخلاف شمال مغربی صوبۂ سرحدی، بلوچستان اور کشمیر میں تقریباً کل آبادی مسلمانوں کی ہے اور پنجاب، مشرقی بنگال اور سندھ میں دوسری قوموں کے مقابلے میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ بدھ مت کے پیرو، تقریباً سب کے سب برما میں آباد ہیں؛ چنانچہ وہاں کی آبادی کا ۸۵ فی صد حصہ بدھ مت کا پیرو ہے۔ علیٰ ہذا سکھ پنجاب میں محدود ہیں۔ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری میں ہندوستان میں جین مت کے پیروؤں کی تعداد ۱۲۵۲۱۰۵ تھی، اور اس مجموعے کا کم و بیش نصف حصہ احاطۂ بمبئی اور اس کے زیر اثر دیسی ریاستوں اور بڑودہ میں تھا۔[۲] جن قدیم و نیم مہذب قوموں کو "مظاہر پرستوں"[۳] کی ذیل میں شمار کیا جاتا ہے وہ زیادہ تر بہار و اڑیسہ، صوبۂ متوسط اور آسام میں پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ

46

۱۔ مردم شماری کی رپورٹ (بابتہ ۱۹۳۱ء) صفحہ ۳۸۷، اور ایک کتاب موسوم بہ "انڈین ایر بک بابتہ ۱۹۳۵ء صفحہ (۴۰)۔

۲۔ ہم نے ڈاکٹر تھراس صاحب کے ممنون ہیں کہ ان سے ہمیں یہ بات معلوم ہوئی! (چنانچہ دیکھو اکنامک جرنل Economic Journal ستمبر ۱۹۳۲ء صفحہ ۴۶۹)۔

۳۔ Animists

باب ۲

ایک خاصی بڑی تعداد بنگال، برما، مدراس، راجپوتانہ، وسطی ہند اور حیدرآباد میں بھی موجود ہے۔ عیسائیوں کی مجموعی آبادی کا ۲/۵ حصہ جنوبی ہند میں رہتا ہے۔ پارسی اور یہودی زیادہ تر احاطۂ بمبئی میں آباد ہیں۔

۶۔ آبادی کی تقسیم بلحاظ پیشہ

صفحہ ۶۴ پر مندرجہ اعداد[1] سے صرف یہی نہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان مختلف پیشوں کی اضافی اہمیت کیا ہے جن کے ذریعے سے باشندگان ہند کسب معاش کرتے ہیں، بلکہ یہ بھی کہ پیشہ زراعت کو کثیر غلبہ حاصل ہے اور یہی آبادی کے بیشترین حصے کا ذریعۂ معاش ہے۔

سنہ ۱۹۲۱ء کے بعد سے یہ خیال کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ آبادی کی تقسیم بہ لحاظ پیشہ میں کوئی بڑا تغیر ہوا ہے، بجز اس واقعے کے "نقل و حمل" کے تحت کچھ حقیقی اضافہ ہوا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ "دس سال کی مدت میں رسل و رسائل میں ہر جگہ اضافہ ہوگیا ہے، سڑکوں کی حالت بہتر ہوگئی ہے اور موٹروں کی آمد و رفت ہر جگہ ہونے لگی ہے۔" دماغی پیشوں اور فنون درسی کے تحت خفیف اضافہ ہوا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لکھے پڑھے لوگوں کی تعداد بتدریج زیادہ ہوتی جارہی ہے۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں مزدوروں کی مجموعی تعداد کے مقابلے میں زراعت میں کام کرنے والوں کا تناسب ۱۹ء۷۰ تھا، اور اس کے برخلاف سنہ ۱۹۳۱ء میں ۶۵ء۶ ہوگیا۔ ڈاکٹر ہٹن ناظم مردم شماری کی رائے میں یہ تخفیف حقیقی نہیں ہے بلکہ ظاہری ہے، اور اس کا باعث یہ ہے کہ زراعت سے جن عورتوں کی کفالت ہوتی ہے ان کی کثیر تعداد کو غلطی سے خانگی ملازموں میں محسوب کیا گیا ہے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ مزدوروں کی مجموعی تعداد کے مقابلے میں جہاں صنعتوں میں کام کرنے والے مزدوروں کا فی صد ۱۰ء۳۸ ہے وہیں ان میں سے صرف ۱ء۵ فی صد کی کفالت منظم صنعتوں کے ذریعے سے ہوتی ہے[2]۔

---

[1] دیکھو "برطانوی ہند کا اعدادی خلاصہ" Statistical Abstract of British India سنہ ۱۹۲۲ء تا سنہ ۱۹۲۳ء سے سنہ ۱۹۳۱ء تا سنہ ۱۹۳۲ء جدول نمبر (۱۸)

[2] نیز دیکھو باب ۲، جلد دوم۔

باقی مزدوروں کا بڑا حصہ غیر منظم صنعتوں میں مصروف ہے جو ذاتی اور خانہ داری کی ضرورتوں اور کام کے سادہ آلات کی بہم رسانی کے متعلق ہیں۔ ملک کے نظم و نسق اور اس کی حفاظت میں مزدوروں کی مجموعی تعداد کا صرف ½ فی صد حصہ مصروف ہے' اور بقیہ تعداد کی کفالت' خانہ داری' متفرق اور غیر پیداآور پیشوں سے ہوتی ہے۔ گو مختلف صوبوں میں زرعی پیشہ' دوسرے پیشوں پر مختلف تناسب کے ساتھ غالب ہے' پھر بھی کوئی ایسا علاقہ نہیں ہے جس میں زراعت کسی نہ کسی شکل میں صف اول میں نہ ہو۔ باوجود اس کے کہ کلکتہ ایک تجارتی شہر ہے اور بنگال' بہار اور اوڑیسہ میں بے شمار صنعتی و معدنی کاروبار جاری ہیں' مشرقی صوبوں کی آبادی کی بڑی اکثریت کا پیشہ زراعت ہی ہے اور ہندوستان کے کسی دوسرے خطے کے مقابلے میں یہاں زراعت کے ذریعے سے کسب معاش کرنے والوں کی تعداد کا فی صد بہت زیادہ ہے۔ صنعتی مزدوروں کی حد تک مقامی آبادی کا سب سے بڑا متناسب حصہ پنجاب' صوبہ متحدہ اور بمبئی میں موجود ہے۔ لیکن ان تینوں صوبوں کے منجملہ پہلے دو صوبوں کی معاشی زندگی میں زراعت ہی کو غلبہ حاصل ہے' اور گو صنعتی پیشوں میں اشخاص کی کثیر تعداد مصروف ہے پھر بھی یہ پیشے زیادہ تر گھریلو صنعت کی نوعیت رکھتے ہیں۔ بمبئی میں' منظم صنعت کی ترقی کسی حد تک معاشی اہمیت رکھتی ہے؛ لیکن سردست وہ زیادہ تر چند بڑے بڑے شہروں تک محدود ہے۔ غیر مشخصہ پیشوں کی ذیل میں اشخاص کی اکثریت مزدور پیشہ ہے جن کی محنت مخصوص و معین شکل نہیں رکھتی' اور بقیہ اشخاص زیادہ تر غیر معین محرر ہیں۔

دنیا کے مہذب و متمدن ممالک میں ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں زراعت پر انحصار کرنے والی آبادی کا تناسب سب سے بڑا ہے' اور صنائع' تجارت' نقل وحمل وغیرہ میں کام کرنے والی آبادی کا تناسب سب سے کم ہے۔ چنانچہ اس واقعہ کی توضیح مندرجۂ ذیل جدول میں کی گئی ہے[1] جس میں یہ

[1] دیکھو بہمنت نرائن کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان کی آبادی" صفحہ ۹۲۔

بتایا گیا ہے کہ ہر پیشے کے ذریعے سے مجموعی آبادی کے کتنے فی صد کی کفالت ہوتی ہے۔

ملک مع سال مردم شماری	حیوانات و نباتات کا استعمال	کان کنی اور صنعت	تجارت اور نقل و حمل
جرمنی سنہ ۱۹۰۷ء	۲۸٫۶	۴۲٫۲	۱۳٫۴
آسٹریا سنہ ۱۹۱۰ء	۴۸٫۴	۲۶٫۵	۱۲٫۴
اٹلی سنہ ۱۹۱۱ء	۳۴٫۲	۱۶٫۹	۵٫۰
اسپین سنہ ۱۹۱۰ء	۲۱٫۱	۵٫۲	۱٫۵
فرانس سنہ ۱۹۱۱ء[1]	۴۰٫۷	۳۵٫۸	۹٫۸
ہالینڈ سنہ ۱۹۰۹ء	۱۰٫۹	۱۳٫۵	۷٫۵
ڈنمارک سنہ ۱۹۱۱ء	۳۶٫۴	۲۷٫۳	۱۶٫۶
سوٹزرلینڈ سنہ ۱۹۱۰ء	۲۷٫۷	۴۲٫۷	۱۶٫۴
برطانیۂ عظمیٰ و آئرلینڈ (صرف مزدور) سنہ ۱۹۱۱ء[2]	۱۱٫۶	۵۶٫۸	۱۳٫۱
ریاستہائے متحدہ (دس سال سے زیادہ عمر کے مزدور) سنہ ۱۹۲۰ء	۲۶٫۳	۳۳٫۴	۱۷٫۹
ہندوستان سنہ ۱۹۲۱ء	۶۶٫۴	۹٫۵	۷٫۰

49

اگر کسی ملک کی معاشیات کا انحصار اتنی بڑی حد تک زراعت پر ہوجتنا کہ ہندوستان کا ہے تو، اس ملک کی معاشیات کا غیر مستقل و غیر ثبات پذیر رہنا ضروری ہے۔ زراعت پر انحصار کے معنے بارش پر انحصار کے ہیں؛ اور اگر بارش نہ ہو تو، اس کے نتیجے کے طور پر تکلیف و مصیبت کا دور دورہ ہوگا اور باشندوں

[1] ان اعداد کا تعلق صرف مزدوروں سے ہے۔

[2] قریب ترین زمانے کے اعداد و شمار (سنہ ۱۹۲۱ء) سے معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان میں تقریباً ۵۰ فی صد مزدوروں کا ذریعۂ معاش صنعت ہے اور ۸ فی صد کا ذریعۂ معاش زراعت ہے۔

باب

کی اکثریت اس سے متاثر ہوگی۔ اگر باشندوں کا بڑا حصہ زراعت پر براہِ راست انحصار کرنا ترک کر دے تو ایسی صورت پیدا نہ ہوگی۔ ۱۸۸۰ء کے قحط کمیشن نے صورت حال کے متعلق نہایت صحیح اندازہ لگایا جب اس نے یہ خیال ظاہر کیا کہ "ہندوستان کے باشندوں کے افلاس اور ان کو پیش آنے والے خطرات و مصائب کا باعث بڑی حد تک یہ بدبختانہ واقعہ ہے کہ زراعت، آبادی کے بڑے حصے کا تقریباً واحد پیشہ ہے؛ اور اس صورتِ حال کی اصلاح کی تدبیر کے طور پر کمیشن سفارش کرتا ہے کہ صنعتوں کو ترقی دی جائے۔ ملک کے معاشی ذرائع کی ہر جہتی ترقی کے ذریعے سے آبادی کو اس سے زیادہ مساویانہ طور سے پیشوں میں تقسیم کرنا نہایت مناسب اور ضروری ہے۔

۷۔ شہروں اور دیہات کی آبادی[1]

شہروں اور دیہی علاقوں میں آبادی کی تقسیم سے زراعت کی غالب حیثیت کا مزید ثبوت ملتا ہے، اس لیے کہ لوگوں کے پیشے ان کی بود و باش کے مقام کا تعین کرتے ہیں۔ مجموعی آبادی کے مقابلے میں شہری آبادی کا فی صد ۱۹۲۱ء میں ۲ر۱۰ تھا، جو ۱۹۳۱ء میں کچھ بڑھ کر ۱۱ فی صد ہو گیا۔ مندرجۂ ذیل اعداد سے شہری اور دیہی آبادیوں کے تغیرات معلوم ہوں گے؛ اور "مجموعی آبادی کے مقابلے میں شہری آبادی کا بہت ہی قلیل تناسب اس واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مجموعی آبادی اور دیہی آبادی کے تغیرات قریب قریب برابر ہیں، اور اس کے برخلاف مجموعی آبادی اور شہری آبادی کے تغیرات میں بہت بڑا تفاوت ہے۔

اضافہ از ۱۹۲۱ء تا ۱۹۳۱ء

مجموعی	شہری	دیہی
۶ر۱۰ فی صد	۲۰ فی صد	۶ر۹ فی صد

[1] مردم شماری کی رپورٹ بابتہ ۱۹۳۱ء جلد اول صفحہ ۴۴۔

جدول الف

مقاموں کی تقسیم	سنہ ۱۹۳۱ء مقاموں کی تعداد	سنہ ۱۹۳۱ء آبادی	سنہ ۱۹۲۱ء مقاموں کی تعداد	سنہ ۱۹۲۱ء آبادی	مجموعی آبادی فی ہزار کے شمار سے: سنہ ۱۹۳۱ء	سنہ ۱۹۲۱ء	سنہ ۱۹۱۱ء	سنہ ۱۹۰۱ء	سنہ ۱۸۹۱ء
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰
مجموعی آبادی	۶۹۹،۴۰۲	۳۵۲،۸۳۷،۷۷۸	۶۸۷،۹۸۱	۳۱۸،۹۴۲،۴۸۰	۱۰۰۰	۱۰۰۰	۱۰۰۰	۱۰۰۰	۱۰۰۰
شہری علاقے	۲،۵۷۵	۳۸،۹۸۵،۴۲۶	۲،۳۱۶	۳۲،۴۷۵،۲۷۶	۱۱۰	۱۰۲	۹۴	۹۶	۹۵
شہر جن کی آبادی حسب ذیل ہے:- ۱- ایک لاکھ اور اس سے زائد-	۳۸	۹،۶۷۴،۰۳۲	۳۵	۸،۲۱۱،۷۰۴	۲۷	۲۶	۲۲	۲۲	۲۲
۲- ۵۰ ہزار تا ایک لاکھ	۶۵	۴،۵۷۲،۱۱۳	۵۴	۳،۵۱۷،۷۴۹	۱۳	۱۱	۹	۱۲	۱۱
۳- ۲۰ ہزار تا ۵۰ ہزار	۲۶۸	۸،۰۹۱،۲۸۸	۲۰۰	۵،۹۶۸،۷۹۴	۲۳	۱۹	۱۸	۱۷	۱۶
۴- ۱۰ ہزار تا ۲۰ ہزار	۵۴۳	۷،۴۴۹،۴۰۲	۴۵۱	۶،۲۲۰،۸۸۹	۲۱	۱۹	۲۰	۲۳	۱۹
۵- ۵ ہزار تا ۱۰ ہزار	۹۸۷	۶،۹۹۲،۸۳۲	۸۸۵	۶،۲۲۳،۰۱۱	۳۰	۲۰	۱۹	۲۰	۲۱
۶- ۵ ہزار سے کم	۶۷۴	۲،۲۰۵،۷۶۰	۶۹۱	۲،۲۳۳،۱۲۹	۶	۷	۶	۶	۶
دیہی علاقے	۶۹۶،۸۳۱	۳۱۳،۸۵۲،۳۵۱	۶۸۵،۶۶۵	۲۸۶،۴۶۷،۲۰۴	۸۹۰	۸۹۸	۹۰۶	۹۰۱	۹۰۵

باب ۲

سب سے زیادہ ترقی بیس ہزار تا پچاس ہزار آبادی کے شہروں میں رونما ہوئی ہے، چنانچہ ان کی مجموعی آبادی اب پچاس ہزار تا ایک لاکھ نفوس کے شہروں کی آبادی سے تقریباً دوگنی ہوگئی ہے، اور ان ۳۸ شہروں کی آبادی سے بہت کم نہیں ہے جن کی انفرادی آبادی ایک لاکھ سے زائد ہے۔ بڑے صنعتی اور نیم صنعتی شہروں نے ان چھوٹے شہروں کے نقصان سے ترقی کی ہے جن کی آبادی دس ہزار یا اس سے کم ہے۔

شہری آبادی کا اوسط آسام کے ۳ر۴ فی صد سے بمبئی کے ۲۲ر۲۲ فی صد تک ہے؛ چنانچہ ہندوستان کے بڑے صوبوں کے مقابلے میں بمبئی پریسیڈنسی میں شہری آبادی سب سے زیادہ تعداد میں ہے۔

ہندوستان کی بحیثیت مجموعی ۱۱ فی صد شہری آبادی کے مقابلے میں فرانس کی شہری آبادی ۴۹ فی صد، شمالی آئرستان کی ۵۰ر۸ فی صد، کینیڈا کی ۵۳ر۷ فی صد، ریاستہائے متحدہ امریکا کی ۵۶ر۲ فی صد اور انگلستان اور ویلز کی ۸۰ فی صد ہے۔

51

پچھلے صفحے کی جدول ۱ الف[1] سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دیہی علاقوں میں اور بہ لحاظ وسعت مختلف درجے کے شہروں میں آبادی کی تقسیم کیا ہے، اور یہ امر پوری طرح واضح ہوتا ہے کہ گزشتہ کم و بیش ۴۰ سال میں شہری آبادی نے بہت کم ترقی کی ہے۔

جدول ب سے بڑے بڑے شہرون کا حال معلوم ہوتا ہے جن کی آبادی ایک لاکھ سے زائد ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں ایسے شہر صرف ۳۹ ہیں، اور ان میں سے صرف سات کی آبادی چار لاکھ سے زائد ہے۔

اکثر مغربی ممالک میں انیسویں صدی میں منظم صنعتوں نے بہت ترقی کی جس کے نتیجے کے طور پر شہری آبادی میں غیر معمولی سرعت کے ساتھ اضافہ رونما ہوا۔ برخلاف اس کے ہندوستان میں شہری آبادی

[1] رپورٹ مردم شماری بابتہ ۱۹۳۱ء جلد اول حصۂ اول صفحہ ۴۶۔

باب ۲

جدول ب

شہر	آبادی	شہر	آبادی
کلکتہ[۱]	۱،۴۸۵،۵۸۲	پٹنہ	۱۵۹،۶۹۰
بمبئی	۱،۱۶۱،۳۸۳	مانڈلے	۱۴۷،۹۳۲
مدراس	۶۴۷،۲۳۰	شولاپور	۱۴۴،۶۵۴
حیدرآباد	۴۶۶،۸۹۴	جے پور	۱۴۴،۱۷۹
دہلی	۴۴۷،۴۴۲	بریلی	۱۴۴،۰۳۱
لاہور	۴۲۹،۷۴۷	ترچناپلی	۱۴۲،۸۴۳
رنگون	۴۰۰،۴۱۵	ڈھاکہ	۱۳۸،۵۱۸
الہ آباد	۳۱۳،۷۸۹	میرٹھ	۱۳۶،۷۰۹
بنگلور	۳۰۶،۴۷۰	اندور	۱۲۷،۳۲۷
لکھنؤ	۲۷۴،۶۵۹	جبل پور	۱۲۴،۳۸۲
امرتسر	۲۶۴،۸۴۰	پشاور	۱۲۱،۸۶۶
کراچی	۲۶۳،۵۶۵	اجمیر	۱۱۹،۵۲۴
پونا	۲۵۰،۱۸۷	ملتان	۱۱۹،۴۵۷
کانپور	۲۴۳،۷۵۵	راول پنڈی	۱۱۹،۲۸۴
آگرہ	۲۲۹،۷۶۴	بڑودہ	۱۱۲،۸۶۲
ناگپور	۲۱۵،۱۶۵	مرادآباد	۱۱۰،۵۶۰
بنارس	۲۰۵،۳۱۵	ٹنے ویلی	۱۰۹،۰۶۸
الہ آباد	۱۸۳،۹۱۴	میسور	۱۰۷،۱۴۲
مدورا	۱۸۲،۰۱۸	سیلم	۱۰۲،۱۷۹
سری نگر	۱۷۳،۵۷۳		

[۱] مع مضافات اور ہوڑا کو شامل کرکے۔

نمایاں طور سے حالتِ جمود ہی میں رہی[1] صنعتی انقلاب کی بدولت انگلستان کی شہری آبادی میں جو کثیر اضافہ واقع ہوا وہ اس قدر مشہور واقعہ ہے کہ اس پر یہاں تفصیل کے ساتھ بحث کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

موجودہ زمانے میں یہاں شہروں اور دیہات میں آبادی کی تقسیم بہت زیادہ غیر مساوی ہے اور شہروں میں کل آبادی کا بہت ہی قلیل جزو فروکش ہے؛ یہ اہلِ ہند کی معاشی پسماندگی کی بین علامت ہے۔ رانا ڈے نے ترقی پذیر دیہی زندگی اور پیشے پر تبصرہ کرتے ہوئے (اس لیے کہ وہ ایسے زمانے میں لکھ رہے تھے جب کہ شہروں میں بسنے اور شہری پیشے اختیار کرنے کی خفیف سی معکوس تحریک بھی ظاہر نہ ہوئی تھی) بتایا کہ اس کے معنے قوت، ذہانت اور خود حصری کے زائل و سلب ہو جانے کے ہیں۔ تہذیب و ترقی نے ہمیشہ شہروں میں جنم لیا اور یہاں سے ان کی شعاعیں دیہات میں پہنچیں، ورنہ دیہات نے اپنی حالت پر قائم رہکر شاذ ہی ترقی پذیر نشوونما کی صلاحیت ظاہر کی۔ ہندوستان کی شہری اور دیہاتی آبادی کی موجودہ تقسیم کو شہروں کی موافقت میں صرف اس طریقے سے از سرتاپا بدلا جا سکتا ہے کہ صنائع، تجارت اور نقل و حمل کو ترقی دی جائے۔ اس میں کلام نہیں کہ ہمیں ان خطرات سے کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے جو لندن، نیویارک، بمبئی اور کلکتہ جیسے چند بڑے شہروں میں کثیر آبادی کے اجتماع سے منسوب کئے جاتے ہیں؛ لیکن اگر متوسط درجے کے شہر تمام ملک میں پھیلے ہوئے ہوں تو اس کی بدولت بڑے پیمانے کی پیدائش کے جملہ کفایات اور شہری زندگی کی جملہ راحتیں اور سہولتیں حاصل ہوں گی، اور اس کے ساتھ جدید شہروں کے کثیف اور گندہ علاقوں میں اخلاقی و جسمانی صحت کے خطرات سے بچنے کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔

[1] سر فریڈرک سائکس نے حال (۱۹۲۳ء) میں ڈیلی ٹیلیگراف کو ایک مضمون "ہندوستان میں تنظیم جدید" کے عنوان سے بھیجا تھا، اس میں اس تضاد کو بہ خوبی واضح کیا گیا ہے۔ انگلستان میں ۴/۵ آبادی شہروں میں رہتی ہے، برخلاف اس کے ہندوستان میں ۹/۱۰ حصہ دیہات میں رہتا سہتا ہے۔

باب ۲

۸۔ آبادی کی صنفی تقسیم

سالہ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہر ہزار مردوں میں عورتوں کا تناسب ۹۴۰ ہے۔ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی کثرت ظاہر کرنے والے برطانوی ہند کے صوبے صرف مدراس، بہار، اور اوڑیسہ ہیں مندرجۂ ذیل جدول میں بتایا گیا ہے کہ ہندوستان کی آبادی کی مختلف عمروں میں صنفی ترکیب کیا ہے یا دوسرے الفاظ میں فی ہزار مرد کتنی عورتیں ہیں، اور اس حیثیت سے ہندوستان کا بعض دوسرے ملکوں سے مقابلہ کیا گیا ہے۔ [۱]

نام ملک	سال	۰ تا ۱۰	۱۰ تا ۲۰	۲۰ تا ۳۰	۳۰ تا ۴۰	۴۰ تا ۵۰	۵۰ تا ۶۰	۶۰ تا ۷۰	۷۰ اور اس سے زیادہ
جرمنی	۱۹۱۰	۹۸۹	۹۹۵	۱۰۰۱	۱۰۰۴	۱۰۳۳	۱۱۱۲	۱۲۱۹	۱۳۱۴
آسٹریا	۱۹۱۰	۹۸۹	۱۰۲۳	۱۰۴۳	۱۰۴۹	۱۰۸۷	۱۰۷۱	۱۱۱۸	۱۱۹۹
اٹلی	۱۹۱۱	۹۶۳	۱۰۱۷	۱۱۲۱	۱۱۰۸	۱۰۵۷	۱۰۳۱	۲۰۲۸	۱۰۳۸
ہنگری	۱۹۱۰	۹۹۰	۱۰۱۲	۱۰۵۹	۱۰۵۱	۱۰۲۸	۹۹۳	۱۰۱۷	۱۰۶۱
فرانس	۱۹۱۱	۹۸۹	۹۹۴	۱۰۲۱	۱۰۰۸	۱۰۲۶	۱۰۵۹	۱۱۵۵	۱۳۰۰
انگلستان و ویلز	۱۹۱۱	۹۹۶	۱۰۰۹	۱۱۱۴	۱۰۸۲	۱۰۷۸	۱۰۹۳	۱۱۷۶	۱۴۱۶
ریاستہائے متحدہ امریکا	۱۹۱۰	۹۶۹	۹۹۰	۹۵۳	۹۰۳	۸۸۴	۸۵۹	۹۲۵	۱۰۲۳
جاپان	۱۹۱۳	۹۸۶	۹۶۸	۹۷۷	۹۹۹	۹۴۹	۹۶۷	۱۰۴۲	۱۲۱۰
ہندوستان	۱۹۱۱	۹۹۲	۸۷۴	۱۰۲۴	۹۱۰	۹۱۲	۹۵۰	۱۰۹۲	[۲]
ہندوستان	۱۹۲۱	۹۹۸	۸۶۹	۱۰۲۲	۹۰۵	۹۰۲	۹۲۶	۱۰۴۹	

۱۔ دیکھو برج نرائن کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۲۴۔

۲۔ ان اعداد میں وہ سب لوگ شریک ہیں جن کی عمر ۶۰ یا اس سے متجاوز تھی۔

باب ۲

اس جدول سے بعض دلچسپ واقعات کا انکشاف ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ سب سے کم عمر جماعت (یا۔تا۔۱سال کی عمر والوں) میں تمام ملکوں میں مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی تعداد کم ہے[1] لیکن جوں جوں ہم زیادہ عمر والوں کے درجے کی جانب بڑھتے ہیں، ہندوستانی حالات مردوں کے مقابلے میں عورتوں کے تناسب کو مختلف ظاہر کرنے لگتے ہیں؛ اور عام نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ ہندوستان کے حالات یورپ کے حالات کے برخلاف عورتوں کی زندگی کے لیے نمایاں طور سے ناموافق ہیں۔ چنانچہ ہندوستان میں دس سال کی عمر سے اور خاص کر سن بلوغ پر پہنچ جانے کے بعد، عورتوں کی شرح اموات مردوں کی شرح اموات سے زیادہ معلوم ہوتی ہے جو یورپ کے حالات کے برعکس تجربہ ہے۔ اس کی ایک توجیہ اس واقعے سے ملتی ہے کہ پردہ جیسے بعض معاشری رسم و رواج خاص کر ان عورتوں کی صحت پر نہایت مضر اثر ڈالتے ہیں جو گنجان شہروں میں رہتی ہیں۔ پردہ، خوش حال مسلمانوں اور ان علاقوں کے ہندوؤں میں پایا جاتا ہے جہاں مسلمانوں کا اثر بہت قوی رہا ہے۔ لیکن عورتوں میں کثرت اموات کا سب سے بڑا سبب کم سنی کا بیاہ ہے جو لڑکیوں کو ایسی عمر میں حاملہ بن جانے کے خطرے میں مبتلا کر دیتا ہے جس میں جسمانی نشو و نما مکمل نہیں ہوتی جیسا کہ بڑھوتری کی

53

[1] یوں تو لڑکیوں کی ولادت کی کمی ایک عام واقعہ ہے، چنانچہ ہندوستان میں تولد شدہ ہر ۱۰۰۰ لڑکیوں کے مقابلے میں ۱۰۴۸ لڑکے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن یورپی ملکوں میں اس عدم مساوات کی اصلاح، بچوں کی اموات کی اس اعلیٰ شرح سے ہو جاتی ہے جو لڑکیوں کے مقابلے میں لڑکوں کے بارے میں ہے۔ وٹل کا مقولہ ہے کہ "اساسی لحاظ سے عورت، مرد کے مقابلے میں، زیادہ طاقتور ہے" (دیکھو ان کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۱۷)۔ پھر بھی ہندوستان میں لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کی تعداد کی کمی کو بعض اوقات اس بات کی علامت تصور کیا جاتا ہے کہ لڑکیوں کی حد تک طفل کشی کا رواج پوری طرح معدوم نہیں ہوا ہے۔ چنانچہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ رسم نہ صرف گھٹیا اور نیچ قوموں میں بلکہ کسی حد تک جاٹ، کھتری، گوجر، راجپوت وغیرہ جیسی معزز اور مشہور قوموں میں بھی پائی جاتی ہے۔ دیکھو مردم شماری کی رپورٹ (بابتہ ۱۹۲۱ء) جلد اول ضمیمہ (۶)۔

مردم شماری بابتہ سنہ ۱۹۱۱ء کے مہتمم نے کہا ہے "بیشمار لڑکیاں جو مائیں بن جاتی ہیں، عروسی خواب گاہ سے مرگھٹ کی چتا تک کی مسافت بہت تیزی کے ساتھ طے کر جاتی ہیں اور اعصابی کمزوری، دق اور رحمی شکایتوں کا بری طرح شکار ہوتی ہیں"۔ جیسا کہ سر جان میگانے سنہ ۱۹۲۳ء میں تحقیق کرنے کے بعد بتلایا ہے، ہندوستان میں زچاؤں کی اموات کی شرح بحیثیت مجموعی ۰۵ء ۲۴ فی ہزار ہے۔ بہ قول موصوف بنگال میں یہ شرح قریب ۵۰ فی ہزار رہے۔ انگلستان میں محض اس بنا پر اضطراب کا اظہار کیا جاتا ہے کہ وہاں شرح ۱۱ء ۴ فی ہزار ہے، گویا اس شرح کو بھی بہت زیادہ خیال کیا جاتا ہے۔ ایک اور ممکنہ سبب یہ ہے کہ ہندوستان میں عورتوں کی زندگی مغرب کے مقابلے میں بہت کم قیمت مانی جاتی ہے اور صرف مردوں ہی کا یہ خیال نہیں ہے بلکہ خود عورتیں بھی ایسا ہی سمجھتی ہیں؛ چنانچہ اس کے نتیجے کے طور پر عورتوں کی صحت کی جانب دیدہ و دانستہ بہت بے پروائی اور بے التفاتی برتی جاتی ہے۔ ابتدائی سالوں میں لڑکیوں کی داشت میں کم اور لڑکوں کی داشت میں زیادہ توجہ کی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں ایک سبب یہ واقعہ بھی ہے کہ کھیتوں اور کارخانوں میں کام کرنے والی عورتوں کو وضع حمل سے پیشتر اور بعد ضروری آرام لینے اور وقفے سے متمتع ہونے کا شاذ ہی موقع ملتا ہے اور کثرت کار کی وجہ سے ان کی صحت خراب اور جسمانی حالت کمزور ہو جاتی ہے۔ دیہاتی قابلہ کی غیر ماہرانہ دایہ گری بھی ایک مزید مؤید سبب ہے۔ اس صورتِ حالات میں جو چیز خاص طور پر تشویش کا باعث ہے وہ یہ واقعہ ہے کہ ہر مردم شماری کے موقع پر مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی تعداد کا تناسب قطعی طور پر زیادہ سے زیادہ گھٹتا ہوا معلوم ہو رہا ہے۔

یوں تو عام آبادی میں عورتوں کی تعداد کم ہی ہے، لیکن شہروں کی آبادی میں یہ کمی بہت زیادہ ہے؛ اور یہ حالت مغربی ممالک کے بالکل برعکس ہے، چنانچہ وہاں کے شہروں میں عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلے میں بڑی حد تک زیادہ ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ہندوستان کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور عارضی طور پر نقل مقام کرتے ہیں اور اپنے اہل و عیال کو

باب ۳

شہروں میں بہت شاذ لاتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ شہری صنعتوں میں عورتوں سے بہت کم کام لیا جاتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۱ء میں عورتوں کی تعداد ہر ہزار مردوں میں کلکتے میں صرف ۴۷۹ اور بمبئی میں ۵۵۴ تھی۔

یہ کہنے کی بہ مشکل ضرورت ہے کہ شہروں میں عورتوں کی قلت کا اثر مزدوروں کی صحت و آسائش اور ان کے اخلاق پر نہایت مضر پڑتا ہے۔

ہندوستان میں عورتوں کی مجموعی تعداد کے مقابلے میں مزدور پیشہ عورتوں کا فی صد ۲۵ ہے۔ اس کے مقابلے میں انگلستان اور ویلز میں کم و بیش ۲۹، فرانس میں ۳۹ اور ریاستہائے متحدۂ امریکہ میں ۱۸ ہے۔ اس لحاظ سے مغرب کے بعض سب سے زیادہ ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں ہندوستان کا فی صد کم نہیں ہے یہ غالباً ایک تعجب خیز امر ہے اور اس کو اس بات کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے کہ عورتوں کی صرف قلیل تعداد پردے کے زیر اثر ہے۔ علاوہ ازیں اس سے ہندوستان کے افلاس پر بھی ضمنی طور پر روشنی پڑتی ہے، اس لیے کہ ہندوستان میں مردوں کی کسب معاش کی صلاحیت میں اصلاح و ترقی ہوتے ہی عورتیں مزدوری کے پیشے سے بالعموم دست کش ہو جایا کرتی ہیں۔ عزت و آبرو کے مروجہ خیالات کی بنا پر گھر کی عورتوں کے لئے تا حد امکان تلاش معاش کی غرض سے باہر نکلنے کی روک تھام کی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے مزدوری پیشہ عورتوں کی تعداد کی کثرت یہ ظاہر کرتی ہے کہ ملک میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اپنی عورتوں کے لیے بےکاری کے تعیش کو برداشت کر سکتے ہیں۔ خاندان کی آمدنی میں تھوڑا سا اضافہ کرنے کی خاطر، ان کو کام پر لگایا جاتا ہے، اگرچہ بادل ناخواستہ[1]۔

[1] ۔ مردم شماری کے اغراض کے لیے ایسی عورت کو بھی مزدور شمار کیا جاتا ہے جو اساسی طور سے خانہ داری میں مصروف ہو اور اپنے وقت کا صرف ایک قلیل جزو آمدنی والے پیشے میں صرف کرتی ہو۔ گو افلاس کا جہاں تک تعلق ہے وہاں تک، اس نتیجے کی بنیاد اس واقعے پر قایم کرنا بظاہر بالکل حق بجانب ہے کہ قومی معاشری تعصبات کے باوجود عورتوں کی کثیر تعداد تلاش معاش میں گھر سے باہر نکلنے پر

باب ۳
55

۹۔ تقسیم آبادی بلحاظ عمر

مردم شماری بابتہ ۱۹۳۱ء کی رپورٹ میں مندرجۂ ذیل اعداد موجود ہیں جن سے ۱۸۹۱ء تا ۱۹۳۱ء کے پانچ عشروں میں ہندوستان کی آبادی کے ۱۰ ہزار مردوں اور عورتوں کی عمروار تقسیم کا حال دہ سالہ گروہ بندی کے لحاظ سے معلوم ہوتا ہے۔

گروہ بلحاظ عمر	۱۹۳۱		۱۹۲۱		۱۹۱۱		۱۹۰۱		۱۸۹۱	
	مرد	عورتیں	مرد	عورتیں	مرد	عورتیں	مرد	عورتیں	مرد	عورتیں
۰ تا ۱۰ سال	۲۸۰۲	۲۸۸۹	۲۶۷۳	۲۸۱۰	۲۷۱۰	۲۸۱۶	۲۶۴۸	۲۷۲۱	۲۸۳۷	۲۹۲۳
۱۰ تا ۲۰ سال	۲۰۸۹	۲۰۹۲	۲۰۸۷	۱۸۹۶	۲۰۱۳	۱۸۲۳	۲۱۳۰	۱۹۱۷	۱۹۷۴	۱۷۵۸
۲۰ تا ۳۰ سال	۱۷۶۸	۱۸۵۶	۱۶۴۰	۱۷۶۶	۱۷۱۸	۱۸۳۹	۱۶۶۶	۱۷۸۷	۱۶۷۴	۱۸۰۱
۳۰ تا ۴۰ سال	۱۴۳۱	۱۳۵۱	۱۴۶۱	۱۳۹۸	۱۴۵۱	۱۳۹۱	۱۴۵۷	۱۴۰۸	۱۶۷۸	۱۴۰۱
۴۰ تا ۵۰ سال	۹۶۸	۸۹۱	۱۰۱۳	۹۶۷	۱۰۱۴	۹۶۹	۱۰۱۹	۹۹۱	۱۴۵۵	۹۴۹
۵۰ تا ۶۰ سال	۵۶۱	۵۴۵	۶۱۶	۶۰۶	۶۰۹	۶۰۷	۶۱۴	۶۲۱	۱۰۰۴	۵۹۶
۶۰ تا ۷۰ سال	۲۶۸	۲۸۱	۳۴۷	۳۷۷	۳۴۰	۳۸۰	۴۶۶	۵۵۵	۴۶۲	۵۷۳
۷۰ سال اور اس سے زاید	۱۱۵	۱۲۵	۱۶۰	۱۸۰	۱۴۵	۱۷۵				
اوسط عمر	۲۳۱۲	۲۲۱۸	۲۴۱۸	۲۴۱۷	۲۴۹۷	۲۴۱۷	۲۴۱۷	۲۵۱۱	۲۴۱۴	۲۴۱۹

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ مجبور ہو جاتی ہے" تاہم یہ توجیہ اس عام استدلال کی صحت پر اثر انداز نہیں ہوتی کہ ہندوستان کی نسوانی محنت کی مجموعی "مقدار" مغربی ممالک کے مقابلے میں نسبتاً بہت قلیل ہے۔ ہندوستان میں رسم و رواج اور تعصب اکثر پیشوں کا دروازہ عورتوں کے لیے مسدود کر دیتے ہیں جس کے باعث نسوانی محنت کی بڑی مقدار ضایع جاتی ہے اور قومی مقسوم کی مقدار اس سے کم ہوتی ہے جتنی کہ ہونی چاہیے۔ مزدور پیشہ عورتوں کی تعداد تو بڑی ہے؛ لیکن ان میں سے اکثر چونکہ دن کے کچھ حصے میں اور گاہے ماہے کام کرتی ہیں اس لیے اجرتی محنت کے مجموعے میں ان کی محنت کے حصے کی مقدار مرد مزدوروں کے حصے کے مقابلے میں حقیر اور نظر انداز کرنے کے قابل ہے۔ علاوہ ازیں یہاں عورتوں کے لیے جن پیشوں کے دروازے بند ہیں ان کی تعداد مغرب کے ترقی پذیر ممالک کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔

باب

ترکیب آبادی بلحاظ عمر میں معاشی حیثیت سے سب سے زیادہ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ مجموعی آبادی سے مزدوروں یا (موثر آبادی) کا کیا تناسب ہے۔ ہر ملک کی آبادی کی تقسیم بہ لحاظ عمر کو مخروطی شکل میں ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ کم عمر والے گروہ، آبادی کے سب سے بڑے حصے کی نمائندگی کرتے ہیں اور یہی بظاہر اس مخروط کا قاعدہ ترتیب دیتے ہیں؛ جوں جوں ہم زیادہ عمر والے گروہوں پر پہنچیں گے مخروط تنگ اور چھوٹا ہوتا جائے گا، یہاں تک کہ وہ چھوٹا ہوتے ہوتے آخر میں نقطے پر ختم ہوگا، اس لیے کہ ایک مقررہ عمر کے بعد لوگ زندہ ہی نہ رہینگے کہ ان کی تعداد کا اندراج کیا جائے۔ مجموعی آبادی میں مختلف عمر والے گروہوں کے تناسب کے مطابق مخروط کی شکل بھی مختلف ہوگی۔ چنانچہ ہندوستان کی حد تک عمر کے مخروط کا قاعدہ دنیا کے سب ممالک کے عمر کے مخروطوں کے قاعدوں سے زیادہ چوڑا ہے، جس کا باعث یہ ہے کہ یہاں شرح ولادت بہت اعلیٰ ہے۔ ہندوستان میں دس سال سے کم عمر والے بچوں کا تناسب سب ممالک کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ علیٰ ہذا مخروط کا بالائی حصہ بھی دوسرے تمام ملکوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تنگ اور گاؤدم ہو کر اوپر کے نقطے پر پہنچتا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کے باشندوں کی عمریں بہت کم طویل ہوتی ہیں۔ دوسرے ملکوں کے مقابلے میں یہاں ایسے لوگ بہت کم تعداد میں ہیں جو پچاس سال سے زیادہ زندہ رہتے ہوں؛ چنانچہ مندرجۂ ذیل جدول سے اس کا حال معلوم ہوگا جس میں عمر کی تقسیم فی ہزار آبادی کے لحاظ سے بتائی گئی ہے:۔

58

←	جرمنی	فرانس	انگلستان و ویلز	ریاستہائے متحدہ	جاپان	برطانوی ہند	
	سنہ ۱۹۱۰ء	سنہ ۱۹۱۱ء	سنہ ۱۹۱۱ء	سنہ ۱۹۱۰ء	سنہ ۱۹۱۳ء	سنہ ۱۹۱۱ء	سنہ ۱۹۲۱ء
دس سال سے کم	۲۳۴	۱۷۱	۲۰۹	۲۲۲	۲۴۴	۲۷۶	۲۷۴
۱۰ تا ۲۰ سال	۲۰۳	۱۶۶	۱۹۰	۱۹۸	۱۹۸	۱۹۲	۱۹۸
۲۰ تا ۳۰ سال	۱۶۴	۱۵۸	۱۷۳	۱۸۷	۱۵۴	۱۷۸	۱۷۰
۳۰ تا ۴۰ سال	۱۳۹	۱۴۰	۱۵۲	۱۴۶	۱۳۸	۱۴۲	۱۴۳

باب ۲

عمر	جرمنی	فرانس	انگلستان و ویلز	ریاستہائے متحدہ	جاپان	برطانوی ہند	
	سنہ ۱۹۱۰ء	سنہ ۱۹۱۱ء	سنہ ۱۹۱۱ء	سنہ ۱۹۱۰ء	سنہ ۱۹۱۳ء	سنہ ۱۹۱۱ء	سنہ ۱۹۲۱ء
۴۰ تا ۵۰ سال	۱۹۵	۱۲۷	۱۱۵	۱۰۶	۱۰۱	۹۶	۹۴
۵۰ تا ۶۰ سال	۷۶	۱۰۴	۸۰	۷۲	۷۷	۶۱	۶۱
۶۰ تا ۷۰ سال	۵۱	۷۷	۵۱	۴۳	۵۷	۳۶	۳۶
۷۰ اور اس سے زاید سال	۲۴	۴۹	۳۰	۲۶[1]	۳۱	۱۶	۱۷

اوپر کی جدول سے واضح ہوگا کہ پہلے اور دوسرے گروہ کی تعداد کا درمیانی فرق ہندوستان میں سب سے زیادہ ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بچوں کی اموات کی شرح بہت بڑی ہے۔ اسی طریقے سے ۵۰ سال اور اس سے زیادہ عمر والوں کی نمایندگی کرنے والے آخری تین گروہوں میں ہندوستان میں اشخاص کی تعداد کمترین ہے۔

یورپ میں مزدور پیشہ یا پیداآور آبادی کی عمروں کے عام طور پر مسلمہ حدود ۱۵ اور ۶۰ یا ۶۵ سال کے درمیان ہیں۔ برخلاف اس کے ہندوستان میں عمر کی بالائی حد لازمی طور پر کمتر ہے، اس لیے کہ کبرسنی اور عدم قابلیت کار یورپ کے مقابلے میں بہت پہلے سے شروع ہوجاتی ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں عمر کی مسلمہ حد ۱۵ اور ۴۰ کے مابین ہے۔ اس اعتبار سے ہندوستان کی موثر یا محنت کرنے والی آبادی کا تناسب مجموعی آبادی سے صرف ۴۰ فی صد ہے۔ اس کے برخلاف اگر فرانس اور انگلستان میں پیداآور آبادی کے لیے عمر کے حدود ۱۵ تا ۶۰ مانے جائیں تو، ان دونوں ملکوں میں یہ تناسب علی الترتیب ۵۴ فی صد اور ۶۰ فی صد ہے[2]۔ اس طرح مزدوروں کی موجودہ تعداد کے مدنظر، ہندوستان کی حالت تشویش ناک ہے۔ لہٰذا ایسی تدبیروں کا خیر مقدم کرنا چاہیے جن کا مقصد صحت عامہ کے معیار کی

[1] اس میں وہ اشخاص ایسے بھی شامل ہیں جن کی عمریں غیر معلوم ہیں۔ دیکھو برج نرائن کی محولۂ بالا کتاب صفحہ ۲۷ تا ۲۸

[2] دیکھو ایک کتاب موسوم بہ "دولت ہند" (Wealth of India) صفحہ ۶۰ از پی۔ اے واڈیا و جی۔ این جوشی

باب ۳
57

اصلاح کرنا اور عوام کی عمروں کے اوسط کو اس غرض سے بڑھانا ہو کہ محنت کرنیوالی آبادی کی تعداد میں اضافہ ہو اور وہ دوسرے ملکوں کی سطح پر آجائے۔ ۱۹۲۱ء سے شرح اموات میں کمی کا میلان رونما ہوا ہے۔ جس کا باعث غالباً یہ ہے کہ محکہ جات صحت عامہ کی تنظیم جدید ہوئی ہے اور وہ اصلاحات کے نفاذ کے بعد سے مختلف صوبوں میں زیادہ کام کر رہے ہیں۔

یہ بتانے کی یہ مشکل ضرورت ہے کہ ایک ہی مقررہ ملک کی آبادی کی تقسیم بہ لحاظ عمر وقتاً فوقتاً متغیر ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً ممکن ہے کہ معمولی شرح ولادت اور شرح اموات میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ علاوہ ازیں جنگ، قحط اور متعدی امراض بھی عمر کی تقسیم میں تغیر پیدا کر سکتے ہیں۔ جنگ، بالغوں کی آبادی کے تناسب کو گھٹا سکتی ہے۔ قحط اور متعدی امراض کا اثر مختلف عمروں کے گروہوں پر مختلف ہوتا ہے۔ قحط، بالغوں کے مقابلے میں بچوں پر زیادہ شدت کے ساتھ اثر انداز ہوتا ہے؛ برخلاف اس کے متعدی امراض معکوس اثر ڈالتے ہیں[1] کافی طویل مدت کے لیے ظاہر ہے کہ بچوں میں کثرت اموات کا یہ اثر ظاہر ہوگا کہ کم و بیش پندرہ سال کے بعد بالغوں کی تعداد میں کمی ہو جائے گی۔ علیٰ ہذا اگر بالغوں کی کثیر تعداد تاہل کے زمانے میں امراض کا شکار ہو جائے تو رفتار زمانہ کے ساتھ اس کا نتیجہ یہ ظاہر ہوگا کہ شرح ولادت میں کمی ہو جائے گی اور اس کے نتیجے کے طور پر بچوں کے تناسب میں کمی ہو جائے گی۔ چنانچہ ۱۹۱۸ء میں ہندوستان میں انفلوئنزا کی وبا کے شائع ہونے کی وجہ سے جو کثیر اموات واقع ہوئیں اس کی بنا پر یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ مجموعی آبادی میں مزدور پیشہ آبادی کا تناسب معمول سے زیادہ ناموافق ہو گیا ہو۔ گو سب حلقوں کے لوگ کم و بیش مبتلا ہوئے تاہم بالغوں میں غالباً سب سے زیادہ اموات واقع ہوئیں۔

مندرجۂ ذیل جدول میں بہ حساب ملین یہ بتایا گیا ہے کہ ۱۹۲۱ء کی

---

[1] دیکھو برج نرائن کی محولۂ بالا تصنیف۔

مردم شماری میں آبادی کی تقسیم بلحاظ عمر و صنف کیا تھی :-

عمر	مجموعی آبادی			عمر	مجموعی آبادی		
	اشخاص	مرد	عورتیں		اشخاص	مرد	عورتیں
۰ تا ۵	۳۹،۶۵	۱۹،۴۸	۲۰،۱۷	۳۵ تا ۴۰	۱۸،۹۶	۱۰،۳۰	۸،۶۶
۵ تا ۱۰	۴۶،۷۴	۲۳،۸۴	۲۲،۹۰	۴۰ تا ۴۵	۱۹،۵۸	۱۰،۰۷	۹،۵۱
۱۰ تا ۱۵	۳۶،۷۴	۲۰،۱۷	۱۶،۵۷	۴۵ تا ۵۰	۱۱،۶۴	۶،۳۴	۵،۳۰
۱۵ تا ۲۰	۲۶،۱۴	۱۳،۶۵	۱۲،۴۹	۵۰ تا ۵۵	۱۳،۷۴	۷،۰۳	۶،۷۱
۲۰ تا ۲۵	۲۶،۰۹	۱۲،۵۹	۱۳،۵۰	۵۵ تا ۶۰	۵،۵۷	۲،۱۹	۲،۵۸
۲۵ تا ۳۰	۲۷،۵۹	۱۴،۰۲	۱۳،۵۷	۶۰ تا ۶۵	۸،۸۸	۴،۳۱	۴،۵۷
۳۰ تا ۳۵	۲۶،۱۳	۱۳،۳۷	۱۲،۷۶	۶۵ تا ۷۰	۲،۵۱	۱،۳۰	۱،۲۱
				۷۰ اور اس سے زاید	۵،۳۴	۲،۵۸	۲،۷۶
غیر مشخص عمر[1]					۲۴[2]	۲۴[3]	......
میزان					۳۱۵،۳۵	۱۶۲،۰۸	۱۵۳،۲۷

۱۰۔ ہندوستان میں ولادت اور اموات کی شرح

ہندوستان کی آبادی کی تعداد کا تعین تقریباً کل کا کل شرح ولادت و شرح اموات کے ذریعے سے ہوتا ہے؛ اور توطن داخلی و توطن خارجی دونوں عامل، نظر انداز کرنے کے قابل ہیں۔ شرح اموات اور

لہ۔ یہ تعداد ملین میں ظاہر نہیں کی گئی ہے۔

ٹہ۔ " " " " " "

ٹلہ۔ " " " " " "

باب ۳

شرح ولادت، دونوں کی حد تک، ہندوستان دنیا کے مہذب ممالک میں ایک ناقابل رشک لیکن نمایاں حیثیت رکھتا ہے، چنانچہ جیسا کہ سنہ ۱۹۱۱ء میں مختلف صوبوں کے اعداد سے معلوم ہوتا ہے اوسط شرح ولادت اور شرح اموات علی الترتیب ۳۴ء۳ اور ۴۲ء۹ تھی۔ یورپ کے زیادہ ترقی یافتہ ملکوں میں شرح ولادت اور شرح اموات دونوں میں ترقی پذیرگی کا میلان قوت کے ساتھ کارفرما ہے۔ مثلاً انگلستان اور ویلز میں سنہ ۱۸۹۱ء تا سنہ ۱۸۹۵ء میں ولادتوں اور اموات کی تعداد فی ہزار نفوس علی الترتیب ۳۰ء۵ اور ۱۸ء۷ تھی۔ اس کے بالمقابل سنہ ۱۹۳۲ء میں یہ اعداد ۱۵ء۳ اور ۱۲ء۰ تھے۔
ہندوستان میں شرح ولادت و شرح اموات میں اس قسم کی کوئی نمایاں کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ اس کے برخلاف واقعہ یہ ہے کہ بعض زمانوں میں دونوں میں اضافہ رونما ہوا، جیسا کہ مندرجۂ ذیل جدول سے واضح ہوگا۔[1]

زمانہ	ولادتوں کا اوسط فی ہزار نفوس	اموات کا اوسط فی ہزار نفوس
سنہ ۱۸۸۵ء تا سنہ ۱۸۹۰ء	۳۵ء۸۳	۲۷ء۴۴
سنہ ۱۸۹۱ء تا سنہ ۱۹۰۰ء	۳۵ء۴۳	۳۱ء۳۱
سنہ ۱۹۰۱ء تا سنہ ۱۹۱۰ء	۳۸ء۱۸	۳۳ء۹۴
سنہ ۱۹۱۱ء تا سنہ ۱۹۱۷ء	۳۸ء۶۸	۳۰ء۳۱
سنہ ۱۹۱۸ء	۳۵ء۳۵	۶۲ء۴۶
سنہ ۱۹۱۹ء	۳۰ء۲۴	۳۵ء۸۷
سنہ ۱۹۲۰ء	۳۲ء۹۸	۳۰ء۸۴
سنہ ۱۹۱۱ء تا سنہ ۱۹۲۰ء کا اوسط	۳۶ء۹۳	۳۴ء۱۳
سنہ ۱۹۲۱ء	۳۲ء۲۰	۳۰ء۵۹
سنہ ۱۹۲۲ء	۳۱ء۸۵	۲۴ء۰۲
سنہ ۱۹۲۳ء	۳۵ء۰۶	۲۵ء۰۰

[1] سنہ ۱۸۸۵ء تا سنہ ۱۹۲۰ء کے اعداد برج نرائن کی محولہ کتاب سے ماخوذ ہیں۔

زمانہ	ولادتوں کا اوسط فی ہزار نفوس	اموات کا اوسط فی ہزار نفوس
سنہ ۱۹۲۴ء	۳۴،۴۴	۲۸،۴۹
سنہ ۱۹۲۶ء	۳۴،۷۷	۲۷،۷۶
سنہ ۱۹۲۷ء	۳۵،۲۷	۲۴،۸۹
سنہ ۱۹۲۸ء	۳۶،۷۹	۲۵،۵۹
سنہ ۱۹۲۹ء	۳۵،۴۷	۲۵،۹۵
سنہ ۱۹۳۰ء	۳۵،۹۹	۲۶،۸۵
سنہ ۱۹۳۱ء[1]	۳۴،۳۸	۲۴،۸۹

۱۱۔ شرحِ اموات جہاں شرح ولادت اعلیٰ اور بے روک ہوگی وہاں شرح اموات بھی اعلیٰ ہوگی۔ ہندوستان میں اعلیٰ شرح اموات کا باعث آخر میں عام افلاس ہے؛ جس کی وجہ سے لوگ ملیریا، طاعون اور انفلوئنزا جیسے امراض کی مقاومت کی طاقت نہیں رکھتے۔ اہل ہند میں طاقت و توانائی کی کمی ہی اس واقعے کی توجیہ کرتی ہے کہ اکثر عمروں میں زندہ رہنے کی توقع یورپین ملکوں کے مقابلے میں کمتر ہوتی ہے، جیسا کہ مندرجۂ ذیل جدول سے معلوم ہوگا۔[2]

59

ملک	بزمانۂ ولادت	۱۰	۲۰	۳۰	۶۰	۸۰
	مرد					
ہندوستان	۲۲،۵۹	۳۳،۳۶	۲۷،۴۶	۲۲،۴۵	۱۰،۰۰	۳،۰۶
جرمنی	۴۷،۴۱	۵۲،۰۱	۴۳،۴۳	۳۵،۲۹	۱۳،۱۸	۴،۴۱

[1] سنہ ۱۹۳۲ء اور سنہ ۱۹۳۳ء کے اندازوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شرح ولادت ۳۴ اور شرح اموات ۲۲ ہے۔
[2] دیکھو برج نرائن کی محولہ کتاب صفحہ ۳۴؛ نیز دیکھو وڈل کی کتاب محولۂ بالا صفحہ ۸۰ تا ۸۳۔

باب

ملک	بزمانۂ ولادت	۱۰	۲۰	۳۰	۶۰	۸۰
ڈنمارک	۵۴٫۹۰	۵۵٫۱۰	۴۶٫۳۰	۳۸٫۰۰	۱۵٫۲۰	۵٫۱۰
انگلستان و ویلز	۵۱٫۵۰	۵۳٫۰۸	۴۴٫۲۱	۳۵٫۸۱	۱۳٫۷۸	۴٫۹۶
فرانس	۴۵٫۷۴	۴۹٫۷۵	۴۱٫۵۳	۳۴٫۳۵	۱۳٫۸۱	۴٫۸۷
			عورتیں			
ہندوستان	۲۳٫۳۱	۳۳٫۷۴	۲۷٫۹۶	۲۲٫۹۹	۱۰٫۱۱	۳٫۰۶
جرمنی	۵۰٫۶۸	۵۳٫۹۹	۴۵٫۳۵	۳۷٫۳۰	۱۴٫۱۷	۴٫۵۲
ڈنمارک	۵۷٫۹۰	۵۶٫۷۰	۴۸٫۰۰	۴۰٫۱۰	۱۶٫۵۰	۵٫۵۰
انگلستان و ویلز	۵۵٫۳۵	۵۵٫۵۱	۴۷٫۱۰	۳۸٫۵۴	۱۵٫۴۸	۵٫۵۹
فرانس	۴۹٫۱۳	۵۲٫۰۳	۴۴٫۰۲	۳۶٫۹۳	۱۵٫۰۸	۵٫۳۸

"مرد کی عمر کا اوسط انگلستان میں ۵۵٫۶۲ سال ہے؛ ہندوستان میں اس کے نصف سے بھی کم یا صرف ۲۶٫۹۱ ہے۔ عورتوں کی بابتہ ہندوستان کا اوسط ۲۶٫۵۶ اور انگلستان کا اوسط ۵۹٫۵۸ ہے۔ ۱۸۹۱ء میں مردوں کی عمر کا اوسط انگلستان میں ۴۴٫۱۳ سال اور ہندوستان میں ۲۵٫۵۴ سال تھا۔ ۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۲ء میں انگلستان کا عدد ۵۵٫۶۲ تک بڑھ گیا، اور ہندوستانی عدد، ۱۹۰۱ء میں ۲۳٫۹۶ تک اور ۱۹۱۱ء میں ۲۳٫۳۲ تک گھٹ جانے کے بعد، ۱۹۳۱ء میں بھی صرف ۲۶٫۵۶ تھا۔ دوسرے الفاظ میں، جہاں انگریز نے ۳۰ سال کی مدت میں اپنی عمر میں ½۱۱ سال کا اضافہ کیا، ہندوستانی نے ۴۰ سال کی زیادہ طویل مدت میں صرف ایک سال کا اضافہ کیا۔"[1]

[1] دیکھو ونٹل کی کتاب محولۂ بالا صفحہ ۷۱ تا ۷۲۔

باب

ممالک یورپ میں حیات کا طول عام طور پر قطعی ترقی ظاہر کر رہا ہے اور اس کا باعث وہاں کے بہتر حالات زندگی اور موت کو روکنے والے اسباب پر بدرجہا زیادہ قابو ہے۔ اس کے برخلاف ہندوستان، معاشی حیثیت سے بالکل جمود کی حالت میں ہے، اور ممالک یورپ میں جس ترقی کا ذکر کیا گیا ہے وہ یہاں مفقود ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ ثابت کرنے کے لیے اچھا خاصا مقدمہ ترتیب دیا جا سکتا ہے کہ یہاں انحطاط قطعی طور پر شروع ہو گیا ہے۔ ہندوستان میں عمر کے اوسط طول کی کمی کے معنی یہ ہیں کہ صاحب فراست و تجربہ کار لوگ دنیا سے ایسے زمانے میں کوچ کر جاتے ہیں جبکہ ان میں قوم کے لیے اپنے آپ کو کارآمد ثابت کرنے کی قوت وصلاحیت عروج پر ہوتی ہے۔

60

ہندوستان کی شرح اموات کی دو نمایاں خصوصیات یہ ہیں:-

(۱) بچوں میں اموات کی کثرت، اور (۲) عورتوں میں شباب و تاہل کی عمروں میں کثرت اموات۔ مہذب ممالک کے مقابلے میں یہاں بچوں میں بہت زیادہ کثرت کے ساتھ اموات واقع ہوتی ہیں۔ نومولود بچوں میں سے تقریباً ½ حصہ ایک سال کی عمر کو پہنچنے سے پیشتر ہی فوت ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بچوں کی شرح اموات تمام عمروں کی مجموعی شرح اموات کے ½ کے برابر ہے۔ ہندوستانی شہروں کے انتہائی غیر صحت بخش حالات کے باعث شہروں ہی میں بچوں کی اموات خاص طور سے زیادہ ہوتی ہیں؛ مثلاً لندن کی شرح اموات ۹۹ فی ہزار کے مقابلے میں بمبئی کی شرح ۲۷۴ فی ہزار ہے۔ کسی زمانے میں بچوں کی اموات کی حد تک یورپ کے ملکوں کی بھی وہی حالت تھی جو آج ہندوستان کی ہے؛ لیکن موجودہ صدی میں بہت نمایاں کمی واقع ہوئی ہے جیسا کہ انگلستان و ویلز کے متعلق مندرجہ ذیل جدول سے ظاہر ہوگا:

سال	اموات ایک سال کے اندر بحساب فی ہزار ولادت	سال	اموات ایک سال کے اندر بحساب فی ہزار ولادت
۱۸۵۱ء تا ۱۸۵۵ء	۱۵۶	۱۹۱۱ء تا ۱۹۱۵ء	۱۱۰

باب ۳

سال	اموات ایک سال کے اندر بحساب فی ہزار ولادت	سال	اموات ایک سال کے اندر بحساب فی ہزار اموات
سنہ ۱۸۷۰ء تا سنہ ۱۸۷۵ء	۱۵۲	سنہ ۱۹۱۶ء	۸۰
سنہ ۱۸۹۱ء تا سنہ ۱۸۹۵ء	۱۵۱	سنہ ۱۹۲۴ء	۷۵
سنہ ۱۸۹۶ء تا سنہ ۱۹۰۰ء	۱۵۶	سنہ ۱۹۲۵ء	۷۵
سنہ ۱۹۰۲ء تا سنہ ۱۹۲۵ء	۱۳۸	سنہ ۱۹۲۶ء	۷۰
سنہ ۱۹۰۶ء تا سنہ ۱۹۱۰ء	۱۱۷	سنہ ۱۹۳۲ء	۶۰

ہندوستان میں بچوں کی اموات کے اعداد سے اس کے برعکس نہایت تکلیف دہ صورت حال کا پتہ چلتا ہے۔

سال	اموات ایک سال کے اندر بحساب فی ہزار ولادت — مرد	عورتیں	سال	اموات ایک سال کے اندر بحساب فی ہزار ولادت — مرد	عورتیں
سنہ ۱۹۱۱ء	۲۱۴	۱۹۲	سنہ ۱۹۱۸ء	۲۷۴	۲۶۰
سنہ ۱۹۱۲ء	۲۱۶	۱۹۹	سنہ ۱۹۱۹ء	۲۲۸	۲۲۰
سنہ ۱۹۱۳ء	۱۹۳	۱۹۷	سنہ ۱۹۲۰ء	۲۰۱	۱۸۸
سنہ ۱۹۱۴ء	۲۱۹	۲۰۴	سنہ ۱۹۲۲ء	۱۸۳	۱۶۶
سنہ ۱۹۱۵ء	۲۰۸	۱۹۵	سنہ ۱۹۲۵ء	۱۸۱	۱۶۷
سنہ ۱۹۱۶ء	۲۰۹	۱۹۵	سنہ ۱۹۲۸ء	۱۸۱	۱۶۴
سنہ ۱۹۱۷ء	۲۱۲	۱۹۸	سنہ ۱۹۳۱ء	۱۸۸	۱۷۰

بچوں کی اموات کی اس عظیم شرح میں کسی قابل لحاظ کمی کی کوئی علامت

اس کمی کے مقابلے میں نہیں ہے جو مغربی یورپ میں واقع ہوئی ہے۔ اس کا باعث ایک حد تک اوائل عمر کے بیاہ کے رواج کو قرار دیا جاسکتا ہے، جو نہ صرف بچے کی توانائی اور اس کے نشوونما کو متاثر کرتا ہے، بلکہ ماں کو بھی کمزور کردیتا ہے۔ علاوہ ازیں جب ماں کام کے لیے وقت نکالنا اور بچے سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتی ہے تو اس کو افیون کھلا دیتی ہے اور عمدہ دودھ کثیر مقدار میں حاصل کرنے کی راہ میں بھی مشکلات ہیں؛ یہ دونوں عامل، خاص طور سے شدید صورت میں بڑے شہروں میں پائے جاتے ہیں، اگرچہ دیہات میں بھی وہ کلیتہً مفقود نہیں ہیں؛ اور شرح اموات کی زیادتی کے اہم اسباب ہیں۔ لیکن ان سب اسباب سے بڑا سبب جو ان کی بڑی حد تک توجیہ بھی کرتا ہے عوام کے ہلاکت آفریں افلاس کا اثر ہے۔ ہندوستانی شرح اموات کے سلسلے میں دوسری خصوصیت استقرار حمل کی عمر کی عورتوں میں اموات کی کثرت ہے۔ چونکہ ہم اس واقعے کے اسباب پر مفصل بحث کرچکے ہیں یہاں مزید رائے زنی کی ضرورت نہیں۔

۱۲۔ آبادی کا اضافہ۔ اگر ہم گزشتہ پچاس ساٹھ سال کے زمانے پر جس میں مردم شماری کے اعداد دستیاب ہوتے ہیں غور کریں تو، معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی آبادی کے حقیقی اضافے کی رفتار ایک عشرے سے دوسرے عشرے تک بہت سست رہی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ گو شرح ولادت اعلیٰ ہے، لیکن شرح اموات بھی اس کے قریب قریب مساوی ہے۔ اس لحاظ سے باقی رہنے والے نفوس کی شرح یورپ سے بدرجہا کم ہے۔ چنانچہ یورپ میں گو شرح ولادت بہت ادنیٰ ہے، تاہم شرح اموات اس سے بھی کم ہے۔ سنہ ۱۸۷۲ء اور سنہ ۱۹۲۱ء کے مابین ہندوستان کی آبادی میں صرف ۲۰ فی صد اضافہ ہوا۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں آبادی ۳۱۵۰۵۶۳۹۶ تھی اور سنہ ۱۹۲۱ء میں بڑھ کر صرف ۳۱۸۹۴۲۴۸۰ ہوئی؛ گویا ۱ء۲ فی صد اضافہ ہوا۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں بارش کی عام کمی اور اسی کے ساتھ ساتھ بڑے انفلوئینزا کی وبا کی تباہ کاری نے آبادی کے گزشتہ سات سالہ فطری اضافے کا صفایا کردیا، اور سنہ ۱۹۱۱ء تا سنہ ۱۹۲۱ء میں

61

غیر معمولی طور پر ادنیٰ شرح اضافہ کی یہی ذمہ دار تھی؛ چنانچہ اندازہ کیا گیا ہے کہ انفلوئنزا سے ۱۴ ملین جانیں تلف ہوئیں۔ مندرجہ ذیل جدول سے یہ معلوم ہوگا کہ ایک دہے سے دوسرے دہے تک آبادی میں کس قدر بے قاعدہ تغیرات واقع ہوئے۔

ظاہری اضافہ		فی صد تغیر سابقہ مردم شماری کے بعد سے
مردم شماری بابتہ	آبادی بحساب ملین	
۱۸۷۲	۲۰۶٫۱۶	—
۱۸۸۱	۲۵۳٫۸۹	+ ۲۳٫۲
۱۸۹۱	۲۸۷٫۳۱	+ ۱۳٫۲
۱۹۰۱	۲۹۴٫۳۶	+ ۲٫۵
۱۹۱۱	۳۱۵٫۱۵	+ ۷٫۱
۱۹۲۱	۳۱۸٫۱۴	+ ۱٫۲
۱۹۳۱	۳۵۲٫۸	+ ۱۰٫۶

62

لیکن مردم شماری کے موقع پر رقبے اور آبادی کے اضافے کا لحاظ کرنے کے بعد نیز اس واقعے کو ملحوظ رکھنے کے بعد کہ مردم شماری کے طریقے بہت زیادہ صحیح ہوگئے ہیں، آبادی کے حقیقی اضافے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ان ہی امور کا مناسب لحاظ کرنے کے بعد ہم ذیل کے نتیجے پر پہنچتے ہیں جو حقیقی اضافے کو ظاہر کرتا ہے[1]۔

ہندوستان میں سنہ ۱۸۷۲ء اور سنہ ۱۹۱۱ء کے مابین آبادی کا فی صد اضافہ تقریباً

[1] دیکھو مردم شماری کی رپورٹ بابتہ سنہ ۱۹۲۱ء جلد اول صفحہ ۷؛ اور ایک رپورٹ موسوم بہ "ہندوستان سنہ ۱۹۳۰ء تا سنہ ۱۹۳۱ء میں" صفحہ ۱۲۶۔

باب ۳

سال	اضافہ بوجہ شمول علاقہ جات جدید (ملین)	اضافہ بوجہ اصلاح طریق مردم شماری (ملین)	آبادی کا حقیقی اضافہ (ملین)	میزان (ملین)	آبادی کے اضافے کی فی صد شرح
سنہ ۱۸۷۲ء تا سنہ ۱۸۸۱ء	۳۳٫۰	۱۲٫۰	۳٫۰	۴۸٫۰	۱٫۵
سنہ ۱۸۸۱ء تا سنہ ۱۸۹۱ء	۵٫۷	۳٫۵	۲۴٫۳	۳۳٫۵	۹٫۶
سنہ ۱۸۹۱ء تا سنہ ۱۹۰۱ء	۲٫۷	۰٫۲	۴٫۱	۷٫۰	۱٫۴
سنہ ۱۹۰۱ء تا سنہ ۱۹۱۱ء	۱٫۸	—	۱۸٫۷	۲۰٫۵	۶٫۴
سنہ ۱۹۱۱ء تا سنہ ۱۹۲۱ء	۰٫۱	—	۳٫۷	۳٫۸	۱٫۲
سنہ ۱۹۲۱ء تا سنہ ۱۹۳۱ء	۰٫۰	—	۳۴٫۰	۳۴٫۰	۱۰٫۶
میزان	۴۳٫۳	۱۵٫۷	۸۷٫۸	۱۴۶٫۸	۳۰٫۷

۰٫۲ تھا، اس کے برخلاف انگلستان اور ویلز میں ۲٫۸۵، ڈنمارک میں ۲٫۳۵ اور روس کو مستثنیٰ کرکے کل یورپ میں ۵ء۴ تھا[1] روس کو شامل کرکے یورپ کی آبادی ۳۰۵ ملین سے ۴۴۸ ملین تک بڑھ گئی، یا تقریباً ۴۷ فی صد اضافہ ہوا[2]۔

ہندوستان میں جن سالوں میں غیر معمولی طور پر آبادی کی شرح اضافہ ظاہر ہوتی ہے ان میں قحط اور طاعون جیسی آفتوں کا خاص طور پر ظہور رہا ہے جو فطری اضافے کو بڑی حد تک زائل کر دیتی ہیں۔ چنانچہ جنوبی ہند میں سنہ ۱۸۷۶ء تا سنہ ۱۸۷۸ء میں سخت قحط پڑا، اور سنہ ۱۸۹۱ء تا سنہ ۱۹۰۱ء میں قحط اور طاعون نے ملکر اضافے کو روک دیا۔

۱؎ ۔ دیکھو برنٹانو کی محولہ کتاب صفحہ ۱۱۔

۲؎ ۔ دیکھو ایک کتاب موسوم بہ Grundriss Der Sazialokonomik شائع شدہ سنہ ۱۹۲۳ء جلد دوم باب (۱) صفحہ ۹، بہ عنوان Wirts chaft und Natur

باب ۷

سنہ ۱۹۰۱ء تا سنہ ۱۹۱۱ء کے زمانے کو "معتدل زرعی خوشحالی" کا دور کہا جاتا ہے؛ اور اگر طاعون اور ملیریا وبا کی شکل میں رونما نہ ہوتے تو آبادی میں بہت معقول اضافہ ہوتا؛ چنانچہ پنجاب اور یوپی میں جانوں کی کثیر تعداد ان وباؤں کی نذر ہوئی۔ سنہ ۱۸۸۱ء تا سنہ ۱۸۹۱ء کا عشرہ ہی صرف ایسا زمانہ تھا جو کسی غیر معمولی تباہی سے بچا رہا۔ اس لحاظ سے یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ ۶ء۹ فی صد کی شرح کو غیر معمولی شرح تصور کرنا چاہئے، اور اگر ہم آبادی کے معمولی اضافے کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں تو کچھ نہ کچھ منہائی کرنی پڑے گی۔ معمولی اضافے کے مفہوم میں ہم اس اضافے کو شامل کرتے ہیں جو ایسے حالات کا نتیجہ ہو جو نہ تو غیر معمولی طور پر موافق ہوں اور نہ غیر معمولی طور پر ناموافق۔ سنہ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کے ناظم یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ "ہندوستان کی آبادی کے ممکنہ فطری اضافے کی حد، ترقی کی موجودہ حالت میں اور غیر معمولی آفتوں سے قطع نظر کرکے، دس سال کی مدت میں ۷ اور ۸ فی صد ہے"[1]؛ لیکن ان کا یہ اندازہ بہت ہی کم ہے۔ کل ہندوستان میں سنہ ۱۹۲۱ء اور سنہ ۱۹۳۱ء کے مابین بقدر ۶ء۱۰ فی صد حقیقی اضافہ ہوا اور یہ بھی سنہ ۱۹۱۸ء کے انفلوئنزا کے باوجود جس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اس وبا سے زیادہ تر تولیدی قوت رکھنے والی آبادی متاثر ہوئی تھی۔

سنہ ۱۹۰۱ء تا سنہ ۱۹۱۱ء کے دور کے برخلاف سنہ ۱۹۳۱ء سے پیشتر کے دس سال آبادی کے اضافے کے لیے خاص طور سے موافق تھے؛ چنانچہ آبادی حقیقی طور پر ۳۴ ملین تک بڑھ گئی۔ اس دہے میں کوئی سخت قحط نمودار نہیں ہوا، اور ہیضہ، طاعون اور کالا آزار جیسے متعدی امراض کو دفع کرنے کے طریقوں میں استقلال کے ساتھ اصلاح و ترقی ہو رہی ہے[2]۔

[1] دیکھو مردم شماری کی رپورٹ بابتہ سنہ ۱۹۲۱ء صفحہ ۴۸۔

[2] سنہ ۱۹۲۱ء تا سنہ ۱۹۳۱ء کے دہے میں کالا آزار کے علاج کا جو جدید طریقہ نکلا اور جس میں نامیاتی کملی مرکبات کا استعمال کیا جاتا ہے، مرض کو دس دن میں یا اس سے بھی کم مدت میں دفع کر دیتا ہے۔

63

باب ۳

۳۱ مفرط آبادی کا مسئلہ :- یورپ اور ہندوستان میں بحث مباحثہ

عام خیال تو یہ ہے کہ دنیا کی آبادی تہذیب و تمدن کے طلوع سے مسلسل اور مستقل طور پر بڑھ رہی ہے، لیکن تاریخ سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ اس کے برخلاف عام حالت یہ رہی ہے کہ طویل مدت یعنے صدیوں تک آبادی ایک ہی حالت پر قایم رہی ہے، اور اس کی تعداد میں سریع اضافہ صرف بہت ہی حال کے زمانے میں رونما ہوا ہے۔ تقریباً گزشتہ ایک سو سال کے دوران میں دنیا کی آبادی ۱۰۹ ملین سے بڑھ کر کم و بیش ۲۰۰۰ ملین تک پہنچی ہے۔ اس نادر اضافے کا باعث انیسویں اور بیسویں صدیوں کی نئی نئی کلوں کی عہد آفریں ایجادیں، نئے عملوں اور طریقوں کی دریافت اور سائینس کے عظیم انکشافات ہیں، جن کی بدولت انسانوں کی بہت بڑی تعداد پہلے سے زیادہ آرام و آسایش کی زندگی بسر کرتی ہے۔ موجودہ زمانے کے اہم ترین مسائل میں سے ایک مسئلہ جو دنیا کے معاشیات دانوں اور جریدہ نگاروں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا رہا ہے یہ ہے کہ آیا آبادی کے اضافے کی موجودہ شرح، سائنسی ترقی کو اس کے قدم بہ قدم رکھ کر برقرار رکھی جاسکتی ہے یا نہیں، یا ہم کو بہ قول کینس یہ خیال کرنا چاہئے کہ "انیسویں صدی کی شاندار درمیانی داستان ختم ہو چکی"[1] اور یہ کہ سائینس کے حیرت انگیز کارناموں اور کمالات کے جو مفید اثرات انسانی خوشحالی پر پڑے ان کو برقرار رکھنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ آبادی کے اضافے کو ارادی طور پر روکا جائے۔ گزشتہ چند سال سے یہ خیال بتدریج تقویت حاصل کر رہا ہے کہ سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملکوں میں بھی آبادی کے حد اعتدال سے متجاوز ہو جانے کا خطرہ پایا جاتا ہے۔

ہندوستان میں اس سوال پر بہت کچھ بحث مباحثہ ہوا ہے کہ آیا ہندوستان کے افلاس کے بڑے اسباب میں سے ایک سبب غیر محدود اضافہ ہے یا نہیں۔ سرکاری رائے اس نظریے کی تائید میں رہی ہے کہ ہندوستان کی ناداری کا ایک قوی سبب

---

[1] دیکھو، ام کینس کی تصنیف۔

باب

مفرط آبادی نہ ہے! اس کے برخلاف سیاسی گروہ اس نظریئے کا اس لیے عام طور پر مخالف ہے کہ اس کو تسلیم کر لینے سے حکومت تمام الزامات سے یا اہل ہند کے ناقابل انکار افلاس کی ذمہ داری سے بظاہر بری اور سبکدوش ہو جاتی ہے۔

۴۔ مفرط آبادی کا مفہوم۔

آبادی کی افراط کو یا تو ایک حالت تصور کیا جا سکتا ہے یا ایک میلان، اور اس کو انتہائی یا متوازن آبادی کے تخیل سے وابستہ کرنا بہترین ہے۔ چنانچہ کینن نے اس کی حسب ذیل تشریح کی ہے:۔ "کسی مقررہ وقت میں، یا دوسرے الفاظ میں، معلومات اور حالات مساوی و مقررہ رہنے کی صورت میں، وہ چیز موجود ہوتی ہے جس کو اعظم یا بیش ترین ماحصل کا مقام کہہ سکتے ہیں؛ اور اس وقت محنت کی مقدار اتنی ہوتی ہے کہ اس میں اضافہ اور تخفیف، دونوں، متناسب ماحصل میں کمی کر سکتے ہیں۔ جس طرح ہر ایک صنعت میں اعظم یا بیش ترین ماحصل کا ایک مقام ہوتا ہے ٹھیک اسی طرح تمام صنعتوں میں بحیثیت مجموعی بھی ایک مقررہ مقام ہونا ضروری ہے۔ اگر آبادی اتنی کافی بڑی نہ ہو جو صنعت کو اس مقام پر لا سکے تو ماحصل جتنا وصول ہو سکتا ہے اس سے کم وصول ہوگا، اور اس کا علاج آبادی کا اضافہ ہے۔ اگر اس کے برخلاف آبادی اتنی بڑی ہو کہ اس مقام سے متجاوز ہو جائے تو، اس صورت میں بھی ماحصل اس سے کم وصول ہوگا جتنا کہ ہو سکتا ہے اور اس کا علاج آبادی کی کمی ہے"[1] مفرط آبادی کا مفہوم یہ ہے کہ آبادی متوازن تعداد سے تجاوز کر جائے۔

آبادی کی کثرت کے معنی مزدوروں کی تعداد کی زیادتی کے ہیں، اور ان کی زاید محنت کا نتیجہ عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ مجموعی دولت میں اضافہ ہوتا ہے؛ لیکن اہم سوال یہ ہے کہ آیا یہ اضافہ، آبادی کی زیادتی کے متناسب ہوتا ہے یا نہیں، تاکہ فی کس حصہ کم از کم سابق کی طرح مقررہ ہو۔ یہ سچ ہے کہ خدا نے ہر منہ کے ساتھ دو ہاتھ بھی دیئے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آیا زاید آبادی اپنے ہاتھوں کی

[1] دیکھو کینین کی کتاب موسوم بہ "دولت" صفحہ ۶۲ تا ۶۹۔

باب

مدد سے اپنے بل بوتے پر پوری طرح کھڑی ہو سکتی ہے یا نہیں۔ جب ایک مقررہ آبادی میں اضافے کے آثار اس طور پر ظاہر ہوں جس سے فی کس آمدنی میں کمی کی توقع ہو تو اس کو ہم "مفرط آبادی کا میلان" کہیں گے۔ اور جب یہ توقع کرنے کے اسباب موجود ہوں کہ اگر موجودہ تعداد میں کچھ کمی واقع ہو تو اس کی وجہ سے فی کس آمدنی میں اضافہ ہو جائے گا تو ہم اس کو "مفرط آبادی کی حالت" سے تعبیر کریں گے[1]۔ یہ بھی کوئی غیر معمولی بات نہیں کہ میلان اور حالت دونوں ساتھ ساتھ موجود رہیں؛ چنانچہ اکثر لوگوں کے خیال میں آج کل ہندوستان کی یہی حالت ہے، یعنے دونوں ساتھ ساتھ پائے جاتے ہیں۔ حالیہ تحقیق سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ مالتھس کا نظریہ آبادی' متعدد اعتباروں سے ناقص ہے، لیکن اس کے باوجود اس میں صداقت کا ایک اہم عنصر موجود ہے۔ مالتھس نے، انسان کی بڑھنے کی قوت کا بالکل صحیح اندازہ کیا تھا' اور وہ یہ خیال قائم کرنے میں بھی حق بجانب تھا کہ اگر انسان کو اپنی تولیدی قوت سے پوری طرح کام لینے کا موقع ملے تو ذرائع معاش غیر معمولی طور سے موافق حالات کے بغیر، اضافۂ آبادی کا ساتھ نہ دے سکیں گے۔ چنانچہ اندازہ کیا گیا ہے کہ عورت مرد کا ایک جوڑا، اضافے کی موجودہ شرح سے، ۱۷۵ سال میں اولاد در اولاد اتنے انسان پیدا کر سکتا ہے جن کی تعداد دنیا کی موجودہ آبادی کے مساوی ہو گی؛ گو یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ موجودہ شرح اعلیٰ ترین ممکنہ شرح نہیں ہے بلکہ ایجابی و انسدادی مانعات کی وجہ سے اس میں بہت زیادہ کمی ہو گئی ہے۔ انسان کی تولیدی قوت کا یہ حال ہو تو ظاہر ہے کہ وہ پوری طرح کار فرما ہونے کی صورت میں پیدائش دولت کے صنائع و فنون کی ممکنہ ترقی پر بآسانی سبقت لے جائے گی۔ اس لحاظ سے اگر کسی ملک کے متعلق بے روک ولادتوں کا واقعہ تسلیم کر لیا جائے تو اس کو اس بات کی قوی قیاسی شہادت جو تقریباً قطعی ثبوت کے مساوی ہے ماننا پڑے گا کہ متعلقہ ملک میں آبادی کی افراط ہے۔ چنانچہ مفرط آبادی کے آثار و علائم' اعلیٰ شرح ولادت اور اعلیٰ شرح اموات' خاص کر

65

[1] مقابلے کے لیے دیکھو پی' یس' فلورنس کی کتاب موسوم بہ "مفرط آبادی" صفحہ ۱۱۔

بچوں کے اموات کی کثرت ہیں۔

۱۵۔ ہندوستان کی صورت حال[1] مذکورۂ بالا بحث کی روشنی میں ہم اب اس سوال پر غور کرنے کے قابل ہیں کہ آیا موجودہ زمانے میں ہندوستان سے مفرط آبادی کی "حالت" یا "میلان" یا "دونوں کی ساتھ ساتھ موجودگی" کو منسوب کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں اہم ترین قابل غور معاملہ یہ ہے کہ آیا اضافۂ آبادی کے انسدادی مانعات میں سے کوئی مانع ہندوستان میں موفر طریقے پر موجود ہے یا نہیں۔ اگر ہم اس نتیجے پر پہنچیں کہ انسدادی مانعات موجود نہیں ہیں یا یہ کہ ان کا اثر نظر انداز کرنے کے قابل ہے، اور یہ کہ آبادی کی روک زیادہ تر ایجابی مانعات مثلاً وبا قحط وغیرہ کے ذریعے سے عمل میں آتی ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آبادی کی افراط کو ملک کی موجودہ خرابی ثابت کرنے کے لیے ہم نے زوردار مقدمہ تیار کر لیا۔

۱۶۔ انسدادی مانعات آبادی کے متعدد انسدادی مانعات[2] کو حسب ذیل حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :- (۱) بیاہ کو ملتوی کر کے شرح ازدواج کو کم کرنا یا تجرد کی زندگی بسر کرنا۔ (۲) شادی کے بعد کم اولاد پیدا ہونا۔ (ا) قدرتی طور پر، مثلاً قوت تولید کم ہونا۔ (ب) اتفاقی طور پر، مثلاً شوہر کے دور یا غائب رہنے کی وجہ سے اولاد کم پیدا ہونا۔ (ج) ارادی طور پر تولید سے اجتناب کرنا، ضبط سے کام لینا، مانع حمل طریقے استعمال کرنا، اور عمداً اسقاط حمل کرنا، وغیرہ۔ (۳) بعض معاشری حالات و رسوم مثلاً زمانۂ رضاعت کو طول دینا، اونچی ذات میں بیاہ کرنا وغیرہ۔ (۴) طفل کشی (۵) افلاس، امراض وغیرہ وغیرہ۔

---

[1] ہندوستان کی مفرط آبادی کے مسئلے پر عمدہ بحث کے لیے قاری کو سی ایچ ہیملٹن کے اس مضمون کا حوالہ دیا جاتا ہے جو انھوں نے انڈین اکنامک کانفرنس کے ساتویں اجلاس (۱۹۲۴ء) میں بمقام بمبئی پڑھا تھا۔ چنانچہ ہم نے پروفیسر ہیملٹن کے عام طریق استدلال ہی کو اختیار کیا ہے، گو اس میں بہت کچھ تبدیلیاں بھی کر دی ہیں۔

[2] دیکھو پی ایس فلورنس کی محولۂ بالا کتاب صفحہ ۱۰۔

باب ۳

اب ہم اس مسئلے پر بحث کریں گے کہ آیا ان انسدادی طریقوں میں سے ایک یا ایک سے زیادہ ہندوستان میں رائج ہیں یا نہیں اور آیا ان طریقوں کا عمل اس قدرتی میلان کو زائل کرنے میں کہ آبادی کا اضافہ ذرایع معاش سے متجاوز ہوجاتا ہے موثر ہے یا نہیں۔

66

۱۷۔ ہندوستان میں ازدواج کی شرح۔

اس سلسلے میں پہلا قابل ذکر امر یہ ہے کہ ہندوستان میں ازدواجی حالت عام طور پر پائی جاتی ہے۔ مغرب میں مذہب عام طور پر تجرد کی تاکید کرتا ہے، لیکن ہندوستان میں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ "ہر ہندو پر بیاہ کرنا اور اولاد پیدا کرنا مذہباً واجب ہے؛ اگر لڑکے پیدا ہوں تو بہت اچھا ہے، تاکہ باپ کے کریا کرم کی رسوم ادا کرسکیں، ورنہ باپ کی آتما زمین کے خلاؤں میں تکلیف و بےچینی کے ساتھ بھٹکتی پھرے گی"[1]۔ سماج کی بدگوئی سے بچنے کے لیے لڑکیوں کو سن بلوغ کو پہنچنے سے پیشتر بیاہ دینا ضروری ہے[2]۔ مسلمانوں اور مظاہر پرستوں میں اگرچہ اوائل عمر کے بیاہ کو مذہبی فرض قرار نہیں دیا گیا ہے، پھر بھی ان میں بچپن کی شادیاں مساوی طور پر عام ہیں۔ اشتراک خاندان کا رواج اس کی مزید ہمت افزائی کرتا ہے۔ چونکہ خاندان کی آمدنی نئے شادی شدہ جوڑے کی کفالت کے لیے غیر معین مدت کے لیے مہیا رہتی ہے، اس لیے ایسے عاقلانہ و عاقبت اندیشانہ ملحوظات، جیسے کہ یورپ میں ہیں اور عام طور پر بیاہ کے التوا پر مجبور کرتے ہیں، ہندوستان میں بمشکل اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف معاشی ملحوظات عوام میں بیاہ کو روکنے کے بجائے اس کی ہمت افزائی کرتے ہیں؛ اس لیے کہ بیوی گھر کے سازوسامان کی حیثیت سے

[1] دیکھو پی کے وٹل کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان میں مسئلۂ آبادی" صفحہ ۴۳

[2] "اگر اونچی ذات کی ہندو عورت بالغ ہونے پر بھی ان بیاہی رہے، تو صرف وہ اور اس کا خاندان ہی ملعون خلائق نہ بنے گا بلکہ مذہبی کتابوں کی بعض عبارتوں کی تفسیر سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسکے اسلاف کی تین پشتیں بھی لعنت ملامت کا نشانہ بنیں گی"۔ دیکھو ہیچ رِسلے کی کتاب موسوم بہ "اقوام ہند" (People of India) صفحہ ۱۵۴۔

باب۳

ضروری ہے، اور وہ شوہر کو گھر سے باہر کام کرنے میں بھی عام طور پر مدد دیتی ہے۔ رہے بچے تو، وہ بھی چھوٹی سی چھوٹی قابل عمل عمر سے کسی نہ کسی کام پر لگائے جاتے ہیں اور بہ عجلت ممکنہ اپنے مصارف کو پورا کرنے کے لیے آمدنی پیدا کرنے لگتے ہیں۔ خاندان پر ان کا کوئی بار اس لیے محسوس نہیں کیا جاتا کہ مروجہ معیار زندگی قوت لایموت کے لحاظ سے، ادنیٰ ترین ہے؛ اور یہ معیار بچوں کے لیے طویل مدت کی تربیت نہیں چاہتا جس کی مدد سے وہ اس انتہائی ادنیٰ معیار زندگی کو برقرار رکھنے کے قابل نہیں جس کے وہ عادی ہوں۔ قوم کے نونہالوں سے اس طرح قبل از وقت کام لینے سے معاشرے کو انجام کار جو مضرت پہنچتی ہے اس کا عام طور پر احساس نہیں ہے؛ اور اگر اس احساس میں موجودہ حالت کے مقابلے میں کچھ زیادتی ہو بھی جائے تب بھی انتہائی افلاس کی وجہ سے والدین اپنے بچوں کو طویل مدت تک تربیت دینے اور انھیں زندگی کی کشاکش کے لیے زیادہ موثر طریقے پر تیار کرنے کے قابل نہ ہوں گے۔

سنہ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری میں مجموعی آبادی ۸۷۷،۳۷،۸ر۲۵۳ تھی، جس کے منجملہ ۷۶۴و۸۰۲و۳۴۸ (یا ۷۴ فی صد) مرد اور ۲۲۳و۷۰۶و۸۳ (یا ۴۹ فی صد) عورتیں، شادی شدہ تھیں؛ اور ۱۰۰و۸۳۲۲،۶۸ (یا ۴۸ فی صد) مرد اور ۴۳۰،۸۹۶و۹۵ (یا ۳۵ فی صد) عورتیں ان بیاہی تھیں باقی رنڈوے اور بیوائیں تھیں[۱]۔

دنیا کے تمام ملکوں میں ہندوستان ہی تنہا ایک ملک ہے جہاں دونوں صنفوں یعنے مردوں اور عورتوں کے ان بیاہوں کا تناسب کمترین ہے۔

---

[۱]۔ ان اعداد سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شادی شدہ مردوں کا تناسب شادی شدہ عورتوں کے مقابلے میں زیادہ ہے؛ اس کے برخلاف پچھلی مردم شماریوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شادی شدہ مردوں کے مقابلے میں شادی شدہ عورتوں کا تناسب بڑھا ہوا ہے۔ ڈاکٹر ہٹن کا یہ خیال ہے کہ گزشتہ مردم شماری میں شادی شدہ عورتوں کی کثیر تعداد (قریب قریب ۱/۲ ملین) اس ڈر سے غیر شادی شدہ بتلائی گئی کہ کہیں شاردا ایکٹ کے تحت (جو یکم اپریل سنہ ۱۹۳۰ء کو نافذ کیا گیا) ان پر مقدمہ نہ چلایا جائے۔

البتہ لڑکیوں کے مقابلے میں لڑکوں کی شادی کی عمر کسی قدر زیادہ ہے[1]۔ اگر انگلستان اور ویلز کے اعداد عام طور پر مغربی یورپ کے نمایندہ مان لیے جائیں تو ہندوستان میں شادیوں کی شرح، صوبہ وار تغیرات کے باوجود، یورپ کے مقابلے میں بہت اعلیٰ ہے۔ چنانچہ غیر شادی شدہ مردوں کی ۴۸ فی صد کی مجموعی آبادی کے منجملہ تین چوتھائی سے کچھ زیادہ (یا ۷۷ فی صد) ۱۵ سال سے کم عمر کے ہیں؛ اس کے برخلاف غیر شادی شدہ عورتوں کی مجموعی آبادی یعنی ۳۵ فیصد کے منجملہ ۹۱ فی صد کی عمر اس سے بھی کم ہے۔ شباب و تاہل کا زمانہ یعنی ۱۵ تا ۴۰ کی عمر لی جائے تو غیر شادی شدہ عورتوں کی آبادی کا تناسب ۵ فی صد تک گھٹ جاتا ہے، اس کے برخلاف انگلستان اور ویلز میں یہ تناسب ۳۶ فی صد ہے[2]۔

بعض صورتوں میں شادی کی رسم اور رخصتی کے مابین بہت طویل مدت حائل ہوتی ہے، لیکن ایسی صورتیں بہت شاذ ہوتی ہیں؛ چنانچہ بحیثیت مجموعی ان کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

بیاہ کی عمومیت، اس واقعے سے کسی حد تک زائل ہو جاتی ہے کہ ہندوؤں میں بیواؤں کی شادی بہت شاذ ہوتی ہے، گو اس کے خلاف میلان بتدریج رفع ہو رہا ہے۔

کچھ سال ادھر سے مردوں اور عورتوں، دونوں، میں شادی کی عمر کو بڑھا دینے کی موافقت میں میلان رونما ہوا ہے۔ لیکن یہ میلان صرف تعلیم یافتہ

---

[1] ۔ قانون ازدواج اطفال یا شاردا ایکٹ بابتہ ۱۹۲۹ء کی رو سے لڑکیوں کی شادی کی عمر ۱۴ سال قرار دی گئی ہے، گو یہ تدبیر، اصلاح کی ابتدا کے طور پر پسندیدہ ہے، پھر بھی اس کے نتائج و اثرات، تعداد کے نقطۂ نظر سے یقیناً بالکل نظر انداز کرنے کے قابل ہیں۔ بدقسمتی سے یہ ایسی حالت بھی ہے جس میں قانون، رائے عامہ سے زیادہ ترقی یافتہ اور آگے بڑھا ہوا ہے۔ اسی وجہ سے اس قانون کی خلاف ورزی بھی بہت عام طور پر ہوتی ہے۔ اگر برطانوی ہند کے ساتھ دیسی ریاستیں بھی مل کر کام کریں اور اسی قسم کے آئین و قوانین وضع کریں تو، صورت حال کی اصلاح ہو جائے گی۔

[2] ۔ دیکھو پی، کے وٹل کی کتاب محولۂ بالا صفحہ ۴۳۔

طبقوں تک محدود ہے جن کی تعداد حقیر ہے، اور عوام میں ابھی تک رونما نہیں ہوا ہے علاوہ ازیں شادی کو ملتوی کرنے کا میلان عورتوں کے مقابلے میں مردوں میں زیادہ نمایاں طور پر پایا جاتا ہے۔ لیکن شادی کا التوا، آبادی کی روک کے نقطۂ نظر سے، اس وقت بدرجہا زیادہ موثر ہوگا جبکہ لڑکوں کے بجائے لڑکیوں کے بارے میں اس پر زیادہ عمل ہو۔ علاوہ ازیں ایک اور نقطۂ نظر سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا شادی کی عمر کا التوا، تاوقتیکہ وہ قابل لحاظ حد تک نہ ہو، آخری نتیجے کے طور پر آبادی کو کم کرنے کی بجائے بڑھائے گا یا نہیں۔ بچپن کی شادی، شوہر اور زوجہ اور خاص کر زوجہ کی صحت و تندرستی پر مضر اثر ڈالتی اور بارآوری کو کم کرتی ہے؛ لہذا شادی کی عمر میں اضافہ کرنے سے بارآوری میں بھی اضافہ ہوگا۔ بچپن کی شادی سے ایک اور خرابی منسوب کی جاتی ہے اور وہ قبل بلوغ جماع ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ یہ طریقہ اس سے زیادہ عام ہے جتنا کہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ کم عمر بیوی کو شدید جسمانی ضرر پہنچا کر بارآوری کو کم کرنے کا موجب بنتا ہے۔ گو بچپن کی شادی کے رواج کی تنسیخ، معاشی اصلاح کے کسی نظام نامے میں بھی اہم ترین مدوں میں سے ایک مد ہونی چاہئیے؛ پھر بھی یہ فراموش نہ کرنا چاہئیے کہ اس کا براہ راست نتیجہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آبادی میں زیادہ سرعت کے ساتھ اضافہ ہو؛ اور یہ نتیجہ، تاوقتیکہ شادی کی اوسط عمر خاص کر عورتوں کے بارے میں بہت زیادہ نہ بڑھا دی جائے اور تاوقتیکہ دوسری قسم کے روک موثر نہ ہوں، لازماً رونما ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ، ہندوستان میں شادی سے اجتناب یا اس کے التوا کے ذریعے سے اضافۂ آبادی کی روک کم و بیش مفقود ہے، اور حیوانی جبلت کو نیم مذہبی جواز سے مستحکم کرکے اپنا فعل زبوں انجام دینے کے لیے آزاد چھوڑا گیا ہے۔ ایسی حالت میں یہ امر تعجب انگیز نہیں کہ ہندوستانی شرح ولادت، دنیا کی اعلیٰ ترین شرحوں میں سے ہے۔

۱۸۔ ادنیٰ بارآوری۔ (۱) قدرتی۔ لیکن ہندوستان میں، بدرجہا اعلیٰ شرح ولادت کے باوجود آبادی کا موثر اضافہ یورپ کے ملکوں کے مقابلے میں بدرجہا کم ہے؛ جس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں

باب ۲

شرح اموات بہت اعلیٰ ہے۔ تاہم عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس نتیجے کا باعث ایک حد تک ہندوستانیوں کی ادنیٰ قوت تولید ہے۔ بچہ پیدا کرنے کے قابل عمر کی شادی شدہ ہندوستانی عورتوں میں بارآوری فی ہزار ۱۲۰ ہے؛ اس کے برخلاف انگلستان میں یہ اوسط ۱۹۶ فی ہزار ہے[1] اور یہ اعداد اس نظریے کی تائید میں بطور مثال پیش کئے جا رہے ہیں کہ تولیدی قوت کی زیادتی تہذیب و تمدن کی ترقی سے وابستہ ہوتی ہے[2]۔ لیکن "بارآوری" اور "قوت تولید" میں احتیاط کے ساتھ تمیز و تفریق کرنا ضروری ہے۔ "قوت تولید" کا لفظ "بچہ کشی کی قوت" کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے، اور "بارآوری" کے معنی "بچہ کشی کا حقیقی درجہ" لیے گئے ہیں۔

---

[1] دیکھو کار ساؤنڈرس کی محولہ کتاب صفحہ ۲۷۔

[2] قوت تولید اور بارآوری کے درمیان احتیاط کے ساتھ تمیز و تفریق نہ کرنے کے باعث عام طور پر کچھ پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثلاً جس وقت یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں میں قوتِ تولید زیادہ ہے تو اس کا مطلب یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے مقابلے میں زیادہ تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ لیکن محض اس سے مسلمانوں کی قوتِ تولید کی زیادتی کا نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ دوسرے متعدد عاملین مسلمانوں کی تعداد کے اضافے کی اعلیٰ شرح کی کافی توجیہ کرتے ہیں، مثلاً اولاً یہ کہ اوائل عمر کی شادی کا رواج جو صحت کے لیے مضر ہے اور بارآوری کو کم کرتا ہے، مسلمانوں میں نسبتاً کم ہے؛ دوسرے یہ کہ مسلمانوں میں بیواؤں کی مکرر شادی کا رواج ہے؛ اور تیسرے اونچی ذات میں بیاہ کرنے کا طریقہ رائج نہیں ہے۔ اسلامی آبادی کے اضافے کی اعلیٰ شرح کے بعد دیگرے متعدد مردم شماریوں سے ظاہر ہو رہی ہے جس کی وجہ ایک حد تک یہ بھی ہے کہ ہندو تبدیل مذہب کر کے مسلمان ہو جاتے ہیں (اس تحریک کا پوری طرح ازالہ شدھی سے نہیں ہو رہا ہے جس میں مسلمان مرتد کر کے ہندو بنا لیے جاتے ہیں چنانچہ ان کی تعداد نو مسلموں کی تعداد سے زائد نہیں ہے)؛ اور دوسری وجہ یہ واقعہ ہے کہ عیسائیت جیسے مذاہب مسلمانوں کے مقابلے میں ذات پات کے جھگڑوں میں مبتلا ہندوؤں سے مذہب تبدیل کرانے میں زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔

باب ۳

69

اس بیان کا کہ ہندوستانیوں کی تولیدی قوت ادنیٰ ہے، یہ مطلب نہیں ہے کہ ہندوستان میں ہر سال مجموعی آبادی کے مقابلے میں کم تناسب سے بچے پیدا ہوتے ہیں؛ اس لیے کہ یہ علانیہ طور پر غیر صحیح ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ دوسرے حالات مساوی رہنے کی صورت میں، ایک ہندوستانی عورت، بچہ جننے کی عمر میں، انگریز عورت کے مقابلے میں، کم بچے پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس کے برخلاف انگلستان میں، تولیدی قوت کو پوری طرح کام میں نہیں لایا جاتا اس لیے کہ وہاں تجرد کی زندگی اور بیاہ کا التوا ہندوستان کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ عام ہے۔ غرض ہندوستان کی اعلیٰ شرح ولادت کا واقعہ اس نظریئے کے خلاف نہیں ہے کہ ہندوستانیوں کی قوتِ تولید کمتر اور گھٹیا ہے۔

یہ استدلال کیا گیا ہے کہ بارآوری کے اس فرق کی توجیہ ہندوستان کی شادیوں کے رواج سے کلیتہً نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے کہ گو وہ بلاشبہ بارآوری کو کم کرنے والے اہم اسباب میں سے ایک ہے، پھر بھی یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ اس اعتبار سے یورپ میں انسدادی مانعات کا وسیع استعمال بدرجہا زیادہ کارگر اور موثر ہے، اور اس لحاظ سے یورپی اقوام کے مقابلے میں ہندوستان کی ادنیٰ بارآوری کا باعث ہندوستانیوں کی کمتر اور گھٹیا قدرتی تولیدی قوت کو قرار دینا چاہئے۔ تاہم ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نظریہ جس میں قوت تولید کی زیادتی کو تہذیب و تمدن کی ترقی سے منسوب کیا گیا ہے، محض ایک مفروضے کی نوعیت رکھتا ہے جس کی پوری پوری تصدیق ناقابل اعتراض شہادت سے ابھی تک نہیں ہوئی ہے۔ یہ نظریہ، اس عام طور پر مسلمہ خیال کے بظاہر خلاف معلوم ہوتا ہے کہ "تولیدی قوت، عقلی و ذہنی نشو و نما اور مادی بہبودی و ترقی کے ساتھ ساتھ گھٹتی جاتی ہے۔

لہ۔ ہم یقیناً ایک شادی شدہ ہندوستانی عورت کے جنے ہوئے بچوں کی تعداد کا مقابلہ ایک شادی شدہ یوروپین عورت کے پیدا کردہ بچوں کی تعداد سے کر رہے ہیں۔ یہ بتانے کی بہ مشکل ضرورت ہے کہ مجموعی آبادی میں شادی شدہ عورتوں کا تناسب یورپ کے مقابلے میں یہاں بہت بڑھیا اور اعلیٰ ہے، چنانچہ یہاں اسی کے باعث شرح ولادت بھی مقابلتہً اعلیٰ ہے۔

باب ۳

(۲) اتفاقی۔ بعض اوقات یہ ممکن ہے کہ میاں اپنی بیوی سے طویل مدت تک جدا رہے؛ مثلاً قلت باراں کے باعث میاں اپنا گھر بار چھوڑ کر دور دراز مقام کو چلا جائے اور ممکن ہے کہ مہینوں اپنے گھر سے دور رہے۔ لیکن اس قسم کے واقعات گاہ گاہ ظہور پذیر ہوتے ہیں، چنانچہ بارآوری کے کم کرنے میں اس کے اثر پر غور کرنے کے لیے ہمیں توقف کرنے کی ضرورت نہیں۔

(۳) ارادی۔ مالتھس کے مفہوم کے لحاظ سے اخلاقی اجتناب کے طریقے پر کسی بڑی حد تک یقیناً عمل نہیں کیا جاتا اور یہی بات جدید مالتھسی طریقوں کے بارے میں بھی صادق آتی ہے۔ یہ خیال کرنے کی وجہ ہے کہ یہ طریقے بتدریج مقبول ہوتے جا رہے ہیں، اور آیندہ بھی ان کے زیادہ عام ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ لیکن سردست ان کا اثر ہندوستان میں شرح ولادت کو کم کرنے کے سلسلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔

ارادی اسقاط حمل کے طریقے پر ابھی تک کسی حد تک عمل کیا جاتا ہے، لیکن قانون نے اس طریقے کو نہایت مناسب طور پر بڑا جرم قرار دیا ہے؛ چنانچہ موجودہ حالت میں آبادی کے اعظم ترین اضافے کو روکنے کے سلسلے میں اس طریقے کا اثر سرعت کے ساتھ گھٹ رہا ہے[۱]۔

70

۱۹۔ معاشری رسم و رواج: رضاعت کا طویل زمانہ

ہندوستان میں بچوں کو زمانۂ دراز تک دودھ پلانے کا طریقہ عام ہے اور عوام کا خیال یہ ہے کہ طبی رائے اس طریقے کی تائید میں ہے۔ بہرحال اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حمل کم قرار پاتا ہے۔ یورپی ماں خوبصورتی کو قایم و برقرار رکھنے کے خیالات کے زیر اثر بعض اوقات بچے کو اپنی چھاتی کا دودھ ہی نہیں پلاتی، یا اگر پلاتی بھی ہے تو بچہ ہندوستان کے مقابلے میں بہت جلد کمزور ہو جاتا ہے۔ طبی شہادت کے

[۱] اسقاط کا طریقہ جس حد تک اس کو اختیار کیا جاتا ہے، زیادہ تر جرم کو چھپانے اور ناجائز ولادتوں کو روکنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے نہ کہ اس حیثیت سے کہ وہ رائے عامہ کے کسی بڑے حصے کے نزدیک جائز ولادتوں کو روکنے کا پوری طرح مسلمہ طریقہ ہے۔

باب ۵

مطابق، نو ماہ یا ایک سال سے زیادہ رضاعت کے زمانے کو طول دینا ماں اور بچے دونوں کے لیے مضر ہے؛ چنانچہ یورپی ماؤں کے دودھ نہ پلانے کی ایک اور وجہ یہی ہے لیکن ہندوستان میں اس طریقے کے عام رواج کے متعلق یہ خیال کرنا ضروری ہے کہ وہ اضافۂ آبادی کو روکنے والا ایک اہم عامل ہے۔

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ ازدواجی زندگی میں کثرت اولاد کو روکنے کے خیال سے ارادی طور پر مباشرت سے پرہیز کرنے کا طریقہ ہندوستان میں قریب قریب مفقود ہے۔ البتہ بعض مذہبی ہدایات کے مطابق بعض زمانوں میں لازمی طور پر اجتناب کرنا پڑتا ہے؛ مثلاً منو کی یہ تاکید ہے کہ ماہ ہلالی کے ابتدائی اور درمیانی زمانے میں شوہر اپنی بیوی سے الگ رہے۔ لیکن اس کے باوجود متعدد جدید اثرات کے تحت اس قسم کے قواعد کی سختی کے ساتھ پابندی میں بتدریج کمی ہوتی جا رہی ہے۔ بلکہ سچ پوچھو تو یہ قواعد طویل مدت تک اجتناب کو ضروری ہی نہیں قرار دیتے اور ان کا عملی اثر نظر انداز کرنے کے قابل ہے۔

اونچی ذات میں بیاہ کرنے کا رواج اب بھی ہندوستان کے بعض علاقوں میں پایا جاتا ہے، چنانچہ مشرقی بنگال میں یہ ایک حد تک لازمی طور پر آبادی کے اضافے کو روکتا ہے۔ یہ رواج لڑکی کو ایسے مرد سے شادی کرنے سے باز رکھتا ہے جو معاشری رتبے میں لڑکی کے مساوی یا اس سے کم ہو، اور اس کو اونچی ذات اور مرتبے والے مرد سے شادی کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ لیکن چونکہ اونچے طبقوں کے دولہاؤں کی تعداد محدود ہے، اس لیے ان سے رشتہ جوڑنے کے واسطے بہت سرگرمی کے ساتھ مسابقت ہوتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بڑے بڑے جہیز اور تلک، تعدد ازواج وغیرہ جیسی خرابیاں رونما ہوتی ہیں[1]۔

---

[1] میں دو کلینوں کو جانتا ہوں جن میں سے ایک کی ساٹھ اور دوسرے کی سو سے زائد بیویاں تھیں۔ ان دونوں مردوں میں سے ہر ایک کے پاس ایک کتاب تھی جس میں وہ اپنی بیاہی بیویوں کے باپوں کے نام تحریر کر لیتا تھا۔ ہر مرد آغاز موسم سرما میں یادداشت کی کتاب اپنے ساتھ لے کر اپنی بیویوں کے پاس دورے کو نکلتا تھا اور ہر بیوی سے مل کر اور اس کے باپ کی حیثیت کے مطابق روپیہ وصول کر کے

باب ۵

۲۰۔ طفل کشی بعض انتہائی صورتوں میں، لڑکی کو مقررہ طریقوں پر بیاہ دینے کی دقت و دشواری کی بنا پر یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ لڑکی پیدا ہوتے ہی مار ڈالی جاتی ہے۔ بلوغ سے پیشتر لڑکی کو بیاہ دینے کا جو معاشری و مذہبی لزوم ہے اس کی بنا پر لڑکیوں کی ولادت عام طور پر نامبارک خیال کی جاتی ہے؛ چنانچہ لڑکیوں سے بے اعتنائی برتنے کے اسباب کے منجملہ ایک سبب یہی ہے اور اونچے طبقوں میں لڑکیوں کا بیاہ کرنے کا رواج جہاں کہیں پایا جاتا ہے وہاں انکی حالت اور بھی بدتر ہو جاتی ہے۔ لیکن حقیقی دختر کشی کا باقاعدہ رواج[1]، ارادی اسقاط حمل کے مثل بہت کم ہو گیا ہے، اور یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ قانون اور رائے عامہ کی متحدہ قوت، عنقریب اس کے باقیماندہ نشانات کو بھی بالکل مٹا دے گی۔

71

۲۱۔ افلاس اور امراض[2] ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ افلاس جسمانی قوت و توانائی کو گھٹا کر اور اس طرح شرح ولادت کی تحدید کر کے، کیا کیا ممکنہ اثرات ڈال سکتا ہے۔ چنانچہ افلاس ہی کو پرورش اطفال میں بے پروائی،

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:۔ موسم گرما شروع ہونے تک گھر لوٹ آتا تھا، تا کہ سال کا باقی حصہ اپنے قریے میں گزارے ....، ماخوذ از کتاب بابو آبھیا چندر داس، جس کا حوالہ رسؔ لے نے اپنی محولۂ بالا تصنیف میں صفحہ ۹۶ تا ۱۹۷ پر دیا ہے۔ موجودہ زمانے میں کلینی طریقہ اس قدر شدید اور زبون شکل میں تو رائج نہیں ہے لیکن بالکل مفقود بھی نہیں ہے۔ چنانچہ رسؔ لے آگے چل کر لکھتا ہے کہ "لڑکیوں کا بیاہ اونچے طبقوں میں کرنے کا اصول ایک نئی شکل میں رونما ہوا ہے اور وہ یوں کہ اب بنگال کے بیاہ کے بازار میں گریجویٹ (الیلسانی) شوہروں کی مانگ ہے۔"

[1] "پنجاب میں بیس سال پیشتر کے مقابلے میں اب حالات غالباً بہتر ہیں لیکن پھر بھی ایسے جاٹ اور راجپوت موجود ہیں جو اپنی لڑکیوں کی شادی اپنے سے کم درجے والوں میں کرنے کے بجائے لڑکیوں کی موت کو ترجیح دیتے ہیں" دیکھو ام، آل ڈارلنگ کی کتاب موسوم بہ "پنجابی کسان خوش حالی اور قرضداری میں" صفحہ ۹۵

(The Punjab Peasent in Prosperity and Debt)

[2] یوں تو عام طور پر افلاس اور امراض کو ایجابی مانعات کے تحت شمار کیا جاتا ہے، لیکن یہاں ان کو انسدادی مانعات کے تحت اس لیے شمار کیا گیا ہے کہ ہم یہ غور نہیں کر رہے ہیں کہ موجودہ آبادی کو کم کرنے میں ان کے

باب ۴

بے احتیاطی اور کوتاہ اندیشی کا ایک سبب قرار دیا جاتا ہے، گو شادی کے حق میں وہ یوں حوصلہ شکن ثابت ہوتا ہے کہ ضروری مصارف کو پورا کرنے کے ذرائع نہ ہونے کی وجہ سے شادی بادل ناخواستہ ملتوی کر دی جاتی ہے۔ لیکن ادھر مالی حالت کی اصلاح و ترقی ہوئی اور ادھر ملتوی شدہ بیاہ کی رسم بہ موقع اول رچائی جاتی ہے۔

ملیریا بخار، جس سے ہندوستان کا کوئی گوشہ بہ مشکل کلیتہً بچا ہوا ہے، بارآوری کے حق میں سخت مضر ہے، اور بچہ پیدا کرنے کے قابل عمروں میں عورتوں کے، ملیریا میں مبتلا ہونے کا خاص طور سے قرینہ ہوتا ہے۔

۲۲ نتیجہ یوں تو ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ مختلف قسم کے انسدادی مانعات، خواہ وہ ارادی ہوں یا غیر ارادی، موجودہ زمانے میں ہندوستان میں کس حد تک عمل کرتے ہیں۔ لیکن اعلیٰ شرح ولادت، صاف طور پر بتلاتی ہے کہ ان سب مانعات کا متحدہ اثر بہت ہی حقیر ہے۔ ان میں سے بعض، مثلاً طفل کشی اور اسقاط حمل، بتدریج معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ رہے دوسرے مانعات، مثلاً بچپن کی شادی، لڑکیوں کو اونچے درجوں میں بیاہنے کا رواج اور بیواؤں کی شادی کی ممانعت، تو اصلاح معاشرت اور تہذیب و شائستگی کی توسیع و ترقی کی بدولت ان کا زور بھی ٹوٹ جائے گا۔ پس ظاہر ہے کہ انسدادی مانعات کا ارتفاع یا ان کی کمزوری، تاوقتیکہ نئے مانعات سے متوازن نہ ہو، اس میلان کو تقویت پہنچائے گی کہ آبادی ذرائع معاش پر بار بن جائے۔

ایجابی مانعات اور انسدادی مانعات کے درمیان نسبت معکوس پائی جاتی ہے؛ چنانچہ آبادی کو ذرائع معاش کے مساوی و مطابق رکھنے کے عاقلانہ طریقوں کی عدم موجودگی میں، تکلیف دہ طریقوں پر عملدرآمد کرنا پڑے گا۔ اس میں بہ مشکل کوئی کلام ہو سکتا ہے کہ ہندوستان بے روک ولادتوں کا جرمانہ ادا کر رہا ہے اور اٹل قانون قدرت کو بے مہری کے ساتھ اس گتھی کو سلجھانے کا موقع دے رہا ہے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ کیا اثرات ہیں بلکہ یہ کہ موجودہ آبادی میں مزید اضافہ کو روکنے میں ان کے کیا اثرات ہیں۔

"نتیجہ یہ کہ لاکھوں انسان محکی ماندی زمین سے اپنا شکم پر نہیں کر سکتے اور خود نذر زمین ہو کر اس کے شکم کو پُر کر دیتے ہیں"۔ اس سے انکار نہیں کہ اعلیٰ شرح اموات کا باعث ایک حد تک صحت و صفائی عامہ کا ناکافی انتظام اور تندرستی کے قواعد سے عام ناواقفیت ہے، لیکن ان کا سبب بھی آخر میں چل کر افلاس ہی قرار پاتا ہے۔ 72

کہا جاتا ہے کہ انگریز قوم مسلمہ طور پر دنیا کی متمول ترین قوموں میں سے ایک ہے، لیکن اس کے باوجود دس فی صد انگریز خوش حالی سے محروم بلکہ مفلس پیدا ہوتے ہیں، اور نہایت متمول اشخاص کی تعداد بہت ہی کم ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف ہندوستان میں مفلسوں کا فی صد تناسب بدرجہا زیادہ ہے چنانچہ ہمارے خیال میں یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ اہل ہند میں سے ۹۰ فی صد قریب قریب ہمیشہ فاقوں بسر کرتے ہیں۔ بہرحال اطفال اور بالغوں میں کثرت اموات کا بڑا سبب بلاشبہ یہی انتہائی افلاس ہے۔ بچوں کی بڑی تعداد محض اس وجہ سے مرجاتی ہے کہ ان کو مناسب غذا کافی مقدار میں نہیں ملتی۔ رہے بالغ تو مسلسل طور پر کم اور گھٹیا قسم کی غذا اور اس کے نتیجے کے طور پر کم طاقتی انھیں امراض کا بہت جلد شکار بنا دیتی ہے۔ چنانچہ انفلوئنزا کی وبا (۱۹۱۸ء تا ۱۹۱۹ء) کے زمانے میں نہایت کثرت سے اموات واقع ہوئیں اور ان کا باعث ہندوستانی آبادی کی ادنیٰ قوت مقاومت تھی جو بجائے خود افلاس کا نتیجہ تھی۔

اگر نئی ہستیاں عالم وجود میں بے روک آتی رہیں، اور موجودہ ممکنہ ذرایع ان کے قیام و سربراہی کی اجازت نہ دیں تو یہ آبادی کی افراط کی شہادت و علامت ہے؛ چنانچہ ہندوستان میں عام طور پر یہی صورت حال پائی جاتی ہے۔ شرح اموات کی زیادتی جو زیادہ تر افلاس سے منسوب کی جاسکتی ہے کثرت آبادی کا قطعی ثبوت خیال کی جاسکتی ہے۔ موثر قسم کے انسدادی مانعات کی عدم موجودگی اور ساتھ ہی تولید انسانی کی عظیم قوت کی موجودگی اس امر کو بہت اغلب بلکہ یقینی بنا دیتی ہے کہ ہندوستان میں مفرط آبادی، نہ صرف حالت بلکہ میلان کی حیثیت سے بھی، پائی جاتی ہے۔ موجودہ حالات نیز مستقبل قریب میں ترقی کے امکانات کا لحاظ کرتے ہوئے، ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر اہل ہند کی شرح ولادت کمتر ہو تو ہندوستان

باب ۳

ان کی بود و باش کے لیے موجودہ حالت سے زیادہ بہتر ملک ہو سکتا ہے۔[1]

۲۳۔ مفرط آبادی اور قومی آمدنی

مفرط آبادی کے مسئلے کی پیچیدگیوں کے منجملہ ایک یہ ہے کہ اس ملک میں قومی آمدنی کے متعلق وقتاً فوقتاً مرتب کئے ہوئے اندازوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فی کس آمدنی میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر آبادی بڑھ رہی ہے اور اس کے ساتھ ہی قومی آمدنی میں بھی کم از کم اسی مقررہ شرح سے اضافہ ہو رہا ہے تو پھر "آبادی" کو "مفرط" کس طرح کہا جا سکتا ہے؟ اس 73 مشکل کو حل کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اس ملک میں آمدنی کے بارے میں قائم کئے ہوئے متعدد اندازوں کی صحت پر دلیرانہ اعتراض کیا جائے۔[2] سچ پوچھو تو سارے اندازے، صحیح مواد کی عدم موجودگی کے باعث کم و بیش قیاسی ہیں۔ ونسنٹ اسمتھ پر تو یہ سوءظن نہیں کیا جا سکتا کہ برطانوی حکمرانی کے خلاف اس کو کوئی شکوہ یا تعصب ہے، تاہم زیادہ سے زیادہ تعریفی الفاظ جو ان کے قلم سے نکلتے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ اہل ہند کی حالت میں صرف بعض اعتبارات سے اصلاح ہوئی ہے اور اکثر اعتبارات سے حالت بد سے بدتر

---

[1] اس عام نتیجے کی صحت کو تسلیم کر لینے کے باوجود ہمارا خیال یہ ہے کہ ہندوستان کی عظیم وسعت اور اس کے اقوام، قدرتی ذرائع اور آب و ہوا کے لاانتہا ہی انواع و اقسام پر نظر کرتے ہوئے کثرت آبادی کے پیچیدہ مسئلے کی تحقیق اگر چھوٹے پیمانے پر ضلع واری یا صوبہ واری کی جائے تو اس سے مسئلے پر زیادہ بہتر روشنی پڑے گی۔ علاوہ ازیں ذات پات کے طریق اور ہندوستانی معاشرے کی دوسری خصوصیات کی وجہ سے غیر مسابق جماعتیں غیر معمولی طور پر کثیر تعداد میں موجود ہیں، چنانچہ ہر جداگانہ جماعت، گروہ، ذات یا پیشے کو فرداً فرداً جانچنے پر کثرت آبادی کی نوعیت و وسعت کا اس سے زیادہ قابل قدر اور مفصل حال معلوم ہو سکتا ہے جتنا کہ ایک ہمہ گیر اور عام مساحت سے ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کتاب میں تو صرف موخر الذکر طریقہ اختیار کرنا ممکن ہوا۔

[2] دیکھو باب ۴ جلد دوم۔

ہو گئی ہے؛ گویا بحیثیت مجموعی شہنشاہ اکبر کے زمانے کے مقابلے میں موجودہ زمانے میں کچھ ہی بہتر حالات پائے جاتے ہیں[1]۔ جیسا کہ مورلینڈ نے کہا ہے کہ "کم و کیف کے لحاظ سے کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہوئی ہے"[2]۔ لوگوں کی معاشی حالت کی اصلاح و ترقی اس قدر بدیہی واقعہ نہیں ہے کہ کوئی شخص سطحی اور سرسری طور پر اس کا اندازہ کر سکے۔ وہ شخص بھی جو عجلت میں نہ ہو اور وقت نکال کر نظر غائر سے حالات کا مطالعہ کرے اصلاح و ترقی کے بجائے عام طور پر انحطاط ہی پاتا ہے۔ اس کا معمولی سرکاری جواب یہ ہے کہ "اس امر کا الزام کہ اہل ہند افلاس میں ثابت قدمی کے ساتھ جمے ہوئے ہیں خود ان ہی کے سر ہے' اس لیے کہ وہ اپنی آیندہ بہبود کا خیال کئے بغیر اپنی تعداد میں سرعت کے ساتھ اضافہ کئے جا رہے ہیں"۔ پھر بھی یہ جواب اس دعوے کو کہ گزشتہ پچاس سال میں لوگوں کی حالت بہتر نہیں ہوئی ہے' باطل نہیں کرتا بلکہ محض اس کی تاویل کرتا ہے۔

دوسری صورت مشکل کو حل کرنے کی یہ ہے کہ معاشی حالت کی اصلاح و ترقی کو تسلیم کر لیا جائے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی خیال کر لیا جائے کہ اگر آبادی قلیل ہوتی اور اگر متعدد ایجابی مانعات کے عمل کے بجائے ولادتوں کی ارادی روک کے ذریعے سے آبادی کی کثرت پر بندش قایم کی جاتی تو اس سے زیادہ اصلاح و ترقی رونما ہوتی۔ چنانچہ ہم یہ خیال کرنے کی جانب مائل ہیں کہ یہ نقطۂ خیال غالباً اصلی واقعات و حالات کے مطابق ہے۔

۴۲۔ ایجابی و انسدادی مانعات

ہمیں ناظرین کو یہاں یہ خیال قائم کرنے کے خلاف متنبہ کر دینا چاہیئے کہ اس امر کا نفس معاملہ پر اثر نہیں پڑتا کہ آبادی میں ایجابی مانع کے ذریعے سے کمی ہو یا انسدادی مانع کے ذریعے سے۔ اعلیٰ ترین معیار راحت و آرام کے حاصل کرنے کے لیے جس چیز کی

---

[1] دیکھو ونسنٹ اسمتھ کی کتاب موسوم بہ "اکبر مغل اعظم" صفحہ ۳۹۴ تا ۳۹۴ Akber the Great Mogul

[2] دیکھو ڈبلیو ایچ مورلینڈ کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان بزمانۂ وفات اکبر" صفحہ ۲۷۰۔ India at the Death of Akber

ضرورت ہے وہ صرف یہی نہیں ہے کہ آبادی کو روک کر اس کو ایک مناسب و متوازن حد پر رکھا جائے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ پیدآور قوت کو اسی معیار پر برقرار رکھا جائے جو متوازن و معیاری تعداد نفوس کے لیے مناسب ہو۔ قدرت کے کام کرنے کے طریقے عام طور پر بھدے ہوتے ہیں؛ اور ان مصائب عظیم کے قطع نظر کرتے ہوئے جو ان طریقوں کے باعث نازل ہوتے ہیں، یہ ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ گو کوئی بڑی قدرتی آفت، روز افزوں آبادی کے انتہائی اضافے کا صفایا کرنے میں کامیاب ہوسکتی ہے، لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ وہ باقی ماندہ اشخاص کو مضمحل و مخرب اخلاق حالت میں چھوڑے۔ چنانچہ یہ ممکن ہے کہ اس کے نتیجے کے طور پر رونما ہونے والی معاشرتی و معاشی افراتفری و بدنظمی اس قدر شدید ہو کہ جو معاشرہ اس آزمائش میں مبتلا ہو اس کا دور ثانی قطعی طور پر دور اول سے بدتر ہو، اور اس طرح ممکن ہے کہ تعداد نفوس کی کمی کے ساتھ ساتھ افلاس و خواری بھی بڑھ جائے۔ اسی وجہ سے معاشی نقطۂ نظر سے کثرت آبادی کی خرابیوں کا علاج ہونے کی حیثیت سے ایجابی مانعات پر انسدادی مانعات کو ترجیح دینی چاہئے؛ چنانچہ واقعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایجابی مانعات اس مرض کا شاذ ہی علاج کرسکتے ہیں؛ بلکہ ممکن ہے کہ وہ مرض میں اور شدت پیدا کردیں۔

یہ واقعہ کہ ہندوستان کی آبادی مغربی ممالک کے مقابلے میں بہت دھیمی رفتار سے بڑھ رہی ہے[1] بعض اوقات اس نظریئے کی کاٹ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے کہ ملک میں اس کی گنجائش سے زیادہ انسان آباد ہیں[2]۔

---

[1] دیکھو فصل (۱۱) جو اوپر بیان ہوچکی ہے۔

[2] لیکن ناظم مردم شماری بابتہ ۱۹۳۱ء کی طرح موجودہ زمانے میں اکثر لوگوں کے دلوں میں یہ خیال بیٹھا ہوا ہے کہ آبادی کے اضافے کی رفتار سست ہونے کی بجائے تیز ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ سنہ ۱۹۲۱ء اور ۱۹۳۱ء کے مابین اضافے کے اصلی اعداد کچھ کم ۳۴ ملین ہیں۔ یہ اضافہ، فرانس، یا اٹلی کی موجودہ مجموعی آبادی کے قریب قریب مساوی ہے؛ اور پولینڈ اور ہسپانیہ جیسے اہم دول کی آبادی کے مقابلے میں بہت بڑا ہے۔ اس وقت ہندوستان کی آبادی قریب ترین زمانے کے اندازے کے مطابق چین کی

لیکن حقیقی طور پر کم اضافہ اس بات کو لازمی طور پر ثابت نہیں کرتا کہ آبادی مفرط نہیں ہے۔ ہمیں یہ بھی ثابت کرنا چاہئے کہ دولت میں کم از کم اسی تناسب سے اضافہ ہوا ہے اور یہ کہ اگر آبادی کے اضافے کی شرح اس سے کم ہوتی تو فی کس آمدنی اس سے کم ہوتی۔ دوسرے یہ کہ ہمیں پھر اس کا اعادہ کرنا چاہئے کہ اہم ترین سوال یہ ہے کہ آیا سریع اضافۂ آبادی پر انسدادی مانعات کے ذریعے سے روک قایم ہو رہی ہے یا ایجابی مانعات کے ذریعے سے۔ ہم جانتے ہیں کہ اب تک ہندوستان میں صرف موخرالذکر ہی کا کامل دوردورہ رہا ہے؛ چنانچہ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے اس کی وجہ سے آبادی کا سست رفتار اضافہ یا قطعی کمی، باشندوں کی معاشی حالت کے انحطاط کے بالکل ہم آہنگ و مطابق ہو جاتی ہے۔

۲۵۔ آبادی کے اضافے کی ارادی روک کے سوا دوسرے طریقے

اگر ہم یہ خیال ظاہر کریں کہ ہندوستان میں مفرط آبادی ہے تو اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہم یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ ملک کے ذرایع مناسب طریقے پر ترقی پانے کی صورت میں موجودہ تعداد سے زیادہ تعداد ملک میں نہیں رہ سکتی۔ یہ استدلال ترغیب دہ طریق پر کیا جا سکتا ہے کہ جہاں مغرب معاشی ترقیوں کے لحاظ سے بام عروج پر پہنچ چکا ہے وہاں ہندوستان ابھی تک پہلے ہی زینے پر ہے۔ یہاں صنعتی ترقی بمشکل شروع ہوئی ہے، اور صنعتوں میں تکثیر حاصل کا مقام ابھی اتنی دور ہے کہ وہاں تک پہنچنے میں غیر معین مدت درکار ہوگی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ قریب قریب یہی بات نقل و حمل، جہاز رانی وغیرہ کے بارے میں صادق آتی ہے۔ علیٰ ہذا زراعت میں بھی عمیق ترقی اور آب پاشی کے امکانات سے استفادہ کی ابھی بہت گنجائش باقی ہے۔ علاوہ ازیں اگر پیدائش دولت میں

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ: آبادی پر بھی سبقت لے جا چکی ہے؛ یہاں تک کہ ہندوستان، باشندوں کی تعداد کے لحاظ سے، دنیا کے تمام ممالک کی فہرست میں اول نمبر پر ہے۔ اگر موجودہ شرح اضافہ مان لی جائے تو بیسویں صدی کے اختتام پر ہندوستان کی آبادی ۰۰ کروڑ ہو جائے گی۔

اضافہ نہ بھی کیا جائے تو بھی دولت کی بہتر تقسیم، ایک بڑی آبادی کو خوش حالی کے اسی اعلیٰ معیار پر برقرار رہنے کے قابل بنا سکتی ہے۔ خود آبادی کو بھی زیادہ مساوی طریقے پر تقسیم کیا جا سکتا ہے اور وہ اس طرح کہ گنجان آباد علاقوں کی زاید آبادی کو ان علاقوں میں منتقل کر دیا جائے جہاں مناسب ترقی کے لیے آبادی بہت قلیل ہے۔ سب سے آخر میں یہ کہ آبادی کے دباؤ کو کم کرنے کے لیے ترک وطن خارجی کا طریقہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔

۲۶۔ ان اصلاحی تدابیر کی راہ میں رکاوٹیں۔

تاہم ان سمتوں میں سے کسی سمت میں فوری اصلاح کے امکانات کو حد سے زیادہ بڑھا کر بیان نہ کرنا چاہیے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اگر عاجلانہ صنعتی ترقی کی انتہائی کوشش بھی کی گئی تب بھی ترقی کی رفتار حسب دلخواہ تیز نہیں کی جا سکتی۔ ہندوستان صنعتی دوڑ میں بہت دیر سے شریک ہوا، اور اس کے راستے میں بہت سی رکاوٹیں ہیں۔ جب تک یہ رکاوٹیں دور نہ ہوں گی اس کی ترقی کی رفتار مغربی ممالک کے مقابلے میں لازمی طور پر سست رہے گی۔ ہندوستان میں طاقتور اغراض قائمہ موجود ہیں جو موجودہ حالت سے فایدہ اٹھا رہے ہیں۔ یہ ہر قسم کے تغیر کی نہایت سختی کے ساتھ مخالفت کریں گے۔ کہا جاتا ہے کہ ملک کی موجودہ معاشی پسماندگی کا باعث بڑی حد تک حکومت کی غفلت اور بے پروائی ہے۔ حکومت پر اس بارے میں کس حد تک الزام عاید کیا جا سکتا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس سے ہمیں براہ راست کوئی سروکار نہیں ہے۔ لیکن اگر استدلال کی خاطر یہ مان لیا جائے کہ حکومت کی بے پروائی اور بعض صورتوں میں مبینہ مخالفانہ روش ہندوستانی صنعتوں کی صبر آزما طریقے پر سست ترقی کی بڑی حد تک توجیہ کرتی ہے تو، جب تک یہ روش موجود ہے ہم کو دوسرے عناصر کے منجملہ اس عنصر سے بھی نبٹنا پڑے گا۔ اگر حکومت کی بے پروائی و غفلت کے عنصر کو، حکومت اختیاری جلد قایم کر کے، خارج کر دیا جائے تو بھی مالی رکاوٹیں اور دیگر مزاحمتوں کی وجہ سے صنعتی نشو و نما لازمی طور پر سست ہوگی۔

باب ۳

یہ امر کہ سنگین رکاوٹیں موجود ہیں، اس سے تو انکار نہیں ہو سکتا۔ گو ممکن ہے کہ ان رکاوٹوں کا لحاظ کرنے کے بعد رجائیت کی گنجائش پھر بھی باقی رہے، لیکن یہ رجائیت اس رجائیت کے مقابلے میں بہت زیادہ محتاط ہو گی جو بعض لوگ قایم کرتے اور یہ ثابت کرنے کے خواہشمند ہیں کہ ہندوستان میں مفرط آبادی نہیں ہے۔

علاوہ ازیں اگر ہم موجودہ رکاوٹوں سے چشم پوشی کریں اور یہ بھی مان لیں کہ سریع صنعتی ترقی یقینی ہے، تو بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ آدمیوں کی جتنی تعداد اس وقت دستیاب ہو سکتی ہے اس سے زیادہ صنعتی ترقی کے لیے درکار ہو۔ ایسے مقررہ حالات کی موجودگی میں جن کے تحت اضافۂ آبادی پر کسی قسم کی ارادی روک نہ ہو، یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ آبادی کی رسد، اس کی تمام ممکنہ طلب پر سبقت لے جائے گی۔ اضافۂ آبادی پر قدرت کے بے رحمانہ مانعات صرف اس وقت عمل نہ کریں گے جب کہ رسد کی سب زاید آبادی بڑھنے والے معاشی ذرایع میں فوراً جذب ہوتی جائے لیکن ایسا واقعہ کبھی کبھی اور وہ بھی صرف ایک محدود زمانے کے لیے ظہور پذیر ہوتا ہے۔[1] تاہم ہندوستان نہ تو نو آباد ملک ہے اور نہ اس کے مواقع اور سہولتوں کا مقابلہ، خواہ ان پر کتنے ہی رجائی طریقے سے نظر ڈالی جائے، صنعتی انقلاب سے پیشتر کے انگلستان کے مواقع سے کیا جا سکتا ہے۔ زائد آبادی کو صنعتی کاروبار میں

76

[1] مندرجۂ ذیل اقتباس میں معاملے کے ایک اور پہلو پر بھی روشنی پڑتی ہے:۔

"میرا خیال یہ ہے کہ اصل کے بہت بڑے ذخائر جن کی بنا پر سائنٹیفک ایجادیں عمل میں لائی جا سکتی ہیں، بڑے پیمانے پر کاروبار کرنے والی صنعتوں میں تکثیر پذیر ماحصل پیدا کرنے میں سب سے زیادہ اہم عنصر رہے ہیں۔ لیکن اگر آدمیوں کی بڑی تعداد بھی ضروری ثابت ہو تو، ماہرِ اعداد و شمار کو یہ دریافت کرنا چاہیے کہ آیا داخلی اور اکثر خارجی کفایات انفرادی کارخانوں، بازاروں یا شہروں میں آدمیوں کی کثیر تعداد کو کام پر لگانے سے حاصل نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ اگر یہی تکثیر حاصل کی اساسی شرط ہو تو، زرعی ماحصل کی تقلیل پذیری کو کل صنعت میں مزدوروں کی جماعت کا اوسطاً اضافہ زائل نہیں کرے گا بلکہ ہر صنعتی کارخانے، انجمن یا محلے میں کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد کا اوسط اضافہ زائل کرے گا۔ گویا اضافۂ آبادی کے معنی فی نفسہٖ کسی حال صنعت میں تکثیر حاصل کے نہ ہوں گے

باب

لگانا محض اس وقت ایک مستقل علاج ہوسکتا ہے جب کہ آبادی کی زیادتی نہ صرف قابل پیدائش غذا تک، بلکہ صنعتی محنت کی طلب کے نقطۂ سیری تک بھی محدود رہے۔

۲۷۔ محنت کی قلت، آبادی کی افراط کے خلاف دلیل کے طور پر۔

کثرت آبادی کے خلاف جو معمولی دلائل پیش کئے جاتے ہیں ان میں سے ایک محنت کی مبینہ قلت پر مبنی ہے جو زراعت اور صنعت دونوں میں محسوس کی جاتی ہے۔ اس کا جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ زراعت میں محنت کی قلت کا خیال اس واقعے کی بنا پر پیدا ہوتا ہے کہ اس کی طلب سال کے کچھ حصے میں اور وہ بھی قلیل مدت کے لیے مثلاً تخم بونے اور فصل کاٹنے کے زمانے میں خاص طور پر قوی ہوجاتی ہے۔ لیکن یہ فراموش کردیا جاتا ہے کہ سال کے باقی حصے میں وہ مجبوراً بے کاری کی حالت میں رہتی ہے۔ یوں تو یہ بات ہمیشہ سے محسوس کی جاتی رہی ہے کہ زرعی گرما گرمی کے موسم میں اضافی قلت رونما ہوتی ہے لیکن کچھ سال ادھر سے اس احساس کا اظہار زبان سے بہت زیادہ کیا جارہا ہے، شہروں کے قرب وجوار کے زرعی رقبوں کا محنت کی روز افزوں قلت کی شکایت کرنا غالباً اسی وجہ سے حق بجانب ہے کہ شہروں میں دیہات سے جو محنت کھنچ کر جاتی ہے اس کے ایک جزو سے یہ رقبے ہمیشہ کے لیے محروم ہوجاتے ہیں یا یہ کہ یہ سب کی سب اس زمانے میں دستیاب نہیں ہوتی جب کہ زرعی کاروبار کے لیے اس کی ضرورت اور مانگ ہوتی ہے۔ تاہم یہ بات ان دیہاتی رقبوں پر صادق نہیں آتی جو شہروں سے دور واقع ہیں۔ زرعی محنت کی عام قلت کے خیال کو اس عام طور پر مسلمہ نظریے کے مطابق و ہم آہنگ بنانا مشکل ہے کہ زمین پر دباؤ بڑھ رہا ہے اور یہ کہ جتنے اشخاص کو وہ بآسایش پرورش کرسکتی ہے اس سے زیادہ تعداد اس پر

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ۔ دیکھو پی۔ ایس لوکاس کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۱۵۔

ب ۲۲

سکونت پذیر ہے[1]۔ چنانچہ زرعی کمیشن نے غور و خوض کے بعد اپنی یہ رائے ظاہر کی ہے کہ "غالباً بجز آسام کے کسی صوبے میں بھی محنت کی کسی بڑی اور عام قلت کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی"[2] صنعتوں میں محنت کی قلت کی حد تک بھی بیان میں اصلیت اس قدر نہیں ہے جس قدر کہ اس کو ظاہر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ نہیں ہے کہ محنت دستیاب نہیں ہوتی بلکہ یہ کہ شہروں میں رہنے سہنے کی مشکلات اس قدر زیادہ ہیں اور اس کے ساتھ ہی صحت و صفائی کے عام حالات اس قدر غیر اطمینان بخش ہیں کہ وہ موثر موانع بن جاتے ہیں اور محنت کی امکانی رسد کے بڑے حصے کے حاصل کرنے کی راہ میں حائل ہوتے ہیں علاوہ ازیں لوگوں کی جہالت اور قدامت پرستی کو دور کرنے کا کوئی مناسب انتظام نہیں ہے، چنانچہ ان میں سے اکثر زمین ہی سے وابستہ رہ کر اپنا پیٹ پالتے اور مصیبت کی زندگی بسر کرتے ہیں، حالانکہ ان کے لیے شہروں میں مستقل طور پر کام حاصل کر کے اپنی حالت کی اصلاح کرنے کے معقول مواقع موجود ہیں علاوہ ازیں محنت کی طلب بڑی حد تک بامہارت محنت کے لیے ہے۔ لہٰذا علاج بظاہر اس بات میں ایک حد تک مضمر معلوم ہوتا ہے کہ جدید صنعتوں کے لیے مزدور کو تربیت دینے کی غرض سے ضروری سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ سب سے آخر میں یہ کہ، طلب کے معنی ہمیشہ کسی قیمت پر شئے کو طلب کرنے کے ہیں اور یہ

[1] "اصلی وقت یہ ہے کہ زمین کے کسی مقررہ رقبے پر نفع بخش طریقوں سے کاشت کرنے کی صورت میں جتنے آدمی کام کر سکتے ہیں ان کی تعداد محدود ہو گی۔ گو یہ ممکن ہے کہ غذائی پیداوار اس تعداد سے بہت زیادہ کے لیے کافی ہو، لیکن آبادی میں بہت بڑی زیادتی ہو تو اس کی وجہ سے یا تو لازمی طور پر فردہ رقبوں کی انتہائی ذیلی تقسیم رونما ہو گی اور اس طرح کھیتوں کے غیر نفع بخش اور غیر معاشی ہونے کی بنا پر پیداوار میں کمی ہو جائے گی یا بصورت دیگر آبادی بے کار و بے روزگار ہو جائے گی جو نہ تو زراعت میں مصروف ہو گی اور نہ پیدا کنندوں سے اپنی ضرورت کی غذا حاصل کرنے کے لیے اپنے پاس کوئی چیز رکھتی ہو گی"۔ دیکھو مردم شماری کی رپورٹ بابتہ ۱۹۳۱ء صفحہ ۳۱

[2] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ فقرہ (۵-۶)۔

ممکن ہے کہ مزدور کو اس کی شغلے یعنی محنت کے لیے جو قیمت پیش کی جاتی ہے وہ کافی کشش نہ رکھتی ہو۔ حال حال تک یہ صورت تھی کہ اجرت میں تناسب اضافہ ہوئے بغیر اشیا کی قیمتوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔ یوں تو یہ میلان عام طور پر پایا جاتا ہے کہ اجرت دوڑ میں قیمت کا ساتھ نہیں دیتی، لیکن ہندوستان میں رسم و رواج اس میلان کو مزید تقویت پہنچاتا ہے، چنانچہ اب بھی رسم و رواج کی قوت کو خاص کر دیہات میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دیہات میں رواجی اجرت، قیمتوں کے تغیرات کا ساتھ بہت رک رک کر دیتی ہے؛ اور شہروں میں بھی اعلیٰ مصارف زندگی اور بیش خرچ بود و باش کا لحاظ کرتے ہوئے اجرت کی سطح کافی بلند نہیں ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زراعت و صنعت دونوں میں محنت کی رسد و طلب کے باہمی تعلق میں بڑی حد تک بدنظمی پائی جاتی ہے، لیکن یہ بات بہت زیادہ مشتبہ ہے کہ آیا اس کا علاج آبادی کا سریع اضافہ ہے یا نہیں۔ ممکن ہے کہ مزدوروں کی تعداد کی زیادتی ہی ان کو اس بات پر مجبور کر دے کہ وہ اجرت کے ایسے شرائط کے تحت کام قبول کرلیں جو ان کو ناگوار ہیں اور جن کو وہ بحیثیت مجموعی سر دست مسترد کرنے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ یہ صورت حال آجر کے لیے مفید ہو سکتی ہے، لیکن مزدور کا اس میں سراسر نقصان ہے۔ ممکن ہے کہ لوگوں کے کسی محدود و مخصوص طبقے کو فائدہ پہنچے، لیکن قوم بحیثیت مجموعی گھاٹے میں رہے گی۔

۲۸۔ زرعی ترقی

گو زراعت بہت بڑے امکانات رکھتی ہے، لیکن یہ غیر محدود نہیں ہیں، اور نہ ان سے کامل استفادہ کرنا آسان ہے[1]۔ غیر ترقی یافتہ خطے اب بھی موجود ہیں جو ہل چلائے جانے کے

[1] "ہندوستان بہت بڑی حد تک ایک زرعی ملک ہے جس میں آبادی کی گنجانی کا اوسط ۱۹۵ اشخاص فی مربع میل ہے۔ براعظم یورپ میں جو صنعتی حیثیت سے بہت ترقی یافتہ ہے آبادی کی گنجانی کا اوسط ۱۲۷ نفوس فی مربع میل ہے اور ریاستہائے متحدہ امریکا میں صرف ۴۱ ہے۔ اس لحاظ سے ہندوستان بحساب فی مربع میل زیادہ بڑی آبادی کا کفیل ہے۔" دیکھو پی۔ کے۔ وٹل کی کتاب محولۂ بالا صفحہ ۱۰۔

منظر ہیں۔ لیکن زرخیز زمینیں بہت بڑی حد تک قبضے میں آچکی ہیں اور جو زمینیں اب تک قبضے میں نہیں آئی ہیں وہ مقابلتہً کم زرخیز ہیں۔ بہرصورت ان پر عملی طور پر سرمایہ لگانے کی ضرورت ہے جو اوسط درجے کے کسان کی دسترس سے باہر ہے۔ کاشت عمیق کے امکانات کو تقسیم و انتشار اراضی، ہندوستانی کسان کی قرضداری اور سرمائے کے ذرائع کا فقدان جیسی رکاوٹیں گھٹا دیتی ہیں۔ لیکن ان سب خرابیوں کو فوراً دور نہیں کیا جا سکتا۔ علاوہ ازیں زراعت میں جدید ترین طریقوں کو صرف رفتہ رفتہ ہی استعمال کیا جا سکتا ہے! لیکن جدید طریقوں کو استعمال کرنے کے بعد بھی یہی توقع رکھنی چاہئے کہ قانون تقلیل حاصل کا جلدی یا دیر سے عملدرآمد ہوگا، اس لیے کہ اس وقت تک ہمارا تجربہ پورے وثوق کے ساتھ یہ توقع کرنے کی اجازت نہیں دیتا کہ طریق کاشت میں عہد آفرین اصلاح و ترقی یکے بعد دیگرے مسلسل رونما ہوگی اور وہ تقلیل حاصل کے رجحان کو ایک غیر معین مدت تک روک رکھے گی[1]۔ زراعت کی ترقی آب پاشی سے وابستہ ہے اور چونکہ ملک کے بڑے بڑے خطے آب پاشی کے لیے ناقابل حل مشکلات پیش کرتے ہیں، اسی لیے ان خطوں کو کم یا زیادہ بارش پر قناعت کے ساتھ انحصار کرنا پڑتا ہے اور یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ مستقبل قریب میں ان کی زرعی حالت میں کوئی نمایاں اصلاح و ترقی ہوگی۔

[1] گو سابق میں قانون تقلیل حاصل کے عملدرآمد کے متعلق عام اتفاق تھا؛ لیکن بعد میں چل کر بعض معاشیین نے یہ پختہ خیال قائم کرلیا کہ اگر سائنس موجودہ زمانے میں تقلیل حاصل کی دقتوں کو حل نہیں کرے تو مستقبل قریب میں ایسا کرنے کے قابل ہو جائے گی، یا دوسرے الفاظ میں کیمیا دان کوئی ایسا سلسل ایجاد کرے گا جس کے ذریعے سے زمین مجبور ہو جائے گی کہ قلیل سرمایہ لگانے پر یکساں حاصل پیدا کرے۔ اگر ایسا کوئی عمل کبھی کامیاب ثابت ہو تو اس صورت میں بیشک قانون تقلیل حاصل کو نظرانداز کیا جا سکتا ہے۔ لیکن گزشتہ ساٹھ سال میں اکتشافات کی کثرت کے باوجود اس کی کوئی علامت نہیں پائی گئی کہ کاشت کے طریقوں میں کوئی انقلاب رونما ہوا۔" دیکھو جے، ایے، ڈین کی کتاب موسوم بہ "اصول معاشیات زرعی" صفحہ ۱۷۷، جس کا حوالہ ہیملٹن نے دیا ہے۔

باب

۲۹۔ دولت کی بہتر تقسیم

اس میں شک نہیں کہ دولت کی زیادہ معقول طریق پر تقسیم ایک حد تک سودمند ہوگی لیکن دولت کی زیادہ معقول تقسیم اس کے ذرایع کو زائل کئے بغیر کس طرح عمل میں لائی جائے[1] یہ ان مشکل ترین مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے جو جدید تہذیب یافتہ قوموں کے لیے حل طلب ہے، اور ابھی تک اس کے اطمینان بخش طریقے پر حل ہونے کی توقع نہیں دکھائی دیتی۔ علاوہ ازیں ہندوستان میں سب سے بڑی کمی جو محسوس کی جا رہی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ دولت کی زیادہ مساوی تقسیم کی ضرورت ہے، اس لیے کہ یہاں انتہائی طور پر بڑی آمدنیاں بہت کم لوگوں کو مل رہی ہیں؛ بلکہ اس وقت اس سے زیادہ اشد ضروری یہ ہے کہ دولت کی مجموعی مقدار میں اور فی کس پیدائش دولت میں اضافہ ہو۔

۳۰۔ آبادی کو ایک صوبے سے دوسرے میں منتقل کرکے بار کس حد تک ہلکا کیا جاسکتا ہے

جہاں تک مختلف صوبوں میں آبادی کی زیادہ مساویانہ تقسیم کے امکانات کا تعلق ہے وہاں تک، اس امر سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ موجودہ زمانے کے کم آبادی رکھنے والے خطوں کے متعلق مبالغہ آمیز اندازے قایم کئے جاتے ہیں کہ ان میں زیادہ آبادی کی کھپت ہوسکتی ہے، آبادی کو گنجان آباد علاقوں سے کم آباد علاقوں میں منتقل کرنے کی دقت اتنی زیادہ ہے کہ اس کو معمولی سمجھ کر آسانی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ زبان، خیالات، طرز بودوباش اور آب و ہوا، مختلف صوبوں میں اس قدر مختلف ہے کہ کسی بڑی تعداد میں آبادی کی نقل کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ وطن، گھر بار اور ماحول کی فطری محبت کے علاوہ جہالت، قدامت پرستی اور پست ہمتی بھی باہر نکلنے سے باز رکھتی ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ برما اور آسام میں توسیع کی ابھی خاصی گنجایش ہے تو بھی یہ صوبے زاید آبادی کے صرف ایک قلیل جزو کو جذب کرسکتے ہیں۔ زاید آبادی زیادہ تر اس خطۂ زمین میں

79

---

[1] دیکھو آیندہ صفحات میں فصل (۴۷) ترطن خارجی کے بارے میں۔

باب ۳

پائی جاتی ہے جو احاطۂ مدراس سے شروع ہو کر مشرق اور شمال میں بنگال، بہار اور صوبۂ متحدہ تک پھیلا ہوا ہے اور جس کے بار کو ہلکا کرنے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے[1]۔

۳۱۔ توطن خارجی کے ذریعے سے کس حد تک بار ہلکا کیا جا سکتا ہے یہ توقع کرنا کہ غیر ممالک میں آبادی کو منتقل کرکے آبادی کے دباؤ کو بڑی حد تک کم کیا جا سکتا ہے، گویا ہندوستانیوں کے توطن خارجی کے مسئلے کی بابتہ برطانوی نوآبادیات کی پالسی اور قومی خود کفالت جیسے زمانۂ حال کے میلانات و تحریکات کی نسبت ناقابل معافی ناواقفیت کا اظہار کرنا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہندوستانی مزدوروں نے نوآبادیات میں نئی قدر و قیمت پیدا کر دی ہے اور سلطنت برطانیہ کے سب علاقوں کو ایک نفع بخش اثاثہ بنا دیا ہے، لیکن اس کے باوجود آج کل ہندوستانیوں کا نوآبادیات میں آنا بری نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ نوآبادیات کی یہ حالت و روش اور ہندوستان کی سیاسی بے بسی، صاف طور پر ظاہر کرتی ہے کہ ہندوستانیوں کو اپنی معاشی نجات کا سامان خود اپنے ہی ملک کے اندر کرنا چاہئیے۔

۳۲۔ آبادی اور غذا کی رسد ہندوستان کی مفرط آبادی کے مسئلے کے متعلق جملہ سوالات میں ملک میں غذا کی رسد کا سوال عام طور پر بہت نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ اگر دنیا کو بحیثیت مجموعی لیا جائے تو غذا اور آبادی میں توازن ہونا ضروری ہے، لیکن کسی خاص ملک کے لیے ایسا توازن ضروری نہیں ہے۔ مثلاً انگلستان کو جتنی غذا کی ضرورت ہے وہ خود تیار نہیں کرتا بلکہ اس کو زیادہ مفید خیال کرتا ہے کہ دوسرے ممالک سے غذا طلب کرے اور اس کے معاوضے و مبادلے میں اپنی اعلیٰ درجے کی ماہر آبادی کے تیار کردہ مصنوعات انھیں بھیجے۔ لیکن ہندوستان، اشیائے خوردنی کی رسد کے لیے غیر ممالک کا محتاج نہیں ہے، اور ملک میں جو اشیائے خوردنی

[1] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ، پیراگراف (۵۰۶)

باب ۲

پیدا ہوتی ہیں ان کی مقدار کا تغیر بدیہی طور سے اس امر پر اثر انداز ہوتا ہے کہ ذرایع معاش پر آبادی کا کس حد تک دباؤ پڑ رہا ہے۔ اگر ہم یہ ثابت کر سکیں کہ غذا کی رسد کم از کم اضافۂ آبادی کی نسبت سے بڑھ رہی ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ آبادی کی کثرت کم از کم انتہائی صورت میں نہیں ہے۔ لیکن اس بارے میں اعدادی شہادت متناقض نوعیت رکھتی ہے۔ چنانچہ کے، ال، دت نے اپنی "رپورٹ تحقیقات قیمت"[1] میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ۱۸۹۴ء تا ۱۹۱۲ء میں زیر کاشت رقبہ اور خاص کر وہ خطہ جس پر اشیائے خوردنی کاشت ہوتی تھیں آبادی کے مقابلے میں پیچھے رہا۔ حکومت ہند نے اس نتیجے کو اس بنا پر تسلیم نہیں کیا کہ دت کا پیش کیا ہوا مواد زیادہ تر قیاسی اور غیر یقینی تھا۔ حکومت کا یہ استدلال تھا کہ آب پاشی کی توسیع کی بدولت زیر کاشت رقبہ اور خوردنی اشیا کی رسد دونوں آبادی کے قدم بہ قدم گامزن تھے۔ ڈوبے ۱۹۲۰ء میں استدلال کرتے ہوئے بعض اعداد پیش کرتا ہے جس سے اس کا مطلب یہ بات ثابت کرنا ہے کہ مجموعی حیثیت سے ۹ تا ۱۰ ملین ٹن غذا کا گھاٹا ہے، یا اگر برآمد کی سالانہ مقدار کو شامل کر لیا جائے تو یہ گھاٹا تقریباً ۵ ملین ٹن رہ جاتا ہے۔ اس سے گو رسد کی موجودہ قلت اور اس لحاظ سے کثرت آبادی کا حال تو معلوم ہوتا ہے لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ سابقہ سالوں کے مقابلے میں صورت حال بہتر ہے یا بدتر۔ دوسری طرف، یہ شکایت کہ زمین پر دباؤ بڑھ رہا ہے جس کو اکثر لوگ حق بجانب سمجھتے ہیں یہ معنی پیدا کرتی ہے کہ زرعی زمین کی پیداوار، اضافۂ آبادی کے تناسب سے کم بڑھ رہی ہے۔

ڈاکٹر پی، جے، تامس[2] اس مسئلے پر "آبادی اور پیدائش دولت" کے باہمی تعلق کے نقطۂ نظر سے بحث کرتے ہیں۔ وہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ ۱۹۲۰-۲۱ء تا ۱۹۲۱-۲۲ء اور ۱۹۳۰-۳۱ء تا ۱۹۳۱-۳۲ء کی دو سالہ میعادوں میں جہاں آبادی ۱۰ء۴

80

[1] Prices Inquiry Report -

[2] - دیکھو انڈین جرنل آف اکنامکس "کانفرنس نمبر" (اپریل ۱۹۳۵ء) صفحہ ۴۷، تا ۴۷ -

باب ۲

فی صد بڑھی، وہیں زرعی پیداوار میں قریب قریب ۱۶ فی صد اور صنعتی پیداوار میں ۵۱ فی صد اضافہ ہوا۔ اس سے زیادہ طویل مدت یعنی ۱۹۰۱ء تا ۱۹۳۰ء کی تیس سال کی مدت کو لیتے ہوئے بھی وہ قریب قریب اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ چنانچہ اس تیس سالہ مدت میں آبادی میں ۱۹ فی صد اضافہ ہوا، لیکن اگر ابتدائی پانچ سالوں (۱۹۰۱ء تا ۱۹۰۵ء) کا مقابلہ آخری پانچ سالوں (۱۹۲۵ء تا ۱۹۳۰ء) سے کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آبادی میں تو ۵ء۱۳ فی صد اضافہ ہوا، اور زرعی پیداوار ۲۹ فی صد بڑھی، اور صنعتی پیداوار کا اضافہ اس سے بہت زیادہ سریع یعنی ۱۰۹ فی صد تھا۔ غرض یہ کہ خواہ کوئی مدت بھی لی جائے، اس کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی کہ آبادی، پیداوار پر سبقت لے گئی۔ ڈاکٹر موصوف کا دعویٰ ہے کہ ان کی اعدادی تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پیداوار، آبادی کے قدم بقدم چل رہی ہے، اور بعض شعبوں مثلاً گرنی کی صنعت اور تجارتی کاشت وغیرہ میں تو پیداوار، آبادی سے بہت زیادہ رفتار کے ساتھ بڑھی۔ یہ سب ترقی، عالمی کساد بازاری کے زمانے میں بھی برقرار رہی؛ اور یہ ایک نہایت ہی اہم واقعہ ہے۔ اگر عوام کی حالت سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی تو اس کا باعث لازمی طور پر یہ ہوگا کہ تقسیم دولت میں کچھ نہ کچھ عدم مساوات ہے۔

اس خصوص میں کسی قطعی نتیجے پر پہنچنے میں سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ ہندوستان میں پیداوار کی بابت صحیح، اور بھروسے کے قابل اعداد دستیاب نہیں ہوتے[۱]۔ یہ بات خاص طور پر فصلوں کی پیداوار کے سرکاری تخمینوں پر صادق آتی ہے جو فصلوں کے پیش اندازوں پر مبنی ہیں۔ چنانچہ زرعی پیداوار کا اندازہ یا تو حقیقی مقدار سے زیادہ یا کم کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر تامس کے خیال میں اندازہ حقیقی مقدار سے زیادہ کیا گیا ہے۔ بہر حال یہ معلوم ہوگا کہ ڈاکٹر تامس نے غذا کی رسد کا کوئی علحدہ اندازہ نہیں قایم کیا ہے کہ آبادی کی زیادتی کی نسبت سے

81

[۱] ۔ دیکھو باب ۴، جلد دوم۔

کتنی غذا تیار ہوتی ہے۔ وہ اس بات کو بیشک مانتے ہیں کہ چاول کی کاشت کی توسیع کی محدود گنجایش کا لحاظ کرتے ہوئے اس کا امکان ہے کہ ہندوستان کو آیندہ درآمدہ چاول پر روزافزوں انحصار کرنا پڑے گا' لیکن وہ یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ صنعتی پیداوار کی تدریجی ترقی سے اس کمی کی بہت بڑی حد تک تلافی ہو جائے گی۔ بہرحال ہمیں یہ مان لینا چاہئے کہ چونکہ ڈاکٹر تامس کے اعداد کے مطابق' زرعی پیداوار آبادی کے تناسب سے زیادہ بڑھ رہی ہے' اور چونکہ غذائی اشیا' ہندوستان کی کل زرعی پیداوار کے بڑے حصے پر مشتمل ہیں' لہذا غذائی اشیا کی رسد میں بحیثیت مجموعی آبادی سے زیادہ تیزی کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہندوستان میں مفرط آبادی اپنی سب سے بھدی اور بدیہی شکل میں نہیں ہے۔ لیکن جیسا کہ ڈاکٹر صاحب خود تسلیم کرتے ہیں' یہ استدلال کہ ہندوستان کی آبادی متوازن حد سے زیادہ ہے' ڈاکٹر تامس کے اعداد سے غلط ثابت نہیں ہوتا؛ بلکہ جو خیال ہمارے کل استدلال کے دوران میں ذہن نشیں ہوا وہ پھر بھی قایم رہتا ہے یعنی یہ کہ اگر اضافۂ آبادی کی رفتار زیادہ دھیمی ہوتی تو لوگوں کی خوش حالی زیادہ نمایاں اور کثیر مشتبہ ہوتی۔

۳۲۔ دولت کی زیادتی ایک بالواسطہ مگر طاقت بخش مداوا ہے۔

مفرط آبادی کو میلان اور واقعے کے طور پر مان لینے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ معاشی اصلاح و ترقی کی ساری کوششیں بے سود ہیں۔ اس قسم کا نتیجہ اخذ کرنا انتہائی طور پر غیر صحیح اور مضر ہے ممکن ہے کہ دولت کی زیادتی جس کے متعلق یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ زرعی و صنعتی ترقی کے لیے زیادہ گرم جوشانہ پالسی اختیار کرنے سے رونما ہوگی اپنے آپ کو اضافۂ آبادی کی شکل میں ظاہر کرے؛ اور اسی کا نتیجہ کسی حد تک یہ بھی ہو سکتا ہے کہ معیار زندگی بلند ہو جائے۔ ایک مرتبہ معیار زندگی بلند ہو جانے کے بعد اس کو آبادی کی ارادی تحدید کے ذریعے برقرار رکھنے کا ارادہ اور صلاحیت بھی عام طور پر بڑھ جاتی ہے۔[1] چنانچہ

[1] شرح ولادت کی ارادی روک سے قطع نظر کرتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر وہ چیز جو شرح اموات کو

مغربی ممالک میں ترقی کی رفتار ایسی ہی رہی ہے، اور ہم معقولیت کے ساتھ یہ توقع کرسکتے ہیں کہ اس کے مماثل اسباب ہندوستان میں بھی اسی کے مماثل نتائج پیدا کریں گے۔ جس وقت لوگوں کی معاشی حالت میں قابل لحاظ ترقی ہوگی اس وقت ان کو یہ محسوس ہوگا کہ تعداد نفوس کو بقول مل "عاقلانہ پیش بینی کی ارادی رہنمائی" کے تحت لانا ضروری ہے اور یہ احساس پیدا کرنے والی شے معاشی ترقی سے زیادہ اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ اس لحاظ سے مسئلہ کثرت آبادی کا سب سے زیادہ امید افزا حل یہ ہوگا کہ عوام اور حکومت، ملک میں ہر ممکنہ سمت میں معاشی ترقی کی رفتار کو تیز کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں۔ اگر یہ صحیح ہے کہ کثرت آبادی، افلاس کے اسباب میں سے ایک سبب ہے تو، یہ بھی مساوی طور پر صحیح ہے کہ افلاس، بے احتیاطی اور بے پروائی کی ترغیب دے کر کثرت آبادی کی خرابی میں شدت پیدا کردیتا ہے۔ لہذا اگر یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ سابق میں حکومت کی پالیسی اپنے ایجابی اور سلبی پہلوؤں میں معاشی ترقی میں مزاحم رہی ہے تو حکومت، عوام کے افلاس کے الزام سے محض اس واقعے کی طرف اشارہ کرکے بری الذمہ نہیں ہوسکتی کہ یہاں کے لوگ آبادی کی زیادتی پر ارادی طور پر روک قائم کرنے کی اہمیت کو نہیں سمجھتے۔ لیکن حکومت اپنی کامل مدافعت صرف یہ ثابت کرکے کرسکتی ہے کہ اس کا مقصد واحد ہمیشہ سے ملک کے اغراض کی حفاظت و فلاح رہا ہے اور عوام کے افلاس کو دور کرنے میں اس نے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:۔ کم کرتی ہے کسی نہ کسی ناقابل توجیہ طریقے سے شرح ولادت کی کمی بھی پیدا کرتی ہے۔ دولت کی زیادتی اور دماغی دلچسپیوں کی کثرت کے ساتھ ساتھ "بارآوری" میں بھی کمی ہوجاتی ہے۔ صحت عامہ کے متعلق ترقی یافتہ تدابیر اختیار کرنا، معیار زندگی کی اصلاح و ترقی کرنا، تعلیم کی توسیع کرنا، آزادئ نسواں کو ترقی دینا اور عورتوں کو بیاہ اور خانہ داری کے فرائض کے علاوہ خدمت اور جد و جہد کے دوسرے میدانوں میں داخل کرنا، اصلاح کی یہ سب مدیں مناسب اور پسندیدہ ہیں، نہ صرف بجائے خود بلکہ اس لیے بھی کہ یہ آبادی کے ناواجب طور پر عاجلانہ اضافے کو روکنے کے مسئلے سے تعلق رکھتی ہیں۔ دیکھو مردم شماری کی رپورٹ (سال ۱۹۳۱ء) صفحہ ۴۳۔

باب

اپنی جانب سے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا، نیز یہ کہ اس کی پالسی شروع سے آخر تک نہ صرف دیانتدارانہ اور پُرجوش بلکہ درست اور اچھی طرح سوچ سمجھ کر اختیار کی ہوئی ہے۔

۴۳۔ ارادی روک کی اہمیت

اس کے ساتھ ہی اگر لوگوں میں یہ احساس پیدا کرنے کی کوشش کی جائے کہ خوش حالی کا معیار بلند رکھنے کے لیے آبادی کے ناواجب اضافے کو روکنا اور قابل فراہمی ذرایع اور آبادی کے درمیان مناسب تعلق کو برقرار رکھنا کتنا ضروری ہے تو اس سے ایک مفید اور نہایت پسندیدہ تبدیلی پیدا ہوگی۔ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ملک ایسے عظیم الشان ذرایع کا مالک ہے جن کا ابھی تک استحصال نہیں ہوا ہے اور یہ کہتے ہیں کہ ان ذرایع کی موجودگی، آبادی کی زیادتی پر کوئی عاقلانہ اور دور اندیشانہ روک قایم نہ کرنے کو پوری طرح حق بجانب قرار دیتی ہے، وہ امکان کو حقیقت سے خلط ملط کرتے ہیں۔ فی الجملہ اس عام کہاوت میں کہ ''آدمی کو چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہئے'' صداقت موجود ہے۔ اس امر کا تعین کرنے کی غرض سے کہ کسی مقررہ وقت میں آبادی کی مناسب تعداد کیا ہونی چاہئے ''موجود'' یا ''پیش نظر'' ذرایع کو معیار قرار دینا چاہئے نہ کہ ان ذرایع میں عظیم الشان اضافہ کرنے کے بعید امکانات کو۔ اس میں شک نہیں کہ اگر سائنس دانوں کے خواب روزمرہ کے حقائق بن جائیں اور آفتاب اور موجوں کے مد و جزر کی غیر محدود قوت پر انسان کو پوری طرح قابو حاصل ہو جائے تو کرۂ ارض موجودہ حالت کے مقابلے میں بہت زیادہ کثیر آبادی کی کفیل ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ ایسی صورت میں ہمارے اخلاف مسئلۂ آبادی کے بارے میں ہمارے اضطراب و ہراس کا مضحکہ اڑائیں۔ بہرحال اس طرح عمل کرنا کہ گویا یہ خواب ایک تکمیل یافتہ واقعہ ہے، بے وقوفی ہے۔ تنگی کی یہ روش کہ وہ آیندہ ترقی کے امکان ہی کو نہیں مانتا یقیناً لایق مذمت ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ہمیں حد سے زیادہ خود اعتمادی سے کام لینے والے اس اصول پرست کی غلطی سے بھی بچنا چاہئے جو یہ فراموش کر دیتا ہے کہ ترقی کی راہ میں مشکلات حائل ہیں۔ علاوہ ازیں یہ ذہن نشین

88

باب ۲

رکھنا چاہئیے کہ سب سے زیادہ سریع ترقی بھی جو ہم تصور کر سکتے ہیں، زاید آبادی کے صرف ایک قلیل جزو کو جو حسابی طور پر ممکن ہے جذب کر سکتی ہے۔ اگر انسان کی تولیدی قوت کو کارفرمائی کا پورا موقع دیا جائے تو اس کا ناگزیر نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام مذموم قوتیں مثلاً جنگ، دبائیں، قحط وغیرہ جو "ایجابی موانعات" کی تعریف میں داخل ہیں، میدان میں آجائیں گی۔ معاشی ترقی کو کثرت آبادی کی خرابیوں کے حق میں ایک عارضی تسکین خیال کرنا چاہئیے نہ کہ مستقل علاج، اور معاشی ترقی یہ چاہتی ہے کہ اس کو اپنی تمام حالتوں میں "عاقلانہ روک کے عملدرآمد سے، جو حیوان ناطق یعنے تعقل رکھنے والے انسان کو معمولی جانوروں مثلاً خرگوش سے ممیز کرتی ہے، کم و بیش تقویت پہنچتی رہے۔"

۳۵۔ تحدید خاندان: اس کا مالہ و ماعلیہ

اکثر لوگ اس امر کو بے چون و چرا تسلیم کر لیتے ہیں کہ ہر فرد کو اپنے ذرایع کے لحاظ سے اپنے خاندان کی تحدید کرنی چاہئیے، تاکہ اس کے بچوں کو زندگی سے اسی قدر لطف اٹھانے کا موقع ملے جتنا کہ خود اس کو ملا تھا۔ جس طرح عمدہ پودے اگانے کے لیے ان کے تخموں کو بڑی مقدار میں ایک دوسرے کے قریب نہ بونا چاہئیے اسی طرح ایک خاندان میں بچوں کی تعداد بھی بہت زیادہ نہ ہونی چاہئیے، تاکہ ان میں سے ہر ایک اپنی نشو و نما کے معقول مواقع سے متمتع ہونے کے قابل ہو۔ کثرت ولادت سے عام طور پر ضعف قوت لازم آجاتی ہے، اور اسی سبب سے بچوں میں اموات کی شرح زیادہ ہوتی ہے نامناسب نگرانی اور غذا نہ ملنے کی وجہ سے جو بچے آخر کار مرجاتے ہیں ان کی پرورش کی محنت گویا بالکل ضایع جاتی ہے؛ اور ان بچوں کی چند روزہ حیات نہ صرف والدین کو بلکہ دوسرے بچوں کو بھی جو کسی نہ کسی طرح زندہ بچ رہتے ہیں بے فائدہ رنج و تکلیف میں مبتلا کر دیتی ہے۔ انفرادی نقطۂ نظر سے تو یہی زیادہ مناسب ہے کہ انسان اولاد پیدا کرنے سے خود کو اس وقت تک روکے جب تک کہ ان کی پرورش کے انتظام کا اس کو معقول یقین نہ ہو۔ فرد واحد کے لیے جو چیز مفید ہوگی وہی بحیثیت مجموعی معاشرے کے لیے بھی مفید ہوگی۔ اس لیے

۱ ب

کہ اگر افراد کی بہت بڑی تعداد کسی قسم کی دوراندیشی کے بغیر بے روک تولید جاری رکھے تو زندگی کا عام معیار لازمی طور پر گھٹ جائے گا۔[1]

لیکن بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اس قسم کی روک کے نقائص کا پلہ فوائد سے بھاری ہے۔ چنانچہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اگر بچے یکے بعد دیگرے جلد جلد پیدا ہوں تو وہ ایسے بچوں کے مقابلے میں جو زیادہ فصل سے ساتھ پیدا ہوتے ہیں، کردار و خصائل کو درست کرنے کا زیادہ بہتر موقع پاتے ہیں، برخلاف اس کے زیادہ فصل سے پیدا ہونے والے بچوں کو اس کا موقع نہیں ملتا، اور وہ باہمی دباؤ، اصلاح اور صحبت کے فوائد سے محروم رہتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بڑے خاندان خود والدین پر اس لحاظ سے بیش قیمت تعلیمی اثر ڈالتے ہیں کہ وہ صبر، حلم اور نفس کشی کی تعلیم و تربیت میں مدد دیتے ہیں، اور شریفانہ خصائل و عادات پیدا کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ خیال بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ بچے کی نگہداشت کم از کم اس کی زندگی کے چند ابتدائی سالوں میں زیادہ بیش خرچ نہیں ہوتی، لیکن محدود خاندان کے حامی اس واقعے کو ہمیشہ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان سب استدلالوں کی تہ میں کچھ نہ کچھ صداقت مضمر ہے۔ لیکن یہ واقعہ اپنی جگہ قائم رہتا ہے کہ اکثر خاندانوں کے مصائب و تکالیف کا باعث براہ راست ''بچوں کا تباہ کن سیلاب'' ہے۔ ممکن ہے کہ دوراندیشی اور احتیاط دراصل حد سے بہت زیادہ کام میں لائی جائے، جیسا کہ فرانس میں ہو رہا ہے لیکن اس کے مقابلے میں بے احتیاطی کی خرابی بھی مساوی شدید ہے، چنانچہ اس کے نتائج موجودہ زمانے کے ہندوستانی معاشرے میں خاص طور پر نمایاں ہیں۔

84

فرانس کا تذکرہ ہمیں ایک اور عام استدلال کی جانب لے جاتا ہے جو ضبط تولید کے خلاف پیش کیا جاتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ممکن ہے کہ آبادی کی تحدید اتنی وسیع حد تک عمل میں لائی جائے جو فوجی نقطۂ نظر سے

---

[1] دیکھو ہیرولڈ کاکس کی کتاب موسومہ بہ "مسئلہ آبادی" صفحہ ۱۱۸۔

باب ۳

خطرناک ثابت ہو[1]۔ چنانچہ اس کی مشہور قدیم مثال فرانس ہے، جہاں آبادی کے نہ بڑھنے یا کافی تیزی سے نہ بڑھنے سے حکومت خائف ہے، اور لوگوں کو کثیرالاطفال بننے کی ترغیب دینے کی کوششیں کی جارہی ہیں کہ مبادا روایتی دشمن یعنی جرمنی اپنی کثیر آبادی کی قوت سے آیندہ ناگزیر جنگ میں فرانس کا خاتمہ کردے۔ لیکن ہندوستان کی حدتک یہ بالکل واضح ہے کہ اس کو نری تعداد کے اضافے کی کوئی خاص تمنا نہیں ہے۔ فوجی کارکردگی کے لیے کثرت تعداد سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ جسمانی صحت، دماغی و عقلی مستعدی، ضبط، تنظیم، مدافعتی و جارحانہ جنگ کے لیے جدید ترین سازوسامان اور قوم کو متحد کرنے والا قوی احساس ہے۔

۴۶۔ آبادی کی تحدید کے طریقے

(۱) اخلاقی اجتناب۔ ان لوگوں میں بھی جو یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ولادتوں کی تحدید مناسب ہے اس امر پر اتفاق نہیں ہے کہ اس غرض کو پورا کرنے کے بہترین ذرایع کیا ہیں۔ بعض "اخلاقی اجتناب" پر زور دیتے ہیں کہ یہی واحد محفوظ علاج ہے۔ گو یورپ میں اوسط طبقے کے خاندان "اخلاقی اجتناب" سے دراصل جس حدتک کام لیتے ہیں اس کا

---

[1] تاہم بقول کاکس "بے روک اضافہ فی نفسہٖ جنگ کے قوی ترین اسباب میں سے ایک سبب ہے، اس لیے کہ وہ مختلف قوموں کے درمیان کشاکش حیات میں شدت پیدا کرتا ہے، گو عام طور پر اس کی تائید اس لحاظ سے بھی کی جاتی ہے کہ وہ بلا اشتعال حملہ سے محفوظ رکھنے کا ایک موثر اور کارگر طریقہ ہے۔ جوں ہی کسی ملک میں آبادی بڑھ جاتی ہے تو شاید یہ کہتے ہیں کہ "ہماری تعداد میں اتنا اضافہ ہوگیا ہے کہ ہمیں ملک کی توسیع کے لیے لڑنا چاہئے"۔ جوں ہی لڑائی واقع ہوتی ہے تو یہی تائماً اپنے استدلال کو بدل کر یہ کہتے ہیں کہ "دوسری لڑائی کی تیاری کے لیے ہمیں اپنی آبادی میں اضافہ کرنا چاہئے" آخر یہ اینچا تانی کس طرح ختم ہوگی؟ جس وقت تک دنیا کی سب قومیں متفقہ طور پر یہ تسلیم نہ کریں گی کہ کثرت آبادی جنگ کا لازمی سبب ہے اور اس لحاظ سے ہر قوم کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ اپنے ہمسایوں سے لڑنے بھڑنے سے بچنے کے لیے اپنی تعداد کو محدود رکھے، اس وقت تک یہ کشاکش ختم نہیں ہوسکتی"۔ دیکھو ہیرولڈ کاکس کی کتاب موسومہ "مسئلۂ آبادی" صفحہ ۲۰۵۔

باب۳

85

گھٹا کر اندازہ کیا جاتا ہے، پھر بھی ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیئے کہ اس کو اتنی کافی عمومیت کے ساتھ سب طبقے ہرگز کام میں نہ لائیں گے کہ وہ آبادی کی کثیر زیادتی کو روکنے کے لیے مفید ثابت ہو۔ بحیثیت مجموعی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کثرت آبادی کے علاج کے طور پر بیاہے ہوئے جوڑے کو طویل عرصے تک اجتناب کرنے کا سبق پڑھانا ایسا ہی ہے جیسا کہ بھوک کا علاج کرنے کے لیے معدہ کو الگ کرنے کی رائے دینا۔ دونوں طریقے اس کا قریب قریب مساوی موقع رکھتے ہیں کہ ان کو اختیار کیا جائے۔ چنانچہ خود مالتھس نے بھی اس کو پوری طرح محسوس کیا تھا، اور اسی وجہ سے اس کی تحریریں قنوطی رنگ کی رہیں۔ علاوہ ازیں اہل الرائے اطبا کا ایک طبقہ بظاہر اس امر کی تائید کرتا ہے کہ طویل مدت تک مسلسل نفس کشی بحیثیت مجموعی ایسا علاج ہے جو اصل مرض سے بھی بدتر ہے، اس لیے کہ اس کا مضر ردعمل شادی شدہ جوڑے کے دماغ اور جسم دونوں پر ہوتا ہے[1]۔

(ب) مانعات حمل۔ اسقاط، طفل کشی وغیرہ کے قدیم طریقوں کو قانون اور رائے عامہ دونوں بجا طور پر مذموم قرار دیتے ہیں اور کوئی ایسی بے وقوفی نہیں کرسکتا کہ ان کے خلاف عمل کرنے کا مشورہ دے۔ ان کا ترک کیا جانا اخلاقی معیار کی بلندی اور ترقی کی خوشگوار علامت ہے۔ صرف ایک طریق بدل باقی رہ جاتا ہے اور وہ مانع حمل طریقوں کا استعمال ہے؛ چنانچہ آج کل اکثر یورپی ممالک کی خصوصیت خاصہ شرح ولادت کی کمی ہے جس کا باعث یقینی طور پر ضبط تولید کے مصنوعی طریقوں کا وسیع اور بکثرت استعمال ہے۔

مغربی ممالک میں شرح ولادت کی تخفیف اور ضبط ولادت کا پروپگنڈا ان دونوں کا آغاز حیرت انگیز طریقے پر ساتھ ساتھ ہوا۔ چنانچہ انگلستان میں شرح ولادت کی تخفیف اور مقدمۂ بریڈلا کا زمانہ ایک ہی ہے جب کہ

---

[1] ”اخلاقی بندش“ کے بارے میں اہم اعتراضات کے بیان کے لیے دیکھو لیونرڈ ڈارون کی کتاب موسوم بہ ”علم اصلاح نسل کیا ہے؟“ صفحہ ۳۶۔

مسز بیسنٹ اور چارلس بریڈلا پر ۱۸۷۷ء میں اس لیے نالش کی گئی کہ انھوں نے مصنوعی طریقوں سے ضبط ولادت کی تائید میں ایک رسالہ شائع کیا تھا۔ اس مقدمے سے عوام کو غیر معمولی دلچسپی پیدا ہوگئی اور اس کی وجہ سے ضمناً ضبط ولادت کے متعلق معلومات کی اشاعت بھی ہوئی، چنانچہ بظاہر لوگوں کی بڑی تعداد نے ان سے عملی فایدہ اٹھانا شروع بھی کر دیا۔[1]

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان میں "نو مالتھسیت"[2] کے بارے میں ہماری کیا روش ہونی چاہئے؟ ہم اس عام اعتراض کو نظر انداز کر سکتے ہیں کہ یہ غیر فطری طریقہ ہے۔ کپڑوں، پکی ہوئی غذا اور دوائیوں کا استعمال، اور دوسری بے شمار چیزیں جو متمدن زندگی سے وابستہ ہیں، یہ سب بھی تو غیر فطری ہیں۔ لیکن ہمیں دوسرے زیادہ اہم اعتراضات پر غور کرنا چاہئے، جن کے منجملہ ایک یہ ہے کہ مانعات حمل کے متعلق معلومات کی اشاعت، صنفی بداخلاقی سے باز رکھنے والی طاقت ور ترین مزاحمتوں میں سے ایک کو ہٹا دے گی۔ اس کا یہ جواب کہ وہ اخلاق جس کی پابندی محض عواقب ونتائج کے خوف سے کی جائے بمشکل لائق عمل ہے، اطمینان بخش نہیں ہے، اس لیے کہ بے قاعدہ تعلقات کا انسداد، خواہ وہ کسی قسم کے محرکات کی بنا پر رونما ہوئے ہوں، معاشری حیثیت سے مناسب اور پسندیدہ ہے۔[3] یہ بات بے چون وچرا

---

[1] دیکھو پی یس فلورنس کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۳۱ تا ۳۲۔

[2] Neo-malthusianism

[3] کاکس یہ استدلال کرتا ہے کہ یہ خوف بے بنیاد ہے کہ مانع حمل ذرایع کے متعلق معلومات زناکاری یا بے قاعدہ تعلقات میں اضافہ کر دے گی۔ اس کے برخلاف بعض بے قاعدہ تعلقات کا باعث یہ امر ہوتا ہے کہ اکثر لوگ غیر ضروری بچوں کی ولادت کے خوف سے پاک ازدواجی زندگی میں داخل ہونے سے باز رہتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ بچوں کی ولادت کو روکنے کے طریقوں کی معلومات بعجلت بیاہ کرنے کی جانب مائل کرے گی اور اس حد تک بے قاعدہ تعلقات کی خرابیوں کو کم کر دیگی دیکھو کاکس کی کتاب موسوم بہ "مسئلۂ آبادی" صفحہ ۱۳۴ تا ۱۳۸۔

تسلیم کی جاسکتی ہے کہ جن لوگوں کو حرام کاری کی ترغیب ہوتی ہے ان میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں جو افشا یا ناجائز ولادت کے خوف سے ارتکاب سے باز رہتے ہیں۔ لیکن اس ملک میں اسقاط حمل کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جن کا محرک جرم کو پوشیدہ رکھنے کا خیال ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں ممکن ہے کہ مانعات حمل کی معلومات کی اشاعت لوگوں کو اسقاط کی بجائے کسی حد تک ان مانعات کو اختیار کرنے پر مایل کردے۔ خواہ ایسا ہو یا نہ ہو، بہرحال اس بحث کے سلسلے میں یہ سوال معقول و موزوں ہوگا کہ اگر معاشرہ اس اصول پر غیر متناقض طور پر عمل کرے کہ ہر اس طریقے کو ترک کردیا جائے جس کے متعلق یہ قرینہ ہو کہ عوام کا ایک طبقہ اس کو بیجا اور غلط استعمال کرے گا تو اس اصول کا تہذیب و تمدن پر کیا اثر مترتب ہوگا؟ اگر یہ تسلیم کربھی لیا جائے کہ مانعات حمل کے متعلق معلومات کی اشاعت میں خطرات مضمر ہیں، تو بھی خطرے کو کم کرنا ممکن ہے اور وہ اس طرح کہ اس قسم کی معلومات کی بلا امتیاز نشر کے خلاف حکومت تدابیر اختیار کرے اور صرف ان اشخاص کے لیے اس کی بہم رسانی کا انتظام کرے جو اخلاقی و معاشی حیثیت سے اس کی ضرورت معقول و درست وجوہ کی بنا پر محسوس کرتے ہیں[1]۔

ممکن ہے کہ ضبط ولادت کے طریقوں کی تائید میں بلا امتیاز اور عام پروپگنڈا کا نتیجہ بظاہر یہ ہو کہ صنفی بد اخلاقی میں اضافہ ہو۔ تاہم زیر بحث سوال یہ ہے کہ آیا یہ مناسب نہیں ہے کہ سب خطرات سر پر لیے جائیں اور اس قسم کے پروپگنڈے پر مناسب سرکاری نگرانی قائم کرکے ان خطرات کو کم کرنے کی کوشش

---

[1] انگلستان میں ڈاکٹر میری اسٹوپس نے لندن میں ایک سربریات گاہ یا مطب قائم کیا ہے جس میں مانعات حمل کی بابت مفت مشورہ دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی لندن کے مفلسوں کے محلوں میں چند دوسرے نظامات موجود ہیں جو اسی قسم کا کام انجام دیتے ہیں۔

دیکھو سی پی بلیکر کی کتاب موسوم بہ "ضبط تولید اور حکومت" صفحہ ۹۴۔

Birth-control and the state

کی جائے، تاکہ "مفرط آبادی" کی زیادہ شدید خرابی کا سد باب ہو جائے۔
مانعات حمل کے استعمال کے ذریعے سے ضبط ولادت کرنے کے بارے میں ایک اور اعتراض کیا جاتا ہے اور وہ اس امر پر مبنی ہے کہ اس کا قرینہ ہے کہ غریبوں کے مقابلے میں آبادی کے زیادہ خوش حال و ذہین طبقے اس کو زیادہ استعمال کریں۔ گو غریب لوگوں کو اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے لیکن وہ اپنے افلاس کے باعث نہایت بے احتیاطی اور ناعاقبت اندیشی سے کام کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں غریب طبقے میں عورتیں زیادہ ادنیٰ حیثیت رکھتی ہیں، چنانچہ انھیں عام طور پر اپنی مرضی کے خلاف حمل کی مصیبت جھیلنی پڑتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آبادی معاشری زینے کے اس سرے پر بڑھتی ہے کہ جہاں اس کی ضرورت نہیں ہے، اور اس لحاظ سے ضبط ولادت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگوں کے اوصاف میں بتدریج کمی واقع ہوگی۔ اس خیال کا مطلب لازمی طور پر یہ نہیں ہے کہ اس کا قرینہ ہے کہ امیر آدمی کے مقابلے میں غریب آدمی کے بچے خدا داد جسمانی و دماغی قابلیت کے لحاظ سے ادنیٰ اور کمتر ہوں۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ ان کی کثیر تعداد ہی اس امر کو مشکل بنا دیتی ہے کہ ان کی اس طرح پرورش کی جائے کہ ان میں بہترین اوصاف رونما ہوں۔ اگر افلاس اور اس کے نتیجے یعنی بے احتیاطی کی روش سے قطع نظر بھی کر لیا جائے تب بھی ضبط ولادت کے بارے میں جدید معلومات سے فایدہ حاصل کرنے سے ادنیٰ طبقے کے قاصر رہنے کے اسباب کے منجملہ ایک سبب یہ ہے کہ یہ معلومات اکثر و بیشتر ان کو حاصل ہی نہیں ہوتیں، اور اس کا علاج بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی دسترس ایسی معلومات پر بڑھائی جائے۔ ضبط ولادت پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ ادنیٰ طبقے ضبط ولادت کے مقابلتہً بے ضرر طریقوں پر عمل کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے اور اس لحاظ سے وہ آخری چارۂ کار کے طور پر مسلسل طور سے ضرر رساں طریقے استعمال کرتے ہیں، اور یہ کہ یہ نہایت ہی تشویشناک صورت ہے، اس لیے کہ اس طریقے سے جو خرابیاں رونما ہوتی ہیں وہ کثرت آبادی کی خرابی سے زیادہ شدید ہیں۔ چنانچہ یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ آیا کوئی اور خرابی مفرط آبادی کی خرابی سے زیادہ شدید ہو سکتی ہے۔ یہ خیال کرنا بھی مشکل ہے کہ ایک بچے کی

باب ۳

مناسب طریقے پر پرورش کرنے کے معارف، ان اخراجات سے کم ہو سکتے ہیں جو ضبط ولادت کے طریقوں کے استعمال سے لاحق ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں مغرب میں یہ شکایت عام طور پر سنی جاتی ہے کہ اعلیٰ طبقے ضبط ولادت کے طریقوں پر اس حد تک عمل کرتے ہیں جو معاشری حیثیت سے ضرر رساں ہے، اور بچوں کی معتدل تعداد کی پرورش کرنے کے بار اور اس کی مسرت پر غیر ضروری طور پر اعلیٰ بلکہ حد سے زیادہ بڑھیا معیار زندگی کو مرجح خیال کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ ہر قسم کا دباؤ ان پر ڈالا جائے اور ہر قسم کی ترغیب و تحریص دلائی جائے تاکہ وہ یہ محسوس کریں کہ اخلاقی حیثیت سے ان پر لازم ہے کہ وہ حکومت کو تا حد امکان زیادہ سے زیادہ تندرست، طاقت ور اور عمدہ تعلیم یافتہ شہری حوالے کریں۔ "ہمارا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ جہاں کہیں جملہ وجوہ کی بنا پر ضبط تولید کی ضرورت ہو وہاں اس کے لیے سہولتیں مہیا کریں اور دوسری جانب جہاں محض خود غرضانہ محرکات کی بنا پر اس کو استعمال کیا جاتا ہے وہاں اس کو بلا کم و کاست مذموم قرار دیں۔ ضبط ولادت کے موافق و مخالف دوہری مہم کی ضرورت ہے"[1] لیکن موجودہ زمانے میں ہندوستان میں آبادی کے جملہ طبقے بلالحاظ مذہب و ملت آبادی کو کم کرنے کی بجائے بڑھانے کی جانب مائل ہیں۔ لہذا آبادی کی ارادی روک کی ترغیب دینے کے لیے منظم سعی ضروری معلوم ہوتی ہے۔

۴۷۔ ضبط تولید، ہندوستان کے لیے ایک اہم مسئلہ ہے۔

مسئلۂ ضبط تولید سنجیدہ غور و توجہ کا مستحق ہے لیکن ہندوستان میں اس پر بہت کم غور کیا گیا ہے اور ایک مدت دراز سے اس پر سطحی اعتراضات کی بوچھاڑ ہوتی رہی ہے۔ ہم نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ یہ مسئلہ کم از کم "غور و تامل کے لائق" ہے؛ اور ملک کی معاشی ترقی کے "غیر محدود امکانات" کے متعلق مبہم تعمیمات سے کام لے کر اور مسئلۂ آبادی کے اہم عناصر ہی کو سمجھنے سے مستقلاً انکار کر کے ضبط ولادت کے مسئلے کو سرسری طور پر خارج نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] دیکھو لیونرڈ ڈارون کی محولۂ بالا کتاب، صفحہ ۲۰۔

باب ۳
88

لوگوں کے انتہائی افلاس اور اس کے نتیجے کے طور پر دور اندیشانہ محرک کی کمزوری کے باعث ضبط ولادت کے طریقے بلاشبہ بہت مدت میں جاکر رواج پائیں گے۔ علاوہ ازیں تعصب وجہالت کے دیو سے بھی جنگ کرنے کی ضرورت ہے۔ تاہم یہ خیال بتدریج ترقی کر رہا ہے کہ معاملات کو ان کے حال پر چھوڑ دینے کی پالسی ناکام ثابت ہوگی[1]

۴۳۔ نقل وطن: (ا) ملک کے اندر آبادی کی نقل و حرکت[2] آدم اسمتھ کا مقولہ کہ "جملہ سامانوں میں انسان ہی ایک ایسا سامان ہے جس کی نقل وحمل سب سے زیادہ دشوار ہے" ہندوستان پر خاص طور پر صادق آتا ہے۔ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق مقام پیدایش اور سکونت کے لحاظ سے مجموعی آبادی کا اندازہ قریب قریب ½۔ ۳۵ ملین کیا گیا تھا اس کے منجملہ ایک ملین سے بھی کم آبادی ایسی تھی جو مقیم ایک جگہ تھی اور پیدا دوسری جگہ ہوئی تھی۔ ہندوستانی گھربار سے انتہائی محبت کرتے ہیں۔ ان کی

---

[1] "آبادی ضبط ولادت کے طریقوں کی تائید صرف متعدد وطنی مصنف ہی نہیں کرتے بلکہ اہل ہند اب یہ فخر کرسکتے ہیں کہ ان کے ہاں "نو ما لتھسی لیگ" موجود ہے جس کے سرگرم مویدین دو مہاراجہ عدالت العالیہ کے تین جج اور چار یا پانچ مشاہیر قوم ہیں۔ یہ واقعہ اہمیت سے خالی نہیں کہ حکومت ہند نے ملک کے چار بڑے سرکاری شفاخانوں میں ضبط تولید کے سرپرستی گاہیں قایم کرنے کی منظوری دے دی" دیکھو ایک کتاب موسوم "ہندوستان ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۱ء میں" صفحہ ۱۵۳۔ حال کی اہم ترین ترقیات میں سے ایک یہ ہے کہ ہندوستانی خواتین نے ضبط تولید کے مسئلے میں اگرچہ محجوبانہ دلچسپی لینی شروع کردی ہے۔ چنانچہ ضبط تولید کی تائید میں رزولیوشن پاس کرنا خواتین کی کانفرنس کی عام خصوصیت بن گئی ہے۔

[2] دیکھو رپورٹ مردم شماری بابتہ ۱۹۳۱ء جلد اول باب (۳)؛ رپورٹ مردم شماری بابتہ ۱۹۲۱ء جلد اول صفحہ ۶۳ تا ۹۵؛ رپورٹ مردم شماری بابتہ ۱۹۱۱ء جلد اول باب (۳)؛ رپورٹ مردم شماری ۱۹۰۱ء جلد اول صفحہ ۸۸ تا ۹۵؛ اور زرعی کمیشن کی رپورٹ صفحہ ۵۱۸ تا ۵۵۵۔

باب

یہ خصوصیت خاصہ معاشی و معاشری اسباب اور اس امر کا نتیجہ ہے کہ غیر نقل پذیر زرعی آبادی زمین سے وابستہ ہے؛ ذات پات، زبان اور معاشری رسم ورواج کی بندشوں اور قیود میں جکڑی ہوئی ہے اور ہر قسم کی تبدیلی کو فطری طور پر خوف کی نظر سے دیکھتی ہے۔ معاشری سبب جو زیادہ تر ہندوؤں کو متاثر کرتا ہے، ذات پات کا طریق ہے جو ایک ایسے شخص کی زندگی کو عذاب جان بنا دیتا ہے جو اپنے معاشرے کے دائرے سے الگ تھلگ رہتا ہو۔ چنانچہ وہ عام طور پر نہ تو بیاہ کر سکتا ہے اور نہ دوسرے فرقوں کے ارکان کے ساتھ کھا پی سکتا ہے؛ علاوہ ازیں طویل عرصے تک اس کی معاشرے سے علیٰحدگی ممکن ہے کہ اس کے بارے میں یہ بدگمانی پیدا کردے کہ اس نے ذات کے قواعد توڑ دیئے ہیں، اور اس کی واپسی پر اس کا حقہ پانی بند کردیا جائے۔

نقل وطن کی راہ میں معاشی مزاحمت اس واقعے میں مضمر پائی جاتی ہے کہ اہل ہند کا زیادہ تر انحصار صرف ایک ہی پیشے یعنے زراعت پر ہے۔ ایک خطۂ زمین کی ملکیت یا اس سے دلچسپی اور وابستگی لوگوں کو اس بات پر آمادہ نہیں کرتی کہ وہ ایک مقررہ اگرچہ غیر اطمینان بخش ذریعۂ معاش کو دوسری جگہ یا دوسرے طریقے پر روزی تلاش کرنے کی خاطر ترک کریں۔ علاوہ ازیں ملیریا اور خطّافیہ (Hook worm) وغیرہ جیسے امراض کہنہ کا بھی مضر اثر پڑتا ہے جو انسان کی مستعدی اور قوت اختراع کو سلب کرلیتے ہیں۔ علاوہ ازیں اکثر دیہاتی، مہاجن کے پنجے میں پھنسے ہوئے ہیں، جو اپنے قرضداروں کے دیہات چھوڑنے کی راہ میں ہر ممکنہ مزاحمت پیدا کرتا ہے۔

89 آخری امر یہ ہے کہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ آبادی کی اکائی جتنی چھوٹی ہوگی اتنا ہی ان اشخاص کا تناسب زیادہ ہوگا جو دوسری جگہ پیدا ہوئے ہیں۔ اگر یہ بات صحیح ہو تو، یہ توقع کرنی چاہئے کہ ہندوستان جیسے ملک کے اندر جس میں دنیا کی کل آبادی کا قریب قریب ⅕ حصہ بودوباش رکھتا ہے، نقل وطن کرنے والوں کے متناسب اعداد کم ہوں گے۔ لیکن آبادی کے عام طور پر غیر نقل پذیر ہونے کے باوجود، ملک کے اندر نقل وطن کی بعض معین لہریں موجود ہیں جن کا اجمالی طور پر

باب

ذکر کر دینا مناسب ہوگا۔[1]

[1] مردم شماری بابتہ ۱۹۱۱ء میں مختلف قسموں کے نقل وطن کو حسب ذیل بیان کیا گیا ہے۔

(الف) اتفاقی یا خفیف نقل وطن ہمسایہ دیہات کے مابین۔ "اس قسم کی خفیف نقل وطن کا بڑا سبب یہ رواج ہے جو ہندوؤں میں عام ہے کہ والدین اپنے لڑکوں کے لیے اپنے گاؤں سے الگ دوسرے گاؤں میں بیویاں تلاش کرتے ہیں؛ اور دوسرے یہ واقعہ کہ بعض علاقوں میں نوجوان بیوی وضع حمل کے لیے اور خاص کر پہلی زچگی کے لیے اپنے میکے واپس جاتی ہے۔"

(ب) عارضی۔ جو زیادہ تر اس وجہ سے ہوتی ہے کہ نئی نہروں اور ریلوں میں محنت کی طلب کو پورا کرنے کے لیے قلی نقل مقام کرتے ہیں، یا کاروبار، مقدس مقاموں کی زیارت یا شادی بیاہ کی رسوم کے سلسلے میں نقل مقام کیا جاتا ہے۔

(ج) میعادی۔ یعنی محنت کی موسمی طلب کو پورا کرنے کے لیے؛ مثلاً فصل کی کٹائی کے موسم میں سندربن، برما، اور شمالی ہند کے گیہوں پیدا کرنے والے علاقوں کو مزدور سالانہ منتقل ہوتے ہیں؛ اور موسم سرما میں بہار اور صوبۂ متحدہ سے سڑکوں پر کام کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر نقل وحرکت عمل میں آتی ہے۔

(د) نیم مستقل۔ ایک مقام کے باشندے دوسرے مقام میں جا کر کسب معاش کرتے ہیں، لیکن اپنے قدیم وطن سے جہاں ان کے بیوی بچے رہتے ہیں اپنے تعلقات برقرار رکھتے ہیں اور خود بھی انجام کار وہیں لوٹ آتے ہیں؛ مثلاً بڑے شہروں کی فیکٹریوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے اکثر مزدور، سرکاری دفاتر کے ملازم اور خانگی خدمت گار، نیز ہرجائی مارواڑی تاجر اور مہاجن۔

(ھ) مستقل۔ اس قسم کی نقل نو آبادکاری کی نوعیت رکھتی ہے، اور بالعموم اس صورت میں واقع ہوتی ہے جبکہ آب پاشی یا ذرائع نقل وحمل کی ترقی وتوسیع یا تبدلہ سیاسی حالات کے باعث نئی زمینیں قبضے کے لیے دستیاب ہوتی ہیں۔ اس قسم کی نقل کی مثالیں یہ ہیں (۱) شمالی برما کے الحاق کے بعد سے اس علاقے سے جنوبی برما میں وسیع پیمانے پر آبادکاری؛ (۲) پنجاب میں کارہائے آب پاشی کی تکمیل کے بعد گنجان علاقوں سے آبادی کی نہری نوآبادیات میں یورش۔

باب

(۱) آسام آسام کی آبادی بہت قلیل اور دور دور پھیلی ہوئی ہے، اور چونکہ وہاں قابل زراعت زمین وافر مقدار میں دستیاب ہوتی ہے اس لیے وہاں کے باشندے اجرت پر کام کرنے کو غیر ضروری خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ چائے کے باغوں کے لیے مزدوروں کی رسد دوسرے صوبوں سے حاصل کرنی پڑتی ہے۔ وادیٔ برہم پتر میں جو قابل زراعت لیکن افتادہ زمین ہے وہ بھی دوسرے صوبوں سے نقل مقام کرکے آنے والوں کی کثیر تعداد کو اپنی جانب کھینچتی ہے۔

چائے کی باغبانی کی صنعت میں کام کرنے والے مزدور دوسرے صوبوں مثلاً بہار و اوڑیسہ، صوبہ جات متوسط و متحدہ اور مدراس سے آتے ہیں، اس کے برخلاف وادیٔ برہم پتر کے آباد کار زیادہ تر مشرقی بنگال سے آتے ہیں۔ آسام میں تیسری قسم کی درآمد نیپالیوں کی ہے جن کی محنت زیادہ تر گلہ بانی کی نوعیت رکھتی ہے۔ غرض آسام میں دوسرے مقامات سے آکر بسنے والوں کی تعداد خاصی بڑی ہے؛ جیسا کہ اس واقعے سے ثابت ہوتا ہے کہ صوبے کی قریب قریب ایک چوتھائی آبادی غیر ملکی یا خارجی نژاد ہے۔ آسام میں اب بھی زمین کا بہت بڑا رقبہ زراعت کے لیے دستیاب ہو سکتا ہے لیکن دوسرے علاقوں کی آبادی جس سرعت کے ساتھ اس وقت یہاں جذب ہو رہی ہے اس سے زیادہ سرعت کی راہ میں "کالا آزار" اور دوسرے امراض کا شیوع، اطمینان بخش ذرائع نقل و حمل کی کمی اور ادنیٰ شرح اجرت مزاحمت پیدا کرتی ہے۔

90

سنہ ۱۹۲۱ء کے بعد سے تغیرات و ترقیات رونما ہوئے ہیں، خاص کر ان صوبوں سے آبادی کی نقل و حرکت میں جو پہلے چائے کے باغوں کے لیے مزدوروں کی رسد فراہم کیا کرتے تھے۔ مدراس ہی تنہا ایک صوبہ ہے جہاں آسام کو نقل مقام کرنے والوں میں اضافہ ظاہر ہوتا ہے۔ بہار اور اوڑیسہ کے مزدوروں کی بھرتی میں سنہ ۱۹۲۱ء کے بعد سے بہت تیزی کے ساتھ کمی ہوئی جس کا باعث زیادہ تر یہ امر تھا کہ ترک موالات (نان کو اپریشن) کے حامیوں نے

اس بھرتی کے خلاف مہم کا ارادۂ آغاز کر دیا تھا۔ لیکن جب چھوٹی مدت کی بھرتی کا طریقہ مقبول ہو گیا تو بھرتی کا کام از سر نو شروع ہوا۔ دوسری طرف، آسام مقامی مزدوروں پر زیادہ سے زیادہ انحصار کرنے کا سبق بھی سیکھ رہا ہے۔

(ب) بنگال بنگال میں نقل مقام کرکے آنے والوں میں ۶۰ فی صد سے زاید حصہ بہار اور اوڑیسہ سے آتا ہے، اور باقی حصہ صوبۂ متحدہ (۱۸ فی صد)، نیپال (۵ فی صد)، آسام (۴ فی صد)، صوبۂ متوسط (۳ فی صد) وغیرہ سے آتا ہے۔ یہاں توطن اختیار کرنے والوں کی اہم ترین لہریں حسب ذیل علاقوں سے آتی ہیں:۔

(۱) بہار اوڑیسہ اور صوبۂ متحدہ کے مشرقی علاقوں سے کلکتے کے نواحی علاقوں میں؛ (۲) سنتل پرگنوں سے بیر بھوم، مالدہ، دیناج پور اور شمالی بنگال کے علاقوں میں؛ (۳) نیپال اور چھوٹا ناگپور سے دارجیلنگ اور جل پگوری کے چائے کے باغوں میں؛ اور (۴) آسام سے ریاست تری پورا میں۔

بنگال میں آبادی کی درآمد کا باعث یہ ہے کہ یہاں کی زمین مقابلتہً زیادہ زرخیز ہے، صنعتیں خاص کر کلکتہ کے نواح میں مقابلتہً زیادہ ترقی یافتہ ہیں، اور بنگالی دستی پیشوں سے نفرت کرتے ہیں جو ان کی خصوصیت خاصہ ہے۔ نہ صرف دستی مزدور بلکہ محابس کے پولیس کے آدمی اور چھوٹی دار، زمیں داروں کے چپراسی وغیرہ بھی زیادہ تر دوسرے صوبوں ہی سے بھرتی کئے جاتے ہیں۔ بنگال میں آبادی کی اندرونی نقل کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ وسطی علاقے کے لوگ ایک طرف تو کلکتے کے گرد و نواح میں منتقل ہو رہے ہیں اور دوسری طرف شمالی بنگال اور وادئ آسام کی جانب نقل پذیر ہیں۔

(ج) بمبئی بمبئی پریسڈنسی میں دوسرے صوبوں سے آنے والی آبادی کی نقل مقام کی قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ بمبئی، کراچی اور شولاپور جیسے بڑے تجارتی وصنعتی شہروں میں بیرونی اشخاص کا انجذاب روز افزوں ہے، یہ لوگ زیادہ تر بلوچستان، شمالی مغربی سرحدی صوبہ، پنجاب اور صوبۂ متحدہ، راجپوتانہ، حیدرآباد دکن اور مدراس سے آتے ہیں۔ ال۔ جی۔ سجوک مہتمم مردم شماری

(سالنامہ ۱۹۲۱ء) بمبئی رقم طراز ہیں کہ "بمبئی میں دو ذرایع سے آبادی کی درآمد ہوتی ہے' ایک تو شمال مغربی ہندوستان سے جس کی نمایندگی بلوچستان' شمال مغربی سرحدی صوبہ' پنجاب' صوبۂ متحدہ اور راجپوتانہ کے وسیع علاقے کرتے ہیں؛ اور دوسرے جنوب مشرق سے یعنی حیدرآباد اور مدراس سے۔ شمالی لہر بمبئی اور کراچی کے ادنیٰ طبقوں اور مزدوروں کی تعداد میں اضافہ کرتی ہے؛ اور حیدرآبادی موج کا رُخ شولاپور کی گرنیوں کی طرف ہے۔ . . . . . "صنعتی حیثیت سے' بنگال کے مقابلے میں' بمبئی زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ گو بنگال کی طرح اس کی آبادی گنجان نہیں ہے' اس لیے کہ بمبئی کی زمین بدرجہا کم زرخیز ہے؛ لیکن یہاں مقامی محنت کی بدرجہا زیادہ رسد دستیاب ہوسکتی ہے۔ چنانچہ اس کی طلب کے بہت ہی چھوٹے حصے کو صوبے کے باہر سے پورا کیا جاتا ہے۔

شمال مغربی ہندوستان سے خالص درآمد کی مقدار بہت زیادہ ہے۔ باہر سے آنے والوں کا قریب قریب ایک تہائی حصہ صوبۂ متحدہ سے' ½ راجپوتانہ سے' اور باقی پنجاب' شمال مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان سے آتا ہے' اگرچہ بلوچستان کے باشندے زیادہ تر سندھ جاتے ہیں۔ صوبے میں داخلی نقل مقام کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ آبادی صوبے کے طول و عرض سے صنعتی شہروں میں منتقل ہوتی ہے۔ دکن ایک خشک علاقہ ہے جو ہمیشہ سے زرعی خشک سالی کا مرکز بنا رہا ہے' لہٰذا اس کی زاید اور بے کار آبادی بمبئی پریزیڈنسی کے دوسرے علاقوں میں منتقل ہو رہی ہے۔ چنانچہ سارے صوبے کے دوسرے علاقوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ اس علاقے کے باشندے شہر بمبئی کو منتقل ہوتے ہیں۔

(د) برما[1] آسام کے مثل برما کی آبادی بھی کم گنجان ہے' اور اس میں قابل زراعت افتادہ زمین کا بہت بڑا رقبہ موجود ہے۔

[1] قانون حکومت ہند بابتہ ۱۹۳۵ء کی رو سے برما برطانوی ہند سے الگ ہو جانے والا ہے۔ جب برما الگ ہو جائے گا تو "برما کو نقل مقام" کہنے کے بجائے "برما میں توطن خارجی" کہا جائے گا۔

باب ۳

ان ہی اسباب کی بنا پر جو آسام کے چائے کے باغوں کے بارے میں پائے جاتے ہیں، برما کی چاول اور تیل کی گرنیوں کے لیے بھی مزدور باہر سے خاص کر مدراس سے، بلانے پڑتے ہیں۔ چٹاگانگ سے قلیوں کی بہت بڑی تعداد اکیاب کی چاول کی فصلوں اور رنگون کی چاول کی گرنیوں وغیرہ میں کام کرنے کے لیے بھی آتی ہے۔ برما میں باہر سے آئے ہوئے اشخاص کی مجموعی تعداد ۱،۰۷،۰۰۰ ہے، جن کے منجملہ ۵،۷۳،۰۰۰ ہندوستانی ہیں۔ سنہ ۱۹۱۱ء اور سنہ ۱۹۲۱ء کی مردم شماریوں کی درمیانی مدت میں ہندوستانی توطن گزینوں کی تعداد میں ۱۶ فی صد اضافہ ہوا۔ سنہ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری میں سنہ ۱۹۲۱ء کے اعداد پر ۱۲۱،۰۰۰ کا اضافہ رونما ہوا۔ اس نقل و حرکت کی غیر مستقلانہ نوعیت اس بات سے ثابت ہوتی ہے کہ توطن اختیار کرنے والوں میں مردوں کے مقابلے میں عورتیں بہت ہی کم ہیں۔ ہندوستانی تارکان وطن کی سب سے زیادہ تعداد مدراس سے جاتی ہے، اس کے بعد بنگال، صوبہ متحدہ، اور پنجاب کا نمبر ہے۔ ہندوستانی تارک وطن موجودہ زمانے میں زیادہ تر شہری صنعتوں میں کام کرتا ہے اور وہ سب کٹھن دستی کام کرتا ہے جس سے برمی کوئی ذوق نہیں رکھتا۔

پھر بھی برمیوں کی روزافزوں خودداری کے سبب سے (جس کا اظہار بعض اوقات مخالف ہندوستانی بلوؤں سے ہوتا ہے) اور دیسی آبادی کے بڑھنے اور معاشی دباؤ کے روزافزوں ہونے کی وجہ سے، برطانوی ہند کے گنجان علاقوں کی آبادی کے لیے برما میں نقل اور توطن پذیری زیادہ سے زیادہ دشوار ہوتی جا رہی ہے۔

92

۳۸۔ نقل وطن: (۲) توطن خارجی

اس وقت قریب قریب ۲½ ملین ہندوستانی غیر ممالک میں سکونت پذیر ہیں۔ ان میں سے قریب قریب سب کے سب سلطنت برطانیہ کے دوسرے علاقوں میں قیام پذیر ہیں۔ سنہ ۱۹۲۱ء تا سنہ ۱۹۳۱ء میں صرف دس لاکھ اشخاص نے ترک وطن کیا۔ سلطنت کے مختلف علاقوں میں ان کی تقسیم کم و بیش حسب ذیل ہے:-

سیلون　　(۷۷۹۰۰۰)

برطانوی ملایا	(۶۲۴,۰۰۰)
موریشس	(۲۶۹,۰۰۰)
جنوبی آفریقہ	(۱۶۵,۰۰۰)
ٹرینی ڈاڈ	(۱۳۹,۰۰۰)
برطانوی گیانا	(۱۳۰,۰۰۰)
جزائر فی جی	(۷۵,۰۰۰)
کینیا	(۲۷,۰۰۰)
ٹنگانیکا	(۲۳,۰۰۰)
جمائیکا	(۱۷,۰۰۰)
زنزبار	(۱۵,۰۰۰)
اوگانڈا	(۱۲,۰۰۰)

سلطنت برطانیہ سے باہر غیر ممالک میں رہنے والے ہندوستانیوں کی تعداد بہت کم ہے؛ چنانچہ اندازہ کیا گیا ہے کہ سب ملا کر ایک لاکھ چار ہزار سے زائد نہ ہوگی۔ موجودہ زمانے میں ہندوستانی توطن خارجی کے دو اہم ترین ملک ملایا اور سیلون ہیں۔ اگست سنہ ۱۹۳۰ء میں ملایا کے لیے ہندوستانی مزدوروں کی بھرتی روک دی گئی جس کا باعث یہ تھا کہ ٹن اور ربر کی قیمتیں گھٹ گئی تھیں، اور سنہ ۱۹۳۰ء اور سنہ ۱۹۳۱ء میں انھیں بڑے پیمانے پر وطن لوٹا یا گیا۔ رہا سیلون تو ربر کے کھیتوں میں کاشت کے لیے ہندوستانی مزدوروں کی بھرتی سنہ ۱۹۳۰ء اور سنہ ۱۹۳۱ء میں موقوف کردی گئی، اور سنہ ۱۹۳۱ء میں ۱۱ ہزار ہندوستانی وطن لوٹا دیئے گئے۔ لیکن دوسرے طریقوں سے یہاں توطن خارجی کا سلسلہ جاری رہا۔ چنانچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیلون میں ہندوستانی مزدوروں کا انجذاب قریب قریب نقطۂ سیری تک پہنچ گیا ہے۔[1] ہندوستانی توطن خارجی عام طور پر دو قسم کا رہا ہے۔

[1] مندرجۂ بالا گوشوارے میں سنہ ۱۹۳۱ء کی صورت حال بتلائی گئی ہے اور یہ اعداد ملایا اور سیلون سے مزدوروں کی وطن کو واپسی کے بعد کے ہیں۔

ایک تو میثاقی طریقے کے تحت غیر ماہر مزدوروں کا ترک وطن کرنا مثلاً فی جی، موریشس، نیٹال اور جزائر غرب الہند میں؛ یا کسی خاص بھرتی کے طریقے کے تحت، جیسا کہ سیلون اور ملایا میں اختیار کیا گیا۔ دوسرے، پیشہ ور، تجارتی اور دستکار پیشوں سے تعلق رکھنے والے اشخاص کی از خود نقل پذیری۔ اول الذکر قسم کی نقل پذیری کے مقابلے میں موخر الذکر قسم کی نقل پذیری زیادہ وسیع رہی ہے، اور اس کے تحت ایسے مقامات تک بھی لوگ پہنچے ہیں جو امدادی توطن خارجی کے کسی طریقے کے تحت کبھی نہیں آئے۔ چنانچہ یہ بات جنوبی آفریقہ اور بعض شاہی نوآبادیات کو مستثنیٰ کر کے خود مکراں مقبوضات پر اور خاص کر مشرقی آفریقہ کے علاقوں پر بھی صادق آتی ہے۔

اکثر ہندوستانی، ملک سے باہر جاکر زرعی مزدوروں کے طور پر ربڑ، چائے، قہوہ وغیرہ کے باغوں اور کھیتوں میں کام کرتے ہیں۔ مزدوروں کا میثاقی طریقے کے تحت توطن خارجی مارچ ۱۹۱۷ء میں مسدود کر دیا گیا، اور اس کے نتیجے کے طور پر توطن خارجی میں بہت بڑی حد تک کمی ہو گئی ہے۔ ۱۹۲۱ء کی شہنشاہی کانفرنس کی قرارداد نے اس اصول کی مزید توثیق کر دی کہ جماہیر برطانیہ کی ہر رکن قوم کو اپنی آبادی کی ترکیب پر کامل اختیار ہونا چاہئے، تاکہ وہ دوسری قوموں میں سے کسی قوم کے افراد کی درآمد کو روک سکے۔ چنانچہ سلطنت برطانیہ میں جو ملک داخل ہیں ان میں سے اکثروں نے اپنے حدود کے اندر بیرونی آبادی کی درآمد کی تحدید و تنظیم کے حق و اختیار کو، ہندوستانیوں کا داخلہ پوری طرح بند کرنے کے خیال سے نہیں تو کم از کم ان کی حوصلہ شکنی کی نیت سے استعمال کیا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کے اسباب سیاسی ہوں یا قومی یا خالصتاً معاشی؛ لیکن جہاں تک ہندوستانی آبادی کا تعلق ہے اس ناخوشگوار واقعے کا مقابلہ کرنا چاہئے کہ ملک کے اندر آبادی کی گنجانی کا بار ہلکا کرنے کے علاج کے طور پر آبادی کی بیرونی نقل یا توطن خارجی قریب قریب غیر ممکن ہے۔[1] مردم شماری کی رپورٹ بابتہ ۱۹۲۱ء میں بتلایا گیا ہے

[1] توطن خارجی کے بارے میں حکومت ہند کی پالیسی کے متعدد پہلوؤں پر مفصل بحث کرنا غیر ضروری ہے۔

۱۱ب

کہ پچھلے دہے میں آبادی میں بہت زیادہ اور سریع اضافہ ہونے کے باوجود، سابقہ دوروں کے مقابلے میں توطن خارجی کے ذریعے سے آبادی کے بار کو بہت کم ہلکا کیا گیا۔

مذکورۂ بالا متعدد قیود کے باعث ہندوستان کے حدود سے باہر اہل ہند کا توطن خارجی کچھ سال ادھر غیر اہم رہا ہے۔ توطن خارجی کے امکانات سلطنت برطانیہ کے ان علاقوں تک محدود ہیں جو منطقۂ حارہ اور تحتانی منطقہ حارہ میں واقع ہیں۔ یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ برطانوی ملایا اور سیلون کچھ زمانے تک ہندوستان سے زیادہ سے زیادہ تقریباً ۱۴۰،۰۰۰ اشخاص سالانہ جذب کریں گے۔ لیکن اس سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی امید ہے کہ مستقبل میں برطانوی گیانا میں کافی تعداد میں توطن اختیار کیا جائے گا جہاں اب بھی زراعت کی توسیع کے لیے بہت بڑا میدان موجود ہے۔ برطانوی گیانا کی موجودہ آبادی کم و بیش ۳۰۴۰۰۰ نفوس ہے، لیکن ملک اس سے دس گونہ تعداد کی کفالت کی بھی قابلیت رکھتا ہے اور ہندوستانیوں کی بود و باش کے لیے خاص طور پر موزوں ہے۔ قانون توطن خارجی بابتہ ۱۹۲۲ء کے تحت اس نو آبادی میں ہندوستانیوں کے توطن خارجی کی ایک تجویز منظور کی گئی ہے، لیکن اس پر اب تک عملدرآمد اس لیے نہیں ہوا ہے کہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ: موجودہ زمانے میں ایسی نقل پذیری کرنے والوں کی تعداد بہت ہی غیر اہم ہے چنانچہ یہ مسئلہ اس ملک کے معاشی حالات میں سکون پیدا کرنے کے نقطۂ نظر سے کسی معنی میں بھی اہمیت نہیں رکھتا۔ ۱۹۲۲ء کے قانون توطن خارجی (the Emgration Act of (1922)) کی رو سے غیر ماہر مزدوروں کا امدادی توطن خارجی خلاف قانون اور ناجائز قرار دیا گیا بجز اس صورت کے کہ گورنر جنرل باجلاس کونسل کسی شخص کو کسی خاص ملک میں خاص حالات و شرائط کے تحت جانے کی اجازت دیں۔ علاوہ ازیں ہندوستانی مجلس قانون ساز کی ایک مجلس قائمہ توطن خارجی بھی ہے جو حکومت کو توطن خارجی کے تمام بڑے مسائل مثلاً تارک وطن غیر ماہر مزدوروں کی اجرت کا معیار مقرر کرنے اور ہندوستانی آبادکاروں کی بود و باش کے شرائط معین کرنے کے بارے میں مشورہ دیتی ہے۔

ب　کسان فسرائیڈ کو غیر منفعت بخش خیال کرتے ہیں۔ زرعی کمیشن نے پرزور سفارش کی ہے کہ یہ تجویز مزید تحقیق کی مستحق ہے،" اس لیے کہ ہندوستانی آبادی دگنی ہو جانے کے امکان کو حقیر یا موہوم تصور نہیں کیا جا سکتا" (دیکھو رپورٹ پیراگراف ۔ ۱۵)۔

۳۹۔ نسل انسانی کی اصلاح انسان، پیدائش دولت کا اہم ترین آلہ ہے؛ اس لحاظ سے جو چیز بھی نوع انسانی کی جسمانی صحت وقوت، عقل وذہانت اور کردار وخصائل کی اصلاح کرتی ہے وہی اس کی معاشی قوت اور کارکردگی میں بھی اضافہ کرتی ہے۔ کچھ سال ادھر اس امر کی بہت کچھ تحقیق کی گئی ہے کہ معاشی قدر وقیمت رکھنے والے حیوانات ونباتات کی اصلاح وترقی پر توارث کا کیا اثر پڑتا ہے، اور اس بارے میں اہم عملی نتائج حاصل ہوئے ہیں۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ انسان، نباتات اور گھریلو جانوروں کی اصلاح وترقی کے لیے جو کچھ کر سکا ہے وہ اپنے لیے کبھی نہ کر سکا۔ لیکن انسانوں کے بارے میں توارث کا مطالعہ کرنے اور اس کے قوانین کا نسل انسانی کی اصلاح کی غرض سے اطلاق کرنے میں دشواری یہ ہے کہ انسان پر وسیع حدود کے اندر تجربہ کرنا یا جوڑا لگانے میں اس کے ساتھ وہی برتاؤ کرنا جو حیوانات اور نباتات کے ساتھ کیا جاتا ہے غیر ممکن ہے۔　۹۴

تاہم نسل انسانی کی فلاح وبہبود کے لیے یہ امر نہایت اہمیت رکھتا ہے کہ نسل کے قیام ودوام کا انحصار تاحدامکان ان افراد پر ہو جو قوم کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہوں۔ اس کی ضرورت اس وجہ سے اور بھی زیادہ ہو گئی ہے کہ موجودہ تہذیب وتمدن کا میلان یہ ہے کہ ان عاملین میں سے بعض کو نابود کر دیا جائے جو جسمانی ودماغی حیثیت سے کمزور افراد کی ہلاکت کا سبب بن گئے ہیں۔ قدیم زمانے کے حالات کے تحت کمزور اور نحیف لوگوں کو کشاکش حیات میں باقی رہنے یا اپنی نسل کو بڑھانے کا بہت کم موقع حاصل تھا۔ مثلاً جو لوگ غیر معمولی طور پر جری اور طباع ہوتے تھے وہ کمزور افراد کے مقابلے میں زیادہ بیویاں حاصل کر سکتے تھے اور اس لحاظ سے زیادہ اولاد پیدا کر سکتے تھے۔ لیکن موجودہ زمانے میں حفظ صحت وصفائی کی اصلاح وترقی

باب ۳

طبابت و جراحی کی ترقی، اور انسانی ہمدردی کے جذبے کی ترقی کی بدولت فطری انتخاب کا عمل رک گیا ہے[1] جسمانی حیثیت سے غیر موزوں و ناکارہ لوگوں پر کوئی بندش عائد نہیں کی گئی ہے، اور فاترالعقل اور بگڑے ہوئے اخلاق کے لوگ جو موروثی امراض کے تخم اپنے اندر رکھتے ہیں، بیاہ کے ذریعے سے اپنی نسل کو قایم و دایم رکھتے ہیں۔ سائنٹیفک مشاہدے اور تجربے کی مشکلات کے باعث علم اصلاح النسل کی ترقی کی رفتار بہت ہی سست ہے، اور ہماری معلومات، قوانین توارث کے بارے میں، جس حد تک کہ ان کا اطلاق انسانی خصائل کی توریث پر ہوتا ہے، ابھی تک بہت ہی معمولی ہے۔ اس لحاظ سے موجودہ زمانے میں ہم جو کچھ کر سکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ نوع انسان کے بارے میں چند نتائج ان قواعد و اصول سے اخذ کر لیں جن کی پابندی جانوروں کی پرورش کرنے والا مفید پاتا ہے۔ علم اصلاح النسل کی ہر عملی تجویز، ایجابی و سلبی، دونوں پہلو رکھتی ہے؛ یعنی اس کا مقصد خاص طور پر موزوں اشخاص کی نسل کو بڑھانے کی حوصلہ افزائی کرنا اور خاص طور پر غیر موزوں اشخاص کی افزائش نسل کی حوصلہ شکنی کرنا ہے۔ ہندوستان میں بیاہ کا رشتہ جوڑنے میں چند قواعد کی پابندی کی جاتی ہے جو اصلاح نسل کے لیے مفید ہیں؛ مثلاً رشتہ داری کی بعض صورتوں میں بیاہ ممنوع ہے۔ علاوہ ازیں ذاتوں کو بعض "برون زواجی"[2] طبقوں یا برادریوں (گوتروں) میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور ان کے ارکان کا ناتہ اس قدر قریب کا

[1] تاہم یہ کہدینا ضروری ہے کہ قدیم حالات کے تحت فطری انتخاب نے بقائے اصلح کا نتیجہ لازمی طور پر نہیں پیدا کیا۔ چنانچہ یہ بات بجا طور پر کہی گئی ہے کہ فطری انتخاب قوت جسمانی کو قوت دماغی پر اور ادنیٰ قسم کی مکاری کو اعلیٰ قسم کی ذہانت پر عام طور پر ترجیح دیتا تھا۔ علاوہ ازیں طب اور حفظ صحت کی ترقی بحیثیت مجموعی قوم کی معاشی کارکردگی کو بڑھاتی ہے۔ بہر حال یہ ایک مسلم الثبوت کلیہ ہے کہ قدیم حالات کے مقابلے میں جدید حالات کے تحت غیر موزوں اشخاص کی بہت بڑی تعداد باقی رہنے اور نسل بڑھانے کے قابل ہو گئی ہے۔

[2] (Exogamous)

ایک

مانا گیا ہے کہ ان کو آپس میں بیاہ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ لیکن یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ آیا یہ خاص قسم کی ممانعت کوئی سائنٹفک بنیاد رکھتی ہے یا نہیں[1]۔ دوسری طرف ہندوستان میں بعض رواج ایسے ہیں جن کی وجہ سے لازمی طور پر نسلی انحطاط واقع ہوتا ہے۔ چنانچہ ان ہی رواجوں میں سے ایک یہ ہے کہ بہت چھوٹی چھوٹی ذیلی ذاتوں میں جو آپس میں شادی بیاہ کر سکتی ہیں ہمیشہ ازدواجی رشتے قائم ہوتے اور اولاد پیدا ہوتی رہتی ہے[2]۔ بحیثیت مجموعی ہندوستان' انسانی توارث کے قوانین سے واقفیت کا ویسا ہی محتاج ہے جیسا کہ کوئی دوسرا ملک۔ یہ توقع کرنا دراصل بے نتیجہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ واقفیت کے باوجود اختیاری فعل خارجی تحریک کے بغیر موزوں ترین نسلوں کو محفوظ طریقے پر بڑھائے گا۔ اسی کے ساتھ سب سے زیادہ ترقی یافتہ مغربی ممالک میں بھی ایجابی اصلاح نسل کی آئینی تجاویز موجودہ زمانے میں خارج از بحث ہیں' اس لیے کہ ان کی اس لحاظ سے مخالفت کی جائے گی کہ وہ انفرادی آزادی پر بے جا دباؤ ڈالتی ہیں۔ پھر بھی بعض ملک اصلاح نسل کے متعلق آئین وضع کرنے کے بارے میں امتحانی طور پر تجربے عمل میں لا رہے ہیں۔ چنانچہ ریاستہائے متحدہ میں' ریاست نبراس کا میں ایسے شخص کو بیاہ کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے جو امراض خبیثہ میں مبتلا ہو۔ ریاست کنکٹی کٹ نے ایسے اشخاص کے ازدواج کو ممنوع قرار دیا ہے جو مرگی کے مرض یا دماغی امراض میں مبتلا ہوں۔ مونٹانا میں پاگلوں اور مرگی کے بیماروں کی تولیدی قوت آپریشن کے ذریعے سے سلب کر لی جاتی ہے' جس کے نتیجے کے طور پر وہ مجامعت تو کر سکتے ہیں لیکن اولاد پیدا کرنے کی قوت باقی نہیں رہتی۔ یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ کٹر مجرموں اور دوسرے ناخواستہ و ناپسندیدہ

---

[1] ایس' وی' کرانڈی کر اپنی عالمانہ تصنیف موسوم بہ "ہندو بیرون زواجی" Hindu Exogamy میں ان غیر ضروری اور بے معنی بیرون زواجی قیود کو نرم بنانے کے حق میں دلائل پیش کرتے ہیں جن میں ہندو سماج نے اپنے آپ کو جکڑ رکھا ہے۔

[2] دیکھو کرانڈی کر کی محولۂ بالا کتاب صفحہ ۲۰۰۔

باب۳

اشخاص کو بھی تولیدی قوت سے محروم کرنے کا طریقہ استعمال کرنا چاہئیے[1]۔ اگرچہ اکثر ملکوں میں عوام کے جذبات اور رائے عامہ کی موجودہ حالت میں اصلاح نسل کے عام پسند آئین و قوانین وضع کرنے میں بہت زیادہ آگے جانا ممکن نہیں ہے۔ لیکن حکومت، معلومات کی اشاعت کرکے اور مشورے پیش کرکے اس اہم معاملے میں رائے عامہ کی کسی حد تک تعلیم و تربیت کر سکتی ہے۔

۱۴۔ صحت و صفائی عامہ عوام کی معاشی کارکردگی کو برقرار رکھنے میں صفائی و صحت عامہ کا انتظام جو اہمیت رکھتا ہے اس کو جتنا بڑھا کر بیان کیا جائے کم ہے۔ ہندوستان میں طاعون، انفلوئنزا، ملیریا، چیچک، میعادی بخار وغیرہ جیسے امراض کے باعث اموات کی کثرت، معاشی حیثیت سے تباہ کن ہے؛ اس لیے کہ اس کی وجہ سے پیدائش دولت کا شیرازہ بالکل درہم و برہم ہو جاتا ہے؛ انگلستان میں گزشتہ ستر سال میں صحت عامہ کی اصلاح و ترقی کے بہت بڑے منازل طے کئے جا چکے ہیں اور ان کے نتیجے کے طور پر ٹائفس، ہیضہ، تپ قرمزی، اور ڈف تھیریا (خناق وبائی) وغیرہ امراض قریب قریب نابود ہو گئے ہیں۔ ہندوستان میں بے پروائی، سستی اور جمود لوگوں کی امتیازی خصوصیت بن گئی ہے، اور یہ زیادہ تر خطافیہ اور ملیریا جیسے امراض کا نتیجہ ہے۔ ''ملیریا اور خطافیہ، مقامی امراض کے ایک مہیب حزنیہ کے نحس اداکار ہیں اور جس اسٹیج پر یہ حزنیہ کھیلا جاتا ہے اس پر کبھی پردہ نہیں گرتا''[2]۔ یہ امراض جتنے اشخاص کو در اصل ہلاک کرتے ہیں اس سے زیادہ کو مرض زدہ کرتے اور ان کی طاقت سلب کر لیتے ہیں، اس لحاظ سے ان امراض کو نیست کر دینے سے جو معاشی فوائد حاصل ہوں گے ان کو جس قدر بڑھا کر بیان کیا جائے کم ہے۔ لوگوں کو حفظ صحت و تندرستی اور اصول صحت کی باقاعدہ اور عام تعلیم دینی چاہئیے اور اس بات کی ضرورت ہے کہ صحت عامہ کے محکموں کو مزید تقویت

96

---

[1] دیکھو بلیکر کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۶ تا ۹۶۔

[2] لارڈ رونلڈشے کا مقولہ۔

باب ۳

دی جائے۔ ابتدائی مصارف کثیر ہوں گے، لیکن فایدے سے خالی نہ ہوں گے اس لیے کہ ان کے نتائج معاشی کارکردگی کو بڑھانے کی صورت میں رونما ہوں گے، اور اگرچہ یہ نتائج فوری رونما نہ ہوں گے پھر بھی بہت بڑے اور یقینی ہوں گے۔[1]

۴۱۔ تعلیم قوم کی معاشی کارکردگی کو پوری طرح ترقی دینے کی غرض سے خاص پیشوں میں عام معلومات، واقفیت اور خاص تربیت و تعلیم ضروری ہے۔ ہندوستان میں عام اور فنی تعلیم کی حد تک ابھی بہت کچھ کام کرنا باقی ہے۔ لیکن یہ ایک ایسا موضوع بحث ہے جس کی جانب ہمیں زرعی و صنعتی ترقی کی بحث کے سلسلے میں متعاقب رجوع ہونا پڑے گا۔

۴۲۔ نسلی صلاحیتیں معاشی ترقی کا انحصار جبلی نسلی اوصاف پر بھی ہے، اور بعض فرقوں میں اس کی ذراسی بھی صلاحیت نہیں ظاہر ہوتی۔ بعض فرقوں کی برتری اور بعض فرقوں کی کم تری کے متعلق سطحی تعمیمات سے کام لینا بہت ہی خطرناک بات ہے۔ ان تعمیمات میں سے اکثر کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ موجودہ واقعات کا خلاصہ ہیں۔ بعض مصنف محض اس بنیاد پر کہ موجودہ زمانے میں ہندوستانی معاشی و تمدنی حیثیت سے پسماندہ حالت میں ہیں یہ دعویٰ کر بیٹھتے ہیں کہ یورپ کی قومیں تہذیب و تمدن کی جن بلندیوں پر پہنچ گئی ہیں ان پر

---

[1] قوم کی صحت کے لیے مصارف عامہ، ان مصارف کے مشابہ ہیں جو محافظ جان کشتی یا آتش فرو انجن کے لیے کئے جاتے ہیں، بلکہ کچھ زیادہ ہی اہمیت رکھتے ہیں، یعنی ایک بڑی مدت کے شغل اصل کے مشابہ ہیں۔ اس شغل اصل کا سود قطعی اور یقینی طور پر ملتا ہے اور کئی سو گونہ ملتا ہے، لیکن اس کے ملنے میں کئی سال بلکہ بعض اوقات کئی نسلیں درکار ہوتی ہیں۔ بعض اوقات یہ مہمل سوال سننے میں آتا ہے کہ صحت عامہ کے لیے یہ تمام مصارف برداشت کرنے کا حاصل کیا ہے؟ لیکن سوال کرنے والے عام طور پر ایسے اشخاص ہوتے ہیں جو یہ خیال تک نہیں کرتے کہ ان کے جیسے زندہ دل، مستعد اور قابل لوگوں کی ہمارے درمیان موجودگی خود اس کا جواب ہے۔" دیکھو سالانہ رپورٹ مرتبہ صدر طبی افسر وزارت صحت انگلستان، سنہ ۱۹۲۱ء

Annual Report of the Chief Medical officer of the Ministry of Health (England) 1921

باب ۳

چڑھنے کی صلاحیت ہندوستانی جبلی طور پر نہیں رکھتے۔ علیٰ ہذا ہم یہ تصور کرتے ہیں کہ ایک ہندوستانی مبصر جزائر برطانیہ کے باشندوں کے متعلق اسی طرح تعمیم سے کام لے سکتا تھا کہ وہ اس زمانے میں گودے ہوئے وحشی تھے اور جنگل میں گھوما کرتے تھے جب کہ ہندوستانی اپنے اعلیٰ درجے کی تہذیب و تمدن پر فخر کر سکتا تھا۔ اگر اس مبصر سے یہ کہا جاتا کہ ان ہی وحشیوں کے اخلاف کی قسمت میں ہندوستان کی حکمرانی لکھی تھی تو وہ اس خیال کو قابل معافی نفرت وشبہ کی نظر سے دیکھتا۔ بہر حال معجزہ ظاہر ہو کر رہا اور اب ہندوستانی کی باری ہے کہ وہ اپنا یہ دعویٰ ثابت کر دکھائے کہ اس میں تہذیب و تمدن کی صلاحیت موجود ہے۔ تاریخ اس کے متعدد شواہد پیش کرتی ہے کہ ایک قوم نے دوسری قوم کے بارے میں جہل اور حقارت آمیز رائے قایم کی۔ چنانچہ اٹھارھویں صدی کے آخری زمانے میں مغربی یورپ روسیوں کو نیم وحشی خیال کرتا تھا، اور واقعہ یہ ہے کہ ویدروا اور دالمبیر اس بات کو ممکن ہی نہیں خیال کرتے تھے کہ روسی تہذیب و تمدن میں ترقی کر کے کبھی یورپ کے معیار تک پہنچیں گے۔ علیٰ ہذا حبشیوں کے متعلق اب بھی یہی خیال کیا جاتا ہے کہ وہ سفید فام قوموں کے مقابلے میں مساوات کا درجہ حاصل کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ رہے ہندوستانی تو ان کے متعلق بعض اوقات یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ تمام بھوری قوموں کے مثل وہ بھی مسلسل ترقی کرنے کی قابلیت نہیں رکھتے، اس لیے کہ "وہ عجیب وغریب حالت جمود میں مبتلا ہیں" جس کی وجہ سے ان پر یہ لعنت سوار رہے کہ وہ تھوڑی مدت تک ترقی کرنے کے بعد دائمی تخیلات و تصورات کی دنیا میں جا پڑتے ہیں اور طویل مدت تک ان کی حالت غیر تغیر پذیر رہتی ہے۔ لیکن ہندوستانیوں کے متعلق اس قسم کے خیالات قایم کرنا مذموم ہو سکتا ہے تو صرف اس لحاظ سے کہ اس بدیہی واقعے کو نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ ہندوستانیوں کی کوئی ایک نسل یا قوم نہیں ہے بلکہ ان کی قومیت کا خمیر مختلف قوموں کی آمیزش سے تیار ہوا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات

97

لہ دیکھو میری ڈیتھ ٹاونسنڈ کی کتاب موسومہ بہ "ایشیا و یورپ" صفحہ ۹۔

عام طور پر معلوم ہے کہ ہندوستان کی عظیم الشان تہذیب و دولت غیر ممالک کے مہمات پسندوں کو اپنی جانب کھینچتی رہی۔ ہندوستانیوں کی موجودہ پسماندہ حالت میں بھی مستند مبصروں کو عظمت و شوکت کے عناصر دکھائی دیتے ہیں اور وہ تسلیم کرتے ہیں کہ اگر مناسب موقع دیا جائے تو ہندوستانی دماغ یورپین دماغ سے ذرہ برابر بھی کمتر نہ ہوں گے۔[1] یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ ہندوستانی اپنا دماغ معاشی تنظیم و ترقی کے کام میں لگانے کی صلاحیت نہیں رکھتے یا اس سے متنفر ہیں۔ پس اہل ہند کو اس احساس سے مغلوب ہو کر پست حوصلہ نہ بن جانا چاہئے کہ ان میں معاشی ترقی کی صلاحیت مایوس کن اور ناقابل علاج طریقے پر ادنیٰ ہے۔

---

[1] جنرل اسمٹس نے جوہانسبرگ میں ۲۶ اگست ۱۹۱۹ء کو تقریر کرتے ہوئے حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا تھا۔
"میں ہندوستانیوں کو بنظر حقارت نہیں دیکھتا؛ بلکہ ان کی وقعت کرتا ہوں۔ ہندوستانیوں میں بعض ایسے افراد بھی گزرے ہیں جو تاریخ عالم کے مشاہیر میں سے ہیں۔ بعض ہندوستانی نسل انسانی کے ان عظیم ترین قائدوں میں شمار کئے گئے ہیں جن کے جوتے کا تسمہ کھولنے کے بھی میں لائق نہیں ہوں۔"

معاشری و مذہبی آئین و رواج

۱۔ معاشی جدوجہد پر معاشری و مذہبی آئین و رواج کا اثر

معاشی جدوجہد پر معاشری و مذہبی آئین و رواج بہت گہرا اثر ڈالتے ہیں؛ چنانچہ اس باب میں ہم ہندوستان کی معاشی زندگی کی رواجی بنیاد پر بحث کریں گے اور یہ بیان کریں گے کہ ان رواجوں میں سے زیادہ اہم رواج لوگوں کی معاشی ترقی میں کس طرح مدد دیتے یا رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ یہ واقعہ کہ ہندوستان میں معاشی زندگی کی معاشری و مذہبی بنیاد خاص تحقیق چاہتی ہے محتاج توضیح نہیں۔ اس لیے کہ ظاہر ہے کہ ہندوستان کی معاشی زندگی کے مختلف پہلو جس مخصوص شکل اور سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں اس کا باعث ملک کے خصوصی معاشری و مذہبی آئین و رواج ہیں[1]۔

[1] ۔ہندوستان میں لوگوں کی عمرانیاتی زندگی نے حقیت ارضی کے نظاموں اور دیہی زندگی کی تنظیم کو متعین کیا ہے؛ اور اشتراک خاندان اور ذات پات کے طریق قدیم ترین زمانے سے فرد واحد کے حقوق اس خاندان معاشرہ اور انجمن پیشہ یا تجارت کے رکن کی حیثیت سے متعین کرتے آئے ہیں جس سے وہ پیدائشی طور پر وابستہ رہا ہے۔" دیکھو مسٹر جیتھر جی کی کتاب موسوم بہ "معاشیات ہند" صفحہ ۵۰۔

باب ۲

۲۔ ذات پات کا طریق

ذات پات ہندوستانی معاشرے کی سب سے زیادہ قابل ذکر خصوصیت ہے، چنانچہ ہم اس کی بحث کا آغاز "ذات" کی معیاری تعریف سے کر سکتے ہیں۔

ذات کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ "وہ خاندانوں کا مجموعہ یا خاندانوں کا گروہ ہے جو ایک ایسے مشترک نام سے موسوم ہوتا ہے جو عام طور پر کسی خاص پیشے کو ظاہر کرتا ہے یا اس سے وابستہ ہوتا ہے۔ یہ گروہ کسی افسانوی جد یا مورث اعلیٰ کے مشترک اخلاف و وارث ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، خواہ یہ مورث انسانی ہو یا ربانی؛ ایک ہی مقررہ پیشے یا شغل زندگی کی اتباع کا مدعی ہوتا ہے اور مستند اہل الرائے اس کے متعلق یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ایک متجانس قوم یا جماعت ہے کوئی ذات اس معنی میں درون زواجیت رکھتی ہے کہ اس بڑے دائرے کا ایک رکن جو مشترک نام سے موسوم ہو اس دائرے کے باہر بیاہ نہیں کر سکتا۔ لیکن اس دائرے کے اندر بھی عام طور پر متعدد چھوٹے دائرے ہوتے ہیں جن میں سے ہر ایک میں بھی درون زواجیت اور بیاہ کی قید و بند ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ ایک برہمن موجودہ زمانے میں ایسی عورت سے بیاہ نہیں کر سکتا جو غیر برہمن ہو؛ بلکہ یہ ضروری ہے کہ اس کی بیوی کا تعلق بھی برہمن ذات کے اس ذیلی فرقے سے ہو جس میں شوہر شامل ہے اور جس سے باہر شادی نہیں کی جا سکتی"[1]

ہندوستان کی ذات پات کو ان متعدد معاشرتی درجہ بندیوں سے ممیز کرنا ضروری ہے جو تمام قوموں میں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ ان درجہ بندیوں میں نہ تو شدید تفریق ہے اور نہ وہ متعدد فرقوں میں سختی کے ساتھ تقسیم کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں کسی فرد واحد کے لیے ایک معاشرتی طبقے سے دوسرے میں منتقل ہونا مذہباً ممنوع بھی نہیں قرار دیا گیا ہے۔ علیٰ ہذا شادی بیاہ کے بارے میں بھی کوئی بندشیں نہیں ہیں اور ہر شخص اپنے حسب دلخواہ پیشے یا مشغلۂ زندگی کا انتخاب کرنے میں آزاد اور خود مختار ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف ذات پات کے تحت ہندو سماج، بیشمار اور ایک دوسرے سے

[1] دیکھو امپیریل گزٹیر آف انڈیا جلد اول صفحہ ۳۱۱۔

لکل الگ چھوٹی بڑی جماعتوں میں منقسم ہے جن کے ارکان کے اعمال پر ذات بندی کے دقیق قواعد کے مجموعے کے ذریعے سے قیود عائد کی جاتی ہیں۔ چنانچہ ان کو یس میں بیاہ کرنے اور دوسری جماعتوں کے ارکان کے ساتھ مل کر کھانے پینے کی ہی عام طور پر ممانعت ہوتی ہے' خاص کر ان لوگوں کے ساتھ جو حیثیت میں متر خیال کئے جاتے ہوں۔ ہندوستان میں "ولادت ہی اٹل طریقے پر انسان کے ل معاشری و خانگی تعلقات کا تعین کرتی ہے' چنانچہ زندگی بھر اس کا کھانا پینا' لباس اور بیاہ سب کام اس فرقے کے رسم و رواج کے تابع ہوتے ہیں جس میں س نے جنم لیا ہو"۔[1]

۴۔ ذاتوں کی تین بڑی قسمیں

ذاتوں کو تین بڑی قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے' یعنی (۱) فعلی (۲) نسلی اور (۳) فرقہ واری۔ ان میں اہم ترین فعلی ذاتیں ہیں جو ان مختلف پیشوں کی نمایندگی کرتی ہیں جو کلوں کے رواج سے پیشتر قدیم زمانے میں اختیار کئے گئے تھے۔[2] فعلی ذاتوں کی مثال برہمن یا پروہت فرقے اور تجارتی ذات یا بنیے ہیں جن میں دوسرے گروہوں کے منجملہ پنجاب کے

---

[1] دیکھو "امپریل گزیٹیر آف انڈیا" جلد اول صفحہ ۳۲۳۔ ڈاکٹر گھوریئے ہندوستان کی ذات پات کی سب ذیل اہم خصوصیات بیان کرتے ہیں:- (۱) معاشرے کی تقسیم گروہوں میں؛ (۲) مذہبی حکومت ۳) کھانے پینے میل جول پر قیود اور بندشیں؛ (۴) مختلف فرقوں کی سیول اور مذہبی پابندیاں اور ان کے ماص حقوق؛ (۵) پیشوں کے انتخاب کا فقدان؛ اور (۶) بیاہ پر قیود۔ دیکھو ان کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان میں ذات اور نسل" صفحہ ۲ تا صفحہ ۱۔

[2] اشتراک پیشہ کو ذات پات کی واحد بنیاد بمشکل خیال کیا جا سکتا ہے؛ اس لیے کہ اگر بقول سانارٹ ایسا ہوتا تو (ذات پات کا) یہ آئین ذیلی تقسیم اور افتراق کا کمتر میلان ظاہر کرتا؛ اور شروع میں جو عنصر وجہ اتحاد تھا آخر میں بھی ایکا اور ارتباط برقرار رکھتا۔ اگر اشتراک پیشہ' ذات پات کی واحد یا اہم بنیاد ہوتا تو ایک مقررہ پیشے میں کام کرنے والے سب اشخاص صرف ایک ہی ذات کے کہلاتے۔ لیکن جیسا کہ ہم جانتے ہیں صورت حال ایسی نہیں ہے۔ چنانچہ ایک ہی علاقے کے کل جلاہے ہمیشہ ایک ہی ذات سے تعلق نہیں رکھتے"۔ دیکھو رس لے کی تصنیف محولہ بالا صفحہ ۲۶۹ تا صفحہ ۲۷۰۔

کھتری اور راجپوتانہ کے اگروال اور راوسوال بھی شامل ہیں۔ کل فعلی ذاتوں کی تفصیل پیش کرنا تکلیف دہ اور دقت طلب کام ہے۔ ان میں جلاہے، نجار، کمھار اور زرگر جیسے دست کار، چرواہے، حجام اور دھوبی جیسے دیہی خدمت گار اور نجومی، تیلی، جانور پالنے والے اور گویئے جیسے دوسرے متعدد پیشے والے شامل ہیں۔ نسلی ذاتیں ہندوستان کے ہر گوشے میں کثرت سے پھیلی ہوئی ہیں۔ مثلاً بنگال میں راج بنسی، چانڈال وغیرہ، صوبۂ متحدہ اور بہار میں بھار، چیرو وغیرہ، راجپوتانہ اور پنجاب میں جاٹ، جوجرا اور میو؛ بمبئی میں کولی اور مہار؛ اور مدراس میں نائر اور پریّیان وغیرہ۔ فرقہ وار ذاتیں وہ ہیں جو مذہبی فرقوں سے پیدا ہوئی ہیں، مثلاً بمبئی کی لنگایت ذات[1] جس کا بانی سب انی ایک مذہبی قائد تھا جو برہمنوں کی سیادت کا منکر تھا۔

۴۔ ذات پات کی ابتدا۔ جیمس مل کے نظریے کے مطابق ذاتوں کی شکل میں معاشرے کی ابتدائی تقسیم کسی الہامی فرد کا کام ہوگا جس کو باقاعدہ تقسیم عمل کے فوائد کا پہلے سے علم ہوگیا ہوگا۔ جیمس مل یہ خیال کرتے تھے کہ اس امر کا باعث کہ ایک ذات دوسری ذات کے تابع تھی ایک طرف قوم کے کمزور ارکان کا توہم پرستانہ خوف اور دوسری طرف اقتدار حاصل کرنے کی پرمکر خواہش تھی جو مذہبی پیشواؤں کی امتیازی خصوصیت ہے؛ چنانچہ یہ طبقہ اپنی حیثیت سب سے اونچی ذات کی قرار دینے میں کامیاب ہوگیا جس کی تعظیم و تکریم دوسری سب ذاتوں پر واجب تھی۔ برہمنوں یعنی مذہبی جماعت کو آسمانی بلائیں ٹال دینے اور رد کرنے کی قابلیت کا دعویٰ تھا لیکن جنگ کی تباہ کاریاں بھی کچھ کم خوف کے قابل نہ تھیں، اس لحاظ سے برہمنوں کے بعد فوجی جماعت کو اہمیت میں دوسرا درجہ حاصل ہوگیا وقس علیٰ ہذا۔

ام، سانارٹ کے نظریئے کے مطابق "ذات ان قدیم آریائی آئین اور رواجوں کی معمولی ترقی ہے، جنھوں نے یہ شکل اپنے آپ کو ان حالات کے مطابق[2]

---

[1] دیکھو ان سائیکلو پیڈیا آف ریلیجن انڈ ایتھکس جلد سوم۔ صفحہ ۲۳۔

[2] " " " " برٹانیکا گیارھواں ایڈیشن مضمون بعنوان "ذات پات"۔

باب

بنانے کی کشاکش کے سلسلے میں اختیار کرلی جن سے وہ ہندوستان میں دوچار ہوئے"
ام، سانارٹ نے اس نظریے کو بڑی حد تک اس بنیاد پر قایم کیا ہے کہ ہندوؤں کی معاشرتی تنظیم یونانیوں اور رومیوں کی معاشرتی تنظیم سے ان کی قومی نشوونما کی ابتدائی حالتوں میں عام طور پر ملتی جلتی ہے اور اگر کچھ فرق ہے تو صرف یہ کہ ہندوستان میں امتیازات سخت اور غیر تغیر پذیر بن گئے اور یورپ میں اس قسم کی کوئی بات وقوع پذیر نہیں ہوئی۔

ام، سانارٹ کے نظریۂ ذات کے بنیادی عناصر یہ معلوم ہوتے ہیں:۔

"ایک وسیع رقبے پر آبادی کی تقسیم کی وجہ سے گروہوں کے بڑھ جانے کا میلان؛ قدیم و وحشی اقوام سے میل جول کی بنا پر نسل و خون پر فخر کرنے کی ہمت افزائی؛ رسموں کے انجام دینے کے لیے پاک صاف رہنے کا خیال جس کی بنا پر دیسی باشندوں سے تو دستی محنت کے پیشوں میں کام لیا جاتا تھا اور اس کے برعکس آریوں کے لیے اعلیٰ پیشے اور دھندے محفوظ تھے؛ مسئلہ تناسخ کا اثر جو ہر شخص کو قانون کرما کی بنا پر ایک معین حیثیت دیتا ہے؛ منتشر گروہوں کو یکجا کرنے کے لیے کسی سیاسی قوت کی عدم موجودگی؛ اور برہمنی نظام کا بتدریج ایک مستند و مستحکم حیثیت حاصل کرلینا۔"

۵۔ ذات کے طریقے کی سختی۔ ذات کی ابتدا اور اس کے مابعد ارتقا کے متعلق مختلف نظریوں کے بارے میں یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ وہ سب کم و بیش ناکافی ہیں، اس لیے کہ وہ اس چیز کی پوری طرح توضیح کرنے سے قاصر ہیں جو خاص طور پر تشریح طلب ہے، یعنی ہندوستان میں ذات کے طریقے کی

101

لہ۔ دیکھو رس لے کی تصنیف محولۂ بالا، ۲۶۔ ذات پات کی حال کی ترقی کی توجیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جی، یس، گھوریئے یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ حکومت کی سخت واحد نگرانی کا فقدان، قانون اور رواج کے یکساں معیار کو نافذ کرنے کے بارے میں حاکموں کی عدم رضامندی، مختلف گروہوں کے رواجوں کے اختلاف کو درست و معتبر قرار دینے میں حاکموں کی مستعدی، ان سب امور نے جماعتوں اور گروہوں میں تفریق و اختلاف کے میلان کو اور تقویت دی اور ہر گروہ میں اتحاد اور اشتراک احساس کے جذبے کو فروغ دیا۔" ڈاکٹر گھوریئے کا یہ بھی خیال ہے کہ "دو گروہوں کی کثرت اور سارے نظام کے کامل ہونے کا باعث ہندو دماغ کی

ایک

بے نظیر سختی۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ سختی اس وقت اور بھی زیادہ ہو گئی جبکہ بارھویں اور اٹھارھویں
صدیوں کے مابین مسلمانوں کے حملوں کی پے در پے موجوں کے بالمقابل اس نظام میں
انجماد پیدا ہو گیا، اور اس طرح اسلام کے اساسی طور پر جمہوری اثرات کے مقابلے
میں بہت ہی غیر متوقعہ طریقے پر ردعمل ہوا۔ یہ خیال کرنے کی وجہ ہے کہ اپنی نشو و نما کی
ابتدائی حالتوں میں ذات کا طریقہ کم از کم پہلی تین ذاتوں کے تعلق کی حد تک سیال
نوعیت رکھتا تھا۔ یہ ابتدائی سیال نوعیت ٹھیک کس طرح مفقود ہو گئی ایک ایسا
عقدہ ہے کہ جو کبھی حل ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ ممکن ہے کہ شودر جاتی سے ابتداً جو نیچ پن
منسوب کیا جاتا تھا، خواہ اس وجہ سے کہ وہ اصل و قدیم مفتوحہ قوم (دسی یوس) کی
نمایندہ تھی یا کسی اور سبب سے، اس نے ایک ایسے خمیر کا کام دیا ہو جو رفتار زمانہ
کے ساتھ کل معاشری نظام میں سرایت کر گیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آریوں میں مذہبی
رسوم اور نذر و نیاز کو مناسب طریقے پر ادا کرنے کو جو عظیم اہمیت دی جاتی ہے
اس کی وجہ سے اقتدار اس جماعت کے ہاتھوں میں مرتکز ہو گیا ہو جو مذہبی امور سر انجام
دینے کے لیے مخصوص تھی، اور اس لحاظ سے یہ جماعت اس اقتدار کو اپنے ذاتی معاشری
اغراض کی تکمیل و ترقی میں استعمال کرنے کے قابل ہو گئی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ام سابانڈ
کے بیان کئے ہوئے متعدد دوسرے عناصر جن کا اوپر حوالہ دیا جا چکا ہے، آخری نتیجہ
پیدا کرنے میں اپنا واجبی حصہ رکھتے تھے۔ اس خیال کو تسلیم کرنا مشکل ہے کہ ہندوستان
میں معاشرے کی ایک مقررہ اور پر سکون حالت، متعدد نسلوں تک اعمال و افعال
کے تسلسل کو یقینی بنا کر اور اس طرح وراثت و توارث کے اصول کو متعین کر کے ذات
کی ترقی کی موئد ہوئی[1]؛ اس لیے کہ اسی کے مماثل سکونی حالات تمام یورپ میں
"صنعتی انقلاب" سے پیشتر موجود تھے اور اس کے باوجود ان کی وجہ سے وہاں کوئی

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:- یہ خاصیت ہے کہ وہ مختلف اصناف و انواع قایم کرتا اور معاملات کو ان کے منطقی
نتیجے تک پہنچاتا ہے، چنانچہ ہندوؤں کے ادبیات، فلسفہ اور مذہبی فرقوں کی بھی امتیازی خصوصیت ہے۔"
دیکھو جی، ایس گھوریے کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان میں ذات اور نسل" صفحہ ۱۴۲ تا صفحہ ۱۴۸

لہ۔ دیکھو واڈیا اور جوشی کی محولہ تصنیف صفحہ ۱۲۴۔

باب ۴

ایسا معاشری نظام رونما نہیں ہوا جو سختی کے اعتبار سے ذات کے طریق کے مقابلے میں کوئی نظیر پیش کرتا ہو۔ علیٰ ہذا اسی کے مماثل سبب کی بنا پر ہمیں اس استدلال کو ناکافی قرار دے کر مسترد کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ ذرائع آمد و رفت کی غیر ترقی یافتہ حالت اور عوام کی جہالت نے میل جول میں مزاحمت و دشواری پیدا کر کے ذات کے نظام کو مضبوط و استوار بنا دیا۔[1] خلاصہ یہ کہ یہ توجیہات زیادہ تر اس بات کا اشارہ کرتے ہیں کہ سختی کی جانب تحریک ایک مرتبہ شروع ہو جانے کے بعد مساعدت زمانہ سے کس طرح آگے بڑھتی گئی۔ لیکن ان سے یہ مترشح نہیں ہوتا کہ اس سختی کا آغاز کیونکر ہوا۔ پس بحیثیت مجموعی ذات کے نظام کی ابتداء و ترقی کے مسئلے کو یہ سمجھ کر ترک کر دینا چاہئے کہ وہ ایک " ناقابل حل اور بے فائدہ چیستاں " ہے:

102

۴۔ ذات کے طریقے کی خوبیاں اور اس کے نمایاں کام

ان جاندار اصول میں سے ایک اصول جس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ذات پات کو حق بجانب قرار دیتے ہیں "تقسیم عمل" کا اصول ہے جو معاشی کارکردگی و قوت میں اضافہ کرتا ہے۔ اکثر ملکوں میں کسی نہ کسی وقت پیشے نظری طور پر نہیں تو عملاً موروثی ہوتے تھے، اور اس توارث کے نظام سے بڑے ہی فوائد وابستہ ہوتے تھے، چنانچہ اس کے تحت بیٹا اپنے خاندانی پیشے کے رموز فطری پر حاصل کر لیتا تھا، اور کم سے کم محنت سے گھر کی پرسکون و سہولت بخش فضا میں اور باپ کی شفقت آمیز نگرانی میں اس پیشے میں ملکہ و مہارت بڑھاتا اور کمال حاصل کرتا تھا۔ یہ چیز ایسے زمانے میں خاص طور پر اہم تھی جبکہ تعلیمات عامہ کا کوئی منظم نظام نہ تھا اور دستی مہارت و مشاقی کی بہت قدردانی ہوتی تھی۔ اس طریقے میں فائدہ یہ تھا کہ باپ کو اپنے کام میں بیٹے کی امداد بہت ارزاں شرح پر ملتی تھی اور بیٹا زندگی سے آسان ترین طریقے پر روشناس ہو جاتا تھا۔ بیٹے کو دستکار کی حیثیت سے باپ کے مرنے پر اس کے اطوار، شہرت اور نیک نامی ورثے میں ملتی تھی اور یہی اس کے مال متروکہ کا اہم ترین جزو ہوتا تھا۔ پیشوں میں منتقلہ مہارت کی

[1] دیکھو دادا بھائی ادر جوشی کی مولفہ تصنیف صفحہ ۱۲۴ تا صفحہ ۱۲۵۔

قدر و قیمت بہت زیادہ تھی اور اصول توارث اس انتقال میں مدد دیتا تھا۔ جس وقت تک اس اصول پر معقول پر فطری طریقے سے عملدرآمد ہوتا رہا اس وقت تک اس پر کوئی اعتراض وارد نہ ہو سکتا تھا؛ لیکن جوں ہی نئے پیشے کا اختیار کرنا نہ صرف معمول سے انحراف بلکہ غلط اور قابل سزا قرار پایا اس وقت سے اس طریق کے ناقابل اعتراض ہونے کی صورت زائل ہو گئی[1]

فعلی یا مذہبی ذاتوں کا مقابلہ عام طور پر یورپ کے دور وسطیٰ کے "حرفتی جتھوں" سے کیا گیا ہے اور ان کو اس لحاظ سے مفید خیال کیا گیا ہے کہ وہ مشترکہ دھندوں سے پیدا ہونے والے باہمی بندھنوں کی شناخت کو فروغ دینے والا ذریعہ تھا۔ یورپ کے قدیم حرفتی جتھوں کی طرح یہ بھی اپنے ارکان کے لیے باہمی رفاہ کی انجمنوں کا کام انجام دیتی تھیں؛ مثلاً کارآموزوں کی تربیت کرنا، ارکان میں ہمدردی پیدا کرنا، نزاعی امور کے تصفیے کے لیے ثالثی کی عدالتیں مہیا کرنا، اپنے ارکان کی اجرت اور نفع کی تنظیم کرنا اور گاہ گاہ مصیبت و تکلیف میں ان کی مدد کرنا۔[2] "غرض ذات کا نظام ہندو کے لیے کلب، مزدور سبھا، رفاہی انجمن اور آدم دوست جمعیۃ کا کام دیتا تھا۔"[3] لیکن یہ ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ یورپ کے حرفتی جتھے، ذات کے طریقے سے بعض اہم اعتباروں سے مختلف تھے۔ اولاً یہ کہ حرفتی جتھا ارادی اور خود اختیاری سا جتھا تھا، اور ذات پات میں یہ بات نہیں تھی۔ دوسرے یہ کہ گو حرفتی جتھوں کے ارکان کے لڑکوں کو کارآموزوں کی حیثیت سے بہت سہولتیں حاصل تھیں، پھر بھی ان جتھوں کے بگڑ کر اجارہ دار سبھاؤں کی حیثیت اختیار کر لینے سے پیشتر تک دوسروں کو بھی مشروط طریقے پر داخل کر لیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں آپس میں بیاہ کرنے کی اجازت تھی اور یہ خالصاً معاشری اثر و احساس کا معاملہ تھا۔ لیکن ہندوستان میں کسی خاص

---

[1] دیکھو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی محولۂ بالا عبارت۔

[2] دیکھو جٹرجی کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۹۲

[3] دیکھو یس، تو کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان کا تصور" صفحہ ۲۶۳۔

ذات میں داخل ہونا بالکل توارث کا معاملہ ہے، اور آپس میں بیاہ کرنے کی سختی کے ساتھ ممانعت ہے۔ علاوہ ازیں یورپ کے حرفتی جتھوں کی حد تک "مشترک پیشہ ہی اصل بندھن تھا، جو آخر کار امیر اور بادشاہوں کے خلاف متحد کرنے والا قوی ذریعہ تھا اور ہندوستان کی ذاتوں کی طرح نفاق و کمزوری کی علامت نہ تھا۔" بعض مصنفوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "ممکن ہے کہ دور وسطیٰ کے یورپ کے حرفتی جتھوں کی طرح ذاتوں نے صنعت و حرفت کو ترقی و فروغ دیا ہو" اور یہ کہ "اس نظام نے دست کار جماعتوں کی عجیب و غریب میکانکی مہارت و ہنرمندی کو غیر ملکی مسابقت کی زد سے محفوظ و قائم رکھا ہو۔"[1] گو اس نقطۂ خیال میں یقیناً کسی حد تک صداقت ہے، تاہم یہ بھی قطعی ممکن ہے کہ موجودہ زمانے میں ہندوستانی حرفتوں کی امتیازی خصوصیت یعنی زمانے کے حالات کے مطابق چلنے اور ترقی کرنے میں کوتاہی کا باعث ذات کے طریقے کی قید و بند ہو جس نے فطری ترقی میں لازمی طور پر رکاوٹ پیدا کر دی ہے۔[2]

ذات پات کی حمایت میں اس امر کو تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ آریوں کے حملے کے زمانے میں اسی نے مختلف قوموں کے تعامل اور مختلف تہذیبوں کے باہمی عمل میں مدد دی۔[3]

---

[1] دیکھو واڈیا اور جوشی کی تصنیف محولۂ بالا صـ ۱۲۶ ۔

[2] "حرفتی جتھا پھیل سکتا اور ترقی کر سکتا ہے؛ وہ صنعت کارانہ جذبات کو ابھرنے کا پورا موقع دیتا ہے؛ چنانچہ یہ حرفتی جتھوں کا اتحاد ہی تھا جس نے دور وسطیٰ کے آزاد شہر پیدا کئے۔ لیکن ذات ایک گھٹیا قسم کا نظام ہے؛ وہ امتیاز و تفریق کے ذریعے ترقی کرتا ہے لہٰذا اس کی ترقی کا ہر قدم، اس کی ترقی کرنے یا اس صنعت کا تحفظ کرنے کی قوت کو جس پر عمل کرنے کی وہ مدعی ہے ضعیف کر دیتا ہے۔" دیکھو رسلے کی محولۂ بالا تصنیف، صـ ۲۷۰

[3] ذات کا طریقہ دراصل نہ آریائی نظام ہے نہ ڈراویڈی، بلکہ اس کو زمانے کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے جبکہ مختلف قسم کی قوموں کو آپس میں مل جل کر رہنا سہنا پڑتا تھا رائج کیا گیا۔ ایک ایسی قوم کی تہذیب و شائستگی کو محفوظ کرنے کا واحد طریقہ جس کے لیے اس بات کا بڑا خطرہ تھا کہ وہ دیسی باشندوں کی کثیر تعداد کے ادہام میں جذب ہو جائے گی، یہ تھا کہ اس زمانے کی تہذیب و نسل کے اختلافات کو فولادی بندھنوں سے سختی کے ساتھ

باب ۴

اس طریق نے ہندو سماج کو غالباً اس قابل بھی بنایا کہ خود کو تباہی میں مبتلا کئے بغیر سیاسی حملے کے صدمات برداشت کرے۔ علاوہ ازیں یہ بھی تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ ذات کے طریقے نے ہندو سماج کی اساسی ثبات پذیری وقناعت گزینی کی جانب رہبری کی۔ کچھ سال ادھر تک ہندوستان میں کسی شخص کی حیثیت اور اس کے پیشے کا تعین سراسر اس کی ولادت کے ذریعے سے ہوتا تھا چنانچہ اس کی بدولت وہ اس پریشانی اور بے چینی سے محفوظ رہتا تھا جو موجودہ معاشرے میں پیشے کے انتخاب میں لاحق ہوتی ہے۔ چونکہ کسی شخص کے پیدا ہوتے ہی اس کے پیشے کا تعین ہو جاتا تھا۔ اس لیے وہ رشک وحسد کی زد سے اور مقاصد میں ناکامی و مایوسی اٹھانے سے محفوظ رہتا تھا۔

۷۔ ذات کے طریقے کی حمایت اس کی موجودہ شکل میں نہیں کی جا سکتی

لیکن ذات کے طریقے کی موافقت وتائید میں جو کچھ کہا جا سکتا ہے اس کا اطلاق صرف اس زمانے پر ہوتا ہے جبکہ اس طریقے میں ایسی گڈ مڈ اور بدنظمی پیدا نہیں ہوئی تھی جیسی کہ اب پائی جاتی ہے۔ ذات اپنی موجودہ متبدلہ حالت میں صرف غیر مشروط مذمت کی مستحق ہے۔ یہ ہر جہتی ترقی کے راستے کی ان عظیم مزاحمتوں میں سے ایک ہے جس کو انسان کی گمراہ ہنرمندی نے خود اپنی تباہی کے لیے پیدا کیا ہے۔ اس کی ابتدائی خوبیاں خواہ کچھ ہی ہوں، موجودہ زمانے میں تو وہ بگڑ کر ظلم وتعدی اور عدم رواداری کا ایک زبردست آلۂ کار بن گئی ہے اور ایسی مذموم قوت کی حیثیت رکھتی ہے جو معاشری وسیاسی تفریق واختلاف اور کمزوری پیدا کرتی ہے[1] اگر موجودہ زمانے میں ہندوستانی قومیت کی یہ تعریف

104

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:۔ دبایا جائے۔ لیکن بدقسمتی سے، یہ طریقہ جو نظام معاشرت کو تباہی وہلاکت سے محفوظ رکھنے کے لیے اختیار کیا گیا تھا آخر کار اس نظام کی ترقی میں سدراہ بن گیا۔"

دیکھو رادھا کرشنن کی کتاب "ہندوستانی فلسفہ" جلد اول صفحہ ۱۱۱ تا صفحہ ۱۱۳

[1] کسی ضلع یا شہر کی آبادی مختلف قوموں کا مجموعہ ہے جو تقریباً نوعی فرق رکھتی ہیں اور ایسے انسانوں پر مشتمل ہے جو نہ تو ایک دوسرے کے ساتھ کھا اور پی سکتے ہیں اور نہ آپس میں بیاہ کر سکتے ہیں۔ یہ کہنا

باب

کرنا بجا ہے کہ وہ رنگ برنگ دانوں کی ایک مالا ہے جو ایک رشتے میں منسلک نہیں ہے تو اس کا باعث بہت بڑی حد تک ذات کے طریقے کا عملدرآمد ہے۔ ہندوستان میں ذات پات نے ایک طاقتور قومیت کے ارتقا میں رکاوٹ پیدا کی؛ اس کے برخلاف دوسرے مقامات میں ایک مشترک علاقے میں رہنے سہنے والے مختلف باشندوں کے بے روک ٹوک میل جول نے ایک زبردست قومیت کو فروغ دیا ہے۔ یہ ایک بہت ہی بڑی سیاسی مشکل ہے جس میں ہندوستانی موجودہ زمانے میں مبتلا ہیں اور ماضی میں بھی یہ عام طور پر سیاسی کمزوری کا سبب رہی ہے۔ چنانچہ پروفیسر جادو ناتھ سرکار کے اس استدلال میں بہت کچھ قوت ہے کہ مرہٹہ سلطنت کے زوال کا باعث بڑی حد تک ذات کے ولولے کی غیر مفید ترقی تھی۔ ہندوستانیوں کے لیے سیاسی آزادی کے بغیر اپنی معاشی مراد تمام و کمال حاصل کرنا غیر ممکن ہے؛ اور ذات پات 'سیاسی سوراج حاصل کرنے کی راہ میں بلاشبہ بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

۸۔ درون زواجیت اور نسل کا بگاڑ ذات کے طریقے کی موافقت میں جو امور پیش کئے جاتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ بعض اعلیٰ درجے کے نسلی سلسلوں کو خالص حالت میں محفوظ رکھتا ہے' اور یہ کہ تنہا ہندوؤں کی قوم ہی نے غیر مخلوط حالت برقرار رکھنے کے طریقے اختیار نہیں کئے ہیں بلکہ دوسروں نے بھی ایسا کیا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ کسی دوسری جگہ درون زواجیت یا ذات کے دائرے کے اندر شادی کرنے کا طریقہ اس قدر شدت کے ساتھ نہیں پایا جاتا جتنا کہ ذات کے طریقے میں پایا جاتا ہے۔

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ۔ مبالغہ نہ ہوگا کہ ذات کے طریقے اور برطانوی نظم و نسق کے اثر کی وجہ سے انسانوں میں زندگی کے طبیعی تعلقات کی حد تک اتنا ہی کم اشتراک پایا جاتا ہے جتنا کہ حیوانیاتی باغ کے ساکنوں میں۔ دیکھو باب ششم، خاکہ فلر کی محولۂ بالا تصنیف۔ گو اس بیان میں صورت حال کو کسی قدر مبالغے کے ساتھ اور بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے؛ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ہندوستانی آبادی کی غیر معمولی طور پر غیر متجانس نوعیت کا باعث بڑی حد تک ذات پات ہے۔

چنانچہ اس کی وجہ سے ایک ہی دائرے کے اندر خاندانوں کا دائمی اختلاط ہوتا رہتا ہے اور انجام کار اعلیٰ درجے کے نسلی سلسلوں میں ضعف و انحطاط پیدا ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں گو بعض ذاتوں میں مردوں کی زیادتی اور بعضوں میں عورتوں کی کثرت ہے لیکن ذات پات جنسی مساوات کے حصول میں مزاحم ہوتی ہے، اس لیے کہ ایک ذات کی کمی کو دوسری ذات کی زیادتی سے پورا نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ یہی ایک حد تک اس معاشرتی خرابی کی ذمہ دار ہے کہ بھاری جہیز دیا جاتا ہے اور بعض مقامات مثلاً پنجاب میں اب تک طفل کشی رائج ہے۔

105

۹۔ ذات پات استعداد اور فعل کی مطابقت میں مزاحم ہے

ذات پات کے سب سے زیادہ شدید نقائص میں سے ایک یہ ہے کہ وہ جبلی قابلیت اور جد و جہد میں ایسی مطابقت و مناسبت پیدا ہونے میں حائل ہوتی ہے جو معاشی ترقی و خوش حالی کے لیے ایک اساسی عنصر ہے۔" اگر کسی قوم کو محض پیدائش کے امر اتفاقی کی بنا پر اور بلا لحاظ اس کے کہ ان کے طبائع و اوصاف کیا ہیں مختلف حلقوں میں سختی کے ساتھ تفریق کر کے تقسیم کر دیا جائے اور اس کے ساتھ ان کو اس پیدائشی حق سے محروم کر دیا جائے کہ وہ اپنے فطری اوصاف اور قابلیتوں کو انتہائی ممکنہ حد تک ترقی دیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس قوم کو وہ سب سہولتیں عطا کرنے سے انکار کیا جا رہا ہے جو بصورت دیگر قومی دولت و خوش حالی کے ذخیرے میں اضافہ کرتیں۔ ہم نہیں جانتے کہ نامناسب کاموں پر اشخاص کو مقرر کر کے لوگوں کی معاشی جد و جہد کو کس قدر نقصان پہنچایا جا رہا ہے، اس لیے کہ اس کی وجہ سے سب کو مساوی مواقع نہیں ملتے۔[۱]

۱۰۔ محنت و اصل کی عدم نقل پذیری

ایک اور بڑی خرابی یہ ہے کہ ذات پات، اصل و محنت کی آزادانہ نقل پذیری میں مزاحم ہوتی ہے۔ محنت کی نقل پذیری میں یوں مزاحمت ہوتی ہے کہ نقل مقام یا نقل پیشہ وقت طلب بنا دیا گیا ہے، جیسا کہ دستی صنعتوں کے قدیم طریقے کے تحت ہوتا تھا، دست کار

[۱] دیکھو پیس، وی کینکر کی کتاب موسوم بہ "معاشیات ہند"۔

باب

اپنا ذاتی اصل لگاتا ہے، اس لیے محنت کی عدم نقل پذیری کے معنی لازمی طور پر اصل کی عدم نقل پذیری کے بھی ہیں۔ علاوہ ازیں یہ طریقہ سخت غیر مسابق جماعتیں قایم کرنے کا موقع بھی بہم پہنچاتا ہے؛ چنانچہ اس کے نتیجے کے طور پر بعض پیشوں میں افراد کی ضرورت سے زیادہ تعداد پائی جاتی ہے اور بعضوں کو بے جا فائدہ پہنچ جاتا ہے جو ذات کی دیواروں کی آڑ میں استواری کے ساتھ پناہ گزیں ہوتے ہیں اور یہ دیواریں ان کو بیرونی مسابقت سے مصنوعی طریقے پر محفوظ رکھتی ہیں۔

۱۱۔ ذات کا طریقہ بڑے پیمانے کے کاروبار میں سد راہ ہے۔

ذات کا طریقہ بڑے پیمانے کے کاروبار کی راہ میں مختلف طریقوں سے مزاحمت پیدا کرتا ہے۔ اولاً یہ کہ کسی خاص قسم کی محنت کی رسد و طلب میں بسرعت توازن قائم نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ ذات کا طریقہ، عمل کی نازک تقسیم در تقسیم کا مخالف ہے جو موجودہ زمانے کی بڑے پیمانے کی پیدائش کی امتیازی خصوصیت ہے۔ علاوہ ازیں ذات پات کی وجہ سے عقل و ذہانت، دستی محنت اور اصل کو یکجا کرنا دشوار ہے، جو عام طور پر ایک دوسرے سے الگ رہتے ہیں اور ہر ایک جداگانہ ذاتوں سے تعلق رکھتا ہے۔[۱] اس پر طرہ یہ کہ صرف، مقامی اور فرقہ واری ہو جاتا ہے، اس لیے کہ ہر ذات دوسری ذات سے اپنے طرز بود و باش میں غذا، لباس، آلات و ظروف وغیرہ کے گوناگوں اختلافات کی وجہ سے ممیز اور ممتاز ہوتی ہے۔ [illegible] بہت سی مختلف قسموں کی اشیا تیار کرنی پڑتی ہیں؛ لیکن ہر شے چھوٹے پیمانے پر تیار ہوتی ہے۔[۲] نتیجہ یہ کہ

۱۔ ہندوستان کی قدیم سرمایۂ مشترک کی بنک کاری کی ناکامی کا سبب منجملہ دوسرے اسباب کے یہ واقعہ قرار دیا گیا ہے کہ ہندوستان کے اس زمانے کے حالات کے تحت کامیابی کے لیے جو چیزیں مؤید ہو سکتی تھیں ان میں سے ایک عام طور پر مفقود تھی اور وہ یہ کہ بنک امکانی طور پر ایسے اشخاص پر مشتمل ہونا چاہیے جو ایک ہی ذات سے تعلق رکھتے ہوں تاکہ اس کا کاروبار پرسکون و پرامن طریقے پر چل سکے۔

۲۔ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ یہ استدلال اس وقت بڑی [illegible] ہو جاتا ہے جبکہ بعض اشکال کی تعداد

باب ۲ 106

گو ملک بڑا اور وسیع ہے، پھر بھی پیدائش دولت کا پیمانہ چھوٹا ہے جس کی وجہ سے بڑے پیمانے کی پیدائش کے کفایات کا حاصل کرنا دشوار رہے۔ ایک اور چھوٹی سی بات یہ ہے کہ معاشرے کے نیچ طبقوں کے معاشی حالات کی اصلاح و ترقی ہمیشہ معیار زندگی کی ترقی کی صورت میں ظاہر نہیں ہوتی؛ اس لیے کہ اس کا موقع ہی نہیں ہوتا کہ نیچ طبقے اونچے طبقوں میں داخل کر لیے جائیں اور اس طرح تقلید کے اثر سے موخر الذکر کا اعلیٰ معیار زندگی اختیار کر لیں۔

۱۲۔ ذات کا طریقہ اور محنت کا وقار۔ ذات کا طریقہ اونچی ذاتوں میں بعض ایسے پیشوں اور محنت کی شکلوں سے نفرت کرنے کا میلان پیدا کرتا ہے جو نیچ طبقے معمولاً سرانجام دیتے ہیں۔ اس طرح یہ طریقہ ان کو اپنی معاشی حیثیت و حالت کی اصلاح و ترقی سے باز رکھتا ہے اور اس خرابی کی جڑیں مضبوط کر دیتا ہے جو بعض نام نہاد شریف پیشوں میں افراد کی کثرت سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ یورپ کے لوگوں کو محنت کے وقار کے متعلق کوئی غلط فہمی نہیں ہے، یعنی میلان یہ نہیں ہے کہ کام کو بہت بڑا درجہ دیا جائے بلکہ یہ کہ اس کو کم کیا جائے اور زیادہ مساوی طریق پر تقسیم کیا جائے۔ لیکن اسی کے ساتھ ہر شخص اپنی مادی خوش حالی کو ترقی دینے کی غرض سے اپنے حسب دلخواہ پیشہ اختیار کرنے کی کامل آزادی رکھتا ہے؛ بحیثیت مجموعی کسی قسم کی دیانتدارانہ محنت کو بذاتہ ذلیل و حقیر نہیں خیال کیا جاتا اور آبائی پیشے کے ماسوا کوئی دوسرا پیشہ اختیار کرنے کی وجہ سے کوئی شخص ذات سے باہر نہیں ہو جاتا اور نہ اس کا حقہ پانی بند کیا جاتا ہے۔ یہ چیز محنت و اصل کی نقل پذیری کو ترقی دیتی ہے اور معاشی کارکردگی و قوت میں اضافہ کرتی ہے۔ ذات پات میں ایک اور نقص ان میلانات کی موجودگی سے رونما ہوتا ہے جو زرعی و صنعتی پیدائش میں اصلاح و ترقی کے بعض طریقوں کو استعمال کرنے کے خلاف پائے جاتے ہیں؛ چنانچہ ہڈی، مچھلی اور فضلہ کو زرعی زمین کے لیے کھاد کے طور پر استعمال کرنے کے بارے میں

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے جیسا کہ بعض ذاتوں میں پایا جاتا ہے۔

اکثر ذاتوں کو اعتراض ہے۔

۱۳۔ ذات کا طریقہ اصول مساوات کے خلاف ہے

ذات کا طریقہ مساوات کے فائدہ رساں اصول کی نفی کرتا ہے اور اونچی اور نیچی دونوں ذاتوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔ وہ اول الذکر میں برتری کا غلط اور گمراہ کن احساس پیدا کرتا ہے اور موخر الذکر میں ایسی دماغی کیفیت پیدا کر دیتا ہے جو خودداری کے نشوونما کے لیے مہلک ہے۔ اس کی انتہائی مثال نیچ یا اچھوت طبقے پیش کرتے ہیں جو ناشنیدہ محکومیت سے سرنگوں ہیں اور متعدد معاشری و معاشی پابندیوں اور مجبوریوں میں مبتلا ہیں۔ اس طریق کا بدنصیب شکار "معمولی تجارتی کاروبار میں ہمیشہ گھاٹے میں رہتا ہے' اس وجہ سے کہ وہ کسی ایسی دکان میں داخل ہونے یا ایسی سڑکوں سے گزرنے کے قابل نہیں ہوتا جہاں دوکاندار رہتے ہیں۔ معاشرے سے اخراج یا حقہ پانی بند کرنے کا طریقہ اس قدر مبتذل اور قدیم ترین زمانے سے رائج چلا آرہا ہے کہ اس کی وجہ سے جوانمردی' آزادی اور اپنی آپ مدد کرنے کی صلاحیت میں فطرتاً بہت بڑی مزاحمت پیدا ہوتی ہے[1]

۱۴۔ ذات پر مغربی تہذیب کا اثر۔

مغربی خیال کا اثر اس قدر پھیل گیا ہے اور تہذیب و تمدن کے جدید آلات (یعنی ریلوں) کا جال اس قدر وسیع پیمانے پر بچھ گیا ہے کہ وہ ذات پات کے قید و بند کو کسی حد تک توڑ رہا ہے۔ بیرونی دنیا سے گاؤں کے الحاق اور تجارت و جدید صنعت کی ترقی کے باعث اشخاص کی بڑی تعداد اپنے قدیم روایتی پیشوں کو ترک کرنے اور نئی نئی نوکریوں' معدنوں اور نئے کارخانوں میں کام حاصل کرنے میں فائدہ اور سہولت محسوس کر رہی ہے۔ اونچی ذات کے ارکان معاشی حالات کے دباؤ کی وجہ سے ایسے پیشے اختیار کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں جو اب تک بالکل نیچ طبقوں کے لیے مخصوص تھے۔ مثلاً اکثر برہمن خیاطی' تجارت اور دوکانداری وغیرہ

---

[1] دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ (Moral and Moterial Report) (اخلاقی و مادی ترقی کی کیفیت) شایع شدہ سنہ ۱۹۲۳ء

باب

پیشوں میں کام کر رہے ہیں۔ اس لحاظ سے پیشہ اب ذات کی یقینی علامت نہیں رہا۔ ریلوں کے ذریعے سے سیاحت، کرنے کی ضرورت نے غذا، لباس اور میل جول کی بعض بندشوں کو کمزور کر دیا ہے، اور اس عمل کو مغربی تعلیم نے اپنے مساوات قائم کرنے والے میلانات کے ذریعے سے مزید تقویت پہنچائی ہے[۱۸]

مغربی تعلیم و تہذیب، جامعاتی و کلیاتی زندگی جہاں نیچ ذات کا آدمی اونچی ذات والے کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا اور چلتا پھرتا ہے، بڑے شہروں کی ترقی،

۱۸۔ دوسری ذاتوں کے ساتھ کھانے پینے اور ملنے کے متعلق قواعد کا انحصار رسمی نجاست کے اس مابعد الطبیعی نظریئے پر ہے جس میں متعدد مستثنیات کو تسلیم کیا گیا ہے؛ چنانچہ منو کے زمانے سے یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ ایک عابد و زاہد مسافر کے لیے جب فاقے کا خطرہ ہو تو اس کو اپنی ذات کے قید و بند کو ترک کر دینا چاہئے اور بہترین طریقے سے جو ممکن ہو بھوک رفع کرنی چاہئے۔ موجودہ زمانے میں اور خاص کر ریلوں کی ایجاد کے بعد سے اس سہولت بخش اصول کو برہمن اجتہادیین نے کدو کاوش کے بعد ترقی دی اور مرتب و مدون کیا ہے۔ مثلاً ایک زمانۂ دراز سے یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ "مٹھائیوں کو جو ایک عام اور لچکدار اصطلاح ہے اور جس میں وہ سب متفرق غذائیں شامل ہیں جو ریلوے کے پلیٹ فارم پر بکتی ہیں، تقریباً کسی شخص سے بھی خریدا جا سکتا ہے۔ اسٹیشن پر گاڑی ٹھیرنے کے قلیل وقفے میں تیسرے درجے کے ڈبے کی کھڑکی سے مٹھائی کے خوانچہ والوں کی ذات کے بارے میں مفصل تحقیق نہیں کی جاتی؛ چنانچہ ایک جدید کہاوت اس صورت حال کا خلاصہ اس عملی سوال میں پیش کرتی ہے کہ "اس نے جو کھانا تمھیں دیا وہ تم نے کھا لیا پھر اس کی ذات دریافت کرنے سے کیا حاصل"؟ اسی اصول کے لحاظ سے دانشمند آدمی بہت جلد اس بات کو فراموش کر دیتا ہے کہ برف بھی پانی ہی سے بنایا گیا ہے اور یہ کہ "سوڈا واٹر" چالاکی سے بنائی ہوئی بوتل میں داخل ہونے سے پیشتر معمولی پانی تھا اور گنگا سے لازمی طور پر براہ راست نہیں لایا گیا؛ بعض ست، جو ہرا، رنجوڑ جو طبی اغراض کے لیے استعمال کئے جاتے ہیں گائے کے گوشت کا ایک معین تناسب رکھتے ہیں اور یہ کہ بعض درآمدہ بسکٹ اپنی تیاری کے زمانے میں لازمی طور پر ہر قسم کے بے ذات لوگوں کے ہاتھوں میں سے گزرے ہوں گے۔ علاوہ ازیں وہ اس قدر غیر دانشمند بھی نہیں ہے کہ یہ سوال کرے کہ کتنے قدم کے فاصلے پر اس کا ہمسایہ نجاست پیدا کر سکتا ہے جبکہ وہ بہر صورت مسلسل بارہ گھنٹے ریل کے ڈبے میں اس کے دوش بدوش بیٹھتا ہے"۔ دیکھو

حکمراں قوم کا اثر، اور تشکیک کے جذبے کی ترقی، یہ سب چیزیں ذاتوں کے قیود کو نیست کر رہی ہیں۔ ایک جانب وہ اونچی ذاتوں میں اپنے خاص حقوق پر اصرار کرنے کے میلان کو کم کر رہی ہیں تو دوسری جانب نیچ طبقوں میں یہ میلان پیدا کر رہی ہیں کہ وہ اونچی ذاتوں کی اعلیٰ حیثیت کو بلا چون و چرا تسلیم نہ کریں۔ علاوہ ازیں اس وقت صرف ایک قانون ہے جس کا اطلاق بلا امتیاز و تفریق ادنیٰ و اعلیٰ پر یکساں طور پر کیا جاتا ہے، اور حکومت اب اعلیٰ ذاتوں کے دعووں کی 103 حوصلہ افزائی نہیں کرتی اور نہ سرکاری ملازمت میں اعلیٰ عہدوں پر ان کی ماموری کی موید ہے[1]۔ اس کے برخلاف اب تقررات میں نیچ ذات والوں کو ہی ترجیح دی جاتی ہے، اور ایک طرح یہ ذات کے معکوس طریق کو رواج دیا جا رہا ہے۔ نیچ ذات والوں میں خودداری بڑھتی جا رہی ہے اور وہ متحدہ قومی عمل کے ذریعے سے اپنی قدیم پابندیوں اور معذوریوں کو رفع کرنے کی ضرورت سے واقف ہوتے جا رہے ہیں۔ چنانچہ یہ میلان نیچ طبقوں میں سے سب سے ادنیٰ طبقے یعنی چماروں میں بھی ظاہر ہوا ہے جو اپنے حقوق منوانے کے لیے منظم مساعی عمل میں لا رہے ہیں۔ علاوہ ازیں ہندو مسلم کشیدگی، قدامت پسند ہندوؤں کو بھی معاشرتی اصلاح و مساوات کے خیالات کے اثر کے بہت زیادہ تابع بنا رہی ہے۔ چنانچہ یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ قوم کی حیثیت سے ہندوؤں کے وجود ہی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ وہ اپنی اندرونی تنظیم کریں، جس کے معنی دوسرے امور کے منجملہ یہ ہیں کہ ذات پات کو نیست کردیا جائے یا یہ کہ اس میں کم از کم اس طرح تغیر و تبدل کردیا جائے کہ موجودہ شکل باقی نہ رہے۔ متعدد ہندو قائدوں نے ذات پات کے خلاف جہاد شروع کردیا ہے، چنانچہ گاندھی جی نے ایک تحریک شروع کی ہے

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ۔ رسّل کی تصنیف ص۲۱۹ تا ص۲۲۵۔

[1] ذات پات کے بارے میں برطانوی حکومت کے تغیر پذیر طرزِ عمل کی بابت اور عام برطانوی حکمرانی کے اثر کی نسبت دیکھو جی، ایس گھوریے کی تصنیف محولۂ بالا ص۱۵۸ تا ص۱۶۴۔

جس کا رخ چھوت چھات کی لعنت کو دور کرنے کی جانب ہے۔[1]

۱۵۔ ذات پات کی اندرونی قوت لیکن اس سب کے باوجود یہ خیال کرنا غلط ہے کہ ذات پات مردہ ہو چکی ہے۔ بدقسمتی سے اس کی گرفت اب بھی پوری طرح سخت ہے اور اس کے اثر میں کمی نہیں ہوئی ہے۔ ہندوستانی دماغ پر اس کا تسلط اس درجہ قوی ہے کہ وہ مسلمان جیسی قوموں پر بھی اثر انداز ہوئی ہے جن کے مذہب نے اپنے پیرؤں میں کامل مساوات پر بہت خاص طور پر زور دیا ہے۔ حالیہ واقعات نے ذات پات کے بعض نقائص کی جڑیں بظاہر بہت مضبوط کر دی ہیں؛ خاص کر جدید اصلاحات نے مختلف قوموں کو سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی جد و جہد کا موقع بہم پہنچا کر ان کے درمیان ناخوشگواری اور حسد و عناد کو بڑھا دیا ہے۔ نیچ طبقوں میں عام بیداری پیدا ہونے کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے؛ اگرچہ یہ اکثر صورتوں میں ایک خوشگوار ترقی ہے؛ پھر بھی عملاً بالعموم یہ دیکھا جاتا ہے کہ کسی شخص کی اپنی ذات سے گہری الفت کے معنی یہ ہیں کہ اونچی ذاتوں سے سخت متعصبانہ تنفر کیا جائے اور اس طرح اونچی ذاتوں کے خلاف قدیم کینہ و بغض کی پرورش کرنے میں بہت کچھ قوت ضایع ہو رہی ہے۔ اصلاحات نے جو جدید حقوق لوگوں کو عطا کئے ہیں انھیں بسا اوقات وسیع قومی اغراض کو نظر انداز کر کے تنگ نظری کے ساتھ فرقہ وارانہ اغراض کی تکمیل میں عام طور پر غلط طریقے سے استعمال کیا جاتا ہے؛ اور مختلف ذاتوں سے جو ترقی یافتہ تنظیم اور تقویت یافتہ احساس خود داری کی و بیداری رکھتی ہیں؛ مستقل سیاسی بنکوں کے تیار نظام کے

109

[1] ڈاکٹر امبیڈکر کے اس فیصلے نے جس کا اعلان حال ہی میں کیا گیا کہ وہ اپنے ساتھیوں سمیت ہندو دھرم سے ہٹ جائیں گے اور دوسرا کوئی ایسا مذہب اختیار کر لیں گے جو دھرم پلٹ ہریجنوں سے مساوات کے برتاؤ کا وعدہ کرے، ہندوؤں کو تیز و تند غور و فکر میں ڈال دیا ہے؛ اور کٹر ہندو دھرمت کی ذات پات کی مورچہ بندیوں پر نہایت غیر متوقعہ سمتوں سے شد و مد کے ساتھ حملے کئے جا رہے ہیں۔

۱۱ب

طور پر کام لیا جاتا ہے۔ گو مختلف ذاتیں اپنے سے اونچی ذاتوں کے خلاف آزادانہ طور پر حکایات و شکایات کا دفتر کھولتی ہیں، لیکن وہ اپنے سے نیچی ذاتوں کے ساتھ کامل مساوات کے شرایط پر سلوک کرنے کے لیے عام طور پر تیار نہیں ہیں۔ اکثر سطح سازوں کی طرح وہ اپنے سے اوپر کی ذاتوں کو اپنی سطح کے برابر لانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ برداشت نہیں کرسکتے کہ ان سے نیچے کی ذاتیں ان سے بڑھ کر ان کی سطح کے برابر آجائیں۔ یہ صحیح ہے کہ برہمنیت ہر جگہ مدافعانہ کارروائی کرتی ہے، لیکن برہمنیت کا جذبہ اب بھی قائم و برقرار ہے اور ادنیٰ ذاتوں میں نفوذ کر گیا ہے۔

۱۶۔ ذات پات کی خرابیوں کا علاج۔ جب کوئی شخص ذات پات کی خرابیوں پر غور کرتا ہے تو وہ دل ہی دل میں کڑھتا ہے کہ کاش کوئی طاقت ور اور نیک نہاد آمر مطلق پیدا ہوتا جو موجودہ معاشری عمارت کو مسمار و منہدم کر دیتا اور اس کو زیادہ معقول طریقے پر از سر نو تعمیر کرتا لیکن کسی آمر مطلق کے پیدا ہونے کی توقع نہیں ہے اور یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا کسی آمر مطلق کو کبھی اتنا زبردست اختیار و اقتدار حاصل ہوگا یا نہیں جس کی مدد سے وہ ذات کے طریقے کو نیست کرنے کے عظیم کام کو انجام دے سکیگا۔ ہندوستان کے ذات کے طریقے کو مٹانے کے لیے ایک بہت بڑے پیمانے پر معاشری انقلاب کی ضرورت ہے جو انقلاب فرانس سے بدرجہا زیادہ وسیع اور اس سے بدرجہا زیادہ متغیر کرنے والی قوت رکھتا ہو۔ لیکن اس قسم کا انقلاب بہ مشکل ممکن ہے۔ کوئی ایک ذات نہیں ہے جو تنہا اس کی قیادت کے لیے کافی قوت رکھتی ہو اور کوئی ایک دشمن نہیں ہے جس کا مقابلہ کیا جائے۔ ہر ذات اپنے سے اونچی ذات کی مخالفت کرے گی۔ اس کی مثال ایسی جنگ کی ہوگی جو ایک غیر موجود فوج ایسے دشمن کے خلاف لڑے جو کسی مقام پر موجود نہ ہو، اس لیے کہ یہ دشمن ہر جگہ موجود ہے۔ اس طرح ہمیں اس پامال و غیر دلچسپ نتیجے پر آنا پڑتا ہے کہ تعلیم کی ترقی اور بصیرت و عام روشن خیالی کے پھیلنے کا انتظار کرنا چاہئے، تاکہ وہ ذات کے طریقے کو بے ضرر بنانے کے لیے اس کا شیرازہ

درہم برہم کردے۔ ہم مزید یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ خاص کر طبقۂ اناث میں روشن خیالی کا پھیلنا ضروری ہے؛ اس لیے کہ عورتوں کی جہالت اور ہٹ ان کو قدیم رواج اور بندشوں کا سختی سے پابند رکھتی ہے۔ اسی طرح یہ نہایت اہم و ضروری ہے کہ دیہات میں روشن خیالی پھیلے، اس لیے کہ ہندوستان جیسے ملک میں جس کی آبادی کا بیشتر اور غالب حصہ دیہاتی ہے، اصلاح کی انتہائی سخت مخالفت سے دوچار ہونا پڑے گا۔[1]

۱۷۔ اشتراک خاندانی کا طریقہ ایک اور امتیازی خصوصیت جس کو ہندو سماج کی معمولی حالت تصور کیا جا سکتا ہے "مشترک اور ان بٹے خاندان" کا طریقہ ہے۔ مغربی ممالک میں خاندان، عام طور پر ایک بیوی، ایک شوہر اور ان کے نابالغ بچوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں کسی وقت مقررہ میں غالباً تین تین نسلیں متعدد لاحقین اور رشتہ داروں کے ساتھ یکجا رہتی سہتی ہیں اور ایک ہی خاندان شمار ہوتی ہیں۔ غیر منقسم ہندو خاندان نہ صرف املاک کے لحاظ سے بلکہ غذا اور عبادت کے لحاظ سے بھی عام طور پر مشترک ہوتا ہے۔ خاندان کا رواج، بیاہ، تبنیت و کفالت کی حد تک ہندو قانون اور خاص کر قوانین وراثت و توارث کا سنگ بنیاد ہے۔

۱۸۔ اشتراک خاندانی کی ابتدا اشتراک خاندانی کی ابتدا عمرانیات داں عام طور پر اس ترقی سے منسوب کرتے ہیں جو تمدن نے معاشی نشوونما کی ایک منزل گلہ بانی سے زرعی اور صنعتی منزلوں میں جانے میں کی۔ جس وقت شکار کرنے اور جڑیں کھودنے کی منزل کی جگہ ترقی یافتہ زراعت نے لے لی اس وقت انسان کی محنت، زمین جوتنے، مکان بنانے اور مال متروکہ کی نگہداشت کرنے میں خاص طور پر اہم ہو گئی۔ اس وقت معاشی عمل میں مرد کی حیثیت سب سے

---

[1] ہندوستان کی ذات بندی کی تشریح کے مختلف طریقوں کی دلچسپ بحث کے لیے ناظرین کو ڈاکٹر ایس۔ جی گھوریے کی کتاب موسومہ بہ "ہندوستان میں ذات اور نسل" ص ۱۰۱ تا ص ۱۸۱ کا حوالہ دیا جاتا ہے۔

باب ۶

بڑے حال کی تھی، چنانچہ اسی لیے ہم ابوّتی خاندان پاتے ہیں[1] تا معاشی اسباب کو قرابت کے قوی احساس سے اور ایک ایسے مذہب سے مزید تقویت پہنچتی ہے جو آبا و اجداد کی پرستش پر زور دیتا ہے؛ اور اس طرح یہ آئین و رواج ایک مرکب معاشری و معاشی نظام بن جاتا ہے اور ان بڑے بڑے خاندانوں کی جماعتوں کی روحانی و معاشی خوش حالی اس کا مقصد قرار پاتا ہے جن سے معاشرے نے ترکیب پائی۔ ہندوستان کے مشترک خاندان کا ابوّتی نظام جو آریوں کے قبضے کے بعد ملک کے طول وعرض میں عام طور پر رائج ہو گیا تھا، قدیم یونانیوں اور رومیوں کے نظام سے جس کو "پدری اقتدار" (Patria Potestas) کہتے تھے، قریبی مشابہت رکھتا ہے۔ چنانچہ اسی کے بالمقابل ہندوستان میں خاندان کے بزرگ ترین رکن کو بہت بڑا اقتدار عطا کیا گیا ہے جس کی مدد سے وہ خاندان کے کل معاملات کا انتظام کرتا ہے۔ اس کو ایک طرح کا امین یا معتمد علیہ خیال کیا جا سکتا ہے جس کے ہاتھ میں خاندان کی املاک کا نظم و نسق ہوتا ہے اور جو ارکان کی عام مادی و روحانی بہبود کے لیے خاندان کے معاملات کا انتظام کرتا ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اسے ہر طریق عمل اختیار کرنے کا اقتدار حاصل ہے۔ خاندان کی عورتیں اپنی ہی جنس میں سے اپنا ایک علاحدہ صدر رکھتی ہیں جس کو گھر بار کے اندرونی انتظام اور امور خانہ داری میں مردوں کے بالمقابل اقتدار حاصل ہوتا ہے، اور وہ عام طور پر خاندان کے بیرونی معاملات کی تنظیم میں بھی قابل لحاظ اثر ڈالتی ہیں، اگرچہ یہ خاندان کے سب سے بزرگ مرد کے خاص فرائض میں داخل ہے۔ ہر رکن کی آمدنی ایک مشترکہ ذخیرے یا پنچایتی مال میں جمع ہوتی ہے اور اس میں سے سب کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے صدر خاندان کے حسب ہدایت رقم خرچ کی جاتی ہے۔ ہر شخص اپنی صلاحیت و قابلیت کے مطابق کماتا ہے اور اپنی ضرورت کے مطابق پاتا ہے۔ اس طرح مشترک خاندان کے نظام کو اشتراکی قومیت کے تصور

---

[1] دیکھو سیلگ من کی تصنیف محولۂ بالا باب ششم۔

ک
کی سب سے قریبی شکل کہا جا سکتا ہے۔

111
قرابت، مذہب اور معاشرتی روایات سے قطع نظر کرتے ہوئے زندگی و محنت کے معاشی حالات نے مشترک خاندان کو اس کا موقع بہم پہنچایا کہ وہ اپنے اتحاد اور اکیلے کو طویل صدیوں تک قائم رکھے۔ آمد و رفت اور سفر کے مشکلات نے سب ارکان خاندان کو اس بات پر مجبور کیا کہ مل جل کر رہیں اور زراعت، صنعت یا تجارت کے موروثی خاندانی پیشے کو مشترکہ طور پر انجام دیں[1]۔ اس صورت حال نے انفرادی رکن کو باہر جانے اور اپنے لیے جداگانہ اور آزاد شغلہ زندگی پیدا کرنے سے فطری طور پر باز رکھا۔ علاوہ ازیں تفرقی قابلیت سے کام لینے کا میدان بھی وسیع نہ تھا جو موجودہ پیچیدہ معاشی نظام کی خاص خصوصیت ہے۔

۱۹۔ مشترک خاندان کے طریقے کی خوبیاں اشتراک خاندانی کی موافقت میں اکثر امور پیش کیے جا سکتے ہیں۔ اولاً یہ کہ یہ طریقہ لوگوں کو خود غرضی کے بغیر محنت مشقت کرنا سکھاتا ہے اور کسی کو خالی نہیں رکھتا۔ ہر شخص کو کم از کم قوت لایموت کی ضمانت دی جاتی ہے جو معاشی ترقی کی اولین شرط ہے۔ یتیم و بیسہارا بچوں کی مناسب طریقے پر نگہداشت کی جاتی ہے اور دنیا کے مصائب برداشت کرنے کے قابل ہونے سے پیشتر انھیں دنیا میں بے سہارا نہیں چھوڑ دیا جاتا۔ اسی طریقے سے مشترک خاندان بدنصیب بیواؤں کے لیے بھی ایک محفوظ و موثر ملجا و ماویٰ ہے، خاص کر ایسی صورت میں جبکہ عقد ثانی کے ذریعے سے ان کے لیے موجودہ بے بسی کی حالت سے باہر نکلنا عام طور پر ناممکن ہے۔ علاوہ ازیں مشترک خاندان بوڑھوں اور مفلسوں کے لیے کبرسنی کے وظائف اور مالی امداد کی شکل میں سرکاری انتظام کی ضرورت باقی نہیں رکھتا، معذوروں کے لیے ان کی عدم استطاعت کے باوجود خاندان میں کفالت کی گنجائش نکالی جاتی ہے، اور ان کی طاقت و قابلیت کے مطابق ان کو موزوں کام تفویض کیا جاتا ہے۔ عام طور پر

[1] دیکھو بھٹناگر کی تصنیف محولۂ بالا۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ مشترک خاندان سے ایک حد تک سادہ تقسیم عمل کے فوائد حاصل ہوتے ہیں، چنانچہ ہر رکن کو وہی کام دیا جاتا ہے جس کے لیے وہ موزوں ہو۔ دیہات میں کسانوں اور دست کاروں کی عورتیں اور بچے بالغ مردوں کو ان کے کاموں میں مدد دیتے ہیں۔ یہ امر سال کے گرما گرمی کے موسموں میں ایک حد تک اہمیت رکھتا ہے جبکہ اجرت پر محنت دستیاب ہی نہیں ہوتی۔

صرف کا جہاں تک تعلق ہے وہاں تک خانہ داری کا ساز و سامان اور انتظام مشترک خاندان کی صورت میں الگ الگ کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی؛ اس لحاظ سے بھی بہت کچھ کفایت ہوتی ہے؛ قلیل آمدنی سے بہت سے مفید کام لیے جا سکتے ہیں اور مقابلۃً بڑے خاندانوں کا قیام و انتظام زیادہ محنت کے بغیر عمل میں آتا ہے۔ جس وقت تک مشترک خاندان قائم رہے اس کے اثاثے کا بہت زیادہ کفایت شعارانہ استعمال ممکن ہے اور تقسیم و انتشار زمین کی خرابیاں رونما نہیں ہوتیں۔

ان سب معاشی فوائد کے علاوہ مشترک خاندان بحیثیت مجموعی، ضبط، تادیب، ایثار، اطاعت و ادب کے محاسن بھی پیدا کرتا ہے۔

۲۰۔ مشترک خاندان کے طریقے کے نقائص۔

تاہم مشترک خاندان کے طریقے کے بعض پوشیدہ نقائص موجودہ زمانے کے متبدلہ حالات کی وجہ سے نمایاں طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس طریق کے سب سے بڑے نقائص میں سے ایک یہ ہے کہ محنت اور اس کے صلے کے مابین مطابقت نہیں ہوتی؛ چنانچہ ہم ضمناً کہہ سکتے ہیں کہ اشتراکیت کی اکثر شکلوں کے خلاف اس کو ایک موثر استدلال کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ انسانی فطرت جیسی کچھ ہے اس کے لحاظ سے محنت مشقت کے حق میں بہترین محرک یہ ہے کہ اس بات کا یقین حاصل ہو کہ محنت کرنے والے کو اس کی محنت کا پھل پورا پورا ملے گا۔ لیکن یہ محرک مشترک خاندان میں عام طور پر مفقود ہوتا ہے؛ اس لیے کہ بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ خواہ خاندان کا کوئی رکن کام کرے یا بے کاری میں وقت ضائع کرے اس کو اس بات کا اطمینان و یقین ہوتا ہے کہ بہر صورت اس کی

کفالت کی جائے گی اور یہی یقین خاندان میں نکھٹوؤں کی تعداد بڑھا دیتا ہے جس کی وجہ سے خودداری اور ذمہ داری کا احساس نہیں پیدا ہوتا۔

چونکہ مشترک خاندان کا اساسی خیال یہ ہے کہ فرد جماعت کے اغراض و مقاصد کا تابع رہے جس کی بنا پر خاندان کے صدر کو اس کے ہر رکن کے عمل کی باریکی کے ساتھ تنظیم کرنی پڑتی ہے' لہذا انفرادیت کی ترقی کے لیے فضا ناموافق ہوتی ہے اور لوگوں میں کسی قسم کی اختراعی قوت اور بے باکی نہیں پیدا ہونے پاتی؛ اس لیے کہ ان کا فرض صرف اس قدر ہوتا ہے کہ احکام سنیں اور ان کی اطاعت کریں۔ تنہا صدر خاندان ہی اس سے مستثنیٰ ہوتا ہے' لیکن اس کو بھی خاندان کی ذمہ داری کا احساس بے باکی کے ساتھ خطرات برداشت کرنے سے عام طور پر روکتا ہے جو آج کل معاشی ترقی کے لیے نہایت ضروری ہے۔ علاوہ ازیں انفرادی ارکان کی آمدنیاں کل خاندان کے مصارف کے لیے بہ مشکل تمام کافی ہوتی ہیں' اسی وجہ سے اصل کی فراہمی اور اس لحاظ سے نڈر طریقے پر کاروبار کو بڑے پیمانے پر چلانے کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ گھر بار کی محبت کا پیدا ہونا اپنا مستحسن پہلو رکھتا ہے لیکن وہ آدمی کو گھر گھسنا بناتا ہے اور باہر نہ نکلنے کی عادات کی ہمت افزائی کرتا ہے جس کی وجہ سے محنت غیر نقل پذیر ہو جاتی ہے۔

۲۔ اس طریق کو توڑنے والے جدید اثرات

چونکہ موجودہ زمانے کے حالات بحیثیت مجموعی مشترک خاندان کے طریق کے قیام و دوام کے ناموافق ہیں' اس لیے اس کے نقائص زیادہ نمایاں ہوتے جا رہے ہیں اور یہ طریق ان قوتوں سے عام طور سے مغلوب ہوتا جا رہا ہے جس کا اثر موجودہ زمانے میں اس پر پڑ رہا ہے۔ اولاً یہ کہ ذرائع آمد و رفت و وسائل نقل و حمل نے انفرادی اختراعی قوت کے لیے نئے میدان کھول دیے ہیں جس کی بنا پر خاندان کے زیادہ بے باک ارکان کو خاندان کا آغوش ترک کرنے اور اپنے لیے آزاد مشغلۂ زندگی پیدا کرنے کی ترغیب ہو رہی ہے۔ دوسرے یہ کہ قدیم خاندانی پیشوں کے زوال یا نقصان نے اکثر صورتوں میں خاندان کے لیے اکٹھا رہنا غیر ممکن بنا دیا

ہے اور علیحدگی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ مغربی انفرادیت کا قوی اثر مشترک خاندان کے ایکے پر حملہ آور ہونے میں ناکام نہیں رہا ہے۔ علاوہ ازیں برطانوی قانون اور ضابطے کا نمایاں طور پر انفرادی میلان بھی مشترک خاندان کی شکست کی رفتار کو تیز کر رہا ہے۔ کشاکش حیات کی شدت پذیری، جذبۂ انفرادیت کی ترقی کے ساتھ ملکر مشترک خاندان کو موجودہ زمانے کے کم و بیش خلاف اور متناقض بنا رہی ہے۔ قدیم زمانے کے مشترک خاندان کے ساتھ جو خانگی مسرت اور قناعت عام طور پر منسوب کی جاتی تھی وہ اس صورت میں نہیں پائی جاتی۔ "دو اور لو" کے جذبے کی جگہ غیر مصالحانہ خود استحقاقی نے لے لی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کل اکثر خاندانوں میں جو مشترک بنیاد پر زندگی بسر کر رہے ہیں بے اطمینانی اور چھوٹے چھوٹے جھگڑے فسادوں کا دور دورہ ہے۔

گو بحیثیت مجموعی ہم اس بات کا خیر مقدم کرتے ہیں کہ مشترک خاندان کے طریقے کو بتدریج معدوم کر دینا چاہئے، پھر بھی اس کا یہ مفہوم نہ قرار دینا چاہئے کہ ہم ایسی مذموم انفرادیت کے موافق ہیں جو سراسر نفس پرستی پر مبنی ہو اور کمزور اور محتاج رشتہ داروں کی دست گیری کے لیے اپنے ضمیر کی آواز نہ سن سکے۔ مسئلہ صرف افراط و تفریط سے بچنے کا ہے، یعنی ایک طرف تو انفرادیت کو کاملاً بانے سے پرہیز کیا جائے اور دوسری طرف باہمی امداد و ہمدردی کے جذبے کو کچلنے سے اجتناب کیا جائے۔ ایثار نفس کی ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی لیکن یہ ایثار جبری ہونے کے بجائے ارادی و اختیاری ہونا چاہئے۔

۲۲۔ قوانین وراثت و توریث مشترک خاندان کی بحث کے بعد ہم فطری تغیر کے عمل کے ذریعے سے قوانین وراثت و توریث کے مسئلے پر پہنچتے ہیں جو زیادہ تر مشترک خاندان کے آئین و رواج کے تابع ہیں۔ جیسا کہ سیلگ من نے کہا ہے "انفرادی ملک کا آئین و رواج موجودہ زمانے کی معاشی زندگی کی تہ میں مضمر ہے" اور ایک طویل ارتقا کی پیداوار ہے جس میں تین اساسی حالتیں تمیز کی جا سکتی ہیں۔ پہلی حالت جماعتی یا فرقہ دار ملکیت کی ہے۔ دوسری حالت ناقابل انتقال اور مشترک خاندانی ملکیت کی ہے۔ تیسری

باب ۶

حالت خانگی انفرادی ملکیت کی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں ابھی تک دوسری حالت کا دور دورہ ہے اور تیسری حالت کی جانب تغیر شروع ہو چکا ہے۔ ہندو قانونی قیاس ابھی تک غیر منقسم خاندانی ملکیت کی موافقت میں ہے بجز اس کے کہ باقاعدہ تسہیم و تفریق ہوئی ہو۔[1]

۴۳ – مِتکشرا اور دیا بھاگ قانون۔ 114

ابتداً اگر خاندانی جائداد کی تملیک کا کوئی تصور تھا تو وہ ویسی ہی نوعیت رکھتا تھا جسے ہم آج کل مشترک ملکیت کہتے ہیں۔ ملکیت پر خاندان کا قبضہ و دخل اجتماعی ہوتا تھا اور ارکان کو انفرادی طور پر اس معنی میں کوئی حق نہ ہوتا تھا جس معنی میں کہ ساجھے یا شراکت کی جائداد کے مالک شرکا ہوتے ہیں۔ ملکیت اور

---

[1] انگلستان میں ملکیت عام طور پر انفرادی آزاد اور غیر محدود ہوتی ہے۔ یوں تو اشتراک کا بھی امکان ہے لیکن قیاسات قانونی اس کے خلاف ہوں گے۔ ملکیت پر بندش ہو سکتی ہے لیکن صرف خاص حالات اور خاص شرائط کے تحت۔ اس کے برخلاف ہندوستان میں مشترک ملکیت ہی عام قاعدہ ہے اور ہر منفرد صورت میں وہ موجود قیاس کی جائے گی تاوقتیکہ اس کے خلاف کوئی امر ثابت نہ ہو۔ اگر کوئی فرد کسی جائداد کا تنہا مالک ہو تو یہ جائداد بعد کی نسل میں مشترک حق ملکیت میں مبدل ہو جائے گی قطعی غیر محدود ملکیت جس کی بنا پر مالک اپنی جائداد سے اپنی مرضی کے موافق کام لینے کا اختیار کلی رکھتا ہے مستثنیات میں سے ہے۔ باپ پر بیٹا، بھائی پر اس کے دوسرے بھائی اور عورت پر اس کے وارث روک قائم کرتے ہیں۔ اگر جائداد محصل یا مکتسب کے ہاتھوں میں آزاد اور بے روک شکل میں بھی ہو تب بھی اس کے ورثا کے ہاتھوں میں پہنچ کر اس پر از سر نو روک قائم ہو جائے گی۔ مغرب میں انفرادی ملکیت عام اصول ہے اور مشرق میں عام قاعدہ اجتماعی یا مشترک ملکیت ہے۔ گو ان دونوں نظاموں کے فرق کو براہ راست تضاد کی شکل میں ظاہر کیا جا سکتا ہے پھر بھی یہ بالکل یقینی ہے کہ دونوں مشترک ماخذ اور بنا رکھتے تھے۔ ہندوستان میں ماضی اور حال میں تسلسل پایا جاتا ہے انگلستان میں دونوں کو ایک وسیع خلیج جدا کرتی ہے۔ اور دونوں کو ملانے کے لیے سابق میں جو پل باندھا گیا تھا اس کے صرف چند تختے اس کی یادگار کے طور پر باقی رہ گئے ہیں۔ دیکھو جے ڈی مین کی کتاب موسوم بہ "رسالۂ ہندو قانون و رواج" صفحہ ۳۰۵۔

باب ۷

انتظام میں تفریق و تمیز کرنے کا سوال اس وقت تک نہیں اٹھا جس وقت تک انتقال جائداد کی اجازت نہ تھی۔ لیکن جس وقت انتقال کا مسئلہ رفتار زمانہ کے ساتھ رونما ہوا تو، ہندو قانون کی دو اہم شرحوں یعنی متکشرا اور دیا بھاگ نے ایک دوسرے سے متضاد دو نظریے پیش کیے[1]۔ متکشرا طریقے کے مطابق باپ کے ساتھ اس کے بیٹے اپنے باپ کے عین حیات خاندانی جائداد کے مشترک مالک ہوتے ہیں لیکن دیا بھاگ طریقے کے تحت بیٹے صرف باپ کے مرنے پر جائداد کے مالک متصور ہوتے ہیں۔ بہرصورت باپ ہی آزاد منتظم ہوتا ہے؛ فرق صرف ملکیت کے بارے میں ہوتا ہے۔ دیا بھاگ طریقے کے تحت باپ اپنے عین حیات تنہا مالک ہوتا ہے۔ متکشرا قانون کے تحت والد اور اس کی اولاد نرینہ اجتماعی طور پر مالک ہوتی ہے، یعنی افراد کے طور پر نہیں بلکہ انجمن کے طور پر۔ اس فرق کی بدولت جائداد کی توریث و تقسیم کے مختلف اصول رونما ہو گئے ہیں۔ اگر کسی مشترک ہندو خاندان کا کوئی رکن اپنا حصہ الگ کرنا چاہتا ہو تو وہ اس کا مطالبہ کر سکتا ہے، اس لیے کہ ہندو خاندان کے ارکان کے لیے مشترکہ طور پر زندگی بسر کرنے کے بارے میں کوئی جبر نہیں ہے۔ لیکن دیا بھاگ طریق کے تحت صرف بھائیوں اور بھائیوں کی اولاد کے درمیان تقسیم ممکن ہے اور باپ اور اس کے بیٹوں کے مابین ممکن نہیں، اس لیے کہ موخر الذکر مالک نہیں ہیں۔ متکشرا طریق کے تحت باپ بیٹوں کے درمیان بھی تقسیم ممکن ہے، اس لیے کہ وہ سب مشترکہ طور پر مالک ہیں، اور تقسیم و تفریق کی صورت میں لڑکوں کو یہ اصرار کرنے کا حق ہے کہ

[1] ہندوستان میں وراثت کے دو طریقے ہیں، متکشرا اور دیا بھاگ۔ موخر الذکر بنگال میں اور اول الذکر ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں رائج ہے۔ ان دونوں طریقوں کے درمیان جو فرق ہے اس کا باعث یہ واقعہ ہے کہ متکشرا طریقے کے تحت میراث کے حق کو متعین و منظم کرنے والا اصول "قرابت" یا رشتہ بذریعۂ خون ہے۔ اس کے برخلاف دیا بھاگ طریق کے تحت اس اصول کی جگہ "مذہبی قابلیت" کا اصول لیتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وارث میں لوگوں کو فائدہ پہنچانے کی صلاحیت ہو۔ دیکھو ڈی، ایف، ملا کی کتاب موسوم بہ "اصول ہندو شاستر" صفحہ ۱۶۔

باب ۔

ان کے حقوق کا احترام کیا جائے۔

۲۴۔ ان دونوں طریقوں سے تحت وراثت 115

اب ہم قانون وراثت پر پہنچتے ہیں۔ "وراثت" کے معنی مالک کی وفات پر اور اس کے نتیجے کے طور پر اس کی ملکیت کے انتقال کے ہیں۔ اصول مِتکشرا کی رو سے مشترک خاندان میں وراثت کا کوئی سوال نہیں ہوتا، اس لیے کہ کسی رکن کی موت سے ملکیت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور جائداد غیر منقسم حالت میں باقی رہتی ہے بجز اس کے کہ تسہیم و تفریق پر اصرار کیا جائے۔ بقول مین[۱] اصول مِتکشرا کے تحت، جس وقت تک خاندان مشترک طور پر زندگی بسر کرنے کا خواہاں ہو اس وقت تک ارکان خاندان کو جائداد سر دست توریث کے ذریعے سے نہیں بلکہ باقی ماندہ جائداد کے طور پر پہنچتی ہے۔ چنانچہ دیابھاگ طریق میں بھی، اگر موت واقع ہو اور اس کے نتیجے کے طور پر کوئی تقسیم و تسہیم نہ ہو تو، خاندان کے معاملات میں کوئی قابل لحاظ تبدیلی نہیں ہوتی۔ صرف ایسی صورت میں جبکہ تسہیم و تقسیم واقع ہو کر جانشینی اور توریث کا سراغ لگانے کا سوال رونما ہوتا ہے۔ دیابھاگ خاندان میں، جب کبھی کسی رکن کی وفات واقع ہوتی ہے، وراثت کا سوال پیدا ہوتا ہے اور متوفی کا حصہ اس کے وارث کو ملتا ہے۔

لیکن یہ نہ خیال کر لینا چاہیئے کہ ہندوستان میں کل کی کل املاک مشترک املاک ہیں۔ علٰحدہ و انفرادی جائداد حاصل کی جا سکتی ہے، اگرچہ اس کا تعین کرنا ہمیشہ آسان نہیں ہوتا کہ کن حالات میں وہ الگ ہے لیکن منفرد ملکیت کی صورت میں خالص حق وراثت رونما ہوتا ہے جس کے لیے قانونی اہتمام ضروری ہے۔

۲۵۔ قوانین وراثت و توریث کے معاشی اثرات

ان دونوں طریقوں کے تحت تقسیم و توریث کا نتیجہ یہ ہے کہ جائداد کی تقسیم بہت پھیلی ہوئی ہوتی ہے،

---

[۱] دیسی ریاستوں اور بعض زمینداریوں میں تسہیم و تقسیم کی اجازت نہیں ہے اور گدی یا جائداد نسلاً بعد نسل سب سے بڑے بیٹے کو ملتی ہے۔ صرف ان ہی مستثنیٰ صورتوں میں "قانون اولاد اکبر" رائج ہے۔

[۲] تسہیم و تقسیم بلاشبہ موت پر منحصر نہیں ہے اگرچہ عام طور پر باپ یا منتظم کی وفات پر عمل میں آتی ہے۔

سب لڑکوں کو مساوی حصہ ملتا ہے اور بیواؤں اور لڑکیوں کو بھی مشترک خاندان میں ایک حد تک حصہ ملتا ہے۔ عام اصول یہ ہے کہ مردوں کی نسل کے کسی مشترک جد اعلیٰ کے مرد اخلاف دوسروں کے مقابلے میں وراثت میں زیادہ حق رکھتے ہیں۔ اسلامی قوانین وراثت و توریث نظری اعتبار سے نہیں تو عملاً ہندو قانون سے بہت قریبی مشابہت رکھتے ہیں۔ مسلمانوں میں اگرچہ اشتراک فرض نہیں کیا گیا ہے، پھر بھی مشترک خاندان کا طریقہ کمیاب نہیں ہے، اور اسلامی شرع کے تحت جائداد کا مالک، خواہ جائداد اس کی آبائی ہو یا خود اس کی اکتسابی، صرف اپنے حین حیات اس پر پورا اختیار رکھتا ہے۔ ہندو قانون کے تحت جائداد جتنے اقسام کے ورثاء کو ملتی ہے اس سے زیادہ اقسام کے ورثاء میں وہ شرع اسلام کے تحت تقسیم ہوتی ہے۔ چنانچہ اسلامی قانون کے تحت تقسیم جائداد کے قواعد و ضوابط کا انحصار صرف قرابت (رشتہ بذریعہ خون) ہی پر نہیں ہے بلکہ بعض منصفانہ ملحوظات پر بھی ہے جن کے ذریعے سے قرابت کی بنا پر مقرر کردہ قواعد میں ترمیم و تبدیلی ہوتی ہے۔ ہندو قانون کی طرح اس میں بھی فرزند اکبر کا کوئی حق تسلیم نہیں کیا گیا ہے اور مرد وارثوں کو عورت وارثوں پر عام طور پر ترجیح دی جاتی ہے۔

ہندوستانی قوانین وراثت و توریث کی حمایت میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ فرزند اکبر کے حق کی عدم موجودگی، اصول مساوات و منصفانہ تقسیم کے سراسر مطابق ہے۔ ان قوانین کا میلان یہ ہے کہ دولت و تمول کے عظیم فرق و اختلاف کو پیدا ہونے سے روکا جائے اور متوسط طبقے کی تعداد میں معقول اضافہ کیا جائے۔ تقسیم زمین پر ان قوانین کے عمل کا جہاں تک تعلق ہے وہاں تک، تاوقتیکہ ان پر حد سے زیادہ عملدرآمد نہ کیا جائے، وہ ایک ایسے ثبات پذیر دیہاتی معاشرے کا یقین دلاتے ہیں جو آزاد اور خود دار خود کاشت زمینداروں پر مشتمل ہو، چنانچہ مغرب میں بھی ایسے کسانوں کو ایک مفید زرعی نظام کی پشت و پناہ خیال کیا جاتا ہے جس سے ملک کی خوش حالی کو گہرا لگاؤ ہے۔ یہ واقعہ کہ ہر شخص کو کاروبار آغاز کرنے کے لیئے کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے،

صنعتی نقطۂ نظر سے ایک بہت بڑی سہولت بہم پہنچاتا ہے۔ ترکے کا چھوٹا ہونا، جو حقداروں میں جائداد کو مساوی یا نہ طریق پر تقسیم کرنے کا عام نتیجہ ہے، بجائے خود اس بات کا محرک ہے کہ راحت و آرام کے عادتی معیار کو برقرار رکھنے کے خیال سے اس ترکے میں مزید اضافے کی کوشش کی جائے[1]۔

لیکن چند اہم امور کا لحاظ کرتے ہوئے ہندوستان کے مروجہ قوانین وراثت ناقص پائے جاتے ہیں۔ سب سے اول یہ کہ ان قوانین کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ اصل کے ذرائع کی بڑی مقدار میں فراہمی کو روک کر بڑے پیمانے کے کاروبار کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔ جب ہر فرد واحد کو قلیل مقدار میں حصہ ملے، جیسا کہ جائداد مساوی تقسیم ہونے کی صورت میں عام طور پر کم حصہ ملتا ہے تو پس اندازی دشوار ہوتی ہے۔ لیکن اس خرابی کو اس طرح رفع کیا جا سکتا ہے کہ صنعت کی تنظیم کو مشترک سرمایہ کے اصول پر اور محدود ذمہ داری کی بنیاد پر ترقی دی جائے جس کی بنا پر پس انداز کی ہوئی چھوٹی رقموں کو بھی بڑے پیمانے کے کاروبار میں لگانے کا موقع ملتا ہے۔

ہندوستان میں ان قوانین کے بے روک عملدرآمد کی ایک اور شدید خرابی یہ ہے کہ تقسیم و انتشار اراضی نے انتہائی صورت اختیار کرلی ہے جس کے نتیجے کے طور پر اکثر کھیت غیر منفعت بخش ہو گئے ہیں اور مقدمہ بازی کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے جو ہندوستانی کسانوں کے افلاس کو بہت ہی نامبارک طریقے سے ترقی دے رہی ہے۔

۲۶۔ کیا ہندوستانی روحانیت ہندوستان کی معاشی پسماندگی کی ذمہ دار ہے؟

اب ہم اس بحث مباحثے پر رائے زنی کرنا چاہتے ہیں کہ آیا ہندوستانی معاشرے کی غیر ترقی پذیر نوعیت اور اس کی عام معاشی پسماندگی کو ہندوستانی روحانیت سے منسوب کیا جا سکتا ہے یا نہیں[2]؟ یہ بات عام طور پر بیان کی جاتی ہے کہ ہندوستان میں "مذہب یہ حکم دیتا ہے کہ تمام مادی فوائد سے

[1] دیکھو پی بنرجی کی کتاب موسوم بہ "تحقیق معاشیات ہند" صفحہ ۴۲
[2] ہم نے اس عبارت میں جہاں کہیں "ہندوستانی روحانیت" یا "ہندوستانی مذہب" کے الفاظ استعمال

منہ موڑ لیا جائے'، اور ہندو کو اس کے مذہب کی یہ تاکید ہے کہ ہر شے کو مذہب کا مظہر تصور کیا جائے۔" علاوہ ازیں ہندوستانی تہذیب و تمدّن کی خصوصیت "لامحدود" کا مستقل احساس ہے' اس کے برخلاف معاشی ترقی' زندگی کے "محدود" اور "مادّی" پہلو سے انہماک کی طالب ہے۔ بسبب سے اول ہمیں اس بات پر غور کرنا ہے کہ آیا ہندوستانی مذہب و فلسفہ نے اخروی روش کا حکم ایسے مفہوم میں دیا ہے جس مفہوم میں کہ دوسرے مذاہب اور فلسفے حکم نہیں دیتے۔ دوسرے یہ کہ ہمیں یہ غور کرنا ہے کہ ہندوستان میں معاشی ترقی کی راہ میں ترک دنیا کے نصب العین کا تسلّط کس حد تک مزاحم ہے' اس لیے کہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ہندوستانی روحانیت اسی نصب العین کو عوام کے سامنے پیش کرتی ہے۔

۲۷۔ تاریخ سے رجوع۔ اس سلسلے میں ہم اس استدلال کے خلاف کہ ہندوستانی روحانیت نے زندگی کے مادّی پہلو سے عام تغافل اور قنوطی روش کو فروغ دیا ہے' ابتداءً تاریخی شہادت کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔ اگر ہندوستانی دماغ بالکل آخرت کے خیالات سے مملو ہوتا' جیسا کہ اس سے یہ بات وقتاً فوقتاً منسوب کی گئی ہے تو' اہل ہند تاریخ میں عظیم الشان سلطنت سازوں' فاتحوں اور نڈر نوآبادکاروں کی حیثیت سے مشہور نہ ہوتے[1]۔ ان تمام سمتوں میں ان کے نمایاں کارناموں پر کوئی اعتراض نہیں کیا گیا ہے۔ ہندوستانیوں کے مقاصد داغراض کسی طرح مذہب و

بسلسلۂ حاشیہ صفحہ ۱۷۶۔ کئے ہیں وہاں ان سے ہمارا مطلب "ہندو روحانیت" یا "ہندو مذہب" ہے۔ اسلام کا حوالہ اس مفہوم سے خارج کر دیا گیا ہے' اس لیے کہ اول تو ہندومت ہی ہندوستان کی اکثریت کا مذہب ہے اور دوسرے یہ اسلام کے متعلق یہ بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ وہ ہندو مذہب کے مقابلے میں طلب حق کا زیادہ اور ترک دنیا کا کم حامی ہے۔ اور ہندومت کے مقابلے میں مدافعت و حمایت کا کم محتاج ہے۔

[1] دیکھو کالے کی تصنیف جلد اول باب ۳۔

باب ۴

فلسفہ تک محدود نہیں رہے ہیں، اگرچہ انھوں نے ان شعبوں کو اپنے لیے مخصوص کرلیا تھا۔ یہ نظریہ کہ ہندوستانی دماغ ہمیشہ مذہبی و مابعد الطبیعی خیال آرائیوں میں منہمک رہا ہے اور دوسرے اغراض پر اس نے کوئی توجہ نہیں کی، ایجابی علوم میں اس کے مسلمہ کارناموں سے تناقض رکھتا ہے۔ یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ "ہندوستان کے قدیم باشندوں ہی نے ریاضی و میکانی معلومات کی بنا ڈالی۔" "انھوں نے زمین کی پیمائش کی، افلاک کے نقشے کھینچے، آفتاب اور سیاروں کی رفتار و گردش کا حال حلقۂ بروج کے ذریعے سے معلوم کیا، مادّہ کی ترکیب کا تجربہ کیا، اور پرندوں، چرندوں، نباتات اور تخموں کی نوعیت کی تحقیق کی۔" الجبرا کی ایجاد اور ہیئت د اقلیدس پر الجبرا کے اطلاق کا سہرا ہندوؤں ہی کے سر بندھتا ہے۔ اعدادی علامتوں کا بھی یہی حال ہے جو یورپ میں ہر جگہ رائج ہیں[1]۔ علاوہ ازیں قدیم ہندوستانی دستی صنعتوں کی پیداوار نے جو عالمگیر شہرت حاصل کی وہ اس واقعے کی بیّن شہادت ہے کہ ہندوستانی روحانیت نے گزشتہ زمانہ میں معاشی جدوجہد کو مفلوج نہیں کیا۔

یہ صحیح ہے کہ ہندوستانیوں نے بڑے میکانی آلات ایجاد نہیں کئے، چنانچہ رادھا کرشن نے اس کا ذمہ دار "مہربان آکاش کو قرار دیا ہے جس نے انھیں بڑے بڑے دریائی سلسلے اور غذائی وافر رسد مہیا کی۔" گو یہ نظریہ اس قدر سیدھا سادہ ہے کہ اس کو مکمل تشریح و توجیہ کے طور پر تسلیم نہیں کیا جاسکتا، پھر بھی ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ اس کے بدل کے طور پر جو مفروضے پیش کئے جاتے ہیں کہ ہندوستانی عقل و ذہانت میں جبلّی نقص موجود ہے یا ہندوستانی دماغ دنیوی معاملات کے مقابلے میں روحانی معاملات میں زیادہ منہمک ہے، ان کو مسترد کرنے کے کافی وجوہ ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ میکانی ایجادوں کا سلسلہ تو بہت ہی حال کے زمانے سے شروع ہوا ہے۔ ہندوستان کم از کم اٹھارھویں صدی تک مادی تہذیب و تمدن کے فنون و صنائع کی حد تک مغرب کی سربرآوردہ

118

[1] یوں تو مؤلف صاحبان اپنے بیان کے مختار و ذمہ دار ہیں تاہم یہ وضاحت بے محل نہ ہوگی کہ جیساکہ نام سے ظاہر ہے "الجبرا" یا "الجبر و المقابلہ" عربوں کی ایجاد مانا جاتا ہے اور یورپ نے یہ علم عربوں ہی سے حاصل کیا۔ علیٰ ہذا علامات اعداد بھی جو یورپ میں رائج ہیں "عربی" کہلاتے اور مانے جاتے ہیں۔ (مترجم)

باب

قوموں سے مقابلے کا دعویٰ کر سکتا تھا۔ یہ واقعہ کہ اس صدی کے بعد سے جمود طاری ہو گیا ہے اس کو ہندوستانی روحانیت سے معقولیت کے ساتھ منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے برخلاف، جیسا کہ متعاقب بیان ہوگا، دوسرے ایسے اکثر اثرات کام کرتے رہے ہیں جو اس واقعہ کی مناسب و اطمینان بخش توجیہ کرتے ہیں۔

۴۸۔ معاشی جد و جہد پر مذہبی عقیدے کے اثر کو مبالغے سے بیان کیا جاتا ہے۔

موجودہ زمانے کے حالات پر نظر ڈالتے ہوئے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں میں مارواڑی، جین، اور بھاٹیا اور مسلمانوں میں خوجے، بوہرے اور میمن جیسے لوگوں اور اقوام ہی کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ مذہب کے بارے میں راسخ الاعتقاد ہوتے ہیں اور اس کے اثر کو سب سے زیادہ قبول کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود ان ہی لوگوں نے ملک کی جدید صنعتی زندگی میں نمایاں حصہ لیا ہے اور مغربی صنعتی زندگی اختیار کرنے کی نمایاں صلاحیت ظاہر کی ہے[1]۔ اس لحاظ سے ظاہر ہے کہ ہندو دھرم یا مذہب اسلام کی پیروی، مادی اغراض کی کامیاب تکمیل سے تناقض یا اختلاف نہیں رکھتی۔ اگر یہ بھی بیان کیا جائے کہ ہندوستان میں مذہب کا میلان دنیادی (مادی) جد و جہد کی جملہ شکلوں کے خلاف ہے، جیسا کہ موجودہ زمانے میں عام طور پر سمجھا جاتا ہے، تب بھی متوسط درجے کے پیرو کی حد تک مذہب کا اثر اس صورت میں کارگر طریقے پر زائل ہو سکتا ہے جبکہ حالات مادی ترقی کے موافق ہوں اور جبکہ ان حالات سے پوری طرح استفادہ کرنے کی جبلی صلاحیت موجود ہو۔ جین اور بھاٹیا جیسی مذکورۂ بالا متعدد قوموں کو برطانوی حکمرانی سے پیشتر ہی سے اپنی کاروباری جد و جہد اور بے باکانہ تجارت کے دیرینہ روایات سے یقیناً مدد ملی۔ کوئی مذہب، خواہ بلحاظ نوعیت دنیا سے کتنا ہی بے تعلق

[1] دیکھو کالے کی تصنیف جلد اول صفحہ ۲۴۔

باب ۴

کیوں نہ ہو، انسان کی معاشی حالت کی اصلاح کے فطری محرک پر مستقل غلبہ حاصل کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ معاشی محرک کم از کم اتنا ہی قوی ہوتا ہے جتنا کہ مذہبی محرک، بلکہ اپنے عمل میں زیادہ مسلسل اور دیرپا ہوتا ہے اور یہ بات مغرب و مشرق دونوں پر یکساں صادق آتی ہے۔ البتہ صرف اس صورت میں جبکہ عام معاشی توقعات مایوس کن ہوتے ہیں، مثلاً جس وقت نظم و نسق اس قدر ظلم و تعدی پر مبنی ہوتا ہے کہ ہر تخلیقی جدوجہد کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے تو متوسط آدمی مذہب میں سکون تلاش کرتا ہے جو توکل اور تسلیم و رضا کی تلقین کرتا ہے اور ان چیزوں کو ایسی تسکین بخش دوا کی طرح استعمال کرتا ہے جو اس شخص کو ان خرابیوں کے احساس سے بےخبر بنا دیتی ہے جن میں وہ گھرا ہوا ہوتا ہے اور جن کا برداشت کرنا اس کے لیے اس واسطے ضروری ہے کہ وہ ان کو دفع کرنے سے قاصر ہے۔ جس وقت اس کی دنیاوی حالت کو قطعی جدوجہد کے ذریعے سے درست کرنے کے مواقع اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں تو فلسفۂ بے عملی سے الفت اور ایسے مذہب سے محبت جو لوگوں کو بامقصد مادی جدوجہد سے پھیر دے خالص رسمی چیز بن جاتی ہے۔ مذہب اور زندگی میں ربط باقی نہیں رہتا، اور لوگ مذہبی اقوال و احکام کی پابندی صرف زبانی کرکے اپنی زندگی بالکل جداگانہ معیاروں کے مطابق منظم کرتے ہیں، یا اس کے بدل کے طور پر کسی مذہب کی پیروی، چند مقررہ مذہبی رسوم کی انجام دہی اور بعض رواجوں اور طریقوں کی سختی سے پابندی تک محدود رہ جاتی ہے جو پر جوش تلاش معاش میں کسی طرح لازمی طور پر مزاحم نہیں ہوتی۔ یہ متناقض صورت حال اس وجہ سے رونما ہوتی ہے کہ روایتی طور پر مسلمہ اعتقاد بدلے ہوئے حالات کے مطابق نہیں ہوتا، لیکن اس صورت حال کے پہلو بہ پہلو خود مذہب بتدریج تازہ عقلی ترکیب پانے لگتا ہے اور اپنے اندر نئے تصورات پیدا کر لیتا ہے جو اعتقاد اور عمل کی درمیانی خلیج کو پاٹنے میں مدد دیتے ہیں۔ غرض اس کی ہیئت ایک نئے سانچے میں ڈھلتی رہے،

119

یہاں تک کہ یہ خیال ترک کر دیا جاتا ہے کہ دنیاوی جد و جہد جبلّی طور پر بے نتیجہ یا گناہ کا کام ہے۔ یہ میلان رونما ہوتا ہے کہ ریاضت اور دنیا سے کنارہ کشی کی بجائے دنیا میں رہ کر پرجوش محنت و مشقت کرنے کے متعلق وعظ و تلقین کی جائے اور اس امر سے انکار کیا جائے کہ دنیاوی اور روحانی جد و جہد کے مابین کوئی نمایاں خط فاروق قائم کرنا ضروری ہے۔ مادّی اغراض کے لیے سعی کرنے کے متعلق یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ لازمی طور پر روحانی انجام کے خوابوں کے خلاف نہیں ہے اور کسی فرد کی زندگی میں دونوں محرکات کو باہم اس طرح وابستہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایک ہی مقصد کو پورا کرنے کے لیے کارآمد بن جائیں۔ جدید مسیحی دنیا انجیل کے اس خیال کے لفظی معنی نہیں لیتی کہ امیر آدمی، جہاں تک اس کے روحانی انجام کا تعلق ہے، خطرے میں ہوتا ہے[1]۔ چنانچہ موجودہ زمانے کے مسیحی علمائے دین اس کو ماننے کے لیے فوراً تیار ہو جائیں گے کہ کیڈبری جیسے کاروباری آدمی کے لیے کسی دوسرے شخص کی طرح بہشت میں داخل ہونے کا اچھا خاصا موقع ہے۔ اس لیے کہ مادّی دولت بذات خود کوئی بری چیز نہیں ہے۔ اگر دولت دیانت داری کے ساتھ ملے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص اس کو کماتا ہے اس نے کوئی قابل قدر خدمت انجام دی ہے جس کا معقول صلہ دینا قوم مناسب اور سودمند خیال کرتی ہے۔ زر کا کمانا اور صرف کرنا دونوں کے متعلق یہ ممکن ہے کہ ان کا مقصد اور نتیجہ اخوانی اور بے غرضانہ ہو۔

۲۹۔ جبریت، ماضی کے تنزل سیاسی حالات کی میراث ہے	ہم یہ خیال کرنے کی جانب پوری قوت کے ساتھ مائل ہیں کہ ''جبریت''

[1] ''جن لوگوں کے پاس دولت ہے ان کے لیے خدا کی بادشاہت میں داخل ہونا کس قدر دشوار ہے! ایک اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے گزرنا اس سے آسان تر ہے جتنا کہ امیر آدمی کا خدائی بادشاہت میں داخل ہونا۔'' دیکھو انجیل (مرقس) باب ۱۰ ص ۲۳

باب
یا دنیا سے بے تعلقی اور رہبانیت جو زندگی کے بارے میں ہندوستانی مطمح نظر کی خصوصیت اور لوگوں کی مادی ترقی کی راہ میں سنگین رکاوٹ خیال کی جاتی ہے، بڑی حد تک اس سیاسی افراتفری سے منسوب کی جاسکتی ہے جو ملک کے اندر برطانویوں کی آمد سے فوراً ہی پیشتر پائی جاتی تھی اور جس نے معاشی محرک کے معمولی عمل کو ناممکن بنا دیا تھا۔ جب حکومتیں لوگوں کی حفاظت کرنے کی بجائے ڈاکہ زنی کرنے لگیں، اور واقعہ بھی یہی ہے کہ برطانوی راج کے قائم ہونے سے پیشتر کے دور بدنظمی و بدامنی میں جو حکومتیں موجود تھیں ان میں سے اکثر پر یہ بیان پوری طرح صادق آتا تھا؛ اور جب لوگوں کی حالت یہ ہو کہ وہ سالہا سال کی محنت و مشقت کا ثمرہ کسی ناگہانی حملہ آور کی دست بُرد یا کسی ظالم حاکم کی چیرہ دستی کے باعث آن کی آن میں کھو بیٹھیں تو دولت کی پیدائش اور فراہمی کی تحریک و ترغیب کا بہت ہی کمزور حالت میں ہونا یقینی اور لابدی تھا۔ یہ نظری امر ہے کہ ان حالات کے تحت لوگوں کا مطمح نظر امید اور بلند حوصلگی نہ رہا، ان کے دماغوں پر جبریت کا تسلط ہوگیا اور وہ تقدیر کے قائل بن گئے۔

۳۰۔ مذہب کو متبدلہ حالات کے مطابق بنانے کے لیے مذہب کی از سر نو تعبیر کا عمل۔

امن قائم ہوتے ہی اور مغربی خیالات اور مغربی سائنس کے اثر کے تحت، مذہب کی از سر نو تعبیر ان ہی اسلوب پر شروع ہوچکی ہے جن سے مغرب آشنا ہے، اور محسوس صبر و تحمل سے زیادہ با مقصد عمل کی تلقین کی جارہی ہے۔[1] دوسرے الفاظ میں، کسی مقررہ وقت میں مذہب کے بارے میں

[1] ہندوستان میں مذہب کی از سر نو تعبیر کا جو عمل جاری ہے اس کی مثالوں کے طور پر

باب۲

کسی قوم کا جو مطمح نظر ہوتا ہے وہ زیادہ عام طور پر ان کی معاشی حالت کا سبب نہیں بلکہ نتیجہ ہوتا ہے۔ جوں جوں معاشی حالت زیادہ موافق ہوتی جاتی ہے وہ زیادہ امید افزا حالت یا روش پیدا کرتی ہے اور یہ یقینی ہوجاتا ہے کہ جبری اصول پس پشت ڈال دیے جائیں۔ یہ تصور کرنا غلطی ہے کہ ہندو مذہب معاشی ترقی کی راہ میں مستقل مزاحمت پیدا کرتا ہے؛ اس لیے کہ یہ مذہب نہ تو پرانی لکیر کا فقیر ہے اور نہ دائمی طور پر معین شکل رکھتا ہے؛ بلکہ وہ اپنا رنگ روپ بدلتا رہتا ہے، تاکہ خیالات کی ترقی اور مادی حالات کی اصلاح و ترقی کے مواقع کا ساتھ دے سکے[1]۔ ہندوستانی تمدن اور شائستگی صدہا سال سے متعدد اور طاقتور حملوں کے باوجود باقی چلی آرہی ہے جس کا راز اس کی لچکدار قدامت پسندی ہے، اور یہ خیال کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ موجودہ حالات کا ساتھ دینے کی صلاحیت ہی نہیں

191

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ۔ رادھا کرشنن کی کتاب موسوم بہ "ہندوستانی فلسفہ" جلد اول سے ذیل کی منتخب عبارتیں نقل کی جاتی ہیں:-

عزلت گزینی یا ترک دنیا کے ذریعے سے نجات حاصل کرنے کی کوششوں میں یہ خیال بھی شامل ہے کہ ایک آدمی کی آتما تمام دنیا کی آتماؤں سے بحیثیت مجموعی زیادہ قیمتی ہے لیکن یہ کوششیں کسی حقیقی بندگی کے جذبے کو نہیں ظاہر کرتیں۔ اوپانشید کا یہ منشا ہے کہ ہم کام کریں لیکن بے غرض و بے لوث طریقے پر" (دیکھو صفحہ ۲۱۵)۔ "جھوٹی ریاضت او تپسیا جو زندگی کو ایک خواب اور دنیا کو ایک دھوکا خیال کرتی ہے' اوپانشید کے مشرب کے خلاف ہے"۔ "اس دنیا کی زندگی کی فضا مسرت سے لبریز ہے۔ تسلیم و رضا کا فلسفہ' اخلاقیات کا ریاضت آموز ضابطہ' کاہلی اور دنیا سے بیزاری کا میلان' نہ صرف کائنات کے خالق کی توہین ہے بلکہ اپنی ذات کے خلاف گناہ ہے؛ اور دنیا ہم پر حق رکھتی ہے۔ او پانشید کا خدا پر عقیدہ ہے اور اس کے نتیجے کے طور پر دنیا پر بھی" صفحہ ۲۲۰۔

[1] "کیا بہ لحاظ عقیدہ اور کیا بہ لحاظ عمل ہندو مت کوئی ایسا مذہب نہیں ہے جو یکسانی

رکھتی ؛ سچ پوچھو تو پرانی عبارتوں میں نئے معنی داخل کرنے اور پرانی بوتلوں میں نئی شراب بھرنے کا عمل ہندو مذہب میں جتنا آسان ہے اتنا غالباً کسی دوسرے مذہب میں نہیں ۔ مخالف نقادوں نے کہا ہے کہ ہندو مذہب غیر منظم اور بے قاعدہ ہے اور اس میں یہ صلاحیت نہیں پائی جاتی کہ اس کو کسی قطعی اصول کے مجموعے کی شکل میں معین کیا جائے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ناقابل تنقید اور ہوا کی طرح ناقابل گرفت ہے ؛ لیکن یہی چیز در اصل کو ایک عمدہ طاقت بخشتی ہے اور نئے نئے حالات کے اقتضا کے مطابق صورت اختیار کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت پیدا کرتی ہے ۔ چنانچہ اس الزام کے باوجود کہ یہ مذہب دنیاوی معاملات سے سرد مہری اور بے اعتنائی برتنے کی ترغیب و تحریص دلاتا ہے ، وہ یہ ثابت کرنے میں کوئی دقت نہیں پاتا کہ اگر اس کو مناسب طریقہ پر سمجھا جائے تو یہ الزام عائد نہیں ہو سکتا ۔ وہ اپنے معتقدوں سے یہ نہیں کرتا کہ دنیاوی اغراض سے دست کش ہو جائیں بلکہ صرف یہ کہ خود غرضانہ سعی ترک کر دیں ۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرو ، بلکہ صرف یہ کہ دنیا میں سیدھے راستے چلو ۔ تلک کی یادگار تصنیف موسوم بہ "گیتا رہا سیا" کا اصل مضمون یہ ہے کہ "بھگود گیتا" ایک ایسی کتاب ہے جو ہندوؤں کی انجیل ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہے ، اس میں ترک دنیا (تیاگ) پر باعمل زندگی کو نمایاں طور پر ترجیح دی گئی ہے ، اور وہ دنیا سے وابستگی کے بغیر عمل کرنے کی تلقین کر کے زندگی کے روحانی اور مادّی پہلوؤں میں ربط و مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے ۔ بسا اوقات یہ خیال شدّومد

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ ... کے ساتھ بے حرکت اور غیر متبدل ہو ۔ ہندو دھرم ایک حرکت ہے نہ کہ سکون ؛ ایک عمل ہے نہ کہ نتیجہ ؛ ایک ترقی پذیر روایت ہے نہ کہ معین الہام"۔ دیکھو ، رادھاکرشنن کی کتاب موسوم بہ "زندگی کے بارے میں ہندو نقطۂ نظر" ، ص ۱۲۹ ۔

کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ ہندوستانی قنوطیت کا اصلی سبب ہندو مذہب کا ایک خصوصی اصول یعنی "کرما" ہے۔ اس لیے کہ اس کی رو سے ریاضت (تپسیا) اور ترک دنیا (تیاگ) ہی جنموں اور نئے جنموں کے لگاتار چکر سے بچنے کا اکیلا ذریعہ ہے۔ لیکن اس اصول کی مختلف طریقہ پر بھی تعبیر کی جاسکتی ہے، چنانچہ یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ وہ عمل کی راہ میں مزاحم ہونے کی بجائے اس کے حق میں نہایت طاقت ور محرک ہے، اس لیے کہ اس کی رو سے انسان ہی اپنی قسمت بناتا ہے نہ کہ قضا و قدر۔

یہ بیان بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ اسلام کے بعض خصوصی احکام پر بھی اسی طریقے سے نظر ثانی کی جارہی ہے اور ان کو حالات کے مطابق بنایا جارہا ہے۔ چنانچہ عام عقیدے کے مطابق مسلمان کے لیے سود (ربا) کا لین دین جائز نہیں ہے۔ اسی وجہ سے یہ بحث بہت سنجیدگی کے ساتھ کی جاتی ہے کہ آیا کسی سچے مسلمان کا ایک ایسی انجمن کا رکن بننا جائز ہے کہ نہیں جو سود کا لین دین کرتی ہے۔ یہ بات بھی بخوبی معلوم ہے کہ مسلمانوں کی امانتی رقموں کے سود کا لاکھوں روپیہ ڈاک خانے کے سیونگ بنکوں میں لادعویٰ پڑا رہتا ہے۔ اس امتناعی حکم کی بنا پر موجودہ حالات کے تحت بظاہر جو دشواری پیدا ہوگئی ہے اس کے مدنظر یہ کوشش کی جارہی ہے کہ قرآن شریف کی متعلقہ آیتوں کی اس طرح تشریح کی جائے کہ ان کی رو سے صرف ربا ممنوع قرار پائے نہ کہ ہر قسم کا سود۔[1]

۱۳۔ ہندوستانی قنوطیت کے دوسرے اسباب مذہب کے سوا

اس طرح ہندوستانی ذہنیت کی خصوصیت کے متعلق اکثر مبصروں کا یہ خیال ہے کہ اس میں قنوطیت اور رنج و غم بے چون و چرا برداشت کرنے کا انداز پایا جاتا ہے، اس کی کافی توجیہ و تشریح کے لیے ہندوستانی مذہب و

122

[1] دیکھو ام ال ڈارلنگ کی کتاب موسوم بہ (Rusticus Loquitur) صفحہ ۳۴۷ تا صفحہ ۳۴۹

فلسفہ کے اثر کے علاوہ دوسرے اسباب کی تحقیق کرنا ضروری ہے۔ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ ہندوستان پر صدیوں کے غیر ملکی تسلط و قبضہ اور نظم و نسق کی خرابیوں کا اثر یہ ہوا کہ ہر طرف افسردہ دلی اور اداسی چھا گئی۔ ہمارے بیان کردہ اسباب کی فہرست میں انسان کی تباہ کاریوں کے ساتھ فطرت کی ستم کاریوں کا اضافہ بھی ضروری ہے۔ ہندوستان کی آب و ہوا اور موسم کا اثر خاص کر ان علاقوں میں جو انتہائی گرم یا مرطوب ہیں، یہ پڑتا ہے کہ انسان کے جسمانی قوٰی کمزور ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے یہ امکان قوی ہو جاتا ہے کہ جسم انسانی ان امراض کو قبول کر لے جو منطقۂ حارہ میں پھیلے ہوئے ہیں مثلاً ملیریا، ملیا جیسے بخار وغیرہ۔ ان امراض میں سے بعض مثلاً خطرناقسم ... نہ بھی ہوں تو جسمانی طاقت و توانائی عام طور پر گھٹا دیتے اور مردہ دلی پیدا کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں زندگی میں زندہ دلی اور رجائیت کے معیار نظر پر قائم رہنا غیر ممکن ہو جاتا ہے[1] اس طرح قنوطیت کی ایک عضویاتی بنیاد ہے جس کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے۔ اس کے علاوہ قحط سالیوں جیسی آفتوں کے اثر کا بھی لحاظ کرنا ضروری ہے جن کا کھٹکا ہندوستان جیسے زرعی ملک کو ہر آن لگا رہتا ہے؛ اس لیے کہ اس کا انحصار غیر معین بارش پر ہے اور گزشتہ زمانے میں قحطوں کو روکنے کے لیے ویسے کارگر انتظامات نہیں کئے جا سکتے تھے جیسے کہ اس زمانے میں موجود ہیں؛ مثلاً قحط کا بیمہ اور امداد قحط۔ اس بلا کے متواتر نزول اور اس کے مقابلے میں تامل سے بے بسی و بے چارگی نے لوگوں میں لازمی طور پر یاس اور قنوطیت پیدا کر دی ہوگی اور تقدیر کا قائل بننے اور تسلیم و رضا سے کام لینے کی ہمت افزائی کی ہوگی۔ مرض اور قحط کے یہ توام حزنیے جو ہندوستانی اسٹیج پر ایک زمانۂ دراز سے بار بار ادا ہو رہے تھے، لوگوں کی افسردہ دلی اور اداسی کی بہت بڑی حد توجیہ کرتے ہیں۔ ایک توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ معاشرے کے سر پر ذات پات کا

---

[1] دیکھو رونالڈ شے کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان پر ایک طائرانہ نظر" باب ۲۲۔

بھوت سوار ہونے کی وجہ سے اس پر اور خاص کر پست ذاتوں پر ایسی بہت سی پابندیاں عائد تھیں جنھوں نے انسانوں کے ایک انبوہ کثیر کے لیے معاشری و معاشی اصلاح و ترقی کا راستہ بند کر دیا تھا اور اس کو غلامی کے جنجال میں پھنسا دیا تھا جس سے رہائی کی کوئی امید نہ تھی۔

مغربی یورپ میں بھی عوام میں رجائیت اور شوق حصول کا رونما ہونا قریبی زمانے کا واقعہ ہے۔ جدید سائنس کے دور سے پیشتر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ قحط و خشک سالی جیسی آسمانی بلائیں اور طاعون، ہیضہ جیسے متعدی امراض کی اشاعت خدائی قہر و غضب کی علامت تھیں جن کے خلاف ہاتھ پیر مارنا یا جد و جہد کرنا کمزور اور فانی انسان کے لیے بے سود تھا۔ گویا یورپ میں بھی کسی زمانے میں عوام کے خیالات پر نام نہاد مشرقی جبریت کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ اگر بے بسی اور بے چارگی کی یہ حالت یورپ میں بڑی حد تک غائب ہو گئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سائنس کی مدد سے اور اس کے گوناگوں مظاہر کی بدولت جو علم طب کی نشو و نما اور رسل و رسائل آمد و رفت کی توسیع و ترقی وغیرہ کی صورت میں رونما ہوئے ہیں انسان یہ محسوس کرنے لگا ہے کہ قدرت پر اس کا قابو بڑھ رہا ہے اور جو کامیابیاں اور فتحمندیاں اس کو حاصل ہو رہی ہیں ان کے مدنظر یہ خیال کرتا ہے کہ ہر خرابی اور کمی جو اس میں پائی جاتی ہے دانائی کوششوں کے ذریعے سے قابل علاج اور قابل تکمیل ہے۔ ہندوستان میں بھی زندگی کے نقطۂ نظر کے بارے میں اسی شکل تبدیلی کا آغاز ہو چکا ہے اور اس کا امکان بلکہ یقین ہے کہ جوں جوں نئی روشنی پھیلتی اور تعلیم عام ہوتی جائے گی، عملی سائنس ترقی کرتی جائے گی اور قومی معاشی نشو و نما کی پالیسی استقلال کے ساتھ اختیار کی جائے گی، ویسے ویسے ہندوستانی قنوطیت کے موجودہ اسباب غائب ہوتے جائیں گے اور یہ خیالی

123

قائم کرنے کی کوئی بنیاد نہ رہے گی کہ تنزلیت ہی معاشی ترقی کے راستے کی بڑی رکاوٹوں میں سے ایک ہے۔
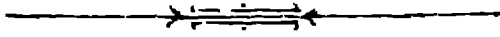
124

ہندوستان کی معاشی حالت میں تغیر

۱۔ انگلستان کا صنعتی انقلاب

اس باب میں ہم معاشی ترکیب و تنظیم کے ان اساسی تغیرات پر تبصرہ کریں گے جنھوں نے اس ملک کی زندگی اور محنت کو گزشتہ ایک سو سال میں بدل دیا ہے۔ جو قوتیں برسر کار رہیں وہ ایک حد تک وہی تھیں جن کی مختصر تعریف "صنعتی انقلاب" کی اصطلاح میں کی گئی۔ ان قوتوں کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے انگلستان کے صنعتی انقلاب کا حال اجمالی طور پر بیان کر دینا مفید ہوگا۔

گو انگلستان کے صنعتی انقلاب نے ایک اعتبار سے تباہ کن نتائج پیدا کیے، لیکن دوسرے اعتبار سے وہ خود ایسی قوتوں کا نتیجہ تھا جو کامل نشو و نما پانے سے قریب قریب دو سال پیشتر سے کارفرما تھیں اور جنھوں نے اٹھارھویں صدی کے کم و بیش وسط میں کافی قوت حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ ان ہی کے نتیجے کے طور پر وہ جاذب نظر تغیرات وقوع پذیر ہوئے جن سے "صنعتی انقلاب" کا نام خاص طور پر منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کے متعدد اسباب تھے "صنعتی انقلاب

باب ۵

نے پہلی دفعہ رونما ہو کر انگلستان کو اپنا مرکز کیوں قرار دیا۔ امریکہ کی دریافت اور ہندوستان کے بحری راستے کے انکشاف کے باعث سولھویں اور سترھویں صدی میں جو تجارتی انقلاب رونما ہوا وہ صنعتی انقلاب کا لازمی پیش خیمہ تھا' اس لیے کہ تجارتی انقلاب نے تجارت بین الاقوام کی نوعیت اور پیمانے کی کایا پلٹ دی اور عالمگیر بازار کھول دیئے جو صنعتی انقلاب کی میکانکی ایجادوں کی پیداوار بہت بڑی مقدار میں جذب کر لیتے تھے۔ مغربی یورپ کے ملکوں کے "تجارتی" اصول کی امتیازی خصوصیت تجارتی اجارہ کا نظریہ تھا جس کے باعث سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں معاشی قومیت کی جنگوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اور گو انگلستان ان جنگوں سے کامیاب اور سرخرو نکلا اور اس کی بحری اور تجارتی طاقت پہلے سے بہت زیادہ ہو گئی' لیکن انگلستان کے رقیبوں اور حریفوں کے ذرائع وصنائع نہایت کمزور ہو گئے اس کی وجہ سے انگلستان کی مسابقت کی قوت بہت بڑھ گئی۔ علاوہ ازیں جس زمانے میں انگلستان میں صنعتی انقلاب رونما ہوا اسی زمانے میں ہندوستان میں برطانوی حکومت واقتدار مستحکم طور پر قائم ہوا' اور ہندوستان کے بڑے بڑے بازاروں کا کھل جانا لنکا شائر کی نئی سوتی صنعت کے حق میں زبردست محرک ثابت ہوا۔ دوسرے اکثر عاملین بھی انگلستان کی جدید تحریک کی موافقت میں تھے۔ مثلاً (۱) انگلستان کی جزیرے کی حیثیت جو اس کو اس کے حدود کے اندر جنگ کی تباہ کاریوں سے محفوظ رکھتی تھی؛ (۲) ملک کے اندر تجارت آزاد کا رواج (۳) عمومی قانون کا تسلط جس نے جاگیریت اور فرقہ وارانہ بے اطمینانی کی خرابیوں کو بڑی حد تک رفع کر دیا؛ (۴) حکومت کا پارلیمانی شکل میں قائم ہونا جس پر زمیندار امرا مسلط ہیں اور قومی صنعتی وتجارتی میلان رکھتے ہیں؛ (۵) سرکاری قواعد وضوابط کے بارے میں شدید بدگمانی جو اسٹورٹ کی آمریت کی یاد سے پیدا ہوئی؛ (۶) مذہبی رواداری کا اصول جس کی رو سے غیر ملکی ماہر دستکاروں کے توطن داخلی کا خیر مقدم کیا گیا؛ اور (۷) بنک کاری اور اعتبار کی باموقع ترقی۔ اٹھارھویں صدی کے انگلستان میں مرکزی ومقامی مذہب و سیاسیات میں جو جمود پیدا ہو گیا تھا اس نے صنعت پر توجہ مرتکز کرنے میں

125

مزید مدد دی) اور میکانی ایجادوں کے حق میں محرک کا کام کیا؛ طبیعی علوم کے انکشافات اور ریاضی کے احیا سے خیالات میں جو جوش اور ولولہ پیدا ہو چکا تھا وہ بھی ایجادوں کے حق میں مؤثر ثابت ہوا[۱]۔

۲۔ انگلستان کے صنعتی انقلاب کی چار بڑی خصوصیتیں۔

انگلستان کے صنعتی انقلاب کی چار بڑی خصوصیات تھیں، (۱) زراعت میں انقلاب (۲) نقل و حمل میں انقلاب (۳) صنعت میں انقلاب (۴) معاشی خیال اور پالیسی میں انقلاب؛ اور ان میں سے ہر ایک دوسرے پر اثر انداز ہوا اور سبھوں نے باہم عمل اور ردعمل کیا۔ سب سے اول زراعت میں تغیر رونما ہوا جو نتیجہ تھا انگلستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کے زیادہ مقدار میں اشیائے خوردنی طلب کرنے کا؛ چنانچہ دور وسطیٰ سے مشترکہ کھیتوں کی کاشت کے جو تباہ کن دقیانوسی طریقے رائج چلے آ رہے تھے ان کی جگہ حقیت اراضی کے ایک جدید نظام نے لی اور زرعی کارکردگی بہت بڑھ گئی۔ زرعی سائنس کی ترقی اور سائنٹیفک کاشت کی عملی ضرورت و اہمیت نے دوسری "احاطہ بندی کی تحریک" کا موقع بہم پہنچایا جس کی وجہ سے ملکی کاشتکاری غائب ہوگئی اور بے زمین مزدوروں کی جماعت اور سرمایہ دار آسامی کاشتکاروں کا گروہ جو ان مزدوروں سے کام لیتا تھا، نمودار ہوا۔ اس طرح موجودہ تین قسمیں رونما ہوئیں: یعنی بڑا زمیندار، سرمایہ دار کاشتکار اور بے زمین زرعی مزدور۔ انقلاب نے نقل و حمل اور صنعت کے شعبے میں اپنے آپ کو یوں ظاہر کیا کہ ایک تو ذرائع آمد و رفت میں اصلاح و ترقی ہوئی ایسی سڑکیں بن گئیں جن پر محصول وصول کرنے کی چوکیاں قائم کی گئیں اور قابل عبور نہریں تعمیر ہوئیں۔ دوسرے کوئلے، لوہے اور پارچہ بافی کی صنعتوں میں مختلف قسم کی ایجادیں عمل میں آئیں، خاصکر کاتنے کی کل، جلاہے کا قوت سے چلنے والا راچھ، اور دخانی انجن۔ تیسرے فیکٹری کا طریقہ رائج ہوگیا جس کی بدولت کارخانوں میں بڑے پیمانوں پر کام ہونے لگا اور انسانی محنت کی جگہ کلوں نے

[۱] دیکھو جے ایل اینڈ بی ہیمنڈ کی کتاب موسوم بہ "جدید صنعت کی ترقی" صفحہ ۶۴ تا صفحہ ۹۶

باقیہ: لے لو یعنی ۱۸۱۵ء سے آگے جنگ، وسائل نقل و حمل و ذرائع آمد و رفت میں ایک انقلاب شروع ہوا جس کی بنا پر آخر میں چل کر ریلیں، دخانی جہاز اور ٹیلیگراف وجود میں آئے۔ صنعتی انقلاب، صنعت پارچہ بافی، کان کنی اور لوہے کے کارخانوں سے شروع ہو کر بتدریج دوسرے صنائع میں بھی رونما ہوا، اور اس کی ترقی میں مشترکہ سرمایہ کی کمپنیوں کے نظام نے جن کی ذمہ داری محدود تھی، اور اعتبار و بنک کاری کی توسیع نے مزید سہولتیں بہم پہنچائیں۔

126 ان تغیرات کے زیر اثر معاشی خیال نے آدم اسمتھ کے زمانے سے ایک نیا رخ اختیار کرنا شروع کیا جو قوم کی معاشی زندگی کی مفصل سرکاری نگرانی و تنظیم کے قدیم نظام کے خلاف "فطری آزادی اور انفرادی کاروبار" کے اصول پر مبنی تھا۔ چنانچہ اس قدیم نظام کے خلاف آدم اسمتھ کی کتاب "دولت اقوام" بڑی حد تک ایک مدلل اور طاقتور احتجاج تھی۔ نئے معاشی مسلک (اسکول) نے اپنا عام اصول "کار مداخلت نہ کرو" قرار دیا اور اجرت اور کار آموزی وغیرہ کے متعلق قدیم تنظیمی ضوابط کو پوری طرح منسوخ کرانے کا بھی وہی ذمہ دار تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اصلداران کاروبار اور آزاد مسابقت کی راہ سے سب موانع دور ہو گئے اور صنعتی انقلاب کی رفتار بہت تیز ہو گئی۔ ضمناً ہم یہ بیان کر سکتے ہیں کہ گو "انتہائی غیر مداخلت" کے اصول نے صنعتی انقلاب کی ترقی کی رفتار تیز کر دی لیکن عبوری دور کی ان خرابیوں میں اضافہ کر دیا جو کسی انقلاب انگیز تبدیلی سے وابستہ ہوتی ہیں اور ان متعدد تکالیف و شکایات کے ازالہ کو ملتوی کر دیا جو زیادہ تر صنعتی انقلاب سے رونما ہوئے تھے۔

۴۔ صنعتی انقلاب کے نتائج

صنعتی انقلاب کے نتائج بہت نمایاں تھے۔ پیدائش دولت میں بہت بڑا اضافہ ہوا، تجارت داخلہ و خارجہ میں بہت خاصی توسیع ہوئی، انگلستان کی آبادی جنوبی حصے سے شمالی حصے میں بہت بڑی تعداد میں منتقل ہوئی اور اس کے ساتھ ہی مجموعی تعداد میں بہت سریع اضافہ ہوا۔ اس کے علاوہ ملک کی معاشرتی اور معاشی تنظیم میں اساسی تغیرات ہوئے، چنانچہ معاشی و سیاسی اقتدار اصلدار جماعتوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو گیا

جس کی وجہ سے مزدور پیشہ طبقوں کے اغراض کو زراعت اور صنعت دونوں شعبوں میں نقصان پہنچا۔ گھریلو صنعت کی جگہ بڑے پیمانے پر کام کرنے والی فیکٹری نے لے لی جہاں ہزاروں مزدور کام کرنے لگے جن کا تعلق اصلداروں سے زر نقد (بطور اجرت) کے رشتے کے سوا کچھ نہ رہا، اور وہ انسانی تعلقات جو مزدور اور اس کے آقا میں قدیم زمانے میں پائے جاتے تھے ناپید ہو گئے۔ اصل اور آلات پیدائش سرمایہ داروں کی چھوٹی سی جماعت کے ہاتھوں میں منتقل ہو گئے جس کی وجہ سے اصلدار اور مزدور میں تفریق پیدا ہو گئی اور معاشرہ دو متضاد و باہم گر برسر پیکار گروہوں میں منقسم ہو گیا۔ مزدور کی زندگی کو غیر محفوظ اور پر خطر بنانے والی بے روزگاری کی ہر وقت کی دھمکیاں، معاشرے کے شیرازے کو درہم و برہم کرنے والی اور بار بار وقوع میں آنے والی ہڑتالیں اور دربندیاں اور معاشی توازن میں متواتر بحرانوں کی رخنہ اندازیاں، یہ سب چیزیں جدید صنعتی نظم و ترتیب کی خصوصیات بن گئیں اور معاشرے کو نئے اور پیچیدہ معاشرتی سیاسی اور معاشی مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔

۴۔ موریسن کی تقسیم قدیم اور جدید وضع کے ملک[۱]

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ انگلستان کے ان تغیرات کے بالمقابل ہندوستان میں کیا تغیرات رونما ہوئے۔ لیکن ہم ہندوستان کی معاشی حالت کے تغیر کی بحث اس تقسیم سے شروع کریں گے جو موریسن نے دنیا کے ملکوں کے مابین قائم کی ہے۔ موریسن ملکوں کو دو وسیع حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ (۱) وہ ملک جو قدیم معاشی نظم سے تعلق رکھتے ہیں اور ابھی تک صنعتی انقلاب کے دور سے نہیں گزرے ہیں۔ اور (۲) وہ ملک جو نئی معاشی وضع سے تعلق رکھتے ہیں اور صنعتی انقلاب کے دور سے گزر چکے ہیں پہلی قسم کے ملکوں کی مثال کے طور پر مصر، مشرقی یورپ کے ممالک اور ہندوستان کو پیش کیا جا سکتا ہے، جہاں صنعتوں کا قدیم نظام اب بھی نئے تغیرات سے غیر متاثر ہے۔ دوسری قسم کی مثال کے طور پر انگلستان، فرانس، جرمنی اور ریاستہائے متحدہ کو پیش کیا جا سکتا ہے، جہاں قدیم نظام کی جگہ پیدائش و تقسیم کے نئے طریقوں نے

127

[۱] دیکھو موریسن کی کتاب موسوم بہ ہندوستان میں معاشی حالت میں تغیر صفحہ ۱ تا صفحہ ۳۔

باب۵

پوری طرح لے لی ہے۔ لیکن یہ ایک بعدی قسم کی تقسیم ہے، اس لیے کہ دونوں قسموں کے مابین کوئی نمایاں خط فارق نہیں ہے۔ پہلی قسم کے اکثر ممالک دوسری قسم کے تحت جانے کا میلان ظاہر کر رہے ہیں اور ان میں سے بعض میں تغیر رونما ہو چکا ہے۔ ہمارے پیش نظر مقصد کے لیے، ہندوستان اور انگلستان کو ایسے دو ملکوں کی حیثیت سے لیا جا سکتا ہے جو متضاد معاشی قسموں کی نمایندگی کرتے ہیں۔ ہندوستان اب بھی بڑی حد تک قدیم معاشی نظام سے تعلق رکھتا ہے، اگرچہ اس کی علامتیں پائی جاتی ہیں کہ اس کا میلان دوسری قسم میں مبدل ہونے کی جانب ہے۔ انگلستان کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا صنعتی انقلاب ختم ہو چکا ہے، جس کی وجہ سے وہاں کی زندگیٔ محنت کے حالات غالباً دوسرے کسی مقام سے زیادہ مکمل طور پر متاثر ہوئے۔ قدیم صنعتی نظام بعض طبعی حالات کا نتیجہ تھا جو دنیا کے قریب قریب ہر ملک میں کسی نہ کسی وقت میں پائے جاتے تھے اور جہاں کہیں وہ موجود رہے ان کا پیدا کیا ہوا معاشی نظام کم و بیش یکساں تھا۔

۵۔ قدیم نظام کی خصوصیات

پہلی قسم یا قدیم معاشی نظام سے تعلق رکھنے والے ملکوں کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔ (۱) مسابقت اور معاہدے پر رواج و حیثیت کا غلبہ۔ (۲) آبادی کی چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم و تفریق جیسی کہ دیہات میں پائی جاتی ہے اور ناقص ذرایع نقل و حمل و وسائل آمد و رفت کی وجہ سے ان کا معاشی حیثیت سے خود مکتفی یا خود کفیل ہونا۔ (۳) زراعت کا غلبہ دوسرے پیشوں پر اور اس کے نتیجے کے طور پر مختلف پیشوں میں آبادی کی تقسیم غیر مساوی ہونا اور شہری آبادی سے دیہی آبادی کا تناسب بہت بڑھا ہوا ہونا (۴) بازار کے تنگ و محدود ہونے کی وجہ سے تقسیم عمل کا سادہ اور نامکمل حالت میں ہونا۔ (۵) دستکار کا گھریلو صنعت اور دستکاری کو چھوٹے پیمانے پر اور بذات خود آزادانہ طور پر چلانا؛ اور اس کے نتیجے کے طور پر صنعت میں اصل کا بہت چھوٹی مقدار میں لگایا جانا اور درمیانی منتظم یا آجر کا موجود نہ ہونا۔ (۶) معاشی انتظام میں زر کی عدم موجودگی اور مبادلۂ اشیا (جنسی مبادلت) یا چیزوں کا براہ راست ایک دوسرے سے مبادلہ کرنے کے طریقے کا رائج ہونا۔ (۷) اعتبار کا غیر منظم ہونا اور ربا کا رواج۔

باب ۲۸

۶۔ جدید نظام کی خصوصیات۔

دوسری قسم یعنی جدید معاشی نظام سے تعلق رکھنے والے ملکوں کی خصوصیات حسب ذیل اور مذکورۂ بالا خصوصیات کی ضد ہیں:۔ (۱) معاہدے اور مسابقت کی آزادی۔ (۲) صنعتی دنیا کے مختلف حصوں کا ایک دوسرے پر قریبی انحصار' وسائل حمل و نقل و ذرائع آمد و رفت کی ترقی و توسیع کی بدولت۔ (۳) مختلف پیشوں میں آبادی کی مقابلتہً مساویانہ تقسیم اور زراعت کی مقابلتہً غیر اہم حیثیت' اور اس کے نتیجے کے طور پر دیہی آبادی کے مقابلے میں شہری آبادی کی کثرت (۴) تقسیم عمل زیادہ پیچیدہ اور مکمل ہوتی ہے جس میں بازاروں کی روز افزوں توسیع و ترقی اور کلوں کا روز بروز زیادہ استعمال سہولتیں بہم پہنچاتا ہے۔ (۵) صنعت کی تنظیم بڑے پیمانے پر' جس کا اقتضا یہ ہے کہ سرمایہ بڑی تعداد میں لگایا جائے اور چند ماہر آجراس کی نگرانی کریں، بڑی فیکٹریوں اور صنعتی مرکزوں میں مزدوروں کا اجتماع وارتکاز اور مزدوروں اور اصلداروں میں شخصی تعلقات کی عدم موجودگی۔ (۶) مبادلۂ اشیا (جنسی مبادلت) کے طریق کی بجائے زر کا نظام۔ (۷) اعتبار اور بنک کاری کی ترقی اور ربا کی عدم موجودگی۔

آج کل ہندوستان کی حالت معاشی حیثیت سے بدل رہی ہے' اور کم و بیش کے فرق سے ایسی خصوصیات ظاہر ہو رہی ہیں جو دونوں قسم کے ممالک سے تعلق رکھتی ہیں۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان ترقی تو کر رہا ہے لیکن اس کی رفتار ہر جگہ یکساں نہیں ہے بلکہ صدیوں کے فرق کو ظاہر کرتی ہے' اس لیے کہ بعض علاقے معاشی حیثیت سے دور قدیم کی نہیں تو دور وسطیٰ کی حالت پیش کرتے ہیں اور باقی قطعی طور پر دور جدید میں قدم رکھ چکے ہیں اور ان کے معاشی حالات میں ویسی ہی مکمل ترقی ظاہر ہوئی ہے جیسی کہ مغربی یورپ کے اکثر ترقی یافتہ ملکوں میں پائی جاتی ہے۔ پھر بھی ترقی کا میلان مذکورہ بالا دوسری قسم کے روز افزوں غلبے کی جانب ہے۔

۷۔ قدیم معاشی تنظیم؛ گاؤں۔

ہندوستان میں جو تغیر واقع ہوا ہے اس کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے اس قدیم معاشی نظام کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرنا ضروری ہے جو نئی قوتوں کے اس پر یورش کرنے سے پیشتر موجود تھا۔

ہندوستان کے قدیم معاشی نظام کی پہلی اہم خصوصیت یہ ہے کہ ملک دیہات میں منقسم ہے' جہاں آبادی کا بیشتر حصہ سکونت پذیر تھا اور آج تک ہا برہے۔ دنیا سے

باب ۴

الگ تھلگ اور اپنی تمام ضرورتوں کا خود کفیل گاؤں قدیم ہندوستانی معیشت کی اکائی تھا؛ چنانچہ ہمیں گاؤں ہی کی جانب متوجہ ہو کر ان حالات کی تحقیق کرنی چاہیے جن کے تحت قدیم وضع اور میلان کے لوگ رہتے بستے اور کام کرتے ہیں۔

129

۸۔ گاؤں کی ابتدا کیسے ہوئی اور وہ اب تک کیوں قایم ہے۔

"گاؤں" جس خاص قسم کی بستی کا نام ہے اس کے وجود کی تشریح و توجیہ کے سلسلے میں مختلف مفروضات پیش کیے گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی فرقہ یا قبیلہ جو پہلے خانہ بدوش تھا زراعت کے لیے جنگل کو خس و خاشاک سے صاف کرنے کے مشکل کام کی بنا پر اس بات پر مجبور رہا ہو کہ موثر تعاون کے اغراض کے لیے کسی ایک مقام پر مستقل سکونت اختیار کر لے۔ ممکن ہے کہ پانی کی رسد، دوسرا اثر انداز ہونے والا عامل ہو۔ پانی کسی مقررہ رقبے میں ہر جگہ آسانی و آزادی کے ساتھ دستیاب نہ ہونے کی صورت میں وہ علاقے جہاں اس کی کثرت تھی فطری طور پر آبادی کے ارتکاز کے لیے منتخب کر لیے گئے ہوں گے۔ ایک اور عامل جس نے اس ارتکاز کو تقویت پہنچائی ہوگی لازماً مخالف قبیلوں اور جنگلی جانوروں سے حفاظت کی ضرورت ہوگی۔ ہندوستان کی دیہی آبادی اپنی نظیر دنیا کے دوسرے علاقوں میں بھی رکھتی ہے۔ مثلاً انگلستان کے دور وسطیٰ کا "جاگیری قریہ" جرمنی کا "مارک" اور روسی "میر" یہ سب بظاہر مشابہت رکھتے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں دیہی تنظیم کی ثبات پذیری اور متعدد سیاسی انقلابات کے مقابلے میں اس کا اصلی حالت میں قایم رہنا، عام طور پر ہندوستانی خصوصیات میں شمار کیا گیا ہے[1] خاصکر بیرونی مبصروں کا یہی خیال ہے اور ٹھیٹ دیہقانی سادگی اور خوشحالی کو جو قدیم ہندوستانی دیہی برادریوں کا طرۂ امتیاز تھی پُرشوکت الفاظ میں بیان کیا گیا ہے[2]۔

---

[1] دیکھو ٹی موریسن کی تصنیف موٹابالا صفحہ ۴۴۔

[2] قاری کو سر چارلس مٹکاف کی ۱۸۳۰ء کی یادداشت کی مندرجہ ذیل عبارت جس کا عام طور پر حوالہ دیا جاتا ہے یاد ہوگی کہ: "دیہی برادریاں چھوٹے چھوٹے جمہوریے ہیں جن میں ضرورت کی قریب قریب کل چیزیں موجود ہیں وہ بیرونی تعلقات سے بالکل الگ تھلگ ہیں خواہ کوئی اور چیز برقرار رہے یا نہ رہے لیکن یہ بظاہر برابر

باب ۳

لیکن اس خیال کو کہ گاؤں بیرونی جنگوں اور انقلابات کا اثر لیے بغیر زندگی بسر کرنے کے قابل تھا بہت کچھ تحفظات و شرائط کے ساتھ تسلیم کرنا چاہیے۔ چنانچہ یہ خیال کرنا ناممکن ہے کہ اٹھارھویں صدی میں جس وقت کل ملک میں جنگ و جدال اور ڈکیتی کا دور دورہ تھا، دیہات بالکل محفوظ رہے ہوں گے اور انھیں پرسکون زندگی بسر کرنے کا موقع ملا ہوگا۔ عام طور پر یہ ہوتا تھا کہ حملوں کی مدافعت کے لیے انھیں مجبوراً اپنی ہی قوت پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا۔ ہم یہ خیال کر سکتے ہیں کہ ان حملوں کو مسترد کرنے میں وہ گاہ گاہ کامیاب ہوتے تھے لیکن عام طور پر دشمن اس قدر قوی ہوتا تھا کہ کامیاب مقابلہ دشوار بلکہ غیر ممکن ہوتا تھا۔ تاخت و تاراج اور لوٹ مار یقیناً ان کی زندگی و معیشت میں وقتاً فوقتاً ہر طرح خلل انداز ہوئی ہوگی اور اس سے بچ کر سابقہ حالت پر عود کر آنے کا عمل بہت سست رفتار اور تکلیف دہ رہا ہوگا۔ یہ خیال کرنا مشکل ہے کہ دیہات، اردگرد کی جنگوں اور انقلابات کے اثر سے محفوظ رہ کر اپنی معمولی پُر امن و سکون زندگی بسر کر سکتے تھے۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ ہی جس سیاسی بدنظمی و طوائف الملوکی کا ملک میں دور دورہ ہوا وہ اپنا زہریلا اثر دیہات تک وسیع کرنے اور ان کی معاشی زندگی پر کاری اور مکرر ضرب لگانے سے قاصر نہیں رہ سکتی تھی۔ اس واقعہ کو کہ دیہی تنظیم صدیوں تک تقریباً غیر متبدلہ حالت میں برقرار رہی اس امر کی جانب منسوب نہ کرنا چاہیے کہ ہندوستانی دیہات میں باقی رہنے کا جبلی وصف موجود ہے بلکہ بعض مستقل عاملوں مثلاً وسایل آمدورفت کی عدم موجودگی اور اس کے نتیجے کے طور پر نظم و نسق حکومت میں موثر مرکزی نظام کے فقدان کی جانب منسوب کرنا چاہیے۔

130

۹ ٹھیٹ ہندوستانی گاؤں

ٹھیٹ ہندوستانی گاؤں میں مزروعہ رقبے کچھ افتادہ زمین کے ساتھ یا بغیر ہوتے ہیں۔ اس مجموعی زمین میں عام طور پر ایک مرکزی

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ قائم ہیں۔ ان دیہی برادریوں میں سے ہر ایک اپنے طور پر ایک جداگانہ چھوٹی مملکت ہوتی ہے ان کا یہ اتحاد ان کی خوشحالی میں بہت بڑا حصہ رکھتا ہے اور ان کی آزادی اور بے تعلقی کو برقرار رکھنے کا بڑی حد تک ذمہ دار ہے۔"

[1] دیکھو "لمہ" (یس 'مل نے کر کی کتاب موسوم بہ "منرلی ہند کی دیہی برادریوں کی سرگزشت"۔ صفحہ ۱۰۵ تا صفحہ ۱۰۶۔

باب ۶

خطہ ہوتا ہے جہاں سکونتی مکان قریب قریب واقع ہوتے ہیں اور اس مرکزی خطے کے اردگرد متعدد دائروں میں یکے بعد دیگرے پھیلی ہوئی گاؤں کی زمینیں ہوتی ہیں بعض صورتوں میں کھیتوں میں چھوٹے چھوٹے منتشر مکانات اور باڑے پائے جاتے ہیں، گو کسان جان و مال کی بہتر حفاظت کی خاطر اور دوسرے اسباب کی بنا پر معمولی طور پر دیہی سکونتی رقبے کے اندر اپنے مکان میں رہتا سہتا ہے۔ گاؤں عام طور پر درختوں کے جھنڈ کی ملکیت کا فخر رکھتا ہے، اور اسی کے ساتھ وہاں کسی نہ کسی قسم کا سرکاری دفتر بھی ہوتا ہے جہاں دیہی عہدہ دار اپنے بہی کھاتے رکھتے اور اپنا کاروبار انجام دیتے ہیں[1]۔

۱۰۔ دیہی نظم

(۱) کسان

دیہی نظم کی جانب عود کرتے ہوئے سردست ہندوستان کے دیہات کی دو بڑی قسموں یعنی ایک رعیت داری یا انفرادی گاؤں اور دوسرے مشترکہ گاؤں کے باہمی فرق کو نظرانداز کرنا اور دونوں کی مشترکہ خصوصیات ظاہر کرنے کے لیے صرف ایک عام بیان کی کوشش کرنا مناسب ہوگا۔ ہر گاؤں کلیتہً خودکفیل معاشی اکائی ہوتا ہے جس کے حدود کے اندر زرعی و صنعتی جد و جہد کے لیے کل مطلوبہ محنت، اصل اور مہارت موجود ہوتی ہے۔ گاؤں کے باشندوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) کسان (۲) دیہی عہدہ دار اور (۳) دیہی دستکار اور ادنیٰ خدمتگزار۔ کسانوں کو بھی دو جماعتوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: (۱) خود کاشت زمیندار (۲) آسامی کاشتکار۔ یہ دونوں دیہی برادری کے اہم ترین طبقے کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ حقیقی کسان، خواہ وہ ملکی کسان ہوں یا آسامی، زیادہ تر چھوٹے چھوٹے کھلے کھیتوں پر کاشت کرتے ہیں (جو زرعی انقلاب سے پیشتر کے انگریزی دیہات کی بے باڑ کی عمومی زمینوں کی یاد تازہ کرتے ہیں)۔ ان پر آتنی ہی محنت صرف کی جاتی ہے۔ جتنی کہ وہ اور اس کا کنبہ مہیا کر سکتا ہے اور کہیں کہیں اجرت پر مزدور رکھے جاتے ہیں۔ جو تھوڑا بہت روپیہ اصل کے لیے درکار ہوتا ہے اس کو کسان ہی بطور خود رقم پس انداز کر کے یا زمیندار سے مستعار لے کر یا عام طور پر گاؤں کے مہاجن سے قرض لے کر مہیا کر لیتے ہیں۔

---

[1] دیکھو آر بیڈن پاول کی کتاب موسوم بہ "برطانوی ہند میں مالگزاری اور حقیت اراضی" صفحہ ۶۶

وہی کاشت کے خطرات برداشت کرتے ہیں، خود ہی اپنے چھوٹے کھیتوں کے منتظم و مہتمم ہیں اور خود ہی ماہر شیر بھی۔ جو کچھ پیداوار بچ رہتی ہے اس کو وہ قریب ترین بازار میں لے جاتے ہیں اور اس کے مبادلے میں نمک اور دوسری چھوٹی موٹی اشیاء ضرورت و تعیش خرید لاتے ہیں جو گاؤں میں دستیاب نہیں ہوتیں[1]۔

۱۱- دیہی نظم

(۲) دیہی عہدہ دار

ہر گاؤں اپنے عہدہ دار رکھتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ہندوستانی گاؤں نظم و نسق کی جس طرح پہلے اکائی تھا اسی طرح آج تک ہے۔ دیہی عہدہ داروں میں ہمیں سب سے اول گاؤں کے سرگروہ یا پٹیل کا ذکر کرنا چاہئے جو گویا رعیت واری گاؤں کا صدر المہام ہوتا ہے۔ اس کا عہدہ موروثی ہوتا ہے اور گاؤں کے امن و نظم اور مالگزاری کی وصول یابی کی ذمہ داری اسی کے سر ہوتی ہے۔ اس کو معمولی فوجداری اختیارات بھی عام طور پر حاصل ہوتے ہیں۔ اس کے قبضے میں ایک خطۂ زمین ہوتا ہے جسے "وطنی" زمین کہتے ہیں اور جو اس کی خدمات کے صلے کے طور پر اس کو ملتا ہے۔ گاؤں کا دوسرا عہدہ دار جو محاسب یا محرر کا کام کرتا ہے پٹواری یا کلکارنی کہلاتا ہے۔ یہی گاؤں کے سب حسابات اور یادداشتیں رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک چوکیدار بھی ہوتا ہے جو کوتوالی میں جرائم و واردات کی اطلاع کرتا ہے، خاطیوں اور مجرموں کو گرفتار کرتا ہے اور پولیس کی مدد کرتا ہے۔ اور سب سے آخر میں دیہی قاصد یا نامہ بر ہوتا ہے۔ ان عائدہ کو جنھیں بعض اوقات الوتہ دار (Alutes) یا دیہی خدمتگاروں یعنی (Balutes) بلوتہ داروں کہتے ہیں،... دست کاروں اور ادنیٰ خدمتگزاروں سے ممیز کیا جاسکتا ہے۔ موخر الذکر دیہی باشندوں کی تیسری جماعت ہے۔ قدیم زمانے میں اکثر دیہات میں پنچایتیں یا دیہی بزرگوں کی انجمنیں ہوتی تھیں جو ارزان اور موثر قسم کی ثالثی کی عدالتیں ہوتی تھیں اور عام حالات میں دیہی آبادی میں ایکا اور اتحاد قائم رکھتی تھیں۔

۱۲- دیہی نظم

(۳) دیہی دستکار

قدیم زمانے میں قریب قریب ہر گاؤں میں نجار، آہن گر، کمہار، جراح، موچی، دھوبی، زرگر، ٹٹ پونجئے دوکاندار اور تیلی وغیرہ

---

[1] دیکھو ٹی موریسن کی تصنیف محولہ بالا باب ۔ نیز منوہی کی تصنیف محولہ بالا باب ۔

باب ۴

جیسے دست کاروں کی مکمل تعداد ہوتی تھی۔ ہر گاؤں میں ایک مقدس آدمی بھی ہوتا تھا خواہ وہ نجومی ہو یا پروہت، گرو ہو یا فقیر۔ بڑے دیہات میں جلاہے کی موجودگی بھی ممکن تھی، اور تقریباً ہر گاؤں میں مہاجن بھی رہتا تھا جو عام طور پر ساہوکار اور ٹھوک غلہ فروش کے کاموں کو ملا کر انجام دیتا تھا۔ دستکار گاؤں کے خدمتگار ہوتے ہیں جن کا پیشہ موروثی ہوتا ہے اور جن کو اجرت بلحاظ کار شاذ ہی دیجاتی ہے۔ ان کو گاؤں میں رہنے کے لیے صرف مکان دیا جاتا ہے، لیکن سب گاؤں والوں کی ضرورتوں کی تکمیل ان کو کرنی پڑتی ہے جس کے لیے اہل دہ انھیں یا تو خام اشیاء مہیا کر دیتے ہیں یا ان اشیاء کی قیمت۔ ان کی محنت کے صلے کے طور پر ان کو سالانہ باقاعدہ زمین دیجاتی ہے یا فصل کی کٹائی کے وقت بہ شکل جنس کچھ معاوضہ دیدیا جاتا ہے[1]۔ لیکن ایسے دستکار جن کی خدمات کی صرف گاہ گاہ ضرورت ہوتی ہے، مثلاً جلاہے تو ان کو اجرت بلحاظ کار دیجاتی ہے اور صرف آلہ کشکر سازی یا بیل گاڑی جیسی اشیا کی تیاری کے لیے نجار جیسے دستکار کو زائد معاوضہ ادا کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۱۱ء کی کیفیت مردم شماری کے الفاظ کے مطابق "ہندوستان کی دیہی زندگی کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ہر گاؤں دستکاروں اور ادنیٰ خدمتگاروں کے مکمل عملے سے آراستہ ہوتا ہے، حتیٰ کہ کل کے بنے ہوئے کپڑے، مٹی کے تیل، چھتریوں وغیرہ جیسی مغربی اشیا کے حال میں رواج پانے سے پیشتر تک گاؤں اپنی جملہ ضروریات کا خود کفیل اور دوسروں سے بے نیاز ہوتا تھا، صرف نمک اور چند دوسری اشیائے تعیش مستثنیٰ تھیں جو گاؤں کے میلے میں خریدی جاتی تھیں یا کاروانوں کے ذریعے درآمد کی جاتی تھیں[2]۔

132

۱۳۔ گاؤں کا الگ تھلگ اور خود کفیل ہونا۔

گاؤں والے، سڑکوں اور ریلوں کے بننے سے پیشتر بیرونی دنیا سے بمشکل کوئی تعلق رکھتے تھے بجز اس کے کہ غلے یا کپڑے کا تاجر گاہے ماہے

---

[1] دیکھو بیڈن پاول کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۱۱۔

[2] دیکھو گاڈگل کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۱۰۔

آیا کرتا تھا اور ایک گاؤں کی زائد از ضرورت اشیا اپنے ساتھ لیجاکر دوسرے گاؤں کی احتیاج کو پورا کرتا تھا یا کبھی کبھی اپنی دستکاری کی پیداوار کو فروخت کرنے کے لیے کسی تجارتی مرکز کو جایا کرتا تھا۔ گاؤں کو اس بنا پر مجبوراً خودکفیل ہونا پڑتا تھا کہ بیرونی دنیا سے اس کا تعلق منقطع ہوتا تھا۔ بقول مورلینڈ "جہاں پانی کے ذریعے سے نقل و حمل غیر ممکن ہوتی ہے اور گاڑیوں کے ذریعے سے آمدورفت سست رفتار اور ناقابل اعتماد ہوتی ہے وہاں مبادلات ان ہی اشیا تک محدود رہتے ہیں جن کی نقل و حمل انسانوں یا لدو جانوروں سے ممکن ہوتی ہے۔" ابتدائی انیسویں صدی میں ہندوستان میں دریائے گنگا اور سندھ جیسے چند ہی دریائی راستے تھے، اور سڑکوں کی نقل و حمل ناقص اور ویسی ہی خراب تھی جیسی کہ آرتھر ینگ کے بیان کے مطابق ابتدائی اٹھارھویں صدی میں انگلستان کی تھی۔ مناسب سڑکیں بمشکل موجود تھیں، بجز ان چند سڑکوں کے جو مغلوں نے بنائی تھیں؛ اور جہاں کہیں وہ موجود تھیں ان کی حالت عام طور پر بے حد غیر اطمینان بخش ہوتی تھی اور ان پر رہزنوں اور ڈاکوؤں کا راج رہتا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے سڑکوں کی اصلاح و ترقی کے لیے کچھ بھی نہ کیا اس کو نظم و نسق سے زیادہ سروکار نفع سمیٹنے سے تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تجارت داخلہ غیر ترقی یافتہ حالت میں رہی۔ اس طرح بقیہ دنیا سے بالکل الگ تھلگ اور بے تعلق رہنے کی وجہ سے گاؤں اس بات پر مجبور ہو گیا کہ اپنی جملہ ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے خود اپنے طور پر مستقل انتظامات کرے، چنانچہ اس سلسلے میں مکانوں اور باقاعدہ معاوضے کا پیش کش دے کر اس نے دستکاروں کے مطلوبہ عملے کو اپنی جانب کھینچا۔ معمولی اوقات میں تو وسائل آمدورفت کی عدم موجودگی کے باعث گاؤں کو تکلیف اس لیے نہ ہوتی تھی کہ اس کی تنظیم میں اس کمی اور مجبوری کو ملحوظ رکھا گیا تھا اور اس کو اس طرح ترتیب دیا گیا تھا کہ اس کمی کا اثر زائل ہو جائے۔ لیکن قحط کے زمانے میں نقل و حمل کی سہولتوں کی عدم موجودگی کے باعث غلہ جہاں بکثرت ہوتا تھا وہاں سے قحط زدہ مقام کو منتقل کرنے میں مزاحمت پیدا ہوتی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ موخرالذکر مقام میں تکلیف و مصیبت زیادہ نازک صورت اختیار کر لیتی تھی۔ یہی بدیہی توجیہ ہے قیمتوں کے ان حیرت انگیز اختلافات کی جو متصلہ و ملحقہ دیہات میں پائے جاتے تھے۔ دیہات ایک دوسرے سے

باب ۳

بہت ہی قریب ہونے کے باوجود ذرائع نقل وحمل کی عدم موجودگی کی وجہ سے آپس میں بہت دور کا تعلق رکھتے تھے۔ لیکن دیہات میں غلے کے ذخائر کی موجودگی قلت وتنگی محسوس نہ ہونے دینے کی ضامن تھی، بہ شرطیکہ قلت مختصر مدت تک محسوس ہو۔[1] چونکہ دیہی دستکاروں کی تیار کی ہوئی اشیا کا بازار تنگ اور محدود ہوتا تھا اس لیے تقسیم عمل نہایت غیر مکمل ہوتی تھی۔ تخصیص کے فوائد سے بڑی حد تک دست بردار ہونا پڑتا تھا اور بہت سا وقت اور مہارت ضایع جاتی تھی۔ نتیجہ یہ کہ دیہی صنعت بہت ہی پسماندہ حالت میں تھی۔ ہندوستانی دستکاری کی اعلیٰ درجے کی پیداوار پر تعریف وتوصیف کی عام طور پر جو بوچھار کی جاتی ہے اس کا اطلاق دراصل ان صنعتوں پر نہیں ہوتا جو دیہات میں رائج تھیں بلکہ قدیم زمانے کی شہری صنعتوں پر ہوتا ہے۔

188

۱۴۔ زر وغیرہ کی عدم موجودگی۔

دیہی زندگی کی ایک اور خصوصیت جس پر زور دینے کی ضرورت ہے یہ تھی کہ کچھ سال ادھر تک زر، مبادلات طے کرنے کے لیے یا خدمات کا معاوضہ ادا کرنے کے لیے بہت شاذ استعمال کیا جاتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ زر کی ضرورت ایسی خودکفیل قوم کو شاذ ہی محسوس ہوتی ہے جس کو بیرونی دنیا سے صرف چند ہی مبادلات عمل میں لانے پڑتے ہیں۔[2] چونکہ زراعت ہی اہم ترین دیہی صنعت تھی، اس لیے غلہ معیار قدر تھا اور اہل دِہ اسی کو آپس کے مبادلات میں استعمال کرتے تھے۔ غلے کی مانگ عام تھی اور اس کا وزن اور جسامت اس لیے حارج و مزاحم نہ ہوتی تھی کہ مبادلات زیادہ تر گاؤں کے حدود کے

[1] دیکھو گاڈگل کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۱۳۔

[2] لیکن قلت زر کی وجہ سے اس حد تک لازمی طور پر دشواری محسوس کی گئی ہوگی جس حد تک کہ حکومت کی جانب سے زمین کی مالگزاری نقد میں ادا کرنے پر اصرار کیا گیا ہوگا۔ اس صورت میں کسان کو اپنی پیداوار کا ایک جزو فروخت کرنا پڑتا ہوگا، اور اس معاملے میں اس کی حیثیت موجودہ حالت کے مقابلے میں حتی الامکان زیادہ کمزور رہی ہوگی۔ چونکہ نقل وحمل قلیل و پرخطر تھی اس لیے اغلب ہے کہ تاجر اپنی قیمت خرید اور قیمت فروخت کے درمیان زیادہ فرق کے طالب رہتے ہوں اور اشیائے خام کی تجارت برآمد میں چونکہ اس وقت تک ترقی نہ ہوئی تھی اس لیے بہ حیثیت مجموعی کسان اپنی اشیا کی بہترین ممکنہ قیمت حاصل کرنے کے بارے میں موجودہ زمانے سے بھی زیادہ کمزور و ناموافق حیثیت رکھتا ہو۔

باب ۲

اندر انجام پاتے تھے۔ غلے کی طرح جس شئے کی طلب شدید اور عام تھی وہ صرف زمین تھی، اور چونکہ اس کی ملکیت گاؤں میں اعلیٰ حیثیت اور رتبے کی علامت تصور کی جاتی تھی اس لیے اس کے ذریعے سے خدمات کا صلہ ادا کیا جاتا تھا خاصکر پٹیل کی طرح کے زیادہ اہم خدمتگاروں کو اسی کی شکل میں معاوضہ دیا جاتا تھا[1]۔ یہ معاوضہ جس شرح سے ادا کیا جاتا تھا اس کا تقرر دیہات کے رسم ورواج کے ایک مفصل وپیچیدہ لیکن بخوبی مفہومہ نظام سے ہوتا تھا۔ اس شرح کا تقرر نیز گاؤں کے دوسرے معاشی تعلقات کا انحصار مسابقت کی بجائے رسم ورواج پر تھا[2]۔

محنت کی عدم نقل پذیری اور گاؤں والوں کی قدامت پسندی موجودہ زمانے سے زیادہ قدیم زمانے کی امتیازی خصوصیت تھی، گو قدیم زمانے میں اتحاد اور ایکے کا احساس زیادہ قوی تھا اور اسی احساس کی کمزوری موجودہ زمانے کی صورت حال کی سب سے زیادہ اضطراب پیدا کرنے والی خصوصیات میں سے ایک ہے۔

دیہی نظام کے مذکورہ بالا بیان کو ان حالات کا آئینہ خیال نہ کرنا چاہیے جو آجکل دراصل پائے جاتے ہیں۔ ملک کے قدیم معاشی انتظام کے اکثر شعبوں کی طرح گاؤں میں بھی قابل لحاظ بلکہ بعض اعتبارات سے اساسی تبدیلی واقع ہوئی ہے، اور یہ سب کچھ ان نئے عاملین کے اثرات کے تحت ہوا ہے جو گزشتہ ایک سو سال میں رونما ہوئے۔ پھر بھی قدیم نظام کی جگہ جدید نظام نے ابھی تک پوری طرح نہیں لی ہے، اور ان تمام تغیرات وتنظیم کے باوجود جو واقع ہوئے ہیں، قدیم نظام کے خدوخال کو اس کی خالص شکل میں دیکھنا اب بھی ممکن ہے۔ گاؤں میں جو تغیر وتبدل واقع ہو رہا ہے اس پر اس باب میں متعاقب زیادہ مفصل بحث کی جائے گی۔

134

۱۵۔ رواج اور حیثیت

ہم راناڈے کا قول بیان کر چکے ہیں کہ ہندوستان میں بجز چند مستثنیٰ ومحدود صورتوں کے نہ تو آزاد وغیر محدود مسابقت کی خواہش ہے اور نہ سلیقہ۔ رواج اور سرکاری قوانین مسابقت سے

---

[1] دیکھو موریسن کی محولۂ بالا کتاب صفحہ ۵۴
[2] دیکھو متعاقب صفحات فصل (۱۵ تا ۱۸)

باب ۵

زیادہ طاقتور اور دسیل ہیں اور حیثیت کا اثر معاہدے سے کہیں بڑھا ہوا ہے"[1] ہندوستانی تہذیب و تمدن کی سکونی نوعیت، لوگوں کی قدامت پسندانہ جبلت اور خاص کر فطری معیشت یا جنسی مبادلت کے طریق نے رواج اور حیثیت کی پرورش کی اور ان کو مستحکم بنایا۔ ڈاکٹر کننگ ہیم جنسی مبادلت کو رواج سے اور زر کو مسابقت سے منسوب کرتے ہیں "جس وقت تک جنسی مبادلت کا طریق قایم ہے اس وقت تک لگان، اجرت اور محصولوں کی ادائی رواج کی بناپر ہونے کا قرینہ ہوتا ہے لیکن جب زر استعمال ہونے لگتا ہے تو ان مطالبات کی ادائیوں میں جلد جلد تغیرات واقع ہوتے ہیں اور وہ مسابقت کے ذریعے سے طے پاتے ہیں"۔

ہندوستان کے ذات پات اور اشتراک خاندانی کے طریقے کی تحقیق سے ہم کو اس بات کا سرسری اندازہ ہوا کہ فرد واحد کی زندگی کا راستہ اور اس کے معاشری و خانگی تعلقات کی کل رفتار معین کرنے میں یہ رسم و رواج کیا قوت رکھتے ہیں۔ جس وقت تک رسم و رواج پر جدید عناصر قابل لحاظ طریقے سے اثر انداز نہیں ہوئے اس وقت تک فرد واحد آزاد عامل نہ تھا اور اس کو اپنے پیشے، معیار زندگی اور سکونت وغیرہ کا انتخاب کرنے میں آزادی معاہدہ حاصل نہ تھی۔ کسی خاص ذات اور خاندان میں کسی فرد کی ولادت اس بات کا تعین کردیتی تھی کہ معاشرے میں اس کی حیثیت کیا ہوگی، خواہ یہ چیز اس کے لیے مضر ثابت ہو یا مفید، اور اس سے وہ بچ نہیں سکتا تھا۔ اس کو اسی حیثیت کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔ جو اس کے لیے ولادت کا اتفاقی امر متعین کردیتا تھا۔

تاریخی حیثیت سے، رواج نے ہر قسم کے معاشی تعلقات کا تعین کرنے میں اہم حصہ لیا ہے، صنعتی انقلاب سے پیشتر جاگیری نظام اور حرفتی پنچایتوں کے نظاموں کے تحت تمام یورپ میں اس کا دور دورہ تھا۔ البتہ کچھ سال ادھر سے مسابقت، رواج کی قائم مقام بنی ہے۔ اسی طریقے سے ہندوستان کے قدیم معاشی نظام کے تحت مسابقت کی بجائے رواج ہی کی بناپر لگان، اجرت، اور

---

[1] دیکھو صفحہ (۸ تا ۱۰)

185 قیمتوں کا تقرر ہوتا تھا۔ رواج کو محض رسم خیال کیا جا سکتا ہے جو عادت کی پختگی پر مبنی ہو، اور رواج کا اساسی تصور ہر قسم کی تبدیلی کی مقاومت ہے اور محض اس بنا پر کہ وہ تبدیلی ہے۔ لیکن نام نہاد رواج کے نظام کے تحت بھی، تبدیلہ رواج کے بھیس میں مسابقت کی خاموش قوت صاف طور پر نظر آتی ہے۔ رواج بہت زمانے تک مسابقت کے خلاف نہیں رہ سکتا؛ اس لیے کہ بقول موریسن[1] "مسابقت اس کشاکش حیات کا صرف دوسرا نام ہے جو تمام جاندار مخلوق میں جاری ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مسابقت اور رواج کے باہمی تضاد کو عام طور پر مبالغے کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ یہ بات عام طور پر معلوم ہوگی کہ ان سے بہت غیر مشابہ نتائج نہیں پیدا ہوتے۔ جب ان میں اختلاف رونما ہوتا ہے تو رواج میں عام طور پر اس طرح تبدیلی کر دی جاتی ہے کہ وہ معاملے کی عملی ضرورتوں کے مطابق بن جائے۔" رواج اور مسابقت کا باہمی تضاد و تخالف، تغیر پذیر حالات کے مطابق بننے کی سہولت اور درجے پر مبنی ہے۔ اس کا مفہوم دراصل یہ ہے کہ رواج کے تحت، تغیر دشوار ہے اور تغیر و تبدّل کی اس سے زیادہ مقاومت و مزاحمت ہوتی ہے جتنی کہ مسابقت کے تحت۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ رواج کے تحت کوئی تبدیلی ہی واقع نہیں ہوتی۔ بلکہ جہاں محنت و اصل کی نقل پذیری مکمل ہوتی ہے وہاں مسابقت رائج ہوگی، اور جہاں یہ نقل پذیری موجود نہ ہوگی وہاں رواج غالب ہوگا۔ رواج کے اثر کے سلسلے میں مل نے بتلایا ہے کہ وہ طاقتور کے مقابلے میں کمزور کی حفاظت و حمایت کرتا ہے اور قوانین و حکومت کی عدم موجودگی میں کمزوروں کا واحد محافظ ہے۔ دوسری جانب رواج کے معنی بہت عام طور پر یہ ہیں کہ طاقتور کی موافقت میں کمزور کو عادتاً دبایا جائے جیسا کہ حرفتی پنچایتوں اور ذات پات میں یا جاگیری نظام کے تحت ہوتا ہے۔ رواج فرد واحد کی آزادی کی تحدید کرتا ہے اور اس کو نامناسب و غیر ضروری طریقے پر قوم کا حد سے زیادہ تابع بنا دیتا ہے۔

۱۶۔ رواج اور لگان اب ہم یہ بیان کریں گے کہ قدیم زمانے میں مختلف

---

[1] دیکھو ٹی موریسن کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۹۵۔

باب۵ معاشی تعلقات پر رواج کا کیا اثر پڑا۔

لگان جو کسان، زمینداروں کو ادا کرتا تھا، زیادہ تر رواجی ہوتا تھا اور اس میں ایک نسل سے دوسری نسل میں جاکر کوئی تغیر و فرق پیدا نہ ہوتا تھا۔ بعض ایسے خاص حالات بھی تھے جو مسابقت کے تحت بھی لگان کو غیر تغیر پذیر بناتے تھے۔ مثلاً قدیم زمانے میں ہندوستان میں زمین کی رسد زیادہ اور طلب کم تھی اور اسامی ڈھونڈے نہ ملتا تھا۔ یہ حالت موجودہ زمانے کے برعکس تھی کہ آجکل زمین کی رسد کم اور طلب زیادہ ہے اور زمین کاشت کے لیے بہ مشکل دستیاب ہوتی ہے۔ بہرحال اس صورت حال کی توجیہ کم از کم ایک حد تک اس واقعے میں مضمر ہے کہ اسامی کو سیاسی حالات کی بدنظمی و بے امنی کے باعث اس بات کا ہمیشہ یقین نہ ہوتا تھا کہ زمین پر کاشت کرنے کے بعد وہ اپنی جائز پیداوار سے متمتع ہونے کے قابل ہوگا۔ 136 علاوہ ازیں دائمی جنگ و جدل کے حالات کے تحت اسامیوں کا زمیندار کے تابع فرمان رہنا بہت مفید و کارآمد تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ بے امنی کے حالات کے پھیلے رہنے ہی کی وجہ سے اسامی اپنے زمیندار سے معاملہ طے کرنے میں سختی نہ برت سکتے تھے، اس لیے کہ وہی ان کا فطری محافظ تھا اور اس کی قوت و خوشحالی پر ان کا تحفظ موقوف تھا۔ ان حالات نے زمیندار اور اس کے اسامی کے درمیان منصفانہ اور باہم نفع بخش تعلقات قایم کیے۔ لیکن جس وقت امن قایم ہوگیا زمیندار رواجی لگان وصول کرنے میں کوتاہی نہیں کرتا تھا، اور یہ تبدیلی پھر بھی حقیقی تھی، اس لیے کہ اس میں مقررہ لگان وصول کرنے کے بجائے زائد محصول عائد کرنے کا ہنرمندانہ طریق کار پوشیدہ ہوتا تھا۔

۱۷۔ رواج اور اجرت۔

رہی اجرت تو زمین کی کاشت کے لیے اجرتی مزدوروں سے جس خفیف حد تک بھی کام لیا جاتا تھا اس حد تک بعض مسلمہ رواجوں کی بنا پر معاوضۂ محنت کی تنظیم کی جاتی تھی چنانچہ عام طریقہ یہ تھا کہ مزدور کو اس کے آجر کے مکان میں قیام و طعام مہیا کیا جاتا تھا یا

سلہ۔ دیکھو مارٹن لیک کی کتاب موسومہ "ہندوستانی زراعت کی اساس" صفحہ ۱۳۰۔

جنس کی شکل میں مقررہ معاوضہ ادا کیا جاتا تھا۔ مزدور کو ایک طویل مدت تک بلکہ عام طور پر سال کے حساب سے مقرر کر لیا جاتا تھا۔ چنانچہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ دیہی دستکاروں کو دیہی جماعت کی خدمات انجام دینے کا معاوضہ از روئے رواج مقررہ سالیانہ کے طور پر جنس کی شکل میں ادا کیا جاتا تھا جو ہر کسان سے غلہ کوٹتے وقت ہی وصول کر لیا جاتا تھا۔ اس طرح اس طریق پر متعلقہ فریقین کے نقطۂ نظر سے بحیثیت مجموعی بخوبی عملدرآمد ہوتا رہا۔ لیکن معاوضوں کی مقدار اس لحاظ سے تغیر پذیر ہوتی تھی کہ ہر سال کی فصل کی نوعیت کے اعتبار سے تحصیلات کی مقدار مختلف ہوتی تھی، اور چونکہ معاوضہ جنس کی شکل میں ادا کیا جاتا تھا اس لیے ویسی پیچیدگی پیدا نہ ہوتی تھی جیسی کہ موجودہ زمانے میں زر کی قوت خرید کے تغیرات کے باعث اجرت صحیح و اجرت متعارفہ کے درمیانی فرق و عدم مساوات کی بنا پر رونما ہوتی ہے۔

۱۸۔ رواج اور قیمت۔ خریدی ہوئی اشیاء کے معاوضے میں زر دینے کا طریقہ، عام نہ تھا بلکہ استثنائی شکل رکھتا تھا۔ لیکن اس طریقے سے جس حد تک بھی خرید و فروخت عمل میں آتی تھی معمولی زمانے میں اس کو منظم کرنے کے لیے "رواج" طاقتور عامل تھا، اور ایک ایسے ماحول میں جہاں گاؤں کے قریب قریب سب معاملات رواج کے اثر کے تحت انجام پاتے تھے اس کے سوا کچھ اور ممکن بھی نہ تھا۔ لیکن غیر معمولی سالوں میں "رواج" مسابقت سے مغلوب ہو جاتا تھا، حتیٰ کہ قلت و خشک سالی کے زمانے میں قیمتیں بڑھ کر بہت اونچی سطح تک پہنچ جاتی تھیں اور افراط کے زمانے میں نہایت تیزی کے ساتھ نیچے آ جاتی تھیں۔ ان مقامی تغیرات میں اعتدال پیدا کرنے والے بیرونی اثرات اس لیے مفقود تھے کہ ذرائع نقل و حمل ناقص ہونے کی وجہ سے بیرونی بازاروں تک گاؤں کی رسائی نہ تھی۔ یہ ظاہر ہے کہ وسیع، منظم اور حساس بازاروں کی عدم موجودگی کی وجہ سے کل ملک کے لیے مسابقتی قیمتوں کی یکساں سطح جیسی کسی چیز کا وجود غیر ممکن تھا۔ چنانچہ ہم اوپر کسی موقع پر بیان کر چکے ہیں کہ ملحقہ دیہما یہ دیہات میں بھی قیمتوں میں عام طور پر حیرت انگیز فرق و اختلافات ہوا کرتے تھے۔

باب ۵

۱۹۔ قدیم معاشی نظام کے تحت شہر[1]

یہ اغلب ہے کہ گزشتہ صدی کے آغاز میں ہندوستان کی آبادی کا تقریب قریب ۱۰ فیصد حصہ شہروں اور قصبات میں رہتا تھا اور یہ تناسب اسی زمانے کے بعض یورپی ممالک مثلاً فرانس یا روس کے مقابلے میں زیادہ تھا۔ یہ بھی ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ ہندوستان کی صنعتی آبادی اس وقت بڑی حد تک دیہات میں بھی پھیلی ہوئی تھی۔ چنانچہ یہ خیال کیا گیا ہے کہ تقریباً ۴۰ فیصد آبادی دیہی و شہری صنائع پر انحصار کرتی تھی اور ۶۰ فیصد کا دارومدار زراعت پر تھا۔

اکثر قدیم ہندوستانی شہروں کی ابتدا اور خوشحالی کو مندرجۂ ذیل تین اسباب سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ (۱) وہ جاترائی مقام تھے یا کسی نہ کسی طرح کے مقدس مقام تھے، مثلاً الہ آباد، بنارس، گیا، ناسک، پوری، یا (۲) وہ کسی دربار یا حکومت کا مرکز تھے یا کسی صوبے کا پائے تخت تھے، مثلاً دہلی، لکھنو، لاہور، پونہ، تنجور، ارکاٹ، یا (۳) وہ تجارتی منڈیاں تھے اور تجارتی راستوں پر مناسب محل وقوع کی وجہ سے ان کو یہ حیثیت حاصل ہوگئی تھی مثلاً مرزاپور، بنگلور، ہبلی وغیرہ۔

تجارتی شہروں کے مقابلے میں مقدس مقام اور حکومت کے مرکز زیادہ اہم تھے۔ مقدس شہروں مثلاً بنارس میں پیتل، تانبے اور بھرت کی صنعتیں عروج پر تھیں۔ اس لیے کہ مقدس برتن، باسن اور ظروف یہاں بنائے جاتے تھے جن کی مانگ جاترائیوں اور زائرین میں مستقل اور کثیر تھی۔ درباری شہر بھی کسی طرح نظر انداز کرنے کے قابل نہ تھے۔ ان کی تعداد بھی کثیر تھی۔ وہ صرف شاہی درباروں کے سلسلے میں وجود میں نہیں آئے بلکہ چھوٹے چھوٹے رئیسوں اور نوابوں کی حکومت کا مرکز ہونے کی وجہ سے بھی بن گئے۔ ان کی سرسبزی و خوشحالی کا انحصار بدیہی طور پر دربار یا دارالسلطنت کی قدر دانی و سرپرستی پر تھا، اور جب شاہی دربار یا دارالسلطنت منتقل ہوا یا تباہ ہوا ان کو بھی زوال آ یا جیسا کہ دکن کے قدیم حکومتی مرکزوں مثلاً دیوگیری، پیتھن، بیجاپور اور وجیانگر کے

---

[1] شہروں کے متعلق ہمارا بیان زیادہ تر گاڈگل کی تصنیف محولۂ بالا پر مبنی ہے۔

ارے میں ہوا جو اس وقت بے رونق کھنڈر ہیں۔ اس قسم کے شہروں میں سامان تعیش تیار
کرنے والی صنعتیں غالب تھیں، مثلاً اعلیٰ درجے کی پارچہ بافی، زردوزی، طلائی و نقرئی
صنعت، ہاتھی دانت کے کام کی صنعتیں اور دوسری منتخب دستکاریوں کی فن کاری اور
سنگکاری۔ یہ صنعتیں اس زمانے میں بام عروج پر پہنچ گئی تھیں اور جملہ شیدائیان فن سے
خراج تحسین و توصیف وصول کرتی تھیں۔ تجارتی شہروں کی اہمیت کا باعث یہ تھا کہ وہ
تجارتی شاہراہوں پر واقع تھے اور سہولت کی بدولت انھوں نے چھوٹے گاؤں
سے ترقی کر کے شہروں کی حیثیت حاصل کر لی چونکہ اس زمانے میں ہندوستان کی
داخلی و خارجی تجارت کا پیمانہ بڑا نہ تھا، اس لیے اس قسم کے شہروں کی اہمیت محدود
رہی۔ تاہم ان کی حیثیت ان شہروں کی حیثیت کے مقابلے میں جو درباروں کی
خوشحالی و قدردانی پر منحصر تھے زیادہ ثبات پذیر تھی۔

اس زمانے میں بھی شہری زندگی کی اہم خصوصیات، دیہی برادریوں کی زندگی
کی خصوصیات سے فطری طور پر مختلف تھیں۔ اس لیے کہ ان کی آبادی نسبتاً زیادہ تھی جس کا
گزارہ ہمسایہ و ملحقہ دیہات کے غلے کی درآمد پر تھا۔ شہروں کے پیشوں اور حرفوں
میں زیادہ تنوع تھا، ان کی صنعت کی تنظیم بدرجہا بہتر تھی اور ان کے بازار وسیع
تھے۔ علاوہ ازیں شہروں میں مبادلات میں زر کا لین دین بہت زیادہ ہوتا تھا،
صرفت میں زیادہ آزادی سے کام لیا جاتا تھا اور اعتبار کی تنظیم بہت اچھی تھی۔
اشیا کو جمع کرنے اور اس کے بعد فروخت کرنے کی غرض سے ان کو تقسیم کرنے کا
طریقہ بہت قدیم زمانے ہی میں خاصا ترقی پا چکا تھا۔ تجارتی اغراض کے لیے معقول
انتظام کی موجودگی اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ یہاں ملکی اعتباری دستاویزات
استعمال کیے جاتے تھے اور ایک ساہوکار یا تاجر دوسرے کے نام ہنڈی
تحریر کرتا تھا۔ چنانچہ ہم جانتے ہیں کہ اس طریقے پر ہندوستان کے طول و عرض میں
ایک حساب سے دوسرے حساب میں زر بآسانی منتقل کیا جاتا تھا۔ بڑی تجارتی
کوٹھیاں صرف زر کا کاروبار ہی نہیں کرتی تھیں بلکہ سامان اور اشیا کی بھی تجارت
کرتی تھیں مثلاً مرزاپور اور بنارس میں ایسے سوداگر موجود تھے جو سامان فراہم و جمع
کر کے بہت وسیع رقبے میں تقسیم کرتے تھے۔

138

باب ۵

۲۰۔ ہندوستانی صنعتیں ماضی میں۔

بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کبھی صنعتی ملک رہا ہی نہیں اور اس کی قسمت ہی میں یہ لکھا ہوا ہے کہ وہ زرعی ملک بنا رہے۔ لیکن اگر اس بیان کا مفہوم یہ ہے کہ ہندوستان میں زراعت ہمیشہ سے اہم صنعت رہی ہے تو اس پر بحث کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اور اگر اس کا یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ ہندوستان اصطلاح کے جدید مفہوم میں صنعتی ملک نہیں رہا ہے تو اس سے بھی اتفاق کیا جا سکتا ہے، گو یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ انگلستان اور موجودہ زمانے کے دوسرے ممالک بھی جو صنعتی حیثیت سے ترقی یافتہ تھے، اپنی تاریخ کے زیادہ دور نہیں بلکہ متصل زمانے میں وہی حیثیت رکھتے تھے جو ہندوستان موجودہ زمانے میں رکھتا ہے۔ لیکن اگر اس بیان کا مفہوم یہ قرار دیا جاتا ہے کہ ہندوستان سراسر زرعی ملک تھا اور یہاں اس کے سوا کوئی دوسری صنعت قابل لحاظ نہیں تھی تو ہندوستان کی گزشتہ تاریخ کی شہادت پر اس بیان کو غلط ثابت کیا جا سکتا ہے[1]۔ سنہ ۱۹۱۸ء کے صنعتی کمیشن کا قول ہے کہ "ایسے زمانے میں جبکہ مغربی یورپ یعنی جدید صنعتی نظام کا مقام ولادت غیر مہذب قوموں سے آباد تھا، ہندوستان اپنے حکمرانوں کے تمول اور اپنے دستکاروں کی اعلیٰ درجے کی فنی مہارت کی بنا پر مشہور تھا۔ بلکہ اس کے بہت بعد کے زمانے میں بھی جبکہ مغرب کے مہات پسند تاجر پہلی دفعہ ہندوستان میں وارد ہوئے، یہ ملک صنعتی ترقی کے اعتبار سے یورپ کی زیادہ ترقی یافتہ قوموں کے مقابلے میں کسی طرح پیچھے نہ تھا[2]"۔ پروفیسر ویبر ارقام فرماتے ہیں کہ "نازک قسم کے بافتہ پارچوں کی تیاری، رنگ آمیزی، فلز کاری، قیمتی پتھروں کے کام اور ہر قسم کی فنی صنعتوں میں ہندوستانیوں کی مشاقی و مہارت کو عالمگیر شہرت حاصل رہی ہے[3]"۔ مصر میں دو ہزار سال قبل ولادت مسیح کی

---

[1] دیکھو رومیش چندر دت کے تصانیف ہندوستان کی معاشی تاریخ کے بارے میں۔

[2] دیکھو صنعتی کمیشن کی رپورٹ صفحہ ۱۔

[3] دیکھو صنعتی کمیشن کی رپورٹ میں مدن موہن مالوی کا اختلافی نوٹ۔ صفحہ ۲۹۵۔

باب ۵
139

ہوبیائی اور مسالے سے ڈھکی ہوئی لاشیں بہترین قسم کی ہندوستانی ململ میں لپٹی ہوئی ملی ہیں۔ روم میں ہندوستانی مصنوعات بڑے پیمانے پر صرف ہوتی تھیں اور یونانی ڈھاکہ کی ململ کو گنجیتکا[1] کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ آہنی صنعت بھی ترقی کے بہت ہی بلند معیار پر پہنچ گئی تھی، جیسا کہ دہلی کے نواح کے مشہور ڈھلے ہوئے آہنی ستون سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس طرح صنعت سے "نہ صرف جملہ مقامی ضرورتیں پوری ہوتی تھیں بلکہ اس کی بدولت ہندوستان اس قابل بھی ہو گیا تھا کہ اپنی مکمل مصنوعات غیر ممالک کو برآمد کرے[2]" علیٰ ہذا ہندوستان اپنی ریشمی مصنوعات، اونی شالوں، صندل کی لکڑی کے صندوقچوں اور چھری چاقو کے لیے مشہور آفاق تھا۔ متعدد غیر ملکی سیاحوں نے اس کے سرسبز اور ترقی یافتہ صنائع اور حرفتوں کو خراج تحسین ادا کیا ہے۔ بیرونی حملہ اور ملک گیری کی مہموں نے جو یکے بعد دیگرے گیارھویں صدی سے اٹھنی شروع ہوئیں، ہندوستانی صنعتوں کی ترقی میں ایک زمانے تک بہت بڑی مزاحمت پیدا کر دی۔ لیکن پرسکون حالات کے عود کر آنے کی وجہ سے خاصکر اکبر اعظم کے دور حکومت میں بظاہر ان صنعتوں میں حیات تازہ کے آثار نمودار ہوئے اور وہ اپنی سابقہ حالت پر پوری طرح آگئیں۔ اس زمانے میں ہندوستان سے سوتی و ریشمی اشیا کثیر تعداد میں ایران، شام اور عرب کو برآمد کی جاتی تھیں۔ چنانچہ اسی تجارت اور خوشحالی کی بنا پر یورپ کے تاجروں کے لیے ہندوستان مرکز کشش بنا۔ اس زمانے میں ان میں ہندوستان میں اپنا قدم جمانے کے لیے جو رقابت پیدا ہوئی وہ ملک کی اشیائے خام کی بنا پر نہ تھی بلکہ اس کے مختلف النوع اور بیش قیمت مصنوعات اور دستکاری کے نمونوں کی بنا پر۔ چنانچہ ہندوستان کے کتان، چھینٹ کیلی کو، جواہرات، زردوزی کے کام اور اونی و ریشمی مصنوعات ہی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی منفعت بخش تجارت کی بنیاد ڈالی[3]۔

---

[1] (Gangetika)

[2] دیکھو ناؤرے کی کتاب موسوم بہ مضامین معاشیات ہند صفحہ ۱۷۱۔

[3] دیکھو مالویہ کا اختلافی نوٹ صنعتی کمیشن کی رپورٹ میں صفحہ ۲۹۲ تا صفحہ ۲۹۷

باب

گذشتہ صدی کے آغاز میں ہندوستان کی شہری صنعت زیادہ تر ایسی دستکاریوں پر مشتمل تھی جو عمدہ قسم کے بنے ہوئے پارچے اور دوسرا سامان تعیش طبقہ امرا کے لیے تیار کرتی تھیں۔ اس کی تنظیم، دیہی صنعت کے مقابلے میں بدرجہا بہتر تھی، اور یہی بیرونی مسابقت کی زد میں سب سے اول آئی۔ دستی پارچہ بافی یقیناً اہم ترین صنعت تھی، اور اس میں بھی سوتی مصنوعات بلاشبہ اول نمبر پر تھیں اور ہندوستان میں ہر جگہ پائی جاتی تھیں۔ بقول "آر، سی، دت" پارچہ بافی قومی صنعت تھی اور لاکھوں عورتیں سوت کاتنے کا پیشہ کرتی تھیں۔ سوتی مصنوعات کے زیادہ اہم مرکز ڈھاکہ، لکھنؤ، احمد آباد، ناگپور اور مدورا تھے۔ کشمیری شال مشہور ترین اونی پیداوار تھی، لیکن یہ صنعت کشمیر تک محدود نہ تھی بلکہ پنجاب کے متعدد شہروں میں بھی رائج تھی۔ علاوہ ازیں دھات کی صنعتیں موجود تھیں جو پیتل، تانبے اور بھرت کے ظروف تیار کرتی تھیں، چنانچہ ان مصنوعات کے مرکز بنارس، ناسک، پونا، احمد آباد، وزاگاپٹم اور تنجور تھے۔ پنجاب اور سندھ میں ہتھیار اور ڈھالیں بنائی جاتی تھیں۔ راجپوتانہ کے شہروں کو مینا کاری کے زیور تیار کرنے اور پتھر تراشنے کے فنی کاموں میں خاص مہارت حاصل تھی۔ ان کے علاوہ دوسری دستی صنعتیں بھی موجود تھیں، مثلاً جیسے سونے اور چاندی کے تار بنانا، سنگ مرمر اور صندل کی لکڑی کا کام کرنا، آرائشی انگوٹھیاں بنانا، شیشہ سازی، دباغت اور چرمی کام، کاغذ سازی اور عطر سازی۔ ایک سو سال پیشتر صنعت جہاز سازی اتنی کافی سرسبز حالت میں تھی کہ اس کی بنا پر انگلستان کے جہاز سازی کے کارخانوں میں رشک و حسد پیدا ہوا، لیکن ہندوستان کو ان کے مقابلے میں کامیاب کرنے والی سہولت یہ تھی کہ یہاں عمدہ قسم کی لکڑی بڑی تعداد میں موجود تھی جو آہن پوش دخانی جہازوں کے پیشتر کے زمانے میں بہت اہمیت رکھتی تھی۔

140

شہری دستکاریاں مختلف ذاتوں کے لحاظ سے مختلف حرفتی جتھوں میں منظم تھیں اور ان کی حیثیت موروثی پیشوں کی تھی۔ یہ جتھے باہمی امدادی انجمنوں کی طرح کام کرتے تھے اور رکنیت کے شرائط اور کام کی خوبی کی نگرانی کرتے تھے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے تقسیم عمل بہت بڑی حد تک اور تخصیص صنائع خفیف حد تک موجود تھی،

---

[1] دیکھو گاڈگل کی تصنیف محولہ بالا صفحہ ۳۶ تا صفحہ ۳۸۔

گو ہر اہم شہر اپنا مختلف دستکاریوں کا پورا لوازمہ یا دستہ رکھتا تھا۔ اس طرح شہری صنعت دیہی غیر زرعی صنعت کے مقابلے میں بدرجہا بہتر طریق پر منظم تھی۔ ہر جگہ کی دستکاریوں کے مثل یہاں بھی تنہا کام کرنے والے دستکار کے پاس اصل کی زیادہ مقدار نہ ہوتی تھی۔ وہ عام طور پر فرمایش کے لحاظ سے کام کرتا تھا اور اس کے گاہک اس کو اشیائے خام مہیا کر دیتے تھے۔ چونکہ دستکار صنعت کے خانگی نظام کے تحت زندگی بسر کرتا تھا اس لیے وہ کسی محنت اور کوشش کے بغیر اپنے پیشے کا راز اپنے باپ سے سیکھ لیا کرتا تھا اور موروثی خاندانی پیشوں کے نظام کی بدولت اس کو یہ فائدہ حاصل تھا کہ اس کی حیثیت محفوظ اور یقینی تھی۔ اس میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا کہ دستکار موجودہ حالت کے مقابلے میں اس وقت اس لیے بہت زیادہ خوشحالی اور سرسبزی کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا کہ اس کے تیار کیے ہوئے سامان کی مانگ یقینی تھی۔ لیکن اس کی معاشی حالت کا حد سے زیادہ خوشگوار خاکہ کھینچنا آسان نہیں ہے، واقعہ یہ ہے کہ پارچہ باف عام طور پر وہ کل منافع حاصل کرنے کے قابل نہ ہوتا تھا جو اس کے تیار کردہ سامان کی سرگرم طلب سے وصول ہوتا تھا۔ اس منافعے کا بیشتر حصہ وہ بیچ والا آجر وبا لیتا تھا جو پارچہ باف کو زر مستعار دیتا تھا اور عام طور پر اس قابل ہوتا تھا اور بعض اوقات یہ نیت رکھتا تھا کہ پارچہ باف سے جتنا زیادہ کھینچ سکے کھینچے۔

۲۱۔ ہندوستانی صنعتوں کے زوال کے اسباب

دستکاریوں کا زوال گو بعض صورتوں میں بہت جلد یعنی اٹھارھویں صدی کے آخر میں شروع ہوا لیکن تقریباً انیسویں صدی کے وسط میں بہت نمایاں ہو گیا۔ اس کے اسباب حسب ذیل قرار دیے جا سکتے ہیں۔

(۱) شاہی درباروں کا اجڑنا۔

شاہی درباروں اور امرا کی سرپرستی و قدردانی کے مفقود ہونے کے معنی یہ تھے کہ دستی صنعتوں کی پیداوار کی سب سے بڑی مانگ موقوف ہو جائے اور اس کی وجہ سے ان میں زوال پیدا ہو۔ چنانچہ بنگال کی سوتی اور ریشمی مصنوعات[1] زیادہ تر عظیم الشان سلطنت مغلیہ کے وجود پر منحصر تھیں جس کے مرکز دہلی، آگرہ اور لاہور تھے۔ اور اس سلطنت کی شکست کے ساتھ جو اورنگ زیب کی وفات کے بعد شروع ہوئی، بنگالی مصنوعات کی خوشحالی فطری طور پر زائل ہونے لگی۔ جوں جوں

[1] ایڈورڈ لینڈ صاحب کی کتاب "اکبر سے اورنگ زیب تک"

باب ۴ برطانوی اقتدار بڑھتا اور پھیلتا گیا، شاہی درباروں اور امرا کی سرپرستی تیزی کے ساتھ اُٹھتی گئی اور جو صنعتیں ان کے سہارے زندہ تھیں ان کو فوراً زوال آیا۔ چنانچہ لکھنؤ اور ٹیپو کی صنعتیں اسی طرح تباہ ہوئیں۔

(ب) مخالف غیر ملکی اثرات کا عمل[1] برطانوی حکمرانی کے آغاز نے ان حرفتی جتھوں اور دوسری جماعتوں کے اقتدار کو بالواسطہ کمزور کردیا جو تجارت کا انتظام اور استعمال ہونے والی اشیائے خام کی خوبی کی نگرانی کرتی تھیں۔ آبادی کو بے ہتھیار کرنے اور امن قایم کرلنے کے عمل کا ان صنعتوں پر بہت مضر اثر پڑا جو اسلحہ اور آلات حرب تیار کرتی تھیں۔ جن لوگوں کی قدردانی کی بدولت دستکاریاں ترقیاں کررہی تھیں ان کے جانشین اب یورپین افسر، غیر ملکی سیاح اور ہندوستانیوں کی نئی تعلیم یافتہ پیشہ ور جماعت تھی۔ گو ہندوستان میں رہنے والے یوروپین، یورپ سے درآمدہ مال کو فطری طور پر ترجیح دیتے تھے، پھر بھی ان دستکاریوں کی خفیف سی یورپی طلب نے ان کی تباہی کو روکنے میں مدد دی لیکن یوروپی مذاق کے مطابق نئی نئی شکلوں اور نمونوں کے رواج اور ان اشیا کی روز افزوں مانگ نے ہندوستانی دستکاریوں کی خوبی اور کاریگری پر مضر اثر ڈالا۔ تعلیم یافتہ پیشہ ور جماعت بحیثیت مجموعی، حکمران قوم کے معیاروں کے زیر اثر دیسی حرفتوں کی پیداوار استعمال کرنے سے گریز کرتی رہی اور سودیشی اشیا پر درآمدہ اشیا کے صرف کو ترجیح دیتی تھی۔ اس طرح شاہی درباروں کی قدیم قدردانی اور سرپرستی کے مفقود ہوجانے کی وجہ سے جو کمی پیدا ہوگئی تھی وہ جدید نظام اشیا کے تحت صرف جزوی حد تک پوری ہوئی۔

(ج) ایسٹ انڈیا کمپنی اور برطانوی پارلیمنٹ کی پالیسی ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی میلانات ابتداً اس کو ہندوستانی صنعتوں کی ہمت افزائی کی جانب لے گئے۔ چنانچہ اس کی تجارت برآمد کا انحصار زیادہ تر ان ہی صنعتوں پر ہونے کی وجہ سے وہ اپنی فرمائشوں کے ساتھ پیشگی قیمت ادا کرکے قرضہ دے کر اور دوسرے طریقوں سے ان کی مالی معاونت کرتی رہی۔ لیکن انگلستان کے حقوق قائمہ

[1] دیکھو ڈی آر گاڈگل کی کتاب محولۂ بالا صفحہ ۴۳ تا صفحہ ۵۴۔

نے اس پالیسی کی سختی کے ساتھ مخالفت کی اور اس غرض سے پارلیمنٹ میں اپنے اثر سے
کام لیا تاکہ کمپنی ملکِ ہندوستان سے ان ہی اشیاءِ خام کی برآمد پر توجہ مرتکز کرے جو
انگریزی مصنوعات کے لیے درکار تھیں[1]۔ انگلستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی انگلستان
اور ہندوستان کی تجارت کی مخالفت کی وجہ سترھویں صدی کے آخر میں یہ بھی
ہوئی کہ اس تجارت کی بنا پر سونا انگلستان سے نکل کر ہندوستان جا رہا تھا۔

اٹھارھویں صدی کے نصف اوّل میں، انگلستان نے ہندوستان کے مال پر محصول
درآمد عاید کیا جس کا دوہرا مقصد تھا یعنی (۱) اپنے اونی و ریشمی مصنوعات کی تامین اور
(۲) برطانیہ عظمیٰ جنگوں کے مصارف کو پورا کرنے کے لیے آمدنی کی توفیر۔ سنہ ۱۷۰۰ء تا سنہ ۱۸۲۴ء میں
رنگین ہندوستانی چھینٹ کی درآمد انگلستان میں قانوناً ممنوع قرار دی گئی، البتہ سادہ ململ
اور چھینٹ نیز ہر قسم کے ریشمی پارچوں اور سوتی اشیاء کو جن کی مکرر برآمد براعظم میں کرنا مقصود
تھا، مستثنیٰ رکھا گیا۔ بقول آر۔ سی۔ دت "اٹھارھویں صدی میں ہندوستان نہ صرف
بہت بڑا زرعی ملک بلکہ بہت بڑا صنعتی ملک بھی تھا، اور ہندوستان کے پارچہ بافی کے
دستی راچھ اور چرخے ایشیا اور یورپ کے بازاروں کی مانگ کو تمام و کمال پورا کرتے تھے۔
یہ بدقسمتی سے صحیح ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور برطانوی پارلیمنٹ نے ایک سو سال پیشتر
کے خود غرضانہ تجارتی اصول پر عمل پیرا ہو کر برطانوی حکمرانی کے ابتدائی سالوں میں
انگلستان کی نوخیز صنعتوں کی ہمت افزائی کی خاطر ہندوستانی مصنوعات کی حوصلہ شکنی
کی۔ پارلیمنٹ کی مقررہ پالیسی جس پر اٹھارھویں صدی کے آخری عشرے اور انیسویں صدی
کے ابتدائی عشروں میں عمل کیا گیا یہ تھی کہ ہندوستان کو برطانیہ عظمیٰ کی صنعتوں کا محتاج و
دست نگر بنایا جائے اور اہل ہند کو مجبور کیا جائے کہ برطانیہ عظمیٰ کے دستی کارخانوں
اور کپڑا بننے کی کلوں کے لیے خام مال مہیا کرنے کی غرض سے صرف اشیائے خام تیار کریں۔
اس پالیسی پر مضبوط و مصمم ارادے سے عمل کیا گیا اور اس کو ایسی کامیابی حاصل ہوئی جو
ہندوستانی صنعتوں کی کامل ہلاکت و تباہی کا باعث ہوئی۔ احکام جاری کیے گئے کہ
ہندوستانی دستکاروں کو کمپنی مذکور کے کارخانوں میں کام کرنے پر مجبور کیا جائے؛

[1] ۔ دیکھو صنعتی کمیشن کی رپورٹ صفحہ ۵۷۔

باب

تجارتی نگرانکاروں اور ایجنٹوں کو ہندوستانی جلاہوں کی برادریوں اور دیہاتوں کے بارے میں وسیع اختیارات استعمال کرنے کا قانوناً مجاز گردانا گیا، محصول درآمد کے ذریعے سے ہندوستانی ریشمی و سوتی مصنوعات کی درآمد انگلستان میں ممنوع قرار دی گئی، اور انگریزی مصنوعات کو ہندوستان میں بلا محصول بے روک ٹوک یا برائے نام محصول لگا کر درآمد کیا گیا[1]۔ انگلستان میں ہندوستانی سامان پر ۷۰ تا ۸۰ فی صد محصول درآمد عاید کیا گیا تھا اور بعض صورتوں میں ہندوستان سے درآمد کرنے کی کلیتہً ممانعت تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت ہندوستان سے انگلستان کو اشیا کی برآمد کو کسی حد تک نقصان پہنچائے بغیر نہیں رہ سکتی تھی[2]۔ اس سے زیادہ تشویشناک بات یہی کہ ہندوستان اور دنیا کے بازاروں میں انگریزی اشیا سابقت کر رہی تھیں[3]۔ اگر اس قسم کے بھاری محصول اور امتناعی احکام موجود نہ ہوتے تو پیزلی اور مینچسٹر کی گرنیاں ابتدا ہی میں بند ہو جاتیں اور خواہ بھاپ کی قوت ہی کیوں نہ استعمال کی جاتی ان کا کام موقوف رہتا۔ لیکن ہندوستانی صنعتوں کا بھینٹ چڑھا کر ان گرنیوں میں جان ڈالی گئی۔ برطانوی صناع نے ایسے رقیب و حریف کو زک دینے کے لیے جس سے وہ مساوی شرائط پر مسابقت کر ہی نہیں سکتا تھا، سیاسی ناانصافی کو اپنا آلۂ کار بنایا[4]۔ انگلستان

---

[1] دیکھو آر سی دت کی کتاب موسوم بہ "معاشیات ہند ابتدائی برطانوی حکمرانی کے تحت" صفحہ ۲ تا صفحہ ۸۔

[2] لیکن ہندوستانی سوتی صنعت کے زوال کی توجیہ کے سلسلے میں ان تامینی تدابیر کے اثر پر زور دینے میں جو انگلستان میں ہندوستانی اشیا کی درآمد روکنے کے لیے اختیار کی گئی تھیں عام طور پر مبالغے سے کام لیا جاتا ہے۔ انگلستان کا بازار ہندوستان کے سوتی پارچوں کی برآمد کی حد تک اس وسیع بازار کا بہت ہی چھوٹا سا جز تھا جو چین و جاپان سے لیکر اسپائس آیلنڈز بحرہ ہند کو عرب مشرقی افریقہ اور تمام یورپ پر پھیلا ہوا تھا" (مورلینڈ)۔

[3] دیکھو سی بی جیلش کی کتاب موسوم بہ "تجارتی تعلقات مابین ہندوستان و انگلستان" صفحہ ۱۶۳۔

[4] یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ اگر انگریزی مصنوعات کی تامین ہندوستانی اشیا کے مقابلے میں نہ بھی کی جاتی تو بھی انگلستان کی مصنوعات کلوں کی سہولت کے باعث ترقی کرتیں۔ لیکن مسٹر ایچ ولسن کا قول جو اوپر بیان ہو چکا ہے یہ ہے کہ اگر انگلستان کو ہندوستان کے اغراض کی حفاظت کی اتنی ہی فکر ہوتی جتنی اپنے اغراض کی بابت تھی تو وہ ہرگز ہندوستان پر تجارت آزاد کی پالیسی کی پابندی عائد کر کے اس کے برخلاف خود تجارت تامین کی پالیسی پر عمل نہ کرتا۔

باب ۴۸

اس وقت سوتی مصنوعات تیار کر رہا تھا جن کے لیے ہندوستان ایک اچھا بازار تھا، چنانچہ اس بازار کا استعمال کرنے کی غرض سے اس نے اپنے سیاسی اقتدار سے کام لینے میں تامل نہیں کیا۔" اس کا قرینہ نہ تھا کہ برطانوی حکومت ایک ایسی دور افتادہ قوم کے ساتھ جو اس کے زیر اقتدار آگئی تھی اس سے کم خود غرضانہ برتاؤ کرے گی جتنا کہ اس نے امریکہ کی برطانوی نوآبادیات کے ساتھ کیا تھا۔[۱] انگلستان میں ہندوستانی مصنوعات کی فروخت کو روکنے کے لیے جو محصول درآمد عاید کیے گئے تھے وہ صرف انیسویں صدی کے وسط میں جاکر اٹھائے گئے لیکن یہ وہ زمانہ تھا جبکہ برطانوی مصنوعات کی بے روک مسابقت ہندوستان اور بیرونی بازاروں میں ہندوستان کی ملکی صنعتوں کو پوری طرح نیست و نابود کر چکی تھی۔

(۴) کل کی بنی ہوئی مصنوعات کی مسابقت۔

اس زمانے میں ہندوستانی پارچوں اور دوسرے مصنوعات کی کساد بازاری کا اہم ترین سبب انگلستان کا صنعتی انقلاب تھا۔ ہندوستان کی گھریلو اور چھوٹے پیمانے کی دستی صنعتیں کسی طرح غیر ملکی مسابقت کی تاب نہ لاسکتی تھیں جو اعلیٰ درجے کی صنعتی تنظیم، دیو ہیکل کلوں، بڑے پیمانے کی پیدائش، پیچیدہ قسم کے تقسیم عمل اور ترقی یافتہ ذرائع نقل و حمل و وسائل آمد و رفت کی وجہ سے اور بھی زیادہ طاقتور ہوگئی تھی۔ بقول دت "یورپ میں قوت سے چلنے والے راچھ کی ایجاد نے ہندوستانی صنعتوں کے زوال کو پایۂ تکمیل تک پہنچادیا۔" ہندوستان کی صنعت جہاز سازی بھی اس سے نہ بچی، اور ہندوستانی جہازوں کی جگہ برطانوی تجارتی جہازوں نے لے لی۔ یہ ایک حد تک اس پالسی کا نتیجہ تھا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے کورٹ آف ڈائرکٹرس (مجلس نظما) نے ہندوستانی جہاز رانی و جہاز سازی کے خلاف انگلستان میں ہیجان پیدا ہونے کے جواب میں اختیار کی تھی۔ علیٰ ہذا دوسری ہندوستانی صنعتوں مثلاً لوہا پگھلانے کا کام شیشے کی صنعت اور کاغذ سازی پر بھی یہی بات صادق آتی ہے۔ ہندوستان میں لارڈ ڈلہوزی کے زمانے سے سڑکوں اور خاصکر ریلوں کی تعمیر کی بدولت ذرائع نقل و حمل کے

---

[۱] دیکھو جے، ایل، بی، ہینڈ کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۱۰۵۔

باب ۵

انقلاب نے ملک کے اکثر اندرونی اور دور افتادہ علاقوں کو بھی درآمد اشیا کے لیے کھول دیا اور اس طرح مسابقت کی قوت میں مزید شدت پیدا کر دی[۱]۔ سڑکیں، ٹیلی گراف، ریلیں، نہر سویز کی تعمیر، جہازوں کے کرایہ کی تخفیف، خاصکر سنہ ۱۸۴۰ء کے بعد، جس کی بدولت انگریزی مصنوعات کی برآمد کے مصارف کم ہو گئے، غرض ان سب چیزوں نے ہندوستانی دستکار کی دشواریوں کو اور بھی بڑھا دیا اور اس کو بہت جلد تباہ کر دیا[۲]۔

ریلوں کی تعمیر اس قدر سرعت سے ہوئی کہ ہندوستانی دستکار کو نئے حالات کے مطابق اپنے آپ کو بنانے اور اپنے لیے کوئی منفعت بخش ذریعۂ معاش اور پیشہ تلاش کرنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ چونکہ حالات نے اچانک پلٹا کھایا تھا اور دستکاروں کو اپنے ہی ذرائع پر انحصار کرنا پڑا، اس لیے دستکار ہزاروں کی تعداد میں اپنے روایتی پیشے ترک کر کے زراعت میں جا گھسے اور اس طرح انھوں نے زمین پر آبادی کے دباؤ کو بڑھا دیا۔ اگر ریلوں کی تعمیر کی رفتار نسبتہً سست ہوتی اور تغیر زیادہ تدریجی طریقے پر واقع ہوتا تو ممکن تھا کہ ہندوستانی صنعتوں کی جانب سے زیادہ قوت مقاومت ظاہر ہوتی، پیشہ زراعت اختیار کرنے کی جانب لوگ اتنی کثیر تعداد میں مائل نہ ہوتے اس کے بدل کے طور پر دوسرے پیشوں کی تلاش کی جاتی اور ان سے استفادہ کیا جاتا اور عبوری دور میں جو مشکلات اور دشواریاں پیش آئیں ان میں بڑی حد تک کمی ہو جاتی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ انقلاب اس قدر اچانک طور پر رونما ہوا تھا کہ اس قسم کی ازسرِ نو تنظیم کا موقع ہی نہ ملا[۳]۔

144

(۵) حکومت ہند کی عدم مداخلت کی پالیسی۔ حکومت نے صرف یہی نہیں کیا کہ دشواریوں میں پھنسی ہوئی دستی صنعتوں کی دست گیری سے باز رہی بلکہ بعض اوقات اس نے اپنے اصول سے ہٹ کر ہندوستانی بازار سے نفع حاصل کرنے میں انگریزی مصنوعات کی براہ راست مدد کی۔ ریلیں انگریز صناعوں کی

---

[۱] دیکھو کتاب ہذا جلد دوم "نقل و حمل" کا باب۔

[۲] دیکھو اے پیٹرسن کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان میں صنعتی ارتقا" صفحہ ۲۰۔

[۳] دیکھو اے لوفے کی کتاب موسوم بہ "ہندوستانی قحط" صفحہ ۱۰۶۔

باب ۵

ہوئی پیداوار کو ملک میں ہر جگہ پہنچاتی تھیں، جس کی وجہ سے دیسی اشیا کی جگہ
اشیا نے لے لی، اور اشیائے خام کی برآمد کی ہمت افزائی کرتی تھیں۔ ملک
ارت داخلہ کی قربانی دے کر تجارت خارجہ کو توسیع و ترقی دی گئی جس کا
ہوا کہ ملک کے ذرائع کی یکطرفہ ترقی ہوئی۔ جیسا کہ رانا ڈے کا قول ہے
وستان جیسے بڑے ملک نے انگلستان کے زیر نگیں آکر اس (انیسویں) صدی
دیم نوآبادیات کی خالی جگہ پر کردی۔ اس محکوم ملک کو ایک مزرعہ یا کھیتی خیال
تے لگا ہے کہ وہ خام پیداوار تیار کرتی رہے جس کو برطانوی ایجنٹ برطانوی
ں میں لاد کر وطن روانہ کریں تاکہ برطانوی مہارت اور اصل کی مدد سے مصنوعات
ی جائیں اور برطانوی تاجران مصنوعات کو ہندوستان اور دوسرے مقامات کی
ی کمپنیوں کے ذریعے سے اس محکوم ملک میں مکرر برآمد کریں۔ بھاپ کی قوت
تعمال اور کلوں کو چلانے کی مہارت کی ترقی اور ذرائع نقل و حمل و آمد و رفت کی
نے محض اس زمانے کے رجحان کو مزید تقویت پہنچائی اور اس تغیر کا ایک نتیجہ یہ
اس عظیم الشان محکوم ملک میں زرعی پیشوں کی جانب میلان بتدریج بڑھتا گیا
صنعتوں کا سریع زوال واضح اور نمایاں ہوتا گیا۔[1] ممکن ہے کہ ہندوستانی
کو ارزاں غیر ملکی اشیا سے کچھ فائدہ ہوا ہو۔ لیکن یہ استدلال کیا جاسکتا ہے کہ
ستی صنعتوں سے محنت کے ہٹ جانے اور اس کے نتیجے کے طور پر زراعت میں
ہو جانے کی وجہ سے قحط کے امدادی کاموں کے مصارف بہت بڑھ گئے اور
جہ سے خریدار پر محصول ادا کرنے والے کی حیثیت سے بار پڑا۔

ہندوستان
انگلستان کے
انقلاب
تضاد۔

یہ سچ ہے کہ انگلستان میں بھی صنعتی انقلاب نے قدیم حالات کو
بدل کر جو جدید نظام اشیا قایم کیا اس کی وجہ سے بہت کچھ
بے ترتیبی اور خلل رونما ہوا اور دستکاروں کو بہت کچھ مصائب اور
دشواریوں کا سامنا رہا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ حکومت انگلستان نے
بے کار و بے روزگار پارچہ بافوں اور دوسرے دستکاروں کی

145

[1] رانا ڈے کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۱۰۳ تا صفحہ ۱۰۴۔

باب۴ حالت زار سے ساری تغافل برتا اور حکومت کے ایجابی عمل کا مقصد یہ تھا کہ جدید اصلدار صناعوں کے لیے راستہ صاف کیا جائے اور دستکاروں کی تکلیف و مصیبت رفع نہ کی جائے۔ لیکن انگلستان میں کام سے ہٹائے ہوئے مزدور سخت مصیبت کے مختصر دور کے بعد فوراً ہی جدید کارخانوں اور بڑی فیکٹریوں میں جذب ہو گئے۔ زراعت پیشہ آبادی بڑھنے کی بجائے شہری صنعتوں میں آبادی کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی، چنانچہ جدید صنعتوں میں محنت کی طلب اس قدر کثیر و شدید تھی کہ اس کو پورا کرنے کے لیے دیہی بستیاں اجڑ گئیں اور صنعتی انقلاب کے نتیجے کے طور پر انگلستان نے بے نظیر خوشحالی اور اقتدار کے دور میں قدم رکھا۔ ہندوستانی انقلاب نے ان سب اعتبارات سے بالکل مختلف نتائج پیدا کیے۔ ہندوستان کا صنعتی انقلاب ایسی قوتوں کا نتیجہ تھا جو ملک سے باہر پیدا ہوئی تھیں، اور کلوں کی بنی ہوئی اشیا جن کا مقابلہ دستکاروں کو کرنا پڑا، ایک زمانۂ دراز تک ہندوستان میں تیار ہی نہیں کی جاتی تھیں، بلکہ یورپ کے کارخانوں میں بنتی تھیں[۱]۔ ملک میں بڑے پیمانے پر کام آنے والی جدید صنعتوں کی عدم موجودگی کے باعث بے کار دستکاروں کو مجبوراً زراعت کا پیشہ اختیار کرنا پڑا اور ملک پہلے سے بہت زیادہ دیہی اور زرعی ہو گیا۔ دستکار نے کسان کا جدید پیشہ اختیار کر کے اپنی معاشی حالت کو قطعی طور پر پہلے سے زیادہ سقیم اور گرا ہوا پایا۔ اس کے برخلاف انگلستان میں اس کے ہم پیشہ بھائی نے نئی فیکٹریوں میں پُرمنفعت کام پا کر اپنی مالی حیثیت کو عام طور پر مستحکم کر لیا تھا۔ رہا یہ امر کہ معاشی انقلاب کا اثر ملک پر بحیثیت مجموعی کیا پڑا تو یہ سوال ابھی تک قابل بحث ہے کہ آیا زراعت، آبپاشی اور نقل و حمل کے ذرائع کی ترقی و توسیع کے باوجود گزشتہ سو سال میں قومی مقسوم میں قابل لحاظ اضافہ ہوا یا نہیں[۲]۔

ملک کا رُجحان صنعت کی جانب روز افزوں میلان جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے،

---

[۱] ہندوستان کے معاشی انقلاب نے تمام تر نقل و حمل ہی کو متاثر کیا اور اس کا اہم ترین نتیجہ یہ ہوا کہ تجارت و اخلاء و تصدیر میں توسیع و ترقی ہوئی۔ لیکن اس کے ساتھ زراعت یا صنعت میں پیدائش کے طریقوں میں کوئی قابل لحاظ تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔

[۲] دیکھو جلد دوم میں قومی مقسوم سے متعلق باب۔

باب ۳

مردم شماری کے ان اعداد و شمار سے نمایاں طور پر ظاہر ہوتا ہے جو زراعت پر گزارہ کرنے والے لوگوں کی فیصد تعداد سے متعلق ہیں۔ ۱۸۸۰ء میں اس سال کے قحط کمیشن نے یہ پایا کہ زرعی پیشے پر گزارہ کرنے والوں کی تعداد ان اشخاص سے بدرجہا زیادہ تھی جو زمین کی مکمل کاشت کے لیے مطلوب تھے، اور یہ میلان اس کے بعد سے برابر قوی ہوتا چلا آرہا ہے۔ زمین پر آبادی کا دباؤ سب صوبوں میں بڑھ گیا ہے، صرف پنجاب ہی غالباً ایسا صوبہ ہے جہاں صورت حال میں بہت زیادہ تغیر نہیں ہوا ہے۔

148

ہندوستان پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۹۱ء کی مردم شماری کے لحاظ سے زرعی آبادی کا فیصد مجموعی آبادی کے مقابلے میں ۶۱ تھا۔ یہ فیصد بڑھ کر ۱۹۰۱ء میں ۶۵.۱۲؛ ۱۹۱۱ء میں ۶۹.۸؛ اور ۱۹۲۱ء میں ۷۰.۱۹ ہو گیا۔ اگر ہم ۱۸۹۱ء کی مردم شماری کو اس بنیاد پر نظر انداز بھی کر دیں کہ اس تاریخ کے بعد سے ترتیب اعداد کے طریق میں بہت کچھ تغیرات ہوئے ہیں، تب بھی بعد کی مردم شماریوں کی بنا پر اس بارے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ آبادی صنعت سے زراعت میں منتقل ہوئی ہے۔ ۱۹۳۱ء میں زرعی آبادی (مزدوروں) کے فیصد میں جو ظاہری تخفیف رونما ہوئی ہے اور یہ تناسب گھٹ کر ۶۵.۲ فیصد تک آگیا ہے اس پر پہلے تنقید کی جا چکی ہے[۱]۔ یہ صحیح ہے کہ مردم شماری کے اعداد و شمار کو اس لیے قطعی طور پر معتبر نہیں قرار دیا جا سکتا کہ ان میں بڑے پیشوں اور ذیلی پیشوں کے مابین کوئی نمایاں خط فارق قائم نہیں کیا گیا ہے اور بہت سی گھریلو صنعتیں زراعت کے ذیلی پیشوں کی حیثیت سے جاری ہیں[۲]۔ لیکن چونکہ عدم صحت کا یہ عنصر جملہ مردم شماریوں میں مساوی طور پر موجود ہے، اس لیے مقابلے کے اغراض کے لیے مختلف مردم شماریوں کے اعداد سے بلاخوف و خطر کام لیا جا سکتا ہے۔

لیکن جدید طرز کے بڑے پیمانے کی صنعت کا آغاز ہو چکا ہے، اور حکومت چونکہ صنعت کو سرعت کے ساتھ ترقی دینے کی پالیسی کا اعلان کر چکی ہے، اس لیے

---

[۱] دیکھو باب ۲ فصل (۵)۔

[۲] دیکھو ڈی۔ آر گاڈگل کی تصنیف محولہ بالا صفحہ ۲۲۱۔

باب ۴

آیندہ اس سمت میں ترقی بہت اطمینان بخش ہونی چاہئیے اور اس سے زراعت کی جانب بکثرت میلان اور نقل مکانی بھی کم ہوجائے گی جس کی بنا پر راناڈے کو بہت کچھ بدگمانی اور خطرہ محسوس ہوا تھا۔ ملک میں جدید طرز کی صنعتوں کی عظیم الشان ترقی بذات خود، دست کاروں کی دشواریوں کو بڑھاکر ان کی حالت اور بھی زیادہ سقیم کردے گی۔ چنانچہ آیندہ چل کر ہمیں جن سوالوں کو جانچنا ہوگا۔ ان میں سے ایک یہ ہوگا کہ آیا گھریلو صنعتوں کا نیست و نابود ہوجانا لابدی ہے یا وہ جدید صنعتوں کی توسیع و ترقی کے دوش بدوش برقرار اور خوشحال رہ سکیں گی۔

۲۳۔ گاؤں عبوری دور میں۔ دیہی برادری کی تنظیم اور معاشی زندگی کا حال اوپر بیان ہوچکا ہے، ان میں ان جدید قوتوں کے نتیجے کے طور پر تغیر و تبدل ہورہا ہے جو نظم و نسق کی مرکزیت، مغربی تہذیب و تمدن کے زیر اثر انفرادیت کی ترقی، اور ذرائع نقل و حمل و آمد و رفت کے انقلاب کی بدولت وجود میں آئی ہیں۔

(۱) نظم و نسق کی مرکزیت۔ "قدیم زمانے میں ہندوستانی دیہات کو مقامی آزادی بڑی حد تک حاصل تھی، اس لیے کہ حکمراں خاندان اور ان کے مقامی نمائندے کو انفرادی کسانوں سے براہ راست کوئی سروکار نہ تھا بلکہ وہ گاؤں کو بحیثیت مجموعی یا کسی بڑے زمیندار کو سرکاری مالگزاری ادا کرنے اور مقامی نظم و امن قایم کرنے کے لیے ذمہ دار قرار دیتے تھے۔ لیکن دیوانی اور فوجداری کی مقامی عدالتوں کے قایم ہوجانے کی وجہ سے نیز مال اور پولیس کی موجودہ تنظیم کی بدولت اور انفرادی رعیت واری نظام کی بنا پر جو شمالی ہند میں بھی پھیل رہا ہے، اب یہ مقامی آزادی باقی نہیں رہی ہے[1]۔" نظم و نسق کی مرکزیت کا یہ برطانوی اصول بمبئی میں ایلفنسٹن اور مدراس میں منرو کی سفارشوں کے خلاف اختیار کیا گیا، یہ دونوں اصحاب دیہی برادریوں کو صحت و قوت کی حالت میں محفوظ رکھنے کے لیے متردد تھے، لیکن ان کی رائے کے خلاف اصول اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیہی آزادی گئے

147

[1]۔ عدم مرکزیت کے کمیشن کی رپورٹ ۱۹۰۹ء۔

باب ۵

ترغیبات مفقود ہو گئے اور تازہ وجدید انتظام مثلاً ضلع واری و تعلقہ واری مجلسوں کے تقرر گاؤں کی محدود لیکن زیادہ موثر حکومت خود اختیاری کے کسی حد تک مذموم بدل ثابت ہوئے۔

نظم و نسق کی موثر مرکزیت دو شرائط پر مبنی ہے۔ (۱) طاقتور مستحکم حکومت کا قیام اور (۲) نقل و حمل اور آمد و رفت کی سہولت۔ یہ دونوں شرائط برطانوی دور سے پیشتر کے زمانے میں مفقود تھے۔ اکثر حکمران خاندان اپنی بقا و حفاظت کے زیادہ اہم مسئلے میں منہمک تھے، لہذا انھوں نے کمترین مقاومت کا اصول اختیار کیا اور دیہی حکومت میں امکانی حد تک کم مداخلت کی۔ بہرصورت یہ ضروری تھا کہ طاقتور سے طاقتور حکومت بھی روزمرہ کے دیہی معاملات میں مداخلت کرنے کے کام کو محض اس وجہ سے ناقابل عمل پاتی کہ آمد و رفت میں قدرتی دشواریاں تھیں اور دیہات مرکزی حکومت کے عہدہ داروں کی رسائی سے باہر تھے۔ ان حالات میں اعدام مرکزیت کے اصول کو مجبوراً اختیار کرنا پڑا اور اس کے فطری نتیجے کے طور پر دیہات کی آزادی کا باقی رہنا لابدی تھا۔ موجودہ تبدل صورت حال میں دیہی آزادی کی بحالی صرف اس وقت رونما ہوگی جبکہ مرکزی حکومت اپنے اقتدار سے ارادی طور پر دست بردار ہو جائے گی۔ لیکن گاؤں کو اس کی سابقہ حیثیت پر از سر نو قایم کر دینے کے معنی ہرگز یہ نہیں ہو سکتے کہ کل اعتبارات سے قدیم میلان عود کر آئے گا۔ گاؤں کبھی معاشی حیثیت سے اپنی جملہ ضرورتوں کا خود کفیل اور زمانۂ قدیم کی طرح تمام دنیا سے بالکل الگ تھلگ نہیں رہ سکتا اور نہ ہماری یہ خواہش ہونی چاہیے کہ اُسے اس حالت میں دیکھیں۔

(۲) انفرادیت کی ترقی۔ ایک اور سبب جس کا دیہی برادری کی شکست میں حصہ ہے انفرادیت کی ترقی رہا ہے۔ موجودہ زمانے میں ہر سمت میں انفرادی قانونی حقوق رونما ہو گئے ہیں اور انھوں نے اجتماعی زندگی کا خون کر کے فرد کی حیثیت نہایت مستحکم کر دی ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں بھی یہ میلان ظاہر ہوا ہے، اور موجودہ زمانے کی ان سب سے زیادہ طاقتور قوتوں میں سے ایک قوت ہے جو ہندوستانی معاشرے کی قدیم عمارت کو مسمار کر رہی ہیں۔ جو

باب ۴

انفرادیت کی بجائے اجتماعیت پر مبنی ہے۔ اس طرح گاؤں میں اجتماعیت کا احساس بہت ضعیف ہوگیا ہے، گو ابھی تک پوری طرح نابود نہیں ہوا ہے۔ چنانچہ گاؤں میں اتنی طاقت اور جان موجود ہے کہ اس کو اب بھی نظم ونسق کی اولین اکائی شمار کیا جاسکتا ہے اور قدیم عائدہ مثلاً پٹیل اور محاسب گاؤں اور مرکزی حکومت کو ملانے والی ناگزیر کڑی ہیں۔ علاوہ ازیں دیہی حکومت خود اختیاری اور اجتماعی زندگی کی تجدید کا مستقبل، امداد باہمی کی تحریک کے اثر کی بدولت روشن ہوگیا ہے، اور دیہی پنچایتوں کی قدر و اہمیت کو حکومت کے تسلیم کرلینے کی وجہ سے اس کی توقع اور بھی زیادہ ہوگئی ہے۔ مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ نے اس تحریک کے حق میں مطلوبہ محرک کا کام کیا جو ۱۹۰۹ء کے اعدام مرکزیت کے کمیشن کی خیرخواہی حاصل کرچکی تھی۔ نئی شراب پرانی بوتلوں میں ان کو توڑے بغیر بھرنا آسان نہیں ہے، اور دیہی حکومت کی خود مختاری کی تجدید کا کام، مالیہ اور عملے کے متعلق دشواریوں سے بھرا ہوا ہے اور جو روایات مردہ ہوچکے ہوں ان کو ایک سو سال کے بدبختانہ وقفے کے بعد زندہ کرنا مشکلات سے خالی نہیں ہے۔ لیکن ان تمام مشکلات اور دشواریوں کے باوجود دیہی حکومت کی خود مختاری کا نصب العین لائق حصول ہے، اور اس کی راہ میں جو مزاحمتیں ہیں وہ رفتار زمانہ کے ساتھ دیہی ہندوستان کی معاشی ترقی، تعلیم کی توسیع اور عوام کی روشن خیالی کی بدولت رفع ہوجائیں گی۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ خود مختار دیہی حکومت کے تصور کو دیہات سدھار کی ایک جامع تجویز کے طور پر عملی جامہ پہنایا جائے۔

148

(۳) نقل وحمل میں انقلاب۔

آخری بات یہ کہ انیسویں صدی کے وسط سے ریلوں اور سڑکوں کا جال بچھ جانے کی وجہ سے نقل وحمل میں جو انقلاب رونما ہوا ہے اس کی وجہ سے گاؤں کا علیٰحدہ وجود باقی نہیں رہا ہے اور اس کے نتیجے کے طور پر اہم تغیرات واقع ہوئے ہیں۔

۲۴۔ گاؤں کی خصوصیات عبوری دور میں۔

(۱) سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ گاؤں خود کفیل نہیں رہا ہے۔ چنانچہ اس وقت گاؤں میں کپڑا، مٹی کا تیل، الومونیم کے برتن، شکر، چائے، دیا سلائی کے بکس، چھتریاں، قینچی، چوڑیاں، آئینہ،

مسالے اور دوائیں، سلائی کی مشینیں وغیرہ باہر ہی سے درآمد کی جاتی ہیں۔ گاؤں کو بیرونی دنیا کا اس طرح روز افزوں دست نگر اور محتاج بنانے میں معیار زندگی کے ان تغیرات نے بھی بڑی حد تک مدد کی ہے جو مغربی اثرات کے تحت رونما ہوئے ہیں۔ گاؤں بیرونی دنیا کے لیے اشیاء بھی تیار کرنے لگا ہے اور اشیا کے مبادلے کی حد تک بیرونی دنیا پر اس کے روز افزوں انحصار کی بدولت ایسے معاشی انقلاب کا آغاز ہو چکا ہے جو بلحاظ نوعیت نہایت دوررس ہے۔

(۲) گاؤں کی علاحدگی کے باقی نہ رہنے کی وجہ سے قحط کی مصیبت کی نوعیت میں بھی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ مقامی فصلوں کی کمی کو پورا کرنے کے لیے ان علاقوں سے اشیائے خوردنی درآمد کرنے کا امکان پیدا ہو گیا ہے جہاں پیداوار بہ افراط ہوتی ہے اور اس کے نتیجے کے طور پر اشیائے خوردنی اور زر کے قحط کی جگہ محض زر کے کال نے لے لی ہے، چنانچہ اشیا کے قحط کی بنا پر عوام کی بہت بڑی تعداد بھوک اور فاقوں کی شدید تکلیف میں مبتلا نہیں ہوتی بلکہ قلت اشیاء کی وجہ سے محض گرانی رونما ہوتی ہے، عارضی طور پر بے روزگاری پیدا ہو جاتی ہے اور زرعی کاروبار رک جاتا ہے۔ علیٰ ہذا فصلوں کے غیر معمولی طور پر عمدہ ہونے کی وجہ سے پیداوار کی افراط اور ارزانی کا جو خوف تھا اس میں بھی داخلی و بین الاقوامی بازاروں کی توسیع کی بدولت کمی ہو گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی قدیم گاؤں کے غلے کے ذخائر بھی اس لیے عملاً مفقود ہو گئے ہیں کہ گاؤں اب غلے کے ذخائر بہت بڑی مقدار میں ملک کے کسی حصے سے بھی بآسانی حاصل کر سکتا ہے۔

(۳) ایک نمایاں تبدیلی معیشتِ زر کے رواج کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے۔ قدیم زمانے کے برعکس آج کل بیرونی دنیا سے مبادلات جلد جلد اور روز افزوں ہونے اور زرعی پیداوار کی قیمتوں میں اضافہ ہو جانے کی وجہ سے نیز اس سبب سے کہ گاؤں کے باہر جا کر کام کرنے والے بھی اپنے وطن کو ترسیل زر کرتے ہیں، دیہات میں زر کی درآمد ہونے لگی ہے۔ غرض زر کی اس روز افزوں رسد نے اس کا موقع بہم پہنچایا کہ زر ہی معمولی آلۂ مبادلہ کے طور پر اختیار کر لیا جائے۔ چنانچہ آجکل مطالبات جنس کی شکل میں بہت کم ادا کیے جاتے ہیں۔ دقعہ

باب ۴ یہ ہے، جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، کہ جنسی مبادلت کے بدل کے طور پر زر کا رائج ہونا اس بات کی بین علامت ہے کہ قدیم معیشت جدید معیشت سے بدل رہی ہے، اور تہذیب و تمدن نے ترقی کی نئی منزل میں قدم بڑھایا ہے۔ آجکل مالگزاری اور دوسرے محصول، لگان، نفع کا سود، اور اجرت، یہ سب زیادہ تر زر نقد کی شکل میں ادا کیے جاتے ہیں۔ دیہی دستکاروں کو ان کی خدمات کے صلے میں از روئے رواج غلہ ادا کیا جاتا تھا، اس طریقے کے بجائے کوئی دوسرا بالکل مختلف طریقہ ابھی تک رائج نہیں ہوا ہے، لیکن قدیم زمانے کے مقابلے میں آجکل اس کی اہمیت بہت گھٹ گئی ہے۔ دیہات میں درآمد کی ہوئی اشیا کی قیمت ادا کرنے کے لیے بھی نقد کی ضرورت ہوتی ہے۔

(۴) شہروں میں کما کر دیہی آمدنی کی کمی کو پورا کرنے کی معاشی ضرورت محسوس کی جانے لگی ہے اور ریلیں بن گئی ہیں جن کا نتیجہ یہ ہے کہ دیہی آبادی ساکن اور غیر نقل پذیر نہیں رہی ہے۔ قدیم زمانے کی طرح آجکل پیشے معین و مقررہ نہیں ہیں اور ذات اور حیثیت کا اثر ایک حد تک کمزور ہو گیا ہے۔ ممکن ہے کہ فیکٹریوں، معدنوں اور بڑے بڑے کارہائے عامہ میں کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد کا تناسب مجموعی آبادی کے مقابلے میں کسی وقت دراصل کم اور نظر انداز کرنے کے قابل ہو، لیکن دائمی تغیر پذیری کی وجہ سے جدید عناصر سے متاثر ہونیوالوں کی تعداد بدرجہا زیادہ ہے۔ گاؤں کی "علحدگی" کا باقی نہ رہنا ان دیہات کی صورت میں خاص طور پر نمایاں ہے جو بڑے اور مرکزی شہروں سے کافی متصل واقع ہیں۔

۲۵- دیہی پیشوں میں تغیر

(۱) زراعت میں تغیر

اب دیہی پیشوں کے تغیر کو اجمالاً بیان کرنا مناسب ہوگا۔ چنانچہ زراعت سے آغاز کیا جا سکتا ہے جو گاؤں کی سب سے بڑی اور اہم صنعت ہے اور اس کے بعد دیہی دستکاریوں میں جو تغیر ہوا ہے اس کی جانب توجہ کی جا سکتی ہے۔

زرعی کاروبار کی تنظیم میں کوئی اساسی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ چنانچہ عام طریقہ اب بھی یہی ہے کہ چھوٹے چھوٹے کسان اپنے ذاتی اصل اور محنت سے

باب ۸

چھوٹے پیمانے ہی پر کاروبار کرتے ہیں۔ اگر کوئی بات قابلِ لحاظ ہے تو یہ ہے کہ زراعت کی جانب ملک کے روز افزوں میلان اور زمین کی تقسیم در تقسیم کی زیادتی نے چھوٹے کسانوں کی تعداد میں بہت خاصہ اضافہ کر دیا ہے۔ علیٰ ہذا قدیم ترین زمانے کا کاشتکاری کا طریقہ اور فن اب بھی بڑی حد تک غیر متاثر ہے اور زراعت وامداد باہمی کے محکموں کو طریق کاشت اور آلات کشاورزی کی اصلاح و ترقی میں ابھی تک بہت ہی محدود کامیابی ہوئی ہے۔

150

ہندوستانی زراعت کا عبوری دور چار اہم پہلو رکھتا ہے؛ یعنی (۱) زراعت کا نفع بخش کاروبار بن جانا، (۲) کسان کی بے دخلی اور زمین کا غیر کسان ساہوکار یا قرض دہندہ کو منتقل ہوجانا (۳) کھیتوں کی روز افزوں تقسیم اور ان کا انتشار، (۴) دیہی مزدوروں کی قلت[1]۔

(۱) زراعت کے نفع بخش کاروبار بن جانے کا باعث زیادہ تر یہ امر رہا ہے کہ نقل و حمل اور ذرایع آمد و رفت میں اصلاح، توسیع و ترقی ہوئی۔ چنانچہ ۱۸۶۹ء میں نہر سویز کے افتتاح نے زرعی پیداوار کے لیے وسیع اور عالمگیر بازار قایم کرنے میں خاص طور پر مدد دی۔

دنیا کے بازاروں کا کھل جانا اور اس کے نتیجے کے طور پر ہندوستانی زراعت کا ایک نفع بخش کاروبار بن جانا، یہ ایسے عامل تھے جو امریکا کی خانہ جنگی کے باعث گزشتہ صدی کے چھٹے عشرے میں بہت شدومد کے ساتھ نمایاں ہوئے۔ چونکہ اس جنگ کی وجہ سے انگلستان میں امریکا سے روئی کی رسد کی درآمد کا سلسلہ رُک گیا تھا، لہٰذا لنکا شائر کو مجبوراً مصر اور ہندوستان کی سمت رُخ پھیرنا پڑا۔ لنکا شائر کی عظیم طلب نے روئی کے کاروبار میں ایسی گرم بازاری پیدا کر دی کہ اس کی بدولت روئی کا کاشت کرنے والوں اور برآمد کرنے والوں کی جیبیں بھی کچھ مدت کے لیے کثیر نفع سے بھرتی رہیں۔ علاوہ ازیں پنجاب، صوبہ متحدہ اور دوسرے علاقوں میں بڑے بڑے کارہائے آبپاشی کے اجرا نے وسیع خطہ ہائے زمین کو

[1] اس معاملے کی زیادہ مفصل بحث کے لیے دیکھو گاڈگل کی تصنیف مولفہ بالا باب ۸۔

باب ۵

قابل زراعت بنا دیا ہے اور کفافی کاشتکاری کو تجارتی کاشتکاری سے مبدّل کرنے کے حق میں محرک کا کام کیا ہے۔ نقل و حمل اور آبپاشی کے علاوہ لیکن ان ہی سے متعلق ایک اور عامل جو زراعت کو نفع بخش کاروبار بنانے کا ذمہ دار ہے یہ ہے کہ گاؤں میں زر کا استعمال روز افزوں ہوگیا اور محصول لگان، سود اور اجرت بصورت نقد ادا ہونے لگی۔ مطالبات کی ادائی بصورت نقد کرنے کی ضرورت کسان کو مجبور کر رہی ہے کہ وہ اپنی پیداوار کا ایک جزو بلکہ اکثر صورتوں میں بہت بڑا جزو فصل کی کٹائی کے فوراً ہی بعد فروخت کر دے اور اُسے عام طور پر خود اپنی ہی فصل کی پیداوار ساہوکار سے واپس خریدنی پڑتی ہے اور ایسی قیمتوں پر جو اس کی قیمت فروخت سے زیادہ ہوتی ہیں۔

زرعی پیدائش کی اس جدید ہیئت کی بدولت مختلف علاقے خاص خاص فصلوں کی تیاری کے لیے مخصوص ہوگئے ہیں۔ چنانچہ بنگال نے سن کی کاشت کے لیے، بمبئی اور برار نے روئی کے لیے، صوبۂ متوسط نے روغن دار تخم کے لیے، پنجاب نے گیہوں کے لیے اپنے آپ کو مخصوص کر لیا ہے۔ اس جدید صورت کی بدولت صنعتی پیداوار اور غیر خوردنی اشیا مثلاً روئی، سن، اور روغن دار تخم وغیرہ کی کاشت کا رقبہ بہت وسیع ہوگیا ہے۔ علاوہ ازیں بیچ والوں، تھوک فروشوں اور برآمد کرنے والوں کی خاص خاص جماعتیں پیدا ہوگئی ہیں جو بندرگاہوں اور اندرون ملک تقسیم کرنے والے مرکزوں میں روئی، سن، گیہوں وغیرہ جیسی پیداوار کو جلد جلد پہنچاتی ہیں۔ چنانچہ "زراعت" کے متعلق باب میں ہم یہ بیان کریں گے کہ زراعت کے نفع بخش کاروبار بن جانے کی وجہ سے پیدا کنندہ اور ملک کو بحیثیت مجموعی دراصل کس حد تک فائدہ پہنچا ہے اور زرعی پیداوار کی فروخت کے انتظام میں کسقدر اصلاح و ترقی کی ضرورت ہے۔

151

(۲) قدیم کسانوں کی زمین کا ساہوکار کے قبضے اور ملکیت میں چلا جانا دیہی قرضداری کے نتائج میں سے ایک ہے، جس کے حق میں انفرادی حقوق اراضی، انتقال اراضی کی آزادی، زمین کی قیمت کے اضافے، اعتبار کی سہولت اور انتہائی طور پر پیچیدہ دیوانی قانون اور ضابطے نے محرک کا کام کیا ہے۔ ہم کسی دوسرے

باب ۴

مقام پر کسانوں کی قرضداری کے ثانوی اسباب بیان کریں گے اور اس کے ساتھ ان مختلف تدابیر کا بھی ذکر کریں گے جو حکومت نے کسان کے قبضے سے زمین کے نکل جانے کو روکنے کے لیے غیر زرعی طبقوں کی مدافعت میں اختیار کی ہیں۔

(۳) روز افزوں تقسیم و انتشار زمین کا باعث یہ ہے کہ توریث و توارث کے قوانین کے ذریعے سے زمین پر آبادی کا روز افزوں دباؤ پڑتا جاتا ہے اور یہ زراعت کی اصلاح و ترقی کے حق میں سخت مضر ہے۔[۱]

(۴) زرعی مزدوروں کی قلت، جس کے متعلق اکثر دیہات میں شکایت عام ہوگئی ہے، خاصکر فصل کی کٹائی کے موقعے پر زیادہ محسوس ہوتی ہے جبکہ ٹٹ پونجیے کسان اور اس کے کنبے والوں کی زائد محنت دستیاب نہیں ہوتی، اور اس کا باعث زیر کاشت رقبے کی زیادتی، شہری صنعت کی ترقی اور متمول زمینداروں کے اس میلان کو قرار دیا جاتا ہے کہ وہ قیمتوں کے اضافے سے خاص طور پر متمتع ہونے کی وجہ سے اپنے کھیتوں پر خود کام کرنے کی بجائے مزدور سے اجرت پر کام لیتے ہیں۔[۲]

۲۵-(۲) دیہی حرفتوں میں تغیر

اس کے بعد ہم دیہی دستکار کی حیثیت لیں جو تبدیلی ہوئی ہے اس کی جانچ کی جانب متوجہ ہو سکتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی کوئی انقلاب انگیز تغیر واقع نہیں ہوا ہے۔ نجار، آہن گر، دھوبی، جراح، کمہار وغیرہ اب بھی دیہی خدمتگاروں کی حیثیت سے موجود ہیں۔ ان کی خدمات کو تسلیم کیا جاتا اور صلہ ادا کیا جاتا ہے، چنانچہ وہ رواجی واجبات پاتے ہیں۔ لیکن رواجی فرائض اب اتنی اہمیت نہیں رکھتے جتنی کہ قدیم زمانے میں رکھتے تھے اور موجودہ زمانے کا دیہی دستکار دوسرے مقام پر بہتر ذریعۂ معاش کی تلاش میں منتقل ہونے کے لیے زیادہ مستعد معلوم ہوتا ہے۔ ارزاں و آسان نقل و حمل نے بیرونی اشیا کی درآمد میں سہولت پیدا کر دی ہے اور اس کی وجہ سے گاؤں کے لیے اپنی جملہ احتیاجوں کو مقامی طور سے پورا کرنے کی ضرورت کم ہوتی جاتی ہے۔ بس

---

[۱] دیکھو باب۔

[۲] دیکھو جی کیٹنگ کی کتاب بعنوان "مغربی ہندوستان میں زراعت کی ترقی" صفحہ ۱۴۴ تا ۱۴۶ (See G. keatinge, Progress of Agriculture in Western India; P P. 144-6)

باب ۸

لحاظ سے گاؤں میں تمام دستکاروں کی مسلسل موجودگی کی اب ضرورت ہی نہیں رہی ہے۔ دستکار کی محنت کا معاوضہ سالیانہ کی شکل میں ادا کرنے کی بجائے کام کے لحاظ سے ادا کرنے کا طریقہ زیادہ عام ہو رہا ہے اگرچہ اس اعتبار سے اور دوسرے اعتبارات سے پوری طرح تغیر نہیں ہوا ہے۔ یہی حال اس بات کا بھی ایک حد تک ذمہ دار ہے کہ پارچہ باف، معمار، رنگریز جیسے بعض دستکار بڑے دیہات اور شہروں کا رخ کر رہے ہیں۔ دیہی دستکار کو بیرونی اور ہندوستانی کارخانوں کی بڑے پیمانے کی پیدائش کی مسابقت نے بھی نقصان پہنچایا، اور اس غیر مساوی مسابقت کے نتیجے کے طور پر بعض دیہی صنعتیں تباہ ہو چکی ہیں۔

152

لیکن انقلاب نے مختلف دیہی دستکاروں کو مختلف طریقوں سے متاثر کیا ہے۔ ہاتھ سے سوت کاتنے والے انگلستان کے صنعتی انقلاب کی طرح، یہاں بھی سب سے زیادہ بری طرح متاثر ہوئے ہیں اور ہر جھونپڑے کا قدیم کتائی کا چرخہ بڑی حد تک بے کار ہو گیا ہے۔ دیہی رنگریزوں کو بھی انیلین رنگوں کی درآمد سے اور کلوں کے بنے ہوئے رنگین سوت کے استعمال سے نقصان پہنچا ہے۔ پارچہ باف کو محض اس لیے نقصان نہیں پہنچا کہ کلوں کی بنی ہوئی مصنوعات کی مسابقت کی زد ان پر پڑی اور ہندوستانی بازار میں ان کی بھرمار ہو گئی، بلکہ ایک حد تک اس وجہ سے بھی کہ غیر ملکی ایشیائی بازار مثلاً جاوا اور ایران، جو پہلے ہندوستان سے اشیا کی درآمد کرتے تھے اب انگلستان سے سامان طلب کرنے لگے۔ لیکن دستی پارچہ بافی ہندوستان میں کسی طرح کلیتہً مفقود نہیں ہوئی ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ اب بھی ۲۰ لاکھ سے ۳۰ لاکھ تک دستی راچھ ہندوستان میں کام کر رہے ہیں، دستی راچھ پر کپڑا بننے والوں کی تعداد تقریباً ۶۰ لاکھ ہے، اور یہ کہ ان کی سالانہ خام آمدنی کی مجموعی مقدار لازمی طور پر قریب ۵۰ کروڑ روپیہ ہوگی[۱]۔ آہنی ہلوں، موسلوں اور دوسرے ترقی یافتہ آلات کشاورزی کے روز افزوں استعمال کی وجہ سے آہنگر اور نجار کی حیثیت پر اسی طرح مضر اثر پڑا ہے جس طرح پچی کاری کے ظروف اور تانبے

[۱] دیکھو صنعتی کمیشن کی رپورٹ پیراگراف ۲۵۶ اور مسٹر اتچیسن کی کتاب موسوم بہ "صنعت ہند" ضمیمہ (۱۴)۔

باب ۴

اور پیتل کے برتنوں کے روز افزوں استعمال کی وجہ سے کمہار کا وجود بڑی حد تک غیر ضروری سا ہو گیا ہے۔ دیہی دباغ کو خام چرم اور کھالوں کی عالمی قیمتوں میں اضافہ ہو جانے کی وجہ سے اپنی حیثیت وحالت کا سنبھالنا دشوار ہو گیا ہے، اس لیے کہ ہندوستانی کھالیں ہر سال بہت کثیر تعداد میں برآمد کی جاتی ہیں اور دباغت کیے ہوئے تیار چمڑے کی درآمد روز افزوں ہے۔ گاؤں میں مٹی کے تیل کے بکثرت استعمال، روغندار تخموں کی برآمد اور شہروں میں تخموں سے تیل نکالنے کی صنعت کے فروغ پانے کی وجہ سے گاؤں کے تیلی پر بھی کاری ضرب لگی۔ جہاں دیہی صنعت کو زوال آیا یا اس میں کسادبازاری رونما ہوئی وہاں بے کار دستکار یا تو خود گاؤں ہی میں وہاں میں کام کرنے والے مزدوروں کی صف میں داخل ہو جاتا ہے یا بہتر ذریعہ معاش کی تلاش میں شہروں کو منتقل ہو جاتا ہے۔ دستکاروں نے اپنا موروثی پیشہ عام طور پر صرف اسی صورت میں ترک کیا جبکہ وہ ایسا کرنے پر مجبور ہوئے گو بعض صورتوں میں یہ بھی ہوا کہ انھوں نے آنے والی تباہی کو دیکھ کر اپنی حیثیت بالکل مایوس کن ہو جانے کا انتظار کیے بغیر پہلے ہی سے اپنا پیشہ ترک کر دیا۔

رہے وہ دستکار جو اب بھی اپنی حرفتوں میں کام کیے جا رہے ہیں تو ان کی حالت میں بہت کم تغیر ہوا ہے، بجز اس کے کہ بعضوں نے اپنے پیشے کو پیدائش کے متبدلہ حالات کے مطابق ایک حد تک بنا لیا ہے۔ مثلاً جلاہا آجکل زیادہ تر کلوں کا بنا ہوا سوت استعمال کرتا ہے اور بعض صورتوں میں ڈھرکی (Fly shuttle) سے بھی کام لیتا ہے جیسے مدراس میں۔ آہنگر بنا بنایا لوہا اور ٹین کی چادریں درآمد کرتا ہے، نجار جدید آلات سے اور درزی سلائی کی مشین سے کام لینے لگا ہے۔

153

اس طرح ظاہر ہے کہ گاؤں کے سب دستکار مساوی طور پر متاثر نہیں ہوئے ہیں۔ جو لوگ بڑے دیہات میں مرتکز یا شہروں میں منتقل ہونے کے قابل ہوے انھوں نے اپنی حالت درست کر لی، مثلاً نجار اور آہنگر، جن کی مانگ انجینیری کے کارخانوں، عمارت اور فرنیچر سازی کی صنعتوں میں روز افزوں ہے۔ لیکن وہ لوگ جو دیہات چھوڑ نہیں سکتے تھے اور وہاں رہنے کے سوا کوئی دوسرا چارہ کار اختیار نہ کر سکتے تھے انھیں تکلیف و پریشانی اٹھانی پڑی اور معمولی زرعی مزدوری کی جانب رجوع ہونا پڑا۔

باب ۳

دیہی دستکاریوں[1] کی حالت تغیر کے مذکورۂ بالا بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ دیہی صنعت بحیثیت مجموعی زوال پذیر ہے۔ دستکاروں کی بہت بڑی تعداد تباہی میں آکر معمولی اجرت یاب مزدور بن گئی۔ معدودے چند خوش قسمت دستکاروں نے شہروں میں منتقل ہوکر اپنی معاشی حالت درست کرلی۔ بعضے کسان بن گئے اور جن لوگوں کو اپنے موروثی پیشوں میں جمے رہنا پڑا ان کی حالت عام طور پر بہت ہی نازک ہے چنانچہ یہی لوگ قحط و مصیبت کے زمانے میں کارہائے امداد عامہ پر سب سے پہلے ہجوم کرتے ہیں۔

۲۶۔ حیثیت اور رواج سے معاہدے اور مسابقت کی جانب تبدیلی۔

ہم "معاشرتی و مذہبی رسم و رواج" کے باب میں اوپر ذکر کرچکے ہیں کہ ہندوستان میں ذات پات کی تنظیم اور اشتراک خاندانی کے نظام کے تحت حیثیت ابھی تک کیا درجہ رکھتی ہے، اور اس میں یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ ہندوستانی سماج یا معاشرہ عبوری دور میں سے گزر رہا ہے اور اس کی شکل و صورت بتدریج نئے سانچے میں ڈھل رہی ہے۔ چنانچہ پہلے رواج کی بنا پر اجرت لگان اور قیمتوں کا تعین ہوتا تھا اب مسابقت اس کی جگہ بتدریج لے رہی ہے، اور یہ بات خاصکر شہری علاقوں میں صادق آتی ہے۔ مغربی تہذیب کی اشاعت، معیشت زر کا رواج اور اس کی توسیع، اور ذرائع نقل و حمل کی ترقی وغیرہ، رواج کے زور کو توڑ رہے ہیں اور ہر جگہ مسابقت کا دور دورہ ہورہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سب سے زیادہ ترقی یافتہ قوموں میں بھی مسابقت کی قوت کو رواج کی قوت کسی حد تک ضعیف کردیتی ہے۔ لیکن رواج کا اثر مغربی یورپ میں نظر انداز کرنے کے قابل ہے گو پوری طرح مفقود نہیں ہے۔ ہندوستان میں رواج کا اثر زیادہ قوی ہے، گو یہ بیان کردینا اہمیت سے خالی نہیں کہ واقعات کی رو یہ بتلاتی ہے کہ رواج کی جگہ مسابقت لے رہی ہے اور عام طور پر مغربی حالات سے بتدریج مشابہت پیدا ہورہی ہے۔

---

[1] دیہی دستکاریوں میں جو تغیر واقع ہوا ہے اس کے مزید مفصل بیان کے لیے دیکھو گاڈگل کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۱۰۳ تا صفحہ ۱۰۸

باب ۵

(ا) مسابقت اور لگان۔ اضافۂ آبادی، دیہی زندگی بسر کرنے کا میلان، دوسرے ذرایع معاش کی عدم موجودگی، سن، روئی، گیہوں، روغن دار تخموں وغیرہ جیسی تجارتی فصلوں کی قیمتوں کی زیادتی، زمین کے حق میں روایتی جوش و خروش، امن و امان کا قائم ہونا، اور نقد لگان ادا کرنے کا رواج، ان سب چیزوں نے لگان کے تقرر میں مسابقت کے حصے کو وسیع کر دیا ہے۔ بعض صورتوں میں زمینداروں کے اس رجحان کو کہ وہ کسانوں کی کل پیداوار بطور لگان سختی کے ساتھ وصول کیا کرتے تھے، قوانین لگان منظور کر کے بنگال، مدراس، صوبۂ متحدہ اور صوبہ متوسط وغیرہ میں روکنا پڑا۔ 154 تاکہ کسان، ان حقوق سے فائدہ اٹھائے جو اس کو از روئے رواج ملے تھے اور زمینداروں کی دستبرد سے محفوظ رہے اور اس طرح لگان میں من مانا اضافہ اور کسان کے اخراج کا سدباب ہو جائے۔ رہے شہروں کے مکانوں کے کرایے تو وہ آجکل عام طور پر مسابقت کے ذریعے سے طے پاتے ہیں، اگرچہ گاہ گاہ بمبئی جیسے بڑے شہروں میں ان پر وضع آئین، قوانین کے ذریعے سے نگرانی رکھی جاتی ہے۔

(ب) مسابقت اور اجرت موجودہ زمانے میں ہندوستان میں خاصکر شہروں کی حد تک اجرت کے متعلق یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ اس کا تقرر رواج سے زیادہ مسابقت کی بنا پر ہوتا ہے، گو اس محدود دائرے میں بھی مسابقت کا اثر اس قدر طاقتور نہیں ہے جس قدر کہ مغربی ممالک میں، اجرت رسد و طلب کے تغیرات کا ساتھ اس قدر تیزی سے نہیں دیتی جس قدر جلد مغرب میں دیتی ہوئی اور اس طرح گو اجرتوں کی سطح ملک کے مختلف حصوں میں مختلف ہے، مقابلۃً ثبات پذیر ہے۔ آجکل دیہات میں بھی مسابقت، اجرتوں کی شرح پر مختلف قوتوں کے نتیجے کے طور پر اثر انداز ہوتی ہے، مثلاً شہروں میں مزدوروں کی روز افزوں طلب، ذرایع نقل و حمل کی ترقی کی بدولت محنت کی زیادہ نقل پذیری، اور اجرت کو بصورت نقد ادا کرنے کے طریقے کا رواج۔ دیہی دستکار کو رواجی اجرت دینے کے طریقے کی اہمیت، جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، گھٹتی جا رہی ہے، اور یہ بات دیہی آہنگر اور نجار جیسے دستکاروں کی حد تک جن کو شہروں میں بآسانی کام مل جاتا ہے خاص طور پر صادق آتی ہے۔ کھیتوں پر کام کرنے والے مزدوروں کی اجرت کا تعین بھی بڑی

باب ۸ حد تک مسابقت کے ذریعے سے ہوتا ہے تاہم ان مقامات میں جہاں زرعی مزدوروں کی قلت ہے۔ شہروں میں اُجرت کا تقرر مزدوروں کی روز افزوں مانگ کی وجہ سے قریب قریب پورے طور پر خالص مسابقت کی بنا پر ہوتا ہے۔

(ج) مسابقت اور قیمت

دیہی علاقوں میں قیمتوں کا تقرر طلب و رسد کے توازن کی بنا پر زیادہ سے زیادہ مسابقت کے تابع ہو رہا ہے۔ ذرائع نقل و حمل کی اصلاح و ترقی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ملک کے ایک علاقے میں قیمتوں میں تغیرات ہوں تو وہ دوسرے علاقوں کی قیمتوں کو بہت جلد متاثر کرتے ہیں؛ اور دنیا کے بازاروں سے ملک کا اتصال بڑھ جانے کی وجہ سے قیمتوں کے تعیّن میں مسابقت کا حصّہ قابلِ لحاظ حد تک بڑھ گیا ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ شہروں کے مقابلے میں دیہات میں قیمتوں کی اثر پذیری کی رفتار کا زیادہ سست رہنا لازمی ہے اس لیے کہ دیہی آبادی زیادہ قدامت پسند اور جاہل ہے۔

۲۔ صنعتوں میں تغیر و تبدّل

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ملکی صنعتوں میں کیا تغیر ہوا ہے؛ ان کے زوال کے کیا اسباب ہیں، اور دیہی پیشے اختیار کرنے کی جانب روز افزوں کیا میلان رہا ہے۔

بقول رانا ڈے ہندوستان گزشتہ صدی کے ساتویں عشرے کے وسط میں صنعتی حیثیت سے انتہائی پستی کی حالت میں تھا[1]۔ لیکن اس زمانے کے بعد سے بڑے پیمانے کی صنعت نے بہت تدریجی مگر قریب قریب کسی خلل کے بغیر ترقی کی۔ جو لوگ ہندوستان میں صنعتی انقلاب سے امیدیں وابستہ کرتے ہیں انھیں تصویر کا روشن پہلو گاؤں میں نہیں بلکہ ان صنعتی مرکزوں میں تلاش کرنا چاہیے جنھوں نے موجودہ زمانے میں جنم لیا ہے اور جن میں صنعت کی تنظیم بالکل جدید ترین اصول پر ہوئی ہے۔ چنانچہ بمبئی، کانپور، کراچی اور دریائے ہوگلی کے کناروں پر جا کر

158

---

[1] ۱۸۶۰ء تا ۱۸۶۵ء کے لگ بھگ زمانے میں حالات نہایت ابتر اور ناگفتہ بہ تھے۔ لیکن اس کے بعد ملک نے کروٹ بدلی اور حیاتِ تازہ کے آثار نمودار ہوئے۔ اسی حالت میں ہندوستان نے پہلا قدم اٹھایا جس نے اس کو مجبوری دور میں خالص زرعی ملک کے بجائے ایک حد تک صنعتی و تجارتی ملک بھی بنا دیا۔

باب ۵

دیکھنا چاہئیے جہاں ماہروں کی نگرانی میں مزدور اکھٹے اور کارگزار ہیں۔ ان ہی شہروں میں گرنیوں کی تعمیر اور قیمتی کلوں کی تنصیب میں سرمایہ بہت کشادہ دلی کے ساتھ لگایا گیا ہے۔ یہیں بڑے پیمانے کی پیدائش کے کفایات حاصل ہوئے ہیں اور یہیں ہندوستانی قائدان صنعت پیدا ہوئے ہیں[۱]۔ جدید طرز کی صنعت نے سب سے اوّل باغوں اور نخلستانوں میں اپنا قدم جمایا۔ چنانچہ جدید اصول پر چائے، کافی، نیل اور سَن کے کھیتوں اور باغوں میں کام شروع ہوا جو اہل یورپ کے ہاتھ میں تھے اور آج تک ہیں۔ اس جدید نشو ونما کو ۱۸۳۳ء کے قانون منشور (چارٹر ایکٹ) نے بہت تقویت پہنچائی، اس لیے کہ اس کی رو سے وہ سب بندشیں اٹھا لی گئیں جو اہل یورپ پر ہندوستان میں بسنے اور کاروبار کرنے کے بارے میں عائد تھیں۔ علاوہ ازیں اس نشو ونما میں جزائر غرب الہند کی غلامی کی منسوخی بھی اس لیے ممد و معاون ثابت ہوئی کہ اس کی وجہ سے جزائر غرب الہند کا مزرعہ دار ارزاں محنت کی سہولت سے محروم ہو گیا[۲]۔ برطانیہ کے کاروباری اشخاص نے اس بات کی اہمیت محسوس کرنے میں تساہل نہیں کیا کہ جدید اصول پر مصنوعات تیار کرنے کے لیے انواع و اقسام کی خام اشیا کثیر مقدار میں حاصل ہو سکتی ہیں اور ان مصنوعات کا مقامی بازار نہایت وسیع تھا۔ اس طرح انھوں نے لارڈ ڈلہوزی کی پیش بینی کو حق بجانب ثابت کیا جنھوں نے اس ترقی کا اندازہ پہلے ہی کر لیا تھا۔ چنانچہ برطانوی اصل اور حوصلہ مندی کی درآمد ہندوستان میں گزشتہ صدی کے وسط کے بعد سے خاص طور پر نمایاں ہو گئی۔

یوروپین کاروباری اشخاص کی مثال نے ہندوستانی تاجروں کے طبقے کو بالخصوص بمبئی میں اسی کے بالمقابل سرگرم جدو جہد کے لیے ابھارا۔ چنانچہ بمبئی میں نہایت جوش وخروش کے ساتھ اس کی تقلید کی گئی اور بمبئی ہی کو یہ عزت حاصل ہوئی کہ وہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی اس بارے میں رہنمائی کرے

---

[۱] دیکھو مورلینڈ کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۱۷۰ تا صفحہ ۱۸۱۔

[۲] دیکھو نالس کی تصنیف موسومہ "سلطنت ماورائے بحر کی معاشی ترقی" صفحہ ۱۰۴۔

باب اور اپنے لئے "ہندوستان کے صنعتی دار السلطنت" کی حیثیت حاصل کرے۔ گو بڑے پیمانے کی صنعتوں کی ترقی کی رفتار سست رہی ہے، لیکن ان کی ترقی کے سلسلے کا ملک میں قائم ہو جانا، دیہی پیشے اختیار کرنے کی اس تحریک کے ایک حد تک ازالے کی علامت تصور کیا جا سکتا ہے جس کے بارے میں راناڈے نے اس قدر افسوس و ملال کا اظہار کیا ہے۔

گزشتہ صدی کے تقریباً وسط میں ہندوستان میں فیکٹریوں کی صنعت رائج ہوئی اور ملک میں صنعتی انقلاب کا قطعی طور پر آغاز ہوا۔ اس کے بعد ہندوستان کی موجودہ زمانے کی اہم ترین صنعتوں میں سے دو صنعتیں علی الترتیب بمبئی اور کلکتے میں قائم ہوئیں۔ چنانچہ بمبئی کی سوتی کپڑے کی صنعت کو شروع ہی سے ہندوستانی اصل و تنظیم 156 حوصلہ مندی نے استوار بنیادوں پر قائم کیا اور اس کے برخلاف سن کی صنعت میں یوروپین اصل و حوصلہ مندی کو غلبہ حاصل رہا۔ صنعتی انقلاب کا اثر معدنی صنعتوں میں میں بھی ظاہر ہوا، اور اس کے بعد کئی دوسری صنعتوں مثلاً روئی اوٹنے، صاف کرنے اور دبانے کی صنعت، "کوئلہ، مینگنیز، سونے، ابرق، فولاد اور آہن کی صنعتوں، چاول کا بھوسہ صاف کرنے، آٹا پیسنے اور تیل کی گرنیوں وغیرہ میں بھی پھیل گیا۔ ترقی کی رفتار ابتداءً سست رہی اور وہ بھی ملک میں صرف چند مقامات تک محدود رہی، اور گزشتہ صدی کے آخر سے فیکٹری کی صنعت نے سارے ملک میں ترقی کرنی شروع کی۔ موجودہ صدی کے ابتدائی عشرے میں خاصکر اس سرگرمی اور جوش و خروش کے اثر کے تحت جو "سودیشی" کی تحریک کی بدولت پیدا ہو گیا تھا، اکثر معدنی اور بعض متفرق صنعتوں نے نمایاں حیثیت اختیار کر لی۔ اسی بعد کے زمانے میں ہندوستان میں چھوٹی کلوں اور چھوٹے انجنوں کا رواج بھی شروع ہوا اور ہر جگہ میکانکی آلات کو استعمال کرنے کا میلان عام طور پر بڑھ گیا۔ جنگ عظیم نے ہندوستانی مصنوعات کے حق میں ایک جانبدارانہ محرک کا کام کیا اور یہ بات بالخصوص سوت اور سن کی گرنیوں، اپنی فولادی اصنعتوں(؟) پر خاص طور پر صادق آتی ہے۔ بڑے پیمانے کی صنعت کی حالیہ

ء مزید تاریخی تفصیلات کے لیے دیکھو گاڈگل کی تصنیف محولہ بالا باب ۳ اور باب ۸۔

باب ۵

ترقی پر جس کو "امتیازی تامین" کی پالسی سے منسوب کیا جاسکتا ہے، ہم ہندوستان کے محصول درآمد کے اصول کی بحث کے سلسلے میں مفصل توجہ کریں گے۔

ہندوستانی صنعتوں کی اس عبوری حالت کی دو مذموم خصوصیات کا ذکر کردینا ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ تغیر کی رفتار بہت سست اور ناہموار رہی، اور دوسرے یہ کہ جو کچھ تغیر واقع ہوا ہے اس کا محرک غیر ملکی اصل ہے، چنانچہ اس کے نتیجے کے طور پر ملکی صنعتوں میں غیر ملکی اصل کی حیثیت بہت غالب ہوگئی ہے اور وہ ہندوستان کی نوزائیدہ دولت کے بڑے حصے کو جذب کرلیتا ہے۔ گو غیر ملکی اصل اور حوصلہ مندی نے صنعتی ترقی کے حق میں محرک کا کام کیا؛ لیکن اس کے نتیجے کے طور پر اکثر صورتوں میں ایسے ملکی ذرایع کے ایک حد تک قبل از وقت استحصال کا بھی موقع بہم پہنچایا جو فطری افزایش و بحالی کے عمل کے تابع نہیں ہیں اور ایسا تو حقوق قائم پیدا کردیے جو سیاسی و معاشی معاملات میں قومی نقطۂ نظر سے بین تضاد و تناقض رکھتے ہیں۔ ہماری صنعت کی سست رفتار ترقی اور ناہموار نوعیت کی توجیہ کرنے والے اسباب کے منجملہ سب سے نمایاں اور اہم سبب حسب ذیل ہیں:-

(۱) ہندوستانی اصل کی قلت اور اس کا شرمیلاپن یا حجاب ہندوستانی اصل، جدید وضع کی مصنوعات کی تیاری کے بجائے قرضہ دینے میں اور زمین یا تجارت میں مصروف رکھا جاتا ہے یا (۲) بنک کاری کی ناکافی سہولتیں؛ (۳) قدرتی ذرایع مثلاً کوئلے کی غیر مساوی تقسیم، قدرتی ذرایع کے متعلق عام ناواقفیت اور ان کی مقابلتہً غیر ترقی یافتہ حالت؛ (۴) فنی تعلیم کا فقدان، (۵) ہمارے ماہر اور غیر ماہر مزدوروں کی مقابلتہً ادنیٰ کارکردگی؛ (۶) ماہر مزدوروں اور قائدان صنعت کی قلت؛ (۷) فولاد اور لوہے کی سی اساسی صنعتوں کی غیر ترقی یافتہ حالت؛ اور (۸) حکومت کا تغافل و تساہل اور ترقی کی رفتار کو بڑھانے کے بارے میں کوئی خاص جدوجہد کرنے سے قاصر رہنا۔ حال ہی میں "تامین" کا جو اصول اختیار کیا گیا ہے وہ بے پروائی کے اس طرز عمل سے انحراف کی ایک خوشگوار علامت ہے جو ہندوستان کی صنعتی ترقی کے بارے میں زمانۂ دراز سے برطانوی پالسی کی امتیازی خصوصیت رہا ہے۔

157

باب

۲۸ صنعتی ترقی کی جانچ کے دو معیار۔

ملک کی صنعتی ترقی کی وسعت دریافت کرنے اور ہندوستان میں معاشی تغیر کا حال معلوم کرنے کے لیے آزمایش کے دو معیار تجویز کیے گئے ہیں، یعنی (۱) تجارت خارجہ کے اعداد و شمار اور (۲) شہروں کی ترقی۔ (۱) سب سے اوّل تجارت خارجہ کے اعداد و شمار سے بحث کرنی چاہیے جو درآمد و برآمد میں مصنوعات کے تناسب سے خاص طور پر متعلق ہیں۔ بقول موریسن "ملک کی دولت اور آبادی کے اضافے کے باعث درآمد و برآمد دونوں میں بڑی حد تک اضافہ ہوا ہے، لیکن اشیائے خام کی برآمد کے مقابلے میں مصنوعات کی برآمد میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے، جس سے مقامی صنعتوں کی ترقی ظاہر ہوتی ہے۔ تجارت درآمد میں ہماری توقع کے مطابق اس کے برعکس سمت میں میلان ہے، مصنوعات کی درآمد کے مقابلے میں اشیائے خام کی درآمد میں بدرجہا زیادہ اضافہ ہوا ہے اور اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہاں مصنوعات تیار کرنے کی غرض سے ملک اشیائے خام کی بڑی تعداد درآمد کرتا رہا ہے۔ خود بقول راناڈے ۱۸۷۹ء تا ۱۸۹۲ء میں مکمل یا جزوی حیثیت سے مکمل مصنوعات کی برآمد کی قیمت بڑھ کر ۴ء۱۶ کروڑ روپے ہو گئی جس سے ۲۱۱ فیصد اضافہ ظاہر ہوتا ہے۔ خام پیداوار کی برآمد کی قیمت ۵۹ء۶ کروڑ روپے سے بڑھ کر ۸۵ء۶ کروڑ روپے ہو گئی، لیکن یہ اضافہ مقابلۃً اتنا بڑا نہ تھا، اس لیے کہ اس کا فیصد صرف ۴۳ نکلتا ہے۔ اس کے برخلاف مصنوعات کی درآمد ۲۵ء۱۹ کروڑ سے بڑھ کر ۲۲ء۳۶ کروڑ ہو گئی یا ۹۳ فیصد اضافہ ہوا، لیکن خام پیداوار کی درآمد تقریباً دونی ہو گئی یعنی ۷۵ء۱۳ کروڑ سے بڑھ کر ۲۶ء۳۰ کروڑ ہو گئی یا ۹۱ فیصد اضافہ ہوا۔ چنانچہ ان اعداد کی بنا پر راناڈے اس نتیجے پر پہنچا کہ "گھریلو صنعتوں کی تباہی اور صنعتی پیشے ترک کر کے بتدریج زراعت اختیار کرنے" کے خلاف جو تحریک شروع ہوئی اس کا آغاز ہو گیا تھا[۱]۔ اسی اصول پر ۱۸۹۰ء تا ۱۹۰۵ء کے زمانے کی بابت اس تجزیے کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے پروفیسر کالے یہ ثابت کرنے کے قابل ہوئے ہیں کہ "اس زمانے میں

---

[۱]۔ دیکھو کالے کی تصنیف صفحہ ۱۱۱۔

باب ۵

مصنوعات کی درآمد ۳۰۹ فیصد اور خام اشیا کی درآمد ۱۲۰ فیصد بڑھ گئی؛ اس کے برخلاف مصنوعات کی برآمد میں ۱۳۹ فیصد اور پیداوار خام کی برآمد میں صرف ۵۰ فیصد اضافہ ہوا۔ مجموعی درآمد کے مقابلے میں مصنوعات کی درآمد کا تناسب ۱۸۷۹ء میں ۶۵ فیصد اور ۱۸۹۲ء میں ۷۵ فیصد تھا، لیکن ۱۹۰۷ء میں یہ ۵۳ فیصد تک گر گیا۔ علیٰ ہذا مصنوعات کی برآمد کا تناسب مجموعی برآمد کے مقابلے میں ۱۸۷۹ء میں صرف ۸ فیصد اور ۱۸۹۲ء میں ۱۶ فیصد تھا، لیکن ۱۹۰۷ء میں ۲۲ فیصد تک بڑھ گیا۔[۱] اور یہاں یہ تبلا دینا مناسب ہوگا کہ جنگ عظیم نے جو محرک بہم پہنچایا اس کے تحت یہ تناسب ۱۹۱۹ء میں بڑھ کر ۳۶ فیصد ہوگیا۔

لیکن جے، ام کینس جیسے نقادوں نے ان اعداد و شمار کی صحت پر اعتراض کیا ہے۔ وہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ "سرکاری گوشواروں میں مصنوعات کی درآمد کے اعداد گمراہ کن ہیں اور ان کا وہ مفہوم نہیں ہے جو وہ بظاہر پیدا کرتے ہیں؛" اس لیے کہ اس عنوان کی ذیل میں دوسری مدوں کے منجملہ کلوں، فلزات اور فلزی مصنوعات کی کل درآمد داخل نہیں کی گئی ہے۔ علیٰ ہذا اشیائے خام کی درآمد کے اضافے کے حسابات بھی مغالطہ پیدا کرتے ہیں۔ برآمد کی حد تک، نیم کل مصنوعات مثلاً سوت اور دباغت کیا ہوا چرم، مصنوعات کی برآمد کے مجموعی اعداد کو بڑھا دیتا ہے جس کی وجہ سے صنعتوں کی ترقی اور اس کی رفتار کے متعلق غلط اور مبالغہ آمیز اندازہ قائم ہوتا ہے۔ ہندوستان کی تجارت خارجہ کی اساسی خصوصیات پر تبصرہ کرتے وقت اس موضوع پر مکرر بحث کی جائے گی۔ یہاں یہ کہہ دینا کافی ہے کہ تجارتی اعداد و شمار سے یہ بات پوری طرح عیاں ہے کہ میلان، صنعتی ترقی کی طرف یقینی طور پر پایا جاتا ہے اور مرور وقت کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض لوگ ڈاکٹر گلبرٹ سلیٹر کی طرح ترقی کی موجودہ رفتار سے نالاں ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ اتنی زیادہ سریع اور تیز ہے کہ معاشی و معاشری ثبات پذیری کو دھکی دے رہی ہے اور موجودہ زمانے کی صنعتی ترقی کی خرابیوں کو روکنے کی جو تدابیر

---

[۱] دیکھو بلے کی تصنیف موسومہ "ہندوستان کے معاشی حالات" صفحہ ۴۱۔

باب ۵

اختیار کی جا رہی ہیں ان پر سبقت لے جا رہی ہے۔ لیکن یہ خیال عام طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے برخلاف عام اور غالب خیال یہ ہے کہ صنعتی ترقی کی رفتار کو تیز تر کیا جائے؛ اس لیے کہ موجودہ زمانے میں بھی ہندوستان کی درآمد کا ۳/۲ حصہ مصنوعات پر مشتمل ہے اور دوسری طرف مجموعی برآمدیں اشیائے خام بشمول اشیائے خوردنی کا قریب قریب یہی تناسب ہے[1]۔

(۲) اس کے بعد اب ہم آزمائش کے دوسرے مجوزہ معیار یعنی شہروں کی ترقی سے بحث کریں گے[2]۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ شہروں کی قلیل تعداد، اور مجموعی آبادی سے شہری آبادی کا حقیر تناسب، اس بات کی علامت ہے کہ ملک صنعتی حیثیت سے پسماندہ حالت میں ہے۔ اس سے پیشتر ایک گوشوارہ دیا جا چکا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کی شہری آبادی کا تناسب بتدریج ترقی پذیر ہے[3]۔ طویل مدت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو مجموعی آبادی سے شہری آبادی کا تناسب کم و بیش غیر متغیر رہا ہے، شہری آبادی میں ملک کی مجموعی آبادی کے مقابلے میں کچھ ہی زیادہ سرعت کے ساتھ اضافہ ہوا ہے۔ اس کے برخلاف انگلستان میں جدید صنعتوں کی ترقی کی بدولت شہری آبادی میں بہ سرعت اضافہ ہوا، چنانچہ وہاں ۸۰ فیصد باشندے شہروں میں رہتے ہیں۔ پس شہروں کی آبادی کی ترقی کے آزمائشی معیار کے لحاظ سے ہندوستان کو ابھی بہت بڑی کمی کو پورا کرنا باقی ہے۔

158

۲۹۔ شہروں کی ترقی پر اثر ڈالنے والی جدید قوتیں۔ اب ہم ان مختلف قوتوں کو بیان کریں گے جو جدید ہندوستان میں شہروں کی ترقی پر اثر ڈال رہی ہیں۔

---

[1] ۱۹۲۲ء تا ۱۹۳۳ء میں مجموعی درآمد سے درآمدہ مصنوعات کا تناسب ۶ر۴ فیصد تھا جس کے مقابلے میں زمانہ قبل از جنگ کا تناسب ۲ر۷۱ تھا۔ اس کے برخلاف ۱۹۲۲ء تا ۱۹۳۳ء میں ہندوستان کی مجموعی برآمد سے ہندوستان سے برآمد کردہ مصنوعات کا تناسب ۴۶ ر ۵ تھا جس کے مقابلے میں زمانہ قبل از جنگ کا تناسب ۲۳ تھا۔ دیکھو "تبصرہ بر تجارت ہند" (ریویو آف دی ٹریڈ آف انڈیا) ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء جدول (۴) و (۵)۔

[2] دیکھو ناکس کی تصنیف محولۂ بالا باب ۱۰۔

[3] دیکھو مطبوعہ اوراق کے صفحہ کا حوالہ دیا جائے۔

باب ۵

(۱) ریلوں اور جہازرانی نے نئے صنعتی مرکز پیدا کر دیئے ہیں اور بعض قدیم مرکزوں کی اہمیت کو بڑھا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں برطانوی حکمرانی کے اولین نتائج میں سے ایک یہ تھا کہ بڑے بڑے تجارتی مرکز رونما ہوئے، گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ برطانویوں نے ہندوستان میں شہر سازوں کا کام انجام دیا۔ چنانچہ بمبئی، کراچی، مدراس، رنگون، کلکتہ، دہلی، لاہور، ہبلی اور بنگلور جدید تجارتی شہروں کی مثال کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔

(۲) مغرب میں جدید صنعتوں کی ترقی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے بڑے شہروں میں آبادی بہت بڑی تعداد میں مجتمع ہو گئی، چنانچہ یہ واقعہ ہندوستان میں بھی اپنی نظیر سے خالی نہیں۔ ملک کی بڑی صنعتوں نے دیہات و مواضع کو قصبات میں اور قصبات کو شہروں میں مبدل کرنے میں بہت اہم حصہ لیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بمبئی، احمد آباد، شولاپور اور ہبلی، جہاں سوتی گرنیاں اور کارخانے قائم ہیں اور کانپور جہاں اون کی گرنیاں اور چمڑے کی فیکٹریاں قایم ہیں، جدید صنعتی دور کی پیداوار ہیں اور ان کی وسعت و اہمیت کا باعث یہ ہے کہ وہاں ایسی صنعتیں قائم ہوئیں جن سے روزمرہ کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ ۱۹۱۱ء کے بعد جب ٹاٹا کے آہنی و فولادی کارخانے میں توسیع ہونے لگی تو پھر جمشید پور بھی بہت تیزی سے ترقی کرنے لگا یہاں تک کہ وہ ہندوستان کا ایک غیر معمولی صنعتی کارنامہ سمجھا جانے لگا۔ لیکن ہندوستان میں شہروں کی ترقی پر صنعتی ترقی کا اس قدر طاقتور اثر نہیں پڑا جس قدر کہ مغربی ممالک میں پڑا تھا۔ چنانچہ یہ اس واقعے سے ثابت ہے کہ موجودہ ۳۴ ہندوستانی شہروں کے منجملہ جن کی آبادی ایک لاکھ یا اس سے متجاوز ہے کم از کم ۲۲ شہر ایسے ہیں جن کی اہمیت کا باعث کم از کم ایک حد تک صنعتی یا تجارتی کاروبار کے سوا دوسرے اثرات ہیں۔ اور اس کا مزید ثبوت اس واقعے سے بھی جو ۱۹۱۱ء کی مردم شماری سے ظاہر ہوتا ہے، بہم پہنچتا ہے کہ ان شہروں کے صرف ۳۰ فیصد باشندے صنعتی پیشہ کرتے تھے۔

(۳) دیہی آبادی میں کمی اور شہری آبادی میں اضافہ جن اسباب کی بنا پر ہوتا ہے ان میں سے ایک قحط ہے۔ ممکن ہے کہ اس اضافے کا ایک جزو شہری بستیوں میں

باب ۸

مستقلاً جذب ہو جائے، گو عام طور پر اس اضافے کا بیشتر حصہ اس لیے یقیناً کم ہو جاتا ہے کہ اکثر لوگ بارش کے شروع ہوتے ہی اپنے اپنے دیہات کو واپس چلے جاتے ہیں۔

(۴) دیہات میں بے زمین مزدوروں کی جماعت کا نمودار ہونا کئی اسباب کا نتیجہ ہے، مثلاً قحطوں کا واقع ہونا، قدیم ملکی کاشتکاروں کا بے دخل کیا جانا اور دستکاروں کا اجرت پانے والوں کی حیثیت میں تبدیل ہو جانا۔ اس جماعت کا وجود شہری آبادی کے اضافے میں ایک حد تک مدد دیتا ہے، اس لیے کہ بے زمین مزدور کو اگر شہروں میں کام مل جائے تو وہاں عام طور پر بخوشی جانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

160

(۵) شہری زندگی کی گوناگوں دلچسپیاں، متمول زمینداروں اور دوسرے باحیثیت اشخاص کو شہروں میں جا بسنے کی ترغیب دیتی ہیں۔ اس کی وجہ سے ضمناً "غیر حاضر زمینداری" کی بھی حوصلہ افزائی ہوتی ہے

(۶) نظم و نسق کی مرکزیت نے دیہات کے مقابلے میں تعلقے کے قصبے کی اور تعلقے کے قصبے کے مقابلے میں ضلع کے مستقر کی اہمیت بڑھا دی ہے؛ علیٰ ہذا یہی بات ڈویژن کے صدر مقام، صوبائی پایۂ تخت، مرکزی حکومت کے دارالسلطنت اور ریاست کے مرکزی شہر کے بارے میں بھی صادق آتی ہے۔

(۷) ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی سہولتیں عملاً بڑے شہروں تک محدود ہیں اور والدین اپنے بچوں کی تعلیم کی غرض سے عام طور پر ان ہی شہروں کو سکونت کے لیے منتخب کرتے ہیں۔

۳۔ شہروں کے زوال کے اسباب

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ شہروں کی اس روز افزوں ترقی کے دوش بدوش قدیم شہروں میں آبادی کی کمی کا میلان بڑھ رہا ہے۔

(۱) محل وقوع کی اہمیت کے تغیرات اور تجارتی شاہراہوں کی تبدیلی اکثر صورتوں میں ایسے شہروں کے زوال کا باعث ثابت ہوئی ہے جن کی سابقہ خوشحالی و سرسبزی کا منبع یہ تھا کہ وہ دریائی یا بری تجارتی راستے پر واقع تھے لیکن اب ریلوں کی توسیع کی وجہ سے ان راستوں کی اہمیت باقی نہیں رہی؛ مثلاً مرزا پور ساحل گنگا پر، پٹنا، ساگر وغیرہ۔ ریلوے انجینئر ہمیشہ ایسا خاکہ مرتب نہیں کر سکتا کہ ریلیں کی

باب ۶

پڑی قدیم شہری مرکزوں کے قریب سے ہو کر گزرے۔ چنانچہ شاہراہ سے دور اور الگ تھلگ ہو جانے کی وجہ سے بعض شہروں کی اہمیت فطری طور پر گھٹ گئی ہے۔

(۲) قدیم شاہی درباروں کے اجڑ جانے اور یوروپین مسابقت کے رونما ہونے کی وجہ سے شہر کی دستی صنعتوں کو زوال آیا جس کی بنا پر قدیم ہندوستانی شہروں مثلاً ڈھاکہ، مرشدآباد، مانڈلے، تنجور وغیرہ کی آبادی میں کمی ہو گئی۔ حتیٰ کہ گیا اور بنارس جیسے مقدس شہروں کی آبادی اور اہمیت بھی گھٹ رہی ہے، اس لیے کہ ان شہروں کی قدیم صنعتوں کی پیداوار کی طلب زائرین اور جاتریوں میں کم ہو رہی ہے۔

(۳) طاعون اور ہیضہ جیسی وبائیں جو میعادی طور پر نازل ہوتی رہتی ہیں شہروں کو مرگھٹ بنا جاتی ہیں اور آبادی کو ملک کے کھلے ہوئے حصوں میں منتقل کر دیتی ہیں۔ اس قسم کی نقل و حرکت بہ لحاظ نوعیت صرف عارضی ہوتی ہے، چنانچہ شہروں میں صحت و تندرستی کے معمولی حالات و شرائط عود کر آنے سے آبادی پھر شہروں کو واپس آجاتی ہے۔

شہروں کے عروج و زوال کے دو متضاد میلانات کا لحاظ کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اب تک ایک میلان دوسرے کو زائل کرتا رہا یا دونوں میں ایک حد تک توازن قائم رہا، گو حالیہ سالوں میں شہری آبادی کی ترقی کا میلان خفیف حد تک غالب اور نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔ یہ حالت انگلستان میں صنعتی انقلاب کے زمانے کے واقعات سے نمایاں طور پر تضاد رکھتی ہے۔ وہاں جنوبی ملک کے شہر قلیل سی مدت میں اجڑ گئے، لیکن ان کا زوال شمال کے بدرجہا زیادہ آباد مرکزی شہروں کے سریع عروج کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

161

۳۱۔ مقامی معیشت سے بین الاقوامی معیشت میں اچانک تغیر

پروفیسر واڈیا اور پروفیسر جوشی اس ارتقا کو، جسے ہم "معاشی تغیر" کے عنوان کے تحت بیان کر چکے ہیں "مقامی معیشت سے بین الاقوامی معیشت میں اچانک تغیر" کے نام سے موسوم کرتے ہیں[۱]۔ اس کے ذریعہ سے بظاہر صرف یہ مفہوم ادا کرنا مقصود ہے کہ گاؤں بیرونی دنیا سے اچانک طور پر ملحق ہو گیا، یہ کہ داخلی تجارت کے مقابلے میں

[۱] دیکھو واڈیا اور جوشی کی تصنیف مولفہ لاننگ ۱۹۲۵ء صفحہ ۱۶۰

باب۴ بین الاقوامی تجارت نے بہت تیزی کے ساتھ ترقی کر لی؛ یہ کہ چونکہ یہ تجارت بالکل غیر منظم تھی، اس لیے اس کی بنا پر ملک کی معاشی زندگی کی یکطرفہ اور بہ حیثیت مجموعی ضرر رساں ترقی ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زراعت کے بہت موافق اور صنعت کے مخالف رجحان پیدا ہو گیا؛ یہ کہ یہ ترقی و تغیر افریقہ و ایشیا کے براعظموں کے غیر ترقی یافتہ علاقوں کے اس عام استحصال کا جزو تھا جو یورپ کی بڑی حکومتوں کے ہاتھوں عمل میں آ رہا تھا؛ اور یہ کہ ملک کی حکومت نے اس کو جائز قرار دیتے ہوئے حقیقی قومی اغراض کو ملحوظ خاطر نہ رکھا۔ اگر ان تمام امور کی کوئی مختصر تعریف ضروری یا مفید خیال کی جائے تو، غالباً یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ "خود کفالت کی حالت سے بین الاقوامی مبادلے کی جانب اچانک تغیر واقع ہوا"۔ اس لیے کہ "بین الاقوامی معیشتہ" کی اصطلاح کے معنی یہ ہیں کہ ایک "عالمی ارادہ یا مقصد" موجود ہے جو "قومی ارادوں یا مقاصد سے مافوق اور ان پر حاوی ہے"۔[1] لیکن موجودہ زمانے میں ایسا کوئی "عالمی ارادہ" یا مقصد موجود نہیں ہے، اور بین الاقوامی تعلقات نسل انسانی کے نصب العین کے مطابق نہیں بلکہ متعلقہ قوموں کے ارادوں اور مقاصد کے لحاظ سے منظم ہوتے ہیں۔[2] "قوم اب بھی معاشی اکائی ہے اور ہم بین الاقوامی معیشتہ کا لفظ اس وقت تک استعمال نہیں کر سکتے جب تک کہ قومی نقطۂ نظر عالمی یا بین الاقوامی ملحوظات سے متبدل نہ ہو جائے"۔[2] بین الاقوامی معیشتہ میں کسی خاص قوم کو جو قربانی کرنی پڑے گی اس کو خود متعلقہ قوم اپنی رضا و رغبت سے قبول کرے گی اور اس پر کوئی دوسری قوم مکر یا قوت سے عائد نہ کرے گی۔ علاوہ ازیں ایسی قربانی انجام کار بہ لحاظ اس امر کے ہمیشہ حق بجانب ثابت ہوگی کہ قربانی کرنے سے نہ صرف عام طور پر مملکت عالم کو انجام کار فائدہ پہنچے گا بلکہ خود عارضی طور سے قربانی کرنے والی انفرادی مملکت کو بھی۔

پھر بھی جہاں ہمیں "بین الاقوامی معیشتہ" کی اصطلاح پر اعتراض ہے وہاں، عام طور پر اس خیال سے اتفاق ہے کہ ہندوستان کی معاشی حالت کے تغیر کے

[1] دیکھو جے گرنزل کی کتاب "معاشی ماہیت" صفحہ ۳ تا صفحہ ۴۔

[2] دیکھو سیگسمن کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۱۸ تا صفحہ ۲۰۔

باب ۲
162

روش بدوش متعدد قابل افسوس خصوصیات بھی رونما ہوئیں۔ گو اس ارتقا کے نتیجے کے طور پر رونما ہونے والی تبدیلی سب کی سب خراب نہیں ہے، بلکہ ایک حد تک اچھی بھی ہے، تاہم وہ اپنے ساتھ بعض یقینی خرابیاں بھی لائی، مثلاً ہندوستانی تجارت خارجہ کی انتہائی یکطرفہ نوعیت، ملکی صنعتوں کا بہ سرعت زوال، اس کی معاشی زندگی میں غیر ملکی اصل کا ناواجب دخل، اور زمین پر آبادی کا حد سے زیادہ دباؤ وغیرہ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ نازک حالت میں ملک کی معاشی سدھار کے لیے حقیقی قومی معیشت کو ترقی دینا نہایت ضروری اور اہم ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ قومی معیشت اپنا نصب العین لازمی طور پر "خود کفالت" نہیں قرار دیتی اور نہ تجارت مامون یا تجارت آزاد کی کسی مخصوص پالسی سے خود کو وابستہ کرتی ہے، بلکہ وہ اپنے طریق کار کا خود ہی انتخاب کرلیتی ہے، خواہ طریق کار کچھ ہی ہو، اور اس کا واحد نصب العین یہ ہوتا ہے کہ قومی مفاد اور خوشحالی کو ترقی اور فروغ دیا جائے۔

۴۲۔ کیا ہندوستان کا صنعتی حیثیت سے ترقی کرنا مناسب ہے

ہندوستان میں صنعتوں کی ترقی و توسیع کی تحریک اچھی خاصی شروع ہو چکی ہے۔ اگرچہ رائے عامہ کا میلان اس کی رفتار کو تیز کرنے کی تائید میں ہے، پھر بھی بعض لوگ ایسے ہیں کہ جو بس چلے تو اس کو اسی ابتدائی حالت میں اس لیے کچل دینا چاہتے ہیں کہ وہ ملک کے لیے نہایت نامبارک امکانات سے پر ہے۔ صنعتوں کی توسیع و ترقی کی مخالفت ایک حد تک ان لوگوں کی طرف سے کی جاتی ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ انسانی زندگی اور کام کو ناگزیر طور پر ادنیٰ و ذلیل خشک اور بے مزہ بنا دیتی ہے۔ وہ صنعت کے سادہ اور دقیانوسی نظام کے دلدادہ ہیں جس کے تحت مشینوں کے دور کے مقابلے میں زیادہ ہوا اور روشنی ملے گی، چلنے پھرنے کی زیادہ گنجایش ہوگی اور زیادہ آزادی کے ساتھ کام کیا جا سکے گا۔ لیکن انتہائی طور سے سادہ معاشی زندگی کا یہ خیال ایک شاعرانہ خواب ہے جو حقیقت اور معقولیت سے بالکل معرا ہے، چنانچہ ہمیں تحقیق طور پر معلوم ہے کہ یہ خیال کسی زمانے اور کسی مقام میں کبھی پورا ہوا ہی نہیں۔ اس کے برخلاف ہم یہ جانتے ہیں کہ دستی محنت بہت سست رفتار، بوجھل اور وحشی بنانے والی ہوتی ہے، اور یہ کہ جب سے انسانی و حیوانی محنت کی جگہ کلوں نے لی ہے، انسان کی معاشی حیثیت میں گوناگوں

اصلاح و ترقی ہو گئی ہے اور انسان نے قدرت پر اپنے قابو کو بڑھا کر زمین کو زیادہ آرام دہ اور خوشگوار مسکن بنا لیا ہے، چنانچہ انسانی و حیوانی محنت کی جگہ کلوں کو استعمال کرنے کا حقیقی مقصد یہی ہے۔

بعض لوگ اگرچہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ انسانوں اور حیوانوں کی محنت کے ساتھ ساتھ کلوں کو بھی استعمال کرنا ایک حد تک ضروری ہے، پھر بھی وہ ایک ایسی حد قائم کرنا چاہتے ہیں جس سے تجاوز کر کے قدرت پر انسان کے قابو کو بڑھانے کو وہ جائز نہیں قرار دیتے۔ مثلاً وہ پن چکی یا ہوائی چکی یا سادہ چوبی ہل یا کتائی کے چرخے تک اپنی ترقی کو محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کے پاس اس سوال کا کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ہے کہ قدرت پر اپنا قابو بڑھانے کے لیے انسان نے جو شروعات کی ہیں ان کا سلسلہ آگے بڑھا کر اپنے تسلط کو اور زیادہ مکمل کیوں نہ کیا جائے۔

168

اس بات کا یقیناً قرینہ ہے کہ جدید طرز کے بڑے پیمانے کے کاروبار اور کلوں کے رواج کے نتیجے کے طور پر بعض بہت ہی شدید خرابیاں رونما ہوں، مثلاً آبادی کی حد سے زیادہ کثرت، کمزور کا طاقتور کے ہاتھوں تباہ ہونا، ناگفتہ بہ حالات اور صحت کیلئے مضر اور گندہ ماحول میں مزدوروں کی بہت بڑی تعداد کا بے سرو سامانی، تنگ دستی، تکلیف و مصیبت کے ساتھ، زندگی بسر کرنا۔ تاہم یہ صحیح نہیں ہے کہ ان خرابیوں کو رفع کرنے کا واحد علاج ہی یہ ہے کہ بڑے پیمانے کی صنعت کے جدید طریقوں کو ترک کیا جائے یا ان سے اجتناب کیا جائے۔ جیسا کہ مغرب کے تجربے سے ظاہر ہے، ان خرابیوں کو، مناسب سرکاری پالسی کے ذریعے سے اور آئین و قوانین وضع کر کے رفع کرنا بڑی حد تک ممکن ہے۔ اور یہ بہت ہی معنی خیز بات ہے کہ گو مغرب میں موجودہ معاشی نظام کے خلاف سخت بے اطمینانی پھیلی ہوئی ہے پھر بھی کسی بااثر شخص نے کلوں کو رواج سے کلیتہً خارج کر دینے کی تحریک یا تجویز ہی پیش نہیں کی۔ جو بے اطمینانی پھیلی ہوئی ہے وہ زیادہ تر بڑے پیمانے کی پیدائش کے طریق کے خلاف نہیں بلکہ پیدا کی ہوئی دولت کی تقسیم کے طریقے کے خلاف ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ہمیں زندگی کے مادی پہلو پر ناواجب زور دینے سے احتراز

باب ۵

کرنا چاہئے لیکن ہندوستان جیسے مفلس ملک کے لیے یہ واضح طور سے ضروری ہے کہ فی کس دولت کی مقدار میں اضافہ کیا جائے اور اس کے کروڑوں باشندوں کو محض زیست کے افکار اور پریشانیوں سے نجات دلائی جائے تاکہ ان کے لیے کسی قسم کا بہتر طرز بود و باش ممکن و میسّر ہو سکے[1]۔ اور یہ پیدائش کے جدید ترین طریقوں کو استعمال کیے بغیر ممکن نہیں۔ علاوہ ازیں یہ ذہن نشیں رکھنا چاہیئے کہ ہندوستان اب بقیہ دنیا سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتا، خواہ وہ اس کا خواہاں ہی کیوں نہ ہو، اور وہ صرف اس صورت میں غیر ملکی مسابقت کی زد سے بچ کر نکل سکتا ہے جبکہ جدید صنعتی ترقی کے آلات خود بنائے۔ ایف، ایس، مارون نے کلوں کی تائید میں نہایت پُرزور استدلال حسب ذیل کیا ہے:۔"مشین، قدرت پر انسان کی طبیعی قوت اور دسترس بڑھادیتی ہے، اس کو اس قابل بناتی ہے کہ زیادہ دماغی محنت کر سکے، اپنی انگلیوں سے زیادہ دیر تک اور زیادہ نزاکت و صفائی سے کام لے سکے اور اس کے رگ پٹھوں میں زیادہ قوت پیدا کرتی ہے جو شخص اس کا اصولاً مخالف ہے وہ نوع انسانی کی ترقی کا دشمن ہے؛ وہ کوئی حد فاصل قایم کرکے یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہاں تک انسان کا اپنی قوت کو بڑھانا حق بجانب ہے لیکن اس سے تجاوز کرنا درست نہیں کیا یہ حد قوت محرکہ سے چلنے والے ہل پر قائم کرنی چاہئیے یا اس قدیم ترین اور سادہ ترین لکڑی پر جو زمین کھرچنے کے لیے استعمال کی جاتی تھی، فولادی میکانی فصل تراش تک اس کو محدود رکھنا چاہئیے یا حجری دور کی پتھر کی کلہاڑی تک؛ ان میں کمال اور قوت کے مدارج کے سوائے اور کوئی فرق نہیں ہے۔ اصل اعتراض تو کسی دوسری ہی چیز پر ہے جو اس سے مختلف ہے یعنی صنعتی شہر پر، فیکٹری کے نظام پر اور اس چیز پر جس کو "اجرت کی غلامی" کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ سب معاشری انتظامات ہیں جن میں حسب دلخواہ و مرضی ترمیم و اصلاح کی جا سکتی ہے، تاہم وہ قدرت پر انسانی دسترس کے اضافے سے کسی طرح لازماً وابستہ نہیں ہیں۔"

[1] ہندوستان کی مادی ترقی کے بارے میں زیادہ مناسب طریق کار اختیار کرنے کی عمدہ بحث کے لیے دیکھو ام، ال ڈارلنگ کی کتاب موسومہ بہ "دیہاتی کی کہانی خود اس کی زبانی" صفحہ ۲۷۴۔

باب ۵
164

جو لوگ ہندوستان کو صنعتی ملک دیکھنے کے مخالف ہیں بعض اوقات وہ ایک نرالے انداز میں استدلال کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہندوستان میں صنعتوں کو فروغ دینا صرف اس حالت میں ممکن ہے جبکہ ہندوستان کی عظیم ترین صنعت یعنی زراعت کا خون کیا جائے۔ اس استدلال پر اُس باب میں بحث کی جائے گی جس میں ہندوستان کی صنعتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ سردست ہم یہ کہنے پر قناعت کریں گے کہ صنعتی ترقی، ہمارے ملک کی زرعی ترقی کے ہرگز منافی نہیں ہے بلکہ اس پر مفید و نفع رساں اثر ڈالتی ہے۔ آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ خیال کہ ہندوستان کو بسرعت صنعتی ملک بنانا ضروری اور مناسب ہے روز افزوں قوت حاصل کرتا جارہا ہے اور اس میلان کے مخالفوں کو معلوم ہوگا کہ وہ ایک بے سُود اور لاحاصل سعی کررہے ہیں۔ انھیں صنعتی ترقی کے امنڈنے والے سیلاب کو روکنے کی کوشش میں اس سے زیادہ کامیابی کا موقع نہیں ہے جتنا کہ مسز پارٹنگ ٹن جیسی نیک نفس خاتون کو بحر اطلانطک سے بے انداز زور آزمائی کرنے میں اور اس کو اپنی کوپچی سے ڈھکیلنے کی دلیرانہ کوشش میں تھا۔

165

باب ۶

زراعت

پیداوار اور برآمد

ا۔ زراعت کی حیثیت معاشیات ہند میں۔

ہندوستان کی معاشی زندگی کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ دوسرے سب پیشوں کے مقابلے میں زراعت کا پلہ بہت بھاری ہے۔ چنانچہ انسانوں کا ایک انبوہ کثیر جو ملک کی تین چوتھائی آبادی کے برابر ہے، کھیتی باڑی میں اپنی زندگی اور محنت وقف کیے ہوئے ہے۔ یہاں کی زرعی پیداوار میں وہ سب خوردنی اجناس شامل ہیں جو ملک میں صرف کیے جاتے ہیں؛ اور روئی سن، روغن دار تخم وغیرہ جیسی اشیائے خام کثیر مقدار میں پیدا ہوتی ہیں جو بڑی صنعتوں میں کام میں آتی ہیں۔ تاہم ہندوستانی زراعت کی موجودہ حالت کی تحقیق، حکومت ہند کے مشیر زراعت ڈاکٹر کلاوسٹن کے حزن انگیز الفاظ کی پوری پوری تصدیق کرتی ہے۔ ڈاکٹر موصوف

باٹ فرماتے ہیں کہ "ہندوستان میں جس طرح بیج ملتے موجود ہیں، اسی طرح بیج صنعتیں بھی پائی جاتی ہیں، چنانچہ بدقسمتی سے زراعت ان ہی صنعتوں میں سے ایک ہے۔" خواہ کسی معیار سے جانچیے، کھیت کی وسعت وترکیب، آلات کشاورزی اور کھاد، دوری فصلوں کا طریق، تخموں کی خوبی، آبپاشی کی سہولتیں اور دوسری قسم کی ارضی اصلاح وترقی، کاشتکاری کے حیوانات، انتظام فروخت پیداوار، ذیلی دیہی پیشے وغیرہ، ہر اعتبار سے ہماری زراعت انتہائی پسماندہ حالت میں ہے۔ یہ بات اس واقعے سے ثابت ہوتی ہے کہ فی ایکڑ پیداوار انتہائی کم مقدار میں حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ دوسرے ملکوں کی پیداوار کے مقابلے میں اس کی مقدار زیادہ سے زیادہ ایک تہائی یا ایک چوتھائی ہوتی ہے، اور خشک سالی وقحط کے زمانے میں یہ بھی گھٹ کر نہ ہونے کے برابر رہ جاتی ہے۔

۲۔ زراعت کو ترقی دینے کی ضرورت۔ متعدد اعتباروں سے زرعی اصلاح وترقی کی شدید ضرورت ہے۔ اس لیے کہ وہ عوام کی معاشی حالت درست کردے گی، ان کے معیار زندگی کو بڑھادے گی، اور ملک کی آبادی کے لیے غذا کی رسد یقینی طور پر بہم پہنچائے گی۔ زراعت کی اصلاح وترقی کا جو اثر صنعت پر پڑے گا وہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہے۔ دیہی آبادی کی قوت خرید میں اضافہ ہوجانے کی وجہ سے ایک وسیع گھریلو بازار وجود میں آئے گا جس میں ملکی مصنوعات کی کھپت ہوگی۔ زرعی اصلاح وترقی کے معنی لازمی طور پر یہ بھی ہوں گے کہ اس کے مختلف عملوں میں کلوں کا استعمال بڑھ جائے گا، اور یہ توقع بھی کی جاسکتی ہے کہ کشاورزی کے آلات اور کلیں تیار کرنے والے مختلف بڑے کارخانے قائم ہوجائیں گے۔

لیکن یہاں دو امور کی توضیح مناسب معلوم ہوتی ہے۔ اولاً جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے، یہ کہ زراعت کی اصلاح وترقی کے استدلال کے معنی یہ نہیں ہیں کہ

166

[1]۔ دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ روئداد شہادت، جلد اوّل، حکومت ہند کے عہدہ داروں کی شہادت۔

[2]۔ دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ، روئداد شہادت جلد اوّل، عہدہ داران حکومت ہند کی شہادت۔

[3]۔ دیکھو صنعتی کمیشن کی رپورٹ صفحہ ۱۴۔

باب ۲

قسام ازل نے ہندوستان کی قسمت میں سراسر زرعی ملک ہونا لکھ دیا ہے۔ ہمارے خیال میں اس کی حیثیت ایسی ہے کہ اس میں سرسبز زراعت کے ساتھ ساتھ خوشحال صنعتیں بھی رہ سکتی ہیں۔ دوسری یہ کہ ہمیں اس واقعے کو بخوبی ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ ہم اپنے زرعی مسائل کو اپنے صنعتی مسائل سے الگ رکھ کر حل نہیں کر سکتے۔ چنانچہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ انگلستان میں صنعتی انقلاب کے زمانے میں زراعت صنعت دونوں میں ساتھ ساتھ تبدیلیاں واقع ہوئیں اور ایک کی ترقی سے دوسرے کی ترقی کو مدد ملی۔ بحالت موجودہ ہندوستان کی دیہی و زرعی آبادی کی کثرت ایسی خرابیاں ہیں جو محض زرعی ترقی کے کسی نظام کے ذریعے سے رفع نہیں کی جا سکتیں۔ زمین پر آبادی کا جو دباؤ پڑ رہا ہے اس کو کم کرنے اور شہروں اور صنعتوں سے اس کو بتدریج ہٹا کر زمین میں مصروف ہونے کا موقع بہم پہنچانے کے لیے زراعت کے ساتھ ساتھ صنعت کو بھی ترقی دینی چاہیے۔

ہندوستان کی موجودہ بیداری کو زراعت میں اس عالمگیر دلچسپی کا ایک رخ تصور کیا جا سکتا ہے جو جنگ عظیم کے بعد سے رونما ہوئی ہے۔ غالباً زمانۂ قبل از جنگ میں زراعت کی انتہائی اہمیت کو فراموش کر دینے کا میلان نمایاں تھا۔ لیکن جنگ کے تجربے نے خام پیداوار اور اشیائے خوردنی کی حد تک بیرونی رسد پر بھروسہ کرنے کے خطرات ظاہر کر کے اس تغافل کا خاتمہ کر دیا ہے۔ چنانچہ سب سے بڑی قومی صنعت ہونے کے اعتبار سے زراعت نے اپنی حیثیت پھر قایم کر لی ہے اور اس کی تنظیم جدید و ترقی کے بارے میں قریب قریب ہر ملک میں بحثیں کی جا رہی ہیں اور مضامین تحریر کیے جا رہے ہیں، یہاں تک کہ انگلستان بھی جو مصنوعات تیار کرنے والی حرفتوں کا زمانۂ قدیم سے مرکز رہا ہے اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

۳۔ برطانوی ہند میں مختلف فصلوں کی کاشت کے رقبوں کے اعداد و شمار۔[1]

جدول (۱)

رقبے کی نوعیت	ایکڑ (بحساب ملین) ۱۹۰۱ء تا ۱۹۰۲ء	دیہی کاغذات کے مطابق خالص رقبے کا فیصد	ایکڑ (بحساب ملین) ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۱ء	دیہی کاغذات کے مطابق خالص رقبے کا فیصد
خالص رقبہ فی مساحت کے لحاظ سے	۵۵۲ء۹۲	۔	۶۶۷ء۳۳	۔

[1] ۔ زرعی اعداد و شمار جلد برطانوی ہند از ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء (عارضی) صفحہ ۲ تا صفحہ ۳

باب ۶

۱۵۷

سلسلہ جدول نمبر (۱)

رقبہ کی نوعیت	ایکڑ (بحساب ملین) سنہ ۱۹۰۱ تا سنہ ۱۹۰۲	دیہی کاغذات کے مطابق خالص رقبے کا فیصد	ایکڑ (بحساب ملین) سنہ ۱۹۳۰ تا سنہ ۱۹۳۱	دیہی کاغذات کے مطابق خالص رقبے کا فیصد
دیہی کاغذات کے لحاظ سے خالص رقبہ	۵۵۳ر۷	۔	۶۶۶ر۸۶	۔
رقبہ زیر جنگلات	۶۶ر۳۶	۱۲ر۰	۸۹ر۰۷	۱۳ر۴
ناقابل زراعت	۱۲۷ر۹۶	۲۴ر۹	۱۴۴ر۶۵	۲۱ر۶
قابل زراعت افتادہ زمین	۱۰۷ر۵۲	۱۹ر۴	۱۵۳ر۵۹	۲۲ر۹
بنجر زمین	۴۲ر۱۵	۷ر۶	۴۷ر۴۵	۷ر۱
خالص رقبہ زیر کاشت	۱۹۹ر۷۱	۳۶ر۱	۲۳۲ر۱۰	۳۵ر۰
مجموعی زیر کاشت رقبہ (اس میں وہ رقبہ بھی شامل ہے جس پر ایک سے زائد مرتبہ کاشت ہوئی ہے)	۲۲۰ر۳۵	۔	۲۶۷ر۰۲	۔
رقبہ زیر آبپاشی	۳۲ر۵۸	۔	۵۰ر۵۱	۔

جدول (۱) الف

مختلف اجناس جن کی کاشت کی جاتی ہے ۔	ایکڑ (بحساب ملین) سنہ ۱۹۰۱ تا سنہ ۱۹۰۲	مجموعی زیر کاشت رقبے کا فیصد	ایکڑ (بحساب ملین) سنہ ۱۹۳۲ تا سنہ ۱۹۳۳	مجموعی زیر کاشت رقبے کا فیصد
رقبہ جس پر اشیائے خوردنی کی کاشت ہوتی ہے				
چاول	۷۰ر۰۶	۳۱ر۸	۸۰ر۲۹	۳۰ر۰

باب ۹

سلسلہ جدول (۱) الف

مختلف اجناس جن کی کاشت کی جاتی ہے	ایکڑ (بحساب ملین) سنہ ۱۹۰۱ء تا سنہ ۱۹۰۲ء	مجموعی زیر کاشت رقبے کا فیصد	ایکڑ (بحساب ملین) سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء	مجموعی زیر کاشت رقبے کا فیصد
گیہوں	۱۸ر۶۱	۸ر۴	۲۷ر۶۰	۱۰ر۴
جو	۶ر۲۲	۲ر۴	۶ر۷۲	۲ر۵
جوار	۲۱ر۸۲	۹ر۸	۲۱ر۴۰	۸ر۰
باجرا	۱۳ر۲۰	۵ر۹	۱۳ر۱۴	۵ر۰
راگی	۳ر۷۵	۱ر۷	۳ر۷۳	۱ر۴
مکائی	۶ر۲۰	۲ر۸	۶ر۰۵	۲ر۳
چنا	۹ر۷۸	۴ر۴	۱۲ر۵۴	۶ر۲
دوسرا غلہ اور دالیں	۲۷ر۳۵	۱۲ر۴	۳۰ر۶۱	۱۱ر۵
میزان اجناس خوردنی	۱۷۷ر۰۰	۸۰ر۰	۲۰۶ر۰۸	۷۷ر۳
رقبہ دوسرے اشیائے خوردنی کے تحت (جس میں ترکاریاں، میوے، مسالے، متفرق غذا کی فصلیں وغیرہ شامل ہیں):-	۸ر۰۳	۳ر۷	۸ر۰۸	۳ر۰
شکر	۲ر۶۰	۱ر۳	۳ر۳۶	۱ر۳
مجموعی اشیائے خوردنی	۱۸۷ر۶۳	۸۵ر۰	۲۱۷ر۵۲	۸۱ر۶

باب

مختلف اجناس جن کی کاشت کی جاتی ہے	ایکڑ (بحساب ملین) سنہ ۱۹۰۱ تا سنہ ۱۹۰۲	مجموعی زیر کاشت رقبے کا فیصد	ایکڑ (بحساب ملین) سنہ ۱۹۳۳ تا سنہ ۱۹۳۴	مجموعی زیر کاشت رقبے کا فیصد
سلسلہ جدول (۱) الف				
رقبہ زیر کاشت روغن دار تخم:-				
السی	۲ر۲۷	۱ر۰	۲ر۰۷	ر۰۸
تل	۳ر۰۵	۱ر۰	۴ر۲۱	۱ر۶
سرسوں اور رائی	۲ر۸۸	۱ر۳	۳ر۳۲	۱ر۳
مونگ پھلی	.	.	۵ر۹۵	۲ر۲
ناریل	.	.	ر۶۴	۰ر۳
ارنڈی	.	.	ر۴۷	۰ر۲
دوسرے روغن دار تخم	۳ر۰۷	۱ر۴	۱ر۱۳	۰ر۴
میزان روغن دار تخم	۱۱ر۹۷	۵ر۴	۱۰ر۷۹	۶ر۶
ریشہ دار پودوں کی کاشت کا رقبہ:-				
روئی	۱۰ر۳۰	۴ر۰	۱۴ر۵۰	۵ر۴
سن	۲ر۲۸	۱ر۰	۲ر۵۰	ر۰۹
دوسرے ریشے	۰ر۵۶	ر۰۲	ر۰۶۳	۰ر۲
مجموعی ریشہ دار پودے	۱۳ر۱۴	۵ر۹	۱۰ر۶۳	۶ر۵

168

باب ۶
168

سلسلہ جدول (۱) الف

مختلف اجناس جن کی کاشت کی جاتی ہے	ایکڑ (بحساب ملین) سنہ ۱۹۰۱ تا سنہ ۱۹۰۲	مجموعی زیر کاشت رقبہ کا فیصد	ایکڑ (بحساب ملین) سنہ ۱۹۳۳-۳۴ تا سنہ ۱۹۳۶-۳۷	مجموعی زیر کاشت رقبہ کا فیصد
ان فصلوں کا رقبہ جو بطور غذا استعمال نہیں ہوتیں:-				
نیل	۰ر۷۹	۰ر۴	۰ر۰۴	۰ر۰۲
افیون	۰ر۶۱	۰ر۳	۰ر۰۲	۰ر۰۱
کافی	۰ر۱۳	۰ر۰۵	۰ر۱۰	۰ر۰۴
چائے	۰ر۴۹	۰ر۳	۰ر۷۸	۰ر۳۰
تمباکو	۰ر۹۵	۰ر۴۵	۱ر۰۸	۰ر۴۰
چارے کی فصلیں	۲ر۹۴	۱ر۴	۱۰ر۲۱	۳ر۸۴
متفرق فصلیں	۱ر۷۱	۰ر۸	۱ر۸۵	۰ر۶۹
میزان ناقابل خوردنی اشیا	۳۲ر۷۲	۱۵ر۰	۴۹ر۵۰	۱۸ر۴۰
مجموعی زیر کاشت رقبہ	۲۲۰ر۳۵	۰	۲۶۷ر۰۲	۱۰۰ر۰۰
(بہ شمول اس رقبے کے جس پر ایک سے زیادہ مرتبہ کاشت ہوئی)	۲۰ر۶۴	۰	۳۴ر۹۲	۰

ب

۴ - اہم فصلوں (دیسی ریاستوں کو شامل کرکے) کی پیداوار اور رقبۂ زیر کاشت کا اندازہ[1]

جدول (۲)

فصلیں		پیداوار (ملین) سنہ ۱۹۰۱ تا سنہ ۱۹۰۲	پیداوار (ملین) سنہ ۱۹۳۳ تا سنہ ۱۹۳۴	رقبہ (ملین ایکڑ) سنہ ۱۹۳۳ تا سنہ ۱۹۳۴
چاول	ٹن	۱۹ر۲۱	۳۰ر۰۹	۸۲ر۷۰
گیہوں	"	۶ر۰۹	۹ر۳۶	۳۶ر۰۶
جوار	"	-	۶ر۱۸	۳۲ر۱۶
باجرا	"	-	۲ر۱۳	۱۳ر۴۴
چنا	"	-	۳ر۳۷	۱۷ر۲۳
گڑ	"	۲ر۰۲	۵ر۹۰	۳ر۳۱
چائے	پاؤنڈ	۱۹۱ر۳۰	۳۸۳ر۲۶	۰ر۸۱
روئی	(۴۰۰ پاؤنڈ کے گانٹھ)	۳ر۵۶	۵ر۰۰	۲۳ر۹۲
سن	(" " ")	۷ر۴۳	۷ر۹۹	۲ر۵۱
السی	ٹن	۰ر۳۵	۰ر۳۸	۳ر۲۶
سرسوں اور رائی	"	۰ر۹۵	۰ر۹۶	۶ر۰۷
تل	"	۰ر۳۵	۰ر۵۴	۶ر۲۱
تخم ارنڈی	"	-	۰ر۱۴	۱ر۵۴

[1] دیکھو ایک رپورٹ موسومہ بہ "ہندوستان کی اہم فصلوں کی پیداوار اور زیر کاشت رقبے کا اندازہ از سنہ ۱۹۳۳ تا سنہ ۱۹۳۴" صفحہ ۸ اور صفحہ ۲۶ تا صفحہ ۴۲۔

باب ۷

سلسلہ جدول نمبر (۲)

فصلیں		پیداوار (ملین) سنہ ۱۹۰۱ء تا سنہ ۱۹۰۲ء	پیداوار (ملین) سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء	رقبہ (ملین ایکڑ) سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء
مونگ پھلی	ٹن	۰ر۰۶	۳ر۳۱	۸ر۰۶
تیل (ہنڈرڈویٹ)	〃	۰ر۱۱	۰ر۰۱	۰ر۰۴
کافی	پاؤنڈ	۱۵ر۵۷	—[1]	—[1]
ربڑ	〃		۱۴ر۲۵	۰ر۱۸

۵۔ کاشت عمیق اور کاشت وسیع کی گنجائش۔

جدول (۱) سے ظاہر ہوگا کہ مجموعی رقبے کے ۳۵ر۰ حصے پر (بہ شمول جنگلات) کاشت نہیں ہوتی، یہ کہ صرف ۰ر۳۵ فیصد زیر کاشت ہے اور یہ کہ موجودہ بنجر زمین اور قابل زراعت افتادہ زمین کو ملایا جائے تو مجموعی رقبے کے منجملہ ۰ر۳۰ فیصد حصہ ہندوستان میں توسیع زراعت کے لیے دستیاب ہوسکتا ہے۔ برطانوی ہند کے مختلف صوبوں میں توسیع زراعت کے لیے جو رقبہ دستیاب ہوسکتا ہے اس کا حال مندرجۂ ذیل جدول (۲) سے معلوم ہوگا، جس میں سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء کے مزروعہ و غیر مزروعہ رقبے کو ہر صوبے میں الگ الگ ملین ایکڑ کے حساب سے بتایا گیا ہے۔[2]

[1] : اعداد و شمار دستیاب نہیں ہوئے سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء کے لیے کافی کی بابت اعداد و شمار ۲۲ر۴۹ ملین ٹن (پیداوار) اور ۰۰۷۶ر۱۱ ایکڑ (رقبہ) تھے۔

[2] ۔ دیکھو "زرعی اعداد و شمار" از سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء (عارضی) صفحہ ۲۔

169

جدول (۳)

صوبہ	[illegible] ۱۹۲۹ء	مزروعہ		غیر مزروعہ		جنگلات
		خالص رقبہ زیر کاشت	بنجر زمین بحالت موجودہ	قابل زراعت افتادہ زمین	ناقابل زراعت رقبہ	
مدراس	۹۱٫۰۰	۳۳٫۸۷	۱۰٫۳۸	۱۳٫۱۸	۱۹٫۸۸	۱۳٫۶۹
بمبئی	۷۸٫۸۸	۳۳٫۲۵	۱۰٫۲۲	۶٫۵۸	۱۹٫۸۲	۹٫۲۷
بنگال	۵۵٫۴۴	۲۴٫۰۰	۴٫۶۲	۶٫۲۶	۸٫۹۲	۴٫۶۱
یوپی	۷۶٫۹۷	۳۶٫۰۱	۲٫۵۰	۱۰٫۲۸	۹٫۹۰	۹٫۲۸
پنجاب	۶۰٫۱۷	۲۸٫۶۸	۲٫۴۶	۱۴٫۲۰	۱۲٫۸۶	۱٫۹۷
برما	۱۵۵٫۸۵	۱۸٫۲۴	۳٫۶۵	۵۹٫۶۷	۵۲٫۰۴	۲۲٫۱۶
بہار واڑیسہ	۵۳٫۱۳	۲۴٫۱۸	۶٫۹۳	۶٫۹۵	۸٫۰۱	۷٫۰۶
سی پی وبرار	۶۴٫۰۹	۲۴٫۹۹	۳٫۷۷	۱۴٫۱۱	۴٫۹۵	۱۶٫۲۷
آسام	۳۵٫۴۸	۵٫۸۸	۱٫۸۷	۱۹٫۲۱	۴٫۵۷	۳٫۹۵
شمال مغربی سرحدی صوبہ	۸٫۵۸	۲٫۲۹	۰٫۵۳	۲٫۷۱	۲٫۷۰	۰٫۳۵
اجمیر میرواڑہ	۱٫۷۷	۰٫۳۵	۰٫۱۲	٫۰۲۸	۰٫۸۸	۰٫۱۰
کورگ	۱٫۰۳	٫۰۱۴	۰٫۱۷	۰٫۰۱	۰٫۳۳	۰٫۳۶
دہلی	۰٫۳۷	۰٫۲۳	۰٫۰۱	۰٫۰۷	۰٫۰۸	۰
میزان	۶۶۶٫۸۶	۲۳۲٫۱۰	۴۷٫۴۵	۱۵۲.۵۹	۱۴۴٫۶۵	۸۹٫۰۷

ظاہر ہے کہ مزید کاشت کی گنجائش، خاصکر برما، آسام، سندھ، پنجاب اور صوبۂ متوسط میں بہت ہے۔ لیکن اس مسئلے کی گہری جانچ لازمی طور پر اس نتیجے پر

باب ۶

پہنچاتی ہے کہ کاشت وسیع کے مواقع ہندوستان میں بحیثیت مجموعی بہت محدود ہیں۔ بنگال، صوبۂ متحدہ، مدراس اور بمبئی جیسے قدیم صوبوں میں کاشت فطری طور پر کم ترین متقاومت کے اصول پر ہوتی رہی ہے، اور بہترین قسم کی زمینیں زیر کاشت آچکی ہیں اور بڑی حد تک صرف ادنیٰ زرخیزی کی زمینیں کاشت کے لیے باقی رہ گئی ہیں۔ لیکن اکثر صورتوں میں ان پر کاشت صرف اُس وقت ممکن ہوسکتی ہے جبکہ آبپاشی کی کافی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ علیٰ ہذا پنجاب، صوبۂ متوسط، آسام، برما اور سندھ جیسے جدید صوبوں میں بھی اسی کے مشابہ صورت حال بتدریج ترقی پارہی ہے۔ چنانچہ یہاں گو اعلیٰ زرخیزی کی زمینیں ابھی تک پوری طرح زیر کاشت نہیں آئی ہیں، پھر بھی مختلف قسم کی دقتوں کا سامنا رہتا ہے۔ پنجاب اور سندھ میں کاشت کی توسیع کا دارومدار زیادہ تر آبپاشی پر ہے جس کا انتظام یہاں دوسرے علاقوں مثلاً بمبئی دکن اور صوبۂ متوسط کے مقابلے میں بہت آسان ہے لیکن مالی اور طبیعی مشکلات کی وجہ سے وہ بہرحال ہر جگہ محدود رہی ہے۔ آسام میں مُضرِ صحت آب وہوا سے قطع نظر کرتے ہوئے سب سے بڑی مزاحمتیں یہ ہیں (۱) محنت کے ناموافق حالات اور (۲) اس کے نتیجے کے طور پر محنت کی مطلوبہ رسد کو حاصل کرنے کی دشواری "برما برمیوں کے لیے" کا نعرہ برما میں قوی صوبہ واری احساس کو ظاہر کرتا ہے جو زراعت کی تیز رفتار توسیع کے لیے ایک سنگ راہ ہے اس لیے کہ موجودہ حالات میں صرف محنت کی بیرونی رسد ہی کی مدد سے زراعت ترقی کرسکتی ہے۔ پس ان صوبوں میں بھی جہاں قابل زراعت افتادہ زمین کا وسیع رقبہ موجود ہے زراعت کی کسی نمایاں توسیع کی توقع نہیں کی جاسکتی چنانچہ اس نتیجے کی تصدیق مندرجۂ ذیل اعداد سے ہوتی ہے جس میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ قریب کے زمانے میں برطانوی ہند کے زیر کاشت خالص رقبے میں بہت دھیمی اور تدریجی رفتار کے ساتھ توسیع و ترقی رونما ہوئی ہے۔

زیر کاشت رقبہ

سال	خالص رقبہ زیر کاشت (ملین ایکڑ)
سنہ ۱۸۹۲ء تا سنہ ۱۸۹۷ء	۱۹۵ ء ۹۱

سال	خالص رقبہ زیر کاشت (ملین ایکڑ)
سنہ ۱۹۰۱ تا سنہ ۱۹۰۲	۱۹۹٫۷۱
سنہ ۱۹۱۰ تا سنہ ۱۹۱۱	۲۲۳٫۰۶
سنہ ۱۹۲۱ تا سنہ ۱۹۲۲	۲۲۳٫۱۸
سنہ ۱۹۲۷ تا سنہ ۱۹۲۸	۲۲۳٫۸۶
سنہ ۱۹۲۸ تا سنہ ۱۹۲۹	۲۲۸٫۱۷
سنہ ۱۹۳۰ تا سنہ ۱۹۳۱	۲۲۹٫۰۹
سنہ ۱۹۳۱ تا سنہ ۱۹۳۲	۲۲۸٫۸۴
سنہ ۱۹۳۳ تا سنہ ۱۹۳۴	۲۳۲٫۱۰

ہندوستان کے زرعی مسئلے کا زیادہ امید افزا حل کاشت عمیق کے طریق میں مضمر ہے۔ کاشت عمیق کے امکانات کی تمثیل کے طور پر ہم جاپان کی مثال پیش کر سکتے ہیں جہاں پانچ کروڑ ۶۰ لاکھ آبادی کی کفالت ایک کروڑ ستر لاکھ ایکڑ مزروعہ رقبے کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ گویا ہندوستان کے ۴/۵ ایکڑ فی کس کے مقابلے میں یہاں کا اوسط تقریباً ۱/۲ ایکڑ فی کس ہے۔[1]

ہندوستان میں ابھی تک جدید سائنسی اصول پر کاشت عمیق کا آغاز کرنے کی بالکل کوئی سنجیدہ کوشش کی گئی ہے، حالانکہ کاشت وسیع کے طریقے زرعی آبادی کی کثرت اور چھوٹے کھیتوں کی موجودگی کی وجہ سے انتہائی طور پر ناموزوں ہیں۔

۶۔ فصلوں کی اضافی اہمیت۔

ہندوستان کی زرعی پیداواروں میں فصلوں کی کاشت بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ لوگ زیادہ تر نباتات پر گزر کرتے ہیں اور اشیائے برآمد میں تخم اور ریشوں کو بہت

[1] دیکھو۔ ایم۔ وشویشوریا کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان کی تنظیم جدید" صفحہ ۱۷۴۔

اہمیت حاصل ہے۔ ہندوستانی کسان فصلیں اگاتا ہے، اس کے مویشی اس کو صرف کاشت ہی میں مدد نہیں دیتے بلکہ اس کے کنبے والوں کی غذا کی ضرورتیں بھی پوری کرتے ہیں۔ گوشت، اون اور دودھ دہی مکھن پنیر وغیرہ ملک سے برآمد نہیں کیے جاتے۔[1] مختلف فصلوں کی کاشت کا رقبہ یہ بتلاتا ہے کہ ہندوستان میں زرعی پیداوار انواع و اقسام کی ہوتی ہے اور مختلف فصلیں اضافی حیثیت سے اہمیت رکھتی ہیں۔ چنانچہ مختلف پیداواروں کی کاشت ہندوستان کو اس قابل بناتی ہے کہ اپنے جملہ اشیائے خوردنی اور انواع و اقسام کی اشیائے خام کی کثیر رسد کی صورت میں اپنی جملہ ضرورتوں کا خود کفیل رہے۔ اشیائے خوردنی کی بہت زیادہ مقدار میں کاشت کی جاتی ہے چنانچہ مجموعی زیر کاشت رقبے کے منجملہ ۱۸٫۷ فیصد حصے پر ان ہی کی کاشت کی جاتی ہے، اور ناقابل خوردنی اشیا کی کاشت کے رقبے کا فیصد ۱۸٫۳ ہے، گو عالمی قیمتوں کا لحاظ کرتے ہوئے ناقابل خوردنی اشیا مثلاً روئی، سن، روغن دار تخم وغیرہ کی کاشت کا رقبہ اشیائے خوردنی کی کاشت کے رقبے کے مقابلے میں بہت تیزی کے ساتھ بڑھتا رہا ہے۔ اشیائے خوردنی کی فصلوں میں چاول کا نمبر سب سے اوّل ہے؛ اس کے بعد کے درجے میں گیہوں، جوار، باجرا، اور چنے کی کاشت ہوتی ہے۔ ناقابل خوردنی فصلوں میں ریشے (روئی سن وغیرہ) سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اور مجموعی زیر کاشت رقبے کے منجملہ ۶٫۵ فیصد پر ان کی کاشت ہوتی ہے۔ روئی ان ریشوں میں سب سے زیادہ اہم پیداوار ہے۔ اس کے بعد روغن دار تخموں کا نمبر ہے، چنانچہ مجموعی زیر کاشت رقبے کے منجملہ ۶٫۶ فیصد حصے پر ان کی کاشت ہوتی ہے۔

۷۔ ہندوستان کی اہم فصلوں کی جانچ[2]

(ا) اشیائے خوردنی کی فصلیں۔

(۱) چاول۔ ہندوستان کی سب سے بڑی پیداوار چاول ہے جو اکثر باشندوں کی غذا کی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ چاول کی کاشت مجموعی زیر کاشت رقبے کے ۳۰ فیصد حصے پر ہوتی ہے، چنانچہ اس کا مجموعی رقبہ ۸۰٫۲۱ ملین ایکڑ ہے

[1] دیکھو اے ہاورڈ کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان میں فصلوں کی تیاری" صفحہ ۶۱

[2] اس جانچ کے لیے ہم نے حسب ذیل تحریروں سے مدد لی:۔

(۱) ہندوستان کے زرعی کاروبار پر تبصرہ۔

جس سے ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں ۳۰٫۹ ملین ٹن پیداوار حاصل ہوئی۔ دنیا کی چاول کی مجموعی پیداوار میں ہندوستان کا حصہ تقریباً ۴۰ فیصد ہے اور وہی دنیا کا سب سے بڑا چاول کی برآمد کرنے والا ملک ہے، اگرچہ اس کی اوسط برآمد کی مقدار اس کی مجموعی پیداوار کے ۷، یا ۸ فیصد سے شاذ ہی متجاوز ہوتی ہے۔ چاول کی کاشت ہندوستان کے بڑے حصے میں ہوتی ہے اور خاصکر ان حصوں میں جو مرطوب اور نم ہیں۔ چنانچہ مندرجۂ ذیل اعداد سے مختلف صوبوں میں چاول کی کاشت کا حال معلوم ہوگا:۔ بنگال ۲۱٫۶۷ ملین ایکڑ، بہار و اوڑیسہ ۱۳٫۲۳، برما ۱۲٫۸۵، مدراس ۱۱٫۷۰، صوبۂ متحدہ ۵٫۹۵، صوبۂ متوسط ۶٫۴۶، آسام ۴٫۷۲ اور بمبئی ۲٫۱۹۔ چاول مشرقی صوبوں اور برما میں اصل غذا کے طور پر بکثرت استعمال کیا جاتا ہے۔ گو برما میں مجموعی زیر کاشت رقبے کے منجملہ چاول صرف ۱۵ فیصد حصے پر بویا جاتا ہے پھر بھی برما کو چاول کی برآمد کی تجارت میں کم و بیش اجارہ حاصل ہے اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے مقامی صرف کے لیے رسد میں قلت ہو تو اس کو بھی پورا کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ برما میں چاول کے زیر کاشت رقبے کا تناسب آبادی کے مقابلے میں اس قدر بڑا ہے کہ اس کی قابل برآمد زائد پیداوار بنگال، بہار یا مدراس کی قابل برآمد زائد پیداوار کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ ہے۔ گو موخرالذکر صوبوں میں برما کے مقابلے میں چاول کی زیادہ مقدار کاشت ہوتی ہے لیکن ان کو اندرونی طلب نسبتاً بہت کثیر مقدار میں پوری کرنی پڑتی ہے۔ برما کی چاول کی تجارت، برما کی مجموعی برآمد کے ۸۰ فیصد یا اس کی مجموعی پیداوار کے تقریباً ۵۰ فیصد کی نمایندگی کرتی ہے۔ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں بنگال اور مدراس نے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ (۲) ہندوستان کی اہم فصلوں کی پیداوار اور ان کے رقبے کا اندازہ ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء

(۳) ہندوستان کی فصلوں کا نقشہ ۱۹۲۵ء۔

(۴) کاٹن کی کتاب موسوم بہ "تجارتی معلومات کا خلاصہ۔ دوسرا اڈیشن ۱۹۲۴ء۔

(۵) ہاورڈ کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان میں فصلوں کی تیاری"

(۶) زرعی کمیشن کی رپورٹ۔

باب ۲

علی الترتیب ۶ اور ۵ فیصد برآمد کیا۔ برما کی برآمد نسبتاً بڑھ رہی ہے لیکن اس کے برخلاف ہندوستان کی برآمد کا تناسب گھٹ رہا ہے۔ ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۰ء میں ہندوستان نے ۲۲۲۳،۲۰۰۰ ٹن چاول برآمد کیا جس کی قیمت ۱۳،۵ کروڑ روپے تھی۔ لیکن ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۱ء میں برآمد کی ہوئی پیداوار کی مقدار ۲۷۹،۰۰۰ ٹن تک اور اس کی قیمت ۲۵،۹۷ کروڑ روپے تک گر گئی۔ چاول کی قیمت کی کمی، جو زیادہ تر تجارتی کساد بازاری کا نتیجہ تھی، چاول کی تجارت کے لیے مہلک ثابت ہوئی۔ ہندوستان (بہ شمول برما) کی برآمد مجموعی پیداوار کا ۵ فیصد رہی۔ بعد کے سالوں میں برآمد کی مقدار اور قیمت میں مزید کمی رونما ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں برآمد کی مقدار ۱۴۸،۰۰۰ ٹن اور قیمت ۱،۰۵۷ کروڑ روپیہ اور ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں مقدار ۶،۰۰۰ ٹن اور قیمت ۱،۰۳۷ کروڑ روپے تھی۔ غیر ملکی بازاروں میں ہندوستانی چاول کی مانگ کی کمی ایک حد تک اس بنا پر زائل ہو جاتی ہے کہ ہندوستانی چاول کو سلطنت متحدہ میں ترجیح حاصل ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں ہندوستان سے انگلستان کو جو چاول برآمد ہوا اس میں ۱،۱۰۰ ٹن سے ۴،۸۰۰ ٹن تک اضافہ ہوا۔

کچھ سال ادھر سے سیام، فرانسیسی انڈوچین اور جاپان سے ہندوستان میں چاول کی درآمد میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں درآمد کی مقدار سال ماسبق کے ۵،۴۰۰،۸۸ ٹن کے مقابلے میں ۱۵،۴۹۳،۰۰۰ ٹن رہی۔ یہ درآمدہ چاول جو زیادہ تر مدراس گیا کنکی کی شکل میں تھا اور گرتی کے کاروبار کی ذیلی پیداوار تھا۔ اس نے مقامی قیمتوں کو بڑی حد تک گھٹا دیا۔ اسی لیے تامینی تدبیر کے طور پر کنکی (ٹوٹے ہوئے چاول) پر ۲،۱۲ آنہ فی من کا محصول درآمد اپریل ۱۹۳۵ء سے ۳۱ مارچ ۱۹۳۶ء تک عاید کیا گیا۔

چاول سرمائی فصل ہے جو زیادہ تر دسمبر اور جنوری میں کٹتی ہے۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مختلف مقامی حالات اور معلومات کی بنا پر مختلف قسم کا دھان پیدا ہوتا ہے۔ غالباً مسئلے کی پیچیدگی اور وسعت ہی کے باعث محکمۂ زراعت نے اب تک اس فصل کے بارے میں بہت کم ترقی کی ہے[1]۔ لیکن کچھ سال ادھر سے زرعی

[1] دیکھو میکنا کی کتاب موسومہ بہ "ہندوستانی زراعت"۔

باب ۵

تحقیق کی شاہی کونسل کی سرپرستی میں تحقیقاتی کام کے نتائج زیادہ بہتر رہے ہیں۔

(۲) گیہوں رقبے کے لحاظ سے چاول کی کاشت کے بعد گیہوں کا نمبر ہے جو مجموعی زیر کاشت رقبے کے منجملہ ۱۰ فیصد پر بویا جاتا ہے۔ ہندوستان میں گیہوں فصل ربیع ہے جو اکتوبر تا دسمبر میں بوئی جاتی ہے اور مارچ تا مئی میں کٹتی ہے پنجاب، صوبۂ متحدہ اور شمال مغربی سرحدی صوبے کے باشندوں کی غذا گیہوں ہے۔ دوسرے مقامات پر وہ زیادہ تر برآمد کی غرض سے کاشت کیا جاتا ہے ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں گیہوں کی کاشت کا رقبہ ہندوستان میں ۶۰ر۳۶ ملین ایکڑ تھا۔ ہندوستان کے گیہوں پیدا کرنے والے اہم صوبے پنجاب (۷۰ر۹ ملین ایکڑ) صوبۂ متحدہ (۵۴ر۸ ملین ایکڑ) صوبۂ متوسط و برار (۴۴ر۳ ملین ایکڑ) ریاستہائے وسط ہند (۸۰ر۲ ملین ایکڑ) بہار و اوڑیسہ (۲۲ر۱ ملین ایکڑ) اور بمبئی (۲۳ر۳ ملین ایکڑ) ہیں پنجاب اور صوبۂ متحدہ کا رقبہ مجموعی رقبے کا ⅔ اور ان کی پیداوار کا ¾ ہے۔ بقول کاٹن "ہندوستان دنیا کی مجموعی پیداوار کا تقریبًا ⅒ گیہوں پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ زمانۂ قبل از جنگ میں دنیا کے گیہوں برآمد کرنے والے پانچ اہم ملک بہ لحاظ مقدار برآمد علی الترتیب ریاستہائے متحدہ امریکا، روس، کنیڈا، جمہوریہ ارجن ٹائن اور ہندوستان تھے۔ پیداوار کی حد تک ہندوستان تیسرے نمبر پر ہے۔" بڑی جنگ کے زمانے میں ہندوستان کے گیہوں کی کاشت کے رقبے میں قابل لحاظ توسیع ہوئی، چنانچہ رقبہ ۷۴ر۲۸ ملین ایکڑ سے ۴۸ر۳۵ ملین ایکڑ تک بڑھ گیا، جس کا باعث یہ واقعہ تھا کہ حکومت نے کثیر مقدار میں خریداری کی تھی۔ گیہوں کی تجارت برآمد ۱۸۷۰ء میں نہر سویز کے کھل جانے کے بعد سے ترقی کر رہی تھی۔ لیکن گیہوں کی برآمد کی مقدار میں ہندوستان اور بیرونی ممالک کے موسموں کی نوعیت کے لحاظ سے تغیرات ہوتے ہیں۔ قحط کے زمانے میں مقامی قیمت عام طور پر اتنی اعلیٰ ہو جاتی ہے کہ برآمد کی مقدار بہت گر جاتی ہے۔ بڑی جنگ سے پیشتر کے پانچ سالوں میں اوسط برآمد ۰۰۰ر۳۰۸ر۱ ٹن ہوئی جس کی قیمت ۹۶ر۱۳ کروڑ یا گیہوں کی مجموعی پیداوار کا ۱۴ فیصد تھی۔ اس کے بعد سے خاصکر زمانۂ بعد از جنگ میں گیہوں کی برآمد میں بہت کمی ہو گئی ہے۔ کچھ زمانے سے ہندوستان کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ وہ دنیا کے

بازار میں گیہوں کی بہت ہی تھوڑی مقدار بیچ رہا ہے۔ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں برآمد کی مقدار قریب قریب ۱۱,۰۰۰ ٹن اور اس کی قیمت ۵ر۱۰ لاکھ روپے تھی جس کے مقابلے میں ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۲ء میں مقدار ۲۰,۲۰۰ ٹن اور قیمت ۱۵ لاکھ روپے تھی، اور زمانۂ بعد از جنگ کے پہلے پنجسالہ دور میں مقدار کا اوسط ۲۴۷,۰۰۰ ٹن اور قیمت کا اوسط ۷ر۳ کروڑ روپے تھا۔ بڑی جنگ کے بعد سے مالی امداد اور درآمد کی روک کی پناہ میں برآمد کرنے والے اور درآمد کرنے والے ملکوں میں زراعت کی غیر معاشی

توسیع نے گیہوں کے بین الاقوامی مسئلے کو ایک چیستان بنادیا ہے۔ کچھ سال ادھر سے شدید مسابقت اور ادنیٰ قیمتوں کی موجودگی میں ہندوستان اس بات پر مجبور ہوا ہے کہ نہ صرف بین الاقوامی بازار سے الگ رہے بلکہ اپنے گیہوں بونے والوں کے اغراض کے تحت دوسرے ممالک کے ارزاں گیہوں اور گیہوں کے آٹے کی درآمد پر محصول عائد کرے۔ قانون محصول درآمد گندم کی رو سے مارچ ۱۹۳۱ء سے محصول درآمد کی مقدار دو روپے فی ہنڈرڈویٹ تھی، اس محصول کو اپریل ۱۹۳۵ء میں ایک روپیہ آٹھ آنے تک کم کردیا گیا، اس لیے کہ ہندوستانی گیہوں اور ہندوستان میں درآمد آسٹریلیائی گیہوں کی قیمتوں کا درمیانی فرق گھٹ گیا تھا۔ یہ محصول ۳۱ مارچ ۱۹۳۶ء تک نافذ رہنے والا تھا۔ ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں گیہوں کی درآمد کی مقدار ۳۰,۸۰۰ ٹن تھی، اس کے مقابلے میں ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں مقدار صرف ۴,۷۰۰ ٹن اور قیمت ۵ لاکھ روپے رہی۔ ملک میں باہر سے جو گیہوں آرہا تھا اس پر محصول درآمد کی روک قایم ہونے کی وجہ سے ہندوستانی گیہوں کی قیمتیں صورت حال پر اثر ڈالنے والے بیرونی عاملین سے زیادہ اندرونی طلب سے متاثر ہوتی رہی ہیں[1]۔

نقل وحمل اور آبپاشی کی اصلاح و ترقی نے گیہوں کی کاشت کے حق میں بہت بڑے محرک کا کام کیا ہے۔ یہ بات پنجاب کی جدید نہری نوآبادیات کے بارے میں خاص طور پر صادق آتی ہے۔ ایک زمانے میں ہندوستانی گیہوں ناقص مشہور تھا، لیکن اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اس کو بے احتیاطی کے ساتھ کوٹا یا رکھا جاتا تھا بلکہ

---

[1] دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ ہندوستانی تجارت پر تبصرہ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء صفحہ ۱۰۰ تا صفحہ ۱۰۲ (Review of the Trade of India)

باب زیادہ تر یہ تھی کہ انگریزی تجارت کے طریقے کے مطابق گیہوں میں جان بوجھ کر آمیزش کی جاتی تھی ۱۹۰۶ء کے بعد سے اس اعتبار سے بہت کچھ اصلاح و ترقی رونما ہوئی ہے۔ محکمۂ زراعت کی قرار دادہ قسم پوسا نمبر ۱۲ نے غلے کی خوبی کی اصلاح کر دی ہے، لیکن اس خوبی کو مزید ترقی دینا اور برقرار رکھنا چاہیے تاکہ ہندوستانی گیہوں عالمی بازاروں میں وہی قیمتیں حاصل کرنے کے قابل ہو جو کنیڈا اور امریکا کے گیہوں کو حاصل ہوتی ہیں۔

(۳) جو ۔ یہ زیادہ تر صوبۂ متحدہ اور بہار میں پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ ان صوبوں میں اس کے زیر کاشت رقبہ علی الترتیب ۲۷ر۴ ملین ایکڑ اور ۳۱ر۱ ایکڑ ہے۔ جو کی برآمد اس لیے بہت قلیل مقدار میں ہوتی ہے کہ اندرون ملک اس کی طلب بہت زیادہ ہے۔ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں برآمد کی مقدار ۰۰ر۱۴ ٹن تھی جس کی قیمت ۲ر۹ لاکھ روپے وصول ہوئی۔ انسان اور جانور دونوں کے لیے جو بطور غذا استعمال ہوتا ہے۔

(۴) کنگنی ۔ ہندوستانی کنگنی کی دو قسمیں ہیں، جوار اور باجرہ ۔ اور یہ مدراس، بمبئی (دکن) اور سلطنت حیدرآباد کے ملحقہ علاقوں کے باشندوں کی خوراکی فصلوں کی اہم قسم ہیں۔ 175 زرعی مویشی کے لیے بھی وہ قابل قدر چارہ بہم پہنچاتے ہیں ۔ ان کو گیہوں کی طرح خاص احتیاط کے ساتھ کاشت کرنے کی ضرورت نہیں اور کھاد تو شاذ ہی دینا پڑتا ہے۔ ان کے زیر کاشت بہت بڑا رقبہ ہے۔ جوار کل ہندوستان میں ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء میں ۱۰ر۴۴ ملین ایکڑ پر کاشت کی جاتی تھی اور باجرا ۷ر۱۸ ملین ایکڑ پر ۔ جوار پیدا کرنے والے اہم علاقے یہ ہیں: ۔ حیدرآباد دکن ۳۶ر۹ ملین ایکڑ؛ بمبئی ۱۲ر۸ ملین؛ مدراس ۴۵ر۴ ملین ایکڑ، صوبۂ متوسط و برار ۳۱ر۴ ملین ایکڑ؛ اور صوبۂ متحدہ ۰۸ر۲۳۔ علی ہذا باجرے کی کاشت بھی بہت وسیع رقبے پر ہوتی ہے ۔ مثلاً بمبئی ۱۱ر۵ ملین ایکڑ؛ مدراس ۳ر۲۸ ملین ایکڑ، پنجاب ۴۰ر۳ ملین ایکڑ؛ اور صوبۂ متحدہ ۸۰ر۲ ملین ایکڑ۔ باجرا فصل خریف میں پیدا ہوتا ہے، اس کے برعکس جوار خریف اور ربیع دونوں فصلوں میں کاشت ہوتی ہے۔ لیکن ان دونوں اجناس میں سے کسی کی بھی برآمد قابل لحاظ مقدار میں نہیں ہوتی ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۰ء میں جوار اور باجرا ۰۰۰ر۵۰ ٹن قیمتی ۱۳ر۲۵ لاکھ روپے ہندوستان سے برآمد ہوا جس کے مقابلے میں ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں برآمد کی مقدار ۴۰۰ ٹن تھی اور قیمت صرف ۴ر۱۴ لاکھ روپے وصول ہوئی ۔

(۵) دالیں۔ ان کی کاشت ہندوستان کے طول و عرض میں بہت وسیع رقبے پر ہوتی ہے اور باشندوں کی غذا میں ان کا بہت نمایاں حصّہ ہے۔ دالیں زیادہ تر صوبۂ متحدہ، پنجاب، بمبئی، صوبۂ متوسط، بنگال وغیرہ میں کاشت کی جاتی ہیں۔ چنا، ہندوستان کی سب دالوں میں بلاشبہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ۳۴-۱۹۳۳ء میں کم از کم ۳۲،۷ ملین ایکڑ رقبہ اس کے زیر کاشت تھا، اور صوبۂ متحدہ اس لحاظ سے اہم ترین علاقہ ہے کہ وہاں اس کا رقبہ ۵،۳۰ ملین ایکڑ ہے۔ ملک کے اندر دالوں کی مانگ کثیر ہونے کی وجہ سے ان کی برآمد ایک حد تک محدود ہے۔ ۳۵-۱۹۳۴ء میں دالوں کی برآمد کی مقدار ۲،۱۱...،،، ٹن تھی اور ان کی قیمت ایک کروڑ ۵ لاکھ روپے وصول ہوئی۔

(۶) دوسری خوراکی فصلیں۔ ان میں پھل، ترکاریاں، مسالے، اور متفرق خوراکی پیداواریں شامل ہیں۔ ۳۵-۱۹۳۴ء میں ان کی کاشت کا مجموعی رقبہ برطانوی ہند میں ۸،۰۰ ملین ایکڑ تھا۔ میووں، ترکاریوں، ساگ پات اور جڑیلو پودوں کی کاشت ۵ ۸،۴ ملین ایکڑ پر کی جاتی تھی۔ ہندوستان میں انواع و اقسام کے میوے پیدا ہوتے ہیں مثلاً آم، سیب، سنگترہ، آلوچہ، شفتالو، خوبانی اور ناسپاتی۔ رسد کی قلت کے سبب سے میوے بہت گراں ہیں چنانچہ یہ گرانی اور باشندوں کا عام افلاس میووں کے کاروبار کی قابل لحاظ ترقی میں مانع رہا۔ ہندوستان میں مختلف و متعدد اقسام کی ترکاریاں پیدا ہوتی ہیں، مثلاً آلو، پیاز، بیگن، کرم کلا، پھول گوبی، شلغم، ٹماٹو وغیرہ۔ اگر آبپاشی کی مناسب سہولتیں خاصکر بڑے شہروں سے متصل علاقوں میں بہم پہنچائی جائیں تو میووں اور ترکاریوں کی کاشت کے رقبے میں قابل لحاظ توسیع عمل میں آسکتی ہے۔ بحیثیت مجموعی زراعت کے محکمے میووں اور ترکاریوں کی وافر رسد کے دورِ جدید کے توقعات کو پورا کرنے کے اب تک قابل نہیں ہوئے ہیں۔ لیکن پشاور کی وادی میں بہت نمایاں کامیابی حاصل ہوئی ہے، اور اب جبکہ چار دوسرے صوبوں کے زرعی محکموں میں ماہران باغبانی موجود ہیں ہم یہ توقع کرسکتے ہیں کہ میووں کی کاشت کی جانب زیادہ باقاعدہ توجہ مبذول کی جائے گی۔ تجارتی باغبانی کی پیداوار کے لیے بڑے مرکزی شہر بہت وسیع بازار مہیا کرتے ہیں۔ لیکن موجودہ زمانے میں نقل و حمل کی مشکلات ان شہروں کی طلب سے فائدہ اٹھانا غیر ممکن

باب ۴ بنا دیتی ہیں نقل و حمل کی سہولتوں کی ترقی، احتیاط کے ساتھ پھلوں کا توڑنا، سلیقے کے ساتھ جوڑ کر بھیجنا، میووں کو ٹھنڈا رکھنے کا انتظام جیسی اصلاحیں ضروری معلوم ہوتی ہیں[1]۔
176 ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں بگھار کی اشیا اور مسالوں کی کاشت ۱۰۴۷ ملین ایکڑ پر ہوئی۔ مسالے زیادہ تر انتہائی جنوبی ہند میں پیدا ہوتے ہیں گو بعض انواع کی کاشت ہر جگہ ہوتی ہے۔ سیاہ مرچ ملیبار، ٹرانکور، جنوبی کنڑا، کورگ اور کسی حد تک بنگال وغیرہ میں ہوتی ہے؛ مرچیں، زیادہ تر مدراس، مشرقی و شمالی بنگال اور برما و بمبئی کے بعض علاقوں میں؛ ادرک ساحل ملیبار، اور بمبئی کے علاقوں یعنی تھانہ اور سورت میں، اور بنگال و صوبۂ متحدہ کے بعض اضلاع میں، الائچی جنوبی و مغربی ہندوستان کے مرطوب جنگلوں میں، مدراس، ٹراونکور، میسور، کورگ اور بمبئی خاصکر کنڑا میں، سپاری جنوبی ہند اور برما میں؛ دارچینی جنوبی ہند میں مغربی گھاٹ میں؛ لونگ، زیادہ تر مدراس پریزیڈنسی میں مغربی گھاٹ کی پہاڑیوں کے دامن میں پیدا ہوتے ہیں یہی ہندوستان کے اہم مسالے ہیں۔ ان میں کسی حد تک تجارت برآمد بھی ہوتی ہے چنانچہ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں ان کی مقدار ۲۸۶۰۰۰ ہنڈرڈ ویٹ اور قیمت ۲۰۷۷۰ لاکھ روپے تھی۔

(۷) شکر۔ ہندوستان نیشکر کی کاشت کا غالباً سب سے قدیم ملک ہے اور نیشکر کی کاشت کا رقبہ یہاں سب سے بڑا ہے۔ لیکن فی ایکڑ اوسط پیداوار اس قدر کم ہے اور زیادہ تر نباتات پر گزر کرنے والی آبادی کی مانگ اس قدر کثیر ہے کہ ملک کا انحصار کچھ سال ادھر تک بڑی حد تک ارزاں بیرونی شکر پر تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۰ء میں ہندوستان نے ہر قسم کی شکر ۱۲۰۰۰۰۰ ٹن درآمد کی جس کی قیمت ۱۵۰۰۰ کروڑ روپے تھی۔ ہندوستانی شکر کمیٹی کے قول کے مطابق ہندوستان کی حقیقی شکر کی پیداوار فی ایکڑ، کیوبا کی پیداوار کا ایک ثلث، جاوا کا $\frac{1}{6}$ اور ہوائی کا $\frac{1}{7}$ ہے۔ آسٹریا اور جرمنی کی چقندر کی شکر کو ان ممالک کی حکومتیں مالی امداد دیتی تھیں جس کی وجہ سے یہ شکر بہ کفایت ہندوستان کو برآمد کی جاتی تھی لیکن

---

[1] دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "تنقید بر زراعتی کاروبار ہندوستان ۱۹۲۷ء تا ۱۹۲۸ء" صفحہ ۴؛ ایضاً برائے ۱۹۲۸ء تا ۱۹۲۹ء صفحہ ۶۵ تا صفحہ ۶۷ اور زراعتی کمیشن کی رپورٹ پیراگراف ۵۱۵ تا ۵۱۹۔

باب

ہندوستان میں ۱۹۰۳ء سے اس پر محصول درآمد عائد کیا جانے لگا، چنانچہ اِس محصول کی بدولت اِس شکر کی جگہ بتدریج جاوا اور مورشیس کی نیشکر کی شکر نے لے لی۔ اِس غیر ملکی مسابقت نے ہندوستانی نیشکر پر کاری ضرب لگائی، اور بڑی جنگ سے پیشتر کے سالوں میں زیر کاشت رقبے میں کچھ کمی ہو گئی۔ لیکن یہ کمی زمانۂ جنگ کی گرانی کے محرک کے تحت ۱۹۱۸ء تا ۱۹۱۹ء میں کسی حد تک رفع ہو گئی۔ نیشکر کی کاشت کا رقبہ مسلسل کئی سالوں سے ایک حالت پر قائم ہے، اور گزشتہ بیس سال میں اوسط (۲۸۴۰٫۰۰۰) ایکڑ رہا۔ ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۱ء میں نیشکر کی کاشت کا مجموعی رقبہ ۲ء۷۸ ملین ایکڑ تھا۔ ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں نیشکر پیدا کرنے والے اہم صوبے صوبۂ متحدہ (۱ء۷۱ ملین ایکڑ)، پنجاب (۰ء۴۷ ایکڑ)، بہار و اوڑیسہ (۰ء۴۲ ملین ایکڑ)، مدراس (۰ء۱۲ ملین ایکڑ)، بمبئی (۰ء۱۰ ملین ایکڑ) اور آسام (۰ء۳۵ ملین ایکڑ) تھے۔ اِس طرح شمالی ہند کو اس کی کاشت میں نمایاں دلچسپی ہے۔ گو جنوبی ہند کا رقبہ چھوٹا ہے پھر بھی یہاں جو نیشکر اگتی ہے وہ شمالی ہند کے مقابلے میں بہت موٹی اور شیریں ہوتی ہے۔ ہندوستان میں عام طور پر سفید شکر تیار نہیں کی جاتی۔ رس کو راب نکالے بغیر اس قدر جوش دیا جاتا ہے کہ وہ جم جاتا ہے، اور اس پیداوار کو جسے گڑ کہتے ہیں اسی حالت میں استعمال کیا جاتا ہے۔

177

آجکل نیشکر کو قدیم طریقے کے بجائے زیادہ تر جدید اصول پر مشینوں کے ذریعے سے دبایا جاتا ہے۔ سفید شکر کئی فیکٹریوں میں خاصکر صوبۂ متحدہ اور بہار و اوڑیسہ میں تیار کی جاتی ہے۔ بمبئی میں بھی حال حال میں اسی قسم کا کاروبار شروع ہو گیا ہے۔ ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء سے پیشتر نیشکر کے ۳۱ کارخانے تھے۔ شکر کا مقام ہے کہ ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۲ء میں قانون کی منظوری کے بعد ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء میں ۲۶ نئے کارخانوں کا اضافہ ہوا۔ اس کے بعد کے سال میں ۶۵ کارخانے کھولے گئے جس کی وجہ سے نیشکر کے کارخانوں کی مجموعی تعداد ۱۲۲ ہو گئی۔ ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء کی بابت اندازہ کیا گیا ہے کہ اِن کارخانوں کے منجملہ ۱۱۲ کارخانوں میں کام ہوتا رہا۔ ان کارخانوں کے علاوہ ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں ۱۱ گڑ سازی کے کارخانے بھی تھے۔ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں ترقی کی رفتار قدرے سست ہو گئی، چنانچہ ۱۹ نیشکر کے کارخانے اور ۲ گڑ سازی کے کارخانے تعمیر ہوئے۔ ۱۹۳۸ء تا ۱۹۳۹ء میں نیشکر اور گڑ کے

۹۹,۰۸۰ ٹن شکر تیار کی گئی۔ یہ مقدار بڑھ کر ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۱ء میں ۱۵۱,۶۵۰ ٹن ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء میں ۲۸۳,۰۷۳ ٹن اور ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں ۶۲۰,۰۰۰ ٹن (عارضی اندازہ) ہوگئی۔ ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء میں تیار شدہ شکر کی مقدار، قند سازی[1] کے کارخانوں کی پیداوار کو ملاکر ۹۷۶,۰۰۰ ٹن تھی۔ زرعی تحقیق کی شاہی کونسل کے ماہر شکر سازی نے اندازہ لگایا ہے کہ ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء پر ختم ہونے والے تین سالوں میں شکر کے اوسط کی مقدار گڑ کو الگ کر کے ۳۱۰,۰۰۰ ٹن تھی۔ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں ۲۲۳,۰۰۰ ٹن شکر درآمد ہوئی جس کی قیمت ۴ کروڑ ۱۱ لاکھ روپے ادا کی گئی۔ ان اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ پچھلے سالوں کے مقابلے میں درآمد میں بہت بڑی حد تک کمی ہوگئی ہے۔

لیکن ہندوستان میں صاف شکر بنانے کا کاروبار حال حال تک ترقی یافتہ حالت میں نہیں تھا جس کا باعث کئی مشکلات تھیں مثلاً (۱) غیر ملکی شکر کی مسابقت، نیشکر کی فی ایکڑ کم پیداوار، رس نکالنے کے جدید ترین طریقوں کی غیر موجودگی راب کا کم مقدار میں نکلنا، فیکٹری کے متصل کافی بڑی مقدار میں نیشکر حاصل کرنے کی دقت اور کاروبار چلانے کے لیے کثیر سرمایہ کی ضرورت۔ باوجود اس امر کے کہ ہندوستان میں تامینی محصول وقتاً فوقتاً بڑھا کر عائد کیا جاتا رہا، زمانۂ بعد از جنگ میں شکر کی قیمت کم رہی اور اس نے بھی صنعت کی مشکلات کو بڑھا دیا۔ قیمت کی کمی کا باعث زیادہ تر یہ تھا کہ موثر طلب میں کوئی اضافہ نہیں ہوا اور اس کے مقابلے میں جنگ عظیم کے حالات کی وجہ سے پیداوار بہت کثیر مقدار میں تیار ہوئی۔ چنانچہ ان ہی حالات نے کیوبا اور جزائر غرب الہند کے دوسرے علاقوں میں نیشکر کی عمیق کاشت کے حق میں محرک کا کام کیا تھا۔ علاوہ ازیں شکر کی قیمت میں اور بھی زیادہ کمی اس وجہ سے ہوگئی کہ دوسرے کئی ملکوں میں تامینی محصول عائد کیا گیا تھا۔ ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۱ء میں ہندوستان میں شکر کی قیمت غیر نفع بخش سطح تک گھٹ گئی جس کا باعث یہ تھا کہ ہندوستانی بازار میں جاوا کی شکر کی بھرمار ہو رہی تھی اور جاوا سے چین کی بجائے ہندوستان کو شکر بھیجے جانے کی وجہ یہ تھی کہ چین اور جاوا کے

---

[1] قند سازی کے کارخانوں میں سفید شکر تیار کرنے کے لیے دیسی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے جس کو "بیل" کا طریقہ کہتے ہیں۔

178

باب ۱۰

معمولی باہمی تجارتی تعلقات میں چاندی کی قیمتوں کی کساد بازاری کی وجہ سے خلل پڑ گیا تھا۔ اس طرح ہندوستانی کاشتکار پر بہت مضر اثر پڑا۔ بڑی جنگ کے بعد سے یورپ کی چقندر کی شکر کی صنعت کو بھی کثیر مالی امداد اور تامینی محصول کی بھاری شرح کے محرک کے تحت پورے جوش و خروش کے ساتھ زندہ کیا جارہا ہے اور یورپ دنیا کے بازاروں میں اپنی پیداوار کی بھرمار کر رہا ہے۔

حکومت نے اس مسئلے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے، اور ۱۹۰۲ء تا ۱۹۱۰ء سے نیشکر کی خوبی اور رسد کی اصلاح و ترقی کے خیال سے مسئلے کی باقاعدہ تحقیق کی جارہی ہے۔ چنانچہ حال میں مدراس کے ضلع کوئمبتور میں جدید اصول پر ترقی یافتہ نیشکر کا ایک مزرعہ قائم کیا گیا ہے۔ ۱۹۱۹ء میں حکومت ہند نے ایک "شکر کمیٹی" قائم کی تاکہ ہندوستان میں شکر سازی کی صنعت کی تنظیم و ترقی کے امکان کی تحقیق کی جائے۔ ۱۹۲۱ء میں کمیٹی نے اپنی رپورٹ شایع کی جس میں یہ سفارش کی گئی ہے کہ جاوا کے نمونے پر شکر سازی کی صنعت کی تنظیم مناسب ترمیم کے ساتھ کی جائے اور اس غرض کے لیے ایک "شکر بورڈ" قایم کیا جائے۔ رپورٹ میں یہ بھی مشورہ دیا گیا ہے کہ ایک مرکزی ادارہ بنام شاہی ادارۂ تحقیق (Imperial Research Institute) قائم کیا جائے جس کی تین شاخیں ہوں یعنی (۱) زرعی (۲) کیمیائی (۳) انجینیری؛ اور جو مختلف صوبوں کے تحقیقاتی مرکزوں کے کام کی نگرانی کرے۔ شکر بورڈ ادارۂ تحقیق کی نگرانی کرے اور شکر سازی کی صنعت کے بارے میں جملہ معاملات میں حکومت کو مشورہ دے۔ علاوہ ازیں یہ تجویز بھی پیش کی گئی ہے کہ شکر سازی کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا جائے جو ادارۂ تحقیق کا جزو لاینفک ہو اور طلبہ کو کھیتوں اور کارخانوں میں تربیت دے اور کام سکھائے۔ ۱۹۳۰ء میں حکومت ہند نے نو امور زرعی تحقیق کی شاہی کونسل کی سفارشوں کی بنا پر شکر سازی کی صنعت کو تامین دینے کے مسئلے کو ٹیرف بورڈ کے پاس غور و خوض کے لیے بھیجا اور ایسا کرنے کا دہرا مقصد تھا (۱) ایک تو یہ کہ ہندوستان کو غیر محدود غیر ملکی مسابقت سے محفوظ رکھا جائے اور دوسرے یہ کہ

سلہ۔ دیکھو باب ۱۰۔

باب ۶

ملکی صنعت شکر سازی کو فروغ دیا جائے۔ کونسل نے اپنی "شکر کمیٹی" کے مشورے کے مطابق عمل کیا جو محض ہندوستان کی شکر سازی کی صنعت کی امداد کی غرض سے تدابیر اور مشورے پیش کرنے کے لیے قائم کی گئی تھی۔ ٹیرف بورڈ نے اپنی رپورٹ شائع شدہ مارچ [1]۱۹۳۱ء میں سفارش کی کہ اس صنعت کو تامین دی جائے اور اس بات پر اپنا اطمینان ظاہر کیا کہ اس بارے میں ہندوستانی مالی کمیشن کے مقرر کیے ہوئے شرائط شکر سازی کی صنعت کی حد تک پورے کیے گئے تھے۔ ٹیرف بورڈ نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ قومی مفاد کے مدِ نظر نیشکر کی کاشت کے رقبے کو کم نہ ہونے دینا چاہیے اور سفید شکر بنانے کی صنعت کی توسیع کی ہمت افزائی کر کے نیشکر کی کاشت کی ترقی کا ایک اور راستہ نکالنا چاہیے۔ بورڈ نے یہ خوف ظاہر کیا کہ اگر اس صنعت کی ترقی کی تدابیر اختیار نہیں کی گئیں تو گڑ کی تباہ کن کساد بازاری شروع ہو جائے گی جس سے زرعی طبقہ بہت بُری طرح متاثر ہوگا۔ بورڈ نے انتظامی وجوہ سے مالی امداد کو ناپسند کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ سات روپے چار آنے فی ہنڈرڈ ویٹ کا تامینی محصول ابتدائی سات سال کے لیے اور چھے روپے چار آنے فی ہنڈرڈ ویٹ کا محصول اس کے بعد کے آٹھ سال کے لیے عائد کیا جائے اور اس طرح اس صنعت کو پندرہ سال تک تامین دینے کا یقین دلایا۔ محصول میں ایک روپیہ چار آنے فی ہنڈرڈ ویٹ کا یہ فوری اضافہ ۱۹۳۱ء تا [2]۱۹۳۲ء کے موازنے میں زائد آمدنی وصول کرنے کی عارضی تدبیر کے طور پر شریک کر لیا گیا، اور ٹیرف بورڈ کی سفارش تک اس کا استقلال عمل میں نہیں آیا۔ اپریل ۱۹۳۲ء میں یہ محصول مستقل طور پر نافذ ہوا جبکہ مرکزی مجلس قانون ساز نے قانون تامین صنعت شکر سازی [3] بابتہ ۱۹۳۲ء منظور کیا۔ سات روپے چار آنے کا تامینی محصول ابتداءً سات سال یعنی ۳۱ر مارچ ۱۹۳۸ء تک نافذ رہے گا، لیکن اس قانون کے جاری رہنے کے زمانے میں

179

---

[1] دیکھو ٹیرف بورڈ کی رپورٹ شکر سازی کی صنعت کے بارے میں باب ۱۲ خاصکر فقرہ ۲۲۷ و ۲۴۵ تا ۲۴۶۔

[2] دیکھو باب متعلقہ بحث "مالیات و تحصیل ٹیکس" جلد دوم۔

[3] (Suger Industry Protection Act)

باب ۶

ضرورت ہو تو اس میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اس نے صنعت کے حق میں بہت بڑے مربی کا کام کیا ہے اور اس کی بدولت صنعت میں تیزی سے ترقی و توسیع ہوئی ہے۔ چنانچہ اس کی علامتیں پائی جاتی ہیں کہ ہندوستان چند سال کے اندر اس قابل ہو جائے گا کہ اپنی شکر کی ضرورت کو تمام و کمال پورا کرے۔ لیکن مرکزی حکومت کی آمدنی میں دوسرے ممالک سے منجملہ شکر کی کم مقدار درآمد ہونے کی وجہ سے جو کمی ہو گئی تھی اس کو پورا کرنے کے لیے بدقسمتی سے اپریل ۱۹۳۴ء میں ہندوستان کے کارخانوں کی بنی ہوئی شکر پر محصول چنگی عائد کرنا پڑا[1]۔ اسی کے ساتھ مرکزی مجلس قانون ساز میں "قانون نیشکر" منظور ہوا جس کی بنا پر صوبائی حکومتیں اس قابل ہوئیں کہ کارخانے کی جانب سے کسان کو ادا کی جانے والی اقل قیمت مقرر کرنے کی تجاویز کو عملی جامہ پہنائیں۔ حکومت ہند نے بھی یہ وعدہ کیا کہ ایک آنہ فی ہنڈرڈ ویٹ کی معاول رقم یعنی ۷ لاکھ روپے الگ رکھے جائیں گے اور اس فنڈ کو سفید شکر بنانے والے صوبوں میں تقسیم کیا جائے گا تاکہ نیشکر اگانے والوں میں امداد باہمی کی انجمنیں بنائی اور چلائی جائیں جن سے اس طبقے کو واجبی قیمتیں وصول کرنے میں اور اسی مقصد کے تحت دوسرے کاموں میں مدد ملے[2]۔

ٹیرف بورڈ نے تامین سے متعلق اپنی تجویز کی کامیابی کے لیے یہ ضروری خیال کیا کہ اس صنعت کے زرعی اور سائنسی پہلو بہت نمایاں رکھے جائیں۔ چنانچہ اس نے یہ سفارش کی کہ زرعی تحقیق کی شاہی کونسل کو نیشکر کی کاشت کی تحقیق کی غرض سے دس لاکھ روپے سالانہ کی منظوری دی جائے۔ حکومت کی جانب سے قرضے دیے جانے کی حد تک بورڈ کو کوئی اعتراض نہیں ہے بشرطیکہ ایسی شکل میں امداد دینا کسی خاص صورت میں مناسب معلوم ہو، اور اس تحفظ کے تابع ہو کہ اس قسم کی کوئی

180

---

[1] قانون (محصول چنگی) شکر بابتہ ۱۹۳۴ء یکم اپریل ۱۹۳۴ء سے حسب ذیل شرح سے نافذ کیا گیا:-
(۱) قند سازی کے کارخانوں کی شکر پر ۱۰ آنے ہنڈرڈ ویٹ اور (۲) پامالی (کھانڈسری) شکر کے علاوہ دوسری شکر پر ایک روپیہ ۵ آنے فی ہنڈرڈ ویٹ۔ نیز دیکھو جلد دوم باب "مالیات" جس سے محصول چنگی کی مزید تفصیلات اور اس پر کی ہوئی تنقیدات کا حال معلوم ہوگا۔

[2] دیکھو رکن مالیہ کی موازنہ (۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء) کی تقریر۔

باب ۲

امداد یا مالی اعانت یا کوئی دوسری سہولت شکر سازی کے کسی ایسے کارخانے کو بہم نہ پہنچائی جائے گی جس کی مجلس نظما میں ہندوستانی اغراض کی مناسب نمایندگی نہ ہو اور جو ہندوستان کے مستقل اہل کرنے والوں کو نئی کمپنیوں کے سرمایے کے حصے خریدنے کے مواقع بہم نہ پہنچائے[1]۔ یہ ذہن نشیں رکھنا ضروری ہے کہ خام گڑ ہندوستان میں بکثرت اور بڑے پیمانے پر تیار اور صرف کیا جاتا ہے چنانچہ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں اس کی مقدار ۵٫۸۵۰۰۰ ملین ٹن تھی، اسی وجہ سے اس بات کی ضرورت ہے کہ دیسی گڑ کی صنعت کے ساتھ ساتھ ارزاں سفید شکر کی تیاری کی جانب بھی توجہ مبذول کی جائے۔ محکمہ جات زراعت اور خاص کر کوئمبٹور کا نیشکر کا شاہی مزرعہ عمدہ قسم کی نیشکر کی کاشت کا تجربہ کر کے اس کی پیداوار کو بڑھانے کی جانب اپنے مساعی کو مرتکز کر رہا ہے۔ نیشکر کی ترقی یافتہ قسموں کی کاشت کا رقبہ تمام صوبوں میں ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء میں (۱،۸۵،۸۸) ایکڑ تھا جس کے مقابلے میں ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں بڑھ کر (۲،۳۹،۱۱۲) ایکڑ ہو گیا، اس کو دراصل عمدہ قسموں کی کاشت ہی کا نتیجہ کہنا چاہیے کہ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں نیشکر کی کاشت کا رقبہ ۳ر۴۷ ملین ایکڑ ہو گیا جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ۷ فیصد اضافہ ہوا، اور پیداوار میں جو ۵ر۵۰ ملین ٹن بتلائی جاتی ہے، ۵۴ فیصد اضافہ ہوا[2]۔ اس قسم کے کام کے متعلق یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ مسئلے کے دونوں پہلوؤں کے لیے مشترک ہے۔ یہ لکھنے کی بہ مشکل ضرورت ہے کہ خام شکر کی برآمد بہت کم مقدار میں ہوتی ہے چنانچہ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں دو ہزار ٹن بہ قیمت ۲ر۴۳ لاکھ روپے برآمد ہوئی اور سیلون، اسٹریٹ سٹل منٹ اور فی جی کو وہاں کی ہندوستانی آبادی کے لیے روانہ کی گئی۔

(ب) غیر غذائی اشیا۔

(۱) قہوہ۔ ہندوستان میں کافی کے کاروبار کا آغاز کب ہوا اس کا کچھ حال معلوم نہیں۔ لیکن عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ہندوستان سے اس کا تعارف سولھویں صدی میں ایک شخص بابا بڈن نے مکہ کے حج سے واپس ہو کر کرایا۔ پھر بھی کافی کی باقاعدہ

---

[1] دیکھو ٹیرف بورڈ کی رپورٹ (صنعت شکر سازی) شائع شدہ ۱۹۳۱ء پیراگراف (۱۰۵)۔

[2] دیکھو انڈین ایئر بک شائع شدہ ۱۹۳۵ء صفحہ ۲۸۸۔

کاشت کا آغاز صرف سنہ ۱۸۳۰ء سے ہوا۔ چنانچہ میسور کورگ اور نیلگیری پہاڑی کے ایک بڑے رقبے پر کافی کی کاشت ہونے لگی [illegible] میں اس کا کاروبار معراج ترقی پر پہنچ گیا۔ اس تاریخ کے بعد سے ٹڈیوں کی [illegible] زوال شروع ہوا۔ بعد میں چل کر یورپ کے بازاروں میں برازیل کی ارزاں کافی کی درآمد کی وجہ سے بھی ہندوستانی کافی کی کاشت پر مضر اثر پڑا، اور پیداوار کی مقدار بہت کم ہوگئی۔ کافی کی کاشت کے بعض رقبوں میں کافی کی جگہ چائے نے لے لی ہے۔ سنہ ۱۹۳۲ تا سنہ ۱۹۳۳ میں کل ہندوستان میں کافی کے زیر کاشت رقبہ ۱۷۶،۰۰۰ ایکڑ تھا جس میں بڑے علاقے حسب ذیل تھے۔ ریاست میسور ۹۵،۳۰۰ ایکڑ، مدراس ۴۱،۰۰۰ ایکڑ، کورگ ۳۸،۶۰۰ ایکڑ، ٹراونکور ۱۰،۰۰۰ ایکڑ اور کسی حد تک برما اور بمبئی۔ سنہ ۱۹۳۴ تا سنہ ۱۹۳۵ میں ۱۴۱،۰۰۰ ہنڈرڈویٹ کافی جس کی قیمت ۳۷ لاکھ روپے تھی برطانوی ہند سے برآمد کی گئی جس کے مقابلے میں سنہ ۱۹۳۰ تا سنہ ۱۹۳۱ میں ایک کروڑ ۹۲ لاکھ روپے قیمت کی ۲۹۳،۰۰۰ ہنڈرڈویٹ کافی برآمد کی گئی۔ ہندوستانی کافی کے اہم بازار حسب معمول سلطنت متحدہ اور فرانس ہی رہے۔ مرکزی مجلس قانون ساز نے ہندوستانی کافی کے کاروبار کو اس کی موجودہ مشکلات میں سہارا دینے کی غرض سے ستمبر سنہ ۳۵ء میں "قانون ابواب کافی" منظور کیا۔ ان ابواب سے ۸ آنے فی ہنڈرڈویٹ کے حساب سے حاصل ہونے والے فنڈ کا انتظام "ہندوستانی کافی کی ابواب کمیٹی" کے سپرد کیا گیا، اور اس فنڈ کو نہ صرف پروپگنڈا کے لیے بلکہ فروخت کے انتظام کی اصلاح و ترقی زرعی و فنی تحقیق اور کاروباری ترقی کے دوسرے اغراض کے لیے استعمال کیا جائے گا۔

(۲) چائے۔ ہندوستان، غالباً چین کے واحد استثناء کے ساتھ، دنیا کا سب سے بڑا چائے پیدا کرنے والا ملک ہے۔ اٹھارہویں صدی کے آخری نصف حصے میں چین کی چائے ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت برآمد کا اہم اور نفع بخش شعبہ تھی۔ اس صدی کے آخر میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ ہندوستان میں اس رسد کے متبادل ذریعے کو ترقی دی جائے۔ لیکن لارڈ ولیم بنٹنک کی خواہش پر صرف سنہ ۱۸۳۴ میں اس معاملے پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کا موقع ملا۔ چنانچہ آسام میں سرکاری مزرعے قائم کیے گئے جہاں چینی تخم بویا جاتا تھا، اس لیے کہ آسام میں دیسی پودے کی موجودگی کا اس وقت تک علم نہ ہوا تھا۔ سنہ ۱۸۵۲ء میں یہ قطعی طور پر معلوم ہوگیا کہ لندن کے بازار میں ہندوستانی چائے

چینی چائے کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ جب اس کاروبار کی ترقی کی رفتار تیز ہو گئی تو حکومت نے اس سے اپنا تعلق ۱۸۶۵ء میں منقطع کر لیا اور اس کے بعد سے اس کی تنظیم و مالی نگرانی یورپ کے سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ چائے کے اندرونی صرف اور بیرونی برآمد کی روز افزوں ترقی کی بدولت اس کا کاروبار زمانہ دراز سے ترقی یافتہ حالت میں ہے۔ ۱۹۳۳ء میں ۸۱۶,۰۰۰ ایکڑ زمین چائے کے زیر کاشت تھی جس کے منجملہ آسام کا حصہ ۴۳۰,۳۰۰ ایکڑ، بنگال کا ۱۹۹,۸۰۰ ایکڑ، مدراس کا ۷۵,۰۰۰ ایکڑ، پنجاب (کانگڑا) کا ۹,۶۰۰ ایکڑ، صوبہ متحدہ کا ۶,۲۰۰ ایکڑ اور ٹراونکور کا ۷۶,۳۰۰ ایکڑ تھا؛ اور مجموعی پیداوار ۳۸۴,۲۶ ملین پاؤنڈ تھی۔ ”ہر باغ، خواہ وہ کتنی ہی حیثیت رکھتا ہو، اپنے کارخانے رکھتا ہے جہاں بازار کے لیے چائے تیار کی جاتی ہے؛ اس لیے کہ یہ بہت ضروری ہے کہ پتا توڑ لینے کے فوراً ہی بعد مختلف تدریجی عمل انجام دیئے جائیں۔ جو فیکٹریاں منظم اور اعلیٰ پیمانے پر کام کر رہی ہیں وہاں اعلیٰ درجے کی مخصوص کلیں موجود ہیں اور ماہر چائے سازوں کی نگرانی میں کام ہو رہا ہے۔ چائے کی تجارت برآمد خاصکر سلطنت متحدہ سے بڑے پیمانے پر ہوتی ہے؛ چنانچہ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں ہندوستانی برآمد کا ۸۵ فیصد حصہ صرف سلطنت متحدہ گیا۔ ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۰ء میں ۳۷۶,۲۳ ملین پاؤنڈ چائے ۲۶ کروڑ روپے قیمت کی برآمد کی گئی۔ لیکن ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں برآمد کی مقدار ۳۲۴,۸۵ ملین پاؤنڈ تک گھٹ گئی جس کی قیمت صرف ۲۰,۱۳ کروڑ روپے وصول ہوئی۔ اس کمی کا باعث یہ تھا کہ صارفوں کی قوت خرید گھٹ گئی تھی اور تجارت خارجہ پر بندشیں عائد کی گئی تھیں۔ لیکن مئی ۱۹۳۳ء میں چائے کی برآمد کی تنظیم کے بارے میں بین الاقوامی تجویز اختیار کر لیے جانے کی وجہ سے بحیثیت مجموعی چائے کے کاروبار میں دیسی کساد بازاری رونما نہیں ہوئی جیسی کہ اکثر دوسری صنعتوں میں ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں برآمد میں ہندوستان کا حصہ رسدی ۳۳۰ ملین پاؤنڈ تھا۔ اس طرح چائے ایک اہم ضرورت کی شے ہے جو برآمد کی جاتی ہے بشکریہ کہ ہندوستانی چائے کی انجمن کی

Indian Tea Association. ۱؎

باب ۲

مساعی کی بدولت ہندوستان میں بھی چائے کا صرف تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ ۱۹۰۳ء سے ہندوستان سے برآمد کی ہوئی ہندوستانی چائے پر ایک چھوٹا سا محصول عائد کیا جا رہا ہے اور اس محصول کی مجموعی رقم چائے کا کاروبار کرنے والوں کی درخواست پر ہندوستانی چائے کی انجمن کو دیدی جا رہی ہے۔ اپریل ۱۹۳۵ء میں محصول کی شرح ۸ آنے فی صد پاؤنڈ سے بڑھا کر ۱۲ آنے فیصد پاؤنڈ کر دی گئی۔ انجمن مذکور اس رقم کا ایک جزو غیر ملکی بازاروں خاصکر ریاستہائے متحدہ امریکا میں ہندوستانی چائے کی فروخت کو فروغ دینے کے کام میں لاتی ہے۔

(۳) روغن دار تخم۔ ہندوستان میں انواع و اقسام کے روغن دار تخم پیدا ہوتے ہیں؛ مثلاً السی، تل، سرسوں، رائی، مونگ پھلی، ناریل، ارنڈی، بنولہ، موٹھ رام تل، دھنیا، زیرہ، اجوائن اور کاردی[1]۔ ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں برطانوی ہند میں ان سب کی کاشت کا مجموعی رقبہ ۱۰٫۷۹ ملین ایکڑ تھا۔ ہر سال ان کی کثیر مقدار برآمد ہوتی ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں ہندوستان سے برآمد کی ہوئی ہمہ اقسام کی اشیا میں روغن دار تخموں کا نمبر پانچواں تھا۔ زمانۂ قبل از جنگ کی برآمد کے اوسط (یعنی مقدار ... ۱٫۴۵۴ ٹن اور قیمت ۲۴٫۲۷ کروڑ روپے) کے مقابلے میں مختلف قسموں کے روغن دار تخموں کی برآمد میں نمایاں کمی ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء میں مقدار ... ۷۳۳ ٹن اور قیمت ۱۱٫۳۱ کروڑ روپے تھی، ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں مقدار ... ۱٫۱۲۴ ٹن اور قیمت ۱۳٫۶۶ کروڑ روپے تھی اور ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں مقدار ... ۸۰۵ ٹن اور قیمت ۱۰٫۵۴ کروڑ روپے رہی۔ یوروپین ممالک خاصکر جرمنی، فرانس اور اٹلی میں درآمد پر جو بندشیں یا نگرانی قائم کی گئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی روغن دار تخموں کی طلب بہت گھٹ گئی۔ ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں جو اصلاح و ترقی ہوئی اس کا باعث یہ تھا کہ ہندوستانی السی کثیر مقدار میں برآمد ہوئی جس کی وجہ یہ تھی کہ ارجن ٹائن میں اس کی پیداوار کی مقدار کم تھی اور میثاق اوٹاوا کی بناپر ہندوستان کو سلطنت متحدہ کے بازار میں ۱۰ فیصد محصول کی ترجیح حاصل ہو گئی تھی۔

[1] Kardi

باب ۶

لیکن ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں ارجن ٹائن میں فصلوں کی پیداوار بہت اچھی رہی اور سلطنت متحدہ سے بھی مانگ چھوٹے پیمانے پر ہوئی۔ سلطنت متحدہ کو ہندوستانی السی کی برآمد ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء میں ۰۰۰ر۴۱ ٹن ہوئی تھی' یہ مقدار ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں ۰۰۰ر۶۷ ٹن تک بڑھ گئی، لیکن ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں اس میں ۰۰۰ر۳۰ ٹن تک کمی ہوگئی۔ روغن دار تخموں کی مجموعی پیداوار کے مقابلے میں برآمد کی ہوئی مقدار کا تناسب مختلف تخموں کے لحاظ سے بہت مختلف ہے۔ مثلاً السی زیادہ تر برآمد کے لیے بوئی جاتی ہے۔ لیکن رائی اور سرسوں اور تل کی برآمد کا اوسط زمانۂ قبل از جنگ میں ۲۲ فیصد اور ۲۵ فیصد تھا، ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں یہ اوسط گھٹ کر علی الترتیب ۴ فیصد اور ۱ فیصد ہوگیا۔ مونگ پھلی کی برآمد کا پنجسالہ اوسط زمانۂ قبل از جنگ میں مجموعی پیداوار کے مقابلے میں ۳۵ فیصد تھا، جنگ کے زمانے میں یہ گھٹ کر ۱۲ فیصد ہوگیا اور ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۰ء میں یہ دوبارہ بڑھ کر ۲۷ فیصد ہوگیا۔ چنانچہ زمانۂ قبل از جنگ کی برآمد کی مقدار ۰۰۰ر۲۱۲ ٹن اور قیمت ۳ر۵۲ کروڑ روپے تھی جس میں نمایاں طور پر قطعی اضافہ ہوا اور مقدار ۰۰۰ر۴۱۷ ٹن اور قیمت ۱۶ر۳۹ کروڑ رہی۔ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں برآمد کی مقدار گھٹ کر ۰۰۲ر۱۱۵ ٹن ہوگئی جس کی قیمت ۵ر۹۳ کروڑ روپے وصول ہوئی۔ گویا یہ مقدار اس سال کی مجموعی پیداوار کا ۲۷ فیصد تھی۔ اس طرح روغن دار تخموں میں آجکل سب سے اول نمبر مونگ پھلی کا ہے۔ 183

یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ ہندوستان اپنے روغن دار تخموں کے ذرائع سے ابھی تک بہترین طریقے پر فائدہ حاصل نہیں کرتا۔ اگرچہ تخموں کو پیل کر تیل نکالنے کی مقامی صنعت کو ترقی دینے کی کوشش کی گئی ہیں[1]۔ مغرب میں آجکل نباتی تیل سے مختلف کام لیے جاتے ہیں۔ مثلاً امریکا میں بنولہ کو کوٹ کر تیل نکالا جاتا ہے تیل کو کھانے کے اغراض کے لیے استعمال کیا جاتا ہے' اور کھلی کو کھاد یا جانوروں کی غذا کے کام میں لایا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف ہندوستان میں بنولہ کی بہت بڑی مقدار برآمد کی جاتی ہے۔ روغن دار تخموں کی تجارت برآمد زیادہ تر برّاعظم کے

[1] دیکھو باب متعلقہ "ہندوستانی صنائع"۔

باب ۵

ملکوں سے ہوتی ہے، اور بڑی جنگ کی پیدا کردہ قوتوں سے اس پر بڑی حد تک اثر پڑا ہے۔ یورپ کی مانگ کی کمی سے قطع نظر کرتے ہوئے بڑی جنگ نے روغن دار تخموں کی تجارت کے حالات میں تغیر پیدا کر دیا ہے۔ چنانچہ اس نے صاف کرنے کے عملوں کی ترقی کے حق میں محرک کا کام کرکے ایک تیل کے بجائے دوسرا تیل استعمال ہونے کے مواقع بہت زیادہ بڑھا دیئے ہیں۔ مثلاً قابل خور و لوش تیلوں میں کھوپرا اور سرسوں کے تیل کا اسی طرح اضافہ ہوا۔ بڑی جنگ نے روغن دار تخموں کے دوسرے کئی ذرائع کو بھی ترقی دی جس کی وجہ سے زمانہ قبل از جنگ میں ہندوستان کی موافق صورت حال پر مضر اثر پڑا۔ موجودہ زمانے میں ہندوستانی السی کو ارجن ٹائن کی السی کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے جس کا رقبہ گزشتہ بیس سال سے جنگ سے غیر متاثر رہ کر بتدریج بڑھ رہا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، ہندوستانی السی کو ۱۹۳۲ء سے سلطنت متحدہ میں دس فیصد ترجیح حاصل ہے۔ ہندوستانی برآمد کرنے والوں کو تل میں چین سے اور مونگ پھلی میں مغربی افریقہ سے مسابقت کرنی پڑتی ہے۔ دوسری نباتی پیداوار بھی جو چین، جنوبی امریکا، اور مغربی افریقہ میں ہوتی ہے، تیل تیار کرنے کے لیے حاصل کی جاتی ہے۔ آخر میں یہ کہ سرسوں اور رائی کی جگہ مونگ پھلی نے لے لی ہے[1]۔

ہندوستان میں جو اہم روغن دار تخم پیدا ہوتے ہیں ان کا مختصر حال بیان کر دینا مناسب ہوگا۔

(۱) السی۔ السی کی کاشت اس کے تخم حاصل کرنے کے لیے کی جاتی ہے نہ کہ ریشے کے لیے۔ تخم کی بہت بڑی مقدار، تخم کا تیل، اور کھلی برآمد کی جاتی ہے ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں السی کی کاشت کا مجموعی رقبہ ۳ء۲۶ ملین ایکڑ تھا[2]۔ جس کے مجملہ صوبہ متوسط میں ۹۳ء۰، بمبئی میں ۱۲ء۰، بہار و اوڑیسہ میں ۶۳ء۰، صوبہ متحدہ میں ۸۱ء۰ اور بنگال میں ۱۲ء۰ ملین ایکڑ تھا۔ ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں ۳۷۹,۰۰۰ ٹن السی برآمد ہوئی

[1] دیکھو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، تیرھواں ایڈیشن "تیل اور چربی" کا بیان اور گاڈگل کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۲۲۴ تا صفحہ ۲۲۴۔
[2] اس میں صوبہ متحدہ کی مخلوط پیداوار کا ۱۵ء۰ ملین ایکڑ رقبہ بھی شامل ہے۔

باب [illegible]
184

(چنانچہ زمانۂ قبل از جنگ کی مقدار بھی اتنی ہی تھی) جس کی قیمت ۵ ر۴ کروڑ روپے وصول ہوئی۔ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں ۲۳۸۰۰۰ ٹن السی ۰ ر۳ کروڑ روپے قیمت پر برآمد کی گئی۔

(ب) تل جسے جنجلی بھی کہتے ہیں، قریب قریب سب صوبوں اور خاصکر حسب ذیل علاقوں میں کاشت ہوتی ہے۔ برما (۷ ۵ ر ۱ ملین ایکڑ)، مدراس (۴ ۸ ر ۰ ملین ایکڑ)، صوبۂ متوسط (۵ ۵ ر ۰ ملین ایکڑ)، بمبئی (۲۰ ر ۰ ملین ایکڑ)، ریاستہائے بمبئی (۴ ۹ ر ۰ ملین ایکڑ)، حیدرآباد دکن (۸ ۵ ر ۰ ملین ایکڑ)، صوبۂ متحدہ (۳۰ ر ۱ ملین ایکڑ)، پنجاب (۹ ر ۰ ملین ایکڑ)، اور بنگال (۱۲ ر ۰ ملین ایکڑ)۔ ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں مجموعی رقبہ ۲۲ ر ۶ ملین ایکڑ تھا[1]۔ دنیا کی رسد کا ۵۰ فیصد سلطنت برطانیہ مہیا کرتی ہے، اور ہندوستان کا حصّہ اس میں بقدر نصف ہے۔ حالیہ سالوں میں برآمد بہت گر گئی ہے، چنانچہ زمانۂ قبل از جنگ کی اوسط برآمد ۱۱۹۰۰۰ ٹن اور قیمت ۸ ۴ ر ۲ کروڑ کے مقابلے میں ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں اس کی مقدار صرف ۲۴۰۰ ٹن اور مالیت ۲/۱ ۲ لاکھ روپے تھی۔

(ج) سرسوں اور رائی۔ ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں سرسوں اور رائی ملا کر ۷۰ ر ۶ ملین ایکڑ رقبہ زیر کاشت تھا جس میں صوبۂ متحدہ کی مخلوط کاشت کے ۹ ۵ ر ۲ ملین ایکڑ بھی شامل ہیں؛ اور اہم صوبے حسب ذیل ہیں:۔ صوبۂ متحدہ بہ شمول مخلوط کاشت ۸۱ ر ۲، بہار و اوڑیسہ ۶۰ ر ۰، بنگال ۶۹ ر ۰، پنجاب ۱۳ ر ۱، بمبئی ۱۹ ر ۰، آسام ۳۳ ر ۰ ملین ایکڑ۔ زمانۂ قبل از جنگ میں مجموعی پیداوار کا تقریباً ۲۰ فیصد حصّہ برآمد کیا جاتا تھا۔ لیکن اب یہ تناسب ۱ فیصد سے بھی کم ہو گیا ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں ۸ فیصد اور ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں ۴ فیصد تھا۔ موخر الذکر سال میں برآمد کی مقدار صرف ۳۶۹۰۰ ٹن اور قیمت ۲/۱ ۴۲ لاکھ رہی۔

(د) مونگ پھلی۔ یہ سب سے اہم روغن دار تخموں میں سے ایک ہے، اور حالیہ سالوں میں اس کی کاشت کے رقبے میں نمایاں توسیع ہو گئی ہے۔ ۱۹۱۸ء تا ۱۹۱۹ء میں مجموعی زیر کاشت رقبہ ۴ ر ۱ ملین ایکڑ تھا، اس کے مقابلے میں ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں

[1] اس میں صوبۂ متحدہ کی مخلوط پیداوار کا ۰۹ ر ۰ ملین ایکڑ رقبہ بھی شامل ہے۔

باب

وہ بڑھ کر ۶ر۰۶ ملین ایکڑ ہوگیا، اور اس کی تقسیم مختلف صوبوں میں حسب ذیل تھی :۔ مدراس ۸ر۲ ملین، بمبئی ۲ر۱ ملین، برما ۱۱ر۱ ملین اور حیدرآباد ۳۸ر۱ ملین۔ بعض صوبوں میں اس فصل کی معاشی اہمیت بہت بڑھ رہی ہے اور وہ کپاس کی مدِ مقابل بن گئی ہے۔ گزشتہ صدی کے آخر میں دیسی اقسام میں نمایاں خرابی پیدا ہوجانے کی وجہ سے برآمد اور رقبے میں بہت کمی ہوگئی۔ لیکن سنہ ۱۹۱۰ء کے بعد سے سینیگل اور موزمبیق سے مرض کی مدافعت کرنے والے غیر ملکی انواع کی درآمد اور کامیاب کاشت کی بدولت بحالی رونما ہوگئی ہے اور اس کے رقبے میں بتدریج توسیع ہو رہی ہے۔ لیکن موجودہ تجارتی کساد بازاری کے باعث کسی قدر کمی رونما ہوئی ہے۔ مجموعی پیداوار کا قریب قریب ۳/۴ حصہ ملک کے اندرونی صرف کے لیے رکھ لیا جاتا ہے اور بقیہ کو برآمد کیا جاتا ہے۔ برآمد کے اعداد اوپر پیش کیے جا چکے ہیں۔ اب تک فرانس ہی ہندوستانی مونگ پھلی کا سب سے بڑا بازار تھا، لیکن اس کو جتنی مقدار برآمد کی جاتی ہے اس میں بہت نمایاں کمی ہوگئی ہے، چنانچہ سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء میں ۰۰ر۱۸۸ ٹن اور اس کے مقابلے میں سنہ ۱۹۳۴ء تا سنہ ۱۹۳۵ء میں ۰۰۰ر۹۹ ٹن برآمد ہوئی۔ اس کا باعث حصۂ رسدی کے طریقے پر عملدرآمد ہے جس کی رو سے فرانسیسی بازار میں ۰ ۵ فیصد حصہ فرانسیسی نوآبادیات کی پیداوار کے لیے

محفوظ رکھا گیا ہے۔ محکمۂ زراعت، مونگ پھلی کی پیداوار کو کم زرخیز زمینوں میں بڑھانے میں بھی کامیاب ہوا ہے، چنانچہ یہ پایا گیا ہے کہ ان زمینوں پر وہ اچھی طرح اگتی ہے۔

(۴) ریشے ۔ یہ بھی زرعی پیداوار کی ایک اہم قسم ہیں۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء میں برطانوی ہند کے کل زیر کاشت رقبے کے منجملہ ان کی کاشت ۵ر۶ فیصد زمین پر ہوئی؛ اس کے مقابلے میں سنہ ۱۹۱۰ء تا سنہ ۱۹۱۱ء میں یہ تناسب صرف ۱ر۵ فیصد تھا۔

(۲) کپاس ۔ کپاس ہندوستان کی سب سے اہم ریشے کی پیداوار ہے۔ ان کے اعداد و شمار سے حیرت انگیز ترقی ظاہر ہوتی ہے۔ محض برطانوی ہند میں سنہ ۱۹۲۵ء تا سنہ ۱۹۲۶ء میں زیر کاشت رقبہ ۱۸ر۱۸ ملین ایکڑ اور سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء میں ۲۰ر۱۴ ملین ایکڑ تھا۔ اور اگر بڑی بڑی دیسی ریاستوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو رقبہ ۲۸ر۴ اور ۲۳ر۸ ملین ایکڑ علی الترتیب تھا۔ ان ہی دونوں سالوں میں پیداوار کی مقدار ۶ر۱۲ اور ۰۰ر۹ ملین گانٹھ علی الترتیب تھی جس میں سے ہر گانٹھ کا وزن ۴۰۰ پاؤنڈ تھا۔ کپاس کی تجارت

برآمد بہت کثیر مقدار میں ہوتی ہے، چنانچہ ۶۰ فیصد سے زائد پیداوار باہر بھیجی جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی اشیائے برآمد میں کپاس کا نمبر اوّل ہے، اور تجارتی کسادبازاری سے پیشتر کے زمانے میں برآمد کی قیمت میں بہت نمایاں اضافہ ہوا۔ چنانچہ سنہ ۱۹۱۵ء تا سنہ ۱۹۱۶ء میں ۰۰۰ر۴۰۴ ٹن کپاس قیمتی ۲۴ر۹۷ کروڑ روپے برآمد کی گئی۔ سنہ ۱۹۲۵ء تا سنہ ۱۹۲۶ء میں ۹۵ کروڑ روپے کی کپاس وزنی ۰۰۰ر۴۷ ٹن باہر بھیجی گئی اور یہی سب سے بڑی مقدار تھی جو برآمد ہوئی۔ اس کے بعد سے کئی اسباب کی بنا پر روئی کی برآمد کیا بلحاظ خوبی اور کیا بلحاظ قیمت کم ہوگئی ہے۔ یہ اسباب حسب ذیل تھے، مثلاً: تجارتی کسادبازاری، جاپان کا مالی بحران، ہندوستانی گرنیوں میں روئی کا زیادہ صرف، بعض کرگھوں کے لیے امریکی روئی کے مقابلے میں ہندوستانی روئی کی گرانی۔ زمانۂ بعد از جنگ میں سنہ ۱۹۳۲ء تا سنہ ۱۹۳۳ء کا ایک سال ایسا تھا جس میں کمترین مقدار یعنی ۰۰۰ر۸۴۳ ٹن روئی برآمد ہوئی جس کی قیمت ۲۰ر۳۷ کروڑ روپے وصول ہوئی۔ سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء سے کسی حد تک بحالی رونما ہوئی ہے۔ سنہ ۱۹۳۴ء میں جاپان نے ہندوستان کے اس فیصلے کے خلاف کہ وہ سنہ ۱۹۰۴ء کے تجارتی معاہدے کو منسوخ کرنا چاہتا تھا، انتقامی کارروائی کے طور پر ہندوستانی روئی کا قریب قریب چھے ماہ تک مقاطعہ کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بمبئی میں روئی کا بازار ایک زمانے تک تنزلزل کی حالت میں رہا۔ جب نیا ہندوستانی جاپانی تجارتی معاہدہ طے پایا تو جنوری سنہ ۱۹۳۴ء میں جاپان نے مقاطعہ موقوف کیا۔ اس جدید معاہدے کے تحت ہندوستان میں درآمدہ جاپانی سوتی اشیا اور جاپان کی خریدی ہوئی ہندوستانی روئی کی مقداروں میں ربط و تعلق قائم کیا گیا۔ چنانچہ اگر جاپان، ہندوستان کو ۳۲۵ ملین گز جاپانی سوتی اشیا برآمد کرے تو جاپان کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ اس کے معاوضے میں ہندوستان سے خام روئی کے ایک ملین گانٹھ خریدے۔ سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء میں ہندوستانی روئی کی برآمد کی مقدار ۰۰۰ر۹۰۴ ٹن تھی اور قیمت ۵۹ر۲۶ کروڑ روپے وصول ہوئی، اس کے مقابلے میں سنہ ۱۹۳۴ء تا سنہ ۱۹۳۵ء میں برآمد کی مقدار ۰۰۰ر۶۱۵ ٹن تھی اور قیمت ۵ر۴۳ کروڑ روپے وصول ہوئی۔

بعض علاقوں میں اشیائے خوردنی کی کاشت گھٹا کر روئی کے زیر کاشت رقبہ کو ترقی دی گئی۔ چنانچہ سنہ ۱۹۰۵ء تا سنہ ۱۹۱۰ء کے چھے سالوں کا اوسط ۶۰ر۱۳ ملین ایکڑ تھا۔

اس کے برخلاف ۱۹۲۵ء تا ۱۹۲۶ء میں کپاس کے زیر کاشت کل رقبہ صرف ۲۴ء۴۰ ملین ایکڑ تھا۔ ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں روئی کی کاشت کے رقبے کا اندازہ ۲۳۹۳۲۲۵۰ء۰۰۰ ایکڑ کیا گیا تھا۔ ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں ہندوستان کے کپاس پیدا کرنے والے اہم صوبے بمبئی (۶ء۳ ملین ایکڑ) صوبہ متوسط و برار (۴ء۸ ملین ایکڑ) حیدرآباد (۳ء۷ ملین) پنجاب (۳ء۵ ملین) ریاستہائے وسطی ہند (۱ء۱ ملین) اور مدراس (۲ء۲ ملین) تھے۔ جہاں تک روئی کے زیر کاشت رقبے اور مجموعی پیداوار کا تعلق ہے وہاں تک ہندوستان کا نمبر تمام دنیا میں دوسرا ہے یا ریاستہائے متحدۂ امریکا کو الگ کر کے سب سے اوّل ہے۔ امریکا اور مصر کی کپاس کے مقابلے میں ہندوستانی کپاس میں ریشہ زیادہ تر بہت کم اور چھوٹا ہوتا ہے اور روئی موٹی اور گاڑھی ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ حال حال تک ویسے مہین تاروں کے کپڑوں کی تیاری کے لیے موزوں نہیں تھی جیسے کہ لنکاشائر کی گرنیوں میں تیار ہوتے ہیں۔ کچھ سال ادھر سے ہندوستانی روئی کے سب سے بڑے گاہک جاپان اور براعظم یورپ اور سلطنت متحدہ ہیں۔ چنانچہ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں ہندوستانی روئی کی مجموعی برآمد کا ۶۱ء۱ فیصد حصہ جاپان نے لیا، قریب قریب ۲۲ فیصد حصہ براعظم یورپ کو گیا، اور ۹ء۹ فیصد سلطنت متحدہ نے خریدا لیکن ہندوستان میں روئی کی پیداوار فی ایکڑ بہت کم ہے، یعنی جہاں ریاستہائے متحدۂ امریکا میں ۱۸۰ پاؤنڈ اور مصر میں ۳۰۰۔ ۴۰۰ پاؤنڈ ریشہ نکلتا ہے وہاں ہندوستان میں ۷۵ اور ۱۰۰ پاؤنڈ کے مابین ریشہ نکلتا ہے۔ محکمۂ زراعت، جو ابتداءً دراصل لنکاشائر کی تحریک پر قائم ہوا تھا، چند سالوں سے روئی کی خوبی کی اصلاح و ترقی اور دیسی انواع کی پیداوار فی ایکڑ کو بڑھانے کی جانب اپنے مساعی مرتکز کر رہا ہے۔ محکمۂ مذکور نے غیر ملکی انواع خاصکر لانبے ریشے کی روئی کو یہاں رائج کرنے اور مخلوط قسم کی پیداوار حاصل کرنے کی بھی کوشش کی لیکن ہندوستان کے اکثر علاقوں میں بدیسی انواع کی کاشت کے لیے حالات موافق نہیں ہیں، اور اسی لیے دیسی انواع کی اصلاح و ترقی کی جانب زیادہ توجہ صرف کرنے کی ضرورت ہے۔ مصر اور شمالی امریکا کی کپاس کی سندھ میں کاشت کی گئی ہے اور موخرالذکر کی کامیابی کی بہت کچھ توقع ہے۔ یہ بھی امید کی جاتی ہے کہ

باب ۲

سکر بند کی آبرسانی کی تجویز کے مکمل ہونے پر اس قسم کی کپاس کے زیر کاشت رقبے میں
اضافہ ہو جائے گا۔ ایک اور قابل ذکر کارنامہ یہ ہے کہ ۱۹۱۴ء کے بعد سے مدراس میں
کیمبوڈیائی کپاس کی کاشت ہو رہی ہے۔ بمبئی پنجاب اور صوبۂ متحدہ میں بھی امریکی
کپاس بوئی جا رہی ہے۔ کچھ سال ادھر سے متوسط درجے کے ریشوں کی کپاس کی
پیدائش میں بہت کچھ اصلاح و ترقی ہوئی ہے اور مزید اصلاح و ترقی کے مواقع
بہت شاندار ہیں؛ لیکن ایک خطرہ یہ ہے کہ ممکن ہے کہ کسان، اس کپاس کی قیمت کم
وصول ہونے کی وجہ سے چھوٹے ریشے کی ہندوستانی کپاس کی کاشت کی جانب عود
کر جائیں جس کی طلب مستقل ہے گو کہ اس میں کسی بڑی توسیع کا امکان نہیں ہے۔
حال حال میں لنکاشائر میں جو تجربے کیے گئے ہیں ان سے یہ ثابت ہوا ہے کہ
ہندوستانی کپاس کی بعض بہترین قسمیں مثلاً بہترین "پنجابی امریکی قسم"، "مدراسی
کیمبوڈیائی" قسم اور "سورتی قسم" کو مہین اور اعلیٰ درجے کا سوتی تار کاتنے کے
کام میں لایا جا سکتا ہے۔ یہ امر غالباً اہمیت سے خالی نہیں کہ ۱۹۳۲ء میں "لنکاشائر
کی ہندوستانی کپاس کمیٹی" قائم ہونے کے بعد سے اور اس کمیٹی کی کوششوں کی
بدولت آجکل لنکاشائر کی گرنیوں میں ہندوستانی روئی کی کھپت پہلے سے زیادہ
ہو رہی ہے۔ لنکاشائر دنیا کے مختلف ملکوں سے جتنی روئی لیتا ہے اس کی مجموعی
مقدار میں ہندوستان کا حصہ ۴ فی صد سے کچھ زیادہ سے ۱۹ فی صد تک بڑھ گیا ہے۔ 187
"بمبئی لنکاشائر معاہدۂ پارچہ بافی" بابتہ ۱۹۳۴ء میں بھی جو عام طور پر "موڈی لیز پیان"
کے نام سے موسوم ہے، اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ سلطنت متحدہ میں
ہندوستانی خام روئی کے استعمال کو عام اور وسیع کیا جائے اور فروغ دیا جائے[1]۔

بڑی جنگ نے اس مسئلے کو بہت نمایاں کر دیا ہے کہ سلطنت برطانیہ کو اپنی
روئی کی رسد کی حد تک کس طرح خودکفیل بنایا جائے اور دوسرے اسباب کے منجملہ
بڑی جنگ ہی نے حکومت ہند کے لیے ستمبر ۱۹۱۷ء میں ہندوستانی کپاس کمیٹی مقرر
کرنے کا موقع بہم پہنچایا، تا کہ وہ ہندوستان میں لانبے ریشے کی کپاس کی

[1] دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "تبصرہ بر تجارت ہند" بابتہ سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء و سنہ ۱۹۳۴ء تا سنہ ۱۹۳۵ء۔

باب

رسد کو بڑھانے کے امکانات کو جانچے، روئی اوٹنے اور صاف کرنے کے موجودہ طریقوں کی اصلاح و ترقی کے لیے مشورے دے اور کپاس میں آمیزش کرنے اور اس کو نم کرنے کے طریقے کو روکنے کے بارے میں سفارشیں پیش کرے۔ کمیٹی مذکور کی رپورٹ اپریل ۱۹۱۹ء میں شائع ہوئی اور دو شعبوں میں منقسم تھی۔ ایک زرعی، دوسرا تجارتی۔ زرعی شعبے میں روئی کی پیداوار اور خوبی کی اصلاح و ترقی کے طریقوں پر بحث کی گئی تھی اور نباتی کام اور کاشتکاری کے طریقوں کی اصلاح و ترقی کے بارے میں خاص طور پر زور دیا گیا تھا۔ رپورٹ میں یہ سفارش بھی کی گئی کہ محکمۂ زراعت کی تنظیم اور توسیع کی جائے اور لانبے ریشے کی روئی کے زیر کاشت رقبے کو خاصکر سندھ، پنجاب، شمال مغربی صوبۂ سرحدی، صوبۂ متحدہ اور کسی حد تک جزیرہ نما میں آبپاشی کے ذریعے وسیع کیا جائے۔ کمیٹی نے اس خیال سے کہ کسان کو خاصکر خالص اور اعلیٰ درجے کی روئی کی معقول قیمت وصول ہو، متعدد مفید سفارشیں پیش کیں۔ مثلاً یہ کہ برار کے نمونے پر کھلے بازار قائم کیے جائیں، تاکہ خریدار کو بخوبی معلوم ہو جائے کہ وہ کس قسم اور نوعیت کا مال خرید رہا ہے، امداد باہمی کے اصول پر فروخت کی انجمنیں قایم کی جائیں، روئی اوٹنے اور دبانے کے کارخانوں کے لیے سرکاری اجازت نامے جاری کیے جائیں، روئی میں آمیزش کرنے اور اس کو نم کرنے کے مذموم طریقوں کو روکنے کے لیے نقل و حمل پر بندشیں عائد کی جائیں۔ علاوہ ازیں کمیٹی نے روئی کے متعلق پیش اندازوں اور دوسری اعدادی معلومات کی اصلاح و ترقی کے بارے میں مشورے پیش کیے۔ یہ بھی سفارش کی گئی کہ بمبئی میں ایک انجمن بنام "مرکزی انجمن برائے تجارت پنبۂ ہند" Central East India cotten Trade Association قائم کر کے روئی کی تجارت کی اصلاح و توسیع کی جائے۔ آخر میں یہ رائے پیش کی گئی کہ محکمۂ زراعت اور کپاس کی تجارت کے مابین زیادہ قریبی تعلق پیدا کرنے کے لیے ایک مستقل "مرکزی کپاس کمیٹی" قایم کی جائے۔ یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا کہ ایک کمیٹی جو بارہ سرکاری اور غیر سرکاری ارکان پر مشتمل ہو، مشاورتی مجلس کے طور پر قائم کی جائے جس سے حکومت کسی مجوزہ آئین سازی اور اجرائے اجازت نامہ جات کے عمل کے بارے میں مشورہ کرے، کمیٹی مذکور کا یہ کام ہو کہ وہ روئی کے نئے انواع کی قیمتوں کا

باب
188

مستند طریقے پر تخمینہ کرے اور مختلف تخم کی کتائی کی جانچ کرے۔ کچھ تاخیر کے بعد کمیٹی کی تجاویز کو عملی جامہ پہنایا گیا، چنانچہ ۱۹۲۳ء میں ایسٹ انڈیا کاٹن ٹریڈ اسوایشن قائم ہوئی۔ مرکزی کپاس کمیٹی نے اپنا پہلا اجلاس ۱۹۲۱ء میں بمقام بمبئی منعقد کیا۔ روئی کی آمیزش کو روکنے کے لیے کمیٹی مذکور نے ۱۹۲۳ء میں ایک قانون بنام کاٹن ٹرانسپورٹ ایکٹ (قانون نقل وحمل پنبہ) نافذ کرایا۔ یہ قانون پہلے بمبئی میں نافذ ہوا جہاں اس کو ہمت افزا کامیابی ہوئی، اس کے بعد اس کو مدراس میں بھی جاری کیا گیا۔ ۱۹۲۵ء میں ایک قانون بنام کاٹن جننگ انڈ پریسنگ فیکٹریز ایکٹ (روئی اوٹنے اور دبانے کے کارخانوں کا قانون) جو نقل وحمل کے قانون کا ضمیمہ تھا، نافذ ہوا۔ ہندوستان کی "مرکزی کپاس کمیٹی" نے بمبئی میں ایک فنی تجربہ خانہ قائم کیا ہے جہاں سوت کات کر روئی کی خوبی کی آزمایش کی جاتی ہے۔ ریاستہائے وسطی ہند سے تعاون کر کے کمیٹی کپاس کے بارے میں تجربات کا کام آغاز کر چکی ہے اور اس کے لیے ایک تحقیقاتی مرکز بنام انسٹی ٹیوٹ آف پلانٹ انڈسٹری بمقام اندور قائم ہو گیا ہے۔ علاوہ ازیں مختلف صوبوں میں بھی یہی کمیٹی خاص خاص تحقیقاتی تجاویز کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔ اس کمیٹی کو اپنے جملہ کاروبار انجام دینے کے لیے دو آنے فی گانٹھ کے اس چھوٹے سے محصول سے مالی مدد ملتی ہے جو برطانوی ہند کی گرنیوں میں استعمال ہونے والی روئی پر عائد کیا جاتا ہے۔ بمبئی میں ۱۹۲۷ء میں ایک قانون بنام کاٹن مارکٹس ایکٹ (روئی کے بازار کا قانون) منظور ہوا، اور اس قانون کے شرایط حکومت بمبئی کی جانب سے شایع کیے جا چکے ہیں۔ بمبئی پریزیڈنسی کے ایک یا دو کپاس کے مرکزوں میں اس قانون کو نافذ کر دیا گیا ہے۔ اسی کے مشابہ قوانین صوبہ متوسط اور مدراس میں "صوبہ متوسط کی روئی کے بازار کا قانون" اور "مدراس کی تجارتی فصلوں کے بازار کا قانون" کے نام سے منظور ہوئے ہیں۔ ہم یہاں جو تنقید ضروری سمجھتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ خود ملک کے اندر کپاس کی ترقی یافتہ انواع کے استعمال کیے جانے کے بارے میں تدابیر پیدا کرنا ضروری ہے تاکہ ملک کا انحصار بیرونی پارچوں پر کم ہو جائے۔ ہندوستان اپنی خام روئی کی وافر رسد کے باوجود اپنے کپڑوں کی مجموعی طلب کے قریب قریب ایک تہائی تک غیر ملکوں کا محتاج رہتا ہے۔ کسان کی معاشی حالت کی اصلاح و ترقی کے لیے کمیٹی جو بھی تدابیر اختیار کرے اس کا

باب ۶

یقیناً خیر مقدم کرنا چاہئے۔ کمیٹی لانبے ریشے کی روئی کے بارے میں لنکاشائر کی طلب کو پورا کرنے کی تدابیر اختیار کرے تو اس میں کمیٹی کی کوئی غلطی نہیں ہے بلکہ اس کو تو چاہئے کہ اسی کو اپنا واحد اور سب سے بڑا مقصد قرار دے۔

(ب) سَن کپاس کے بعد اہم ترین ہندوستانی ریشہ سَن ہے۔ ہندوستان کو سن کی پیداوار میں تمام دنیا میں واحد اجارہ دار کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کی کاشت بنگال میں گنگا و برہم پتر کے ڈلٹا، صوبۂ آسام اور کوچ بہار کی ملحقہ دیسی ریاست اور اوڑیسہ تک محدود ہے۔ یہاں کی زمین زرخیز دریائی مٹی ہے جو دریاؤں کے سیلاب کے ساتھ آکر تہ بہ تہ جم گئی ہے اور سَن جیسی فصل کی کاشت کے لیے جو زمین سے بہت قوت کھینچکر اس کو کمزور کردیتی ہے موزوں ہے اور کھاد کے مصارف برداشت نہیں کرنے پڑتے۔

189

سنہ ۱۹۳۰ء میں سن کے زیر کاشت مجموعی رقبہ ۳۳,۹۴,۲۰۰ ایکڑ تھا، جس کے مقابلے میں سنہ ۱۹۳۴ء میں کاشت کے رقبے کا اندازہ ۲۴,۹۷,۰۰۰ ایکڑ کیا گیا تھا۔ اگرچہ قیمتوں کے گرجانے اور سَن کی مصنوعات کی کساد بازاری کے باعث موجودہ زمانے کا رقبہ کچھ سال پیشتر کے رقبے سے بہت کم ہے، لیکن صورت حال کی اصلاح و ترقی کی تحریک بہت زوروں پر ہے۔ چنانچہ حکومت بنگال نے ۲۰ ستمبر سنہ ۱۹۳۴ء کو اس تجویز کا اعلان کیا کہ سنہ ۱۹۳۵ء کی فصل کی ارادی طور پر روک تھام کی جائے گی، تاکہ خام سَن کی قیمت کو بحال کرنے میں مدد ملے۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں سَن کی کاشت کا مجموعی رقبہ ۲۰,۹۶,۱۰۰ ایکڑ تھا، جس میں بنگال کا بہت بڑا حصہ تھا، باقی صوبے بہار و اوڑیسہ (۱,۶۵,۶۰۰ ایکڑ) اور آسام (۲,۵۴,۳۰۰ ایکڑ) تھے۔ سنہ ۱۹۳۷ء تا سنہ ۱۹۳۸ء میں مجموعی زیر کاشت رقبے کے زائد از ۳۳ فی صد حصے پر زیادہ پیداوار دینے والے اور مرض کی مقاومت کرنے والے دو اہم قسم کے ریشوں کی کاشت ہوتی تھی۔ صوبۂ متحدہ کے ایک علاقہ گنجر نامی میں سَن کی نئی نئی کاشت کامیاب ثابت ہوئی ہے۔ گزشتہ پچاس سال میں سن کی کاشت کے رقبے اور ریشے کی پیداوار میں بہت بڑی حد تک اضافہ ہوگیا ہے۔ سَن کی برآمد اہمیت کے لحاظ سے کپاس سے صرف دوسرے درجے پر ہے۔ سنہ ۱۹۲۸ء تا سنہ ۱۹۲۹ء میں ۸,۹۸,۰۰۰ ٹن خام سن جس کی قیمت ۳۲٫۲۸ کروڑ روپے تھی اور سن کی مصنوعات جس کی قیمت ۵۶٫۹۰ کروڑ روپے تھی، برآمد ہوئیں۔ اس کے بالمقابل سنہ ۱۹۲۹ء تا سنہ ۱۹۳۰ء کے اعداد خام سن کے بارے میں ۸,۰۷,۰۰۰ ٹن تھے جس کی قیمت

باب

۱۷ء۷ کروڑ روپے وصول ہوئی۔ مصنوعات کے اعداد ۳۹ء۱۵ کروڑ روپے تھے۔ اس کمی کا باعث یہ تھا کہ ہندوستان اور دوسرے خریدار ملکوں میں سَن کی صنعت میں انتہائی کساد بازاری رونما ہوئی تھی۔ بعد کے سالوں میں کساد بازاری اور بھی بڑھ گئی تھی۔ چنانچہ ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء میں برآمد کیے ہوئے سَن کی مقدار صرف ۵۲۳,۰۰۰ ٹن تھی جس کی قیمت ۹ء۳ کروڑ روپے وصول ہوئی۔ اس کے بعد سے برآمد کیے ہوئے خام سَن کی مقدار میں کچھ زیادتی ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں ۷۴۴,۰۰۰ ٹن اور ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں ۷۵۲,۰۰۰ ٹن ہو گئی برآمد میں ۴,۰۰۰ ٹن سے زاید مقدار کا اضافہ ہونے کے باوجود باہر بھیجے ہوئے خام سَن کی قیمت ۱۰ء۷۰ کروڑ روپے وصول ہوئی جو پچھلے سال کے مقابلے میں زائد از ۶ لاکھ روپے کم تھی۔ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں خام سَن اور سَن کی مصنوعات کی برآمد کی مجموعی مقدار ۱,۷۳۴,۰۰۰ ٹن تھی جس سے ۳۲½ کروڑ روپے وصول ہوئے۔ آجکل غیر ملکی بازاروں میں خام سَن یا سَن کی اشیا کے آزادانہ داخلے پر جو بندشیں عائد کی جارہی ہیں ان کی بنا پر ممکن ہے کہ ہندوستان کی تجارت برآمد متاثر ہو۔

جرمنی اور سلطنت متحدہ، ہندوستان کے خام سَن کے سب سے بڑے خریدار ہیں، اور درآمد کرنے والے دوسرے ملک اسپین، فرانس، جاپان، چین، ریاستہائے متحدہ امریکا، اٹلی اور بلجیم ہیں۔ یوں تو خام سَن کی برآمد ۱۷۹۵ء ہی میں شروع ہو چکی تھی، لیکن مقدار ابتدا ً بہت قلیل رہی۔ ۱۸۳۲ء تک قوت سے چلنے والے ڈنڈی کے کرگھوں کی طرف سے طلب میں خاصا اضافہ ہو گیا۔ لیکن بنگال کی دستی کرگھوں کی صنعت میں ۱۸۵۰ء تک اتنی کافی طاقت تھی کہ خام سَن کی برآمد کے مقابلے میں مصنوعات کی برآمد کی زیادتی یقینی تھی۔ — جنگ کریمیا کے زمانے میں سلطنت متحدہ کو روسی سَن کی برآمد کا سلسلہ رک گیا اور نہایت اہم تجارتی ریشہ ہونے کی حیثیت سے اُس کو حاصل کرنے کی کوشش کی گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی خام سَن کی برآمد میں اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ ۱۹۰۹ء تا ۱۹۱۰ء میں مجموعی طور پر ۹۰۰,۰۰۰ ٹن سَن برآمد ہوا، جس کے دو بڑے خریدار سلطنت متحدہ اور جرمنی تھے۔ بڑی جنگ کے زمانے میں برآمد میں بہت بڑی کمی ہو گئی، گو جنگ ختم ہو جانے کے بعد سے یہ کمی ایک حد تک رفع ہو گئی ہے۔ سَن کی مصنوعات کی ترقی کا حال کسی دوسری جگہ بیان ہوگا، یہاں صرف یہ کہدینا مناسب ہوگا کہ اس صنعت کی ترقی خلل کے بغیر جاری رہی جس کا

سلسلہ موجودہ زمانے کی تجارتی کساد بازاری تک قائم رہا۔ زمانۂ قبل از جنگ میں ہندوستانی سَن کی مصنوعات کی برآمد میں خام سَن کی برآمد سے زیادہ تیزی کے ساتھ ترقی ہوئی، اور اس میلان کے حق میں جنگ عظیم نے مزید محرک کا کام کیا۔ سنہ ۱۹۲۱ء تا سنہ ۱۹۳۰ء میں سَن کی مصنوعات کی برآمد زمانۂ قبل از جنگ کے مقابلے میں تھیلوں کی حد تک ۸۳ فی صد اور بنے ہوئے ٹاٹ کی حد تک ۵۵ فی صد زیادہ رہی۔ سنہ ۱۹۳۰ء تا سنہ ۱۹۳۱ء اور اس کے بعد کے سالوں کی کساد بازاری کا حال کسی دوسری جگہ بیان کیا گیا ہے[1]۔

(د) نیل۔ نیل کی سرگزشت بہت ہی رنگ برنگی ہے جو تقریباً عیسوی سنہ کے آغاز سے شروع ہوتی ہے۔ ابتداءً صنعت مغربی ہندوستان میں پرتگالیوں کے ہاتھوں میں تھی، لیکن سنہ ۱۷۷۹ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال میں اس میں نئی جان ڈالی اور اس کے بعد بیس سال تک اس کی براہ راست ہمت افزائی کرتی رہی۔ چنانچہ جب سنہ ۱۸۳۰ء میں یہ صنعت ترہٹ اور صوبۂ متحدہ میں منتقل ہوئی تو، ہندوستان نے دنیا کے نیل پیدا کرنے والے ملکوں کی پہلی صف میں اپنی جگہ دوبارہ قائم کر لی جہاں سے اُس کو جزائر غرب الہند نے عارضی طور پر ہٹا دیا تھا۔ ہندوستان مسابقت کی زد سے اس وقت تک بالکل محفوظ رہا جس وقت تک کہ جرمنی کے تجربے خانوں نے سنہ ۱۸۹۷ء میں آخر کار یہ دریافت نہیں کر لیا کہ نیل تجارتی اصول پر تیار کیا جا سکتا ہے[2]۔ جو مصیبت مجیٹھ اور لاکھ کی صنعتوں پر آ چکی تھی اس سے بہار کے کارخانے خطرے میں پڑ گئے[3]۔ ہندوستانی نیل کی برآمد بری طرح متاثر ہوئی۔ سنہ ۱۹۰۰ء تا سنہ ۱۹۰۱ء برآمد کئے ہوئے نیل کی قیمت، رنگائی اور دباغت کی اشیا کی برآمد کی قیمت کے نصف سے زائد کی نمایندگی کرتی تھی، لیکن سنہ ۱۹۱۳ء تا سنہ ۱۹۱۴ء میں یہ تناسب گھٹ کر ۱/۲ ہو گیا تھا۔ سنہ ۱۸۹۶ء تا سنہ ۱۸۹۷ء میں نیل کے زیر کاشت رقبہ ۱۶۸۸۹۰۱ ایکڑ تھا، لیکن سنہ ۱۹۱۳ء تا سنہ ۱۹۱۴ء میں یہ ۱۷۲۶۰۰ ایکڑ تک گھٹ گیا اور برآمد ۱۶۹۵۲۳ ہنڈرڈ ویٹ سے ۱۰۹۳۹ ہنڈرڈ ویٹ تک گر گئی۔ بڑی جنگ نے قدرتی نیل کی صنعت کے حق میں عارضی محرک کا کام کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زیر کاشت

---

[1] دیکھو جلد دوم باب (۲) ”ہندوستانی صنعتیں، قدیم و جدید“۔

[2] اگرچہ سچ پوچھو تو نیل کی ترکیب کا تجزیہ تیس سال قبل کیا جا چکا تھا۔

[3] دیکھو کاٹن کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۲۶۴۔

رقبے میں کچھ زیادتی ہوئی چنانچہ سنہ ۱۹۱۲ تا سنہ ۱۹۱۱ میں رقبہ بڑھ کر ۰۰۰،۷۷ ایکڑ ہوگیا اور سنہ ۱۹۱۵ تا سنہ ۱۹۱۶ میں برآمد بڑھ کر ۳۲۹،۴۱ ہنڈرڈ ویٹ ہوگئی، پھر بھی بڑی جنگ کے موقوف ہونے کے بعد سے کمزرگی رونما ہوئی ہے اور برآمد جس کی اہمیت گھٹ گئی ہے سنہ ۱۹۳۴ تا سنہ ۱۹۳۵ میں صرف ۰۰۰،۵ ہنڈرڈ ویٹ تھی اور اس کی قیمت ۰۰ر۱۱ لاکھ روپے وصول ہوئی۔ اس صنعت کے آیندہ توقعات کے بارے میں مختلف رائیں قایم کیجاتی ہیں اور صنعت کا مستقبل روشن نہیں معلوم ہوتا بلکہ غیر یقینی ہے۔ اس کو تباہی سے بچانے کی صورت صرف یہ ہوسکتی ہے کہ اس کی کاشت اور مصنوعات کی تیاری کے مصارف کم کیے جائیں۔ سنہ ۱۹۱۵ء میں دہلی کانفرنس میں اس صنعت کی امداد کا مسئلہ زرعی تحقیقاتی اور تجارتی تین نقطۂ ہائے نظر سے زیر غور و بحث رہا۔ سنہ ۱۹۱۸ میں نیل کی برآمد پر ایک محصول عائد کیا گیا اور طے پایا کہ حکومت ہند اس کے ماحصل کو نیل کی کاشت اور مصنوعات کی تیاری کے سلسلے میں تحقیقاتی کام پر صرف کرے۔ چنانچہ پوسا کے تحقیقاتی مرکز (Pusa Research Institute) میں حکومت ہند کے مقرر کردہ ماہر کیمیا نیل کے بارے میں تحقیق کر رہے ہیں۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ سنہ ۱۹۳۳ تا سنہ ۱۹۳۴ میں نیل کے زیر کاشت مجموعی رقبہ صرف ۰۰،۹۱ر۱م ایکڑ تھا جس میں مدراس، صوبۂ متحدہ، بہار اوڑیسہ، بمبئی اور بنگال کا بڑا حصہ تھا۔ تجارت خارجہ کے نقطۂ نظر سے بہار سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے چنانچہ یہیں اہل یورپ کی نگرانی میں رنگ باقاعدہ طور پر نکالا اور تیار کیا جاتا ہے اور اس کی قیمت مقرر کی جاتی ہے۔ بہار کے کارخانوں میں جو نیل تیار ہوتا ہے اُس کی برآمد کلکتے سے زیادہ تر یونان، سلطنت متحدہ، فرانس، تیونس، اور مصر کو ہوتی ہے۔

(۶) افیون سنہ ۱۹۰۷ء میں حکومت ہند کا چین سے اور آخر کار سنہ ۱۹۳۵ میں دوسرے تمام ملکوں سے جو معاہدہ طے پایا اس کے تحت حکومت ہند نے چین کو افیون کی برآمد موقوف کرنے کی پالیسی اختیار کی جس کے نتیجے کے طور پر اور اندرونی صرف پر سرکاری نگرانی قائم ہو جانے کی وجہ سے افیون کے زیر کاشت رقبے میں بتدریج کمی ہوگئی ہے۔ برطانوی ہند میں سنہ ۱۹۰۶ تا سنہ ۱۹۰۷ میں رقبہ ۸۷۹،۱۶۱م ایکڑ تھا جو سنہ ۱۹۳۳ تا سنہ ۱۹۳۴ میں ۵۶۲،۴۲ ایکڑ تک گر گیا۔ پوست کی کاشت سرکاری اجازت ناموں کے

باب

طریقے کے تحت ہوتی ہے اور آجکل یہ زیادہ تر صوبۂ متحدہ تک محدود ہے، جہاں ۱۵,۹۵۲ ایکڑ رقبہ زیر کاشت ہے۔ افیون کی برآمد کا پنجسالہ اوسط زمانۂ قبل از جنگ میں ۵۱۰۰۰ ہنڈرڈ ویٹ تھا، اس کے مقابلے میں ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں ۸۲۲۲ پیٹی یا ۲۴۳۵ ہنڈرڈ ویٹ اور ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں ۴۴۶ پیٹی یا ۲۵۰۸ ہنڈرڈ ویٹ افیون برآمد کی گئی۔[1]

(۷) تمباکو۔ تمباکو کے پودے کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سترھویں صدی کے اوائل میں پرتگالیوں نے ہندوستان کو اس سے روشناس کرایا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے ہی سے حکومت کی یہ کوشش رہی کہ بڑھیا تمباکو کا پتا چلایا جائے اور اس کو سکھانے اور تیار کرنے کے دیسی طریقوں کو اصلاح و ترقی دی جائے۔ تمباکو کی صنعت کے تین اہم مرکز ہیں، یعنی (۱) مشرقی و شمالی بنگال (۲) جنوبی ہند اور (۳) جنوبی برما۔ ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء کے اندازے کے مطابق تمباکو کے زیر کاشت مجموعی رقبہ ۱۸۳۰۰۰ ایکڑ تھا جس میں سب سے بڑا حصہ مدراس، بنگال، بہار، اڑیسہ، بمبئی، برما، صوبۂ متحدہ اور پنجاب کا تھا۔ ہندوستان میں جتنا تمباکو پیدا ہوتا ہے اُس کا بیشتر حصہ ملک ہی میں صرف ہوتا ہے۔ لیکن غیر مصنوعہ تمباکو زیادہ تر مدراس اور رنگون سے برآمد کیا جاتا ہے جس سے معقول قیمت وصول ہوتی ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں ۲۶ ملین پاؤنڈ وزنی تمباکو باہر گیا جس سے ۸۷ لاکھ روپیہ وصول ہوا۔ جہاں تک تمباکو کی مصنوعات کا تعلق ہے وہاں تک درآمد کی قیمت ہمیشہ برآمد کی قیمت سے بڑھی رہی ہے اور یہ فرق حال میں اس وجہ سے اور بھی زیادہ ہوگیا ہے کہ یہاں سگرٹوں کے استعمال میں اضافہ ہوگیا ہے۔ ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۰ء میں ہندوستان میں ۳ر۵ ملین پاؤنڈ وزن کے سگریٹ جن کی قیمت ۲ کروڑ ۱۳ لاکھ روپے اور ۸ر۴ ملین پاؤنڈ تمباکو جس کی قیمت ۷۵ لاکھ روپے تھی درآمد ہوا۔ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں سگریٹ کی درآمد ۱۴۴۰۰ پاؤنڈ تک گر گئی جس کی قیمت ۲۲ لاکھ روپے تھی اور درآمدہ تمباکو تین ملین پاؤنڈ تک گر گیا اور اس کی قیمت ۳۹ر۶ لاکھ روپے ادا کی گئی۔ اس کثیر طلب نے ہندوستان میں سگریٹ بنانے کی ہمت افزائی کی اور کئی کارخانے قائم ہوگئے ہیں۔ ہندوستان کے پتے کے تمباکو سے سگریٹ نہایت عمدہ بنتا ہے لیکن سگار عام طور پر اچھا

102

[1] نیز دیکھو جلد دوم "مالیہ اور محصول" کا باب۔

باب ۶

نہیں بنتا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے سماٹرا اور جاوا سے کثیر تعداد میں تمباکو درآمد کیا جاتا ہے۔ پوسا کے زرعی تحقیقاتی مرکز کے شعبۂ نباتیات نے اپنی توجہ ہندوستانی تمباکو کی خوبی کی اصلاح و ترقی کی جانب مبذول کی ہے خاصکر نئی بدیسی قسموں کی کاشت کرنے میں اور اس قسم کے رنگ اور خوشبو کے تمباکو کی پیدائش میں جس کو عام طور پر ورجینیا تمباکو کہتے ہیں۔ تمباکو کی درآمد پر جو بھاری محصول عاید کیے گئے ہیں ان کے متعلق بھی یہ توقع ہے کہ وہ ہندوستانی تمباکو کی کاشت اور اس کے صرف کے حق میں محرک کا کام کریں گے[1]۔

(۸) چارے کی فصلیں سنہ ۱۹۰۱ء تا سنہ ۱۹۰۲ء میں برطانوی ہند میں ان پودوں کے زیر کاشت رقبہ ۴ء۱۹ ملین ایکڑ تھا جو سنہ ۱۹۳۲ء تا سنہ ۱۹۳۳ء میں ۱۲ء۱۰ ملین ایکڑ تک بڑھ گیا جس کے منجملہ اہم صوبوں کا حصہ حسب ذیل تھا۔ پنجاب ۶ء۷ ملین ایکڑ، بمبئی ۴ء۲ ملین ایکڑ اور صوبہ متحدہ ۱ء۳ ملین ایکڑ۔ اس اضافے کے باوجود ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ چارے کے لیے جو رقبہ وقف ہے وہ ہندوستان جیسے زرعی ملک کے مویشیوں کی بڑی تعداد کی پرورش اور ترقی اور ان کی کارکردگی کو برقرار رکھنے کے لیے بہت کم ہے۔ محکمۂ زراعت نے کچھ سال ادھر سے چارہ پیدا اور اکٹھا کرنے کے مسئلے کی جانب بہت توجہ مبذول کی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں مشہور مصری تینیا گھاس کی کامیاب کاشت، زمین کی کایا کلپ کے بارے میں سندھ، بہار، صوبۂ متوسط اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں اختیار کی ہوئی تدابیر اور پوسا میں برسیم کی کاشت، ان سب چیزوں کو محکمۂ زراعت کا قابل تعریف کارنامہ خیال کیا جا سکتا ہے[2]۔

(۹) ربڑ۔ ربڑ جس کے فوائد آج کل بے شمار ہیں، زیادہ تر جنوبی ہند مثلاً مدراس، کورگ، اور ریاستہائے میسور، ٹراونکور اور کوچین اور برما میں پیدا ہوتا ہے۔ سنہ ۱۹۳۳ء میں ربڑ کی کاشت کا مجموعی رقبہ ۱۷۷،۰۰۰ ایکڑ اور پیداوار ۱۴ ملین پاونڈ خام ربڑ تھی۔ جتنا ربڑ پیدا ہوتا ہے اس کا بیشتر حصہ باہر جاتا ہے، چنانچہ سنہ ۱۹۳۴ء تا سنہ ۱۹۳۵ء میں

---

[1] دیکھو جلد دوم "مالیہ اور محصول" کا باب جس میں "قانون مالیہ بابت سنہ ۱۹۳۴ء" کی رو سے تمباکو پر نظر ثانی کے بعد عائد کیے ہوئے محصول کی تفصیلات دی گئی ہیں۔ اس قانون نے ہندوستان میں اُگے ہوئے تمباکو کے سگریٹ بنانے کے لیے کچھ زیادہ سہولت بہم پہنچائی۔

[2] دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "تبصرہ بر زرعی کاروبار ہند" برائے سنہ ۱۹۲۸ء تا سنہ ۱۹۲۹ء صفحہ ۷۶ تا صفحہ ۸۰۔
(Review of the Agricottural opretieus in India)

جدول (۱)

مقدار (در ہزار)

	زمانۂ قبل از جنگ کا اوسط	زمانۂ جنگ کا اوسط	زمانۂ بعد از جنگ کا اوسط	سنہ ۱۹۲۹ تا سنہ ۱۹۳۰	سنہ ۱۹۳۴ تا سنہ ۱۹۳۵
(۱) غلہ، دال اور آٹا	ٹن	ٹن	ٹن	ٹن	ٹن
دھان	۴۳	۳۲	۳۵	۲۸	۱۴
چاول	۲۳۹۸	۱۶۸۵	۱۴۶۳	۲۲۹۸	۱۵۹۲
گیہوں	۱۳۰۸	۸۰۷	۲۳۷	۱۳	۱۱
گیہوں کا آٹا	۵۵	۵۷	۵۶	۵۱	۱۳
دال	۱۵۹	۱۲۹	۱۴۱	۹۴	۱۱۳
جو	۲۲۷	۱۹۸	۴۰	۶	۱۴
جوار اور باجرا	۴۱	۴۱	۱۱	۱۵	۴
دوسرے اجناس	۱۸۱	۱۹۳	۲۷	۲	۶
میزان اشیائے خوردنی	۴۴۱۱	۳۱۴۱	۲۰۰۹	۲۵۱۰	۱۶۶۵
(۲) چائے - (پاؤنڈ)	۲۶۶,۴۹۷	۳۲۲,۶۹۱	۳۲۱,۱۶۹	۳۷۶۶۳۴	۳۲۴۸۳۵

باب

باب ۴

سلسلہ جدول (۱)

	قیمت (بحساب ہزار روپیہ)				
	زمانہ قبل از جنگ کا اوسط	زمانہ جنگ کا اوسط	زمانہ بعد از جنگ کا اوسط	سنہ ۱۹۲۹ تا سنہ ۱۹۳۰	سنہ ۱۹۳۴ تا سنہ ۱۹۳۵
(۱) غلہ، دال اور آٹا					
دھان	۲۶/۱۵	۲۰۰۹	۳۱۳۲	۲۲۲۰	۶۶۳
چاول	۲۵۶۶٫۵۵	۱۸۸۸/۲۵	۲۴۳۳۶۶	۱۰۳۰۲۸	۳۱۲۸۴۲
گیہوں	۱۳۹۶/۸۲	۱۰۳۳۴۱	۳۶۶۲۱	۲۱۲۴	۱۰۶۱
گیہوں کا آٹا	۸۶/۹۹	۱۱۳۲۰	۱۵۰۲۶	۱۰۷۰۸	۱۴۶۷
دال	۱۴۹/۸۱	۱۸۸۵۳	۲۰۲۷۸	۱۶۳۷۸	۱۰۵۰۶
جو	۱٫۹۳/۱۶	۲۲۱۷۳	۴۶۵۶	۶۷۳	۹۳۰
جوار اور باجرا	۳۷/۹۰	۴۴۱۵	۱۷۳۹	۲۵۱۳	۴۱۴
دوسرے اجناس	۱۴۲/۹۶	۲۳۲۴۵	۳۲۰۳	۴۴۹	۳۷۱
میزان اشیائے خوردنی	۴۵۸۱/۱۱	۳۷۴۱۸۰	۳۲۸۲۶۵	۳۴۷۹۴۲	۱۱۸۴۴۰
(۲) چائے (پاؤنڈ)	۱۳۰۶۷۸	۱۷۵۴۵۷	۳۰۹۲۴۲	×	۲۰۱۳۱۹

جدول (۲)

	زمانۂ قبل از جنگ کا اوسط	زمانۂ جنگ کا اوسط	زمانۂ بعد از جنگ کا اوسط	سنہ ۱۹۲۹ تا سنہ ۱۹۳۰	سنہ ۱۹۳۴ تا سنہ ۱۹۳۵
	مقدار (بحساب ہزار ٹن)				
(۳) ریشے:۔	ٹن	ٹن	ٹن	ٹن	ٹن
خام کپاس	۴۳۰	۳۹۱	۵۲۱	۷۲۷	۶۱۵
خام سن	۷۶۴	۴۶۴	۵۵۴	۸۰۷	۷۵۳
میزان ریشہ	۱۱۹۴	۸۵۵	۱۰۷۵	۱۵۳۴	۱۳۶۷
(۴) روغندار تخم:۔ جوہری	۱۰	۸	۹	۴	۹
غیر جوہری:۔ السی	۳۷۹	۲۷۰	۲۵۱	۲۴۸	۲۳۸
مونگ پھلی	۳۱۳	۱۱۹	۱۹۵	۴۱۴	۵۱۱
سرسوں	۴۷۳	۹۱	۲۰۶	۴۴	۳۷
تل	۱۱۹	۳۳	۲۸	۱۱	۴
ارینڈی	۱۱۴	۸۹	۴۸	۱۰۶	۶۹
ناریل	۳۱	۱۲	۷	–	–
بنولہ	۲۴۰	۶۹	۱۵۵	۵۸	۱
رائی	۴	۳	۲	۳	۳
موٹھ	۳۹	۳	۸	–	–
خشخاش	۳۳	۵	۶	–	–
دوسری قسمیں	۹	۲	۸	۷	۳
میزان روغندار تخم	۱۴۵۳	۷۰۸	۹۲۳	۱۲۵۰	۱۰۳۷

(ماخوذ از تبصرہ تجارت ہند بابت سنہ ۱۹۲۹ء تا سنہ ۱۹۳۰ء و سنہ ۱۹۳۴ء تا سنہ ۱۹۳۵ء) (Review of the Trade of India)

سلسلہ جدول (۲)

قیمت بحساب ہزار روپیہ

	زمانہ قبل از جنگ کا اوسط	زمانہ جنگ کا اوسط	زمانہ بعد از جنگ کا اوسط	سنہ ۱۹۳۳ سنہ ۱۹۳۴	سنہ ۱۹۳۴ سنہ ۱۹۳۵
(۳) ریشے:-					
خام کپاس	۳۳۲۷۸۳	۳۳۶۳۱۹	۶۴۷۳۸۹	۶۵۰۷۷۰	۳۴۴۹۸۳
خام سن	۲۲۲۰۲۲	۱۳۸۰۲۸	۱۹۵۲۷۷	۲۰۱۶۳۸	۱۰۸۷۱۱
میزان ریشہ	۵۵۶۸۰۶	۴۶۴۳۴۷	۸۴۲۶۶۶	۹۲۲۵۰۸	۴۵۳۶۹۴
(۴) روغندار تخم:-					
جوہری	۳۰۵۰	۲۴۱۲	۳۵۸۹	۱۵۸۹	۱۹۶۵
غیر جوہری					
السی	۷۹۸۹۰	۴۹۴۹۴	۷۵۷۰۳	۵۷۴۳۷	۲۹۹۷۶
مونگ پھلی	۳۵۲۵۷	۱۹۱۱۷	۵۶۱۹۷	۱۶۳۸۹۶	۵۶۳۸۴
سرسوں	۴۱۳۶۹	۱۴۳۰۱	۵۰۷۳۷	۹۲۰۸	۴۳۳۹
تل	۲۴۸۱۵	۶۷۳۵	۱۰۳۷۳	۳۷۱۸	۷۵۳
اریںڈی	۱۶۶۴۳	۱۵۷۵۵	۱۱۴۵۴	۲۱۴۹۶	۸۱۰۸
نائجل	۱۱۰۴۳	۶۰۷۳	۲۸۸۴	۶۸	۲۰
جوزنہ	۱۷۹۹۸	۵۰۲۵	۱۸۸۰۵	۵۴۸۷	۳۹
رائی	۱۰۰۸	۹۱۶	۹۷۵	۷۶۲	۴۹۰
موڑہ	۲۴۵۳	۳۰۴	۱۲۷۹	۶۳	—
خشخاش	۶۹۴۱	۹۵۸	۳۰۹۷	۷۱	۱۸
دوسری قسمیں	۲۳۲۳	۶۲۸	۱۳۰۳	۲۱۱۳	۵۱۸
میزان روغندار تخم	۲۴۳۶۹۷	۱۲۱۷۴۲	۲۳۵۳۶۴	۲۶۴۶۰۶	۱۰۵۴۱۰

۲۶ ء ۲ ملین پاؤنڈ ربڑ جس کی قیمت ۴۴ ء ۳ ۶۵ ء ۶ روپے تھی برآمد کیا گیا۔ سنہ ۱۹ء سے پیشتر اشیائے برآمد کی مقدار بہت کم تھی، اس لیے کہ صنعت نوخیز اور ابتدائی حالت میں تھی، موجودہ زمانے میں بھی دنیا کی مجموعی پیداوار میں ہندوستان کا حصہ صرف تقریباً ۴ فی صد ہے۔ جون سنہ ۱۹۳۴ء سے ربڑ کی پیدائش اور برآمد کی نگرانی کے لیے ایک بین الاقوامی تجویز پر عمل ہو رہا ہے۔ اس تجویز کے عملی جامہ پہننے سے پیشتر ربڑ کا بازار بہت مندا تھا، لیکن اب یہ حالت باقی نہیں رہی ہے۔ سنہ ۱۹۳۴ء تا سنہ ۱۹۳۵ء میں درآمدہ ربڑ کی مصنوعات مثلاً ٹائر، ٹیوب وغیرہ کی قیمت ۲ کروڑ ۲ لاکھ روپے تھی۔

۸۔ زرعی پیداوار کی برآمد۔ ہندوستان کی اہم زرعی پیداوار کے مذکورۂ بالا تبصرے میں ان کے برآمد کے پہلو پر بھی کچھ روشنی ڈالی گئی تھی۔ لیکن اب زرعی پیداوار کی برآمد کے کل مسئلے پر جداگانہ بحث کرنا ضروری ہے۔ اس مسئلے کی ابتدائی بحث کے طور پر اجناس خوردنی اور اشیائے خام کی برآمد کے متعلق کچھ اعداد و شمار پیش کیے جا سکتے ہیں صفحہ ۲۹۲ تا ۲۹۶ پر مندرجہ جدولوں میں سے ایک میں اشیائے خوردنی کی برآمد کی قیمت اور مقدار اور دوسری میں اہم زرعی پیداوار کی برآمد کی قیمت اور مقدار بتلائی گئی ہے۔

مندرجۂ ذیل جدول نمبر (۳) میں یہ بتلایا گیا ہے کہ مجموعی پیداوار سے بعض اہم فصلوں کی برآمد کا فی صد تناسب کیا ہے۔[۱]

جدول (۳)

	زمانۂ قبل از جنگ کا اوسط	زمانۂ جنگ کا اوسط	زمانۂ بعد از جنگ کا اوسط	سنہ ۱۹۲۵ تا سنہ ۱۹۲۶	سنہ ۱۹۲۷ تا سنہ ۱۹۲۸	سنہ ۱۹۳۰ تا سنہ ۱۹۳۱	سنہ ۱۹۳۴ تا سنہ ۱۹۳۵
چاول	۹	۵	۵	۸	۸	۷	۵

۱؎ دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "تصویر تجارت ہند" برائے سنہ ۱۹۳۴ تا سنہ ۱۹۳۵ء صفحہ ۲۴۴۔

سلسلہ جدول (۳)

	زمانۂ قبل از جنگ کا اوسط	زمانۂ جنگ کا اوسط	زمانۂ بعد از جنگ کا اوسط	سنہ ۱۹۲۵ سنہ ۱۹۲۶	سنہ ۱۹۲۷ سنہ ۱۹۲۸	سنہ ۱۹۳۰ سنہ ۱۹۳۱	سنہ ۱۹۳۴ سنہ ۱۹۳۵
گیہوں ...	۱۴	۹	۳	۳	۴	۲	۰ء۱
چائے	۹۶	۸۹	۹۵	۹۰	۹۱ سنہ ۱۹۲۶ تا ۱۹۲۷	۹۶	۸۱
خام کپاس ...	۵۶	۵۱	۶۱	۶۹	۴۶	۷۵	۷۲
خام سن	۵۱	۲۱	۴۸	۴۶	۴۹	۳۱	۴۹
السی	۷۳	۶۳	۵۹	۷۷	۶۳	۶۸	۵۷
سرسوں اور رائی	۲۳	۰	۱۹	۱۳	۸	۴	۴
تل ...	۲۵	۸	۷	۱۰	۲	۰ء۲	۱
مونگ پھلی	۳۵	۱۲	۱۹	۲۴	۲۴	۱۹	۲۷
نیل[۱] ...	۴۰	۴۴	۲۶	۷	۱۷	۷	—

[۱] سنہ ۱۹۳۴ تا سنہ ۱۹۳۵ کے اعداد دستیاب نہیں ہوئے۔

مندرجۂ ذیل جدول (۴) میں جملہ اشیائے برآمد کی مجموعی قیمت سے مختلف اجناس کا فی صدی تناسب دیا گیا ہے اور ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء کی تجارت برآمد میں اہم اشیائے خوردنی اور دوسری قسموں کی پیداوار کی اضافی اہمیت بھی بتائی گئی ہے۔[1]

جدول (۴)

اشیا	فیصد	اشیا	فیصد
خام کپاس	۲۳ر۱۵	کھلی	۱ر۲۰
غلہ دال اور آٹا	۷ر۸۳	مسالے	۰ر۵۱
خام سن	۷ر۱۹	قہوہ	۰ر۴۸
تخم	۶ر۹۷	تمباکو	۰ر۵۴
چائے	۱۳ر۳۲	میوے اور ترکاریاں	۰ر۷۱

۹۔ اشیائے خوردنی کی برآمد پر بندشیں

جیسا کہ اوپر جدول (۱) میں بیان ہوچکا ہے چاول جملہ برآمد کردہ اجناس میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں جملہ برآمد کردہ اجناس اور آٹے کے مقابلے میں اس کی برآمد کا تناسب ۹۳ر۳ فیصد اور ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں ۱۰ فیصد تھا۔ گیہوں کا نمبر برآمد کردہ اہم اجناس میں

[1] سنہ ۱۹۳۰ء تا سنہ ۱۹۳۱ء میں برطانوی ہند سے جملہ برآمد کی مجموعی قیمت ۴۴ر۱۲۱۵ روپے وصول ہوئی۔ دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "تبصرہ بر تجارت ہند بابت سنہ ۱۹۳۴ء تا سنہ ۱۹۳۵ء" صفحہ ۲۰۔

حال حال تک دوسرا تھا، چنانچہ تجارت برآمد میں اس کی بحث آچکی ہے اور یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ حالیہ سالوں میں برآمد کی مقدار بہت گھٹ گئی ہے۔ اس لحاظ سے جب ہم اشیائے خوردنی کی برآمد کے مسئلے پر بحث کریں تو فی الحال اشارہ زیادہ تر چاول ہی کی طرف ہوگا۔ کیا اجناس خوردنی اور خام اشیا کی برآمد قابل مبارکباد ہے یا لائق خوف و ہراس؟ بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ یہ برآمد روز افزوں خوش حالی کی علامت ہے۔ وہ یہ ظاہر کرتی ہے کہ ملک منفعت بخش عالی قیمتوں سے نفع حاصل کر رہا ہے اور اپنی آبادی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے بعد جو زاید پیداوار بچ رہتی ہے اس کو برآمد کرتا ہے اور اس برآمد سے جو قیمت وصول ہوتی ہے اس سے ارزاں مصنوعات خریدتا ہے جو ملک میں نفع کے ساتھ تیار نہیں کی جاسکتیں۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق برآمد کی ہوئی مقدار" اس اصلی زائد پیداوار کی نمایندگی کرتی ہے جو عمدہ فصل کے زمانے میں ہندوستان میں اس کی اپنی ضرورتیں پوری کرلینے کے بعد بچ رہتی ہے اور دوسروں کو دی جاسکتی ہے اور ایسے ذخیرۂ محفوظ کا کام دے سکتی ہے جو قحط یا خشک سالی کے زمانے میں مقامی ضرورتیں پوری کرسکتی ہے۔[2]

دوسرا نقطۂ نظریہ ہے کہ اجناس خوردنی اور اشیائے خام کی برآمد اس مفہوم میں اصلی زاید پیداوار نہیں ہے کہ وہ مقامی ضرورتوں کو بخوبی پورا کرنے کے بعد فاضل مقدار کے طور پر بچی رہتی ہے اور اس لحاظ سے ملک کے حقیقی اغراض کے حق میں مناسب یہ ہوگا کہ بھاری محصول عائد کرکے اس برآمد پر بندش قائم کی جائے یا اس کی ممانعت کردی جائے۔ چنانچہ یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ ایسی صورت میں جب کہ آبادی کا بڑا حصہ فاقوں بسر کر رہا ہو، ملک کے اجناس خوردنی کی برآمد کو روا رکھنا اور قیمتی اشیائے خام بیرونی ممالک چلے جانے پر مسرور ہونا ایک جرم ہے، اس لیے کہ ملکی مصنوعات کو ترقی دینے کے لیے ان اجناس و اشیا کی ملک کو سخت ضرورت ہے۔

---

[1] دالیں، جو، جوار، باجرا، اور مکائی دوسرے اجناس ہیں جن کی برآمد کی جاتی ہے لیکن ان کی مجموعی برآمد کی مقدار متقابلتہً کم ہے۔

[2] دیکھو ایک کتاب موسوم بہ "سلطنت کے معاشی ذرائع" مرتبہ ٹی ورسوک، صفحہ ۱۰۵

(Economic Resources of the Empire)

ان مباحث کے سلسلے میں ہمیں ایک سادہ حقیقت پر زور دینا چاہیے جس کو عام طور پر فراموش کر دیا جاتا ہے اور وہ یہ کہ بیرونی ممالک کو اشیا کے برآمد ہونے کے مجرد واقعے سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ برآمد کرنے والے ملک کے باشندوں کی احتیاجیں برآمد کی ہوئی اشیا کی حد تک بخوبی پوری ہو چکی ہیں۔ اس سلسلے میں "اصل زاید پیداوار" کی جو اصطلاح عام طور پر استعمال کی جاتی ہے وہ غلط ہے، اس لیے کہ وہ اس بات کی جانب اشارہ کرتی ہے کہ "نفلی زائد پیداوار" جیسی کوئی چیز بھی ہے۔ سچ پوچھو تو جملہ زاید پیداوار جو برآمد کی جاتی ہے وہی مقررہ باضابطہ نوعیت رکھتی ہے؛ یعنی وہ اس واقعے کی بنا پر برآمد کی جاتی ہے کہ برآمد کرنے والے ملک میں مروجہ قیمتوں پر اس کی طلب نہیں ہوتی۔ طلب کا مطلب، جیسا کہ معاشیات کے ہر مبتدی کو معلوم ہے، صرف کسی شے کو اپنے قبضے میں لانے کی خواہش نہیں بلکہ ایسی خواہش ہے جس کی بنیاد ضروری قوت خرید پر قائم ہو۔ اگر ریاستہائے متحدہ امریکہ گیہوں برآمد کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہر انفرادی امریکن کو وہ سب خوراک میسر آتی ہے جس کو وہ صرف کر سکتا ہے۔ علیٰ ہذا ہندوستان میں اجناس خوردنی کی برآمد کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ جو پیداوار برآمد کی جاتی ہے اس کی ملک میں کسی شخص کو احتیاج ہی نہیں ہے۔ ہندوستان اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے درمیان فرق صرف یہ ہے کہ موخر الذکر ملک کے مقابلے میں اول الذکر ملک میں ایسی آبادی کا تناسب بدرجہا زیادہ ہے جس کی طلب غذا کے بارے میں پوری نہیں ہوتی۔ گویا یہ فرق مدارج کا ہے نہ کہ نوعی۔ چنانچہ جب مالی کمیشن لال بھکر بن کر ہندوستان سے گیہوں اور چاول کی برآمد کے بارے میں یہ رائے ظاہر کرتا ہے کہ "موجودہ قیمتوں پر ہندوستان کی موثر طلب پوری ہو جاتی ہے اور زاید پیداوار برآمد کے لیے بچ رہتی ہے"[1] تو وہ ایک ایسی بات کہہ رہا ہے جو ایک حد تک پوری طرح ٹھیک بھی ہے اور بالکل بے کار و بے سود بھی۔ "موجودہ قیمتوں" پر خواہ وہ اعلیٰ ہوں یا ادنیٰ "موثر طلب" ہمیشہ پوری ہوتی ہے لیکن ممکن ہے کہ غذا کی "موثر طلب" کے پورا ہونے کے باوجود ملک کے لاکھوں باشندوں کو پیٹ بھر کر کھانا میسر نہ ہو؛ چنانچہ ہندوستان کی عام طور پر یہی حالت معلوم ہوتی ہے۔

[1] ۔ دیکھو مالی کمیشن کی رپورٹ صفحہ ۱۵۵ (Fiscal Commission Report)

باب ۲

اس صورت حال کی اصلاح کے دو طریقے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ اور غیر متعلق نہیں ہیں۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اجناس کی قیمتوں میں اتنی کمی کردی جائے کہ عوام کی ادنیٰ قوت خریداں پر دسترس حاصل کر سکے؛ اور دوسرا یہ کہ ان کی قوت خرید میں اتنا اضافہ کردیا جائے کہ مروجہ قیمتوں پر ان کی طلب موثر طور پر پوری ہوجائے۔

اشیائے خورد و نوش کی قیمتوں کو کم کرنے کے طریقوں میں سے ایک طریقہ یہ بتایا جاتا ہے کہ ان کی برآمد ممنوع قرار دی جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا برآمد کی ممانعت سے یا بھاری محصول برآمد عاید کرنے سے قیمتیں مطلوبہ سطح تک گر جائیں گی؟ اور اگر ایسا ہوا تو کیا ایسے مصنوعی طریقے پر قیمتوں کو کم کرنے سے ملک کی معاشی زندگی پر کوئی نقصان رساں ردعمل ہوگا یا نہیں؟

198

جو لوگ اس طریقے پر اشیائے خورد و نوش کی قیمتوں کو کم کرنے کی کسی ارادی کوشش کے مخالف ہیں وہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ اجناس کی بجائے ناقابلِ خورد و نوش پیداوار مثلاً کپاس، سن، روغندار تخم وغیرہ کی کاشت شروع کردیں گے اور اس وقت تک کرتے رہیں گے جبتک کہ ان پر بھی بندشیں عاید نہ کی جائیں؛ اور اس طرح ملک کی اشیائے خوردنی کی رسد کو ارزاں بنانے کی کوشش کا نتیجہ محض یہ ہوگا کہ اجناس کی پیداوار گھٹ جائے گی اور آبادی کو کافی غذا مہیا کرنے کے نقطۂ نظر سے صورت حال پہلے سے بھی زیادہ ابتر ہوجائے گی۔

ہمیں اس پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ برآمد کی ممانعت یا بھاری محصول برآمد عاید کرنے کا نتیجہ، دوسرے حالات مساوی رہنے کی صورت میں، لازمی طور پر یہ ہوگا کہ اشیائے خوردنی کی مجموعی پیدایش کسی حد تک گھٹ جائے گی۔ اگر رسد بہت تغیر پذیر ہے تو ممکن ہے کہ اس کمی کا یہ اثر ہو کہ ملک میں پہلے سے بھی کم مقدار دستیاب ہو۔ تاہم دوسری جانب یہ تسلیم کرلینے کے باوجود کہ رسد میں کسی حد تک کمی ہوجائے گی یہ خیال کرنا قطعی غیر متناقض ہوگا کہ ملکی بازار کے لیے دستیاب شدنی غذا کی زیادہ مقدار بچ رہے گی۔

فرض کیجئے کہ چاول کی مجموعی سالانہ پیداوار ۳۰ ملین ٹن کے منجملہ تین ملین ٹن ہر سال برآمد ہوتی ہے جس کے نتیجے کے طور پر ۲۷ ملین ٹن گھریلو صرف کے لیے بچ رہتی ہے۔ اب

اگر قیمتیں گر جائیں اور چاول کی رسد انتہائی طور پر تغیر پذیر ہو تو ممکن ہے کہ مجموعی پیداوار ۲۷ ملین ٹن سے بھی کم ہو جائے؛ لیکن یہ کسی حال یقینی نہیں ہے کہ مقدار میں اتنی کمی ہو جائے گی البتہ ۲۸ ملین ٹن قرین قیاس ہے اور ایسی حالت میں چاول کی رسد گھریلو بازار کے لیے پہلے کے مقابلے میں ایک ملین ٹن زیادہ دستیاب ہوگی۔ غرض ہم یہ اصول قطعی قرار نہیں دے سکتے کہ ممانعت کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک میں پہلے کے مقابلے میں کم مقدار رہے گی۔ ہو سکتا ہے کہ اکثر کسانوں کے لیے یہ بات قابل عمل نہ ہو کہ اپنی زمینوں کو اجناس کی کاشت کی بجائے غیر خوردنی اشیا کے کام میں لائیں۔ لہٰذا منافع کی کمی کے باوجود یہ ممکن ہے کہ کسان پہلے کی مانند کم و بیش وہی مقررہ مقدار پیدا کرتا رہے۔ چنانچہ ہر اس شخص کو جو ہندوستانی کسان کی حقیقی حالت سے ذرا سی بھی واقف ہو یہ معلوم ہوگا کہ کسان کا اپنی پرانی وضع اور اپنے تنگ راستے کو ترک کرنا کس قدر دشوار اور تبدیلِ حالات کے مطابق اپنی رفتار میں فوری تبدیلی کر دینا کس قدر وقت طلب ہے۔ پس یہ بعید از امکان نہیں ہے کہ بندش کی پالیسی کے نتیجے کے طور پر ملک میں غذائی اشیا کی رسد بڑھ جائے۔

پیداوار کی بے روک ٹوک برآمد کے حق میں ایک اور دلیل جس کا مالی کمیشن نے ذکر کیا ہے، یہ ہے کہ غیر ملکی بازاروں میں یہاں کی پیداوار کی مانگ ہندوستان کو "فاضل پیداوار" تیار کرنے پر آمادہ کرتی ہے جس کا یہاں رہنا خاصکر مقامی فصلوں کی خرابی کے زمانے میں جو آئے دن رونما ہوتی رہتی ہے نہایت اہم و ضروری ہے۔ یہ زاید پیداوار اس لیے تیار کی جاتی ہے کہ غیر ممالک میں اسی کی برآمد اس کے لیے ایک نفع بخش نکاس مہیا کرتی ہے اور اگر یہ نکاس بند ہو جائے تو زائد پیداوار کی تیاری رک جائے گی[1] لیکن قحط کی کافی امداد کے مسئلے کا انحصار کسی بڑی حد تک اس زاید پیداوار کے میسر آنے پر نہیں ہے جو معمولی سالوں میں برآمد کی جاتی ہے۔ اگر اس زاید پیداوار کو جو معمولاً برآمد کی جاتی ہے برآمد کرنے کے بجائے ملک کی

---

[1] دیکھو مالی کمیشن کی رپورٹ صفحہ ۱۱۵؛ اور کے ال دت کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان میں اضافہ قیمت کی تحقیق" صفحہ ۹۰۔

باب ۳

خاص اور فوری ضرورتیں پوری کرنے کے لیے روک لیا جائے تو قحط کے امدادی کام میں کچھ مدد تو مل سکتی ہے لیکن صورت حال میں کوئی بڑا فرق پیدا نہ ہوگا، اس لیے کہ قابل برآمد پیداوار کی زاید مقدار ملک کی مجموعی غذائی ضرورتوں کے مقابلے میں بہت ہی حقیر ہے۔ علاوہ ازیں ہندوستان میں ایسا بہت ہی شاذ ہوتا ہے کہ تمام ملک میں ہر جگہ ایک ہی زمانے میں خشک سالی یا قلت باراں رونما ہو۔ اور قلت و خشک سالی کے زمانے میں صرف یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسد ایک ایسے مقام سے جہاں مقابلۃً افراط ہو قحط زدہ مقام کو بعجلت منتقل کی جائے۔ چنانچہ حکومت کا یہ فخریہ دعویٰ نہایت حق بجانب ہے کہ اس کا بنایا ہوا "قحط کی امداد اور رسد" کا طریق جو چھپکے ہیں نہایت عمدہ اور قابل تعریف کام کر رہا ہے۔ لہٰذا اس بات پر زور نہیں دیا جا سکتا کہ زاید مقدار کی برآمد کو روک کر قحط کے امدادی کام میں لگانے سے قحط کی مصیبت کو دور کرنے کے لئے جو زائد امداد دی جا سکتی ہے اس کی کسی بھی مفہوم میں شدید ضرورت ہے۔

اس لحاظ سے گو ہمیں ان معمولی دلائل سے اتفاق نہیں ہے جو اجناس خوردنی کی بے روک ٹوک برآمد کے حق میں پیش کیے جاتے ہیں، پھر بھی ہم اس امر سے مطمئن نہیں ہیں کہ بندش کی پالیسی مناسب ہوگی۔ ہم اوپر اس امر کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ برآمد کی مقدار مجموعی پیداوار کے قلیل جزو کی نمایندگی کرتی ہے۔ اس طرح اگر اسے ملک میں پوری طرح روک بھی لیا جائے تو بھی، اس کا جو اثر اجناس خوردنی کی قیمتوں پر عام طور پر پڑے گا وہ بہت ہی ادنیٰ ہوگا، اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ کہ یہ ادنیٰ نفع کسانوں کے نقصان سے حاصل ہوگا۔ چنانچہ اندازہ کیا گیا ہے کہ بندش کی پالیسی کے تحت محض گیہوں کی حد تک ان کا نقصان سولہ کروڑ روپے ہوگا۔[1] ایک اور چھوٹی سی بات جس کی طرف کمیشن نے اشارہ کیا ہے یہ ہے کہ زیر بحث پالیسی زرعی اصلاح و ترقی پر مضر اثر ڈالے گی۔ اعلیٰ قیمتیں بہ نسبت کسی دوسری جماعت سے زیادہ خوشحال کسانوں کو فایدہ پہنچاتی ہیں۔ اور چونکہ یہی طبقہ ضروری اصل اور معلومات رکھتا ہے، اس لیے اسی سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اصلاح و ترقی عمل میں لائے گا۔ ادنیٰ قیمتیں، اس طبقے کی خوشحالی میں کمی کر دیں گی

[1] دیکھو مالی کمیشن کی رپورٹ صفحہ ۴۱۱؛ نیز دیکھو کتاب مذکور صفحہ ۴۱۵۔

باب ۵

اور اس طرح اس میں اس حیثیت سے کام کو انجام دینے کی صلاحیت کو گھٹا دیں گی۔ گو اس استدلال کے بارے میں مبالغہ کرنا آسان ہے لیکن یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ وہ بجائے خود معقول ہے۔ اجناس خوردنی کو ارزاں بنانے کا واحد اطمینان بخش طریقہ یہ ہے کہ زراعت کی کارکردگی بڑھائی جائے اور اجناس خوردنی کی پیدائش کو فروغ اور ترقی دی جائے؛ اگرچہ یہ بھی کہہ دینا ضروری ہے کہ سردست قیمتوں میں کمی کرنا اس قدر ضروری نہیں ہے جس قدر کہ اضافہ کرنا۔ رہا عوام کی قوت خرید کو بڑھانا جس کی بنا پر وہ کافی غذا حاصل کرنے کے ذرایع پر قابو پا سکیں تو یہ ہمیشہ سرکاری پالیسی کا نہایت ہی قابل قدر نصب العین رہے گا۔

200

گو ہم اس بات کے حامی نہیں ہیں کہ معمولی زمانے میں اجناس خوردنی کی برآمد پر بندشیں عاید کی جائیں، پھر بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ایسے غیر معمولی حالات کا پیدا ہونا ممکن ہے جن کی بنا پر بھاری محصول برآمد کا عائد کرنا ضروری ہو جائے چنانچہ ممکن ہے کہ کسی مقام پر بہت ہی شدید قلت رونما ہو یا کسی دوسرے مقام پر قلت کی وجہ سے ہندوستانی پیداوار کی طلب بہت قوی ہو جائے جیسا کہ جنگ عظیم کے زمانے میں ہوا، اور اس کے باعث یہ خطرہ رونما ہو کہ قیمتیں اتنی بلندی پر چڑھ جائیں جہاں ان کا رہنا نامناسب وغیرہ محفوظ ہے۔ سرکاری مداخلت کی صورت میں انتظامی اور دوسری قسم کی دشواریاں پیش آ سکتی ہیں، جیسا کہ جنگ عظیم کے زمانے میں ہوا کہ قیمتوں کو قابو میں رکھنے کی تدابیر کے باعث متعدد دشواریاں پیش آئیں، لیکن ان کے باوجود حکومت کے لیے مداخلتی کارروائی کرنا نہ صرف صورت حال کی اصلاح کی خاطر ضروری ہو سکتا ہے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ رائے عامہ مقامی تدابیر اختیار کرنے کا مطالبہ کرے۔ یہ صحیح ہے کہ مقامی قلت کے باعث ہندوستان میں قیمتوں کا اضافہ، بیرونی عالمی بازاروں میں اشیا کی برآمد کو خودبخود کم کر دے گا، لیکن قبل اس کے کہ برآمد میں مطلوبہ حد تک کمی واقع ہو یہ بھی ممکن ہے کہ کثیر مقدار برآمد ہو چکی ہو۔ لہٰذا اگر مقصد یہ ہو کہ اس مقدار کو ملک سے باہر جانے نہ دیا جائے اور اضافۂ قیمت کو روکا جائے تو حکومت کو اس بات کا انتظار کرنے کی بجائے کہ واقعات خودبخود اصلاح پا جائیں گے اسی وقت فی الفور کارروائی کرنی چاہئے

باب ۲

جبکہ اُسے خطرہ محسوس ہو۔[1]

اشیائے خام کی برآمد پر بندشیں

اشیائے خام کی برآمد کے بارے میں ان سب امور کا اعادہ غیر ضروری ہے جو "حقیقی زائد مقدار" کی اصطلاح کی تشریح کے سلسلے میں پیش کئے گئے تھے۔

صنعت میں اشیائے خام کے طور پر کام آنے والی زرعی پیداوار کی آزاد اور بے روک برآمد کے خلاف بہت سے دلائل پیش کیے گئے ہیں۔ اولاً یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ چونکہ کپاس، سن اور روغندار تخم جیسی غیر غذائی تجارتی پیداوار کی برآمد سے اعلیٰ قیمت وصول ہوتی ہے، اس لیے غذائی پیداوار کے بجائے غیر غذائی پیداوار بوئی جارہی ہے، اس کی کاشت کے لیے بہترین زمینوں کو کام میں لایا جارہا ہے اور اجناس کی کاشت ادنیٰ زمینوں پر کی جارہی ہے۔[2] پھر بھی اجناس کی کاشت چھوڑکر تجارتی فصلوں کی کاشت کرنے کے باوجود تجارتی پیداوار کے زیر کاشت مجموعی رقبہ، اجناس کے زیر کاشت مجموعی رقبے کے مقابلے میں بہت ہی چھوٹا ہے۔[3]

201

یہ بلا شبہ صحیح ہے کہ غیر غذائی فصلوں کی کاشت کا رقبہ بتدریج اور یقینی طور پر بڑھ رہا ہے اور اس کی وجہ سے اجناس کا زیر کاشت رقبہ کم ہورہا ہے، لیکن مجموعی پیداوار کی مدتک ان دونوں میں جو فرق وعدم مساوات ہے وہ سردست اجناس کی پیداوار کے بہت زیادہ موافق ہے، اور تجارتی پیداوار کے بڑھنے کے باعث اشیائے خوردنی کی رسد میں کمی اس قدر بعید از امکان ہے کہ فکر و پریشانی

[1] "قلت وقحط کے زمانے میں برآمد کو ممنوع قرار دینے کی پالیسی جس پر ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۰ء میں عمل کیا گیا فائدہ رساں ہوتی ہے۔ لیکن موجودہ زمانے میں اندرون ملک کی قیمتوں میں اضافہ ہونے کی صورت میں بھی برآمد پر کوئی روک قائم نہیں کی جاتی اس لیے کہ مالی حیثیت سے پیدا کنندے (کسان) سوداگروں سے اور سوداگر برآمد کرنے والوں سے وابستہ ہوتے ہیں۔" دیکھو آنس ٹے کی تصنیف محولہ بالا صفحہ ۱۷۔

[2] دیکھو کے۔ ال۔ دت کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۶۴ تا صفحہ ۶۶۔

[3] دیکھو جدول مندرجہ صفحہ ۲۵۲۔

کی کوئی فوری وجہ نہیں ہے۔ ہماری دانست میں ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے کہ قوم کے غذائی ذرایع کو محفوظ کرنے کی غرض سے کوئی خاص تدابیر اختیار کی جائیں اور تجارتی فصلوں کی پیدائش اور برآمد کی روک تھام کی جائے۔ ہمیں اس واقعے کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ تجارتی اشیا کی پیدائش سے ان کسانوں کو معقول منافعہ وصول ہوتا ہے جو اس میں کام کرتے ہیں، چنانچہ ایسی صورت میں جبکہ کسان کو اچھا خاصہ منافعہ وصول ہورہا ہو اس کی آزادی میں مداخلت کرنے کی سردست ہمارے لیے کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔

اشیائے خام کی آزاد برآمد کے بارے میں ایک اور اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ایسی پالسی کی وجہ سے صنعت میں بطور اشیائے خام کام آنے والی اہم پیداوار مثلاً کپاس، سن، اور روغندار تخم کی قیمت ہندوستانی صناعوں کے لیے اتنی بڑھ جاتی ہے کہ وہ غیر ملکی حریفوں کے مقابلے میں اپنی حیثیت قائم رکھنے کے قابل نہیں رہتے۔ اگر ان کی برآمد پر بندشیں عاید کی جائیں تو ہندوستانی صناع ارزاں اشیائے خام سے فایدہ اٹھا سکتا ہے اور یہ سہولت غیر ملکی صناع کو حاصل نہ ہوگی۔ گو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ نوخیز دیسی صنعتوں کی تامین کرنا ضروری ہے تاہم اشیائے خام کی قیمتوں کو مصنوعی طریقے پر کم کرکے اس مقصد کو موثر طور سے حاصل کرنا ہمیں مشتبہ معلوم ہوتا ہے؛ اس لیے کہ مصنوعات کی مجموعی قیمت کے مقابلے میں اشیائے خام کی مجموعی قیمت کا تناسب بہت ہی کم ہے۔ ضروری تامین کا اس سے زیادہ موثر طریقہ یہ ہوگا کہ مالی امداد دی جائے اور تامینی محصول درآمد عاید کیا جائے۔

تیسرا استدلال یہ ہے کہ کپاس، سن وغیرہ کی فصلوں کی مسلسل کاشت کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زمین پر بار پڑے گا اور اس کی قوت بتدریج سلب ہو جائے گی۔ اس سلسلے میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ روغندار تخموں اور کھلی کی کثیر مقدار میں برآمد خاص طور پر قابل اعتراض ہے۔ زمین کی زرخیزی میں اس لیے انحطاط پیدا ہو جاتا ہے کہ جو چیز اس سے خارج ہو جاتی ہے وہ اس کو واپس نہیں ملتی۔ زمین کی کمزوری کو روکنے کی غرض سے یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ روغندار تخموں پر تامینی محصول برآمد اور کھلی، ہڈی اور مچھلی کے کھاد کی برآمد پر بھاری محصول عاید کیا جائے۔ ضمناً

باب ۶

202

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ روغندار تخموں کے محصول کی تائید اس بنیاد پر بھی کی جاتی ہے کہ اس کی بدولت مقامی روغن برآری کی صنعت کو بھی ترقی ہوگی۔ رہا زمین کی کمزوری کا معاملہ تو یہ امر بحث طلب ہے کہ آیا در اصل ایسا ہو رہا ہے یا نہیں[1]۔ لیکن اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ زمین کی قوت میں روز افزوں کمی واقع نہیں ہو رہی ہے تو بھی اس میں کلام نہیں ہوسکتا کہ موجودہ حالات میں جتنا کھاد اس کو دیا جا رہا ہے اس سے زیادہ مقدار میں دینے سے زمین کو بہت فایدہ پہنچے گا۔ غرض اس نقطۂ نظر سے یہ سفارش کی جا سکتی ہے کہ روغندار تخموں اور کھلی پر معتدل قسم کا محصول برآمد عاید کیا جائے، اور اس محصول کے ماحصل کے ایک جزو کو ضروری پروپگنڈا کے کام کے لیے الگ رکھا جائے تاکہ اس قسم کے کھاد کا روز افزوں استعمال یقینی ہو جائے۔ اس سے یہ توقع ہوسکتی ہے کہ کھاد کی قیمت میں اس حد تک کمی ہو جائے گی کہ اس پر غیر مستطیع کسان کو آسانی دسترس حاصل ہو اور اسی کے ساتھ روغندار تخم بونے والے کو بھی کوئی شدید معاشی ضرر نہ پہنچے۔ زرعی کمیشن، مالی کمیشن کی اس رائے کی حمایت کرتا ہے کہ روغندار تخموں یا کھلی پر محصول برآمد عاید کرنا یا ان اشیا کی برآمد کو سرا سر ممنوع قرار دینا حق بجانب نہیں ہوسکتا[2]۔ چنانچہ زرعی کمیشن نے یہ استدلال کیا ہے کہ محصول برآمد کا بار تخم بونے والے کسانوں پر پڑے گا، اس لیے کہ ہندوستان ہی روغندار تخم پیدا کرنے والا دنیا کا سب سے بڑا ملک نہیں ہے؛ اور یہ محصول کسان کو روغندار تخموں اور کھلی کے خریدار کی حیثیت سے جتنا نفع پہنچائے گا۔ اس سے زیادہ اس کو بونے والے کی حیثیت سے نقصان پہنچائے گا۔ چونکہ روغندار تخموں کی کاشت ہندوستان میں بہت بڑے رقبے پر ہوتی ہے اور ان تخموں میں نائٹروجن بھی ملی ہوئی ہوتی ہے، اس لیے کمیشن کی رائے ہے کہ

---

[1] ۔ دیکھیو فصل ۱۲ اسی باب میں۔

[2] ۔ لیکن زرعی بورڈ نے ۱۹۱۹ء میں اور محصول کی تحقیقاتی کمیشن کی اکثریت نے محصول برآمد کی حمایت کی تھی۔

نائٹروجن کی کافی بڑی رسد سہولت کے ساتھ حاصل کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ روغن برآری کی صنعت کو ترقی دی جائے۔ گو ہندوستان میں تیل کی مانگ ناکافی ہونے کی وجہ سے اور غیر ملکی بازاروں میں اہل یورپ کی سخت مسابقت کے باعث یہ کام مشکل ہے؛ پھر بھی ہندوستان میں اس صنعت کے امکانات کی احتیاط کے ساتھ تحقیق سود مند ہوگی۔[1]

۱۱۔ پیداوار کی کمی اور اس کے اسباب۔

گو ہندوستان میں زراعت ہی واحد قومی صنعت ہے، تاہم اس کو انتہائی غیر اطمینان بخش طریقے پر چلایا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مختلف فصلوں کی پیداوار فی ایکڑ ان ملکوں کے مقابلے میں بہت کم ہے جہاں زراعت بدرجہا بہتر طریق پر منظم ہے۔ چنانچہ اس واقعے کی تشریح کے طور پر مندرجۂ ذیل جدول (۱) میں یہ بتلایا گیا ہے کہ ۱۹۱۸ء تا ۱۹۱۹ء، ۱۹۲۳ء تا ۱۹۲۴ء اور ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں ہندوستان کی اہم فصلوں کی اوسط پیداوار فی ایکڑ کیا تھی اور جدول (۲) میں یہ بتلایا گیا ہے کہ ۱۹۲۲ء میں ہندوستان اور دوسرے ممالک کی پیداوار فی ایکڑ کیا تھی۔[2]

جدول (۱)

پیداوار	۱۹۱۸ء تا ۱۹۱۹ء (پاؤنڈ)	۱۹۲۳ء تا ۱۹۲۴ء (پاؤنڈ)	۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء (پاؤنڈ)	پیداوار	۱۹۱۸ء تا ۱۹۱۹ء (پاؤنڈ)	۱۹۲۳ء تا ۱۹۲۴ء (پاؤنڈ)	۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء پاؤنڈ
صاف کیا ہوا چاول	۷۰۱	۷۹۸	۸۳۴	السی	۲۶۵	۲۷۸	۲۶۱

[1] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ فقرہ (۸۷)۔

[2] دیکھو ایک کتاب موسوم بہ "ہندوستان میں اہم فصلوں کی پیداوار اور رقبے کا اندازہ برائے ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء صفحہ و تا صفحہ ۱۱ اور ریاستہائے متحدۂ امریکہ کے محکمۂ زراعت کا زرعی سالنامہ" برائے ۱۹۲۳ء۔

باب ۶

سلسلہ جدول (۱)

پیداوار	سنہ ۱۹۱۸ء تا سنہ ۱۹۱۹ء (پاؤنڈ)	سنہ ۱۹۲۳ء تا سنہ ۱۹۲۴ء (پاؤنڈ)	سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء (پاؤنڈ)	پیداوار	سنہ ۱۹۱۸ء تا سنہ ۱۹۱۹ء (پاؤنڈ)	سنہ ۱۹۲۳ء تا سنہ ۱۹۲۴ء	سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء
گیہوں...	۷۰۷	۶۹۴	۵۸۱	سرسوں، درائی	۳۰۱	۴۱۶	۳۵۳
نیشکر....	۱۸۹۷	۲۵۴۴	۳۴۵۰	تل	۱۷۴	۱۹۲	۱۹۳
چائے....	۵۶۱	۵۲۸	۴۷۰	مونگ پھلی	۹۹۷	۸۶۷	۹۲۲
کپاس (اعلیٰ جنس)	۷۶	۸۷	۸۴	تخم ارنڈ	×	۲۰۷	۲۰۹
سن....	۱۱۹۵ (سنہ ۱۹۱۸ء)	۱۱۶۴ (سنہ ۱۹۲۴ء)	۱۲۹۲ (سنہ ۱۹۳۴ء)	ربڑ	۱۱۵ (سنہ ۱۹۱۹ء)	۱۲۱ (سنہ ۱۹۲۴ء)	۱۴۱ (سنہ ۱۹۳۰ء)
کافی....	۱۸۳ سنہ ۱۹۱۴ء تا سنہ ۱۹۲۰ء	۱۳۹	۱۸۴ سنہ ۱۹۳۲ء تا سنہ ۱۹۳۳ء				

جدول (۲)

ملک	گیہوں بشل ۶۰ پاؤنڈ	غلہ بشل ۵۶ پاؤنڈ	جو بشل ۴۸ پاؤنڈ	چاول (پاؤنڈ)	کپاس (پاؤنڈ)	تمباکو (پاؤنڈ)
کینیڈا ...	۱۷٫۸	۳۴٫۴	۲۷٫۶	۰	۰	۰
ریاستہائے متحدۂ امریکہ	۱۳٫۹	۲۸٫۳	۲۴٫۹	۱۰۹٫۰	۱۴۱٫۰	۷۳۵٫۲
انگلستان	۳۱٫۲	۰	۳۱٫۰	۰	۰	۰
ڈنمارک	۳۹٫۰	۰	۴۵٫۶	۰	۰	۰
فرانس	۱۸٫۶	۱۶٫۰	۲۳٫۹	۰	۰	۱۴۲۶٫۱
اٹلی	۱۴٫۱	۲۰٫۲	۱۴٫۳	۲۱۵۱	۰	۹۱۷٫۹
جرمنی	۲۰٫۵	۰	۲۵٫۷	۰	۰	۲۶۳۹٫۲ (سنہ ۱۹۲۱ء)
مصر	۲۴٫۱	۳۶٫۳	۳۰٫۱	۱۴۵۶ (سنہ ۱۹۲۱ء)	۲۹۹٫۰ / ۳۵۴٫۰ (۱۹۲۳ تا ۱۹۲۴)	×

باب

سلسلہ جدول (۲)

ملک	گیہوں بشل ۶۰ پاؤنڈ	غلہ بشل ۵۶ پاؤنڈ	جو بشل ۴۸ پاؤنڈ	چاول (پاؤنڈ)	کپاس (پاؤنڈ)	تمباکو (پاؤنڈ)
ہندوستان	۱۳٫۰	۱۵٫۶	۱۹٫۸	۹۱۱	۹۸٫۰	x
جاپان	۲۲٫۵	۲۷٫۷ (سنہ ۱۹۲۱)	۳۱٫۷	۲۴۷۷	x	x
آسٹریلیا	۱۱٫۳	۲۵٫۷	۲۱٫۳ (سنہ ۱۹۲۱)	x	x	x

ہندوستانی کھیتوں کی ادنیٰ پیدآوری کا ذکر کرتے ہوئے سر ایم، دس ویسوریا لکھتے ہیں کہ "زمانۂ قبل از جنگ کی معمولی بنیاد پر برطانوی ہند کی اوسط پیداوار، بشمول ان فصلوں کے جن کے زیر کاشت خطوں کی آبپاشی کی جاتی ہے، پچیس روپے فی ایکڑ سے زیادہ قیمت کی نہیں ہوسکتی؛ لیکن جاپان میں ایک ایکڑ کی پیداوار کی قیمت ڈیڑھ سو روپے سے کم نہیں ہوسکتی"[ت]

204

ہندوستان میں ادنیٰ پیدآوری کے اسباب میں سے ایک سبب بارش کی غیر معین نوعیت ہے۔ بارش کی قلت اور غیر ہموار

ت۔ دیکھو سر ایم وس ویسوریا کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۱۷۴۔

باب ۶

تقسیم کے قطع نظر دوسرے اسباب بھی ہیں مثلاً سیلاب، ژالہ باری، کہر اور دوسرے موسمی تغیرات و اختلافات جو پیداوار پر مضر اثر ڈالتے ہیں قلت باراں کی اصلاح ایک حد تک آبپاشی سے ہو جاتی ہے، لیکن دوسری مصیبتوں کو انسانی تدبیر سے پوری طرح رفع نہیں کیا جا سکتا۔ جنگلی جانور، ہو ہے، ٹڈے اور دوسرے کیڑے بھی بہت نقصان پہنچاتے ہیں، اور مختلف محکمہ جات زراعت نے ان سے بچاؤ کی تدابیر نکالنے اور ان کو عوام میں مقبول بنانے کی جانب کامیابی کے ساتھ توجہ کی ہے۔

پیداوار کی کمی کی ایک اور وجہ غیر موثر کاشت اور آلات کے بارے میں کاشتکار کی بے سروسامانی ہے۔ اس سلسلے میں جو مسائل رونما ہوتے ہیں ان پر نیز زمین کی انتہائی تقسیم در تقسیم اور انتشار اراضی پر جس سے کھیتی باڑی میں فضول خرچی بڑھتی ہے بتعاقب بحث کی جائے گی۔

۱۲۔ کیا ہندوستان میں زمین بتدریج کمزور ہو رہی ہے؟

وثوق کے ساتھ یہ بات کہی گئی ہے کہ چند سالوں سے ہندوستان میں غذائی اجناس کی اوسط پیداوار فی ایکڑ کم ہو گئی ہے اور ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ حقیقت میں ایسا ہی ہے تو بھی اس کو زمین کی کمزوری کا بین و قطعی ثبوت نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ غذائی اجناس کی کاشت ادنیٰ زمینوں پر کی جاتی ہو، اور کپاس سن اور روغندار تخموں وغیرہ جیسی تجارتی پیداوار کی کاشت کے لیے بہتر قسم کی زمینیں محفوظ رکھی جاتی ہوں۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ نہ صرف غذائی اجناس بلکہ دوسری اشیا کی اوسط پیداوار فی ایکڑ زمین کی تدریجی کمزوری کے باعث گھٹ گئی ہے اور ممکن ہے کہ اس خیال کا باعث کسی حد تک یہ واقعہ ہو کہ زرعی پیداوار کی طلب کے اضافے کے ساتھ ساتھ، کاشت میں توسیع عمل میں آئی یہاں تک کہ ادنیٰ ترین زرخیزی والی اور غیر نفع بخش زمینیں بھی اس کے زیر کاشت آ گئیں۔ اس کا نتیجہ فطری طور پر یہی ہوگا کہ اوسط پیداوار فی ایکڑ کم ہو جائے گی۔ اس بارے میں کاشتکار کا اندازہ اس وجہ سے

غلط ہو سکتا ہے کیونکہ وہ اس کی بنیاد ایسے زمانے کی یاد پر قائم کرتا ہے جبکہ صرف بہتر قسم کی زمینیں زیر کاشت تھیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آبادی کی زیادتی کے باعث ابتدائی طور پر غیر مزروعہ افتادہ رقبوں میں کمی ہو گئی ہو اور اس کے نتیجے کے طور پر نہ صرف بے مزائی زمین میں بلکہ کھاد کی موجود رسد کی کم مقدار پائے ہوئے مزروعہ رقبہ میں اضافہ ہو گیا ہو اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہو کہ زمین کمزور اور خراب ہو گئی ہو۔[1]

ان امور سے قطع نظر کرتے ہوئے ماہروں کی رائے بظاہر اس نظریے کے خلاف ہے کہ دور حاضر میں ہندوستان کی زمین ہر سال زیادہ سے زیادہ کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر کلاوسٹن جو اُس وقت حکومت ہند کے زرعی مشیر تھے، اپنی تحریری یادداشت میں جو انھوں نے زرعی کمیشن کے سامنے پیش کی، کہتے ہیں کہ "ہندوستان کے اکثر خطہ ہائے زمین لازمی طور پر صدہا سال پیشتر ہی انتہائی کمزوری اور ادنیٰ زرخیزی کی حالت پر پہنچ چکے ہوں گے اور اگر ان پر آئندہ اور صدہا سال تک کھاد کے بغیر فصلیں بوئی جائیں تو ان کی کمزوری میں مزید اضافہ نہ ہوگا۔ کسی اوسط درجے کی فصل میں تقریباً بیس پونڈ نائٹروجن فی ایکڑ صرف ہوتی ہے۔ لیکن اس نقصان کی تلافی سال بہ سال ہو جاتی ہے، اس لیے کہ زمین مطلوبہ نائٹروجن ہوا سے اور ان گلی سڑی جڑوں سے حاصل کر لیتی ہے جو فصل کی کٹائی کے بعد زمین کے اندر رہ جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ کہ اکثر خطے نائٹروجن کی حد تک کمزور نہیں ہیں۔ روتھم اسٹیڈ میں جو دنیا کا سب سے بڑا زرعی تحقیقاتی مرکز ہے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو گئی ہے کہ وہاں کی زمین میں انتہائی ضعف اس وقت تک پیدا نہیں ہوا جب تک کہ اس پر مسلسل چالیس سال تک گیہوں کی کاشت نہیں کی گئی؛ لیکن اس مدت کے بعد بھی اور اس امر کے باوجود کہ کھیت کو کسی قسم کا کھاد نہیں دیا گیا سالانہ پیداوار تقریباً ایک حالت پر ساکن رہی۔ اس لحاظ سے ہم تسلیم کر سکتے ہیں کہ ہندوستان میں ایک محدود رقبہ ایسا ہے جس کی زمینوں میں

205

[1] - زرعی کمیشن کی رپورٹ، پیراگراف (۷۷)۔

فاسفیٹ کی قلت ہے، لیکن اس کے سوا جو قدیم مزروعہ زمین ہے وہ مدت ہوئی کہ انتہائی ضعف کی حالت کو پہنچ چکی ہے؛ یہ کہ اب پیداوار کی زیادتی کا دارومدار بالکل معیار کاشت اور کھاد کی نوعیت پر ہے؛ اور یہ کہ صرف نئی زمین یا زمینوں میں جن میں فاسفیٹ کی کمی ہے کاشت کی وجہ سے ضعف پیدا ہو رہا ہے[1]۔ ڈاکٹر ووئلکر نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ جہاں تک عام ہندوستانی زمینوں کا تعلق ہے وہاں تک تخموں، کپاس اور دوسری پیداوار کی برآمد کے باعث زمین کے اجزائے ترکیبی خارج ہو جانے کے بعد اس کو واپس نہیں ملتے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ زمین مسلسل کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن ڈاکٹر موصوف نے بھی اس خیال کو مشروط طریقے پر ظاہر کیا، چنانچہ وہ اس واقعے کی جانب توجہ منعطف کرتے ہیں کہ ہندوستان میں ہر سال جو فصلیں بوئی جاتی ہیں ان کا بیشتر حصہ اور درخت اور خود رو پودے بھی غذا کے محتاج ہیں اور اپنے لیے نائٹروجن ہوا سے لیتے ہیں[2]۔ کے' ال' دت جملہ ممکنہ شہادت کو جانچنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ "اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کوئی اعدادی شہادت نہیں ہے کہ ہندوستان کے کسی حصے میں زرعی زمین کی زرخیزی میں کوئی تغیر واقع ہوا ہے، خواہ ہم زیر تحقیقات زمانہ سنہ ۱۹۰۵ء تا سنہ ۱۹۱۲ء لیں یا اس سے بھی زیادہ کوئی طویل زمانہ[3]۔"

خوش قسمتی سے اس انتہائی فنی معاملے پر کوئی قطعی رائے قایم کرنا ہمارے لیے ضروری نہیں ہے۔ ہمارے نقطۂ نظر سے اہم ترین واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی زمین کی پیداآوری دراصل ادنیٰ ہے۔ یہ بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ ہندوستان میں زمین کی پیداآوری کی اصلاح و ترقی نہایت اہم ہے، نیز یہ بھی کہ پیداوار کی اصلاح و ترقی کا واحد طریقہ یہ ہے کہ زمین کی اچھی طرح خبرگیری کی جائے اور کافی مقدار میں کھاد دیا جائے۔ محض اس بات کا یقین دلا دینے سے طمانیت و تسکین نہیں ہو سکتی کہ

---

[1] دیکھو روئداد شہادت متعلقہ زرعی کمیشن رپورٹ جلد اول جزو اول، صفحہ ۳۲۔

[2] دیکھو دت کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۱۷۔

[3] دیکھو دت کی تصنیف صفحہ ۲۸۔

باب ۶

ایک سکونی حالت قایم ہوگئی ہے اور زمین میں ضعف اس لیے نہیں پیدا ہو سکتا کہ وہ کمزوری کی حالت پر بہت پہلے ہی پہنچ چکی ہے۔ اس کے معنی بہرصورت یہ ہیں کہ حالات اس قدر خراب ہو چکے ہیں کہ ان کے اب بد سے بدتر ہونے کا امکان نہیں پایا جاتا۔ اس کے برخلاف تلافی اور صورت حال کی اصلاح کرنے کی غرض سے جدوجہد کرنے کی قوی وجہ ہمارے لیے ہمیشہ کی طرح موجود ہے۔ اس سلسلے میں زرعی کمیشن اس بات پر زور دیتا ہے کہ کھیتوں اور زمین کے حالات کے بارے میں تحقیقاتی کام انجام دینا ضروری ہے اور یہ سفارش کرتا ہے کہ محکمۂ جات زراعت میں محققوں اور ماہروں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے اور خاصکر جراثیمی طبعی اور نباتی تحقیقات کی غرض سے فن داں افسروں کا تقرر کیا جائے[1]۔

206

---

[1] دیکھو زرعی کمیشن کی رپوٹ پیراگراف (۸۸)۔

207

باب ۷

زراعت

زمین اور اُس کے مسائل

اس باب میں ہم زمین کے متعلق اہم مسائل پر حسب ذیل عنوانات کے تحت بحث کریں گے۔

(۱) تقسیم و انتشار اراضی؛ (۲) مستقل اصلاح و ترقی؛ اور (۳) آبپاشی[1]

تقسیم و انتشار اراضی

۱۔ متوازن کھیت کا تخیل۔ ہندوستان کی زرعی پسماندگی اور کسان کے افلاس کے جو متعدد اسباب ذمہ دار ہیں ان کے منجملہ ایک سبب زمین کی غیر محدود تقسیم

[1] ۔ حقیت اراضی کے اہم موضوع پر کسی متعاقب باب میں علٰحدہ بحث کی گئی ہے۔

باب

اور اس کا انتشار ہے۔ صنعت و حرفت کی طرح زراعت میں بھی پیدائش کا ایک مقررہ پیمانہ ہوتا ہے جس سے پیداکنندے کے نقطۂ نظر سے بہترین نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ اگر ایک مقررہ حد کے بعد پیدائش کے پیمانے میں مزید تخفیف کی جائے تو اس کی وجہ سے مصارف اور پیداوار کا تناسب بتدریج زیادہ سے زیادہ ناموافق ہوتا جائے گا، یہاں تک کہ منافعہ بالکل غائب ہو جائے گا۔ بے شبہ ایسا مقام بھی ہوتا ہے جس سے تجاوز کر کے کھیت کی وسعت میں اضافہ کرنا منفعت بخش نہیں ہوتا؛ لیکن اس کل بحث کے دوران میں جسے ہم عنقریب شروع کریں گے اس امکان کو یہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے گا کہ ہندوستان کی حد تک یہ کوئی عملی اہمیت نہیں رکھتا۔

۲۔ کاشت کی اکائی اور ملکیت کی اکائی

جس وقت ہم مناسب وسعت کے کھیت کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں لازمی طور پر زمین کا وہ رقبہ نہیں ہوتا جو زیر ملکیت ہو بلکہ دراصل کاشت کی اکائی ہوتی ہے؛ اگرچہ ہندوستان کے رعیت واری علاقوں میں ان دونوں میں بیشتر یکسانیت ہوتی ہے۔ ...ل کا قول ہے کہ "محض اس بنیاد پر کہ ملکی جائداد چھوٹے اجزا میں تقسیم ہے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ کھیتوں کی بھی یہی حالت ہوگی۔ جس طرح یہ ممکن ہے کہ بڑی جائدادوں کے ساتھ چھوٹے کھیت موجود ہوں اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ چھوٹی جائدادوں کے ساتھ بڑے کھیت موجود ہوں؛ اور قبضے یا دخیلکاری کی ذیلی تقسیم، ملکی کسانوں کی تعداد کی بنا و اجب کثرت کا کبھی ناگزیر نتیجہ نہیں ہے۔" لیکن یہ صرف اس وقت ممکن ہے جبکہ ارث تقسیم نہ کی جائے۔ یا جیسا کہ نکلسن بیان کرتا ہے "بڑی جائدادوں کا مطلب لازمی طور پر یہ نہیں ہے کہ کاشت وسیع پیمانے پر ہو اور نہ وسیع نظام ملکیت کے معنی لازمی طور پر یہ ہیں کہ کاشت چھوٹے پیمانے پر ہو۔ ممکن ہے کہ بڑی جائداد چھوٹے چھوٹے اجزا اور کھیتوں میں لگان یا پٹے پر دی جائے، اور کوئی بڑا کاشتکار پٹے کی زمین مختلف مالکوں سے حاصل کرے"[1]۔

اگر کسان کا ذاتی کھیت اتنا چھوٹا ہو کہ اس پر کفایت کے ساتھ کاشت نہ کی جا سکتی ہو تو اس کمی کو دوسرے اشخاص سے زاید زمین پٹے پر لے کر

[1]۔ دیکھو نکلسن کی تصنیف محولۂ بالا جلد اول صفحہ ۱۴۹۔

باب 208

پورا کیا جا سکتا ہے[1]۔ چنانچہ ہندوستان میں ایک حد تک ایسا ہی ہوتا ہے اور اسی لیے کھیتوں کی وسعت اور اُس کے معاشی نتائج کے متعلق اعداد و شمار کی تشریح کرنے میں ہمیں اس کی رعایت محفوظ رکھنی چاہیئے۔ ہمیں ایسی حالتوں کا بھی لحاظ کرنا چاہیے جن میں کاشت مشترک طور پر ہوتی ہے' ہمیں بلا تحقیق براہ راست یہ فرض کر لینے کا کوئی حق نہیں ہے کہ ہر خطۂ زمین جو جدا جدا افراد کی ملک ہے اُس پر کاشت بھی جدا جدا افراد کرتے ہیں۔ گو ممکن ہے کہ اس قسم کا مفروضہ عام طور پر صحیح ہو' لیکن ہمیشہ ایسا ہی نہیں ہوتا۔

ایک اور واقعہ جس سے تقسیم اراضی قریب قریب ہر صورت میں ہندوستان میں منسوب کی جاتی ہے زمین کا منتشر خطوں میں پھیلا ہوا ہونا ہے۔ یہی نہیں کہ کھیت حد سے زیادہ چھوٹا ہوتا ہے بلکہ متعدد حصوں میں منتشر ہوتا ہے اور ایک حصہ دوسرے سے تکلیف دِہ فاصلے پر واقع ہوتا ہے۔

زرعی کمیشن نے تقسیم اراضی اور کھیتوں کے انتشار کے مسئلے پر مندرجۂ ذیل چار عنوانوں کے تحت بحث کی ہے :۔ (۱) حقوق داروں کے کھیتوں کی ذیلی تقسیم؛ (۲) کسانوں کے کھیتوں کی ذیلی تقسیم؛ (۳) حقوق داروں کے کھیتوں کا انتشار؛ اور (۴) کسانوں کے کھیتوں کا انتشار۔ "حقوق داروں" کی اصطلاح اُن اشخاص کی تعریف کے لیے استعمال کی گئی ہے جو کسی نہ کسی قسم کا موروثی حق زمین کے بارے میں رکھتے ہیں' خواہ مالکوں کی حیثیت سے یا دخیلکار کسانوں یا پٹہ داروں کی حیثیت سے؛ اور "کسانوں" کی اصطلاح میں وہ سب اشخاص داخل ہیں جو مذکورۂ بالا حیثیتوں میں سے کسی ایک حیثیت سے زمین پر کاشت کریں یعنی مالکوں یا پٹہ داروں کی حیثیت سے یا دخیلکار کسانوں یا اسامی غیر دخیلکار یا مستاجر کی حیثیت سے؛ لیکن ایسا کسان جس کو اجرت دی جائے اس تعریف میں داخل نہیں[2]۔

اس موضوع کی بحث میں ہمیں اس چیز کے مان لینے میں سہولت معلوم ہوئی

---

[1] ظاہر ہے کہ کسان کو پٹے پر زمین لینے سے جو معاشی فائدہ ہوگا وہ ذاتی زمین کے مقابلے میں کم ہوگا' اس لیے کہ لگان کی مقدار مقررہ مالگزاری سے زیادہ ہوگی۔

[2] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ' پیراگراف (۱۱۰)۔

جو عام طور پر صحیح ہے یعنی یہ کہ حصہ داروں کے کھیت جس طرح ذیلی اور منتشر اجزا میں تقسیم ہیں اسی طرح کاشت کے خطے بھی ذیلی اور منتشر اجزا میں منقسم ہیں۔ چنانچہ ایک کی اصلاح جن تدابیر سے ہوسکتی ہے وہی دوسرے کی بھی بڑی حد تک اصلاح کرسکتے ہیں۔

۴۔ تقسیم اراضی اور انتشار کی خرابیاں

بہت ہی چھوٹے رقبے کے کھیت پر کاشت کرنے سے مختلف طریقوں سے نقصان پہنچتا ہے۔ معمولی کسان کے پاس جو تھوڑا سا ساز و سامان رہتا ہے یعنی ایک جوڑ بیل اور ہل اس سے بھی اس کی انتہائی قوت تک کام نہیں لیا جا سکتا۔ خطے بعض اوقات اس قدر تنگ اور مختصر ہوتے ہیں کہ ہل چلاتے وقت بیلوں کو پلٹانا بھی بمشکل ممکن ہوتا ہے۔ بیلوں کی پرورش اور کسانوں کی ضروریات زندگی کے مصارف وہی مقررہ ہوتے ہیں۔ ان میں اس بنا پر کمی نہیں ہوجاتی کہ اس کا کھیت رقبے میں اس کھیت سے چھوٹا ہے جس پر کاشت کرنے کے لیے اس کا مستقل ساز و سامان مکتفی ہوسکتا ہے۔ دوسری طرف پیداوار کم مقدار میں وصول ہونا یقینی ہے۔ عام طور پر دیکھا جائے تو ایک مقررہ حد کے بعد کھیت کی وسعت کی تخفیف کے ساتھ پیداوار کی قیمت کے مقابلے میں جملہ مستقل مصارف کا تناسب بڑھتا جاتا ہے۔ رہے عارضی اور تغیر پذیر مصارف تو ان میں سے بھی بعض میں خطے کی وسعت اور رقبے کے تغیر کے ٹھیک تناسب سے تغیر نہیں ہوتا۔ مثلاً کھیت کے اطراف جھاڑی اگانے یا احاطہ بندی کرنے کے فی ایکڑ مصارف احاطہ کردہ رقبے کی تخفیف کے ساتھ بڑھتے جاتے ہیں۔ اگر کوئی خطہ بہت زیادہ چھوٹا ہو تو ممکن ہے کہ بھولے بھٹکے جانوروں سے حفاظت کرنے کی غرض سے باڑ لگانے کے مصارف برداشت کرنا سودمند نہ ہو۔ اور مناسب باڑ لگا کر کھیتوں کو محفوظ کرنے کی عدم قابلیت جملہ کسانوں پر کاشت کا یکساں طریقہ عائد کردے گی۔ فصلوں کو آس پاس کے افتادہ خطوں کے بھولے بھٹکے مویشیوں سے نقصان پہنچنے کے امکان کی وجہ سے کوئی نیا کاشت کا طریقہ یا دوہری فصلوں کا طریق ممکن نہیں۔ اگر باڑ لگانے میں زحمت ہو تو چوکی داروں کو ملازم رکھنے میں عام طور پر اور بھی زیادہ زحمت ہوگی۔ ایسی صورت حال حوصلہ مند اور اولوالعزم کاشتکار کے لیے انتہائی طور پر ہمت شکن ہوتی ہے۔ چھوٹے کھیتوں کی بڑی تعداد

میں موجودگی کی وجہ سے ایک نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ بہت بڑا رقبہ بیکار ہو جاتا ہے۔ مثلاً بہت زیادہ جھاڑی اور باڑ لگانی پڑتی اور راستے بنانے پڑتے ہیں' اور اس طریقے سے بحیثیت مجموعی بہت بڑا رقبہ ضایع ہو جاتا ہے۔ انفرادی کھیتوں کی تعداد جتنی کم ہوگی اتنا ہی زیادہ رقبہ کاشت کے لیے دستیاب ہو سکے گا' اور کارآمد زمین کی بچت ہوگی۔ علاوہ ازیں ممکن ہے کہ کسی کھیت میں زیر زمین پانی بکثرت موجود ہو' لیکن اس سے اس لیے فائدہ نہیں اُٹھایا جا سکتا کہ کنواں کھودنے کے معنی یہ ہوں گے کہ کھیت کے انتہائی طور سے چھوٹے رقبے کے مقابلے میں مصارف کا تناسب حد سے بہت بڑھ جائے گا۔ اگر چار یا پانچ ایکڑ زمین ہو تو کنواں کھودنا مفید و مناسب ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر رقبہ صرف ایک ایکڑ یا اس سے بھی کم ہو تو اس میں کنویں کی کندیدگی مناسب نہ ہوگی۔ چھوٹے کاشتکار کے لیے محنت بچانے والے آلات مثلاً ٹریکٹر' کاٹنے کی مشین' غلہ کا بھوسہ نکالنے اور صاف کرنے کی کل وغیرہ کا استعمال کرنا اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ امداد باہمی کی کوئی نہ کوئی شکل یا مشترک سرمایہ یا جدو جہد کی کوئی انجمن نہ ہو۔ لیکن یہ چیزیں آسانی کے ساتھ فراہم نہیں کی جا سکتیں۔ کسی نامناسب طور سے چھوٹے کھیت سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں وہ سب اُس کھیت میں یکجا ہو جاتی ہیں جو چھوٹا ہونے کے علاوہ منتشر بھی ہوتا ہے۔ کھیتوں کے انتشار کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر مان کہتے ہیں کہ "اس میں چھوٹے کھیتوں کی ساری خرابیاں اس لحاظ سے موجود ہوتی ہیں کہ اُن میں کلوں اور محنت بچانے والے آلات کو استعمال نہیں کیا جا سکتا؛ اور دوسری جانب بڑے کھیتوں کی ساری خرابیاں اس لحاظ سے موجود ہوتی ہیں کہ ان میں واقعی عمیق کاشت دستی محنت کے ذریعے سے نہیں کی جا سکتی جیسا کہ چھوٹے کھیت والا سہولت کے ساتھ کر سکتا ہے[1]"۔ اراضی کی تقسیم در تقسیم اور کھیتوں کے انتشار کے باعث باڑ لگانے کی دشواریاں' اُس پاس کے کھیتوں کے بھولے بھٹکے جانوروں اور مویشیوں کے حملے اور مداخلت بیجا سے تحفظ کی دقتیں' اور چوروں کی دستبرد کی مدافعت کی مشکلات' عام طور پر محسوس ہوتی ہیں۔

---

[1] دیکھو ان کی کتاب موسوم بہ "دکنی گاؤں کی محنت اور زمین" جلد اوّل صفحہ ۴۸۔

باب 211

لیکن بعض اور بھی خرابیاں انتشار اراضی کے باعث خاص طور پر رونما ہوتی ہیں۔ اور وہ یہ ہیں کہ ایک یکجائی کھیت کے مقابلے میں اُسی کے مساوی رقبے کے منتشر کھیتوں پر محنت واصل زیادہ صرف ہوتا ہے یعنی مصارف کاشت زیادہ ہوتے ہیں اور پیداوار بھی کمتر وصول ہوتی ہے۔ چنانچہ اندازہ کیا گیا ہے کہ ہر ۵۰۰ میٹر فاصلے کے لیے دستی محنت اور ہل چلائی کے مصارف میں ۳ء۵ فی صد، کھاد کی نقل و حمل کے لیے ۲۰ تا ۳۵ فی صد اور فصلوں کی پیداوار کی نقل و حمل کے لیے ۵ء۲ تا ۲۲ فی صد کا اضافہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کھیتوں کا انتشار ان سب صورتوں میں مصارف بڑھا دیتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ کاشت میں بھی مزاحمت پیدا کرتا ہے اور دیہی سکونتی خطے سے کھیتوں تک اور پھر ایک کھیت سے دوسرے تک جانے میں بہت سا وقت لگتا ہے اور بہت سی محنت اور بہت سی مویشیوں کی قوت ضائع جاتی ہے۔ کھیتوں کے منتشر ہونے کی وجہ سے کسان کے لیے بظاہر یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ موثر کاشت کی غرض سے اپنے کھیت ہی پر مقیم رہے۔ بالعموم یہ بھی ہوتا ہے کہ کسان وقت بچانے کے لیے دوسرے اشخاص کے کھیتوں میں سے گزر کر قریب ترین راستہ تلاش کر لیتا ہے۔ اس کی وجہ سے نیز سرحدوں اور حقوق راہبرومی کے بارے میں اہلِ دِہ میں لڑائی جھگڑے پیدا ہوتے ہیں، اور مقدمہ بازیاں ذریعہ آمدنی بن جاتی ہیں۔ اگر کسان کے سب کھیت ایک ہی جگہ ہوں تو وہ اپنے مویشیوں کو روزمرّہ گاؤں سے کھیت کو لانے لے جانے کے بجائے کھیت ہی پر رکھ سکتا ہے جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اُس کو کھاد کی بہت بڑی بچت ہو جائے گی۔ لیکن اراضی منتشر ہونے کی وجہ سے کھاد کو بھی گاؤں کے گھورے سے کھیت تک لے جانا پڑتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سا کھاد ضائع جاتا ہے۔ اگر کھیت بہت ہی چھوٹے اور منتشر ہوں تو پانی کافی مقدار میں موجود ہونے کے باوجود آب پاشی عام طور پر ناممکن ہو جاتی ہے۔ کسی انفرادی کسان کے سب چھوٹے چھوٹے منتشر کھیتوں میں پانی بہ آسانی نہیں پہنچایا جا سکتا۔ علاوہ ازیں اگر نالیوں کے ذریعے سے پانی پہنچایا بھی جا سکتا ہے تو دوسرے لوگوں کے کھیتوں میں سے یہ نالیاں لے جانی پڑیں گی۔ یہ بخوبی معلوم ہے کہ نالیوں کے ذریعے سے پانی پہنچانے اور تقسیم کرنے کی دشواریاں بہت کچھ فساد اور لڑائی جھگڑے کا موجب بنتی ہیں۔

بعض اوقات تقسیم اراضی و انتشار کا متحدہ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زمین پر کاشت کلیتہً موقوف ہو جاتی ہے۔[1] ڈاکٹر مان ان خرابیوں کو اجمالی طور پر یوں بیان کرتے ہیں کہ "یہ طریقہ حوصلہ مندی کو فنا کر دیتا ہے، محنت کی کثیر مقدار کو ضائع کر دیتا ہے حد بندیوں کے باعث بہت بڑی زمین کا نقصان کر دیتا ہے، کھیتوں پر کاشت عمیق کو غیر ممکن بنا دیتا ہے جیسی کہ دوسری صورت میں ممکن ہوتی اور خیلکار کاشتکاروں یا عمدہ زرعی جائداد کے خریداروں کی حیثیت سے زردار غیر اشخاص کے داخلے کے امکان کو روکتا ہے"۔

۴۔ تقسیم اراضی و انتشار کے حق میں دلائل۔

یہ خیال نہ کر لینا چاہئے کہ انتشار اراضی کی سب صورتیں نامناسب ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی کھیت کا ایک ہی جگہ نہ ہونا معاشی لحاظ سے پوری طرح حق بجانب بھی ہو سکتا ہے۔ کھیت کا مختلف و منتشر قطعوں کی شکل میں ہونا اس لحاظ سے ضروری ہو سکتا ہے کہ وہ کسی حد تک موسمی تغیرات سے بچاؤ کا ضامن ہوتا ہے۔

"ہندوستان کے اکثر علاقوں میں یہ صورت حال پائی جاتی ہے کہ مختلف قسم کی زمینوں کے منتشر کھیتوں میں دو یا دو سے زائد قسم کی فصلیں اس خیال سے بوئی جاتی ہیں کہ اگر ایک فصل بارش کی کمی یا بے قاعدہ تقسیم سے تباہ ہو جائے تو دوسرے کھیتوں سے منفعت بخش پیداوار حاصل ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ دوری فصلوں کا دقیق طریقہ جو ہندوستانی طریق کاشت کو مغربی طریق کاشت سے ممتاز کرتا ہے زیادہ تر اس وجہ سے ممکن ہوا ہے کہ کھیت منتشر ہیں"۔[2] علاوہ ازیں متنوع فصلوں کی بدولت کسان کو ہر سال اس سے زیادہ زمانے تک کام سے لگے رہنے کا موقع ملتا ہے جتنا کہ ایک یکجائی اور ایک ہی قسم کی فصل کے کھیت پر ممکن ہے۔ ایسے منتشر کھیتوں کی متعدد مثالیں پیش کرنا آسان ہے جن پر معاشی فائدے اور سہولت کے لحاظ سے کام کیا جاتا ہے۔

---

[1] دیکھو موصوف کی کتاب محولۂ بالا صفحہ ۱۴۵۔

[2] دیکھو معاشی رسالہ موسوم بہ "انڈین جورنل آف اکنامکس" بابت اپریل ۱۹۲۶ء، رادھا کمال مکرجی کا مضمون "کھیتوں کی تقسیم پر"۔

مثلاً کن کان کے علاقے میں چاول کی زمین کی کاشت اس کو ضروری بنادیتی ہے کہ خشکی (ورکس) کی زمین کی کچھ مقدار بھی قبضے میں رکھی جائے اور اس لیے دونوں قسم کی زمینوں کی ایک ساتھ موجودگی ضروری ہے۔ علیٰ ہٰذا گھاٹوں کے بالائی حصے میں خاص کر ساحل دریا پر کسان کے لیے یہ قطعی ضروری ہے کہ اس کے پاس کم از کم ایک چھوٹا سا خطہ "ملنی" یا دریائی مٹی کا بھی ہو۔ یہ خطہ اس کے مویشیوں کے لیے چارہ مہیا کرتا ہے اور دوسرے طریقوں سے مفید ثابت ہوتا ہے پس کھیتوں کے انضمام کی کسی تجویز کو کامیاب بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ان واقعات کا لحاظ رکھا جائے[۱]۔

اسی طریقے سے اراضی کو ایک خاص حد تک تقسیم کرنے کی حمایت اس لحاظ سے کی جاسکتی ہے کہ وہ زمین کی ملک کی وسیع تقسیم کا اور ایسے ملکی کاشتکاروں کی ایک بڑی جماعت کی تخلیق کا موقع بہم پہنچاتی ہے جو اپنی زمین سے مستقل طور پر وابستہ ہوں چنانچہ یہ بات متفقہ طور پر تسلیم کرلی گئی ہے کہ ایسی تقسیم معاشی و معاشری استواری و ثبات پذیری کے لیے مفید ہے۔ اس امر کو ہندوستان کے موجودہ کھیتوں کی توسیع کی تجاویز مرتب کرنے کے سلسلے میں ذہن نشین رکھنا چاہیئے۔ انگلستان کے نمونے پر بڑی جائدادیں اور اصلاح ارانہ طریق کاشت ہندوستانی حالات کے لیے مناسب نہیں ہے۔ چھوٹے پیمانے کی کاشت کا رواج اور ملکی کاشتکاروں کی ایک قوی جماعت کا قائم کرنا اصلی مقصود اور نصب العین ہونا چاہیئے۔

لیکن ہم جس وقت تقسیم اراضی اور کھیتوں کے انتشار کو مذموم قرار دیتے ہیں تو ہمارے ذہن میں ایسی مثالیں ہوتی ہیں جن میں اس قسم کے حق بجانب قرار پانے والے حالات اور مستحسن پہلو مفقود ہوتے ہیں اور خرابیاں ناقابل برداشت حد کو پہنچ چکی ہیں۔

(۵) ہندوستان میں خرابیوں کی وسعت

اب ہم یہ بیان کرنے کی کوشش کریں گے کہ یہ خرابی جو تقریباً ہندوستان کے طول و عرض میں پائی جاتی ہے کتنی پھیلی ہوئی ہے[۲]۔

(۱) حقوق داروں کے کھیتوں کی تقسیم در تقسیم۔

بہار و اڑیسہ کے گنجان آباد علاقے میں اسامی کے کھیت کا اوسط نصف ایکڑ سے بھی کم ہے اگرچہ فی کسان اوسط ۳ ایکڑ نکلتا ہے۔

۱؎ ملاحظہ ہو ڈی ایل دی جادھو کی "تقریر" بمبئی کی مجلس مقننہ میں بتاریخ ۱۰ اکتوبر سنہ ۱۹۲۸ء

۲؎ تقسیم اراضی کی خرابی کے سلسلے میں بعض اوقات فی کس آبادی کے حساب سے رقبہ (ایکڑوں) کے اعداد و شمار

باب

بنگال میں زیر کاشت رقبے کا اوسط بہ مشکل ۲ء۱ ایکڑ فی کسان ہے ۔ وہی حقوق جو کسان اپنی زمین پر رکھتا ہے اور جو اس کے لیے خاص طور پر قانون لگان وضع کرکے حاصل کیے گئے ہیں کسان کو مجبور کرتے ہیں کہ اپنے چھوٹے اور گھٹیا کھیت سے گھوڑ پھوڑ کی طرح چمٹا رہے اور اُس کو بجز آخری چارۂ کار کے صنعتی مرکزوں میں کام کی تلاش میں جانے سے روکتے ہیں۔ آسام میں ایک اوسط درجے کا کھیت تین ایکڑ سے زیادہ کا نہیں ہوتا' اس کے برخلاف صوبۂ متحدہ میں وہ صرف ۵ء۲ ایکڑ کا ہوتا ہے۔ پنجاب کے ۲۳۹۷ مواقع کی خاص تحقیق سے یہ معلوم ہوا کہ کل کھیتوں میں سے ۷ء۱۹ فی صد کا اوسط رقبہ ایک ایکڑ سے بھی کم تھا؛ ۵ء۲۵ فی صد حصے کا رقبہ اوسطاً ۱ اور ۳ ایکڑ کے مابین تھا؛ ۹ء۱۴ فی صد حصہ ۳ اور ۵ ایکڑ کے مابین تھا؛ اور ۱۸ فی صد حصہ ۵ اور ۱۰ ایکڑ کے درمیان تھا۔ ایک ایکڑ سے کم رقبے کے کھیتوں کی خاص تحقیق کی گئی تو یہ بات معلوم ہوئی کہ ان میں سے بہت بڑی تعداد زرعی کھیتوں کی تھی ۔ مدراس اور بمبئی میں کھیت کا اوسط رقبہ چھوٹا ہوتا ہے ۔ چنانچہ اکثر کھیتوں کا رقبہ ۲ یا ۳ ایکڑ سے بھی کم ہے جس کی وجہ سے موثر کاشت غیر ممکن ہوتی ہے ۔ ایک ایکڑ سے کم رقبے کے کھیتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے ۔ سر چونی لال مہتا نے بمبئی کے چھوٹے کھیتوں کے مسودۂ قانون پر بمبئی میں بتاریخ ۲۸ اکتوبر ۱۹۲۷ء تقریر کرتے ہوئے یہ بتلایا کہ مقبوضہ رقبوں کے مقابلے میں ان کھیتوں میں کس قدر تیزی کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے اور یہ میلان ۵ ایکڑ اور اس سے کم رقبے کے کھیتوں میں خاص طور پر نمایاں ہے ۔ بقول ڈاکٹر مان ۱۷ء میں ضلع پونا کے ایک موضع موسوم بہ پمپلا سوداگر میں ایک کھیت کی اوسط وسعت بتلا ہر

بقیۂ حاشیہ صفۂ گزشتہ۔ پیش کیے جاتے ہیں۔ اگر ہم برطانوی ہند کے مجموعی زیر کاشت رقبے کو مجموعی آبادی پر تقسیم کریں تو ۳ء۱ ایکڑ فی کس سے کچھ زاید خارج قسمت حاصل ہوتا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زمین پر آبادی کا دباؤ کتنا شدید ہے لیکن اس سے تقسیم اراضی و انتشار کے مسئلے کا کوئی براہ راست تعلق نہیں ہے۔ اس سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ زمین پر حد سے زیادہ اشخاص کا انحصار ہے لیکن کھیتوں کی تقسیم در تقسیم کا حال براہ راست نہیں معلوم ہوتا۔

۴۰ ایکڑ تھی؛ سنہ ۱۸۱۸ء میں ۱۷½ ایکڑ تک گر گئی اور سنہ ۱۹۲۰ء کے بعد سے بہت زمانے تک غیر متبدل حالت میں ۱۴ ایکڑ رہی؛ لیکن سنہ ۱۹۱۵ء تک وہ ۷ ایکڑ تک گر گئی۔ ڈاکٹر مان کہتے ہیں کہ "یہ ظاہر ہے کہ گزشتہ ساٹھ یا ستر سالوں میں کھیتوں کی نوعیت بالکل بدل گئی ہے۔ برطانوی دور سے پیشتر اور ابتدائی برطانوی دور میں کھیت عام طور پر اچھی خاصی وسعت رکھتے تھے؛ یعنی اکثر و بیشتر کا رقبہ ۹ یا ۱۰ ایکڑ سے بھی زیادہ ہوتا تھا اور دو ایکڑ سے کم کے انفرادی کھیت بہ مشکل موجود تھے۔ لیکن اب کھیتوں کی تعداد دگنی سے بھی زیادہ ہو گئی ہے اور ان میں سے ۱۰ فی صد کا رقبہ ۱ ایکڑ سے کم ہے؛ اس کے برخلاف کم از کم ۶۰ فی صد کا رقبہ ۵ ایکڑ سے بھی کم ہے۔"[ل]

۵۔ ہندوستان میں خرابیوں کی وسعت

(۲) کاشت کی ذیلی تقسیم۔

کاشت کی ذیلی تقسیم اور بھی زیادہ نمایاں ہے؛ چنانچہ خالص کاشتکاروں کی تعداد حقوق داروں سے بارہا زیادہ ہے۔ آبادی کی بہت بڑی تعداد دوسرے ذرائع معاش کی عدم موجودگی میں آخری چارہ کار کے طور پر مایحتاج زندگی کے لیے کھیتی باڑی اختیار کرتی ہے۔ پنجاب میں ۵ر۲۲ فی صد کسان ایک ایکڑ یا اس سے کم رقبے پر کاشت کرتے ہیں؛ ۴ر۱۵ فی صد ۱ تا ۵ر۲ ایکڑ پر؛ ۹ر۱۷ فی صد ۵ر۲ تا ۵ ایکڑ رقبے پر؛ اور ۷ر۲۰ فی صد ۵ تا ۱۰ ایکڑ رقبے پر کاشت کرتے ہیں۔ سنہ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ میں فی کسان مزروعہ رقبہ (بحساب ایکڑ) حسب ذیل بتلایا گیا ہے۔

صوبہ	مزروعہ رقبہ	صوبہ	مزروعہ رقبہ
بمبئی	۱۲ر۲	مدراس	۴ر۹
پنجاب	۹ر۲	بنگال	۳ر۱
صوبہ متوسط و برار	۸ر۵	بہار و اڑیسہ	۳ر۱
برما	۵ر۶	آسام	۳ر۰
	۔	صوبہ متحدہ	۲ر۵

ل۔ دیکھو ڈاکٹر مان کی تصنیف محولہ بالا صفحہ ۴۶۔

باب

۵۔ ہندوستان میں خرابیوں کی وسعت

(۳) حقوق داروں کے کھیتوں کا انتشار۔

قوانین وراثت کے مطابق جائداد کی تقسیم عمل میں آتی ہے۔ اور کھیتوں کا انتشار عام طور پر اسی تقسیم کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس طرح بہت کم کھیت ایک ہی جگہ پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ خاص بمبئی پریسیڈنسی میں قریب قریب ہر کھیت ۲ تا ۴ خطوں میں تقسیم ہے۔ ڈاکٹر مان نے پیلا سوداگر کے موضع میں یہ پایا کہ ۱۰۶ مالکوں پر ۲۹۰ خطے تقسیم تھے جن کے منجملہ ۴۶۳ خطوں کا رقبہ ایک ایکڑ سے کم تھا اور ۲۱۱ خطوں کا رقبہ ۱/۴ ایکڑ سے بھی کم تھا۔ زمینداری میں انفرادی خطوں کا رقبہ بعض صورتوں میں (۰۰۶۲۵) ایکڑ یا ۱/۱۶۰ ۳۰ مربع گز ہے: پنجاب میں بعض کھیت ایسے پائے جاتے ہیں جو طول میں تو ایک میل سے زاید ہیں لیکن عرض میں چند ہی گز ہیں۔ ایسی صورتوں کا بھی حال معلوم ہوا ہے جن میں انتشار ایسی حد کو پہنچ گیا ہے کہ کاشت سراسر ناممکن ہوگئی ہے۔

۵۔ ہندوستان میں خرابیوں کی وسعت

(۴) کاشت کا انتشار

کاشت کا انتشار کھیتوں کے انتشار سے بھی زیادہ شدید اور وسیع خرابی ہے جو موخرالذکر سے بھی زیادہ انتہائی صورت اختیار کر چکی ہے۔ ڈاکٹر مان نے پیلا سوداگر میں کسانوں کے کھیتوں میں سے ۶۲ فی صد کے متعلق یہ پایا کہ ان کا رقبہ ایک ایکڑ سے کم تھا اور جاتے گاؤں میں ایسے کھیتوں کا فیصد ۳۱ تھا۔ بقول رام لال بھلا پنجاب کے ایک گاؤں موسوم بہ "بیرام پور" میں یہ پایا گیا کہ ۳۴۰۵ فی صد کسانوں میں سے ہر ایک کے پاس ۲۵ منتشر کھیت تھے۔ یہی صورت حال ملک کے باقی حصے میں بھی عام طور پر پائی جاتی ہے[1]۔

تقسیم اراضی و انتشار کے اسباب

اراضی کی تقسیم در تقسیم اور کھیتوں کے انتشار کی خرابی کے متعدد اسباب بیان کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے ایک جذبہ انفرادیت کی ترقی ہے جو اشتراک خاندانی کے طریقے کی شکست کی ذمہ دار ہے۔ موجودہ زمانے میں مشترک کاشت ویسی عام

[1] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ، فقرہ ۱۱۹ تا ۱۲۲۔

باب

نہیں ہے جیسی کہ پہلے ہوا کرتی تھی۔ سرحدی نشان اور حد بندیوں کے ذریعے سے تفریق اور منفرد و جداگانہ کاشت پر اصرار اب سابق زمانے کے مقابلے میں بہت بڑھ گیا ہے۔ اس جذبۂ انفرادیت کو اس بات کی وجہ سے اور زیادہ تقویت پہنچی کہ ہندوستان میں عدل گستری کرنے والے انگریز ججوں نے انفرادی ملکیت اور انفرادی حقوق پر بہت زور دیا۔ علاوہ ازیں بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ہندو و اسلامی قوانین وراثت و توارث اور ان سے وابستہ رسم ورواج، تقسیم اراضی و انتشار کے اصلی اور اساسی سبب ہیں۔ چنانچہ یہ معلوم کرنا آسان ہے کہ خاندانی کھیت کی وسعت آبائی ملک کا تقسیم در تقسیم سے کتنی چھوٹی ہوتی جاتی ہے۔ لیکن تقسیم

214

اراضی کے ساتھ ساتھ معمولاً انتشار بھی عمل میں آتا ہے؛ اس لیے کہ ہر حصہ دار ایک یکجائی کھیت پر مطمئن و قانع ہونے کے بجائے ہر خطے سے تھوڑا تھوڑا اجزو لینے پر اصرار کرتا ہے[1] اس طرح کی تقسیم کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ سب کو پوری طرح مساوی حصہ ملے۔ یہی خیال دور وسطیٰ کے یورپ کی کھلی کھیتی کے طریقے میں مضمر ہے، جس کے تحت مختلف بھلے برے خطے عمدہ اور خراب موقع محل کے اس لیے ملے ہوئے اور منتشر ہوتے تھے کہ اُن کو منصفانہ طریق پر تقسیم کرنا مقصود ہوتا تھا۔ لیکن ہندوستان میں یہ بظاہر منصفانہ تقسیم کا طریقہ انتہا کو پہنچا دیا گیا ہے اور اس کا محرک یہ نہیں ہوتا کہ فوائد اور سہولتوں کو مساوی طور پر تقسیم کیا جائے بلکہ عام طور پر رشک و حسد اور بدگمانی کے مذموم محرکات اس کی تہ میں مضمر ہوتے ہیں[2]

[1] اس رسم وعادت کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر خطہ اُتنے ہی زیادہ ذیلی خطوں میں تقسیم ہو جاتا ہے جتنے کہ وارث ہیں اور اس طرح منتشر کھیتوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے اور ذیلی حصہ داروں کی تعداد کے مساوی ہوتی ہے۔

[2] "اس کی کیا وجہ ہے کہ آبادی میں کسی مادی اضافے کے بغیر نسلاً بعد نسلٍ زمین کا انتشار بڑھتا جارہا ہے؟ وجہ زیادہ تر یہی ہے کہ تقریباً ہر زراعتی خاندان میں بھائی بھائی میں خوفناک بغض و حسد موجود ہے۔ کوئی بھی اس کے لیے تیار نہیں ہے کہ دوسروں سے فائدہ اُٹھانے کے لیے کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے دے۔ کسی درخت کی شاخ پر شہد ہو تو اس کی تقسیم

اس نظریے کے خلاف کہ قوانین توارث و وراثت اس خرابی کے اساسی طور پر ذمہ دار ہیں، یہ استدلال کیا گیا ہے کہ یہ قوانین تو صدہا سال سے موجود ہیں لیکن ان کو جس خرابی کا موجب خیال کیا جاتا ہے وہ ایک حد تک تازہ اور جدید ہے۔[1] تاہم یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ ان قوانین کی عدم موجودگی میں زیر بحث خرابیاں موجود ہا نے پر رونما ہوتیں۔ قوانین جائداد کے حصہ داروں میں سے کسی کو اس کی اجازت دیتے ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی چاہے تو اپنے حصے کو الگ کر لے۔ ممکن ہے کہ تفریق و علیحدگی کی خواہش دوسرے اسباب کی بنا پر پیدا ہو لیکن اس خواہش کو پورا کرنے کا راستہ قانون نے بتلا دیا ہے۔ ہم جذبۂ انفرادیت کی ترقی کا ذکر کر چکے ہیں کہ یہ زمانۂ سابق کے مقابلے میں اب زیادہ شدت و مد کے ساتھ جائداد کی تفریق پر اصرار کرنے کے میلان کے اسباب محرکہ میں سے ایک ہے۔ لیکن یہ میلان دراصل قوانین توارث و وراثت کے ذریعے سے عملی جامہ پہنتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنے کی بجائے یہ کہ قوانین تقسیم اراضی و انتشار کے اسباب ہیں، یہ کہنا غالباً زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ ایک آلۂ کار یا ذریعہ ہیں جن کی وساطت سے تقسیم در تقسیم مسلسل عمل میں لائی جاتی ہے۔ ان ذرائع سے کام لینا جبری تو نہیں ہے لیکن ان سے جس وقت کام لینے کو جی چاہے ان پر ہر شخص کو بآسانی دسترس حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ قدیم زمانے میں ان سے اس قدر جلد جلد اور زیادہ کام نہیں لیا جاتا تھا جتنا کہ موجودہ زمانے میں لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ان قوانین کا عملدرآمد قدیم زمانے میں کھیتوں کی تقسیم در تقسیم کا موقع ہی نہیں دیتا تھا۔[2] بلکہ ہمیں یہ کہنا چاہیے کہ ان کے عملدرآمد کو شاذ ہی روا رکھا جاتا تھا

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ۔ کے لیے لڑنے میں بھی دریغ نہیں کرتے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ وہ درخت کی شاخوں اور پھل کے لیے نہیں بلکہ اس کے سایے کی تقسیم کے بارے میں بھی لڑائی جھگڑا کرتے ہیں"۔ دیکھو ایف۔ جی پیچ اندرسن کی تقریر بمبئی کی لیجسلیٹو کونسل (مجلس قانون ساز) چھوٹے کھیتوں کے مسودۂ قانون کے بارے میں بتاریخ ۱۰ اکتوبر ۱۹۲۷ء۔

[1] ۔ دیکھو واڈیا و جوشی کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۲۴۴۔

[2] ۔ دیکھو واڈیا اور جوشی کی کتاب محولۂ بالا صفحہ ۲۴۳۔

باب

اور مشترک خاندان کا طریقہ عام تھا، لیکن جب کبھی اُس کو روا رکھا گیا اُس نے ناگزیر طریقے پر تقسیم در تقسیم کا موقع بہم پہنچایا۔

برطانوی حکومت کے قائم ہونے کے بعد آبادی کے اضافے کو بھی ایک سبب کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اضافۂ آبادی کے معنی ورثا کی تعداد کے اضافے کے ہوں گے۔ لیکن فی نفسہ اس کی وجہ سے تقسیم در تقسیم رونما نہ ہوگی تاوقتیکہ دوسرے اسباب ورثا کو اس بات پر مجبور نہ کریں کہ وہ قطعی تفریق کا مطالبہ کریں اور مشترک خاندان کے روایات کو اس حالت میں باقی نہ رکھیں جس میں کہ وہ قدیم زمانے میں عام طور پر پائے جاتے تھے۔ جس وقت تک غیر مقبوضہ زمین بکثرت موجود تھی مثلاً پنجاب کی نہری نوآبادیات میں اس وقت تک یہ ممکن تھا کہ زائد آبادی کے لیے مقبوضہ زمین کی تقسیم در تقسیم کیے بغیر زمین فراہم کی جائے لیکن جب تک بیا وہ سب زمین قبضے میں آ گئی جو بہ آسانی زیر کاشت لائی جا سکتی تھی تو صورت حال مختلف ہوگئی اور تقسیم اراضی سے بچنے کا واحد طریقہ مشترکہ کاشت تھا جس کا رواج جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، بتدریج کم ہوتا گیا۔[2]

کل کی بنی ہوئی مصنوعات کی مسابقت کے باعث دستکاریوں کا زوال بھی اہم اسباب میں سے ایک خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن اس موضوع کے متعلق اپنے خیالات کو واضح کرنے کے لیے ہم اس بعینہ سبب کے حقیقی عمل کی تفہیم کی کوشش کریں گے۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے جو دستکار گاؤں سے وابستہ ہوتے تھے وہ عام طور پر گاؤں کی کچھ زمین پر قابض ہوتے تھے۔ ان میں سے وہ لوگ جن کی حیثیت کل کی بنی ہوئی

---

[1] یہاں "مقبوضہ" سے ہمارا مطلب اس زمین کی ذیلی تقسیم ہے جس پر قبضہ ہو چکا ہے اور اُس اوسط رقبے سے ہے جو ہر حقدار کے قبضے میں ہے۔ ممکن ہے کہ کسی گاؤں میں نئے نئے چھوٹے مالکوں مثلاً ساہوکاروں اور قرضہ دہندوں کی مداخلت بیجا جائداد کی اوسط وسعت کو آبائی جائداد کی حیثیت پر اثر ڈالے بغیر کم کر دے۔ دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ پیراگراف (۱۱۹)۔

[2] بقول اہارٹن مشترک خاندان کی تحلیل و شکست [illegible] کے بعد سے قانون محصول آمدنی کے طلوع آمد کی بدولت خاص طور پر نمایاں ہو گئی۔ دیکھو بمبئی کی مجلس قانون ساز کے مباحث چھوٹے کھیتوں کے مسودۂ قانون کے بارے میں۔

باب ۹

مصنوعات کی مسابقت کے باعث بتدریج خراب ہوئی وہ آخری چارۂ کار کے طور پر زمین کی طرف رجوع ہوئے اور انھوں نے کھیتی باڑی کو اپنا ذریعۂ معاش بنالیا۔ چونکہ یہ خاندانی کھیت واحد ذریعۂ معاش بن گیا اس لیے اس کی اہمیت ان لوگوں کی نظروں میں بہت بڑھ گئی جو اس پر حقوق رکھتے تھے۔ مشترک کاشت کی پیداوار کو دیتا میں ہر ایک کی ضرورت کے لحاظ سے تقسیم کرنے کا طریق غالباً ان لوگوں کو غیر منصفانہ معلوم ہونا شروع ہوا جن کی ضرورتیں مختصر تھیں اور جو اس لحاظ سے مجموعی پیداوار کا قلیل حصہ صرف کرتے تھے۔ اس طریقے سے رشک و حسد کا جو احساس پیدا ہوا اُس نے مشترک کاشت کی تجویز کے خلاف عمل کیا اور اس کے نتیجے کے طور پر تقسیم رونما ہوئی۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس طریقے پر جو زمین متاثر ہوئی ہوگی اس کی مقدار یقیناً چھوٹی رہی ہوگی۔

216

رہے شہروں میں کام کرنے والے دستکار تو عام طور پر وہ کسی زمین کے مالک ہی نہیں ہوتے تھے۔ جب وہ کل کی بنی ہوئی مصنوعات کی مسابقت کے باعث بیروزگار ہوگئے اور پیشے سے ہاتھ دھو بیٹھے تو بے زمین مزدور بن گئے۔ اس کو زمین پر آبادی کے دباؤ کے بڑھ جانے کا سبب خیال کیا جاسکتا ہے لیکن تقسیم زمین پر اس کا کوئی براہ راست اثر نہیں پڑ سکتا تھا۔ ممکن ہے کہ بعض شہری دستکار دیہات کو منتقل ہوگئے ہوں اور وہاں انھوں نے ایک ایسا چھوٹا خطہ خرید لیا یا کسی دوسرے طریقے سے حاصل کرلیا ہو جو یا تو شروع ہی سے غیر معاشی تھا یا قانون توارث کے عملدرآمد کے باعث رفتہ رفتہ غیر معاشی بن گیا۔ لیکن یہ غیر اغلب ہے کہ جو دستکار اپنے ابتدائی پیشے کے غیر منفعت بخش ثابت ہونے کی وجہ سے زمین کی جانب رخ کرنے پر مجبور ہوگئے تھے ان کے پاس اتنی کافی پس انداز کردہ رقم یا کافی اعتبار تھا جس کی بنا پر وہ زمین خریدنے کے قابل تھے۔ بہرحال تاوقتیکہ اس طرح حاصل کی ہوئی زمین کی نوعیت ابتداءً کسی بڑے خطے کے جزو کی نہ ہو ذیلی تقسیم کی حدتک صورت وہاں پہلے کی طرح غیر متبدلہ رہی ہوگی۔ اس کے برخلاف اگر نئی زمین زیر قبضہ آئی تو اس کی وجہ سے سابقہ کھیتوں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا ہوگا اور کھیتوں کی ذیلی تقسیم جس حالت میں موجود تھی اُس میں مزید تقسیم نہ ہوئی ہوگی۔ اس لحاظ سے بحیثیت مجموعی

باب

ہم یہ بیان کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ گو دستی صنعتوں کے زوال کا نتیجہ بڑی حد تک یہ ہوا کہ بے زمین مزدوروں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا؛ لیکن اس کا اثر تقسیم اراضی اور کھیتوں کے انتشار پر بہت زیادہ نہ پڑا۔ تاہم جس حد تک کہ دستکار پیشہ ترک کر کے اسامی بن گئے اس حد تک قابل زراعت زمین کے بارے میں ان کی طلب کا نتیجہ لازمی طور پر یہ ہوا ہوگا کہ کاشت کی حد تک اور زیادہ تقسیم اور انتشار عمل میں آیا ہوگا۔

لیکن دو چیزوں کے درمیان علاقۂ سببی قائم کیا جا سکتا ہے؛ یعنی ایک تو اضافۂ آبادی کے تناسب سے صنعت کی توسیع و ترقی کا فقدان اور دوسرے کھیتوں کی تقسیم در تقسیم اور اراضی کا انتشار اگر موجودہ زمانے میں آبادی کے اضافے کے ساتھ ساتھ صنعتوں میں بھی معقول و معتدبہ ترقی ہوتی تو زمین کی زائد آبادی اُن میں جذب ہو جاتی۔ اگر کسی خاندان میں اتنا اضافہ ہو جاتا کہ اُس کے کھیت پر اُس کا گزارہ مشکل ہو جاتا تو خاندان کے بعض ارکان صنعتی مرکزوں کو منتقل ہو سکتے اور باقی ارکان کو خاندانی کھیت پر کاشت کرنے اور اپنی محنت کا پھل پانے چھوڑ جاتے۔ اس صورت میں گاؤں ترک کرنے والوں کا حق خاندانی کھیت پر باقی رہتا۔ لیکن اگر صنعتوں میں کام کرنے سے اُن کو معقول ذریعۂ معاش میسر آتا تو وہ خاندانی کھیت کی آمدنی میں اپنے حق سے دستبرداری کے لیے تیار ہو جاتے اور باقی ارکان کو اُس سے مستفید ہونے کا موقع دیتے۔ بدقسمتی سے ایسی ترقی ظہور پذیر نہیں ہوئی؛ آبادی بڑھتی گئی اور زائد آبادی صنعتوں میں منتقل ہونے کی بجائے سیلاب کی طرح زمین ہی کی طرف رجوع ہوئی اور مشترک خاندان کی بندشوں کی گرفت مضبوط نہ ہونے کی وجہ سے نیز علٰحدگی کے میلانات کی ترقی کے باعث قانون وراثت سے مدد لینے کا طریقہ روز بروز زیادہ عام ہوتا گیا۔ اس طرح کافی حیرت انگیز طریقے پر جوں جوں معاشی مجبوریوں کا دباؤ بڑھتا گیا لوگ ایسا طریق کار اختیار کرتے گئے جس کا نتیجہ پریشانی کو کم کرنے کی بجائے بڑھانے کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس وقت زمین ہی واحد ذریعۂ معاش تھی۔ اس لیے یہ خیال کیا جا سکتا تھا کہ اس سے نہایت منفعت بخش طریقے پر کام لینے کی اور بھی زیادہ وجہ تھی۔ لیکن زمین سے انتہائی غور اور احتیاط سے کام لینے کی بجائے نہایت بے احتیاطی کے ساتھ اور خودکشی کے انداز میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے۔

217

باب ۶

غرض مختصر طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اراضی کی تقسیم در تقسیم اور کھیتوں کے انتشار کے اصلی اسباب اضافۂ آبادی اور اس کے مقابل میں صنعت میں توسیع نہ ہونا، اشتراکِ خاندانی کی شکست اور جذبۂ انفرادیت کی ترقی کو خیال کرنا چاہیئے جن کو قوانین توریث و توارث نے مزید تقویت پہنچائی۔

جس وقت کوئی خرابی ناقابل برداشت حد کو پہنچ جاتی ہے تو اس کی کچھ نہ کچھ اصلاحی صورت بھی از خود رونما ہو سکتی ہے مثلاً یہ ممکن ہے کہ انتہائی چھوٹا کھیت یا تو فروخت ہو جائے یا مالک کی طرف سے پٹے پر دے دیا جائے۔ لیکن اس قسم کی مثالیں کافی عام نہیں ہیں اور اصل سوال کو کسی قابل لحاظ حد تک متاثر نہیں کرتیں۔ اس لحاظ سے ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیئے کہ خرابی شدید صورت میں موجود ہے اور اس کے ممکنہ علاج یا اصلاح کی بحث شروع کرنی چاہیئے۔

۷۔ غیر ممالک میں بھی یہ مسئلہ موجود ہے۔

یہ مسئلہ کسی حال ہندوستان سے مخصوص نہیں ہے۔ دوسرے ملکوں کو بھی اس سے دوچار ہونا پڑا اور انھوں نے اس کو مختلف طریقوں سے حل کرنے کی کوشش کی۔ فرانس، سوئٹزرلینڈ، بلجیم، جرمنی، ڈنمارک اور جاپان جیسے ملکوں کے تجربے نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ملکی کاشتکاروں کے باہمی ارادی معاہدات یکجائی اور معقول رقبے کے کھیتوں کے قائم کرنے کے ضامن نہیں ہوتے اور یہ کہ اسی لیے وضع قوانین کے ذریعے سے اصلاح کرنی ضروری ہے۔ چنانچہ اکثر متعلقہ ملکوں میں اس قسم کے قوانین وضع اور اختیار کیے گئے ہیں اور ان کی تہ میں حسب ذیل اصول مضمر ہیں۔- (۱) موجودہ کھیت کے قابضوں کی جبری بے دخلی؛ (۲) زمینداروں کے ایک حصے کے مشورے سے یا بعض صورتوں میں اس کے بغیر کھیتوں کی از سر نو تنظیم و ترتیب؛ (۳) جدید قائم شدہ کھیتوں کو آیندہ کے لیے ناقابل تقسیم قرار دینا؛ (۴) کھیتوں کو قرضوں کے سلسلے میں قرقی یا ضبطی سے مستثنیٰ کرنا؛ اور (۵) دوسرے کھیتوں کے ساتھ جدید قائم شدہ کھیت کے الحاق کو روکنا[1]۔

---

[1] دیکھو کیٹنگ کی کتاب موسوم بہ "بمبئی دکن میں دیہی معیشت" صفحہ ۵۲ تا ۵۳۔

باب ۸

۸۔ معاشی کھیت کا مفہوم۔

حال میں ہندوستان میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ اس مسئلے کو اختیاری طریقے پر اور جبری قانون کے ذریعے سے حل کیا جائے۔ خواہ کوئی بھی طریقہ اختیار کیا گیا ہو ایک سوال جس سے ہمیشہ دوچار ہونا پڑتا ہے یہ ہے کہ "معاشی کھیت" کا کیا مفہوم ہے؟ اس کے جواب میں متعدد تعریفیں پیش کی گئی ہیں کیٹنگ کے خیال میں "معاشی کھیت" سے مراد "ایک ایسا کھیت ہے جو کسی شخص کو اتنی پیداوار حاصل کرنے کے قابل بنائے جو اس کی اور اس کے خاندان کی پرورش مناسب آرام کے ساتھ کرنے اور ضروری مصارف زندگی ادا کرنے کے لیے کافی ہو" چنانچہ وہ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "دکن میں مثالی معاشی کھیت ۴۰ یا ۵۰ ایکڑ کی مناسب اور یکجائی زمین پر مشتمل ہوگا جس میں آبپاشی کے لیے کم از کم ایک عمدہ کنواں اور ایک مکان موجود ہو۔ حالات کے لحاظ سے مختلف علاقوں میں مناسب رقبہ مختلف ہوگا۔ چنانچہ تھانہ ضلع سورت میں اگر کسی باغبان کے پاس تین ایکڑ زمین ہو تو اس کا اور اس کے خاندان کی زندگی آرام سے بسر ہو سکتی ہے۔ اس کے برخلاف دین کے خشک علاقے میں جہاں زمین کی زرخیزی ادنیٰ ہے تین ایکڑ بھی مشکل کفایت کر سکتے ہیں۔ مثالی معاشی کھیت اور بدیہی طور سے غیر معاشی کھیت کے درمیان متعدد مدارج ہیں۔ لیکن کسی ایک خطے کے بارے میں معیار مقرر کرنا مشکل نہ ہوگا[1]"۔ ڈاکٹر مآن معاشی کھیت کی تعریف یوں کرتے ہیں "ایک ایسا کھیت جو ایک اوسط درجے کے خاندان کے لیے ایک اقل ترین معیار زندگی پر جو اطمینان بخش خیال کیا جائے روزگار مہیا کرے[2]"۔ اسٹینلی جیونس صوبہ متحدہ کے حالات کے لحاظ سے ایک معیاری کھیت کے لیے تقریباً تین ایکڑ کا رقبہ مناسب خیال کرتے ہیں۔ وہ کاشتکار کے لیے "اقل ترین معیار زندگی" تو کیا "مناسب معیار زندگی" بھی کافی نہیں سمجھتے بلکہ "اعلیٰ معیار زندگی" چاہتے ہیں۔

اس سوال پر مزید غور و بحث کرنے سے پیشتر یہ کہہ دینا مناسب ہوگا کہ معاشی کھیت

---

[1] دیکھو کیٹنگ کی محولۂ بالا تصنیف صفحہ ۲۱ تا صفحہ ۵۲۔

[2] دیکھو مآن کی تصنیف محولۂ بالا جلد دوم صفحہ ۲۲۔

باب

کی تعریف مختلف اعتبارات سے مختلف ہوگی۔ مثلاً یہ کہ آیا ہمارے پیش نظر مجموعی خام پیداوار ہے یا خالص پیداوار؟ آیا وافر اصل مہیا ہو سکتا ہے یا اس کی مقدار محدود ہے وغیرہ۔ علاوہ ازیں تعریف کا انحصار زرعی پیدائش کے طریقوں کی نوعیت پر بھی ہوگا یعنی اس بات پر ہوگا کہ کاشت عمیق ہو رہی ہے یا کاشت وسیع؟ زمین کی زرخیزی کی کیا کیفیت و حالت ہے؟ آبپاشی کی سہولتیں موجود ہیں یا نہیں اور کتنی پیداوار حاصل ہوتی ہے۔

انہی تفہیم کے بعد ہم "معاشی کھیت" کی اصطلاح کی پوری طرح تشریح و توضیح کی کوشش کریں گے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک اوسط درجے کے خاندان کے لیے زمین کا ایسا رقبہ مثالی کھیت ہو سکتا ہے جس میں یہ خاندان اپنی مقدور کے مطابق اپنے اصل اور محنت کو نہایت نفع بخش طریقے پر لگا سکے۔ ہر قسم کے عاملین کو جا بجا اور ملحوظ رکھنا پڑے گا، چنانچہ دستیاب شدنی اصل و محنت یا اس کے ایک جزو کو زراعت کے سوا دوسرے کاموں میں لگانے کے امکان کو بھی خارج نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ زراعت اور دوسرے پیشوں میں اصل و محنت کی تقسیم "مساوی اختتامی حاصل" کے اصول کی بنیاد پر متعین ہوتی ہے۔ یہاں مقصود یہ ہے کہ اصل و محنت کی ہر اکائی سے جو زراعت میں لگائی جائے امکانی حد تک بیش ترین خالص پیداوار حاصل ہو۔

لیکن عام طور پر جو مفروضات قائم کیے جاتے ہیں ان میں سے بعض ہندوستان کے اصلی حالات کے تحت صادق نہیں آتے؛ خاصکر یہ مفروضہ کہ محنت، زراعت اور دوسرے پیشوں کے درمیان گاؤں کے اندر یا باہر کامل طور پر نقل پذیر ہوتی ہے، اس وجہ سے صحیح نہیں ہے کہ دیہی صنعتیں مفقود ہیں اور شہروں میں مصنوعات تیار کرنے والی صنعتوں نے ناکافی ترقی کی ہے۔ جہاں تک ہندوستانی حالات کا تعلق ہے ہمیں یہ فرض کرنا پڑتا ہے کہ ایک اوسط درجے کے کسان کے خاندان کو جتنی محنت پر دسترس حاصل ہو سکتی ہے وہ زراعت کے سوا دوسرے پیشوں میں عملاً ناقابل انتقال ہوتی ہے اور یہ کہ وہ غیر مشروط طریقے پر صرف زراعت ہی کے لیے دستیاب ہو سکتی ہے۔

219

اگر ہم اعداد و شمار کے ذریعے سے مثال کو واضح کریں تو معاشی کھیت کا تصور بآسانی

باب

سمجھ میں آسکتا ہے۔

ہم یہ فرض کیے لیتے ہیں کہ اوسط درجے کا خاندان پانچ ارکان پر مشتمل ہے اور محنت کی اکائی وہ محنت ہے جو یہ خاندان مہیا کرسکتا ہے[1] علیٰ ہذا یہ بھی مان لیجئے کہ اصل کی اقل ترین اکائی کی تعریف میں بیلوں کی ایک جوڑا اور ہل داخل ہے۔ یہ مفروضات ہندوستان کے مروجہ حالات کے عین مطابق ہیں۔ اب ہم یہ فرض کرتے ہیں کہ اس خاندان کے قبضے میں پانچ ایکڑ زمین کا ایک خطہ ہے جس پر اصل و محنت کی موجود مقدار لگا کر کاشت کی جائے تو ۱۵۰ روپے کی مجموعی خام آمدنی وصول ہوسکتی ہے۔ اس آمدنی میں سے ۴۰ روپے بیلوں کی پرورش کے مصارف اور دوسرے مصارف بقدر ۲۰ روپے منہا کر لیجئے۔ اس کے بعد خاندان کو خالص آمدنی ۱۵۰ – ۶۰ = ۹۰ روپے وصول ہوگی[2] یہ مان لیجئے کہ ایک ہل، بیلوں کی ایک جوڑا اور کاشتکار کے خاندان کی محنت سے ۲۰ ایکڑ زمین پر اطمینان بخش طریق پر ہل جوتا جا سکتا ہے۔ لہذا اگر اس خاندان کے قبضے میں ۵ ایکڑ کی بجائے ۲۰ ایکڑ زمین ہو تو نتیجہ حسب ذیل برآمد ہوگا۔ مجموعی خام آمدنی = ۶۰۰ روپے۔ بیلوں کی جوڑ کے مصارف پرورش حسب سابق ۴۰ روپے، متفرق مصارف تقریباً ۸۰ روپے یعنی پہلے کے مقابلے میں چہار گونہ (گو اس بات کا امکان ہے کہ دوسرے مصارف میں رقبے کے اضافے کے ٹھیک تناسب سے کم اضافہ ہو)۔ ان سب مصارف کو منہا کرنے کے بعد خالص آمدنی ۶۰۰ – ۱۲۰ = ۴۸۰ روپے بچ رہتی ہے۔

فرض کیجیے کہ ایسے چار خاندان ا، ب، ج اور د ہیں جن میں سے ہر ایک کے پاس ۵ ایکڑ زمین ہے اور ہر خاندان الگ الگ کاشت کر رہا ہے۔ ان میں سے ہر ایک ۶۰ روپے صرف کرے گا یعنی ۴۰ روپے بیلوں پر اور ۲۰ روپے متفرق مصارف، لہذا ہر ایک کو ۱۵۰ روپے مجموعی خام آمدنی اور ۹۰ روپے خالص آمدنی وصول ہوگی۔

---

[1] یہ "ہندوستان میں معاشی زندگی کی اکائی خاندان ہے نہ کہ فرد" دیکھو جیک کی تصنیف موسوم بہ "ایک بنگالی ضلع کی معاشی زندگی" صفحہ ۸۰۔

[2] یہ اعداد و شمار خالصۃً بطور مثال پیش کیے گئے ہیں چنانچہ ان اعداد کو دوسرے اعداد سے بدل دینے سے استدلال پر کسی قسم کا اثر نہ پڑے گا۔

باب

220

اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ سب ملکر ۲۰ ایکڑ کے اس کُل رقبے پر مشترکہ طور پر کاشت کرنے کا تہیہ کریں تو اس صورت میں وہ تین جوڑ بیلوں کو نکال کر بھی کام چلا سکتے ہیں، اور اس طرح اس مد میں ان کو ۱۲۰ روپے کی مجموعی بچت ہو جائے گی۔ اگر محنت کی مقدار وہی مقررہ فرض کی جائے، یعنی صرف ایک خاندان کی محنت، جیسی کہ پہلے لگائی گئی تھی تو اُن کو اب ۶۰۰ روپے کی مجموعی آمدنی وصول ہوگی جس میں سے ۴۰ روپے بیلوں کے مصارف اور ۸۰ روپے متفرق مصارف منہا کرنے کے بعد خالص آمدنی ۴۸۰ روپے وصول ہوگی۔ گویا ہر خاندان الگ الگ اپنی ۵ ایکڑ زمین پر کاشت کرتا تو ہر ایک کو ۹۰ روپے خالص آمدنی وصول ہوتی، لیکن اس صورت میں ۱۲۰ روپے وصول ہوگی۔ اس طرح ہر خاندان کی آمدنی بڑھ جائے گی، گو کہ بحیثیت مجموعی جو محنت لگائی گئی وہ اب پہلے کے مقابلے میں صرف ایک چوتھائی ہے: اس لیے کہ ہمارے مفروضے کے مطابق ایک خاندان جتنی محنت مہیّا کر سکتا ہے اس سے پوری طرح کام لینے کے لیے ۲۰ ایکڑ زمین کی ضرورت ہے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زائد محنت جو بچ رہی اُس کو کیا کیا جائے، اس کو بدل کے طور پر کسی دوسرے پیشے میں نہیں لگایا جا سکتا اس لیے کہ ہمارے مفروضے کے مطابق کوئی دوسرا پیشہ موجود ہی نہیں ہے۔ گویا انتخاب صرف زرعی کام اور بیکاری کے درمیان رہ جاتا ہے۔ ان حالات میں کچھ زائد محنت کو زمین پر بخوبی لگایا جا سکتا ہے، بشرطیکہ اس کے نتیجے کے طور پر پیداوار میں بھی کچھ اضافہ ہو، گو ممکن ہے کہ یہ اضافہ محنت کی زائد اکائیوں کے تناسب نہ ہو۔ فرض کیجئے کہ محنت کی زاید اکائیوں کے لگانے سے مجموعی خام آمدنی میں ۲۰۰ روپے کا اضافہ ہوتا ہے۔ گویا صورت حال یہ ہوگی:۔ مجموعی خام آمدنی ۸۰۰ جملہ مصارف ۱۲۰ روپے لہٰذا خالص آمدنی ۶۸۰ روپے ہوگی۔

ہم اب ان صورتوں کو بہ لحاظ ترتیب خوبی پیش کریں گے:۔

م سے مطلب محنت کی ایک اکائی (یعنی ایک اوسط خاندان)

ا سے مطلب اصل کی ایک اکائی (یعنی ایک ہل اور بیلوں کی ایک جوڑ)

پہلی صورت ۔ ۱م + ۱ا + ۲۰ ایکڑ؛ خالص آمدنی ۴۸۰ روپے؛ آمدنی

باب

فی رکن خاندان = ۳۸۴ ÷ ۴ = ۹۶ روپے۔

دوسری صورت۔ ۴م + ۱ا + ۲۰ ایکڑ؛ خالص آمدنی ۶۸۰ روپے؛ آمدنی فی کس = ۶۸۰ ÷ ۱۶ = ۴۲ روپے۔

تیسری صورت۔ ۴م + ۴ا + ۲۰ ایکڑ؛ خالص آمدنی ۳۶۰؛ آمدنی فی کس = ۳۶۰ ÷ ۲۰ = ۱۸ روپے۔

گویا بہترین نتیجہ اس وقت برآمد ہوتا ہے جبکہ ۲۰ ایکڑ کے رقبے پر محنت و اصل کی ایک ایک اکائی لگائی جائے۔ بس یہی "معاشی کھیت" ہے۔ اس مثالی کھیت میں زمین، محنت و اصل جس تناسب سے لگائے گئے ہیں اس کے علاوہ کسی دوسرے تناسب سے لگانے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کھیت غیر معاشی یا غیر منفعت بخش ہوں گے اور پیدا کنندوں کی آمدنی فی کس گھٹ جائے گی۔ گویا غیر معاشی کھیت کے عاملین پیدائش کے تناسب کو بدل کر مثالی کھیت کی نسبتوں کے جتنا جتنا قریب لیا جائے گا اتنا ہی زیادہ غیر معاشی کھیت، معاشی کھیت بنتا جائے گا۔ پیدا کنندوں کے نقطۂ نظر سے پہلی صورت سے بہترین نتائج حاصل ہوتے ہیں، بشرطیکہ تین خاندانوں کی زائد محنت کو زراعت کے سوا کسی دوسرے منفعت بخش پیشے میں لگایا جا سکتا ہو۔ لیکن اگر حالات اس قسم کے ہوں کہ کل خاندانوں کو بلا شرکت غیرے ۲۰ ایکڑ زمین ہی پر انحصار کرنا پڑے تو دوسری صورت کا انتظام بہترین ہوگا۔ اس لیے کہ پہلی صورت میں چاروں خاندانوں کو بحیثیت مجموعی خالص آمدنی ۴۸۰ روپے اور اس کے برعکس دوسری صورت میں ۶۸۰ روپے وصول ہوتی ہے۔ پھر بھی اس سے اس واقعے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی کہ پہلی صورت ہی میں محنت، زمین و اصل کا تناسب بہترین اور مثالی ہے۔ اس طرح اگر چاروں خاندان کام کریں تو بہترین ترکیب ۴م + ۴ا + ۸۰ ایکڑ ہوتی۔ لیکن چونکہ صرف ۲۰ ایکڑ زمین دستیاب ہو سکتی ہے اس لیے اس کے بعد کی بہترین ترکیب اختیار کرنی پڑے گی جیسا کہ صورت دوم میں کیا گیا۔ غرض اس سے ضمنی طور پر یہ واقعہ ثابت ہوتا ہے کہ مشترکہ کاشت زمین پر انتہائی دباؤ کی خرابی کو ایک حد تک رفع کر دیتی ہے۔

221

یہ معلوم ہوگا کہ معاشی کھیت کی تعریف کے مسئلے پر غور کرنے کا یہ طریقہ اس طریقے

باب ۸

کے مقابلے میں کم قابل اعتراض ہے جو مذکورۂ بالا مروّجہ تعریفوں میں سے بعضوں کی تہ میں مضمر ہے۔ "معقول آرام" "اقل ترین معیار" اور "اعلیٰ معیار" یہ سب مبہم اور گنجلک اسلوب بیان ہے۔ اگر اس کے برعکس ہم یہ کہیں کہ جو مقصد حاصل کرنا ہے وہ یہ ہے کہ زمین، محنت واصل کی باہمی نسبت اس طرح قائم کی جائے کہ اس سے پیداکنندوں کو عظیم ترین ممکنہ فائدہ حاصل ہو تو دقت رفع ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ عظیم ترین معاشی فائدہ کسان کو بہت ہی اعلیٰ معیار زندگی برقرار رکھنے کے قابل بنائے یا اقل ترین معیار کے لیے بھی جو چیز ضروری خیال کی جائے اُس کو پورا نہ کر سکے۔ مثلاً یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ مذکورۂ بالا پہلی صورت کی آمدنی ۹۶ روپے فی کس عمدہ معیار راحت کے لیے کافی نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہی اعلیٰ ترین مقدار ہے جو حاصل ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ زمین، محنت اور اصل کی بہترین ممکنہ ترکیب قائم کرنے کے باوجود نتیجہ پوری طرح اطمینان بخش نہ ہو۔ اس کے لیے دوسرے اصلاحی تدابیر اختیار کرنا ضروری ہے؛ مثلاً طریق پیدائش کو زیادہ مؤثر بنانا، فروخت کے لیے زیادہ سہولتیں پیدا کرنا وغیرہ۔ "معاشی کھیتوں" کے قائم کرنے کا مقصد یہ ہے کہ رعیت کی حیثیت و حالت کو صرف اس حد تک جس حد تک کہ ایک مخصوص طریقے سے اس کی اصلاح کی جا سکتی ہے درست کیا جائے اور وہ طریقہ یہ ہے کہ مناسب وسعت کے کھیت پر اُس کو قبضہ دلایا جائے۔ باقی یہ اُمید رکھنا بیکار ہے کہ اس کی اصلاح کے لیے کوئی نئی زمین اور نیا آسمان پیدا کیا جا سکتا ہے۔ مذکورۂ بالا طریقہ رعیت کی مشکلات کا کامل حل نہیں ہے؛ بلکہ یہ صرف اُن طریقوں میں سے ایک ہے جن کے ذریعے سے صورت حال کی اصلاح ضروری ہے[1]

[1] لیکن بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ کھیتوں کے انتہائی طور پر چھوٹے ہونے کی خرابی خیالی اور فرضی ہے اور یہ کہ کھیت اس مفہوم میں غیر معاشی نہیں ہیں کہ وہ بہت زیادہ چھوٹے ہیں؛ بلکہ اس لحاظ سے غیر معاشی ہیں کہ وہ کسان کے لیے اس قدر بڑے ہیں کہ وہ اُن کی کافی دیکھ بھال نہیں کر سکتا۔ اُس کو اصل کی اس قدر کم مقدار پر دسترس حاصل ہوتی ہے اور اس کا عام ساز و سامان اس قدر سادہ ہوتا ہے کہ کھیت کے

باب 222

۹۔ اصلاحی تدابیر اب ہمیں ان اصلاحی تدابیر پر غور کرنا چاہیے جو ہندوستان میں تقسیم اراضی و انتشار کی خرابی کو رفع کرنے کے لیے اب تک اختیار یا تجویز کی گئیں۔ محکمۂ امداد باہمی کی سرپرستی میں پنجاب میں امداد باہمی کی انجمنیں قائم کر کے منتشر کھیتوں کو ایک شیرازے میں منظم کرنے کے دلچسپ تجربے کا آغاز ۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۱ء میں کیا گیا۔ چنانچہ ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۰ء کے ختم تک تقریباً تیس لین کے کل مزروعہ رقبے میں سے قریب قریب ۲۶۳،۴۶۲ ایکڑ زمین کو ازسرِ نو تقسیم کیا گیا ہے۔ مصارف کا اوسط ۲ روپے ۵ آنے فی ایکڑ رہا[1]۔ اس تحریک کا خلاصہ یہ ہے کہ اس میں امداد باہمی کے اصول کی سختی سے اتباع کی جاتی ہے۔ اور چھوٹے چھوٹے حقدار کو جو سوءِ ظن اور ناواجب خوف و ہراس ہوتا ہے اُس کا مقابلہ کرنے کے لیے ترغیب و تحریص اور مستقل مزاجی کے ساتھ پروپگنڈا ہی واحد آلۂ کار ہیں۔ کھیتوں کے انضمام و اتصال کا نتیجہ جس حد تک کہ اس کو عمل میں لایا گیا پوری طرح مفید برآمد ہوا ہے۔ زمین زیادہ پیدا آور ہو گئی ہے، جو رقبے سابق میں انتہائی انتشار کی وجہ سے غیر مزروعہ تھے ان پر کاشت شروع ہو چکی ہے، مقدمہ بازیوں اور لڑائی جھگڑوں میں کمی اور اصلاح و ترقی کی خواہش قوی اور نمایاں ہو گئی ہے۔ چنانچہ صوبۂ پنجاب بعض اعتباروں سے اس قسم کی امداد باہمی کی جد و جہد کے لیے خاص طور پر موزوں ہے جس کے نتیجے کے طور پر انضمام و اتصال اختیاری اور غیر جبری طریق پر عمل میں آرہا ہے۔ اوّل تو یہ کہ زمین اور آبادی دونوں کے لحاظ سے پنجاب کے دیہات میں زیادہ یکسانی پائی جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ چونکہ نہری نو آبادیات میں زمین کو زیرِ کاشت آئے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گزرا ہے اس لیے

بقیۂ حاشیۂ صفحۂ گزشتہ۔ رقبے میں زیادتی اُس کی مشکلات کو بڑھا دیتی ہے۔ اگر واقعی ایسا ہی ہے تو اس کا بدیہی علاج یہ ہوگا کہ متوسط درجے کے کھیت کے رقبے میں مزید کمی کی جائے۔ لیکن ابھی تک اس کی سفارش کرنے کا خیال کسی کے ذہن میں نہیں آیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ موجودہ بے سروسامانی اور اُس کے نتیجے کے طور پر افلاس تو ایک حد تک کھیت کے بہت چھوٹا ہونے کا نتیجہ ہے۔ اس میں توسیع کرنا گویا اُس کی پیداوار کی قیمت کو بڑھانا ہے۔ اگرچہ اس اشد ضروری اصلاح کے پہلو بہ پہلو یہ بھی ضروری ہے کہ معمولی کسان کے پاس اصل کی کمی کی مجبوری کو رفع کرنے کے لیے ہر ممکنہ تدبیر اختیار کی جائے۔

[1] دیکھو ایک کتاب موسوم بہ ہندوستان ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۱ء میں صفحہ ۱۰۹، ۱۱۰ اور انڈین ایئر بک بابتہ ۱۹۳۲ء صفحہ ۲۹۔

باب

ان میں کھیتوں کی تنظیم زیادہ آسان ہے ۔ تیسرے یہ کہ مقابلۃً سادہ حقیت اراضی بھی انضمام میں سہولت بہم پہنچاتی ہے ۔ لیکن بہترین حالات کے تحت بھی اس تحریک کی رفتار کا بہت سست ہونا یقینی ہے ۔ علاوہ ازیں اس بات کی بھی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ مستقبل میں انضمام کو برباد نہیں کیا جائے گا ۔ پنجاب کا تجربہ صرف انتشار اراضی کے مسئلے کے بارے میں عمل میں لایا گیا اور اس کا مقصد تقسیم اراضی کو روکنا نہیں ہے ۔ خود پنجاب کے عہدہ داروں مثلاً بیچ کیلورٹ ' یم ۔ یل ڈارلنگ ' اور سی ۔ یف اسٹرک لینڈ نے شاہی زرعی کمیشن کے روبرو اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ کھیتوں کے بکثرت انتشار کے مضر اثرات و نتائج سے کسانوں کو بچانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ آئین و قوانین وضع کر کے اُن پر کسانوں کو عمل کرنے پر مجبور کیا جائے ۔ اختیاری عمل کے قانون کی آزمائش ہندوستان میں ہو چکی اور وہ ناکام ثابت ہوا ۔ چنانچہ بڑودہ میں اس قسم کا قانون وضع کیا گیا ' لیکن ' جیسا کہ سر بانو بھائی مہتا نے اپنے صدارتی خطبے میں ' جو بمبئی کی صوبہ داری ' امداد باہمی کی کانفرنس میں ۱۹۲۶ء میں پڑھا گیا تھا ' تسلیم کیا ہے ' قانون محض مجموعۂ ضوابط میں درج ہے اور تقویم پارینہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا ۔ اختیاری عمل کی تجویز مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں میں بھی ناکام رہی اور اسی لیے وہ جبری قانون نافذ کرنے پر مجبور ہوئے ۔

223

پنجاب کی نہری نوآبادیات میں غیر کے ہاتھ جائداد منتقل کرنے پر بندشیں عائد کر کے اور بعض عملیات کی حد تک ترکے کو ایک ہی وارث تک محدود رکھ کر تقسیم اراضی کو روکا گیا ہے ۔ لیکن اس کی مدد سے کاشت کی تقسیم در تقسیم کو روکنے میں کامیابی نہیں ہوئی ہے ۔

مسلمانوں کے لیے مصری رواج کی سفارش کی گئی ہے جس کی رو سے زمین گو عام طور پر ورثا میں تقسیم کر دی جاتی ہے لیکن جملہ ورثا کی جانب سے کسی ایک شخص کی

لہ ۔ لیکن زرعی کمیشن قطعی طور پر یہ رائے ظاہر کرتا ہے کہ پنجاب میں جو کام انجام پا رہا ہے اُس کے متعلق یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ وہ دوسرے صوبوں کے لیے ناموزوں ہے اور بہت ہی احتیاط اور استقلال کے ساتھ معاشی مشکلات کی تحقیق کر کے رائے قائم کرنی چاہیئے ۔

باب

نگرانی میں کاشت کی غرض سے دیدی جاتی ہے یا امینوں کے سپرد کر دی جاتی ہے کہ وہ انتظام کریں۔ رپورٹ میں ہندوستان کے لیے کسی تقسیم و تسہیم کے بغیر موروثی کھیت کی مشترکہ کاشت کے طریق کی حمایت کی گئی ہے۔

حکومت کا محض غیر معاشی کھیتوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دینا کافی نہیں ہے، جیساکہ بمبئی کے تجربے سے ثابت ہوا۔ مشترکہ رپورٹ، جس پر بمبئی کا رعیت واری نظام مبنی ہے اس کے مرتب کرنے والوں کو یہ خوف ہوا کہ مبادا اراضی کی تقسیم در تقسیم کی خرابی رونما ہو۔ لہٰذا ضابطہ مالگزاری میں دفعہ (۹۸) کو شریک کرنے کے وہی ذمہ دار تھے، جس کی روسے کوئی سروے نمبر (پیمائش کردہ خطہ) ایک مقررہ اقل ترین رقبے سے جو زمین کی مختلف قسموں کے لحاظ سے وقتاً فوقتاً مشخص کیا جائے چھوٹا نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ شرط، اقل زمین مقررہ حد سے اوپر زمین کی تقسیم اور علیحدہ خطوں کے طور پر اس کی ملکیت کو روکنے میں غیر موثر ثابت ہوئی۔ عدالتوں نے ایسی تقسیم کو جائز تسلیم کیا اور اس لحاظ سے دفعہ (۹۸) کو منسوخ کرنا پڑا۔ چنانچہ آجکل کتابچۂ حقوق چھوٹی سے چھوٹی تقسیم کے وجود کو بھی تسلیم کرتی ہے۔

نومبر ۱۹۱۶ء میں مسٹر کیٹنگ نے، جو اُس وقت بمبئی کے محکمۂ زراعت کے ناظم تھے، ایک مسودۂ قانون اس غرض سے مرتب و پیش کیا کہ زمینداروں کو اس قابل بنایا جائے کہ اگر وہ چاہیں تو مستقل معاشی کھیت قائم کریں اور ان کو آئندہ کسی بنا پر بھی ذیلی حصوں میں تقسیم نہ کیا جا سکے، نیز انتظامی حکومت کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ غیر مقبوضہ سرکاری زمین کے بارے میں یہی نتائج حاصل کرے۔ لیکن چونکہ اس مسودے پر محکمہ جات عدالت و مالگزاری کے متعدد عہدہ داروں نے جن کے یہاں یہ مسودہ بغرض اظہار رائے بھیجا گیا تھا اُس پر مخالفانہ نکتہ چینیاں کیں، اس لیے اس کارروائی کو ہمیں ختم کر دینا پڑا۔ سب سے اہم اعتراض یہ تھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے معاشری نظام کے خلاف چھوٹے چھوٹے ناقابل تقسیم کھیت کثیر تعداد میں قائم ہوجائیں گے اور یہ کہ ایک بے زمین ادنیٰ طبقہ وجود میں آئے گا جو ایک ایسے ملک میں جہاں صنعتیں اس قدر کم ترقی یافتہ ہوں کہ اُن میں زائد زرعی آبادی کی کھپت نہیں ہو سکتی، خاص طور پر خطرناک ثابت ہوگا[1]۔

---

[1] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ، پیراگراف ۱۲۳۔

باب 224

صوبۂ متوسط میں کھیتوں کے انضمام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک خاص عہدہ دار کا تقرر عمل میں آیا ہے۔ صوبۂ دابری مجلس قانون ساز نے بھی ایک قانون "کھیتوں کے انضمام" کے نام سے ۱۹۲۸ء میں منظور کیا جس کا نفاذ ابتداءً صرف علاقہ چھتیس گڈھ میں ہونے والا تھا۔ اُس کی رو سے مستقل حقداروں میں سے کم از کم نصف کو جن کے پاس گاؤں کے مقبوضہ رقبے میں سے کم از کم ⅔ حصہ تھا، انضمام کی تجویز میں شریک ہونے کا اختیار دیا گیا اور اس تجویز کے منظور ہو جانے کے بعد اُس کی پابندی گاؤں کے جملہ حق داروں اور اُن کے ورثا پر لازم ہو جائے گی۔ بنک کاری کی تحقیق کی مرکزی کمیٹی نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ تین سال سے کچھ زائد مدت میں جس میں یہ قانون نافذ رہا ۲۰۵ گاؤں اس قانون سے مستفید ہونے کے لیے آمادہ ہو گئے تھے، ۱۴۷ گاؤں کا تصفیہ کیا گیا، اور نسبتہً قلیل سرکاری مصارف سے جملہ ۱۵۶،۵۰۰ ایکڑ زمین کا انضمام عمل میں آیا جو پہلے ہزاروں چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں تقسیم تھی[1]

۱۔ بمبئی کے چھوٹے کھیتوں کا مسودۂ قانون بابتہ ۱۹۲۷ء۔

اکتوبر ۱۹۲۷ء میں چھوٹے کھیتوں کا مسودۂ قانون آنریبل سر چونی لال مہتا نے بمبئی کی مجلس قانون ساز میں پیش کیا۔ اس مسودے کے ابتدائی جزو میں یہ تجویز کی گئی تھی کہ مقامی حالات کے لحاظ سے ایک معیاری اکائی کے مقرر کرنے کا انتظام کیا جائے اور اس اکائی میں وہ اقل ترین رقبہ ہو جس پر علٰحدہ خطے کے طور پر منفعت کے ساتھ کاشت کی جا سکے۔ اور اس حد سے نیچے کے جملہ کھیت اجزا قرار دیے جانے والے تھے۔ مسودۂ مذکور کا مقصد یہ تھا کہ قدیم ٹکڑاوں کی مزید ذیلی تقسیم کو اور نئے ٹکڑے قائم کیے جانے کو روکا جائے اور کھیتوں کے اتصال کو ترقی دی جائے۔ موجودہ منتشر خطوں پر گو مالک کاشت کر سکتے تھے لیکن اُن کو کسی دوسرے کے ہاتھ اس طریقے پر منتقل نہیں کیا جا سکتا تھا جس سے ان میں مزید انتشار پیدا ہو۔ منتشر کھیتوں کا انتقال اُس وقت تک جائز نہ تھا

[1] دیکھو مرکزی بنک کاری کی کمیٹی کی رپورٹ شائع شدہ ۱۹۳۱ء پیراگراف (۱۰۱)۔

باب

جب تک کہ اس کی بنا پر منتشر کھیت یکجا نہ ہو جائیں۔ معیاری اکائی کے مقرر کیے جانے کے بعد جو نئے کھیت وجود میں آئیں ان کی حد تک جملہ انتقالات کا حق شفعہ ہمسایہ مالکوں یا پٹے داروں کے لیے مرجح تھا۔ گو کسی کو نئے منتشر خطے کا قابض بننے سے روکا نہیں گیا تھا' پھر بھی اس پر اُس وقت تک کاشت نہیں کی جاسکتی تھی جب تک کہ ملحقہ خطے یا خطوں میں وہ شریک نہ کر لیا جائے تاکہ اس طرح جو مجموعی رقبہ زیر کاشت آئے وہ یا تو معیاری اکائی کے مساوی ہو جائے یا اس سے بڑھ جائے۔

مسودے کے دوسرے جزو کا مقصد یہ تھا کہ زیادہ منفعت بخش کاشت کی غرض سے موجودہ منتشر خطوں کا انضمام کیا جائے۔ چنانچہ اس میں یہ قرار دیا گیا تھا کہ کلکٹر کی تحریک پر کسی گاؤں یا رقبے کے لیے تجویز مرتب کی جاسکتی تھی' بشرطیکہ کم از کم ⅔ خطوں کے قابض اور متاثرہ زمین کے کم از کم نصف حصے کے مالک اس تجویز کے مرتب کرنے پر راضی ہوں۔ اس تجویز کا نفاذ ایک خاص عہدہ دار انضمام کے ذریعے سے عمل میں آنے والا تھا جو متعلقہ گاؤں کے تین نمایندوں کی مدد سے یہ کام انجام دینے والا تھا۔

225

۱۱۔ مسودۂ مذکور کے بارے میں بحث مباحثہ۔

اس مسودے میں کسی حد تک جبر کا عنصر موجود تھا۔ لیکن بقول اسٹینلی جیونس" یہ ایک حیرت انگیز اور نہایت ہی اہم عمرانی واقعہ ہے کہ وہ قوانین اور رسم و رواج جو ملکیت و استعمال زمین کی تنظیم کرتے ہیں معاشرے کی کسی دوسری امتیازی خصوصیت کے مقابلے میں قائم و باقی رہنے کا زیادہ قوی میلان رکھتے ہیں' اور اس لحاظ سے ان میں بجز قانون کی ناقابل مقاومت قوت کے کسی دوسرے خارجی عمل کے ذریعے سے تغیر و تبدل کرنا دشوار ہے"[1]

دوسرا اعتراض یہ تھا کہ مسودۂ مذکور قانون وراثت اور ان اصول میں مداخلت کرتا تھا جن پر ہندوستان کی خاندانی زندگی کا دار و مدار ہے۔ اس کا یہ جواب دیا جاسکتا تھا کہ قانون وراثت میں اس وجہ سے مداخلت ہوتی تھی کہ مسودے

[1] ۔ چنانچہ مجلس مقننہ بمبئی کے مباحث میں ۱۰ اکتوبر ۱۹۲۷ء میں سر چونی لال مہتا نے اس قول کا حوالہ دیا۔

باب

کی رو سے مفادات کی علٰحدگی کو روا رکھا گیا تھا گو ایک مقررہ حد کے بعد جائداد غیر منقولہ کی کاشت کے لیے دراصل طبیعی طور پر ذیلی تقسیم جائز نہ تھی۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ "مسودۂ مذکورہ نے اس قانون میں تغیر کرنے کی بجائے جس پر تفریق و تقسیم مبنی تھی طریق تقسیم و علٰحدگی میں تبدیلی کرنے کی کوشش کی؛ بہرحال قانون تو انسان کا بنایا ہوا ہوتا ہے لہٰذا اگر یہ معلوم ہو کہ وہ اُمّ الفساد و شر ہے تو اس کو رفع کرنے کی واحد معقول تدبیر صرف یہ ہے کہ اس کو بدل دیا جائے۔

لیکن اس مسودے کے بارے میں اکثر جو اعتراض سنائی دیتا تھا وہ یہ تھا کہ اس کی وجہ سے بہت سے کسان بے دخل ہو جائیں گے اور بے زمین مزدوروں کی تعداد بہت بڑھ جائے گی۔ یہ اعتراض اس مفروضے پر مبنی تھا کہ معیاری کھیت کا رقبہ اتنا مقرر کیا جائے گا جو کسان کے موجودہ متوسط درجے کے کھیت سے بہت بڑا ہوگا۔ لیکن مسودۂ مذکور کا مقصد یہ تھا کہ "معاشی کھیتوں" کی بجائے "منفعت بخش کھیت" وجود میں لائے جائیں۔ چنانچہ معیاری اکائی کی تعریف یہ کی گئی تھی کہ ایسا اقل ترین رقبہ جو معاشی کھیت نہ ہو تو کم از کم نفع بخش کاشت کے لیے ضروری ہو۔ ہماری بیان کردہ تعریف کے مطابق معاشی کھیت جتنا ہونا چاہیے اُس سے بہت چھوٹا کھیت بھی نفع بخش ہو سکتا ہے۔ یہ ممکن معلوم ہوتا تھا کہ جہاں معاشی کھیت کا رقبہ ۲۰ ایکڑ ہوگا وہاں معیاری اکائی کا رقبہ کم و بیش ۳ یا ۴ ایکڑ مقرر کیا جاتا۔ اگر ایسا ہوتا تو اس مخصوص قانون کے نفاذ کے نتیجے کے طور پر دراصل بہت کم لوگوں کو زمین الگ کرنی پڑتی۔

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ معیاری اکائی کے لیے بہت ہی معمولی رقبہ تجویز کیا گیا تھا تو بھی اس کا قرینہ تھا کہ ان لوگوں میں سے اکثر جنھیں نئے قانون کے تحت بیع یا فروخت کے ذریعے سے زمین کو الگ کرنا پڑتا وہی لوگ ہوتے جن کے کھیت اس قدر چھوٹے تھے کہ صرف ان ہی پر گزارہ کرنا ممکن نہ تھا اور جو اس لحاظ سے ہمہ وقتی کسان نہ تھے۔ جو کچھ بھی چھوٹے کھیت اُن کے قبضے میں تھے وہ اس لحاظ سے نقصان رساں تھے کہ وہ ایسے پیشے میں مناسب توجہ مرتکز کرنے کی راہ میں مزاحم تھے جو ان کسانوں کا سب سے بڑا ذریعۂ معاش تھا؛ ان حالات میں قابض کا

ب 226

اس میں زیادہ فائدہ ہوتا کہ وہ اپنی زمین کو ذیلی پٹے پر دے دیتا، گویا وہ محض اس خطے کا مالک رہ کر بھی فائدہ اٹھاتا اور خود کاشت کر کے نقصان اٹھانے اور وقت ضائع کرنے سے محفوظ رہتا[1]

مسودۂ مذکور کے نقادوں نے اس امکان کو بھی نظر انداز کر دیا کہ یہ مسودہ بے احتیاطی کے ساتھ تقسیم در تقسیم کرنے کے حق میں حوصلہ شکن ثابت ہوتا اور اس طرح ملکیت کو ساقط کرنے کا سوال اکثر صورتوں میں رونما ہی نہیں ہوتا۔ اگر تقسیم و تفریق کا نتیجہ یہ ہوتا کہ خاندانی کھیت مقررہ اقل ترین رقبے سے چھوٹے خطوں میں تقسیم ہوجاتا تو، اس پر چند مجوزہ قانونی پابندیاں عائد کر دینے کے بعد لوگ تقسیم کی کوشش سے باز رہتے۔ کھیتوں کو تقسیم کرنے کے بعد بھی مشترکہ طور پر کاشت کرنے کا طریقہ زیادہ عام ہوجاتا جس میں پیداوار کی تقسیم ہوتی اور زمین کی تقسیم عمل میں نہ آتی۔ یہ مسودہ ایک ذیلی منتخب کمیٹی کے حوالے کیا گیا جس نے مئی ۱۹۲۸ء میں رپورٹ پیش کی اور اس مسودے کو زیادہ مناسب اور قابل قبول بنانے کے لیے چند جزوی ترمیمیں بھی پیش کیں لیکن کونسل کے اندر اور باہر سخت مخالفت کی وجہ سے مسودے کو غیر معین مدت کے لیے ملتوی کر دینا پڑا۔ مخالفت اس غلط فہمی کی بنا پر کی جارہی تھی کہ مسودہ منظور ہوجانے کے بعد ملکیت کو بڑے پیمانے پر ساقط کرنا پڑے گا۔ اس غلط خیال کو رفع کرنے کے لیے مسٹر بی، ڈی، جادھو نے سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ سے اختلاف کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی کہ خود مسودۂ قانون میں معیاری اکائی کی تعریف کر دینا مناسب تھا۔ چنانچہ انھوں نے یہ تجویز کی کہ باغات کی زمین کے لیے ۱۰ گنٹھے (¼ ایکڑ) تری کی زمین (چاول کی کاشت) کے لیے ۵ گنٹھے، مالی (دریا کے کنارے کی) زمین کے لیے ۵ گنٹھے اور خشکی کی زراعت کے لیے ۴۰ گنٹھے مقرر کیے جائیں[2] گو یہ اکائیاں مقامی حالات کے لحاظ سے غالباً ہر جگہ موزوں نہ ہوتیں پھر بھی اُن کی

---

[1] دیکھو یف۔ جی۔ یچ اندرسن کا رسالہ جو بمبئی کے چھوٹے کھیتوں کے مسودۂ قانون کے بارے میں لکھا گیا تھا۔

[2] دیکھو منتخب کمیٹی کی رپورٹ دربارۂ مسودۂ قانون نمبر (۱۶) بابتہ ۱۹۲۸ء، صفحہ ۶۔

باب

یہ رائے مناسب و معقول تھی کہ عوام کے سوء ظن کو رفع کرنے کے لیے کچھ اطمینان دلانا قطعی طور پر ضروری تھا۔ اگر مسودے کے حامی اس کی حقیقی نوعیت کو عوام پر واضح کرتے اور ان کی تفہیم کرنے کے لیے کوئی باقاعدہ اور منظم جدوجہد کرتے تو اس مسودے کو غالباً زیادہ تائید حاصل ہوتی۔ لیکن چونکہ ایسا نہیں کیا گیا اس لیے جس حالت میں وہ پیش کیا گیا تھا اُسی حالت میں اُس کو کسی معقول شنوائی و سماعت کے بغیر واپس لے لینا پڑا۔

آخر میں زرعی کمیشن کے اس انتباہ کا ذکر نامناسب نہ ہوگا کہ تقسیم اراضی و انتشار کے مسئلے کو حل کرنے میں بہت احتیاط درکار ہے اور متاثرہ اشخاص کی رائے اور اُن کے میلانات کا انتہائی ممکنہ لحاظ بھی ضروری ہے۔ ممکن ہے کہ جبر کا عنصر ایک حد تک ناگزیر ہو، لیکن یہ خیال نہ کرلینا چاہیئے کہ جبر عوام کے خیالات و خواہشات پر نہایت احتیاط کے ساتھ توجہ دینے کی ضرورت سے بے نیاز کردیتا ہے۔ جبر کو انضمام کی مجوزہ تجویز کی ممکنہ طور پر سب سے آخری منزل کے لیے محفوظ رکھنا چاہیئے، اور اس کا استعمال آبادی کی اکثریت کے لیے سہولتیں پیدا کرنے کے لیے کیا جاسکتا ہے جن کی راہ میں ممکن ہے کہ ایک ضدی اقلیت بصورت دیگر رکاوٹ پیدا کرے۔ حکومت کو پروپیگنڈا کا کام اپنے ذمے لینا چاہیئے، اور مشکلات اور دشواریوں کو جدوجہد سے باز رہنے کا عذر نہ بننے دینا چاہیئے۔ جہاں کہیں انضمام اختیاری قانون کے تحت رائج

227

کیا جائے وہاں حکومت کو تدریجی طریقے پر عمل کرنا چاہیئے۔ خاص خاص رقبوں کو منتخب کرکے اختیاری قانون کے تحت اعلان یا اشتہار دینا چاہیئے اور کسی جبری طریقے کو رائج کرنے سے پیشتر حقداروں کی رائیں دریافت کرلینی چاہئیں[1]۔

ہم اوپر یہ بات قطعی طور پر تسلیم کرچکے ہیں کہ ہر آئینی تدبیر خواہ وہ کتنی ہی معتدل کیوں نہ ہو اگر اراضی کی تقسیم در تقسیم اور کھیتوں کے انتشار کی موجودہ انتہائی مشکل کی اصلاح کے لیے اختیار کی جائے گی تو اس کی وجہ سے کچھ نہ کچھ اسقاط ملکیت یا بے دخلی لازمی طور پر نما ہوگی۔ اور گو ہم یہ خیال ظاہر کرچکے ہیں کہ جو لوگ اس طرح

[1] ۔ زرعی کمیشن کی رپورٹ، پیراگراف (۱۲۷)

باب

اپنی زمین کو الگ کرنے پر مجبور ہوں گے ان کی حالت نہ صرف مذکورۂ بالا وجوہ کی بنا پر بلکہ اس وجہ سے بھی پہلے سے بہتر ہو جائے گی کہ کھیتوں کا رقبہ بڑھ جانے کے معنیٰ زیادہ سر سبز زراعت اور مزدوروں کے لیے زیادہ کام نکلنے کے ہوں گے۔ تاہم خاص تدابیر اختیار کرنا مناسب ہوگا تاکہ بے دخل کیے ہوئے تابعین جلد کسی نفعت بخش و آرام دہ کام میں جذب ہو جائیں۔ لہٰذا اسی غرض سے زراعت کی اصلاح و ترقی کو وسعت دینی چاہیے؛ جہاں کہیں ممکن ہو آبادکاری کی تجاویز کو روبعمل لانا چاہیے؛ ویسی صنعتوں کو جو زراعت سے حتی الامکان قریبی تعلق رکھتی ہوں ترقی دینی چاہیے؛ اور صنعتی ترقی کی رفتار کو تیز کرنا چاہیے۔

مستقل اصلاح و ترقی

۱۲۔ مستقل اصلاح و ترقی کا فقدان اور اُس کے نتائج۔

مغربی و ہندوستانی کاشتکاری میں جو نمایاں فرق و اختلافات ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہندوستان میں زمین کی مستقل اصلاح و ترقی تقریباً بالکل مفقود ہے۔ بمبئی دکن کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے جو ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے بارے میں بھی کم و بیش صادق آتے ہیں کیٹنگ کہتا ہے کہ مغربی حصے میں پہاڑیوں کے ڈھالوں پر چھوٹے مالکوں نے احتیاط اور محنت کے ساتھ زینہ نما کھیت بنا لیے ہیں کہیں کہیں کسی خوش نصیب خطے میں آبپاشی کے کنویں موجود ہیں، اور کھیتوں پر کسانوں کے کچھ گھر دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن میدانوں کے بیشتر حصے کو انسان نے ابھی تک ہاتھ نہیں لگایا ہے؛ چنانچہ اردگرد باڑ یا پشتے تو درکنار آبپاشی کا تک انتظام نہیں ہے اور نہ ان میں انسان یا جانور کے لیے پناہ لینے کی کوئی جگہ ہے۔[1]

[1] دیکھو کیٹنگ کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۱۰۰۔

باب ۸

مناسب باڑوں کے نہ ہونے سے فصلیں جنگلی خنزیر، بھٹکے ہوئے مویشیوں اور کھیت چرانے والوں کے رحم و کرم پر رہتی ہیں۔ اس کی وجہ سے سرحدوں کے جھگڑے الگ ہوتے ہیں اور مویشیوں کو اکٹھا کرنے اور فصلوں کی نگرانی میں بھی بہت محنت صرف ہوتی ہے۔ ہوا کو روکنے والی دیوار یا باڑ نہ ہونے کی وجہ سے تیز و تند ہوا کے جھونکے کپاس جیسی فصلوں کو بہت کچھ نقصان پہنچاتے ہیں۔ گو انفرادی طور پر اور امداد باہمی کے اصول پر مناسب باڑ لگانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں لیکن اس سلسلے میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ کھیتوں میں پشتے تو نام کو نہیں ہوتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کانٹ چھانٹ اور چھیل چھال کی وجہ سے بہت سی مٹی ضائع ہو جاتی ہے اور کاشتکار کو نقصان ہوتا ہے حالانکہ وہ اس سے بچ سکتا ہے۔ علاوہ ازیں زمین میں مناسب ڈھال نہیں رکھا جاتا اور نہ اس کو اس طریقے پر سطح کیا جاتا ہے کہ پانی یکسانی کے ساتھ جذب ہو سکے۔ زائد پانی کو نالیوں کے ذریعے سے خارج کرنے کا بھی کوئی معقول انتظام نہیں، نتیجہ یہ کہ پانی گڈھوں میں جمع ہو جاتا ہے؛ اور اگر بدرو بنائے بھی جاتے ہیں تو دوسرے اشخاص کی زمینوں پر پانی بہنے لگتا ہے اور ان کو نقصان پہنچتا ہے۔ چنانچہ "دریائے جمنا کے بائیں کنارے ہزاروں ایکڑ قیمتی زمین نالوں کا جال بچھ جانے کی وجہ سے تباہ ہو گئی، اور جن دیہات کے اطراف کسی زمانے میں زرخیز کھیت تھے وہ اب بیکار نالیوں کے جال میں گھرے پڑے ہیں۔[1] بالائی سطح کے پانی کے بہنے کا مناسب انتظام کرنے سے یہ سب خرابیاں رفع ہو جائیں گی فصلوں کی پیداوار میں اضافہ ہوگا اور سوتوں کی سطح بلند ہو جانے کی وجہ سے کنویں سال بھر کارآمد رہیں گے۔[2]

228

عام طور پر دیکھا جائے تو مطلوبہ پیمانے پر کھیتوں کے پشتوں اور مضبوط باڑ کا انتظام انفرادی کسان کے بس سے باہر ہے، اور اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے اس بات کی

---

[1] دیکھو ڈاکٹر کلاؤسٹن کی یادداشت، زرعی کمیشن کی رپورٹ کی روداد شہادت میں جلد اوّل، صفحہ ۱۲۔

[2] دیکھو ہارولڈ کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۱۴۔

ضرورت ہے کہ زمین کی اصلاح و ترقی کی مشترکہ تجاویز اختیار کی جائیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ حکومت قرضہ بطور تقاوی آزادی کے ساتھ منظور کرے اور خاص ماہر عہدہ داروں کے تقرر کے ذریعے سے فنی نگرانی اور مشورہ مہیا کر کے اس کام میں مزید مدد بہم پہنچائے۔ بعض صوبہ داری حکومتوں نے جدت دکھا کر پشتوں کے بارے میں خاص عہدہ داروں کا تقرر کیا ہے۔ کھیتوں پر سائبان یا باڑہ کا نہ ہونا بھی بہت بڑی خرابی ہے جس کی وجہ سے نہ صرف نگرانی مشکل ہو جاتی ہے بلکہ انسان اور مویشیوں کا وقت اور اُن کی محنت بھی غیر ضروری طور پر ضائع جاتی ہے۔ مویشیوں کو حفاظت نہیں رکھا جا سکتا اور آدمیوں کے ساتھ جانوروں کو بھی گاؤں کے گھر میں رکھنے کا طریقہ نہایت غیر اطمینان بخش ہے۔ گاؤں سے کھیت تک کھاد ڈھو کر لے جانے کا عمل لازمی طور پر وقت طلب اور نقصان رساں ہوگا۔ لیکن کھیت پر مناسب مکان تعمیر کرنے کی راہ میں متعدد دشواریاں ہیں جن کے رفع کرنے میں وقت لگے گا۔ ایک وقت تو یہ ہے کہ کھیت کے مکان کی بود و باش کسان کو اس امن و امان و تحفظ سے محروم کر دے گی جس سے وہ دوسرے کسانوں کے ساتھ گاؤں کے حدود میں رہ کر سر دست متمتع ہو رہا ہے۔ باہمی تحفظ کی ضرورت سرکار برطانیہ کے نظم و امن قائم کرنے سے پیشتر بہت زیادہ تھی لیکن اب بھی وہ ایک اہم اور قابل لحاظ امر ہے۔ دوسرے یہ کہ گاؤں کے آبائی مکان سے وابستگی، کھیت کے نئے مکان میں منتقل ہونے کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔ تیسرے یہ کہ نقل مقام کے مصارف ایک اہم مانع ہیں۔ چوتھے یہ کہ اوسط درجے کا مزرعہ عام طور پر اس قدر منتشر ہوتا ہے کہ کسان ایک کھیت کا مالک نہیں ہوتا بلکہ متعدد چھوٹے چھوٹے کھیت اُس کے قبضے میں ہوتے ہیں۔ اور سب سے آخر میں پانچویں یہ کہ کسان جہاں گاؤں کے حدود کے اندر رہ کر پینے کا پانی حاصل کرنے کے لیے گاؤں کے عام مشترکہ کنوؤں سے استفادہ کر سکتا ہے وہاں اگر وہ اپنے مزرعے میں کھیت کے مکان میں منتقل ہو تو اُسے اپنا ایک ذاتی کنواں کھودنا پڑے گا۔ لیکن اس عظیم فائدے کے مد نظر جو ہر کسان کو انفرادی طور پر اپنے کھیتوں پر مقیم ہونے سے حاصل ہوگا ان سب دقتوں اور دشواریوں کو راستے سے دور کرنا چاہیئے۔

باب

229

باب ۶

آبپاشی

۲۴۱۔ آبپاشی کی ضرورت و اہمیت[1]

اس کے کئی وجوہ ہیں کہ کیوں ہم اپنی زراعت کے بارے میں کلیتہً بارش ہی پر انحصار نہیں کر سکتے اور کیوں کسان کے لیے آبپاشی کی مناسب سہولتیں بہم پہنچانا ضروری ہے۔ سندھ، راجپوتانہ، اور جنوب مغربی پنجاب جیسے اکثر علاقے ہیں جہاں بارش اس قدر کم ہوتی ہے کہ نہ ہونے کے برابر۔ گویا مصنوعی آبپاشی کے بغیر زراعت غیر ممکن ہے۔ دوسرے یہ کہ بعض مقامات پر بارش اس قدر کم تو نہیں ہوتی لیکن بے وقت ہوتی ہے اور اس کی تقسیم خراب ہے۔ مثلاً دکن کے بالائی حصوں میں خشک سالی اور وقت پر بارش نہ ہونے کی شکایت بہت دیرینہ ہے۔ تیسرے یہ کہ چاول اور شکر جیسی بعض فصلوں کو باقاعدہ اور کافی پانی دینا ضروری ہے جو بجز خاص خاص مقاموں کے ہر جگہ بارش کے ذریعے سے نہیں ملتا۔ چوتھے یہ کہ اضافۂ آبادی کے دباؤ کے تحت، زمین کی کاشت عمیق نے دوسری یا سرمائی فصلوں کو ضروری بنا دیا ہے؛ لہٰذا سرمائی بارش نہ ہونے کی صورت میں مصنوعی آبپاشی ضروری ہے۔ اور آخر میں یہ کہ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ قریب قریب ۸۰ فیصد آبادی کا دارومدار زراعت پر ہے، اور آبپاشی کی سی ضروری و اہم چیز کی کافی مقدار میں موجودگی یا عدم موجودگی سے اس کی خوشحالی کا متاثر ہونا لابدی ہے۔ اسی وجہ سے قدیم زمین ایام سے ہندوستان میں آبپاشی کا رواج چلا آرہا ہے، خاصکر کنووں اور نالابوں کی شکل میں؛ اور برطانوی دور نے آبپاشی کے نظام میں جو اضافہ کیا ہے وہ بڑے بڑے کارہائے آبپاشی پر مشتمل ہے جو بڑے بڑے دریاؤں کے زاید پانی سے

---

[1] دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "سہ سالہ تبصرہ بر آبپاشی از ۱۹۲۷ء تا ۱۹۳۰ء" Triennial Review of Irrigation نیز ہیرس کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان میں آبپاشی" صفحہ ۱ تا ۴۔

باب

استفادہ کرنے کی غرض سے تعمیر کیے گئے ہیں۔

آبپاشی کے فوائد بے شمار ہیں چنانچہ اہم ترین یہ ہیں۔ فصلوں کی پیداوار میں اضافہ، خشک اور زیرِ خطر علاقوں میں مستقل کھیتی باڑی کا کامیاب انتظام، قحط و قلت سے تحفظ، پنجاب جیسے زرعی صوبوں میں ریلوں سے بکثرت منافعہ اور سرکاری محاصل میں براہِ راست اضافہ۔

230

۱۴۔ کارہائے آبپاشی کی تبویب۔

(۱) عام تبویب۔

ہندوستان میں کارہائے آبپاشی کی تین اہم قسمیں ہیں (۱) کنوئیں (۲) تالاب اور (۳) نہریں۔ نہریں بھی تین قسم کی ہیں (۱) سیلابی نہریں۔ (۲) مدامی نہریں اور (۳) کارہائے ذخیرۂ آب[1]

(۱) **کنوئیں**۔ ہندوستانی آبپاشی کے نظام میں کنواں ایک اہم عامل ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ چنانچہ جن رقبوں پر آبپاشی کی جاتی ہے ان میں سے ۲۵ فیصد کنووں سے مستفید ہوتے ہیں[2]۔ ملک کے مختلف حصوں میں بشمول دیسی ریاستوں کے جملہ ۲۵ لاکھ کنوئیں ہیں جن سے ایک کروڑ ۶۰ لاکھ ایکڑ زمین سیراب ہوتی ہے اور اُن کی لاگت کا اندازہ ایک ارب روپیہ کیا جاتا ہے۔ اس قسم کی آبپاشی بہت بڑا افادہ رکھتی ہے اور نہری آبپاشی کے مقابلے میں زیادہ موثر ہے[3]۔ کنووں کی کُھدائی زیادہ ترنج کے طور پر کی جاتی ہے اگرچہ حکومت بھی

---

[1] آبپاشی کے جن دوسرے طریقوں سے ہندوستان میں کام لیا جاتا ہے اُن کے منجملہ ایک یہ ہے کہ دریاؤں کا پانی کنووں کی طرح نکال کر آبپاشی کی جاتی ہے اور دوسرا یہ کہ سیلابی پانی کو روک کر عارضی بند تعمیر کیے جاتے ہیں۔ دیکھو ایک کتاب موسوم بہ "ہندوستان ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۱ء" میں صفحہ ۲۲۹۔

[2] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ ضمیمۂ دوم، جس میں ۱۹۰۰ء تا ۱۹۲۶ء میں کنووں کی آبپاشی کے رقبے کے بارے میں اعداد و شمار دیئے گئے ہیں۔

[3] جب کاشتکار کو ہر قطرۂ آب جو وہ استعمال کرتا ہے مختلف گہرائیوں سے اوپر کو لانا پڑتا ہے تو اُس کے استعمال میں بھی وہ زیادہ احتیاط سے کام لیتا ہے۔ نہری پانی کے مقابلے میں چاہی پانی کم از کم سہ گونہ زیادہ محنت عائد کرتا ہے۔ علاوہ ازیں زمین سے پانی نکالنے کے مصارف زیادہ

باب ۲

ان کی تیاری کی ہمت افزائی کرتی ہے۔ مثلاً اس غرض کے لیے تقاوی دیے جاتے ہیں اور اصلاح و ترقی یافتہ زمین پر زائد محصول معاف کیا جاتا ہے۔ کنووں کا افادہ زمین کو برما کر پانی نکالنے کے طریقے اور خاص وضع کے معمولی قوت سے چلنے والے پمپوں کی بدولت بہت بڑھ گیا ہے۔ محکمۂ زراعت کا شعبۂ انجنیری اس قسم کی اصلاح و ترقی کی جانب خاص طور پر توجہ کرتا اور اُس میں حصہ لیتا ہے۔ ہندوستان کے تمام صوبوں میں کنووں کی آبپاشی کی توسیع کی بہت بڑی گنجائش ہے۔ اگر کنووں کی کُھدائی اور پانی نکالنے کے لیے امداد باہمی کی چھوٹی انجمنیں قائم کی جائیں تو وہ چھوٹے چھوٹے انفرادی کھیتوں کے حق میں نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوں گی۔ گو زرعی کمیشن صوبۂ متحدہ کی اس تجویز کا موید نہیں ہے کہ "نل کنوئیں"[1] بنانے کے لیے مالی امداد دی جائے لیکن یہ سفارش کرتا ہے کہ حکومت ان کی تعمیر میں حسب ذیل طریقوں سے مدد دے؛ یعنی فنی مشورہ دیا جائے، تقاوی قرضے دیے جائیں اور زمیندار کو تھوڑی سی فیس ادا کرنے پر کُھدائی اور برمانے کا ساز و سامان اور ماہر مزدور فراہم کیے جائیں[2]۔

(۲) تالاب۔ تالاب بہت ہی قدیم زمانے سے ہندوستانی زرعی معیشت کی امتیازی خصوصیت ہیں۔ لیکن پنجاب اور سندھ میں وہ تقریباً مفقود ہیں۔ مدراس میں یہ سب سے زیادہ ترقی یافتہ حالت میں موجود ہیں؛ چنانچہ یہاں ... ۳۵ معمولی کار ہائے 231

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ۔ ہوتے ہیں اس لیے وہ عام طور پر اعلیٰ درجے کی فصلوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ کنوئیں کی آبپاشی کی ہوئی زمینوں کی پیداوار نہروں کی آبیاری کی زمینوں کے مقابلے میں کم از کم ½ زیادہ ہوتی ہے۔ گو ایک نہری نظام کے تحت زیر کاشت لائے ہوئے بڑے بڑے رقبے ان دونوں نظاموں کے باہمی فرق کو کم کر دیتے ہیں۔ پھر بھی یہ ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ نہروں کی توسیع کنووں کے ذریعے سے آبپاشی کے امکانات میں اضافہ کر دیتی ہے۔ اس لیے کہ نہروں کا پانی زمین میں جذب ہو ہو کر زمین کے ذخیرۂ آب میں اضافہ اور اُس کی سطح کو بلند کر دیتا ہے۔

[1] (Tube Wells)۔

[2] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ؛ فقرہ (۲۷۴) و (۲۸۰)۔

باب

آبپاشی ہیں جو ۲۵ تا ۳۰ لاکھ ایکڑ زمین کو سیراب کرتے ہیں۔ تاہم متعدد قدیم دیہاتی تالاب مٹی اور ریگ سے پُر اور بے مرمت پڑے ہوئے ہیں۔ اس قدیم آبپاشی کی شکل سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے کے طریقے کو عام کرنے کے لیے حکومت اور عوام دونوں کو نہایت سرگرم کوشش کرنی چاہیے خاصکر ان علاقوں میں جہاں نہری آبپاشی غیر ممکن یا ناموزوں ہے۔

(۳) نہریں۔ موجودہ زمانے میں ہندوستان میں آبپاشی کی سب سے اہم شکل نہریں ہیں اور حکومت خاص طور پر اُن ہی کی ہمت افزائی کرتی ہے۔ نہروں کی عام طور پر دو قسمیں ہیں (۱) وہ نہریں جو سال تمام دریاؤں سے قدرتی طور پر پانی حاصل کرتی ہیں اور (۲) وہ نہریں جو مصنوعی ذخیرہ آب سے جاری رہتی ہیں۔ قسم اوّل کی نہریں زیادہ تر ان علاقوں میں کاٹی گئی ہیں جن میں سے ہمالیائی دریا گزرتے اور سال بھر بہتے رہتے ہیں حتیٰ کہ خشک گرمی کے موسم میں بھی پہاڑی برف لازوال ذخیرے کا کام دیتا ہے۔ مدراس میں بھی ایک حد تک یہی حالت پائی جاتی ہے جہاں سرمائی بارش بمبئی کے مقابلے میں زیادہ مقدار میں ہوتی ہے۔ دوسری قسم کی نہریں احاطۂ مدراس، دکن، صوبۂ متوسط اور بندیل کھنڈ میں پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ جزیرہ نمائے ہند کے دریا موسم بارش میں دھڑلے سے بہتے ہیں تاہم سال کے خشک مہینوں میں ان کا پانی بہت کم ہو جاتا ہے اور اس لحاظ سے مصنوعی ذخیرۂ آب ضروری ہے۔

پہلی قسم کی نہر کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) سیلابی نہر (۲) دوامی نہر۔

(۱) سیلابی نہروں میں دریا پر کوئی بند تعمیر کیے بغیر دریا سے براہِ راست پانی لیا جاتا ہے۔ لیکن ان میں اُس وقت تک پانی نہیں آتا جب تک کہ دریا میں سیلاب نہ آئے اور ایک خاص سطح تک نہ پہنچے چنانچہ نہر کے پانی میں دریا کی قدرتی سیلابی سطح کے لحاظ سے کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ سندھ اور پنجاب کی زمینوں کی آبپاشی اسی قسم کی نہروں سے ہوتی ہے جو علی الترتیب دریائے سندھ اور ستلج سے پانی حاصل کرتی ہیں۔ سندھ کی اکثر نہریں سیلابی ہیں۔ چونکہ ان کا انحصار قدرتی سیلابی سطح پر ہوتا ہے، اس لیے جس وقت اس سطح میں کمی ہو جاتی ہے ان میں بھی پانی کی مقدار کم ہو جاتی ہے اور مسلسل اور طویل طغیانی کی بدولت وہ زیادہ وسیع خطوں کو سیراب

باب

کرتی ہیں۔ اس طرح آبپاشی کا زمانہ جون سے ستمبر تک محدود ہوتا ہے اور سال کے باقی حصے میں کنووں کو استعمال کیے بغیر کاشت ناممکن ہو جاتی ہے۔ سندھ کے بند سکر کا افتتاح جنوری ۱۹۳۲ء میں ہوا اور وہ اپنی نوعیت کا دنیا کا سب سے بڑا بند ہے۔ دریائے سندھ کے پانی کو ایک بند تعمیر کر کے روکا گیا ہے اور اس ذریعے سے مذکورہ بالا نقص کو رفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے؛ چنانچہ اس بالائی حصے سے نکالی ہوئی نہروں میں پانی کو اتنی اعلیٰ سطح تک برقرار رکھنا ممکن ہوگا کہ پانی با فراط دستیاب ہو سکے اور آبپاشی کا کام سال بھر تک جاری رہ سکے۔ اسی قسم کی تدابیر پنجاب میں اختیار کی جارہی ہیں اور ان کاموں کو انجام دینے میں جو تاخیر ہو رہی ہے اس کی وجہ محض یہ ہے کہ مصارف بہت زیادہ ہیں۔

292

(۲) مدامی نہریں، جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، ایک ایسے دریا کے پانی کو کسی قسم کے سد یا بند کے ذریعے سے روک کر تعمیر کی جاتی ہیں جو سال بھر بہتا رہتا ہے اور جہاں آبپاشی کی ضرورت ہو وہاں اُس کا پانی نہر کے ذریعے سے پہنچایا جاتا ہے۔ اس طرح یہ نہریں دریا کے پانی کی قدرتی سطح کے تابع نہیں ہوتیں۔ اس قسم کے تحت صوبۂ متحدہ اور پنجاب کی جملہ مدامی نہروں کا نظام آتا ہے۔ سندھ اور پنجاب کی بعض سیلابی نہروں کو مدامی نہروں سے تبدیل کیا جا رہا ہے۔

کارہائے ذخیرۂ آب کی نہریں کسی وادی میں بند تعمیر کر کے بنائی جاتی ہیں۔ جس میں موسم بارش میں برسے ہوئے پانی کو ذخیرہ کیا جاتا ہے، اور اطراف و اکناف کی زمینوں کی آبپاشی کے لئے تقسیم کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں مون سون (بلو برشگال) کے زمانے میں بارش کے پانی کو جمع کرنے کے طریقے پر بہت قدیم زمانے سے عمل ہوتا آرہا ہے۔ چنانچہ اس قسم کے کام دکن، صوبۂ متوسط اور بندیل کھنڈ میں پائے جاتے ہیں۔

۴۱۔ کارہائے آبپاشی کی تبویب

(۲) سرکاری کارہائے آبپاشی کی تقسیم۔

جس ذریعے سے سرکاری کارہائے آبپاشی کا فنڈ مہیا کیا جاتا ہے اُس کو ظاہر کرنے کے لیے ۱۹۲۱ء تک ان کاموں کی تقسیم حسب ذیل طریقے پر کی جاتی تھی۔ (۱) کارہائے پیدا آور (۲) کارہائے حفاظتی اور (۳) کارہائے خورد۔

(۱) کارہائے پیدا آور۔ یہ توقع کی گئی تھی کہ ان کے

مکمل ہوجانے کے دس سال کے اندر ان سے اتنی مالگزاری وصول ہوگی کہ جتنا سرمایہ ان میں لگا تھا اس کے سالانہ سود کی رقم کو ادا کرنے کے لیے کافی ہوگی۔ اس قسم کے کام زیادہ تر شمالی ہند اور مدراس میں پائے جاتے ہیں۔ ۲۷-۱۹۲۶ء تا ۳۰-۱۹۲۹ء کے تین سالوں میں ان کار ہائے پیدآور سے اوسطاً ۲۲،۰۲،۳۰۴ ایکڑ زمین کی آبپاشی کی گئی اور سرمایہ کی مجموعی لاگت ۳۱-۱۹۳۰ء تا ۳۲-۱۹۳۱ء کے ختم تک ۹۲ کروڑ روپے تھی۔ سرکاری کار ہائے آبپاشی سے آبپاشی کیے ہوئے رقبے میں سب سے زیادہ اضافہ پیدآور کاموں کی قسم کے تحت ہوا، چنانچہ ۷۹-۱۸۷۸ء تا ۸۰-۱۸۷۹ء میں ۲ کروڑ ۷ لاکھ ۵۶ ہزار ۲ سو ۹ ایکڑ اور ۳۰-۱۹۲۹ء تا ۳۱-۱۹۳۰ء میں ۲ کروڑ ۳۵ لاکھ ۵ ہزار ۶ سو ۷۵ ایکڑ زمین کی آبپاشی ہوئی۔ ۳۱-۱۹۳۰ء تا ۳۲-۱۹۳۱ء میں رقبہ گھٹ کر ۲۲،۴۶،۳۰۳ ایکڑ ہو گیا۔

(۲) کار ہائے حفاظتی۔ یہ اس توقع سے نہیں بنائے گئے تھے کہ ان سے براہِ راست کوئی نفع حاصل ہوگا بلکہ مقصد غالباً یہ تھا کہ قحط کے زمانے میں دکن جیسے پُر خطر علاقوں میں خشک سالی سے بچاؤ ہو۔ قحط کے زمانے میں آبادی کی امداد کے لیے میعادی طور سے جن مصارف کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اُن میں یہ کام کمی کر دیتے ہیں۔ ان کاموں کے مصارف سرکاری محاصل جاریہ سے اور عام طور پر اُس سالانہ گنجائش سے پورے کیے جاتے ہیں جو امداد قحط اور بیمہ کی مد محفوظ میں رہتی ہے۔ گو یہ کام براہِ راست نفع بخش نہیں ہوتے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ عام طور پر ان سے نقصان ہوتا ہے، پھر بھی حفاظتی کار ہائے آبپاشی انجام کار اس لحاظ سے مفید ثابت ہوتے ہیں کہ وہ بے آب و گیاہ خطوں کی معاشی استواری کے ضامن ہوتے ہیں۔ ۲۸-۱۹۲۷ء تا ۳۱-۱۹۳۰ء کے تین سالوں میں کار ہائے غیر پیدآور سے اوسطاً ۳،۹۷،۹۰۱،۴ ایکڑ رقبے کی آبپاشی ہوئی اور اُن پر جتنا اصل صرف ہوا اس کی لاگت ۳۰-۱۹۲۹ء تا ۳۱-۱۹۳۰ء کے ختم تک ۴۴ کروڑ روپے تھی۔ ۳۱-۱۹۳۰ء تا ۳۲-۱۹۳۱ء میں زیر آبپاشی رقبہ ۲۰،۳ ملین ایکڑ تک بڑھ گیا۔

(۳) کار ہائے آبپاشی خورد۔ ان کا شمار متفرق کاموں کی قسم میں تھا جس میں خاصکر تالاب جیسے کام جن کو برطانوی حکومت نے اپنے اقتدار میں لینے کے بعد درست کیا اور برطانوی دور کے صرف چند کار ہائے خورد شامل تھے۔

باب

ان کارہائے خورد میں سرمائے اور مالگزاری کی مد رکھنے یا نہ رکھنے کے اعتبار سے مزید امتیاز کیا جاتا تھا۔ اور ان کے کل مصارف رواں مالگزاری سے پورے کیے جاتے تھے۔ قرضے لینے کی اجازت صرف پیدا آور کارہائے آبپاشی کے لیے دی جاتی تھی۔

سنہ ۱۹۲۱ کے بعد سے یہ قدیم تقسیم بدل دی گئی ہے، چنانچہ اب افادہ عام کے کسی کام کے مصارف بھی قرضے کے فنڈ سے پورے کیے جا سکتے ہیں۔ کارہائے پیدا آور وخورد کی قسموں کو منسوخ کر دیا گیا ہے اور جملہ کارہائے آبپاشی کو خواہ وہ کلاں ہوں یا خورد، جن کے مصارف کے لیے سرمایہ کی مد رکھی جاتی ہے، از سر نو دو قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے؛ یعنی (۱) پیدا آور اور (۲) غیر پیدا آور؛ اور اس کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا کہ ان کی تعمیر کے لیے کس فنڈ سے رقم حاصل کی جاتی ہے۔ تیسری قسم میں وہ رقبے داخل ہیں جن کی آبپاشی کارہائے غیر سرمایگی سے کی جاتی ہے۔

۱۵۔ کل کاموں کا پھیلاؤ، ان کی ترقی اور آمدنی۔

برطانوی ہند کا مجموعی رقبہ جس پر جملہ ذرائع سے آبپاشی کی گئی سنہ ۱۹۳۳ تا ۱۹۳۴ میں ۵ کروڑ ۰۵ لاکھ ایکڑ تھا جس کے مقابلے میں سنہ ۱۹۲۷ تا ۱۹۲۸ میں رقبہ صرف ۴ کروڑ ۶۰ لاکھ ایکڑ تھا۔ دوفصلی کھیتوں کی آبپاشی کے رقبے کو منہا کرنے کے بعد خالص زیر آبپاشی رقبہ سنہ ۱۹۳۳ تا ۱۹۳۴ میں ۵ کروڑ ۱۱ لاکھ ایکڑ اور اس کے مقابلے میں سنہ ۱۹۲۷ تا ۱۹۲۸ میں ۴ کروڑ ۳۲ لاکھ ۰۴ ہزار ۷ سو ۲۶ ایکڑ تھا۔ سنہ ۱۹۳۳ تا ۱۹۳۴ میں جتنا رقبہ زیر آبپاشی تھا اس کے منجملہ ۲۷ ملین ایکڑ پر نہروں کے ذریعے سے، ۶ ملین ایکڑ پر تالابوں کے ذریعے سے، ۱۱ ملین ایکڑ پر کنوؤں کے ذریعے سے اور ۶ ملین ایکڑ پر دوسرے ذرائع سے آبپاشی ہوئی۔ زیر آبپاشی مجموعی خام رقبے کے منجملہ ۱۹ ملین ایکڑ پر چاول، ۱۱ ملین پر گیہوں، ۴ ملین پر جو، مکئی، جوار، باجرا، ۶ ملین پر دالیں اور دو ملین ایکڑ پر نیشکر کاشت ہوئی۔ کپاس کی کاشت ۳ ملین ایکڑ پر اور دوسرے غیر خوردنی اجناس کی کاشت ۵ ملین ایکڑ زمین پر ہوئی[1]۔ گزشتہ چالیس سال میں کارہائے سرکاری کے زیر آبپاشی رقبے میں تدریجی ترقی ہوئی ہے۔

[1]۔ دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "زرعی اعداد و شمار برائے سنہ ۱۹۳۳ تا ۱۹۳۴" (عارضی) صفحہ ۱۔

چنانچہ سنہ ۱۸۷۸ء تا سنہ ۱۸۷۹ء میں رقبۂ زیرِ آبپاشی جس پر سال میں ایک دفعہ آبپاشی کی جاتی تھی ۱۰٫۵ ملین ایکڑ تھا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں یہ بڑھ کر ۱۹٫۲۵ ایکڑ ہو گیا اور سنہ ۱۹۱۹ء تا سنہ ۱۹۲۰ء میں ۲۸٫۱ ملین ایکڑ تک بڑھ گیا۔ گویا اس سے قبل تک اتنا بڑا رقبہ کبھی زیرِ آبپاشی نہ آیا تھا۔ لیکن سنہ ۱۹۲۲ء تا سنہ ۱۹۲۳ء میں اس میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ برطانوی ہند میں کارہائے سرکاری کے زیرِ آبپاشی کل رقبہ ۲۸٫۳۳ ملین ایکڑ تھا۔ سنہ ۱۹۲۶ء تا سنہ ۱۹۲۷ء میں رقبہ اُس کے قریب قریب یعنی ۲۸٫۲ ملین ایکڑ رہا۔ سنہ ۱۹۲۹ء تا سنہ ۱۹۳۰ء میں ہر قسم کے کارہائے سرکاری کے زیرِ آبپاشی رقبہ برطانوی ہند میں ۳۱٫۶۴ ملین ایکڑ یعنی ہندوستان کے مجموعی زیرِ کاشت رقبے کا ۱۲٫۷ فیصد تھا۔ سنہ ۱۹۳۲ء تا سنہ ۱۹۳۳ء میں سرکاری کارہائے آبپاشی سے کاشت کیا ہوا رقبہ ¾۲۹ ملین ایکڑ سے بھی زائد تھا جو مجموعی زیرِ کاشت رقبے کا ۱۲٫۵ فیصد ہوتا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، اضافہ زیادہ تر کارہائے پیدآور کے تحت ہوا۔ چنانچہ سنہ ۱۸۷۸ء تا سنہ ۱۸۷۹ء میں ۴٫۵ ملین ایکڑ، سنہ ۱۹۰۰ء تا سنہ ۱۹۰۱ء میں ۱۰٫۵ ملین ایکڑ، سنہ ۱۹۲۰ء تا سنہ ۱۹۲۱ء میں ۱۹٫۱۵ ملین ایکڑ، سنہ ۱۹۲۹ء تا سنہ ۱۹۳۰ء میں ۲۳٫۵۰ ملین ایکڑ اور سنہ ۱۹۳۰ء تا سنہ ۱۹۳۱ء میں ۲۲٫۴۵ ملین ایکڑ کی آبپاشی کی گئی۔ سنہ ۱۹۰۰ء تا سنہ ۱۹۰۱ء میں کارآمد بڑی نہروں، اُن کی شاخوں اور تقسیم کنندہ نالوں کا مجموعی طول ۴۲،۳۹ میل تھا، لیکن سنہ ۱۹۳۲ء تا سنہ ۱۹۳۳ء میں یہ طول بڑھ کر تقریباً ۷۵،۰۰۰ میل ہو گیا۔ اندازہ کیا گیا کہ اس سال کارہائے سرکاری سے آبپاشی کردہ فصلوں کی قیمت ۸۷ کروڑ روپے تھی۔ پنجاب سے سالانہ جو گیہوں برآمد کیا جاتا ہے اس کی قیمت ایک ملین اسٹرلنگ سے بڑھ کر ۶ ملین اسٹرلنگ ہو گئی ہے۔ سنہ ۱۹۳۲ء تا سنہ ۱۹۳۳ء کے ختم تک کارہائے آبپاشی و کشتی رانی پر بشمول ان کاموں کے جو زیرِ تعمیر ہیں، ایک ارب ۴۶ کروڑ روپیہ سرمایہ صرف ہوا۔ اس کے برخلاف سنہ ۱۹۰۰ء تا سنہ ۱۹۰۱ء میں اصل لاگت کی مقدار ۴۲٫۲۰ کروڑ روپے تھی۔ مجموعی خام آمدنی ۱۲٫۵ کروڑ ہوئی اور مصارف کار ۴٫۷ کروڑ روپے تھے، گویا صرف شدہ اصل پر ۵٫۵ فیصد کی خالص

284

لہ۔ دیکھو ہیرس کی تصنیف محولہ بالا صفحہ ۸ تا صفحہ ۹؛ اور ایک کتاب موسومہ بہ "انڈین ایئر بک برائے سنہ ۱۹۳۵ء" صفحہ ۳۱۰ تا صفحہ ۳۲۰ اور کتاب موسومہ بہ "ہندوستان سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء میں" صفحہ ۹۹۔

آمدنی وصول ہوئی۔ یہ ایک اطمینان بخش نتیجہ ہے اس لیے کہ مجموعی اصل میں سے ۴ کروڑ روپے کاربائے غیر پیدآور پر صرف کیے گئے جس کے اکثر و بیشتر حصے سے ۱ فیصد سے بھی کم آمدنی وصول ہوئی۔ انفرادی کاربائے آبپاشی کی آمدنی کی مقدار میں بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ چنانچہ دکن کے بعض کاربائے آبپاشی سے بمشکل آنا ۲ فیصد آمدنی وصول ہوتی ہے اور اس کے برخلاف پنجاب کے کاربائے آبپاشی سے صرف کردہ اصل پر معقول منافع ہوتا ہے مثلاً ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۰ء میں اس کا اوسط ۱۶،۳ فیصد رہا؛ مدراس میں ۷،۰۰ فیصد اور صوبۂ متحدہ میں ۵،۹ فیصد منافع وصول ہوا۔

ان اعداد پر نظر ڈالتے وقت یہ ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ صرف کردہ اصل زر بادہ عظیم مصارف بھی شامل ہیں جو درجۂ اوّل کی چار تجاویز یعنی سار دھا اور دھ کی نہریں، وادی ستلج کی تجویز، بندلا ڈکی تجویز اور کاویری (میٹر) کی تجویز کے بارے میں ہوئے ہیں۔ یہ تجاویز یا تو حال ہی میں مکمل ہوئی ہیں یا اب بھی زیر تکمیل ہیں اور ان سے بہت ہی کم آمدنی وصول ہوتی ہے یا بالکل نہیں ہوتی[1] آبیانہ مختلف صوبوں میں مختلف طریقوں سے لیا جاتا ہے۔ مثلاً سندھ میں معمولی مالگزاری میں آبیانہ بھی شامل ہوتا ہے چنانچہ مقررہ مالگزاری کے ۹/۱۰ حصے کا باعث نہروں کو خیال کیا جاتا ہے۔ دوسرے صوبوں مثلاً مدراس اور بمبئی کے بعض حصوں میں مالگزاری کی شرحیں اس لحاظ سے مقرر کی جاتی ہیں کہ زمین کی آبپاشی کی جارہی ہے یا نہیں اور آبپاشی کی زمین کی مالگزاری میں آبیانہ بھی شامل ہوتا ہے لیکن ان طریقوں کو استثنائی خیال کیا جاسکتا ہے۔ ہندوستان کے بڑے حصے میں پانی کا محصول الگ وصول کیا جاتا ہے۔ آبپاشی کے حقیقی رقبے کی پیمائش کی جاتی ہے اور اگائی ہوئی فصلوں کے لحاظ سے بحساب فی ایکڑ محصول وصول کیا جاتا ہے۔ محصول کی شرحیں نہ صرف فصلوں کی اگائی کے لحاظ سے بلکہ ہر صوبے میں اور عام طور پر ایک ہی صوبے کی مختلف نہروں پر مختلف ہوتی ہیں۔ چنانچہ پنجاب میں محصول کی شرحیں مشکر

---

[1] دیکھو ایک کتاب موسوم بہ "ہندوستان ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء" میں صفحہ ۹۹ اور "انڈین ایئر بک" برائے ۱۹۳۵ء صفحہ ۳۱۸۔

باب کے لیے فی ایکڑ ۸ روپے آٹھ آنے سے لے کر ۱۲ روپے تک، چاول کے لیے ۴ روپے سے ۷ روپے آٹھ آنے تک گیہوں کے لیے ۳ روپے ۴ آنے سے ۵ روپے ۴ آنے تک کپاس کے لیے ۳ روپے سے ۴ روپے ۴ آنے تک" اور جوار اور دالوں کے لیے ۲ روپے سے ۳ روپے ۴ آنے تک ہیں۔[1]

مختلف صوبوں کی دیہی معیشت میں آبپاشی کا جو اہم حصہ ہے وہ مختلف صوبوں میں مختلف ہے، جیسا کہ مندرجۂ ذیل جدول سے معلوم ہوگا۔[2]

صوبہ	رقبۂ زیر کاشت کے مقابلے میں رقبۂ زیر آبپاشی کا فیصد	صوبہ	رقبۂ زیر کاشت کے مقابلے میں رقبۂ زیر آبپاشی کا فیصد
آسام	۷،۵	صوبۂ متوسط و برار	۴،۲
بنگال	۶،۲	مدراس	۲۹،۷
بہار و اوڑیسہ	۱۷،۴	شمال مغربی سرحدی صوبہ	۳۴،۴
بمبئی خاص	۳،۹	پنجاب	۱،۴۴
بمبئی سندھ	۶۳،۷	صوبۂ متحدہ	۲۲،۰
برما	۸،۴	دوسرے چھوٹے علاقے	۱۹،۳

برطانوی ہند کا مجموعی اوسط ۱۹،۴ ہے۔

[1] دیکھو "انڈین ایربک" برائے ۱۹۳۵ء صفحہ ۳۱۸۔

[2] یہ عداد ۱۹۲۱ء تا ۱۹۲۲ء سے لے کر ۱۹۲۵ء تا ۱۹۲۶ء کے پانچ سالوں کا اوسط ہیں (دیکھو ایک کتاب موسومہ "ہندوستان ۱۹۲۸ء تا ۱۹۲۹ء میں" صفحہ ۱۱۰) ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۲ء میں برطانوی ہند میں مختلف ذرائع سے جتنے رقبے پر کاشت ہوئی اس کے منجملہ پنجاب کا رقبہ سب سے بڑا یعنی ۱۴،۲۷ ملین ایکڑ ہے۔ صوبۂ متحدہ کا نمبر اس کے بعد ہے۔ اس کا رقبہ ۱۰،۷۰ ملین ایکڑ ہے۔ اس کے بعد علی الترتیب مدراس (۹،۲۰ ملین ایکڑ) بہار و اڑیسہ (۱۰،۸۰ ملین ایکڑ) اور بمبئی بشمول سندھ (۴،۲۳ ملین ایکڑ) ہیں۔ دیکھو ایک رپورٹ موسومہ "برطانوی ہند کے اعداد و شمار کا خلاصہ" برائے ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۲ء۔

باب

اس سے یہ واضح ہوگا کہ اس معاملے میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ صوبے سندھ، پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبہ، مدراس، صوبہ متحدہ اور بہار اوڑیسہ میں۔ بمبئی خاص اور صوبہ متوسط میں آبپاشی کی سہولتیں بہم پہنچانے کی ضرورت ہے اور دونوں بہت کم ترقی یافتہ ہیں۔ آئندہ ان کی ترقی کی رفتار کو تیز کرنا چاہیے، تاکہ اُن علاقوں میں جہاں بارش بہت کم ہوتی ہے یا وقت پر نہیں ہوتی فصلیں یقین کے ساتھ حاصل ہوسکیں۔ بنگال، برما اور آسام بھی اسی ذیل میں آتے ہیں لیکن بارش کی کثرت کی وجہ سے یہاں آبپاشی کی ضرورت بدرجہا کم ہے۔

۱۶۔ آبپاشی کی سرکاری پالیسی۔

برطانوی حکومت کو اُس کے پیشروؤں سے موجودہ کارہائے آبپاشی میں سے بعض بطور ترکہ ملے؛ مثلاً شمالی ہند کی چند سیلابی نہریں، کارہائے ذخیرۂ آب اور خاصکر احاطۂ مدراس کے تالاب۔ لیکن ابتدائی برطانوی دور میں ان کاموں سے غفلت برتی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں سے بعض تباہ ہوگئے۔ لیکن گزشتہ صدی کے وسط تک حکومت کی پالیسی میں تغیر ہوگیا، چنانچہ اس نے قدیم کاموں کی مرمت اور از سر نو درستی شروع کی لیکن ترقی میں اس لیے رکاوٹ پیدا ہوئی کہ خانگی ضمانتی کمپنیوں کو یہ کام سپرد کرنے کا تجربہ ناکام رہا۔ اس کے نتیجے کے طور پر حکومت نے ایک نئی پالیسی اختیار کی جس سے اُس کے تحت اُس نے آبپاشی کے کارہائے پیداآور کی تعمیر اور اُن کا قیام و انتظام اپنے ذمے لے لیا، اور اس غرض کے لیے ضروری قرضے حاصل کیے۔ اس پالیسی کی رو سے صوبہ متحدہ اور پنجاب میں بعض کارہائے کلاں تعمیر ہوئے۔ پنجاب کی نہری نوآبادیات کا مختصر حال اس باب کے آخر میں بیان کر دیا گیا ہے۔

236

لیکن آبپاشی کی ترقی کی رفتار بحیثیت مجموعی بہت سست رہی۔ اس اثنا میں حکومت کی پالیسی میں ایک اور اہم تبدیلی واقع ہوئی۔ سرکار نے اس کو واضح طور پر اپنا فرض تسلیم کیا کہ قحط زدہ علاقوں میں کارہائے آبپاشی بغرض تحفظ تعمیر کیے جائیں، چنانچہ دکن اور دوسرے علاقوں میں اس کے مطابق تدابیر اختیار کی گئیں۔ لیکن

لہ ۱۸۷۷ء تا ۱۸۷۸ء کے قحط کے بعد یہ قرار پایا کہ ہر سال ڈیڑھ کروڑ روپیہ امداد قحط اور بیمہ قحط۔

باب ۷

معارف کی زیادتی اور کسانوں کی جانب سے پانی کی بے قاعدہ مانگ کی وجہ سے نیز بارش کی کمی اور بے وقت آمد کی بنا پر یہ کام منفعت بخش ثابت نہ ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے پنجاب کے دریاؤں کے متعلق زیادہ منفعت بخش کاموں کی جانب توجہ مرتکز کرنی شروع کی۔ گزشتہ صدی کے آخر میں ملک میں جو قحط متواتر ہوئے اور جنھوں نے خاص کر دکن کو بہت بڑی طرح متاثر کیا اُن کی بنا پر لارڈ کرزن کی حکومت نے سنہ ۱۹۰۱ء میں آبپاشی کا ایک کمیشن مقرر کیا۔ اس جماعت نے یہ تسلیم کیا کہ سنہ ۱۸۸۰ء کے کمیشن قحط کی سفارش کے مطابق قحط سے تحفظ کے لیے کارہائے آبپاشی کے ساتھ ساتھ ریلوں کی تعمیر نے قحط سے بچاؤ کے سلسلے میں نہایت عمدہ کام انجام دیا تھا لیکن یہ خیال ظاہر کیا کہ اب خوردنی اجناس کو ترقی دینا ضروری تھا۔ آبپاشی کے کمیشن نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ نفع بخش کاموں کا میدان پنجاب، سندھ اور مدراس کے بعض علاقوں تک ہی محدود تھا حالانکہ وہ قحط سے بڑی حد تک محفوظ تھے۔ چنانچہ اس نے یہ سفارش کی کہ ان کاموں میں بعجلت ممکنہ اضافہ کرنا چاہیے اس لیے کہ وہ ایک جانب سرکار کے لیے نفع بخش ثابت ہوں گے تو دوسری جانب ملک کی خوردنی پیداوار کی مجموعی رسد میں اضافہ ہوگا۔ کمیشن نے قحط زدہ رقبوں کی حفاظت کے لیے یہ سفارش کی کہ کارہائے حفاظتی تعمیر کیے جائیں جو اگرچہ براہِ راست نفع بخش نہ ہوں گے لیکن امدادِ قحط کے سلسلے میں کثیر مصارف کو روکیں گے جن کا روکنا بصورت دیگر ناممکن ہوگا۔ بمبئی دکن کے لیے خاص طور پر یہ سفارش کی گئی کہ گھاٹوں میں تالاب اور ذخیرہ ہائے آب تعمیر کیے جائیں اور ان سے نہریں نکالی جائیں۔ کمیشن نے کرشنا اور تنگ بھدرا اسکیموں کی بھی سفارش کی۔ چنانچہ یہ توقع کی گئی تھی کہ ان تجاویز پر ۴۴ کروڑ روپیہ صرف ہوگا

237

بقیۂ حاشیہ صفحۂ گزشتہ۔ کے لیے الگ رکھے جائیں۔ اس مد کا ایک جز کارہائے حفاظتی میں صرف کیا گیا۔ سنہ ۱۹۱ء میں وزیر ہند نے اس غرض کے لیے امداد قحط کے فنڈ سے ۷۵ لاکھ روپے کے علاوہ ۲۵ لاکھ روپیہ سالانہ امداد کی منظوری دی۔ لیکن اس کل ایک کروڑ روپے کی منظوری کو پوری طرح کام میں نہیں لگایا گیا تھا کہ جنگ کی وجہ سے تخفیف مصارف لازم ہو گئی۔

باب

اور زیرِ آبپاشی رقبے میں ۶½ ملین ایکڑ کا اضافہ ہوگا۔ اس کے بعد کی حکومت کی پالیسی ان ہی سفارشوں پر مبنی تھی اور آبپاشی کو نظر انداز کر کے ریلوں پر توجہ مرکز کرنے کی سابقہ پالیسی سے جس پر آر سی دت جیسے اشخاص نے نکتہ چینی کی تھی بین تفاوت رکھتی تھی۔ غرض بہت سے نئے کاموں کو انجام دیا گیا۔ پیداآور و حفاظتی کارہائے آبپاشی کے مصارف دُگنے سے زیادہ ہو گئے ہیں اور ان کے ذریعے سے جتنے رقبے پر آبپاشی ہو رہی ہے اُس میں زائد از ۸۰ فیصد اضافہ ہو گیا ہے۔

آجکل آبپاشی ایک صوبہ واری مسئلہ ہے چنانچہ صوبہ واری حکومتوں کے مالی اختیارات میں اضافہ کر دیا گیا ہے اور قوتِ اختراع و جدت سے کام لینے کا انھیں زیادہ موقع حاصل ہے۔ وزیرِ ہند اور حکومت ہند کی منظوری کی صرف ان کاموں کی صورت میں ضرورت پڑتی ہے جن کی لاگت کا اندازہ پچاس لاکھ روپے سے متجاوز ہو۔ علاوہ ازیں قرضہ حاصل کر کے کام جاری کرنے کا طریقہ صرف کارہائے پیداآور تک محدود نہیں ہے۔ صوبہ واری بیمۂ قحط کی منظورہ گنجائش سے بھی رقم حاصل کی جا سکتی ہے بشرطیکہ امدادِ قحط کے لیے اس کی حقیقت میں ضرورت نہ ہو۔

زرعی کمیشن نے حکومت بمبئی کی اس تدبیر کو نہایت پسند کیا کہ حکومت نے ۱۹۲۵ء میں ایک خاص عہدہ دار اس غرض سے مقرر کیا کہ وہ قحط سے محفوظ رہنے کے قدرتی ذرائع کی تحقیقات کرے اور کمیشن مذکور دوسرے صوبوں کو بھی اس مثال کی تقلید کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ امدادِ باہمی کے اصول پر آبپاشی کی انجمنیں قائم کرنی چاہئیں اور اس قسم کے کاموں کو انجام دینے اور برقرار رکھنے کے لیے حکومت کو اُن کی مدد کرنی چاہئے۔ کارہائے آبپاشی خورد کی تیاری ترمیم و توسیع اور بقا و حفاظت کی جانب اُن کے استحقاق کے لحاظ سے اب تک توجہ نہیں کی گئی ہے۔[1]

۱۹۲۲ء کے بعد سے کارہائے آبپاشی کے بارے میں بہت نمایاں جد و جہد کی گئی ہے چنانچہ ۱۹ بڑے اور اہم کام یا تو مکمل ہو چکے ہیں یا زیرِ تیاری ہیں اور اُن کے مصارف ۵۰ کروڑ روپے سے زائد ہوئے ہیں۔ ان کی بدولت جو علاقہ زیرِ کاشت

[1] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ پیراگراف (۲۶۹)

باب

آئے گا یا زیادہ بہتر طریقے سے پانی حاصل کرے گا اس کا رقبہ ۲۲ء۱۱ ملین ایکڑ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ۱۹۰۲ء تا ۱۹۰۳ء کے مقابلے میں مجموعی رقبہ سہ گونہ بڑھ گیا۔ غیر معمولی اہمیت کے نئے کارہائے کلاں حسب ذیل ہیں: (۱) وادی ستلج کی تجویز" جو ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء کے ختم پر مکمل ہوئی۔ اس کی مرقمہ لاگت کا اندازہ ۲۳٫۶۰ کروڑ روپے ہے اور اس سے ۵ ملین ایکڑ سے زائد زمین پر آبپاشی ہوگی۔ (۲) "بند سکر" جس کی لاگت کا اندازہ تقریباً ۲۰٫۰۰ کروڑ روپے کیا گیا ہے اور جن سے ۵ ملین ایکڑ سے زائد زمین کی آبپاشی ہوگی[1] (۳) "کاویری کے مخزن آب" اور میٹور پراجکٹ (جس کا افتتاح اگست ۱۹۳۴ء میں ہوا) کے مصارف کا اندازہ ۷٫۳۷ کروڑ روپے تک کیا گیا ہے۔ اس سے تین ملین ایکڑ زائد زمین پر آبپاشی ہوگی اور ملک کی غذا کی رسد میں ۱۵۰٫۰۰۰ ٹن چاول کا اضافہ ہوگا۔ بمبئی میں دو کارہائے کلاں حال ہی میں تکمیل کو پہنچے ہیں۔ ایک تو ہندوستان میں سب سے اونچا یعنی ۲۷۰ فٹ بلند بھنڈر دارا بند" ۱۹۲۵ء میں؛ اور دوسرے ۱۹۲۶ء بمقام بھاٹ گر "لائیڈ بند" جو دنیا کی سب سے بڑی سنگ بستہ تعمیر ہے۔ صوبۂ متحدہ میں "ساردا اودھ نہروں" کے سلسلے میں بہت اطمینان بخش ترقی ہوئی ہے۔ دریائے ساردا کی آبپاشی کی تجویز ۱۹۲۸ء کے موسم خزاں میں باقاعدہ طور پر مکمل ہوگئی اور اس سے ایک ملین سے زاید رقبے کی آبپاشی ہوگی۔

288

[1] یہ توقع کی گئی ہے کہ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء کے ختم تک مرقمہ تخمینے کے مطابق بند سکر کی تجویز پر ۲۰٫۴ کروڑ روپے اور بشمول مطالبات سود ۲۵٫۲۵ کروڑ روپے صرف ہوں گے۔ سر یم وسویس وریا اور نواب علی نواز جنگ بہادر (چیف انجنیر و معتمد تعمیرات حکومت حیدرآباد) بند سکر اور سندھ کی نہروں کے بارے میں اپنی رپورٹ میں یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ اس وقت سندھ کے جملہ کارہائے آبپاشی کی بدولت زرعی پیداوار ۸ کروڑ روپے کی مالیت کی حاصل ہو رہی ہے لیکن بند سکر کی پوری تکمیل کے بعد ۳۰ یا ۳۵ کروڑ روپے کی پیداوار حاصل ہوگی۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے بند سکر کا افتتاح جنوری ۱۹۳۲ء میں عمل میں آیا۔ ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں مجموعی زیر آبپاشی رقبہ ۲۷٫۰۷٫۰۰۰ ایکڑ تھا۔ گیہوں اور کپاس کے زیر کاشت رقبہ علی الترتیب دس لاکھ ایکڑ اور ۵ لاکھ ستر ہزار ایکڑ تھا۔ دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "ہندوستان ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء" میں صفحہ ۹۹۔

باب

صوبۂ متوسط میں بھی ایک بیش خرچ اور وسیع نظام العمل چودہ سال سے زائد مدت کے لیے مرتب کیا گیا ہے۔ تقریباً ہر صوبے میں کئی تجاویز زیر تحقیقات ہیں۔ اس وقت جن زیادہ امید افزا تجاویز پر غور کیا جا رہا ہے اُن کو اور موجودہ تجاویز کی قدرتی توسیع کو ملحوظ رکھنے کے بعد اغلب ہے کہ انجام کار بحیثیت مجموعی ۵ ملین ایکڑ زائد رقبے کی آبپاشی ہو۔

زرعی کمیشن نے حسب ذیل سفارشیں بھی کی ہیں۔ (۱) محکمۂ آبپاشی اور محکمۂ زراعت میں زیادہ قریبی تعلق قائم کیا جائے۔ (۲) ریلوں کی مقامی مشاورتی کمیٹیوں کے مثل آبپاشی کی بھی مشاورتی کمیٹیاں قائم کی جائیں تاکہ وہ آبپاشی کے بارے میں شکایات کا تصفیہ کریں۔ (۳) دہلی میں ایک مرکزی محکمۂ اطلاعات عامہ قائم کیا جائے۔ (ا) جس میں آبپاشی کی مطبوعات کا ایک کتاب خانہ ہو (ب) جو صوبہ واری عہدہ داروں میں اطلاعیں تقسیم کرے تاکہ دوسرے صوبوں کے حالات کے متعلق انھیں جو لاعلمی ہے اُس کا ازالہ ہو (۴) تو بہت برقابت کی ترقی سے رونما ہونے والے مسائل کا بھی حل کیا جائے۔ کمیشن مذکور یہ بھی مشورہ دیتا ہے کہ آبپاشی کے مسائل کی تحقیقات پر بہت زیادہ توجہ کرنی چاہیئے اور بڑے بڑے غیر منفصلہ تجاویز آبپاشی کی صورت حال پر میعادی طور پر تبصرہ کرنا چاہیئے[1]

239

۷۔ آبپاشی بمقابلۂ ریل۔ آبپاشی بمقابلۂ ریل کا بحث مباحثہ ایک زمانے میں خاصکر گزشتہ صدی کے اختتامی سالوں میں بہت سرگرمی کے ساتھ جاری تھا۔ چنانچہ آر۔ سی۔ دت نے اس میں بہت ہی نمایاں حصہ لیا اور یہ بتلایا کہ ۱۹۰۲ء تک حکومت نے آبپاشی پر تو صرف ۲۴ کروڑ روپے بہائے تھے اور اس کے مقابلے میں ریلوں پر ۲۲۰ کروڑ روپے بچھا دیے۔ یہ فرق و عدم مساوات اس لیئے خاص طور پر قابل اعتراض معلوم ہوئی کہ ایک طرف

[1] دیکھو ایک کتاب موسومہ بہ "ہندوستان ۱۹۲۵ء تا ۱۹۲۶ء" میں صفحہ ۱۰۲ "ہندوستان ۱۹۲۶ء تا ۱۹۳۰ء" میں صفحہ ۱۲۰ تا صفحہ ۱۳۰؛ "ہندوستان ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۱ء" میں صفحہ ۲۳۰ تا ۲۴۴؛ اور زرعی کمیشن کی رپورٹ پیراگراف (۲۶۹ تا ۲۷۶)۔

باب

موجودہ صدی کے ابتدائی سالوں تک آمدنی کے لحاظ سے ریلوں سے نقصان ہو رہا تھا، اور دوسری طرف گزشتہ صدی کے آخر میں قحط کا بہت شدت سے دور دورہ تھا۔ وتنے نے یہ استدلال کیا کہ برطانوی اصلاروں، محسنوں اور صناعوں کے اثر کے تحت حکومت پر دباؤ ڈالا گیا تھا کہ ضمانتی طریق پر بعجلت ریلیں تعمیر کی جائیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ضرورت سے زیادہ ریلیں بن گئیں۔ فوجی اغراض کا لحاظ اور قحط زدہ علاقوں تک امداد پہنچانے کی ذمہ داری کا روز افزوں احساس حکومت کی پالسی پر اثر انداز ہوا۔ یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ حفاظتی کار ہائے آبپاشی منفعت بخش نہ تھے، اور اس لحاظ سے اُن کی ترقی کی رفتار بہت سست تھی۔ علاوہ ازیں سرکاری پالسی کے نقادوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ریلوں کی تعمیر میں نامناسب عجلت سے ملکی صنعتوں کے زوال کی رفتار کو بڑھا دیا جس کی وجہ سے زراعت میں آبادی کا دباؤ بڑھ گیا اور اس طرح حفاظتی ریلوں کا مقصد یعنی قحط کی شدت میں کمی کرنا ایک حد تک فوت ہو گیا۔

کئی اسباب کی بنا پر مذکورۂ بالا مباحث میں اب وہ سرگرمی باقی نہیں رہی ہے۔ اب جبکہ ریلیں عام طور پر منفعت بخش ثابت ہو رہی ہیں اور محصول ادا کرنے والے کی جیب پر ان کا کوئی بار نہیں پڑ رہا ہے، ان کی توسیع کے بارے میں نقادوں کی مخالفت بڑی حد تک کمزور پڑ گئی ہے گو بالکل معدوم نہیں ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں ۱۹۰۱ء کے آبپاشی کے کمیشن کی سفارشات کے نتیجے کے طور پر حکومت آبپاشی کے معاملے میں بتدریج بہت فراخ دلی سے کام لے رہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حکومت نے بعض ایسے نئے کاموں کی تکمیل بھی اپنے ذمے لی ہے جس پر کمیشن نے غور و خوض نہیں کیا تھا۔

خود مباحث کے عیب و صواب کا جہاں تک تعلق ہے وہاں تک ہم کہہ سکتے ہیں کہ گو ممکن ہے کہ ریلوں اور آبپاشی کے درمیان صحیح تناسب قائم کرنے کا معاملہ نزاعی ہو لیکن ایک دوسرے کا مخالف و متضاد نہیں ہے بلکہ مؤید و معاون ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر غذا کی زائد رسد آبپاشی کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے تو ملک میں اس کی مناسب تقسیم زیادہ تر ریلوں ہی کے ذریعے سے عمل میں آسکتی ہے۔ پھر بھی یہ صحیح ہے کہ

باب ۴

240

گزشتہ صدی کے آخر میں حکومت کی آبپاشی کی پالسی ویسی ترقی پذیر نہیں تھی جیسی کہ آجکل ہے اور اگر حفاظتی کاروبارِ آبپاشی کو انجام دینے کا فیصلہ کرنے میں تھوڑی فائدے اور نقصان کے ملحوظات کو زیادہ اہمیت نہ دی جائے تو آجکل بھی آبپاشی کی توسیع کی کافی گنجائش موجود ہے۔ یہ بات بمبئی کے بارے میں خاص طور پر صادق آتی ہے اس لیے کہ یہاں سندھ کو خارج کرکے مجموعی زیرِ کاشت رقبے کے ۴ فیصد سے بھی کم کی آبپاشی جملہ ذرائع سے ہوتی ہے جس میں سرکاری آبپاشی کا حصہ بقدر نصف ہے؛ گو یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ نئے پراجکٹ جو زیرِ تجویز یا زیرِ غور ہیں اس رقبے میں مستقبل قریب میں توسیع کر دیں گے۔ احاطۂ بمبئی میں بارش عام طور پر بے وقت اور کبھی کم کبھی زیادہ ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں کاروبارِ آبپاشی کی کافی سہولتیں مہیا کرنے کی اہمیت پر زیادہ زور دینا مبالغہ نہیں قرار پا سکتا ہے ۱۹۲۶ء کی احاطۂ بمبئی کی زرعی نمائش میں شعبۂ آبپاشی اور شعبۂ ارضی ترقی کا انتظام اس بات کا ثبوت خیال کیا جا سکتا ہے کہ حکومت کو اس ضرورت کا واضح طور پر احساس ہے۔ جہاں تک کل ملک کا تعلق ہے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم دو مشکلات میں گھرے ہوئے ہیں۔ ان علاقوں میں جہاں آبپاشی نہایت منفعت بخش ہے مثلاً شمالی ہند میں وہاں قحط اور غیر ثبات پذیر زراعت کا امکان و قرینہ زیادہ نہیں ہے؛ اس کے برخلاف جزیرہ نمائے ہند میں خاصکر خاص احاطۂ بمبئی میں جہاں بارش بہت ہی غیر معین ہے آبپاشی براہ راست منفعت بخش نہیں ہے لیکن یہ ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ یہاں نفع و نقصان کے خالص تجارتی ملحوظات بے موقع ہیں اور مسئلے پر ایک وسیع نقطۂ نگاہ سے نظر ڈالنی چاہیے۔

۱۰۔ آب زدگی اور نمکی فوران[1]۔

آب زدگی (پانی کا جمع ہونا) اور نمکی فوران (کلر پیدا ہونا) ایسے خطرات ہیں جو نہری آبپاشی سے خاص طور پر وابستہ ہوتے ہیں؛ اور گزشتہ زمانے میں ان خطرات سے بچنے کا انتظام ہمیشہ موثر طریقے پر نہیں کیا گیا۔ اسی لیے زمین بعض اوقات آبپاشی کے

[1] Water logging and salt Efflervescence.

نتیجے کے طور پر خراب ہوتی گئی۔ چنانچہ پنجاب میں ۱۹۲۶ء تا ۱۹۲۷ء میں ایک لاکھ ۲۵ ہزار ایکڑ زمین اس وجہ سے ناقابلِ کاشت بن گئی تھی کہ زیرِ زمین پانی کی سطح بلند ہوگئی۔ اس سے بھی بڑا رقبہ نمکوں (کلر) کے سطحِ زمین پر پہنچ آنے کی وجہ سے ناقابلِ زراعت ہوگیا، اور اس کا خطرہ ہے کہ یہ خرابی اس سے بھی زیادہ بڑے رقبے پر پھیل جائے[1]

بمبئی کی وادیٔ نیرا میں یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ انکل (لونا) کی زمینیں محض نہری آبپاشی کے براہِ راست نتیجے کے طور پر رونما ہوئی ہیں اور یہ خرابی ہر سال بڑھ رہی ہے[2]

یہ بات عام طور پر تسلیم کرلی گئی ہے کہ جن رقبوں میں نہروں کے ذریعے سے آبپاشی ہوتی ہے ان میں کسان بہت سا پانی ضائع کر دیتے ہیں، چنانچہ یہ اُن اسباب میں سے ایک ہے جس کی بنا پر زمین میں پانی جمع ہوجاتا ہے اور کلر پیدا ہوتا ہے۔ لیکن جیسا کہ زرعی کمیشن نے بتلایا ہے اس کو سراسر اس واقعے کی جانب منسوب نہیں کیا جاسکتا کہ کسان کو یہ ترغیب نہیں ہوتی کہ حکومت کے مہیا کیے ہوئے پانی کو کفایت کے ساتھ استعمال کرے۔ پانی کی بہت بڑی مقدار ضائع ہوجانے کا باعث پانی کی رسد کا عدم تیقن ہے۔ زرعی کمیشن یہ سفارش کرتا ہے کہ پانی کے کفایت شعارانہ استعمال کو یقینی بنانے کے لیے آبپاشی کمیشن کی سفارشات کے مطابق جو تحقیق و تجربہ عمل میں لایا گیا تھا اُس کا ازسرِنو احیا کیا جائے اور پانی کو بلحاظ مقدار فروخت کرنے کے خلاف آخری فیصلے پر پہنچنے سے پیشتر پنجاب اور دوسرے مقامات میں مزید تحقیق و تجربہ کیا جائے[3]

نہری علاقوں میں زائد پانی کی مناسب طور پر نکاسی کرنے میں کوتاہی صرف زرعی نقطۂ نظر ہی سے خرابی اور نقص ثابت نہیں ہوئی ہے بلکہ اُس نے ایسے خطوں کو بھی مرطوب اور ملیریائی بنا دیا ہے جو سابق میں صحت بخش تھے۔ لہٰذا نہری آبپاشی محض انجنیئر ہی کا کام نہیں ہے بلکہ ارضی طبعیات، زرعی کیمیا، طب و حفظانِ صحت کے

[1] دیکھو برج نرائن کی تصنیف موسوم بہ "ہندوستان کی معاشی زندگی" صفحہ ۳۸۳
[2] دیکھو باورڈ کی کتاب محولۂ بالا صفحہ ۵۴۔
[3] زرعی کمیشن کی رپورٹ فقرۂ ۲۷۷۔

ماہروں سے بھی اس کام میں مشورہ اور مدد لینے کی ضرورت ہے۔ زرعی کمیشن یہ سفارش کرتا ہے کہ آیندہ آبپاشی کی جملہ نئی تجاویز تیار کرتے وقت پانی کی نکاسی کی بدرروؤں کی احتیاط کے ساتھ مساحت بھی لازمی طور پر کرنی چاہیے اور پانی خارج کرنے کے رقبے کے نقشے تیار کرنے چاہئیں۔

۱۹۔ پنجاب کی نہری نوآبادیات[1]

ہندوستانی آبپاشی کی بحث کو ہم پنجاب کی اُن نہری نوآبادیات کا کچھ حال بیان کرنے کے بعد ختم کردیں گے جنھوں نے ہماری آبپاشی کی تاریخ میں بہت نمایاں حصہ لیا ہے۔ پنجاب میں آبپاشی کے جن مسائل کا حکومت کو مقابلہ کرنا پڑا وہ دوسرے صوبوں کے مسائل سے مختلف ہیں۔ گزشتہ صدی کے آٹھویں عشرے میں آبپاشی کا کام شروع ہونے سے پیشتر "ملک کا وہ وسیع رقبہ جس کی اس وقت زیریں چناب، جہلم اور باری دوآبہ کی نہروں سے آبپاشی کی جاتی ہے بے موقع اور کم بارش کی وجہ سے صحرا تھا۔ اسی وجہ سے "یہ بات ضروری ہوئی کہ کارہائے آبپاشی کی تعمیر کے ساتھ ساتھ جن نئے رقبوں کا افتتاح ہو اُن میں آبادی کو بھی مستقل طور پر منتقل کیا جائے" (دیکھو ہیرس کی تصنیف)۔ آبادکاروں کی آمد سے پیشتر پانی گزرنے کے سیدھے راستے قائم کیے گئے اور اسی کے مطابق ہر نوآبادی کی زمین کے چھوٹے بڑے مربع اور مستطیل خطے الگ الگ بنادیے گئے، دیہات کی سرحدیں مقرر کی گئیں، سڑکوں کی تعمیر کے نشان ڈالے گئے، اور متصلہ زمین کو چراگاہ کے طور پر اور دوسرے اجتماعی کاموں کے لیے الگ رکھا گیا۔ آبادکاروں کو منتقل ہونے پر مکان تعمیر کرنے پڑے اور ان خطوں پر کاشت شروع کرنی پڑی جو اُن کو دیے گئے تھے۔ اس طرح ان دیہی نوآبادیات کا نہایت باقاعدہ خاکہ مرتب کیا گیا تھا اور ان میں حفظ صحت کی ایسی سب سہولتیں موجود ہیں جو معمولی دیہات میں مفقود ہیں۔ مالگزاری کے عہدہ داروں نے دانشمندی کے ساتھ صوبے کے گنجان آباد علاقوں سے اور موروثی زمینداروں

---

[1] دیکھو ہیرس کی کتاب صفحہ ۱۱۵ تا صفحہ ۱۲۴ اور ڈارلنگ کی تصنیف موسوم بہ پنجابی کسان باب ۶۔

باب ۹

یا دخیل کار کاشتکاروں میں سے آباد کاروں کو منتخب کیا اور ان کو ان نام نہاد عطیۂ سرکار خطوں یا معافی کی جاگیروں پر جن پر زمین کا بڑا حصہ مشتمل ہے بسایا۔ اس قسم کی جماعتیں جو مشترکہ رشتوں سے ایک دوسرے سے وابستہ ہوتی تھیں نوآبادیات کو اکائیوں کے طور پر بھیجی جاتی تھیں تاکہ جداجدا دیہی برادریاں قائم کی جائیں عطیۂ زمین کی شرائط مختلف نوآبادیوں میں مختلف ہیں۔ ایک شخص کو جو رقبہ عطا کیا جاتا ہے وہ اوسطاً ڈیڑھ تا دو مربعوں کا یا تقریباً ۴۰ یا ۵۰ ایکڑ ہوتا ہے۔ ابتدائی نوآبادیات میں سے اکثروں میں کھیتوں میں ناقابل انتقال دخیلکاری کے حقوق آزمائشی مدت کے ختم پر مفت یا برائے نام معاوضہ ادا کرنے پر عطا کیے جاتے تھے لیکن بعد میں اس طریق کار کی جو نظر ثانی کی گئی اس کی رو سے "دخیلکاری کے حقوق ابتدائی مدت کے بعد عطا کیے جاتے ہیں اور ایک مزید مدت گزرنے پر اسامیوں کو رعایتی قیمت پر جو آسان اقساط میں ادا کی جاسکتی ہے ناقابل انتقال مالکانہ حقوق خرید لینے کا موقع دیا جاتا ہے۔" اس سے زیادہ بڑے خطے باثروت حیثیت موروثی زمینداروں کو اور ایسے صاحبان ذرائع کو عطا کیے جاتے ہیں جو کاشت و آبپاشی کے ترقی یافتہ طریقوں کا تجزیہ کرنا چاہتے ہوں۔ حکومت خاص خاص سیول یا فوجی خدمات کے صلے میں بھی زمین عطا کرتی ہے۔ آباد کاروں کے ایک دفعہ اپنے اپنے نئے دیہات میں بس جانے کے بعد نوآبادی کی ترقی، ذرائع نقل و حمل و وسائل آمد و رفت، پختہ سڑکوں، ریلوں، اور شہروں اور بازاروں کی اصلاح و ترقی اور توسیع کی صورت میں تیزی کے ساتھ شروع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح کسی زمانے میں جو زمین بے آب و گیاہ افتادہ اور ناقابل زراعت تھی اس کو دست انسانی نے ان سرسبز و شاداب بہتری نوآبادیات میں تبدیل کر دیا ہے۔ ان کا سرمایۂ قوت وہ چھوٹا مالکی کاشتکار ہے جس کے قبضے میں تقریباً ۸۰ فیصد زمین ہے۔ مالی نتائج بہت نمایاں اور حیرت انگیز ہیں۔ حکومت کو لیال پور، شاہ پور اور منٹ گمری کی تین بڑی نوآبادیات کی نہروں سے ۳۲ فیصد خالص منافع اور کل نہری نظام سے جو ۲۰ ہزار میل طویل ہے اور جن میں ۳۲ کروڑ روپیہ سرمایہ لگا، $9\frac{1}{2}$ فیصد مقسوم وصول ہوا۔ کسان کو جو نفع ہوا ہے وہ اس سے بھی کہیں زیادہ ہے۔

242

اسی سال نہروں کی زیر آبپاشی رقبے سے گری ہوئی قیمتوں کے باوجود ۹۴ کروڑ روپے کی پیداوار حاصل ہوئی۔ جیسا کہ ام۔ ال ڈارلنگ نے اجمالی طور پر بیان کیا ہے "نو آبادیات نے پنجاب کے لیے دراصل خوش حالی کے ایسے دور کا افتتاح کر دیا ہے جو پہلے کبھی خواب و خیال میں بھی نہ تھا"[1]

---

[1] دیکھو ام۔ ال ڈارلنگ کی کتاب محولہ بالا صفحہ ۱۱۹۔

218

باب ۸

زراعت

محنت، ساز و سامان اور تنظیم

۱۔ انسانی عامل، اس کی غیر اطمینان بخش نوعیت

یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ موثر زراعت کا انحصار جتنا ہل چلانے والے انسان کے اوصاف پر ہے اتنا کسی اور چیز پر نہیں ہے[1] لہذا ہندوستانی زراعت کی موجودہ حالت کو سمجھنے کی غرض سے ہندوستانی کسان کے اوصاف و نقائص کا اندازہ کرلینا ضروری ہے۔ بحالت موجودہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ

[1] مختلف ملکوں کے دیہی حالات کی تحقیق اس نتیجے پر پہنچاتی ہے کہ انسانی عامل پر عمدہ زراعت کا دراصل اس سے زیادہ دارومدار ہے جتنا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ کردار اور خصائل کے نقائص بہترین فطری اوصاف کو زائل کرسکتے ہیں اور کر دیں گے۔ اس کے برخلاف جو مشکلات ناقابل حل معلوم ہوتی ہیں وہ انسانی جد و جہد، انسانی ذہانت اور انسانی معلومات سے مسلسل کام لیکر رفع کی جاسکتی ہیں۔ دیکھو کیلورٹ کی کتاب موسومہ "پنجاب کی دولت و خوشحالی" صفحہ ۲۵۔

ہندوستانی کسان ذہانت، حوصلہ مندی اور محنت کی صلاحیت رکھنے کے اعتبار سے یورپ یا امریکہ کے کسان کے مقابلے میں بہت پیچھے ہے۔ لیکن اس کی کارگزاری کا ناقص ہونا اس کا خلقی یا فطری قصور نہیں ہے اور اس لحاظ سے قابل اصلاح ہے۔ کئی رکاوٹوں اور بندشوں کا بارگراں اس کو مضمحل اور پست ہمت کر دیتا ہے۔ تعجب تو اس بات پر ہے کہ وہ اس کے باوجود کشاکش حیات میں برابر حصہ لے رہا ہے اور کلیۃً نیست و نابود نہیں ہوا۔

یہ سوال کہ آیا نسل اور آب و ہوا کو ہندوستانی کسان کی مقابلۃً ادنے کارکردگی سے کوئی تعلق ہے یا نہیں حد درجہ تخمینی ہے اور اس لحاظ سے ہمیں اس پر زیادہ وقت صرف کرنے کی ضرورت نہیں۔ عملی لحاظ سے واحد محفوظ قیاس یہ مفروضہ ہے کہ ہندوستانی کسان کی پسماندگی کا سب سے بڑا سبب وہ اندوہناک اور دل شکن حالات ہیں جن کے تحت وہ کام کرتا ہے۔ اس خیال کی تائید اس واقعے سے ہوتی ہے کہ کسان ان علاقوں میں مقابلۃً زیادہ چست و چالاک مستقل مزاج جفاکش اور حوصلہ مند ہوتا ہے جہاں بارش قابل اعتماد اور اطمینان بخش ہوتی ہے یا جہاں آبپاشی کی سہولتیں مہیا ہوتی ہیں اور اس کو اپنی محنت کا صلہ حاصل کرنے کا کامل یقین ہوتا ہے لیکن جہاں اس اعتبار سے حالات ناموافق ہوتے ہیں وہاں اس کے کاہل، قنوطی، آرام طلب اور نہایت مفلس ہونے کا قرینہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ویلکر جو رائل اگریکلچرل سوسائٹی کے کیمیائی مشیر تھے انہیں ۱۸۸۹ء میں اس غرض سے ہندوستان بھیجا گیا تھا کہ جدید سائنسی نقطۂ نظر سے ہندوستان کے زرعی کاروبار کے بارے میں کیفیت پیش کریں۔ چنانچہ ڈاکٹر ویلکر نے ہندوستانی کسان کی پر احتیاط کاشت کاری، سخت محنت و جفاکشی استقلال اور جدت آفرینی جیسے اوصاف کی ستائش کرتے ہوئے اپنی سند خوشنودی پیش کی ہے۔ اس قسم کی رایوں کو جو اعلیٰ درجے کی سائنسی سند رکھتی ہیں بہ نظر احترام دیکھنا چاہیے اور ان کی بنا پر ہمیں کامل یقین کے ساتھ یہ بات تسلیم کر لینی چاہئے کہ موافق حالات کے تحت ہندوستانی کاشتکاری اعلیٰ درجے پر پہنچ سکتی ہے۔ لیکن ہمیں اس قسم کی مدح آمیز رائے زنی کی بنا پر جو سیاق و سباق سے الگ کر کے پیش کی گئی ہو اور معکوس سمت کے

باب

انتہائی خیالات کو معتدل بنانے کی غرض سے کی گئی ہو تحفظ کا غلط احساس قائم کرکے مطمئن نہ ہوجانا چاہیے۔ اگر ہندوستان کا متوسط درجے کا کسان ایسا ہی کارگزار اور ترقی پذیر ہوتا جیسا کہ کوئی ناواقف شخص ڈاکٹر ولکر جیسے اہل الرائے کی قصیدہ خوانی کی بنا پر خیال قائم کرسکتا ہے تو ہندوستان کا وہی مسئلہ اس سے بہت زیادہ آسان اور سادہ ہوتا جتنا کہ اب ہے۔ یہ خیال کرنا نہ صرف غلط بلکہ مضر ہوگا کہ ہندوستانی زراعت میں انسانی عامل ان تمام اوصاف سے متصف ہے جن کی اس میں توقع کی جاسکتی ہے، اور یہ کہ خود کسان کی اصلاح کرنے کے لیے کسی خاص جد و جہد کی ضرورت نہیں ہے۔ کسان کے اصلی اسقام و نقائص کو، خواہ وہ کسی سبب کے باعث ہوں، واضح طور پر سمجھنا اور تعلیم کے ذریعے سے اس کے وسیع ترین مفہوم میں ان کو براہ راست رفع کرتے اور بیرونی حالات کی اصلاح کے ذریعے سے ان کو بالواسطہ دور کرنے کی کوشش کرنا نہایت اہم و ضروری ہے۔ اگر ہم نقشہ دیکھنے سے کام لیے بغیر ہندوستانی کسان کا اس کے جملہ نقائص کے ساتھ خاکہ کھینچیں تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ عام طور پر اس میں جدت و اختراع کا مادہ ہی نہیں ہوتا اور وہ روایتی رسوم و رواج کی بندشوں میں حد سے زیادہ جکڑا ہوا ہوتا ہے جن میں سے اکثر نقصان رساں اور بے اصول ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ از سرتا پا توہمات اور تعصبات میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے جو حیثیت مجموعی اس کی معاشی ترقی کی راہ میں مزاحمت پیدا کرتے ہیں۔ اس کی کاہلی، مردہ دلی اور قدامت پرستی اس اصلاح کے حق میں سد راہ بن جاتی ہے جو اس کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے تجویز کی جاتی ہے۔ وہ اپنے غیر صحت بخش طرز بود و باش کی بنا پر اپنے لیے بہت سی بیماریاں اور جسمانی تکلیف مول لیتا ہے جس کے نتیجے کے طور پر کئی خرابیاں پیدا ہوجاتی ہیں یعنی اس کی طاقت و توانائی سلب ہوجاتی ہے، استقلال و جفاکشی کے ساتھ محنت کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی، وہ زندگی کے بارے میں اس کا مطمح نظر

لہ "دہقان ترقی کے تصور کو بھی اپنے پاس جگہ دینے سے انکار کرتا ہے۔ اس کو روٹی کمانے اور اپنی نوع کا سلسلہ آگے بڑھانے کے سوا کوئی دوسرا کام کرنے کی نہ تو اس کو مہلت و فرصت ملتی ہے اور نہ وہ محنت کرسکتا ہے۔" دیکھو ایف آل برین کی کتاب موسوم بہ "دیہی ہندوستان کی ازسرنو تنظیم" صفحہ ۱۳۶۔

بہت تاریک ہو جاتا ہے۔ وہ جاہل، ناعاقبت اندیش اور لاابالی ہوتا ہے اور ان اسقام کی بنا پر وہ ایسے شخص کا آسانی شکار ہو جاتا ہے جو اس کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ وہ غیر ضروری مقدمہ بازی میں اپنی کمائی اور قوت ضائع کرنے کی جانب حد سے زیادہ مائل ہو جاتا ہے، اور اپنے اصل کو ایسے ذاتی مصارف میں لگانے کی بجائے جن سے کارکردگی میں اضافہ ہو یا زیادہ منفعت بخش طریق پر مصروف کرنے کی بجائے زیورات کی شکل میں مقفل اور بیکار کر دیتا ہے۔ وہ شادی بیاہ اور دوسرے رسوم پر عام طور پر اپنی بساط سے زیادہ خرچ کر بیٹھتا ہے اور اس طرح دیدہ و دانستہ ساہوکار کے پنجے میں اپنے آپ کو پھنسا دیتا ہے جس کی گرفت سے وہ بعد میں خود کو مشکل سے چھڑا سکتا ہے۔ وہ اس حقیقت سے ناآشنا معلوم ہوتا ہے کہ خدا صرف انسانی ذرایع سے مدد کرتا اور بچاتا ہے، اس میں خدا یا کسی دوسری خارجی ایجنسی پر بہت زیادہ بھروسا اور تکیہ کرنے کا میلان ہوتا ہے اور پھر اس خرابی کا علاج کرنے کے لیے جس میں وہ مبتلا ہو اور جس کے لیے وہ قسمت یا خدا پر الزام عائد کرنے کی جانب مائل ہوتا ہے وہ ذاتی کوشش و جدوجہد پر بہت کم بھروسا کرتا ہے۔[1]

245

ہر وہ شخص جو ہندوستان کے دیہی حالات سے واقف ہے یہ تسلیم کرلےگا کہ یہی اصلی خرابیاں ہیں اور ان کو صرف براہ راست کوشش سے دور کیا جا سکتا ہے۔ "کسان کے ماحول کی نگرانی کیجیے تو وہ اپنی نگرانی آپ کرنے کے قابل ہو جائے گا" یہ ایک کافی معقول مقولہ ہے، لیکن اس سے بہتر یہ ہے کہ "کسان اور اس کے ماحول دونوں کی اصلاح کیجیے تاکہ ایک کو دوسرے سے تقویت پہنچے۔"

۳۔ دیہی تعلیم کی ایک وسیع اور جامع تجویز۔

کسان کی نفسیاتی حالت اور اس کے معاشرتی و ذہنی عادات و خصائل میں تبدیلی کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اس کو تعلیم دی جائے۔ ظاہر ہے کہ جس وقت تک جہالت اور بے علمی کا

لہ۔ پنجاب کے ضلع گڑگاؤں کی دیہی تنظیم کے سلسلے میں ایف۔ ال۔ برین جو اس تحریک کے باوا آدم ہیں، کہتے ہیں "ضلع گڑگاؤں کے لیے ایک نئی کہاوت ایجاد کی گئی ہے یعنی "زمیندار کی بے عقلی پرمیشور کا قصور" جس کے معنی یہ ہیں کہ حقیقت میں قصور تو کسان کا ہوتا ہے لیکن مورد الزام خدا کو بنایا جاتا ہے۔" دیکھو برین کی کتاب محولہ بالا صفحہ ۱۲۔

باب ۸

ہمارے دیہات میں دوردورہ رہے گا اور بمشکل ۶ فیصد آبادی لکھی پڑی رہ رہے گی اس وقت تک دیہی ترقی کا ذکر بے سود ہوگا۔[1] جہالت اور کسی مناسب دیہی تعلیمی نظام کی عدم موجودگی ہی بڑی حد تک ان کئی خرابیوں کی ذمہ دار ہے جس کا ہم افسوس کرتے ہیں۔ جہالت و ناخواندگی قرض داری کو بڑھاتی ہے' ناعاقبت اندیشی اور فضول خرچی کو ترقی دیتی ہے' زرعی اصلاح و ترقی کی رفتار کو سست کرتی اور اس کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عوام کی بیداری میں مزاحم ہوتی ہے جس کے بغیر کوئی اصلاح مستقل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ دیہی ترقی کے مسئلے کو اس وقت تک حل نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ کسان خود اپنی اصلاح و ترقی کا خواہاں نہ ہو اور اپنے طور پر غور و فکر اور عمل نہ کر سکتا ہو۔ موجودہ تعلیمی نظام کو از سر نو مرتب کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ اہل دیہات کی ضرورتوں کے مطابق ہو اور درسی کتابیں تیار کرنے اور نصاب مقرر کرنے میں محکمۂ تعلیمات کو نہ صرف ان دوسرے محکموں کی جد و جہد کے نتیجے کو جذب کرنا چاہیے جن کے ملازموں کو اثنائے ملازمت میں دیہاتیوں سے سابقہ پڑتا ہے بلکہ ان محکموں سے مشورہ بھی کرنا چاہیے۔ دیہی مدرسوں میں ایسی تعلیم دینی چاہیے کہ اس سے زراعت اور عام دیہی زندگی میں دلبستگی بڑھے اور وہ اعتراض جو تعلیم پر عام طور پر کیا جاتا ہے باقی نہ رہے یعنی یہ کہ وہ دیہاتی طالب علم کے دل میں اس کے آبائی پیشے کے خلاف تعصب پیدا کرتی ہے اور اس کو آرام طلب بنا کر زرعی کاروبار کے قابل نہیں رکھتی۔

موجودہ میلان یہ ہے کہ لکھ پڑھ لینے کی قابلیت سے جھوٹی قدر و قیمت منسوب کی جاتی ہے چنانچہ اس کی بنا پر کسی شخص کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنے

248

[1] ۔ ہندوستان کے دیہات سدھار کام میں ہندوستانی کسان کی ناخواندگی کتنی بڑی حد تک مزاحم ہے اس کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب ہم پوسا کے گیہوں کے جدید اقسام کا مقابلہ شمالی ریاستہائے متحدہ اور کینیڈا کے گیہوں موسوم بہ "مارکوس" (جو کینیڈا اور ہندوستان بالخصوص کلکتے کے گیہوں کے میل کی پیداوار ہے) سے کرتے ہیں۔ پندرہ سال مختتم بہ ۱۹۲۶ء میں پوسا کے گیہوں کے اقسام کی کاشت ۲۰ لاکھ سے کچھ زیادہ ایکڑ زمین پر پھیلی۔ اس کے برخلاف اسی مدت میں مارکوس کے زیر کاشت رقبہ ۲ کروڑ ایکڑ سے بھی متجاوز ہو گیا۔ (دیکھو ہاورڈ کی کتاب موسوم بہ "ہندوستانی زراعت" صفحہ ۳۵)۔

جاہل ساتھیوں سے الگ جماعت سے تعلق رکھتا ہے اور ہل ہاتھ میں لینے کی بجائے قلم بکف ہونے کی غیر دانشمندانہ علو خیالی فروغ پاتی ہے۔ لیکن محنت کا وقار قائم کرنے کی غرض سے خاص طور پر مصیبت برداشت کرکے اور تعلیم کو عام اور جبری بنا کر اس میلان کا خاتمہ کر دینا چاہیے۔ امداد باہمی کی تعلیم کی انجمنیں جیسی کہ پنجاب میں پائی جاتی ہیں مدرسوں کی حاضری کو یقینی بنانے کی توقع کو بوجوہ احسن پورا کرتی ہیں۔ تعلیم سے عورتوں اور مردوں دونوں کو مستفید ہونے کا موقع بہم پہنچانا چاہیے'' اور یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ نسوانی تعلیم کو اس وقت تک روک رکھنا مناسب ہے جب تک معلمات کی تعداد کافی نہ ہو جائے۔ نئی پود میں نوشت و خواند کی دیرپا قابلیت پیدا کرنے کی غرض سے یہ ضروری ہے کہ عورتوں میں لکھنے پڑھنے کی قابلیت پیدا کی جائے[1]۔ دیہی تعلیمات کی کسی مکمل تجویز کی چند مدیں یہی ہوں گی کہ نباتات و حیوانات کی زندگی کے فطری مطالعے، مدرسوں میں باغوں اور مزارعوں کا انتظام کیا جائے' اس غرض سے نہیں کہ کسان کو اس کا کاروبار سکھایا جائے اس لئے کہ وہ تو اپنے پیشے کو اپنے استاد سے بہتر جانتا ہے بلکہ اس غرض سے کہ مناسب ماحول پیدا کیا جائے۔ اس کے علاوہ نصاب میں دیہی مسائل کے متعلق کتابیں رکھی جائیں۔ دستی تربیت دی جائے، تعلیم ایسی ہو جو مقامی ذیلی صنعتوں سے خاص طور پر متعلق ہو جسمانی مدرش کشافہ کی تعلیم اور امداد اولین کے اسباق کا بھی انتظام ہونا چاہیے۔ اس طرح جو تعلیمی نظام ترتیب دیا جائے اس کا انتظام زیادہ تر خود کسان ہی کے ہاتھ میں رہنا چاہیئے اور بہترین قابلیت کے ایسے استادوں کا تقرر معقول تنخواہ پر کرنا چاہیئے جن میں خدمت کا جذبہ اور ''صحیح دیہاتی احساس'' موجود ہو۔ دیہی رقبوں میں اشاعت تعلیم کے سلسلے میں ایک اور کام جو دوسروں سے کچھ کم اہم نہیں ہے یہ ہے کہ بیرونی زبانوں سے ترجمہ کرکے یا تالیف کے ذریعے سے عمدہ کتابیں مرتب کی جائیں لیکن اس نہایت ہی اہم کام کی جانب اب تک خاطر خواہ اور کافی توجہ نہیں کی گئی ہے[2]

[1]۔ دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ، پیراگراف (۴۴۵)

[2]۔ اس باب میں ہم نے اپنے مضمون موسوم بہ "ہندوستان کی دیہی تنظیم کے چند پہلو" سے جو ایک رسالہ "انڈین جرنل آف اکنامکس" کے کانفرنس نمبر میں ۱۹[illegible]ء طبع ہوا تھا بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔

باب ۸

تعلیم بالغان کی ایک مناسب تجویز مرتب کرنا بھی ضروری ہے تاکہ کسان کی ہمہ جہتی کارکردگی بڑھے اور موجودہ نسل زراعت کی جدید ترقیوں سے فائدہ اٹھانے کے قابل بن جائے۔ بالغوں کی تعلیم اس لحاظ سے بھی اہمیت رکھتی ہے کہ وہ نوخیز دہقان میں مدرسہ چھوڑنے کے بعد اکثر اوقات جہالت و ناخواندگی کی طرف عود کرجانے کے عام میلان کو روکے گی۔ تعلیم بالغان کے دائرے میں عورتوں کو بھی شریک کرنا چاہیے تاکہ ان کے خیالات کی اصلاح ہو اور وہ ترقی کے میدان میں سنگ راہ نہ بنیں۔ عصر حاضر میں تعلیم بالغان کی تحریک مثلاً بنگال اور پنجاب تک محدود ہے۔ اگرچہ یہ زیادہ تر غیر سرکاری جد و جہد کا معاملہ ہے تاہم حکومت کو بھی پوری کوشش اور توجہ کے ساتھ اس میں مدد دینی چاہیے اور امداد باہمی کی انجمنوں کی خاص طور پر مالی امداد کرنی چاہیے۔[1]

247

بالغوں اور سن رسیدہ اشخاص میں علم کی روشنی اور خواندگی پھیلانے کے لیے خاص انتظام ضروری ہے مثلاً مدارس شبینہ، فرصتی جماعتیں، توسیعی تقریریں، کتاب خانے، مطالعہ گھر، طلسمی فانوس اور سینما کے تماشے وغیرہ۔ وسیلۂ تعلیم کی حیثیت سے خاصکر سینما کو بہت مفید طریقوں سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہی حال ریڈیو کا ہے[2] اس کے ذریعے نئی نئی احتیاجوں سے روشناس کرایا جا سکتا ہے اور عمل و جد و جہد کے لیے تازہ بہ تازہ ترغیبیں مہیا کی جا سکتی ہیں۔ غرض دہقان کے غیر تربیت یافتہ دماغ تک علم کی روشنی پہنچانے کا ذریعہ ہونے کی حیثیت سے سینما زبانی یا تحریری درس و تعلیم کے مقابلے میں بہت زیادہ موثر اور کارگر ہے۔ تعلیم بالغان کے بیشتر حصے کا دارومدار اسی قسم کی ایجنسیوں پر ہونا چاہیے اور تاحد امکان باقاعدہ مدرسوں کی تعلیم پر کم ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ عمل کا ذکر کرنا نامناسب نہ ہوگا جس کو تعلیم بالغان کے لیے دیہات میں اختیار کیا گیا ہے۔ ایسٹرن بنگال ریلوے جیسی بعض بڑی ریلوے لائنوں پر مختلف محکموں مثلاً ریلوے کے محکمۂ اطلاع و اشاعت، محکمہ جات حفظ صحت،

---

[1] دیکھو زراعتی کمیشن کی رپورٹ۔ پیراگراف (۴۴۹)۔

[2] موجودہ زمانے میں کئی صوبائی حکومتیں دیہی رقبوں میں لاسلکی نشر کے امکانات کی تحقیق کر رہی ہیں تاکہ اس کو دیہات سدھار کا ذریعہ بنالیا جائے اور بعض حکومتیں تجربے بھی کر چکی ہیں۔

باب ۸

صنعت و حرفت، امداد باہمی، علاج حیوانات، اور سررشتہ زراعت وغیرہ کے تعاون و تعامل سے مظاہرہ کرنے والی یا نمایشی ٹرینیں دوڑائی جاتی ہیں۔ ٹرین کے اندر دلچسپ اشیاء بغرض نمایش رکھنے کے علاوہ کھلی ہوا میں بھی مظاہرہ کیا جاتا ہے جس میں تقریریں، سینما اور طلسمی فانوس کے تماشے شامل ہیں[1]

۳۔ کسان کی جسمانی نااہلی: اُس کے اسباب اور علاج[2]

ہمارے اکثر دیہات کو ملیریا، طاعون، ہیضہ، پیچش، دق، کالا آزار جیسے "امراض کلاں" اور جلدی شکایات اور جذام وغیرہ جیسے نام نہاد "امراض خورد" تباہ و تاراج کر رہے ہیں۔ چنانچہ یہی کسان کی عدم کارگزاری اور نااہلی کے بڑے اسباب میں سے ایک ہے۔ مرض طاقتور توانا اور تندرست افراد کو موت کا شکار بناکر اور ناکاروں کے مقابلے میں کام کرنے والوں کا تناسب کم کر کے کسی قوم کی معاشی قوت میں انحطاط پیدا کر سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ مرض کے حملے کے بعد اگر آدمی جانبر بھی ہو جائے تو بھی جن پر حملہ ہوتا ہے وہ نہایت نحیف و ناتوان ہو جاتے ہیں اور اس طرح نہ صرف مزدوروں کی رسد میں قلت رونما ہوتی ہے بلکہ محنت کرنے کی قوت و صلاحیت میں بھی کمی ہو جاتی ہے۔ تیسرے یہ کہ مرض مزدوروں سے کام کی قوت ٹھیک ایسے زمانے میں سلب کر لیتا ہے جب کہ زرعی کاروبار پوری سرگرمی کے ساتھ انجام پا رہا ہو۔ اور آخر میں یہ کہ امراض کی وجہ سے لوگ کاہل، تن آسان، بے پروا اور تقدیر کے قائل بن جاتے ہیں۔ لہٰذا جسم کو امراض سے بچانے اور صحت عامہ کی حفاظت کے متعلق بڑے پیمانے پر باقاعدہ کوشش شروع کرنی چاہیے تاکہ امراض دفع و زائل ہوں، صحت عامہ کا قوی احساس اور تمیز پیدا ہو اور وہ تعصبات نیست و نابود ہو جائیں جن میں سے بعض کی جڑیں اس لحاظ سے بہت مضبوط ہو گئی ہیں کہ وہ مذہب سے وابستہ ہو گئے ہیں۔

248

دیہات کی صحت و صفائی کی حفاظت کے سلسلے میں محکمۂ اشاعت صحت، بالک ہفتوں، صلیب احمر کے کام، بہبودی اطفال زچگی کی انجمنوں اور امداد باہمی کے

[1] ۔ دیکھو ایک رپورٹ موسومہ بہ "ہندوستانی ریلوں کی کیفیت برائے سنہ ۱۹۲۶ سنہ ۱۹۲۷" صفحہ ۹۲۔

[2] ۔ دیکھو ایک رپورٹ موسومہ بہ "زرعی کمیشن کی رپورٹ، روئداد شہادت" جلد دوم صفحہ ۱۴۱۔

باب۸

شفا خانوں وغیرہ کی خدمات کی ضرورت ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ زیر آبپاشی علاقوں مرطوب خطوں اور دلدلوں سے زائد پانی کو نالیوں اور بدرووں کے ذریعے سے خارج کیا جائے، پینے کے لیے صاف اور خالص پانی کی بہم رسانی کا انتظام کیا جائے اور دیہاتی مکانوں کی اصلاح کی جائے۔ ہمارا سب سے بڑا جان لیوا اور افسردگی پیدا کرنے والا مرض ملیریا ہے۔ اس کے خلاف مہم جاری کرنے میں مادی کامیابی صرف اُس وقت ہو سکتی ہے جبکہ لوگ خود سخت کارروائی کریں اور حکومت ان کی مدد کرے۔ کونین کو بہت وسیع پیمانے پر تقسیم کرنا ضروری ہے اور مرکزی حکومت کو چاہیے کہ اس اہم معاملے کی ذمہ داری اپنے سر لے، کونین کو ارزاں کرنے کے مسئلے کی جانب مستعدی کے ساتھ متوجہ ہو اور سنکونا کی کاشت کو وسیع کر کے کونین کی رسد میں اضافہ کرے۔[1] دیہی علاقوں میں کافی طبی سہولتیں موجود نہ ہونے کی وجہ سے سخت دشواری پیش آتی ہے۔ یہ ضروری ہے کہ دیسی طبی نظاموں کی مناسب تحقیق کی جائے اور دیسی جڑی بوٹی اور ادویہ جو موثر معلوم ہوں ان کو ایلوپیتھک دواؤں کے بدل کے طور پر استعمال کرنے کی ہمت افزائی کی جائے۔ حکومت بمبئی نے حال میں دیہی رقبوں میں طبی سہولتوں میں اضافہ کرنے کی غرض سے ایک دلچسپ تجربے کا آغاز کیا ہے چنانچہ ایک "دیہی امدادی تجویز" مرتب کی گئی ہے جس کے تحت احاطۂ بمبئی کے بعض منتخب اضلاع میں مدارس تحتانیہ کے اساتذہ کو ضلع کے سیول ہسپتال میں ایک مختصر مدت تک طبی تربیت حاصل کرنی پڑتی ہے جس کے بعد انہیں طبی صندوقچوں کے ساتھ ان کے دیہات کو واپس بھیج دیا جاتا ہے۔ یہ لوگ سادہ بیماریوں کا علاج کرتے ہیں، باقاعدہ طبیب کی خدمات حاصل ہونے تک اولین امداد دیتے ہیں اور خطرناک بیماری کی صورت میں مریضوں کو قریب کے شفا خانے روانہ کرتے ہیں۔

دیہات میں صحت بخش اور پاک صاف مکان مہیا کرنے کا مسئلہ دیہی

[1] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ جلد اول صفحہ ۱۴۳ اور روئداد شہادت میں حکومت ہند کے کمشنر صحت عامہ کا بیان۔ نیز دیکھو مذکورہ بالا رپورٹ کے پیراگراف (۱۱ ۴ و ۴۱۲)۔

باب

حفظ صحت سے بہت قریبی تعلق رکھتا ہے۔ یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ انتظام سکونت اور اصلاح مکان کے مسئلے کا صرف شہروں ہی سے تعلق ہے۔ اس لیے کہ گو دیہات میں جگہ کشادہ اور ہوادار ہوتی ہے، پھر بھی خود مکانات عام طور پر ناپائیدار اور بودے ہوتے ہیں۔ یعنی مٹی کی چار دیواری پر گھاس پھوس کا چھپر ہوتا ہے، اندر داخل ہونے کا ایک ہی دروازہ ہوتا ہے، کھڑکیاں بالکل نہیں ہوتیں، اندرونی حصہ تاریک ہوتا ہے جس میں دھوپ اور روشنی کا بہ مشکل گزر ہوتا ہے، پھر، چوہے، اور دوسرے حشرات الارض بکثرت ہوتے ہیں۔ انسان اور مویشی عام طور پر ایک ہی کمرے میں بود و باش رکھتے ہیں، اور ایک کی سانس کی زہریلی ہوا دوسرے کی ناک میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس طرح یہ سکونتی انتظام انسان اور مویشی دونوں کے لیے مضر ہوتا ہے۔ دیہات کے ان تنگ اور گندہ مکانوں کو منہدم کرنے اور ان کی جگہ پاک صاف اور عمدہ مکان بنانے کے لیے نہایت سرگرم کوشش کی ضرورت ہے۔ دیہی مکانات کی اصلاح کے لیے امداد باہمی کے اصول پر انجمنیں قائم کرنی چاہئیں جن میں سرکاری جانب سے یا تو قرضہ دیا جائے یا مالی امداد۔ حکومت نہ صرف براہ راست قرضہ دے سکتی ہے بلکہ سود اور ان قرضوں کی ادائی کی ضامن بھی بن سکتی ہے جو کوٹھی کا کاروبار کرنے والے مخصوص اداروں کی جانب سے جو اس غرض کے لیے قائم کیے جائیں دیے جائیں۔

249

۴۔ گاؤں اور شہر کے درمیان زیادہ گہرا ربط قائم کرنے کی ضرورت

دہقان کی اصلاح دراصل اس طرح ہو سکتی ہے کہ اس کے پست اور دقیانوسی خیالات کی جگہ جو اس کے موجودہ افلاس اور پسماندگی کا باعث ہیں، جدید، دلیرانہ اور امنگ افزا خیالات پیدا کیے جائیں۔ اس لحاظ سے ہر وہ تحریک خوش آئند ہے جو بیرونی دنیا اور گاؤں کے درمیان گہرا ربط قائم کرے اور گاؤں کو شہروں کے ترقی پذیر اثرات کے دائرے کے اندر لے آئے۔ آجکل کے گاؤں زمانہ قدیم کی طرح بیرونی دنیا سے الگ تھلگ اور منقطع تو نہیں ہیں، پھر بھی ان میں ریلیں اور سڑکیں بہتر اور زیادہ تعداد میں بنا کر ارزاں آمد و رفت کے ذرائع وسیع کرنے کی بہت کچھ گنجائش باقی ہے۔ یہاں ڈاک خانے کا ذکر بھی نامناسب نہ ہوگا کہ وہ کس طرح تہذیبی اثر

باب

ڈال سکتا ہے[1]۔ کسی قوم کی زندگی میں ڈاک خانہ کس حد تک حصہ لے سکتا ہے اس کا انحصار بہت بڑے طور پر اس بات پر ہوگا کہ اس قوم میں نوشت وخواند کی قابلیت کتنی وسیع ہے۔ لیکن ڈاک خانے کی سہولتیں مہیا کرنا خود نوشت وخواند کی قابلیت حاصل کرنے کی خواہش کے حق میں محرک کا کام دیتا ہے اور ایک دفعہ لکھنے پڑھنے کی جو استعداد حاصل کی جا چکی ہے اس کو برقرار رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ ڈاک خانہ دلچسپ اطلاعیں شایع کر کے جو اہل دیہہ کی تعلیم وتربیت کے لیے خاص طور پر تیار کی جائیں پروپگنڈے کے کام میں ہاتھ بٹا سکتا ہے۔ ڈاک خانے کے سیونگ بنک لوگوں میں کم خرچی اور کفایت شعاری کی عادت پیدا کرتے ہیں اور منی آرڈر سرٹیفکیٹ (نقد پروانہ جات) کے انتظام کے ساتھ ساتھ دیہاتیوں کی پس انداز کی ہوئی چھوٹی رقموں کو بطور اصل مشغول کرنے کی سہولت بہم پہنچاتے ہیں۔ ڈاک خانے سے ایک چھوٹا سا فائدہ یہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے سے تخم اور ارزاں کونین تقسیم کی جا سکتی ہے۔ لاسلکی اور نشر عظیم امکانات رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان کے ذریعے سے دیہات کے آرام وآسائش میں اضافہ کیا جا سکتا ہے اور اہل دہ کی زندگی میں ایسی تبدیلی پیدا کی جا سکتی ہے جو ان کے خواب وخیال سے باہر ہے۔

د۔ پروپگنڈے کے طریقے۔

کسان کی جسمانی، ذہنی اور مادی حالت کی اصلاح وترقی کی غرض سے عہدہ داروں اور دوسرے سرکاری ملازموں اور غیر سرکاری ایجنسیوں کے ذریعے سے مسلسل اور گہرا پروپگنڈا ضروری ہے اور اس کام کو انجام دینے کے لیے مناسب قسم کے افراد کے انتخاب میں بہت کچھ احتیاط درکار ہے۔ دیہی حالات کی معلومات، سرگرم جدوجہد، دانائی وہوشیاری، وسیع تخیل اور دہقان اور اس کے مصائب وتکالیف کے ساتھ گہری ہمدردی، یہ سب لوازم اس میں موجود ہونے چاہئیں۔

سامعین کے روبرو موثر تقریر کرنا ایک فن ہے جسے دیہی سامعین کی فہمائش کا

[1]۔ دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ روداد شہادت جلد اول میں ایچ اے سیمس نائب صدر ناظم محکمہ ڈاک وتار کی یادداشت وشہادت۔

باب ۸

250

غرض سے مستقبل کے مصلح کو کچھ تکالیف برداشت کر کے حاصل کرنا چاہیے۔ اکثر لوگوں کی عمدہ تقریریں جو مفید معلومات سے پُر ہوتی ہیں اس وجہ سے کارگر نہیں ہوتیں کہ مقرر یہ نہیں جانتا کہ انھیں اپنے سامعین کے سامنے موثر طریقے پر کس طرح پیش کرنا چاہیے۔ اف ال' برین نے کیا خوب کہا ہے کہ "اگر دہقانی سامعین بت بنے بیٹھے رہیں تو مقرر سمجھ لیں جونک نہیں لگا سکتا' لیکن جونہی مقرر نے دہقان کو بحث کی ترغیب دی یا اس کو اپنی حالت پر ہنسایا کہ لڑائی جیتا"۔ مقرر میں ظرافت اور متانت دونوں صفتیں ہونی چاہئیں۔ وہ کبھی مذاق اور تمسخر کرے تو کبھی وعظ اور پند کرے لیکن قدرت ہر ایک میں یہ استعداد و قابلیت ودیعت نہیں کرتی۔

علاوہ ازیں اصلاح کے لیے ایسی تجویز پیش کرنی چاہیے جس پر کسان عمل کر سکے اور اس کو پیش کرنے سے پہلے ہی اس کی بخوبی جانچ کر لینی چاہیے۔ مروجہ طریقوں سے کامل عملی واقفیت حاصل کیے بغیر کوئی ایسا نظریہ پیش کرنے سے باز رہنا چاہیے جو حقیقت پر مبنی نہ ہو۔ ہندوستان میں کاشت کا جو مخصوص طریقہ رونما ہوا ہے وہ صدیوں کے عملی تجربے اور زمین سے وابستگی کا نتیجہ ہے اور بقول سر جیمس میکینا "سالہا سال کے روایتی رسم و رواج پر مبنی ہے جن کی گہری بنیادیں باقاعدہ اصول پر قائم ہیں۔ گو ان اصول کی توضیح و تشریح نہیں کی گئی ہے' لیکن ان کے اسباب کو صرف تدریجی طریقے پر بیان کیا جا سکتا ہے"۔ اس میں شبہہ نہیں کہ ہندوستانی کسان کو زیادہ ترقی یافتہ ممالک کی زراعت سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ وہ نہ تو اپنے اختیار کیے ہوئے طریقوں کی توجیہ و تشریح کر سکتا ہے اور نہ ان کے حق بجانب ہونے کے اسباب پیش کر سکتا ہے اور اس سے بہت بڑی دقت پیدا ہوتی ہے اس لیے کہ روایات کی کورانہ تقلید' کاشت کے طریق میں متبدلہ حالات کے لحاظ سے بعجلت مناسب تبدیلی کرنے کی راہ میں مزاحم ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ ایک زمانے میں جو طریقے مفید تھے ان میں اب فائدہ باقی نہ رہا ہو' لیکن چونکہ کسان کی معلومات بالکل تجربی ہوتی ہیں' اس لیے وہ اس چیز کو جلد محسوس کرنے یا سمجھنے کے قابل نہیں ہوتا۔ بہر حال جدید محقق کو مذکورۂ بالا وجوہ کی بنا پر یہ فرض کرنا چاہیے (تا وقتیکہ اس کے خلاف ثبوت بہم نہ پہنچے

باب ۶ کہ موجودہ طریقوں کی بنیاد ایک حد تک معقول ہے اور مفید اصلاح و ترقی کا مشورہ پیش کرنے سے قبل استقلال کے ساتھ تحقیق و تعیش کر لینا ضروری ہے [1]

۶۔ زرعی مزدور (اجیر)

ہندوستانی زراعت میں انسانی عامل کی مذکورۂ بالا بحث دراصل ایسے کسان کے متعلق تھی جو اپنی مزروعہ زمین کا خود ہی مالک ہے۔ لیکن تکمیل بحث کی خاطر یہ ضروری ہے کہ اولاً اجرت پانے والے مزدور کا مختصر ذکر کیا جائے اور دوسرے یہ بیان 251 کیا جائے کہ ہندوستان کی زرعی معیشت میں زمیندار کا کیا حصہ ہے۔ جہاں تک اجرت پانے والے مزدور کا تعلق ہے وہاں تک یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ صورت حال غیر اطمینان بخش ہے۔ زرعی مزدور جو خود کو مزدوری کے لیے پیش کرتے ہیں دو حصوں میں منقسم ہیں۔ (۱) بے زمین مزدور جن کی ملک میں کوئی زمین نہیں ہے؛ اس جماعت کی تعداد سر دست کم ہے لیکن اس میں اضافے کا میلان پایا جاتا ہے؛ (۲) ایسے مزدور جو چھوٹے چھوٹے خطوں کے مالک ہیں لیکن ان کے خطے اس قدر چھوٹے ہیں کہ انھیں اپنا پیٹ پالنے کے لیے دوسرے اشخاص کی زمین پر اجرت پر کام کرنا پڑتا ہے۔ ان دونوں جماعتوں سے جو مزدور حاصل ہوتے ہیں وہ گراں، عدم کارگزار اور ناقابل اعتبار ہوتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں نقل و طمل کی جدید سہولتوں نے اور ریلوں، تعمیرات عامہ، تجارت اور صنعت و حرفت میں مزدوروں کی روز افزوں مانگ نے مزدوروں کی حیثیت کو عام طور پر قوی کر دیا ہے۔

---

[1] سرام وس ویسوریا اپنی کتاب موسومہ بہ Planned Economy for India صفحہ ۹۸ میں یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ "ایک ایک مستقل زرعی عجائب خانہ ہر شہر، بڑے قصبے اور کئی دیہات کے حلقے کے اندر مرکزی محل وقوع والے اس گاؤں میں ہونا چاہیے جہاں زراعت کے اغراض کو ترقی دینے کے لیے کوئی مقامی انتظام موجود ہو۔ ایسے عجائب خانوں میں کتابیں اور رسالے ہونے چاہئیں جن میں جدید ترین زرعی طریقوں اور آلات اور کلوں کا بیان ہو۔ زرعی نظاہرے اور سالانہ نمائشیں بھی منعقد کرنی چاہئیں جن کا انتظام کسان کی امداد باہمی اور حکومت کی تائید اور ہمت افزائی سے مقامی تہوارا اور تقاریب کے موقعوں پر ہونا چاہیے۔"

باب

علاوہ ازیں طاعون اور انفلوئینزا جیسے وبائی امراض کے باعث کثیر اموات واقع ہونے کی وجہ سے مزدوروں کی تعداد میں قابل لحاظ کمی ہو گئی ہے۔ آخر میں یہ کہ چھوٹے ملکی کاشتکاروں میں اپنے کھیتوں پر خود محنت کرنے سے باز رہنے کا بھی ایک حد تک میلان رونما ہوا ہے اور جونہی ان کی مالی حالت اس قسم کا تعیش اختیار کرنے کی اجازت دیتی ہے وہ اجرت پر مزدور حاصل کر کے اسی سے کام لیتے ہیں۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اجرت پانے والے مزدور کی شرح اجرت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ لیکن اس کے مقابل میں اس کی کارکردگی میں کوئی اصلاح و ترقی نہیں ہوئی ہے۔ اجرت میں پہلے کے مقابلے میں جو اضافہ ہوا ہے وہ جدوجہد کو بڑھانے کے حق میں محرک کا کام کرنے کی بجائے بظاہر اس کی برعکس سمت میں عمل کر رہا ہے۔ مزدور زیادہ اجرت کما کر کارکردگی کو بڑھانے کے بجائے کم کام کرنے کو ترجیح دیتا ہے، چنانچہ اس کے معیار زندگی میں اور اعلیٰ معیار زندگی کے ذریعے سے اس کی کارکردگی میں کوئی نمایاں ترقی نہیں ہوئی ہے۔ غرض یہ کہ مزدور میں وہی کمزوریاں اور اسقام پائے جاتے ہیں جو کسان کی امتیازی خصوصیت ہیں۔ اس لحاظ سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ دیہی رقبوں کے عام احیائے جدید کے لیے جو تدابیر نکالی جائیں گی ان سے مزدور کو بھی فائدہ پہنچے گا۔

۷۔ زمیندار اور اس کی حیثیت زرعی معیشت میں

ہندوستانی زراعت کو جن عظیم ترین دشواریوں سے سابقہ ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ زراعت اپنی جانب مطلوبہ دماغ، حوصلہ مندی، اور اصل کو مائل کرنے سے بڑی حد تک قاصر ہے۔ زندگی کے آرام و راحت کے جدید سامان، مثلاً تعلیم، حفظ صحت، اور ترقی یافتہ وسائل آمد و رفت پر زیادہ تر شہروں کو اجارہ حاصل ہو گیا ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ان سہولتوں کی بہم رسانی کے لیے آمدنی زیادہ تر دیہات ہی سے وصول کی جاتی ہے۔ شہر جو وسیع مواقع اور لبھا لینے کا سامان پیش کرتے ہیں ان کی بنا پر اعلیٰ درجے کے ذہین و حوصلہ مند اشخاص کو دیہات سے شہروں میں منتقل ہو جانے کی ترغیب و تحریص ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے دیہات میں ایسی کمی واقع ہوتی ہے جس کا

باب

252

باآسانی پورا ہونا ممکن نہیں۔ آخر میں یہ کہ شہروں کے تعلیم یافتہ لوگوں اور زمینداروں نے دیہی مسائل کی تحقیق کرنے اور دیہی ضرورتوں کو سمجھنے اور پورا کرنے کی جانب اب تک توجہ نہیں کی ہے۔ ان کی معلومات مالی ذرائع اور حوصلہ مندیوں سے دیہی خوشحالی کی ترقی میں کام لینے کا موقع ابھی تک نہیں پہونچایا گیا۔ شہری آبادی کی لاعلمی زرعی معاملات کے بارے میں اس قدر عظیم اور حقیقی ہے کہ وہ کم و بیش احترام و تعظیم کی مستحق ہے[1]۔ اٹھارویں صدی میں بیک ویل، بیٹس اور ٹرنپ ٹاؤن شینڈ جیسے بڑے زمینداروں کی قیادت و رہبری نے انگلستان کی زراعت کو بے حد فائدہ پہنچایا' لیکن ہندوستان میں ایسی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ بنگال میں دوامی بندوبست رائج کرنے کے جو لوگ ذمہ دار تھے ان کی قائم کی ہوئی توقعات میں سے ایک یہ تھی کہ اس انتظام کی بدولت بڑے زمینداروں کی ایک جماعت وجود میں آئے گی جو اپنی جاگیروں پر سکونت پذیر ہوں گے اور جن کے شخصی اثر اور مادی مدد سے کسانوں کو معتد بہ فائدہ پہنچے گا۔ یہ توقع کی گئی تھی کہ دیہی رعیتوں کی مادی، ذہنی وعقلی اور تہذیبی ترقی میں زمیندار زبردست حصہ لیں گے۔ لیکن بدقسمتی سے یہ توقع پوری نہ ہوئی۔ زمیندار بہت ہی چند مستثنیات کے ساتھ عام طور پر اپنی زمینوں سے دور بڑے شہروں میں بود و باش کو ترجیح دیتے رہے اور اپنی جائداد و املاک سے صرف اس لحاظ سے دلچسپی رکھتے ہیں کہ وہ آمدنی کا ذریعہ ہیں اور ان سے لگان وصول ہوتا ہے۔ ان کا وظیفہ صرف یہ ہے کہ اپنے اسامیوں سے قوانین لگان جس حد تک اجازت دیتے ہیں اسی حد تک پورا پورا لگان ایک دور افتادہ آب کش پمپ کی طرح کھینچ لیتے ہیں۔ پرباس زمینداری کا رواج عام طور پر نہ صرف بنگال میں بلکہ ملک کے ان دوسرے علاقوں میں بھی ہے جہاں زمینداروں کی بڑی جماعت موجود ہے۔ پرباس زمینداری کے نقائص کا ذکر کرتے ہوئے کار ور

[1] یہ مقولہ اے کوکے سے ماخوذ ہے اور یہ کیلورٹ کی کتاب موسومہ "پنجاب کی دولت وخوشحالی" دیباچہ صفحہ ا سے نقل کیا گیا ہے۔ گو یہ تبصرہ انگلستان کے حالات کے بارے میں کیا گیا ہے لیکن ہندوستان کے بارے میں بھی وہ اس سے کچھ کم صادق نہیں آتا۔

باب ۸

لکھتا ہے کہ "جنگ، وبا اور قحط کے بعد دیہی برادری کے حق میں کوئی بدترین شے ہے تو وہ پرباس زمینداری ہے"۔[1] یہ خرابی ان علاقوں میں خصوصیت کے ساتھ عام اور زیادہ ہے جہاں زمینداری طریق رائج ہے، گو رعیت واری علاقوں میں بھی یہ خرابی پوری طرح مفقود نہیں ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جہاں تک اراضی کی ترقی کا تعلق ہے، زمیندار ایک جماعت کی حیثیت سے حکومت سے بھی زیادہ الگ تھلگ اور بے تعلق اجنبی کا کام کرتے ہیں۔ حکومت نے تو کم از کم آبپاشی کی سہولتوں سڑکوں اور ریلوں زرعی تعلیم کی بہم رسانی اور تقاوی قرضوں کی منظوری وغیرہ جیسے اہم کام اپنے ذمہ لے رکھے ہیں اس کے برخلاف زمیندار زمین کی اصلاح و ترقی کے لیے عام طور پر کچھ بھی نہیں کرتا۔ زرعی ترقی کے لیے یہ نہایت اہم و ضروری ہے کہ زمیندار جماعت اس میں دلچسپی لے۔ اس کی بدولت لگان کا سختی سے وصول کرنا موقوف ہو جائے گا، زمیندار اور اس کے اسامی کے درمیان خوشگوار ذاتی تعلقات قائم ہوں گے جس سے دونوں فائدہ حاصل کر سکتے ہیں اور ترقی کی رفتار بھی بہت تیز ہو جائے گی۔ بڑے زمینداروں کے پاس ترقی کے کم از کم دو لوازم موجود ہیں یعنی (۱) اصل اور (۲) ذہانت۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ زمیندار جدید خیالات قبول کریں اور یہ محسوس کریں کہ شہروں میں اپنا وقت ضایع کرنے کے بجائے دیہات میں سکونت اختیار کرنا اور ان میں نئی روح پھونکنے کی تحریک کو آگے بڑھانا نہ صرف زیادہ فائدہ مند بلکہ زیادہ مسرت بخش بھی ہے۔ ایسی صورت میں اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کہ زراعت میں خاص اصلاح و ترقی ہو، ہمیں عوام میں بیداری پیدا ہونے کے طویل اور سست عمل کا انتظار کرنا نہ پڑے گا۔ زمیندار مختلف طریقوں سے اصلاح میں مدد دے سکتا ہے، مثلاً خود کاشت کھیت قائم کرے، عمدہ نسل کے مویشیوں کے گلے پالے، عمدہ قسم کے تخم تیار کرے، زیادہ موثر اور کارگر آلات کشاورزی رائج کرے اور آخر میں لیکن سب سے بڑھ کر یہ کہ دہقانوں کسانوں اور چرواہوں

258

[1] دیکھو کاروور کی کتاب موسوم بہ "اصول معاشیات دیہی" صفحہ ۳۰۰۔ Principle of Rural Economics

باب

میں ترقی کی امنگ پیدا کرے۔

زمیندار دیہات میں کیوں سکونت اختیار نہیں کرتے اس کے متعدد وجوہ ہیں جن کے منجملہ ایک یہ ہے کہ دیہی علاقوں میں مہذب زندگی کے آرام و آسائش کے سامان بالکل مفقود ہوتے ہیں۔ جب یہ کمی پوری ہو جائے گی تو ان کی ہمت افزائی ہوگی کہ وہ آئیں اور اپنے اسامیوں کے ساتھ ل کر رہیں۔ لیکن یہ خود زمینداروں کا خاص حق اور فرض ہونا چاہیے کہ وہ دیہات کی دلکشیوں کو بڑھانے میں مدد دیں۔ انھیں اسباب کا انتظار نہ کرنا چاہیے کہ حکومت یا دوسرے عوامل کی کوششوں کے ذریعے سے یہ آرام و آسائش میسر آئے گا بلکہ ان کو دیہات میں قیام کر کے اور یہاں کی حفظ صحت اور تعلیم کے بارے میں اصلاحوں کو فروغ دے کر اسباب راحت خود مہیا کر لینے چاہئیں۔ یہ کہنا نامناسب ہی نہیں بلکہ واقعی طور پر غیر معقول ہوگا کہ ہر مالک زمین لازمی طور پر اپنی ملوکہ زمین پر سکونت اختیار کرے۔ مثلاً یہ مشورہ دینا لغو ہوگا کہ کسی بڑے شہر میں معقول آمدنی کمانے والا کوئی لائق طبیب اس وقت تک زمین کا مالک نہ بنے جب تک کہ وہ اس زمین پر فروکش ہونے کے لیے تیار نہ ہو۔ ممکن ہے کہ اس کا اپنے پیشے کی جانب اپنی تمام توجہ کو مرتکز کرنا نہ صرف انفرادی نقطۂ نظر سے بلکہ اجتماعی اور قومی نقطۂ نظر سے بھی بدرجہا زیادہ نفع بخش ہو۔ اسی کے ساتھ ایسے لوگوں کے خلاف تعزیری یا امتیازی کارروائی کرنا ناانصافی ہوگی جو دوسرے پیشوں میں آمدنی پیدا کر رہے ہوں اور زراعت کے حق میں اپنے پیشوں سے دست بردار ہوئے بغیر اپنی پس انداز کی ہوئی رقوم کو زمین میں مصروف کرنے کے خواہاں ہوں۔ اس قسم کی کارروائی اختیار کرنے کا نتیجہ یقیناً یہ ہوگا کہ زمین کی قیمت گر جائے گی اور زمین کی طرف اصل کی آزادانہ نقل رک جانے کی وجہ سے زرعی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔ لیکن ایسے زمیندار کے لیے جس کا اپنی دیہی جائداد سے غائب رہنا مذکورۂ بالا وجوہ کی بنا پر ناگزیر اور قابل معافی ہو اس بات کا خیال رکھنا ہمیشہ ممکن ہوگا کہ اپنے اسامیوں سے لگان وصول کرنے میں سخت گیری نہ کرے اور ان سے ایسا برتاؤ کرے کہ اس کی بنا پر انھیں نہایت احتیاط کے ساتھ کھیتی باڑی کرنے کی

باب ۳

ترغیب و تحریص ہو۔ رہا ایسا زمیندار جو زراعت کے سوا کسی دوسرے پیشے میں بطریق بدل کام نہ کرے اور کلیتہً اپنی ہی زمین کے لگان پر گزارہ کر رہا ہو تو اس کی حیثیت مختلف ہوتی ہے۔ اس کا فرض ہے کہ اپنی جائداد کی ترقی میں دلچسپی لے جس میں نہ صرف اس کا ذاتی فائدہ ہے بلکہ اس کے اسامیوں اور اس کی برادری اور قوم کا بھی فائدہ ہے۔

154

۸۔ زمینداری سے کیا فرائض اور ذمہ داریاں وابستہ ہیں۔

یہ بات ہمیشہ تسلیم کی گئی ہے کہ سب اقسام کی جائدادوں میں ارضی جائداد ہی ایک ایسی قسم ہے جس سے خاص فرائض اور ذمہ داریاں متعلق ہوتی ہیں ممکن ہے کہ خالص نظری اسباب کی بنا پر ہمارے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ انجمن سرمایۂ مشترک کا حصہ دار جو انجمن کے انتظامی معاملات میں کوئی حصہ لیے بغیر مقسوم حاصل کرنے پر قانع ہوتا ہے اس کی حیثیت اس زمیندار کی حیثیت سے کس طرح مختلف ہوتی ہے جو حصہ دار مذکور کے مثل محض لگان وصول کرنے پر قناعت کرتا ہے اور بذات خود کسی کام میں حصہ نہیں لیتا۔ اس کا جواب اولاً یہ ہے کہ اگر حصہ دار اپنی انجمن کے معاملات میں ذاتی طور پر دلچسپی لے تو اس سے اچھی کیا بات ہوسکتی ہے؛ اس کا ایسا نہ کرنا بالعموم سوء انتظامی کا باعث ہوتا ہے؛ چنانچہ کئی سرمایۂ مشترک کی انجمنیں محض اسی وجہ سے تباہ ہو جاتی ہیں۔ تاہم یہ ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ متوسط حصہ دار کو نہ اتنی فرصت اور مہلت ہے اور نہ اس میں اتنی قابلیت اور مہارت ہے کہ اپنی کمپنی کے معاملات میں غور و فکر کرے اور اس کے کاروبار میں پورے انہماک کے ساتھ دلچسپی لے۔ علاوہ ازیں وہی تنہا حصہ دار نہیں ہوتا بلکہ دوسرے بیسیوں بلکہ سینکڑوں حصہ دار ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس کا انفرادی طرز عمل یا اس کی روش معاملات پر کسی قابل لحاظ حد تک اچھا یا برا اثر نہیں ڈالتی۔ محض اس بنا پر کہ کوئی خاص حصہ دار انتظام میں عملی حصہ نہیں لیتا یا مدد نہیں دیتا یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ انجمن کا کاروبار سراسر غیر منظم حالت میں پڑا ہوا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انجمن سرمایۂ مشترک کا انتظام کارکردگی کے ایسے اعلیٰ زینے پر پہنچ گیا ہے کہ اس امر کے باوجود کہ عام حصہ دار نگرانی نہیں کرتے اور الگ رہتے ہیں قابل منتظموں اور قائدوں کا عام طور پر معقول انتظام کر لیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں جہاں تک مزدوروں یا کاریگروں کا

باب ۶

تعلق ہے وہاں تک یہ ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ ان کی حیثیت کسانوں اور اسامیوں کے مقابلے میں اس لیے زیادہ موافق ہوتی ہے کہ مزدور اپنی خواہشوں اور مطالبوں کو موثر طریقے پر عمل میں لانے اور منوانے کے لیے متحد ہو سکتے ہیں اور مزدور سبھاؤں کی شکل میں نظامات قائم کر سکتے ہیں۔ آخر میں یہ کہ بقول ہے ر یملیس "جب سرمایۂ مشترک کے جدید اداروں کو قائم ہوئے ایک خاص مدت گزر جاتی ہے اور ان کے کاروبار میں خاصی وسعت پیدا ہو جاتی ہے تو ان میں اجتماعی تنظیم کا میلان پیدا ہوتا ہے اور ان کی حیثیت انفرادی طور پر خانگی کاروبار کرنے والی انجمنوں کی بجائے انجمن ہائے عامہ کی ہو جاتی ہے۔ قوم کی عام پابندی و استواری نیک نامی و شہرت ہی سب سے اہم شے ہے اور منافع تو بالکل ثانوی حیثیت رکھتے ہیں"[1]

ان حالات میں عوام کی کم توجہی سے بچنے کے لیے مزدوروں (اور صارفوں) کے اغراض کی خاص طور پر نگرانی و نگہداشت کی جاتی ہے۔ ان سب اعتبارات سے زمین کی حیثیت دوسری چیزوں سے بالکل الگ اور جدا ہے اور یہ خیال کہ ہر قسم کی جائداد ایک امانت یا وقف ہے جس کا اصلی مالک قوم کی جانب سے اور اس کی نیابت کے طور پر کرنا ضروری ہے تو یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ جائداد کی دوسری قسموں کے مقابلے میں زمین ہی پر اس کا بہت زیادہ اطلاق ہو سکتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ ضروری ہے کہ ہندوستانی رعیت کی موجودہ بے بسی اور سقیم حالت میں اس خیال پر انتہائی زور دیا جائے اور دیہی ترقی کے کام میں زمیندار کو زیادہ کارگر اور مفید عامل بنایا جائے۔

کاشت کا طریق اور ساز و سامان

255

۹۔ کاشت کا طریق

ہندوستان کا کسان زیادہ تر کاشت وسیع کے طریقے اختیار کرتا ہے جو اوسط درجے کے کھیت کے مختصر رقبے کے مدنظر

[1] دیکھو ایک کتاب موسومہ بہ اصول عدم مداخلت کا انجام صفحہ ۴۳ تا صفحہ ۴۴۔ The End of Laissez-faire

باب

ناموزوں ہیں۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جتنی پیداوار حاصل ہونی چاہیئے
اس سے بہت کم حاصل ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے ہندوستانی حالات کا
جاپانی حالات سے مقابلہ کرتے ہوئے سرام ولیں ولیسوریا لکھتے ہیں کہ "گو جاپان اپنی
غذا کی ضرورتوں کو خود ہی تمام و کمال مہیا نہیں کرتا پھر بھی معمولاً ۶۵ ملین آبادی کی
کفالت ۱۷ ملین ایکڑ مزروعہ رقبے کے ذریعے سے کرتا ہے گویا ہندوستان کے
فی کس ۲/۳ ایکڑ کے مقابلے میں جاپان کا اوسط فی کس ۱/۴ ایکڑ ہے"۔ چین و جاپان
میں کاشت بہت ہی عمیق اور زمین کی انتہائی قوت تک کی جاتی ہے اور زراعت
کی حالت کم و بیش باغبانی کے مشابہ ہے۔ علیٰ ہذا ہندوستانی کسان کی نجات بھی
کاشت عمیق کا طریقہ اختیار کرنے پر منحصر ہے۔ اس کی وجہ سے دوسرے امور کے
منجملہ یہ ضروری ہوگا کہ مستقل اصلاح و ترقی اور آبپاشی پر زیادہ رقم خرچ کی جائے
زیادہ موثر طریقے سے کاشت کی جائے تخم کے انتخاب میں احتیاط سے کام لیا جائے
دوری فصلوں کا بہتر نظام مرتب کیا جائے اور کھاد کافی مقدار میں دی جائے۔ اس
فہرست کی اول الذکر دو مدوں پر ہم بحث کر چکے ہیں۔ رہا کاشت کا طریق تو
ہندوستان میں گاہ گاہ یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ وہ بہت ہی اعلیٰ معیار پر
پہنچ جاتا ہے لیکن ملک کے اکثر علاقوں میں ابھی اصلاح و ترقی کی بہت کچھ گنجائش
زمین کو کاشت کے لیے تیار کرنے تخم بونے زمین کو خس و خاشاک سے صاف
کرنے مسطح کرنے مینڈ بنانے اور فصل کو کاٹنے کے سلسلے میں باقی ہے۔ عمدہ قسم کے
خالص تخم کی قیمت زیادہ ہوتی ہے لیکن کسان عام طور پر اپنے تخموں کا انتخاب
کرنے میں کافی احتیاط نہیں کرتا یا اس کی اہمیت کو محسوس کرنے کے باوجود ان کو
حاصل کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ ملک میں تخموں کی انجمنیں اور تخموں کے مزرعے
معدودے چند ہیں۔ چنانچہ ملک کے تمام حصوں میں کسانوں کو اعلیٰ قسم کے
تخموں کی کافی مقدار مہیا کرنے کے لیے ان کی تعداد میں کئی گنا اضافہ کرنے کی
ضرورت ہے۔ زرعی کمیشن یہ سفارش کرتا ہے کہ تخموں کی جانچ اور تقسیم کی
غرض سے ایک علحدہ سررشتہ قائم کیا جائے اور اس کی نگرانی ناظم زراعت کے
ماتحت ایک نائب ناظم کے تفویض کی جائے (دیکھو رپورٹ کا فقرہ ۱۰۳)۔

باب ۶

جہاں تک دوری فصلوں کا تعلق ہے وہاں تک معیار سابق کے مقابلے میں بہت گھٹ گیا ہے۔ ایسی مثالیں حد سے زیادہ ملتی ہیں جن میں کہ فوری منافع کا لالچ روئی اور گیہوں جیسی بعض فصلوں کی جانب توجہ مرتکز کرنے کے نقصان رساں اور انجام کار غیر منفعت بخش طریقہ اختیار کرنے کا باعث بنا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کسان کو تلخ تجربے کے بعد آخر کار محسوس ہوگا کہ دوری فصلوں کے ایک باقاعدہ نظام پر عمل کرنا [illegible]، لیکن پروپگنڈا کے ذریعے سے بھی اس سمت میں ایک حد تک مفید کام کیا جا سکتا ہے۔ بعض علاقوں میں حال حال میں ایک خوش آیند تبدیلی یہ رونما ہوئی ہے کہ دوری فصل کی تجویز میں فصل ربیع پر مونگ پھلی کی کاشت کو شریک کیا گیا ہے اور اس خاص فصل کی اس نوعیت کی بنا پر کہ اس سے فوری نفع ہوتا ہے اس تجویز کو بروئے کار لانے میں سہولت پیدا ہو رہی ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ دوری فصلوں کے باقاعدہ نظام میں چارے کی فصلوں کو جگہ دینے کے امکانات کی مناسب تحقیق کی جائے خاصکر اس لیے کہ موجودہ زمانے میں مویشیوں کو کافی مقدار میں خوراک مہیا کرنے کا مسئلہ نہایت اہم بن گیا ہے۔

۱۰۔ کھاد۔[1] کھاد اور زرخیزی بڑھانے والی چیزوں کا استعمال زمین کی پیداوار میں اضافہ کرنے والا ایک اہم عامل ہے خاصکر اس واقعے کے مدنظر کہ زمین پر آبادی کے بڑھتے ہوئے دباؤ اور زرعی پیداوار کی عالمی قیمتوں کی کمی کی بنا پر یہ بہت ضروری ہوگیا ہے کہ کاشت کے طریقوں کو زیادہ موثر بنایا جائے۔ لیکن اگر زمین کو کھاد کی ناکافی مقدار ملتی ہے تو اس میں ہمیشہ کسان ہی کی غلطی نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کہ آبپاشی کی سہولتیں موجود نہ ہوں چنانچہ خشک حصوں میں زیادہ مقدار میں کھاد دینے سے فائدے کی بجائے نقصان کا زیادہ احتمال ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں عام طور پر یہ بھی ممکن ہے کہ مطلوبہ کھاد بہت کمیاب ہو اور اس کا حاصل کرنا مشکل ہو یا اوسط درجے کے کسان کے ذرائع آمدنی محدود ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ مہنگی خرچ ہو۔

256

[1] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ فقرہ ۱۵۰ تا ۹۰؛ نیز دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ تبصرہ برزرعی کاروبار ہندوستان ۱۹۳۰ تا ۱۹۳۱ء صفحہ ۱۹۱ تا صفحہ ۱۹۳ اور صفحہ ۲۰۷؛ ہندوستان ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء صفحہ ۹۴۔

لیکن زمین کو مناسب کھاد دینے اور کھاد کو مناسب طریقے پر محفوظ رکھنے کے مسئلے سے بحیثیت مجموعی اس ملک میں سراسر بے اعتنائی برتی جاتی ہے۔ ہندوستان کے لوگ متعدد نقصان رساں طریقوں کے خوگر ہو گئے ہیں، چنانچہ ان ہی میں سے ایک یہ ہے کہ گائے کے گوبر کو ایندھن کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس طریقے کو روکنا چاہئے اور کھیتوں کے کھاد کو ایندھن کے طور پر استعمال کرنے کے بجائے زیادہ مناسب یہ ہوگا کہ ایندھن کی متبادل شکلیں مہیا کی جائیں۔ اس غرض سے دیہات کے قرب و جوار کے افتادہ علاقوں میں ایندھن کے درخت لگانے چاہئیں، اور محکمۂ جنگلات اور مقامی جماعتوں کے ذریعے سے ایندھن کے محفوظ ذخائر دیہات سے امکانی طور پر قریب قائم کرنے چاہئیں۔ نیز یہ بھی ضروری ہے کہ ایندھن کی رسد میں اضافہ کرنے کی غرض سے جنگلات کی حفاظت کرے اور نئے درخت لگانے نیز ایندھن کی نقل و حمل کے لیے ریل کا کرایہ ارزاں کرنے کے امکانات کو پوری طرح جانچا جائے۔ مویشیوں کا پیشاب عام طور پر ضائع کر دیا جاتا ہے اور انسانی فضلے کو کھاد کے طور پر استعمال کرنے کے بارے میں اب بھی بہت کچھ بے پروائی برتی جاتی ہے، اگرچہ اس میں بتدریج کمی ہو رہی ہے۔ ہندوستانی کسان کو چینی اور جاپانی کسان سے مرکب کھاد کی تیاری کے بارے میں ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے جن میں ہر قسم کا نامیاتی فضلہ انجام کار زمین ہی کو کھاد کے طور پر مل جاتا ہے۔

مسٹر برین نے ضلع گڑگاؤں پنجاب کے دیہاتیوں کو گاؤں کا تمام کوڑا کرکٹ ڈالنے کی غرض سے گڑھے کھودنے پر آمادہ کیا تاکہ اس سے صفائی اور کھاد کے تحفظ کا دوہرا مقصد پورا ہو۔ چنانچہ چند ہی سال کی مدت میں چالیس ہزار سے زیادہ گڑھے کھد کر تیار ہو گئے اور ہر گڑھا ۳ فٹ گہرا اور ۱۰ یا ۱۲ فٹ چوڑا تھا۔ مسٹر برین نے دیہاتیوں کو اس بات کی بھی ترغیب دی کہ مرد اور عورتیں رفع حاجت

لے۔ گائے کے گوبر کو ایندھن کے طور پر استعمال کرنے کا سبب ہمیشہ یہ نہیں ہے کہ کسی دوسری قسم کا ایندھن دستیاب نہیں ہوتا، بلکہ عام طور پر محض غفلت و بے پروائی یا تعصب کی بنا پر ایسا کیا جاتا ہے۔ چنانچہ پنجاب میں یہ خیال بظاہر عام طور پر پھیلا ہوا ہے کہ اوپلوں کے بغیر کھیر نہیں بن سکتا۔ دیکھو برین کی کتاب محولہ بالا صفحہ ۲۔

باب

کے لیے گڑھوں کو استعمال کریں جن کے اطراف تخلیے کے لیے جھاڑیاں لگائی جائیں اور سہولت کے لحاظ سے تختے بچھا دیے جائیں۔ اس طرح ان گڑھوں کی بدولت دیہات بھی پاک صاف رہیں گے اور عمدہ فصلیں بھی تیار کرنے میں مدد ملے گی۔ انسانی فضلے اور ہر قسم کے کوڑے کرکٹ اور گندگی کو زمین کی اغراض میں پوری طرح استعمال کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ ہندوستان کے تمام مختلف شہروں اور قصبات میں جو بدررو موجود ہیں جن کے ذریعے سے اس قدر کھاد کا مواد سمندر یا دریا کے پانی میں بہا دیا جاتا ہے ان کا مخرج بدلنا پڑے گا۔ خشک سفوف فضلہ و پاخانے کی سب سے کم کریہ شکل ہے جو کسان کو مہیا کی جا سکتی ہے اور اس سلسلے میں ناسک میں جو طریقے اختیار کیے گئے ہیں وہ دوسرے مقاموں کے بلدیوں کے لیے لائق تقلید و تحقیق ہیں۔ دالوں کی دوری فصلیں بونے سے یہ فائدہ ہے کہ زمین کو نائٹروجن مل جاتی ہے چنانچہ ہندوستانی کسان ان فصلوں کی اہمیت کو ہمیشہ سے تسلیم کرتا آیا ہے۔ لیکن محکمہ جات زراعت کو چاہیے کہ وہ زمین کی زرخیزی بڑھانے کے لیے دالوں کی فصلیں بونے کے متعلق بہتر طریقوں کی تحقیق کریں۔

سن، ڈھینچہ وغیرہ کو کھاد مہیا کرنے کا طریقہ صرف ترقی یافتہ علاقوں میں رائج ہے۔ چھوٹے کسان سن، ڈھینچہ وغیرہ بونے کی اس وجہ سے مخالفت کرتے ہیں کہ یہ فصلیں زمین میں صرف ہو کر رہ جاتی ہیں اور دوسری منفعت بخش فصل حاصل کرنا ان کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے۔ چھوٹے کسان کے نقطۂ نظر سے نباتی کھاد مہیا کرنے کی معاشی تجویز کو بروئے عمل لانے کی ضرورت ہے۔ مونگ پھلی جیسی فصلیں جن کی تجارتی قدر و قیمت کو کم کیے بغیر نباتی کھاد مہیا کر سکتی ہیں لہٰذا ایسی فصلوں کو بونے کا امکان بھی لائق غور و خوض ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ تجربے کا ایک نظام عمل اس غرض سے مرتب کیا جائے کہ صحت کے ساتھ یہ بات معلوم ہو سکے کہ زرخیزی بڑھانے والی چیزوں کو منفعت بخش طریقے پر کس حد تک استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بحالت موجودہ محکمہ جات زراعت اس قابل نہیں ہیں کہ کسانوں کو زرخیزی بڑھانے والی چیزیں کفایت شعاری کے ساتھ استعمال کرنے کے بارے میں کوئی قطعی مشورہ دیں۔ اس لحاظ سے یہ امر طمانیت بخش ہے کہ امپیریل کونسل آف اگریکلچرل ریسرچ نے ایک کھاد کمیٹی سنہ ۱۹۳۰ء میں ترتیب دی تاکہ دیسی کھاد کے ذرائع کے تحفظ و بقا

باب

اور مقویات کے استعمال کے متعلق مسائل کی تحقیقات کی جائے اور مقویات کی تحقیق کے بارے میں ایک نظام عمل تیار کیا جائے۔ ہر صوبے کے لیے کچھ رقم منظور کی گئی ہے تاکہ مختلف صوبوں میں کھاد کے تجربوں کے متعلق مواد جمع کیا جائے اور ایک کا دوسرے سے مقابلہ کیا جائے۔ ممکن ہے کہ یہ کارروائی مستقبل میں مفید ثابت ہو۔ نہروں اور دوسرے ذرایع آبپاشی کے تحت رقبوں میں امونیم سلفیٹ زیادہ استعمال ہونے لگا ہے اور کھلی بتدریج روز افزوں استعمال کی جا رہی ہے اور یہ سب کچھ محکمہ زراعت کے پروپگنڈا کی بدولت ہوا ہے۔ ہندوستان کے طول و عرض میں مصنوعی کھاد کی مانگ کس حد تک بڑھ رہی ہے اس کا ثبوت درآمد کی ہوئی مقدار کے اضافے سے ملتا ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۵ء تا سنہ ۱۹۲۶ء میں مقدار ۰۰۹ء۱۲ ٹن تھی لیکن سنہ ۱۹۲۹ء تا سنہ ۱۹۳۰ء میں بڑھ کر ۹۰۸ و ۹۴ ٹن ہوگئی۔ سنہ ۱۹۳۰ء تا سنہ ۱۹۳۱ء میں تجارتی کساد بازاری کے باعث درآمد میں جو کمی ہوگئی تھی وہ پھر بڑھنے کی جانب مائل ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۴ء تا سنہ ۱۹۳۵ء میں درآمدہ مقدار ....۶۶ ٹن تھی۔

258

کاشت کا ساز و سامان

مسٹر کیٹنگ نے مندرجہ ذیل خوب نقشہ پیش کیا ہے جس سے ان مختلف قسم کے آلات کاشتکاری کی ایک جامع کیفیت بہ یک نظر معلوم ہو جاتی ہے جو کسانوں کے پاس ہونے چاہئیں۔

اصل
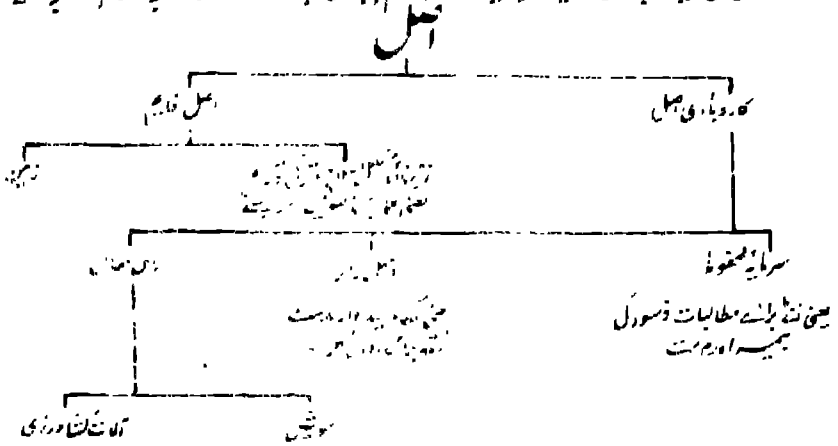
لے کمیٹی نے کل صوبوں میں کھاد کے سابقہ تجربوں کی جانچ کے نتائج پر غور کیا اور ایک مفید مختصر خلاصہ شایع کیا۔

مسٹر لکنگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ "اگر کسی شخص کے کاروبار کو محکم بنیاد پر قائم کرنا ہو اور زمین سے بیشتر بن منافع حاصل کرنا ہو تو مصرحۂ بالا اصل کی ہر شکل کسی نہ کسی صورت سے بہیا کرنی چاہئے۔ چنانچہ اصل کی ہر شکل کو مناسب طریقے سے سمجھنے ہی سے حسابات صحیح رکھے جا سکتے ہیں اور نفع و نقصان کا اصلی ذریعہ متعین کیا جا سکتا ہے"[1]

۱۱۔ آلات کشاورزی[2] ہندوستانی کسان اب بھی بڑی حد تک اپنے قدیم اور سادہ آلات کشاورزی کو استعمال کرتا ہے جو ارزاں ہلکے اور قابل نقل و حمل ہوتے اور بآسانی تیار ہو سکتے ہیں جن کی بآسانی مرمت کی جا سکتی ہے اور جن کو باربرداری کے بیل بآسانی کھینچ سکتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ پیداوری کو بڑھانے کا دارومدار ترقی یافتہ آلات کے استعمال پر ہے۔ آہنی ہل، شکر گھلنے والے آلات، چھوٹی آب کش کلیں اور آب بردار کسی حد تک رواج پا گئے ہیں لیکن اس سمت میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ دوسرے ترقی یافتہ آلات بھی تقسیم کیے گئے ہیں جن میں ہنگا، کدال، آلات تخم ریزی اور کاو تراش شامل ہیں۔ امریکہ میں یہ طریقہ رائج ہے کہ وہاں کشاورزی کی کلیں وسیع پیمانے پر استعمال کی جاتی ہیں لیکن ایک ایسے ملک میں جہاں چھوٹے چھوٹے زمیندار ہوں ان کا استعمال موزوں نہیں۔ لیکن اس قسم کی مجبوری پر امداد باہمی کے طریق پر اور مشترکہ طور سے کاشت کر کے ایک حد تک غلبہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ گجرات اور دوسرے مقامات کے کسان ٹریکٹر بڑی تعداد میں استعمال کر رہے ہیں۔ ان میں سے اکثر کلیں محکموں کی خرید کردہ ہیں جو انھیں کرایہ پر چلاتے ہیں گو بعض بڑے بڑے زمینداروں نے اپنی ذاتی کلیں خرید کرلی ہیں۔ شمالی سندھ، بہار و اڑیسہ اور صوبۂ متوسط کے شمالی حصے میں بعض بڑے زمیندار ٹریکٹروں کے استعمال میں بہت دلچسپی ظاہر کر رہے ہیں اور اگر مظاہرے جاری رکھے جائیں اور معتبر مواد حاصل کیا جائے تو اس کا قرینہ ہے کہ اس کے نتیجے کے طور پر مستقبل قریب میں ٹریکٹروں کی طلب بڑھ جائے اس لیے کہ

259

[1] دیکھو ان کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۱۰۳ تا صفحہ ۱۰۴۔

[2] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ، پیراگراف (۱۰۷) تا (۱۱۰)

ان کی مدد سے کھیت کی گہری اور مکمل جتائی ممکن ہوتی ہے جو معمولی طریقے پر بیلوں کے ذریعے سے ممکن نہیں، اور وقت کی بھی بڑی حد تک بچت ہوتی ہے[1]۔ جن آلات کشاورزی کو دستی قوت اور مویشیوں کے ذریعے سے چلایا جاتا ہے ان کی اصلاح و ترقی کے لیے بھی بہت گنجایش موجود ہے۔ کسانوں کی بڑی تعداد کو اس بات کی ترغیب دینے کے لیے کہ وہ سب مل کر ایک ساتھ ترقی یافتہ آلاتِ کشاورزی استعمال کریں پرزور پروپگنڈا کی ضرورت ہے؛ اس لیے کہ انفرادی طور پر کسان ان کو اختیار کرنے میں جن مشکلات کی بنا پر جھجکتا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس کو اس بات کا خوف ہے کہ اس کی ہنسی اڑائی جائے گی اور اس کو پگلا خیال کیا جائے گا۔ ترقی یافتہ آلات کے استعمال و رواج کو عام بنانے کا کام واضح طور پر محکمہ جات زراعت، زرعی انجمنوں اور انجمن ہائے امداد باہمی کے دائرۂ عمل میں آتا ہے اور یہ مناسب ہے کہ یہ سب ایجنسیاں باہم متحد ہو جائیں اور یکجہتی کے ساتھ کام کریں۔ محکمہ جات زراعت کو چاہئے کہ ترقی یافتہ آلات کے چوبی اجزا کو بڑے پیمانے پر اور کثیر تعداد میں تیار کر کے ان آلات کو ارزاں بنانے کے مسئلے پر خاص توجہ دیں۔ مقصد یہ ہونا چاہئے کہ جدید وضع کے آلات کو رائج کرنے کے بجائے موجودہ قسم کے آلات کی اصلاح و ترمیم کی جائے۔ ممکن ہے کہ مختلف وضع کے آلات بنانے کی وجہ سے کسان پراگندہ ہو جائے اور محکمۂ زراعت کی پالیسی کو بدگمانی کی نظر سے دیکھنے لگے۔ ریلوے حکام کو یہ ترغیب دینی چاہئے کہ وہ زرعی آلات اور کلوں کی نقل و حمل کی رعایتی شرحیں مقرر کرنے کے مسئلے پر انتہائی ہمدردانہ طریقے پر غور و خوض کریں۔ محکمۂ زراعت نے جو مفید تدابیر اختیار کی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ زرعی انجینیروں کا تقرر کیا گیا ہے، تاکہ وہ کسانوں کو مشورہ دیں اور کلوں کے نصب کرنے اور آبپاشی وغیرہ کا انتظام کریں۔ مغرب میں جو جدید وضع کے آلات استعمال کیے جاتے ہیں ان کے مقابلے میں زیادہ ارزاں اور زیادہ سہولت سے چلنے والے

[1]۔ دیکھو ناظم زراعت احاطۂ بمبئی کی سالانہ رپورٹ برائے ۱۹۲۶ء تا ۱۹۲۷ء اور ایک کتاب موسوم بہ "ہندوستان در ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۱ء" صفحہ ۱۹۵۔

باب ۸

آلات تیار کرنے کی مستقل پالیسی کی طرف بھی توجہ دی جا رہی ہے۔ نئے آلات سے پوری طرح کام لیے جائیں تو یقینی بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ملک ہی میں تیار کیے جائیں، پرزے اور اجزا علیحدہ مہیا کرنے کا پورا انتظام کیا جائے اور مرمت کے لیے سہولت بہم پہنچائی جائے۔ زرعی مشینوں پر زور دینے کی ہر کوشش ہے کہ اگر لوہے اور فولاد کی درآمد پر تحفظی محصول عائد کرنے سے ہندوستانی صناع بری طرح متاثر ہوں تو ایسے لوہے اور فولاد پر جو زرعی کلوں اور آلات کی تیاری کے لیے درآمد کیا جائے محصول کی شرح میں کچھ رعایت اور کمی کرنا مناسب ہوگا۔ اکتوبر ۱۹۲۶ء میں بمقام پونا، حافظ جی کی بہت بڑی زرعی نمائش منعقد ہوئی، جس میں لاکھوں روپیہ کی زرعی کلیں بغرض نمائش رکھی گئی تھیں۔ گو ان میں سے اکثر بیرونی ساخت کی تھیں لیکن اگر خاص طور پر کوشش کی جائے جن میں ملکی صنعتی کمپنیوں کی سرکاری طور پر مالی امداد بھی شامل ہو تو یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ بیرونی رسد پر ہمارا موجودہ انحصار بہت بڑی حد تک کم ہو جائے گا یا بالکل باقی نہ رہے گا۔

۵۰۰

۱۲۔ مویشی اور جانور

ہندوستانی کسان کی ملکیت میں جو جانور رہتے ہیں ان میں سب سے اہم جز و مویشی ہیں۔ "اگر یہ نہ ہوں تو کھیت بن جتے رہ جائیں گے گودام اور ذخائر خالی رہیں گے، اور کھانے پینے کی چیزوں میں آدھا مزہ بھی باقی نہ رہے گا، اس لیے کہ نباتات پر زندگی بسر کرنے والے ملک میں اس سے بڑھ کر کیا خرابی ہو سکتی ہے کہ دودھ، مکھن یا گھی میسر نہ آئے"[1]۔ ہندوستان میں مویشی ہی ساری حرکی قوت مہیا کرتے ہیں جس سے ہل جوتنے اور آب کش کے ذریعے سے آبپاشی کرنے میں مدد ملتی ہے۔ جو گوبر عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے اس کا بھی اساسی منبع یہی ہیں۔ علاوہ ازیں ہندوستان میں زراعت کی واحد ذیلی صنعت بیل گاڑی کا کرایہ پر چلانا ہے، اور باربرداری کے لیے بھی طاقتور اور صحت ور مویشی ضروری ہیں۔ مویشیوں کی اصلاح و ترقی دودھ، مکھن وغیرہ کے بخوبی منظم کاروبار کی ترقی میں بھی بہت اہم حصہ رکھتی ہے جس کے

[1] دیکھو ایم ال ڈارلنگ کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۱۳۔

متعلق عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ ہندوستان میں زراعت کا ذیلی پیشہ ہونے کی حیثیت سے عظیم امکانات پیش کرتا ہے۔ آخر میں یہ کہ نباتات استعمال کرنے والے ملک میں دودھ کی وافر رسد کی ضرورت ظاہر ہے؛ اس لیے کہ دودھ ہی باشندوں کو ایسی خوراک مہیا کرنے کا واحد آسان ذریعہ ہے جس میں کافی غذائیت ہوتی ہے اور جو صحت و طاقت کے لیے ازحد مفید ہے۔ باوجود اس کے کہ ہندوستان میں صحت ور مویشیوں کا کافی تعداد میں موجود ہونا نہایت اہمیت رکھتا ہے حالات ابھی تک بہت ہی ناقابل اطمینان ہیں[1]۔ ملک میں مویشیوں کی تعداد تو بہت زیادہ ہے لیکن ان کی حالت اس درجے ناقص و ناگفتہ بہ ہے اور انھیں عام طور پر اس قدر خراب غذا ملتی ہے کہ عمدہ مویشیوں کا ملنا محال ہے۔ چنانچہ ہر ۱۰۰ ایکڑ خالص مزروعہ رقبے کے حساب سے ۶۷ مویشی ہیں۔ قابل زراعت زمین کی نوعیت چاہی آبپاشی کی وسعت جھاڑی جنگل دیہی آبادی اور کھیتوں کے رقبہ وغیرہ کا لحاظ کرنے کے بعد بھی مختلف صوبوں میں مویشیوں کی تقسیم نمایاں طور پر بے قاعدہ ہے۔ زرعی کمیشن عام اوسط کا لحاظ کرتے ہوئے یہ بحث کرتا ہے کہ خواہ منفی و مثالی مویشیوں میں دوسرے اعتبارات سے کتنے ہی اسقام موجود ہوں کم از کم ان کی تعداد کم نہیں ہے۔ گو ہالینڈ اپنے رقبے کے اعتبار سے مویشیوں کی سب سے بڑی تعداد رکھتا ہے؛ پھر بھی اس کے ہر ۱۰۰ ایکڑ مزروعہ رقبے میں اوسطاً صرف ۳۸ مویشی ہیں۔ اسی طرح مصر میں جن عام حالات کے تحت کھیتی باڑی ہوتی ہے وہ بہت کچھ زیادہ ہندوستان کے بعض علاقوں کے حالات کے مشابہ پائے جاتے ہیں اور ہر ۱۰۰ ایکڑ

---

[1] برطانوی ہند میں پہلی پنج سالہ عام بہائم شماری ۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۰ء میں اور دوسری ۱۹۲۴ء تا ۱۹۲۵ء میں کی گئی۔ ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۰ء کے اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ برطانوی ہند میں زراعتی جانوروں کی مجموعی تعداد ۲۱۸,۶۰,۰۰۰ ہے جس کے منجملہ بیل اور بھینسوں کی کل تعداد ۱۵۱,۴۴۰,۰۰۰ ہے۔ بھیڑ بکروں کی تعداد ۹۲,۴۴۰,۰۰۰ اور باقی جانوروں کی تعداد جس میں گھوڑے ٹٹو خچر گدھے اور اونٹ شامل ہیں ۳,۰۰۰,۰۰۰ ہے۔ ان حیوانات میں سے بڑی تعداد معاشی حیثیت سے ضرورت سے زائد ہے۔ دیکھو ایک رپورٹ [illegible] بہائم شماری سوم ۱۹۳۰ء اور ہندوستان ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۱ء [illegible] صفحہ ۱۶۰۔

باب

مزروعہ زمین پر او سطاً ۴۵ مویشی ہیں۔[1]

زرعی کمیشن یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ ہندوستان کی بہائم شماری خرابیوں کا ایک چکر ہے۔ کسی ضلع کے مویشیوں کی تعداد کا انحصار بیلوں کی طلب پر ہے۔ عمدہ مویشیوں کی پرورش کے حالات جتنے خراب ہوں گے اتنا ہی زیادہ میلان اس کا ہوگا کہ ان کی تعداد زیادہ ہو۔ گائیں کم بارآور ہوتی ہیں بچھڑے جسمانی اعتبار سے کمزور واقع ہوتے ہیں اور ان سے کسانوں کی ضرورت پوری نہیں ہوتی، اس لیے کسان کارآمد بیل حاصل کرنے کی کوشش میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں مویشیوں کی پرورش کرتے ہیں۔ جوں جوں ان کی تعداد بڑھتی ہے یا مزروعہ رقبہ عمدہ چراگاہوں میں پھیلتا اور بڑھتا جاتا ہے، چارے کی موجودہ رسد پر دباؤ بڑھتا جاتا ہے اور اس کے باعث گایوں کی بارآوری اور بھی کم ہوتی جاتی ہے۔ غرض یہاں تک نوبت پہنچ جاتی ہے کہ کھیتی باڑی میں کام لینے کے لیے دوسرے صوبوں سے بیل یا بھینسے لائے جاتے ہیں، چنانچہ بنگال میں یہی ہوتا ہے۔[2]

۱۳۔ چارہ کی رسد کا مسئلہ۔ ہندوستان کے مویشیوں سے نہ صرف کام زیادہ لیا جاتا ہے بلکہ خوراک بھی کم اور خراب دی جاتی ہے۔ یورپ میں رسم و رواج اور روایات نے مویشیوں کے مالک پر ان کی خوراک کے انتظام کی ذمہ داری عائد کی ہے۔ لیکن ہندوستان میں معاملہ اس کے برعکس ہے، چنانچہ کسان اپنے جانوروں کو اچھی حالت میں رکھنے کی کوئی خاص کوشش شاذ ہی کرتا ہے، اس کام میں یوں ہی کیا کم مشکلات ہیں، لیکن چارے کے قحط اور میعادی خشک سالیاں بھی ان میں کافی اضافہ کر دیتی ہیں۔ ہندوستان کے بیشتر حصے میں دسمبر سے جولائی تک چارے کی کمی ہوتی ہے۔ مویشیوں کی حالت مارچ اور جون کے درمیان خاص طور پر افسوسناک ہوتی ہے جبکہ وہ بے آب و گیاہ میدانوں میں چارے کو ترستے گھومتے پھرتے ہیں اور بارش شروع ہونے تک ان میں

---

[1] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ، پیراگراف (۱۸۰)

[2] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ نقرہ ۱۲۰۔

سے اکثر سوکھ کر ہڈی چمڑا ہو جاتے ہیں۔ ادھر مینہ برسنا شروع ہوا اور نئی گھاس نمودار ہوئی اور ادھر وہ اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور اس کے نتیجے کے طور پر مختلف امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں[1]۔ بقول کیٹنگ اہل ہند کے لیے کسی دوسری چیز کا سیکھنا اس قدر اہمیت نہیں رکھتا جتنا کہ چارے کی فصلوں کا بونا، کٹائی کے بعد اس کو سلیقے کے ساتھ جوڑ کر رکھنا اور بکفایت استعمال کرنا[2]۔ خوراک کے مسئلے سے زیادہ اہم چارے کی کافی مقدار مہیا کرنے کا مسئلہ ہے، اس لیے کہ چارہ جسامت میں زیادہ اور قیمت میں کم ہونے کی وجہ سے ایک مقام سے دوسرے مقام کو بہ آسانی منتقل نہیں ہو سکتا۔ چونکہ کاشت کا رقبہ بہت وسیع ہو گیا ہے، اس لیے قدیم زمانے کی سی وسیع چراگاہیں مفقود ہو گئی ہیں اور ان کے دوبارہ وجود میں آنے کی کوئی توقع نہیں ہے۔ یہ تو ممکن نہیں ہے کہ موجودہ گھاس کے رمنوں میں کوئی قابل لحاظ اضافہ کیا جائے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے موجودہ رمنوں کی پیداآوری کو بڑھایا جائے۔ اگر چارہ اور چرائی کی سہولتیں مہیا کرنے کے بارے میں جنگلات کا انتظام زیادہ ہمدردانہ طریق پر کیا جائے تو اس سے صورت حال کی ایک حد تک اصلاح ہو جائے گی۔ قلت کے زمانے میں چارے کی جنگلات سے بہم رسانی کے امکانات کو غور و احتیاط کے ساتھ جانچنا چاہیے اور چرائی پر گھاس کی کٹائی کو ترجیح دینی چاہیے[3]۔ گاؤں کی مشترکہ چراگاہ کا رقبہ بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں دیہاتیوں کی غفلت و بے پروائی کی وجہ سے وہ اتنا کارآمد نہیں رہتا جتنا کہ اس کو رکھا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ اس میں عام طور پر خاردار پودوں، بے کار درختوں اور ہر قسم کی جھاڑیوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ لوگ مصری بیتا گھاس اور دوسری چارے کی فصلیں بونے اور چراگاہیں سلیقے سے رکھنے کا ڈھنگ سیکھیں۔

---

[1] دیکھو ایک کتاب موسوم بہ "ہندوستانی دیہات" (Rural India) شائع شدہ ایڈیشن ۱۹۲۷ صفحہ ۱۰۱
[2] دیکھو کیٹنگ کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۱۲۳۔
[3] زرعی کمیشن یہ سفارش کرتا ہے کہ جہاں چرائی کی اجازت ہے وہاں بعض عمدہ نسل کے جانوروں ہی کے چرانے کے لیے مناسب انتظام کرنا چاہیے (دیکھو رپورٹ۔ فقرہ ۱۸۰)

باب

خشک چارہ کٹائی کے بعد جوڑ کر رکھنا یا نر گھاس گرا سے یا کھائی میں محفوظ رکھنا ایسا کام ہے جس پر بہت ہوشیاری کے ساتھ توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ چارے کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے اور اس غرض کے لیے مناسب قسم کی چارہ کٹ کلیں استعمال کرنی چاہئیں۔[۱] تھان پر چارہ دینے کے طریقے کو زیادہ وسیع پیمانے پر رائج کرنا چاہیے۔ حکومت انعام کا لالچ دلاکر اور مالگزاری اور زرِ آبپاشی کی قسطیں معاف کر کے ان سب طریقوں پر عمل کرنے اور مویشی اور چارے کو عمدہ حالت میں رکھنے کی حوصلہ افزائی کر سکتی ہے۔ چارے کی رسد کو کفایت کے ساتھ استعمال کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ناکارہ مویشیوں کی تعداد میں کمی کی جائے۔ یہاں حالت یہ ہے کہ از کار رفتہ اور لاغر بیل اور بوڑھی اور ناکارہ گائیں نیم فاقہ زدہ حالت میں رکھی جاتی ہیں۔ اس کے برخلاف مغربی ممالک میں ایسے جانوروں کو فوراً ذبح کر کے بطور غذا استعمال کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں گائے بیل کے گوشت کی مانگ مقابلۃً کم ہے اور ناکارہ مویشی کا ذبح کرنا ایسا فعل ہے جس سے کسان اور عوام کے بیشتر حصے کے جذبات بھڑک اٹھتے ہیں۔ کسان بیل کو ذبح تو نہیں کرتا لیکن اس کو بھوکا مارنے میں کوئی قباحت نہیں سمجھتا۔ اس کی حالت بعینہٖ اس فقرے کا مصداق ہوتی ہے کہ "تو اس کی جان تو نہ لے لیکن اس کو زندہ رکھنے کی خواہ مخواہ سعی بھی نہ کر"۔ بیلوں کو ناگفتہ بہ حالت میں بے فائدہ زندہ رکھنے سے تو بدرجہا زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ وہ خود اپنے پرا وراں پر رحم کر کے اس معاملے میں مغربی کسان کی طرح زیادہ کاروباری نقطۂ نظر سے عمل کرے۔ لیکن اس کے خلاف جو تعصبات ہیں وہ اس قدر گہرے ہیں کہ اس سمت میں کوئی اصلاح کرنے کے لیے ہمیں مدت دراز تک توقف و انتظار کرنا پڑے گا۔ چارے کی موجودہ رسد پر جو بار پڑ رہا ہے اس کو کم کرنے کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ دوسرے مقصد سے مویشیوں کی نسل کی

۱۔ یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ پنجابی کسان یہ سمجھنے لگا ہے کہ چارہ کٹ کل استعمال کرنے سے چارے میں کفایت ہوتا ہے۔ چنانچہ پنجاب میں سنہ ۱۹۲۰ء تا ۱۹۳۱ء کم از کم ۱۳۰۶۵ کلیں خریدی گئیں۔ (دیکھو ایک کتاب موسومہ "نیا ہندوستان" سنہ ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۱ء صفحہ ۱۵۔)

پرورش کی جائے تاکہ اس وقت جو بھینسیں خالتو ہیں وہ دودھ کی فراہی کا ذریعہ بن سکیں[1]۔

۱۴۔ افزائش نسل مویشی۔ پیشہ ور طریق پر مویشیوں کی پرورش کرنے والے گزشتہ زمانے میں عام تھے لیکن آج کل زراعت کی ترقی کے نتیجے کے طور پر وہ چرائی کا کام ترک کر رہے ہیں اور مویشی کی پرورش موجودہ زمانے میں کاشتکاری کے لازمی جزو کے بجائے اس کا ایک ضمنی واتفاقی واقعہ خیال کی جاتی ہے۔ دوسری طرف رعیت کے معمولی مویشی جن حالات میں پرورش پاتے ہیں ان کی بنا پر نسل میں بگاڑ پیدا ہونا لازمی ہے اور اس بگاڑ کے میلان کو زائل کرنے کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ عمدہ قسم کے بیل مستقل طور پر کثیر تعداد میں فراہم کیے جائیں۔ نسل کی اصلاح و ترقی کی غرض سے یہ ضروری ہے کہ خراب بیلوں کو جبری طریق پر بدھیا کر کے ان کی نسل شماری جائے۔ چنانچہ محکمۂ علاج حیوانات نے کچھ زمانہ ادھر سے اس اہم کام کو ایسے طریقوں سے انجام دینا شروع کیا ہے جو عوام کے مذہبی احساسات کے لحاظ سے ناقابل اعتراض ہیں۔ منتخب نسلوں کی پرورش اور دوغلے یا دونسلی جانور پیدا کرنے کے لیے ان کو احاطے میں رکھنا ضروری ہے۔ دکن میں عام طور پر ادّھے اور ٹوٹے پائے جاتے ہیں جن کے مقابلے میں گجرات کے بیل بڑھیا اور الگ ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ گجرات میں احاطہ بندی کا عام رواج ہے۔ انجمن ہائے امداد باہمی برائے افزائش نسل جانوران کا بعض مقامات میں افتتاح ہوا ہے لیکن بعض مستند اشخاص یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ اس قسم کا کام انفرادی توجہ چاہتا ہے اور امداد باہمی کے طریق کا استعمال اس کے لیے کارگر نہیں ہو سکتا۔ مرکزی اور صوبہ واری محکمہ جات زراعت مویشیوں کی پرورش کے مسئلے پر اس خیال سے بہت کچھ توجہ دے رہے ہیں کہ نقل وحمل اور دودھ دونوں اعتباروں سے اعلیٰ درجے کے پیداآور مویشی پیدا ہوں مویشیوں کی نسلوں کی

[1] لیکن زرعی کمیشن متنبہ کرتا ہے کہ جب ہندوستانی حالات میں ایک ہی مقصد مویشیوں کی پرورش کا کام وقت طلب ہے تو دوہرا مقصد پورا کرنے والی نسلوں کی تیاری کی کوشش سے اس میں مزید خطرہ پیدا نہ کرنا چاہیے؛ (دیکھو رپورٹ پیراگراف ۱۹۰)۔

باب

اصلاح و ترقی کا کام مرکزی صوبہ داری پیمائی پرورش گاہوں میں انجام دیا جارہا ہے جس کی غرض و غایت یہ ہے کہ بہتر خوراک دے کر اور منتخب طریقے پر داشت کرکے نیز یورپی ذات کے نروں کا دیسی نسل کی ماداؤں سے میل کرکے اور دوغلی نسل پیدا کرکے مویشیوں کی دودھ کی پیداوار کی اصلاح کی جائے۔[1] چنانچہ ان طریقوں کی بدولت بمقام پوسا اصیل "سہیوال" کا گلہ بہت بڑھ گیا ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ جو تجربے عمل میں لائے جارہے ہیں ان کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک بخوبی متعین "سہیوال آئرشائر" نسل رونما ہوگی جو ہندوستانی حالات کے مقابلے کے لیے کافی قوی اور جفاکش ہوگی۔ اس معاملے میں بڑے زمینداروں کی سردمہری اور بے پروائی ترقی کی راہ میں روڑا اٹکا رہی ہے۔ لہذا اعلیٰ عہدہ داروں کو جو ان زمینداروں پر اثر ڈال سکتے ہیں چاہئے کہ اس مزاحمت کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ زمینداروں کے لڑکوں کو سائنس کی اعلیٰ اور عملی تعلیم دینے سے بھی زمیندار جماعت کی معاشیات دیہی سے بے پروائی اور بے توجہی میں لازمی طور پر کمی ہوجائے گی۔ علیٰ ہذا یہ بات روسا کے اقتدار میں ہے کہ وہ زرعی اصلاح کی تحریک کو آگے بڑھائیں اور عملی زراعت میں ان کی دلچسپی کو زیادہ کرنے کے لیے تمام جائز تدابیر اختیار کرنے چاہئیں۔

۱۵۔ محکمۂ علاج حیوانات

264

مویشیوں میں امراض کے باعث براہ راست اور بالواسطہ اتلاف و نقصان بکثرت ہوتا ہے۔ چنانچہ مویشیوں کا نقصان بشکل موت دیہی قرض داری کا ایک اہم سبب ہے، اور غالباً اس سے بھی زیادہ تشویشناک معاملہ یہ ہے کہ مویشی مرض سے جانبر ہونے کے بعد لاغر و کمزور ہوجاتا ہے۔ حیات حیوانی کی ناپائیداری بھی کسان کو مویشیوں کا محفوظ ذخیرہ رکھنے پر مجبور کرتی ہے جسے وہ مناسب طریقے پر خوراک نہیں دے سکتا اور اس طرح اچھی حالت میں رکھنے سے تغافل برتتا اور کوتاہی کرتا ہے۔ چنانچہ مویشیوں کی پرورش کے کام سے بڑے زمینداروں کی بے اعتنائی کے وجوہ میں سے ایک یہی ہے۔[2]

---

[1] دیکھو حسب ذیل ناموں کی کتابیں:۔ (۱) "ہندوستان در ۱۹۲۶ء تا ۱۹۲۷ء"۔ صفحہ ۱۳۴ تا صفحہ ۱۳۵۔ (۲) "ہندوستان کے زرعی کاروبار پر تنقید"۔ صفحہ ۹۵ تا صفحہ ۹۹۔ (۳) ہندوستان در ۱۹۲۸ء تا ۱۹۲۹ء۔ صفحہ ۱۳۱ تا صفحہ ۱۳۲۔

[2] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ فقرہ (۲۲۶)

محکمۂ علاج حیوانات نے مویشیوں میں امراض کی اشاعت اور خوفناک ہلاکت کو کم کرنے میں جو کام انجام دیا ہے اس کو مختصر طور پر بیان کر دینا ضروری ہے۔ علاج حیوانات کے صدر اور ذیلی دواخانوں میں دورہ کنندہ افسروں کے زیر علاج بیمار جانوروں کی تعداد بتدریج بڑھ رہی ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ محکمے کے قابل قدر کام کو عوام روز افزوں پسندیدگی کی نظر سے دیکھ رہے ہیں[1]۔ محکمۂ مذکور کا سب سے اہم کام یہ ہے کہ سیرم اور ویکسین کا ٹیکہ جبری طور پر دیگر متاثرہ مقامات میں جانوروں کو متعدی امراض سے محفوظ رکھا جائے اور اس قسم کی کارروائی محکمے کی جانب سے اختیار کیے جانے کے خلاف کسان کے غم و غصے کا رجحان اس وجہ سے تنزل پذیر ہے کہ اس کے افادے کا احساس اس کو روز بروز زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔ ہندوستان کا سب سے شدید مرض مویشی "مویشیوں کا طاعون" ہے جس کے خلاف مدراس میں حفاظتی تدابیر[2] اختیار کی گئی ہیں۔ چنانچہ یہاں مجسٹریٹ ضلع کے اعلان کردہ متاثرہ دیہات میں سیرم کے طریق پر جبری ٹیکہ دینے کی قانونی طور پر اجازت دی گئی ہے۔ چونکہ مرض عام طور پر پھیلا ہوا ہے اس لیے جانوروں کو بالکل الگ رکھنا ناممکن ہوگا اور ہندو جذبات پر نظر رکھتے ہوئے متاثرہ جانوروں کے قریب رہنے والے تندرست جانوروں کا ہلاک کرنا خارج از بحث ہے۔ اس لیے روگ کی جڑ کو اکھاڑ پھینکنے کی بجائے منفرد جانور کو محفوظ رکھنے کے متعلق تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ بایں ہمہ ابھی تک جبری ٹیکہ ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔ زرعی کمیشن شد و مد کے ساتھ یہ سفارش کرتا ہے کہ مویشیوں کو طاعون سے بچانے کے لیے "تنہا سیرم" کے طریقے کی بجائے "ہمزمان سیرم" کے طریقے سے ٹیکہ دیا جائے[3]۔ لیکن انسدادی ٹیکے کے لیے کوئی اجرت نہ لینی چاہئے۔

[1] دیکھو ایک کتاب موسوم بہ "ہندوستان کے زرعی کاروبار برائے ۱۹۲۶ء تا ۱۹۲۹ء پر تنقید" صفحہ ۱۲۱ تا صفحہ ۱۲۲

[2] (Prophylactic Measures)

[3] علاج حیوانات کے متعلق تحقیقی کام میں ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء میں سب سے نمایاں ترقی یہ ظاہر ہوئی کہ مویشی طاعون کو اجتماعی طور پر روکنے کا ایک کامیاب طریقہ نکالا گیا جس کی رو سے بکرے کے خون کا یا بافتی زہر Tissue Virus کا جس کی طاقت کم کی گئی ہو ٹیکہ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اب تک تو اس کے نتائج کئی صوبوں اور ریاستوں میں مویشی اور بھینسوں کی تمام نسلوں کے بارے میں نہایت ہی اطمینان بخش رہے ہیں۔

ہندوستان میں علاج حیوانات کی طبی سہولتیں بہت غیر اطمینان بخش حالت میں ہیں۔ اسی بنا پر زرعی کمیشن یہ سفارش کرتا ہے کہ ہر ضلع میں ایک مرکزی شفاخانہ اور اس کے تحت تعلقات میں ذیلی دواخانے قائم کیے جائیں، ان شفاخانوں میں متعینہ عملے کی تعداد میں اضافہ کیا جائے اور کارکنوں کو دیہات کے دورے پر بھیجا جائے۔ علاج حیوانات کے متعلق تحقیقی کام کا مرکز "مکتسر انسٹی ٹیوٹ" کو بنانا چاہیے[1]۔ 265

۱۶۔ محفوظ سرمایہ دوسری صنعتوں کی مثل زراعت میں بھی ناگہانی مصارف کے لیے کچھ رقم الگ رکھنا ضروری ہے اور اگر زراعت کو صحیح کاروباری اصول پر جیسا کہ چاہیے چلانا مقصود ہے، تو استغراقی فنڈ اور بیمہ کا انتظام ضروری ہے۔ یہ عام تجربہ ہے کہ اچھے برے اور معمولی موسموں کا باقاعدہ دور مسلسل رہتا ہے اور یہ کیفیت بمبئی دکن جیسے علاقوں پر خاص طور پر صادق آتی ہے جہاں بارش غیر یقینی ہوتی ہے۔ قحط جیسی کم و بیش ناگزیر آفتوں کے مقابلے کے انتظام کا فقدان ان آفتوں سے پیدا شدہ تکالیف و مصائب میں شدت پیدا کر دیتا ہے۔ چنانچہ غیر پیدا آور رہن یا قرضوں کے مطالبات یا کھیتوں کی اصلاح و ترقی اور آلات کشاورزی کے مطالبات فرسودگی کو پورا کرنے کے لیے باقاعدہ انتظام تا حال مفقود ہے۔ بقول کیٹنگ ان مختلف اغراض کو پورا کرنے کے لیے جو استغراقی فنڈ قایم کیا جائے اس کو بے کار اور بصورت نقد نہ رکھنا چاہیے۔ بلکہ اس سے مویشیوں کی نسل پیدا کرنے یا ایندھن حاصل کرنے کے لیے درخت لگانے کا کام لیا جا سکتا ہے اس لیے کہ یہ ایسے مشغولات اصل ہیں کہ ان کو جب کبھی ضرورت ہو نقد سے مبدل کیا جا سکتا ہے۔

زرعی بیمے کا اصول ابھی تک ہندوستان میں بہ مشکل جاگزین ہوا ہے۔ تاہم چارے کے انبار، کھیت کے مکانوں، فصلوں اور مویشیوں وغیرہ کا بیمہ کرنا حفاظتی تدبیر کے طور پر ضروری ہے۔ چارے اور مویشیوں کے بیمے کی اس لیے بھی خاص طور پر زیادہ ضرورت ہے کہ چارے کے ذخائر کو آگ لگنے اور مویشیوں میں بکثرت ہلاکت واقع ہونے کی وجہ سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) دیکھو ہندوستان ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۲ء میں صفحہ اور ہندوستان ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء میں صفحہ ۹۲ تا ۹۳۔

[1] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ فقرہ ۲۳۰۔

عظیم تر مالی نقصانات برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ یہاں یہ کہہ دینا مناسب ہوگا کہ کچھ زمانہ ادھر سے خاصکر برمائیں امداد باہمی کے اصول پر مویشیوں کا بیمہ کرنے کا طریقہ شروع کیا گیا ہے۔ یوں تو باقاعدہ بیمہ فنڈ اور استغراقی فنڈ کا رواج ہندوستانی کسان میں عام ہونے کے لیے ابھی مدت دراز تک انتظار کرنا پڑے گا، لیکن اس کی عدم موجودگی میں دوسرا بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ کھیت پر اپنا مکان بنانے کے لیے کسان کی ہمت افزائی کی جائے "تاکہ وہ وہیں مقیم رہ کر اپنی جائداد کی حفاظت کرے، چارے کا محفوظ ذخیرہ قایم کرے، مویشیوں کو قحط و خشک سالی سے محفوظ رکھے، ایک احاطہ دار چراگاہ قایم کرے جس میں متعدی امراض کے پھیلنے کے زمانے میں مویشی الگ رکھے جاسکیں، اور آبپاشی کے لیے کنواں تیار کرے جو خشک سالی کے زمانے میں بے روزگاری سے بچانے کا ضامن ہو"[1]

۱۷۔ دیہی صنعتوں کی اہمیت

یوں تو زراعت تنظیم کی اسی قدر محتاج ہے جس طرح کوئی دوسرا کاروبار، لیکن عصر حاضر میں ہندوستان میں زراعت کی حالت داخلی و خارجی تنظیم ہر دو اعتبار سے بہت ہی ناقص ہے۔ داخلی تنظیم کے بعض شدید نقائص مثلاً "معاشی کھیتوں" اور مستقل اصلاح و ترقی کا فقدان وغیرہ اس سے قبل بیان کیے جاچکے ہیں۔ اس مقام پر ہم ایک خاص نقص پر الگ اور مفصل بحث کرنا چاہتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ ذیلی صنعتیں مفقود ہیں۔ ان کی موجودگی میں کسان اپنی محنت کو پورے سال پر موجودہ زمانے سے زیادہ مساوی طریق پر پھیلائے رکھنے اور اپنی معاشی حیثیت و حالت درست رکھنے کے قابل ہوسکتا ہے۔ لیکن

[1] دیکھو کیٹنگ کی کتاب محولۂ بالا ص ۱۴۱ تا ص ۱۴۵۔

ان کی عدم موجودگی ہندوستان کے ٹٹ پونجیے کسان کی حالت کو سقیم بنانے میں بہت بڑا
حصہ رکھتی ہے۔ چنانچہ کہنے کو بھی اس کا کوئی زائد ذریعۂ آمدنی نہیں ہوتا اور وہ محض
اپنے چھوٹے سے کھیت پر تنگی کے ساتھ زندگی گزار دیتا ہے۔

زرعی کاروبار بہ لحاظ نوعیت موسم پر موقوف ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے دیہی
محنت بہت بری طرح ضائع جاتی ہے۔ آبپاشی کا جہاں انتظام ہے وہاں تو یہ ممکن ہے کہ
کسان سال کے بارہ مہینے تخم بونے، فصل کاٹنے، آبیاری کرنے اور زمین کو خس و خاشاک
سے پاک کرنے میں منہمک رہے، لیکن جہاں انتظام نہیں وہاں متوسط درجے کے
کسان کو اپنے کھیت سے سال کے پورے بارہ مہینے روزگار نہیں ملتا۔ چنانچہ اندازہ
کیا گیا ہے کہ اس جبری بے روزگاری کی مدت سال بھر میں مختلف یعنی ۱۵۰ تا ۲۷۰ یوم
ہوتی ہے۔ مسٹر ای ایچ ایچ آنڈ افسر مردم شماری صوبہ متحدہ مردم شماری کی رپورٹ
بابتہ ۱۹۲۱ء میں یوں لکھتے ہیں کہ:-

"آبادی کا بیشتر حصہ زراعت کرتا ہے اور یہاں زراعت کے معنی عام طور پر
یہ ہیں کہ سال میں دو فصلیں بوئی، کاٹی اور فروخت کی جائیں؛ انگلستان کی طرح یہاں
مخلوط طریق کاشت رائج نہیں ہے۔ اس قسم کی زراعت میں مقررہ موسموں میں کچھ
مدت تک بہت سخت محنت کرنی پڑتی ہے یعنی دو مرتبہ تخم بونا، دو مرتبہ فصل کی
کٹائی، موسم بارش میں گاہ گاہ سوکھی ہوئی جڑوں کو نکال پھینکنا اور موسم سرما میں تین مرتبہ
آب یاری۔ لیکن سال کے باقی حصے میں قریب قریب کامل تعطل و بے کاری رہتی ہے۔
ان رقبوں میں جہاں بارش کی قلت ہے تعطل پورے موسم کے لیے بلکہ تمام سال کے لیے
ناگزیر ہوتا ہے، اور یہ تعطل کا زمانہ اکثر صورتوں میں بے کاری میں صرف کیا جاتا ہے۔"

بقول ڈاکٹر اسلیٹر جنوبی ہند کی زمین پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسان
اپنے ممکنہ کام کے زمانے کے صرف ۵/۱۲ حصے میں زرعی کاروبار کرتا ہے۔ مسٹر جے اسی بجیک
اپنی کتاب موسومہ بہ ضلع بنگال کی معاشی زندگی[1] میں رقمطراز ہیں کہ کسان کے نظام الاوقات
سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت اس کی زمین سن کی کاشت کے لیے ناموزوں ہوتی ہے تو

لہ (Economic Life of a Bengal District)

باب ۸

تین مہینے سخت محنت کرنی پڑتی ہے اور نو مہینے بیکاری میں گزارنے پڑتے ہیں۔ اگر وہ گیہوں اور سن دونوں کو ملاکر کاشت کرے تو جولائی اور اگست میں مزید چھ ہفتے کا کام اس کو مل جاتا ہے"۔ بقول کیٹنگ بمبئی دکن میں سال بھر میں ایام کارگزاری صرف ۱۸۰ تا ۱۹۰ ہیں۔ اس کے برخلاف بقول کیلورٹ پنجاب کے متوسط درجے کے کسان کا کام تقریباً (۱۵۰) یوم کی پوری محنت سے زیادہ کی نمایندگی نہیں کرتا۔ شاہی زرعی کمیشن کا یہ بیان ہے کہ گو زرعی حالات کے مطابق مختلف مقامات میں فرصت و تعطل کے ایام کی تعداد مختلف ہے، تاہم وسیع تعمیم کے طور پر یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ کسانوں کی بہت بڑی تعداد کو سال بھر میں کم از کم دو سے چار مہینے تک قطعی آرام و فرصت کا موقع ملتا ہے[1]۔ یو۔ پی بنکنگ انکوائری کمیٹی صوبۂ متحدہ کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی) نے کل صوبے کے لیے بحیثیت مجموعی یہ اندازہ لگایا ہے کہ کسان (۲۰۰) دن سے زیادہ کام نہیں کرتا[2]۔

زراعت کی معاون ذیلی صنعتوں کی عدم موجودگی میں ہندوستانی کسان خراب موسم کا زمانہ تفریح و آرام کرنے، شادی رچانے، اور مقدمہ بازی کرنے میں گزارتا ہے۔ گاہ گاہ یہ ممکن ہے کہ وہ شہر کی کسی فیکٹری یا حکومت کے کارہائے عامہ میں عارضی ملازمت قبول کرلے یا دیہی رقبوں میں اجرت پر محنت کرنے کے خیال سے ہجرت کرجائے یا اپنی گاڑی کرایہ پر چلانے لگے۔ آخری چارۂ کار اختیار کرنے کی صورت میں اسے آج کل باربرداری کی موٹروں کی روز افزوں مسابقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ان عام پیشوں میں سے کوئی پیشہ بھی کسان کے نقطۂ نظر سے پوری طرح اطمینان بخش نہیں ہوتا۔ بقول سٹرڈارلنگ "ٹٹ پونجیے کسان کے لئے اپنے آپ کو قرضداری سے محفوظ رکھنے کا واحد طریقہ صرف یہ ہے کہ وہ کفایت شعاری اور تندہی کے ساتھ زندگی بسر کرے اور اپنے اوقات فرصت میں کوئی دوسرا کام دھندا کرتا رہے"۔ چنانچہ تمام دنیا میں ادنیٰ درجے کے کسان کا یہی تجربہ ہے۔ جاپان میں ریشم کے کیڑوں کی پرورش، زراعت کی ایک اہم ذیلی صنعت ہے۔ فرانس، جرمنی اور اٹلی وغیرہ میں ان کی مخصوص دیہی صنعتیں موجود ہیں۔ علاوہ ازیں مغرب میں

[1] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ نقرہ (۴۸۸)

[2] دیکھو رپورٹ نقرہ (۳۶۱)

زراعت ایک موسمی دھندا اور تفریح کی حیثیت رکھتی ہے اور کسان کے لیے کسی خلل کے بغیر کام مہیا کرتی ہے۔ مکھن اور پنیر بنانا، تخم ریزی، پالنا اور باغبانی یہ سب اوقات فرصت کے اہم دیہی پیشے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں ادنیٰ درجے کے کسان کے لیے اوقات فرصت میں ایسے ضمنی پیشے کس طرح مہیا کیے جائیں تاکہ وہ اور اس کا خاندان اپنی زمین کی کاشت کو نقصان پہنچائے بغیر مصروف رہ سکے اور اپنی زرعی آمدنی میں اضافہ کر سکے۔[1]

۱۸۔ شیر خانہ وغیرہ

شیر خانہ ہندوستان کے ممکنہ ذیلی کاروبار میں سے ایک ہے اور اگر اس کا انتظام و قیام کامیابی کے ساتھ ممکن ہو تو اس کی وجہ سے نہ صرف رعیت کی معاشی حیثیت و حالت کی اصلاح ہو جائے گی بلکہ خالص دودھ کافی مقدار میں مہیا کرنے کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ یہ سوال دیہات میں خاص طور پر محتاج توجہ ہے، اس لیے کہ یہاں دودھ میں بورک ایسڈ، فورمیلین وغیرہ جیسی نقصان رساں چیزیں ملائی جاتی ہیں، اور دودھ نہ صرف خراب قسم کا بلکہ دنیا کے دوسرے تمام ملکوں سے زیادہ گراں ملتا ہے۔ اب تک مکھن اور پنیر بنانے کے کارخانے کھولنے کی جتنی کوششیں کی گئیں وہ سب کی سب بلا استثناء اس لیے ناکام ہوئیں کہ اول تو دیسی مویشی سخت حالات میں زندگی بسر کرتے کرتے بگڑ گئے ہیں اور کم مقدار میں دودھ دیتے ہیں، دوسرے یہ کہ قانون نے ان کی حفاظت کا کوئی انتظام نہیں کیا ہے، اور تیسرے یہ کہ حکومت کی جانب سے کسی قسم کی ہمت افزائی نہیں ہوئی ہے۔ اس واقعے پر نظر رکھتے ہوئے کہ دودھ اور اس کی ذیلی پیداوار کا فضلہ اور خمیر یا (خناق وبائی) وغیرہ کے جراثیم اور نباتات کو منتقل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے، یہ نہایت ضروری ہے کہ دیانتداری کے ساتھ اور سائنسی اصول پر یہ چیزیں تیار کی جائیں تاکہ کاروبار مالی اعتبار سے بھی منفعت بخش ثابت ہو اور عوام کو بھی محفوظ اور یقینی طریقے پر دودھ کی رسد مہیا ہو سکے۔ شہروں کے قرب و جوار کے قریوں کو اس قابل

[1] ہندوستان کے مختلف صوبوں میں زراعت کے متعلق موجودہ اور امکانی دیہی صنعتوں کے دلچسپ تبصرے کے لیے صوبہ وار بینکوں کی تحقیقاتی کمیٹیوں کی رپورٹوں اور بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ (فقرہ ۲۹۹) کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔

تا چاہئے کہ وہ شہری آبادی کی عمدہ قسم کے دودھ کی کثیر مانگ کو پورا کر سکیں۔ اگر
ہروں اور قصبات سے گاؤں دور بھی واقع ہوں تو بھی دودھ کی پیداوار، بالائی
ی، مکھن وغیرہ شکلوں میں تیار اور دور دراز مقاموں پر باسانی روانہ کی جاسکتی ہے۔
ن شیر خانوں کو مناسب طریقے پر چلانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ جانوروں کی خوبی پر
نیا طاکے ساتھ توجہ دی جائے تاکہ وہ کافی دودھ دے سکیں۔ سائنسی طریق پر پرورش
فزائش نسل کے ذریعے سے اچھے دودھیل جانوروں کی تعداد بڑھانا اور کئی نسلوں سے
قدزدہ اور مخلوط نسل کے مویشیوں کی خرابیاں دور کر دینا ضروری ہے[1]۔ جیسا کہ
یٹنگ نے بتلایا ہے "کسان کے لیے مناسب ترین ذیلی کاروبار ڈھور ڈنگر کی پرورش و
ائش ہے جو ہر موسم میں مصروفیت کا سامان اور آمدنی مہیا کر دے گی اور زمین کی
دآوری اور زرخیزی کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری کھاد بہم پہنچائے گی۔ تاہم اس
میں کئی مشکلات ہیں، مثلاً دیہی مکانوں میں انسانوں کے ساتھ جانوروں کا رکھا جانا
ان جانوروں پر مناسب توجہ دینا ناممکن ہے۔ موجودہ حالات یعنی منتشر کھیتوں اور
بان آباد مواضع کی اصلاح ضروری ہے تاکہ کسان کاروباری پیمانے پر جانوروں کی
اشت کر سکے۔ علیٰ ہذا چرائی اور چارے کی رسد کی معقول سہولتیں بہم پہنچانے کی راہ میں
دقتیں حائل ہیں ان کو بھی ہٹانا ضروری ہے[2]۔

ڈیری فارم اور افزائش نسل جانوران کے علاوہ مندرجہ ذیل گھریلو صنعتیں اور
ی کاروبار بھی قابل ذکر ہیں:۔ مرغبانی، ماہی گیری، میووں کی کاشت، تجارتی باغبانی،
سازی، ہاتھ سے اناج پچھوڑنا، ریشم کے کیڑوں کی پرورش، لاک سازی، شہد کی
یوں کی داشت، دباغت، بورے کی بنائی، بانس اور بید کا کام، رسن سازی، ظروف
انا، جال کی بنائی، بیڑی، کھلونے اور چوڑی بنانا، آلات کشاورزی تیار کرنا، آہنگری،
جاری اور زردوزی کا کام، پیسری اور مٹھائیاں بنانا وغیرہ[3]۔

[1] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ (روئداد شہادت) جلد اول جزو اول، ص۲۳۸ تا ص۲۴۱
[2] دیکھو جی کیٹنگ کی کتاب موسوم بہ "مغربی ہندوستان کی زرعی ترقی" ص۱۲۶ تا ص۱۲۷
[3] دیکھو بمبئی کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ ۴۷۱؛ نیز بنگال کی بنک کاری کی

باب

یہ ظاہر ہے کہ یہ سب کاروبار اور صنعتیں ہندوستان کے طول و عرض میں جاری نہیں کی جا سکتیں۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ان میں سے کن کن کو مختلف علاقوں میں رواج دیا جا سکتا ہے، سلسلے کے ساتھ بہت ہی گہری علاقہ واری تحقیق کرنی پڑے گی[1]۔ 269
ہر ضلع اور گاؤں کے خاص خاص حالات کا احتیاط کے ساتھ مطالعہ کر کے مناسب حرفت یا صنعت کو منتخب کرنا پڑے گا مثلاً مرغبانی صرف ان علاقوں میں ممکن ہوگی جہاں اس کو بطور پیشہ اختیار کرنے کے خلاف شدید مذہبی تنفر و کراہیت نہ ہو۔ چنانچہ یہ شبہ ہوتا ہے کہ گجرات میں غالباً شہد کی مکھیوں کی داشت ناکام ثابت ہوگی جہاں جین مت کے عقائد لوگوں کے دلوں پر چھائے ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں مرغبانی اور تجارتی باغبانی بازار کا قرب چاہتی ہے جہاں مال کی ہاتھوں ہاتھ بکری ہو، اور صرف شہروں کے متصل وہی رقبوں میں منافع کے ساتھ جاری کی جا سکتی ہے۔ علیٰ ہذا ریشم کے کیڑوں کی پرورش خاص طور پر بلند مقامات اور موافق آب و ہوا کی طالب ہے اور آج کل تو یہ حرفت مصنوعی ریشم کی ترقی پذیر درآمد کی مسابقت سے دوچار ہے۔

۱۹۔ کھدر کا معاشی نظریہ

سوت کی دستی کتائی کسی قدر مفصل بحث چاہتی ہے، اس لیے نہیں کہ وہ بذات خود اہمیت رکھتی ہے، بلکہ اس لیے کہ تیرہ چودہ اور اس کے امکانات کے بارے میں کچھ زمانہ ادھر تک سرگرم بحث چھڑی ہوئی تھی چرخے کے حامی یہ کہتے ہیں کہ دستی کتائی ہی واحد تضمینی صنعت ہے جو موجودہ حالات میں دیہی آبادی کی بڑی تعداد کے لیے مناسب و ممکن ہے، علاوہ ازیں وہ موجودہ بیکار انسانی قوت سے فوری کام لینے کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ (۲۹) اور سر ام وسویسوریا کی کتاب موسوم بہ (Progress of Agricuture in Western India) صفحہ ۳۹ تا صفحہ ۴۸ نیز صفحہ ۷۰

[1] سر ام وسویسوریا نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جاپان کے مثل ہندوستانی صوبوں اور دیاستوں میں بھی اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ کچھ علاقے زراعت کے لیے اور کچھ علاقے صنعت کے لیے مخصوص کر دیے جائیں اور لوگوں کی مدد اور ہمت افزائی کرنی چاہیے کہ وہ مسلمہ پیشے اختیار کریں دیکھو ان کی کتاب موسوم بہ Planned Economy for India صفحہ ۳۹۔

سہل ترین اور یقینی ذریعہ ہے۔ مسٹر ام، کے، گاندھی، چرخہ کے مسلک کے سب سے بڑے حامی چرخے کے فوائد کو مختصر طور پر یوں بیان کرتے ہیں:

(۱) چرخے پر فوراً کام شروع کیا جا سکتا ہے، اس لئے کہ (ا) اس کے چلانے کیلئے نہ تو سرمایہ کی ضرورت ہے اور نہ قیمتی آلات اور ساز و سامان کی، اس کو بنانے اور چلانے کے لیے خام مال اور ساز و سامان ارزاں اور مقامی طور سے دستیاب ہو سکتا ہے۔

(ب) اس کو چلانے کے لیے اس سے زیادہ اعلیٰ درجے کی مہارت یا ذہانت درکار نہیں ہوتی جتنی کہ ہندوستان کے جاہل اور افلاس زدہ باشندوں میں پائی جاتی ہے۔

(ج) وہ اس قدر کم جسمانی محنت چاہتا ہے کہ چھوٹے بچے اور بوڑھے بھی اس کو چلا سکتے ہیں اور اس طرح خاندان کی مجموعی آمدنی میں حسب مقدور اضافہ کر سکتے ہیں۔

(د) اس کو چلانے کے لیے کسی پیشگی تیاری اور اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی اس لیے کہ عوام میں کتائی کے روایات ابھی تک زندہ ہیں۔

(۲) اس کا افادہ عام اور دائمی ہے، اس لیے کہ اشیائے خوردنی کے بعد صرف سوت ہی ایک ایسی شے ہے جس کی بکری کام کرنے والے کے گھر کی دہلیز ہی پر فوراً اور غیر محدود طریقے پر ہمیشہ یقینی ہے، اور اس طرح وہ مفلس کسان کے لیے ایک باقاعدہ اور مستقل آمدنی پیدا کرنے کا ضامن ہوتا ہے۔

(۳) چرخہ بارش اور موسمی حالات پر منحصر نہیں ہے، چنانچہ قحط کے زمانے میں بھی اس کو چلایا جا سکتا ہے۔

(۴) وہ عوام کے مذہبی یا معاشری احساسات کے خلاف نہیں ہے۔

(۵) وہ قحط کا مقابلہ کرنے کا ایک نہایت ہی مکمل اور تیار آلہ ہے۔

(۶) وہ کسان کو اس کے جھونپڑے ہی میں برسر کار کر دیتا اور اس طرح آڑے وقت میں خاندان کو بربادی سے بچا لیتا ہے۔

(۷) صرف وہی ہندوستان کی دیہی برادریوں کو جواب قریب قریب

270

ؔ۱ؔ۔ دیکھو آر، بی، اگریگ کی کتاب موسوم بہ "کھدر کا معاشی نظریہ" صفحہ ۱۷ تا صفحہ ۱۴۲
(Economics of Khadder)

تباہ ہو چکی ہیں ان کی اصلی حالت پر لاسکتا اور ان کے فوائد کو بحال کر سکتا ہے۔

(۸) وہ نہ صرف کسان کی بلکہ جلاہے کی بھی پشت و پناہ ہے، اس لیے کہ صرف وہی ایک مستقل اور دیرپا بنیاد دستی پارچہ بافی کی صنعت کے لیے مہیا کرتا ہے جو اس وقت ۸۰ لاکھ تا ایک کروڑ باشندوں کا ذریعۂ معاش بنی ہوئی ہے اور ہندوستان کی قریب قریب ایک تہائی آبادی کے لباس کی ضرورتیں پوری کرتی ہے۔

(۹) اس کا احیا کئی ہم جنس و ملحقہ دیہی پیشوں کے حق میں محرک کا کام کرے گا اور اس طرح دیہات کو تباہی کے گڑھے سے باہر نکالے گا۔

(۱۰) صرف وہی ہندوستان کے کروڑوں باشندوں میں دولت کی منصفانہ تقسیم کا ضامن بن سکتا ہے۔

(۱۱) صرف وہی مسئلۂ بے روزگاری کا کارگر حل ہے، نہ صرف کسان کی جزوی بے روزگاری کا بلکہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بے روزگاری کا بھی، جو تلاش معاش میں بے نیل و مرام حیران و سرگرداں ہیں۔ اس کام کی وسعت و عظمت یہ چاہتی ہے کہ ملک کے تمام ذہنی و عقلی قوی متحد و منظم ہو کر اس تحریک کی رہنمائی و نگرانی کریں۔

سی راج گوپال چاری اپنی اس یادداشت میں جو انھوں نے شاہی زرعی کمیشن کو پیش کی تھی پرنے کے متعلق کہتے ہیں کہ "عوام کی محدود مہارت و معلومات اور اوقات فرصت کے مشغلے کے مندرجۂ ذیل لوازم پر نظر کرتے ہوئے کہ وہ سادہ ہو، باسانی سکھایا جا سکتا ہو اور ہر وقت بلا تکلف شروع یا ترک کیا جا سکتا ہو تاکہ اصل پیشے میں مخل نہ ہو، دستی کتائی ہی ایسا واحد پیشہ ہے جس کو ہندوستان کی دیہی آبادی اپنے اوقات فرصت میں انجام دے سکتی ہے۔" وہ خیال کرتے ہیں کہ اس نتیجے کی تصدیق احاطۂ مدراس کے تامل ناڈ علاقے میں کھدر کے احیا کے کام کے حقیقی تجربے سے ہوتی ہے۔ یہاں کے لوگوں خاص کر عورتوں نے چرخے کو بہت رغبت سے شروع کیا ہے اور اس سے ان کو جو زائد آمدنی ہوتی ہے اگرچہ بہت ہی تھوڑی یعنی ۵ روپیہ تا ۲۵ روپیہ سالانہ فی چرخہ ہے، اصل پیشے کی آمدنی میں مفید اضافہ ہے، خاص کر اس لیے کہ اکثر صورتوں میں مزروعہ زمین کی

271

آمدنی ۵ روپیہ سالانہ فی خاندان سے زیادہ نہیں ہوتی۔ علی ہذا این تمبے کر اور دروا جاری، دستی کتائی و پارچہ بافی کی بابت اپنے قابل تعریف مضمون میں رقم طراز ہیں کہ چرخہ شاندار مستقبل رکھتا ہے اور گرنی کی موجودہ پیداوار کی کمی کو بخوبی پورا کر سکتا ہے، لیکن ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ چرخے کی علاقہ واری تنظیم مناسب طریقے پر عمل میں لائی جائے تاکہ کل آبادی کے لیے کافی معقول پیمانے پر لباس مہیا ہو سکے۔ بایں ہمہ راجگوپالاچاری جیسے کھدر کے سرگرم حامی بھی دو اساسی مشکلات کو تسلیم کرتے ہیں:۔ ایک تو یہ کہ بڑھیا اور مہین کپڑوں کا ذوق پیدا ہو گیا ہے، دوسرے یہ کہ ہاتھ کے بنے ہوئے کپڑوں کی قیمت گرنی کے کپڑوں نیز بیرونی ممالک سے درآمدہ کپڑوں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ راج گوپال چاری دوسری دقت کو زیادہ سخت بتلاتے ہیں اور قیمتوں کی کمی کو ممکن بنانے اور پیدائش میں سہولت پیدا کرنے کے لیے سرکاری امداد کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ متواتر سالانہ پس اندازیوں کی وجہ سے مفلس ترین طبقے کی عام خوشحالی اور قوت خرید میں اضافہ ہونے تک کچھ مدت تک سرکاری امداد کو جاری رکھنا ضروری ہوگا۔ اسی کے ساتھ سرکاری امداد کے دوسرے طریقوں کی بھی وہ سفارش کرتے ہیں، مثلاً قرضے دیے جائیں، پیدائش و تقسیم میں دوسری سہولتیں بہم پہنچائی جائیں، کرایۂ نقل و حمل میں کمی کی جائے، اور محصول درآمد اور دوسرے محصولوں میں ترجیحی سلوک کیا جائے۔ لیکن ہم اس سے اتفاق نہیں کر سکتے کہ مفلس ترین طبقے کی قوت خرید کا اضافہ"، اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ وہ اس قدر آسانی کے ساتھ رونما ہو سکتا ہے، اس طبقے کو اس امر کی ترغیب دے گا کہ گرنی کے ارزاں کپڑے کے مقابلے میں وہ کھدر کو ترجیحاً خریدے۔ تاوقتیکہ کھدر، گرنی کے کے بنے ہوئے کپڑے کے مساوی یا اس سے زیادہ ارزاں فروخت نہ ہو، مالی امداد کی صورت میں مستقل سہارے کو برقرار رکھنا پڑے گا جس سے عام محصول ادا کرنے والے کو نقصان اٹھانا پڑے گا۔ گھریلو صنعتوں کی تحقیق کے لیے حکومت مدراس کی جانب سے ایک خاص افسر مقرر کیا گیا تھا، وہ ابتدائی رپورٹ میں احاطۂ مدراس کی کھدر کی تحریک کے تحدیدات پر زور دیتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ

سالانا: پس اندازیاں اتنی کافی نہیں ہیں کہ دستی کتائی کے لیے کوئی بڑی ترغیب پیش کر سکیں مشکلات حقیقی ہیں اور یہ بات آسان نہیں ہے کہ مصارف کے مسئلے سے قطع نظر کرتے ہوئے لوگوں کی نفسیات میں اور گاڑھے کھدر کے آن زیادہ دلکش اور ٹھنڈے بدلوں کے بارے میں ترجیحی میلان میں تغیر پیدا کیا جائے جن پر مفلس ترین طبقے کے سوا سب کو دسترس حاصل ہے ۔ پھر بھی جس وقت تک کسان کے لیے اس سے زیادہ منفعت بخش تفنیمی صنعت مہیا نہ کی جا سکے دستی کتائی اس کو اس بات کا کچھ موقع بہم پہنچائے گی کہ وہ ختم سال پر اپنے موازنے کو متوازن کرلے ۔ چرخے کے استدلال کی بنیاد ساری یہ ہے کہ چرخہ کا تنا بے کار رہنے سے بدرجہا بہتر ہے ۔ لیکن کسان کو اس کی مشکلات سے نجات دلانے کے لیے چرخے سے زیادہ کسی اور منفعت بخش ذیلی صنعت کی ضرورت ہے ۔

۲۰۔ بعض دوسری دیہی صنعتیں

دیہی بے کاری و بے روزگاری کو حل کرنے کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ دیہی علاقوں میں ایسی صنعتوں کے قیام کو ترقی دی جائے جو زرعی پیداوار کو قابل صرف و قابل برآمد بنانے سے تعلق رکھتی ہیں ، مثلاً بنولے اوٹنا ، ناریل چھیلنا ، چاول بنانا ، بھوسا نکالنا ، غلہ پھوڑنا ، صاف شکر تیار کرنا ، روغن برآری ، ہڈی کے کھاد کی تیاری وغیرہ ۔ ان صنعتوں کو امکانی طور پر امداد باہمی کے اصول پر منظم کرنا چاہیے ۔ انھیں شہروں میں مرکز نہ کرنا چاہیے بلکہ دیہات میں لوگوں کو کام پر لگانے اور روزگار بہم پہنچانے کے لیے رائج کرنا چاہیے ۔ زراعت کے متعلق اس قسم کے کاروبار کی ترقی کے لیے ارزاں برقی قوت کی بہم رسانی بہت بڑی سہولت پیدا کرے گی ۔ چنانچہ دیہی علاقوں میں ارزاں قوت تقسیم کرنے کی غرض سے پنجاب اور بمبئی برقابی کاموں کے امید افزا امیدان بہم پہنچاتے ہیں ۔ فنی تعلیم کا مناسب نظام کامیابی کی ناگزیر شرط ہے ۔ ان حرفتوں کے لیے کم از کم آغاز میں سرکاری امداد کی بھی ضرورت ہوگی ۔ زرعی کمیشن اس امر کی تائید کرتا ہے کہ محکمہ جات زراعت کے انجینیری کے شعبوں کی مدد اور مشورے سے خانگی فرم آلات کشاورزی مقامی طور پر تیار کریں ۔ اس کی وجہ سے بھی نقل و حمل کے موجودہ کثیر مصارف کم ہو جائیں گے اور مقامی قیمت کسان کی دسترس کے اندر آجائے گی۔

272

باب

کاغذ سازی کے خام مادے کے طور پر اگر بانس یا بمبو سے کام لیا جائے تو جنگلات کی سرحد کی دیہی آبادی کے لیے روزگار بہم پہنچ سکتا ہے ۔ میووں کو سکھا کر ڈبے میں بند کر کے ان کا مُربہ بنا کر محفوظ کرنے کا طریقہ زرعی طبقے کو روزگار بہم پہنچانے یا اس کاروبار میں حصّہ لینے والے سرمایہ داروں کے لیے پرمنفعت ہونے کی حیثیت سے بظاہر بہت امید افزا معلوم ہوتا ہے ۔ لیکن کمیشن کو اس بارے میں شبہہ ہے کہ دیہی آبادی کے حالات کی اصلاح و ترقی دیہی صنعتوں کے قیام کے ذریعے سے ممکن ہے ، اور وہ یہ توقع ظاہر کرتا ہے کہ کسان کی مشکلات کا اصلی حل زراعت عمیق و متنوع طریق پر کرنے میں مضمر ہے[۱]۔

مدراس میں گھریلو صنعتوں کی تحقیق کا جو کام شروع کیا گیا تھا وہ ۱۹۲۷ء تا ۱۹۲۸ء میں چار اضلاع میں تکمیل کو پہنچا ۔ اس تحقیق کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ آیا زرعی موسم میں کسان کے لیے گھریلو صنعتوں کا معاشی بنیاد پر احیا ذیلی کاروبار کے طور پر مفید ہو سکتا ہے یا نہیں اسی قسم کی علاقہ واری تحقیق دوسری صوبہ واری حکومتوں کی جانب سے کسی باقاعدہ اصول کو اختیار کرنے کی غرض سے میدان تیار کرنے کے لیے ضروری ہے ۔ ہندوستان کی بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی غور و خوض کے بعد یہ خیال ظاہر کرتی ہے کہ کسان کے لئے اس کی فرصت کے اوقات میں مناسب ذیلی مشغلہ مہیا کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جدید صنعتیں قائم کی جائیں اور موجودہ صنعتوں میں توسیع کی جائے ۔ کمیٹی اس پر زور دیتی ہے کہ صوبہ واری حکومتوں کو چاہیئے ان صنعتوں کی ترقی کی جانب اپنی توجہ پوری سرگرمی کے ساتھ مبذول کر دیں[۲]۔

۲۱ ۔ فروخت بہ امداد باہمی[۳]

جس وقت تک ہندوستانی کسان اپنے گزارے کیلیے

---

[۱] ۔ دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ ، فقرات ۱۹۴ تا ۴۹۳ و ۵۰۰ ۔

[۲] ۔ دیکھو بنک کے کاروبار کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ ۔ فقرات (۳۰۱ تا ۳۰۲) ۔ دیہی صنعتوں کی سرکاری امداد کے بارے میں مزید تفصیلات کے لیے دیکھو رپورٹ مذکور جلد دوم باب ۳ ۔

[۳] زرعی پیداوار کی فروخت کے مسئلے کی جامع بحث کے لیے دیکھو ایس ، جی ، بیری کا لکھا ہوا باب موسوم بہ "زرعی پیداوار کی فروخت" ایک کتاب موسوم بہ "ہندوستان میں امداد باہمی" میں جو زیر ادارت ایچ ، ایل ، قاضی طبع ہوئی صفحہ ۳۳۲ تا صفحہ ۳۶۵ ۔

باب

273

کھیتی باڑی کررہا تھا اور قدیم دیہی تنظیم کی پناہ میں چین سے زندگی گزار رہا تھا اس وقت تک غالباً دیہی علاقوں میں کسی مزید اور خاص تنظیم کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن موجودہ زمانے کے حالات بالکل مختلف ہیں۔ چونکہ آج کل زراعت تجارتی طریق پر انجام دی جاتی ہے اور وسیع مقابلہ کرنے والے بازاروں کا قیام عمل میں آیا ہے، اس لیے زیادہ طاقتور تنظیم ضروری ہوگئی ہے۔ قدیم فرسودہ تنظیم بھی اس قدر کمزور ہوگئی ہے کہ وہ ازکار رفتہ ہوگئی ہے اور بالکل جدید حالات کا مقابلہ کرنے میں وہ رعیت کی رہنمائی یا حفاظت قطعاً نہیں کرتی جیسا کہ زرعی کمیشن خیال ظاہر کرتا ہے رعیت کے مفادات و اغراض معاشی قوتوں کے آزادانہ عمل کے تابع ہوگئے ہیں اور اس عمل میں ان اغراض کو نقصان پہنچا ہے۔ اس لیے کہ رعیت اپنی پیداوار کے خریدنے والوں اور صارفوں کے مقابلے میں نہایت ہی چھوٹی اکائی ہے اور تمام صارف اپنی جگہ پر ہر سال زیادہ منظم، طاقتور اور متحد ہوتے جارہے ہیں۔[1]

یہ تجربہ ہر جگہ عام ہے کہ اشیا کے تمام پیدا کرنے والا مادی فوائد میں اپنا مناسب حصہ پانے سے محروم رہتا ہے اور یہ صورت موجودہ زمانے میں ہندوستان پر خاص طور پر صادق آتی ہے جہاں چھوٹی چھوٹی اکائیاں کاشتکاری کرتی ہیں اور ان کی مدد و حفاظت کے لیے کوئی خاص تنظیم موجود نہیں ہے۔ ہندوستانی کسان معمولاً ساہوکار پر انحصار کرتا ہے جس کے پاس اس کو اپنی پیداوار عام طور پر پیشگی گروی کرنی پڑتی ہے۔ ساہوکار کے علاوہ متعدد پیشہ ور سوداگر اور بیچ والے بھی ہوتے ہیں جو کسان کے ساتھ سایہ کی طرح لگے رہتے ہیں اور اس کو خسارے میں ڈال کر خود گوشۂ عافیت میں بیٹھے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔

ایک اور دقت سڑکوں، پلوں اور معاون ریلوں کے ناکافی انتظام کی وجہ سے بھی پیدا ہوتی ہے، چنانچہ کسان اس خرابی کے باعث صارفوں یا تھوک فروش سوداگروں سے براہ راست معاملہ نہیں کرسکتا۔ کسان کی دوسری دشواریاں یہ ہیں:۔ نوشت و خواند کا بہت ہی ادنیٰ معیار، مناسب طریقے پر منظم بازاروں اور کسانوں میں باہمی اتحاد کی عدم موجودگی، پیمانوں اور اوزان کی غیر منظم حالت اور مال کا ذخیرہ کرنے کی ناکافی سہولتیں۔ ان حالات میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ کسان کو اپنی پیداوار کی واجبی قیمت وصول نہیں ہوتی۔

---

[1] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ۔ فقرہ (۳۲)

باب

سرمایہ کی دیرینہ کمی اور ساہوکار کے مطالبات کو پورا کرنے اور سرکاری زر لگان ادا کرنے کی ضرورت کے باعث کسان اپنی پیداوار کو نقصان کے ساتھ ٹھیک ایسے زمانے میں فروخت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے جب کہ ہر شخص فروخت کرنے پر تُلا رہتا ہے اور بازار میں اشیا کی بھرمار ہونے کی وجہ سے قیمت گری ہوئی ہے۔ اڑھتیوں یا بیچ والوں کا ایک طویل سلسلہ خاص کر اجناس کی برآمد کے کاروبار میں موجود ہوتا ہے۔ بڑی بڑی فرمیں کسان سے عام طور پر پیشگی معاہدے کر لیتی ہیں، اور پیداوار تیار ہونے کے بعد انھیں کو بیچنا کرنے کا پابند بنانے کے خیال سے اس کو پیشگی زر ادا کیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ بتلانے کے لیے کسان اور صارف کے درمیان اڑھتیوں کے طور پر کام کرنے والے بیچ والے ہوتے ہیں مندرجہ ذیل نقشے کو مثالاً پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ نقشہ اس یادداشت سے ماخوذ ہے جو مرکزی ہندوستانی کپاس کمیٹی نے شاہی زرعی کمیشن کے ملاحظے میں پیش کی تھی[1]۔

274

کسان

- دیسی سوداگر
  - ساہو خریدار
  - بیچ والے (ایک یا ایک سے زائد) (یہاں بنولے اوٹنا)
  - کمیشن ایجنٹ
  - برآمد کرنے والا یا گرنی کا خریدار یا تاجر
- برآمد کرنے والا یا گرنی کا خریدار یا تاجر کا گماشتہ (یہاں بنولے اوٹنا)
  - برآمد کرنے والا یا گرنی کا خریدار یا تاجر
- وہی سوداگر
  - بازار (دلال کے توسط سے)
  - بیچ والے ایک یا ایک سے زائد (یہاں بنولے اوٹنا)
  - بمبئی کا کمیشن ایجنٹ (ایک یا ایک سے زائد)
  - برآمد کرنے والا یا گرنی کا خریدار یا تاجر

[1] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ (روئداد شہادت) جلد دوم حصہ دوم۔ صفحہ ۲

باب
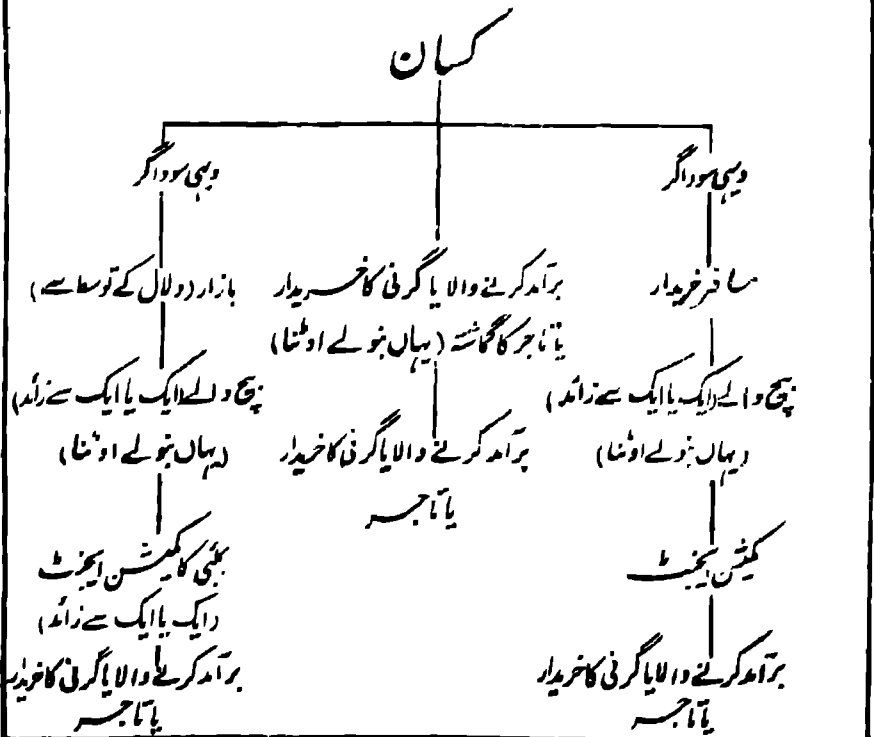
جیسا کہ یادداشت میں آگے چل کر بیان کیا گیا ہے ظاہر ہے کہ ممکنہ تغیرات بہت زیادہ ہوتے ہیں اور بیچ والوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہوسکتی ہے۔ لیکن اگر ہم انتہائی صورتوں کو ترک بھی کر دیں تب بھی کسان اور صارف کے درمیان بیچ والوں کی تعداد عام طور پر حد سے زیادہ ہوتی ہے۔ مثلاً کسان کا مقامی ایجنٹ مفصلاتی خریدار کا ایجنٹ مفصلاتی خریدار اور ٹٹ پونجیا خریدار۔ لہذا جیسا کہ وی۔ ال۔ مہتا اپنی یادداشت میں بتلاتے ہیں، اگر امداد باہمی کا طریق اختیار کر لیا جائے تو ان درمیانی اشخاص کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔ مثلاً فروخت بہ امداد باہمی کی انجمن، مقامی ایجنٹ اور مفصل کے خریدار کے ایجنٹ کے وجود کو غیر ضروری اور مفصل کے خریدار سے براست معاملے کو ممکن بنا سکتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اگر مرکز پر صارفوں کی باقاعدہ انجمنیں موجود ہوں تو جملہ بیچ والوں کو ہٹایا جا سکتا ہے جس سے پیدا کرنے والے اور صارف دونوں کو بہت بڑا فائدہ ہوگا[1]۔ کسان کو اسکی پیداوار کی پوری پوری بازاری قیمت وصول کرنے کے قابل بنانے کے مسئلے کا واحد اطمینان بخش حل صرف امداد باہمی پیش کرتی ہے۔ کسان بعض اوقات صارف سے براہ راست معاملہ کرتا ہے، لیکن چونکہ ہر کسان اپنے طور پر کام کرتا ہے اس لیے پیداوار کو دور کے مقام پر لیجانے اور کم مقدار میں فروخت کرنے میں نامناسب طور پر زیادہ وقت اور محنت لازماً صرف ہوتی ہے۔

محکمہ جات زراعت و امداد باہمی کو کچھ سال ادھر سے اس امر کا احساس ہوا ہے کہ دیہی پیداوار کی فروخت کا انتظام ہی دیہات کی خوشحالی اور بہبود کے کل مسئلے کا اساسی حل ہے؛ اور فروخت بہ امداد باہمی کی تحریک ہندوستان میں کسی حد تک ترقی کر گئی ہے۔ چنانچہ اولیت کا سہرا برما کے سر ہے کہ وہاں چاول فروخت کرنے کی شرکہ انجمنوں کا افتتاح عمل میں آیا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ امید افزا ترقی بمبئی جیسے صوبوں میں روئی کی فروخت سے ہوئی ہے چنانچہ بمبئی صوبہ متوسط اور پنجاب میں روئی کی فروخت کی انجمنیں کھولی گئی ہیں۔ اب تک اس تحریک نے سب سے نمایاں کامیابی احاطہ بمبئی میں حاصل کی ہے اور یہاں کے چار بڑے علاقوں میں روئی کی فروخت کی انجمنیں قائم ہیں۔

275

[1] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ جلد دوم حصہ دوم۔ صنا۱۱۔

(۱) دھارواڑ اور بلگام، (۲) بیجاپور، (۳) سورت، بروچ اور کیرا، (۴) خاندیس۔ پہلے اور تیسرے علاقے کی انجمنیں سب سے اہم ہیں۔ ۳۳-۱۹۳۲ء میں کپاس کی فروخت کی کل ۲۸ انجمنیں تھیں جن کے کاروبار کی قیمت کا اندازہ تقریباً ۲۵ لاکھ روپیہ کیا گیا تھا[۱]۔ آج کل دوسرے مختلف قسم کے نظامات کی بھی آزمائش کی جا رہی ہے:۔ (۱) وہ انجمنیں جو اپنے ارکان کی پیداوار کو اکٹھا کرتی ہیں، بنولے اوٹنے کا انتظام کرتی ہیں اور کپاس اوٹنے اور اس کے گانٹھ یا بورے تیار کرنے کے بعد فروخت کرتی ہیں؛ (۲) وہ انجمنیں جو مختلف قسموں یا درجوں کی کپاس کے میعادی نیلام کا انتظام کرتی ہیں اور ہر ایک کو اس کی پیداوار کی فروخت کے حساب سے قیمت ادا کر دی جاتی ہے؛ (۳) امداد باہمی کی کمیشن کی دوکانیں جو پیداوار کا ذخیرہ کرتی ہیں، تاکہ کسان کسی آڑے وقت فروخت کرنے پر مجبور نہ ہو؛ اس قسم کی انجمنوں کی پنجاب میں آزمائش کی جا رہی ہے[۲]؛ اور (۴) امداد باہمی کے طریق پر بنولے اوٹنا اور تخم سبھاؤں کا اپنے ارکان کی کپاس کو فروخت کرنا۔ یہ سبھائیں زیادہ تر خالص تخم کی پیدائش کی غرض سے قائم ہوئی ہیں، اور ان کے متعلق یہ مشکل خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ روئی کی فروخت کے حقیقی مسئلے سے تعلق رکھتی ہیں۔ پہلی قسم کی انجمن ہی وہ واحد انجمن ہے جو چھوٹے بیچ والے کو پوری طرح ہٹا دینے کی سنجیدہ و سرگرم کوشش کرتی ہے اور اس کو سورت کے ضلع میں کسی حد تک کامیابی ہوئی ہے؛ اس کے برخلاف دوسری قسم کی انجمن زیادہ تر ضلع دھارواڑ میں کام کر رہی ہے اور اس کے اہم مرکز گدگ اور ہبلی ہیں۔

لیکن یہ سب کچھ کہنے اور کرنے کے باوجود فروخت بہ امداد باہمی کی تنظیم کی ترقی اپنی سب سے نمایاں شکل یعنی کپاس کے بارے میں بھی بہت زیادہ تیز رفتار

---

[۱] دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "انجمن ہائے امداد باہمی کے کام کی سالانہ رپورٹ بمبئی" (۳۳-۱۹۳۲ تا ۳۴-۱۹۳۳)

[۲] موجودہ زمانے میں کمیشن کی دوکانیں کچی آڑھت کا کاروبار کرتی ہیں اور اس طرح فروخت بہ امداد باہمی کے طریق پر اس کی سادہ ترین شکل میں کاروبار کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ دیکھو پنجاب کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ (۸۹)

نہیں رہی ہے۔ اور نہ یہ تنظیم سود، انتظام، ارکان پر پورا قابو رکھنے کی ناکامی (اس لیے کہ ان کو اپنی کپاس انجمنوں کے توسط سے فروخت کرنے پر قانوناً مجبور نہیں کیا جا سکتا)، ناکافی سرمایہ، خاص کر کسانوں کو پیشگی زر فوراً ملنے میں رکاوٹیں جیسے شدید نقائص سے بالکل خالی ہے۔ ان سب نقائص کو دور کرنا چاہیے، تحریک کی اعلیٰ پیمانے پر تنظیم کرنی چاہیے اور اس کو ہنرمندی کے ساتھ چلانا چاہیے تاکہ وہ دلالوں، آڑھتیوں اور دوسرے بیچ والوں کے طاقتور حقوق قائمہ سے مقابلہ کر سکے[1]۔ بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی یہ سفارش کرتی ہے کہ صوبہ واری حکومتوں کو چاہیے کہ فروخت بہ امداد باہمی کی انجمنوں کی نشو و نما کی غرض سے امداد باہمی کے بنکوں کو رعایتی شرح سود پر پیشگیاں ادا کریں[2]۔

فروخت بہ امداد باہمی کے اصول کو دوسری قسموں کی زرعی پیداوار مثلاً گڑ، تمباکو، مرچ، چاول، اور آلو کے بارے میں بھی وسیع کیا گیا ہے؛ چنانچہ گڑ کی فروخت کے بارے میں اچھا خاصا باقاعدہ انتظام خاص کر احاطہ بمبئی کے نہری علاقوں میں موجود ہے۔ علیٰ ہذا بنگال میں سن کو امداد باہمی کے طریق پر فروخت کرنے کے بارے میں تجربے کیے جا رہے ہیں اور یہ تحریک بڑے امکانات رکھتی ہے۔ تقریباً بارہ انجمنیں عمدگی سے کام کر رہی ہیں اور ان سب کی فروخت کی ایک مشترکہ ایجنسی بنام "تھوک فروش انجمن کلکتہ"[3] موجود ہے۔ سن تمامتر رعیت سے خریدا جاتا ہے خواہ براہ راست یا بیوپاریوں کے ذریعے سے اور اس کی قیمت متعلقہ انجمن کی وساطت سے ادا کی جاتی اور قرضہ دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد سن کو یا تو کلکتے کی گرنی کے تفویض کیا جاتا ہے یا برآمد کرنے والی فرم کو دیا جاتا ہے جس کے ہاتھ اسے امداد باہمی کی تھوک فروش انجمن کے ذریعے سے فروخت کیا جا چکا ہے۔ فروخت کی تحریک خاص کر بمبئی کرناٹک میں اپنے پیر جما چکی ہے؛ چنانچہ یہاں کپاس کی فروخت کی انجمنوں کے علاوہ ایک ایک انجمن فروخت بمقام بیادگی (دھاڑواڑ) مرچوں کے لیے، بمقام پناتی (بلگام) تمباکو کے لیے، بمقام سرسی اور کمپٹا (شمالی کنڑا) چھالیہ کے لیے،

---

[1] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ (روئداد شہادت) جلد دوم حصہ دوم ص ۲۲ تا ص ۳۱

[2] دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ (۲۹۳)

[3] (Calicutta Wholesale Society)

اور بمقام آلور (دھاڑواڑ) چاول کے لیے قائم ہے[1]

۲۲۔ فروخت کے انتظام کی اصلاح و ترقی کی بعض شکلیں

جدید صنعت یہ چاہتی ہے کہ مال نمونے کے بالکل مطابق بھیجا جائے اور ہر سال یکسانی کے ساتھ تیار ہے چنانچہ جس وقت تک یہ شرائط پورے نہ ہوں اس وقت تک پیداوار دور کے مقاموں پر رہنے والے گاہکوں کے ہاتھ بڑے پیمانے پر فروخت نہیں کی جاسکتی جس سے کسان کو انتہائی ممکنہ فائدہ ہو۔ موجودہ زمانے میں کئی خرابیاں پائی جاتی ہیں: مثلاً جنس کو بھگونا اور اس میں آمیزش کرنا نہ صرف غلہ کوٹنے کے مقام پر بلکہ دلالوں اور بیوپاریوں کے گوداموں میں بھی۔ یہ محسوس کیا گیا ہے کہ ان خرابیوں کو دور کرنے کے لیے قانون وضع کرنا ضروری ہے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے ہندوستانی مرکزی کپاس کمیٹی کی سفارش پر کپاس کی نقل و حمل کا قانون اور روئی اوٹنے اور دبانے کے کارخانوں کا قانون علی الترتیب ۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۵ء میں منظور کیے گئے۔ اول الذکر قانون کے تحت (جس کا اطلاق موجودہ زمانے میں احاطہ ہائے مدراس و بمبئی اور بڑودہ، راج پیپلا اور اندور کی ریاستوں کے اہم کپاس کے رقبوں پر ہوتا ہے) صوبہ واری حکومت اس قابل ہوتی ہے کہ حفاظت کی غرض سے کپاس کے معین رقبوں کا اعلان کرے اور بجز اجازت ناموں کے تحت ان رقبوں کے باہر سے کپاس کی درآمد کو روکے۔ اس قانون کا مقصد یہ تھا کہ گھٹیا کپاس کو جو آمیزش کے اغراض کے لیے درآمد کی جاتی تھی اور جس کے نتیجے کے طور پر کپاس کی کئی قیمتی انواع کی نیک نامی خاک میں مل گئی تھی، محفوظ علاقے میں داخل ہونے سے روکا جائے۔ روئی اوٹنے اور دبانے کے کارخانوں کا قانون، جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، اول الذکر قانون کا ضمنی نتیجہ ہے اور اس کے تحت بنولے اوٹنے اور روئی دبانے کے کارخانوں کی کسی حد تک نگرانی اور روئی کی تمام گانٹھوں پر دبائی کے نشان اور سلسلے کے اعداد بنانے کا انتظام کیا گیا ہے تاکہ ان کے منبع کا سراغ لگانے میں سہولت ہو۔ کپاس کے متعلق

---

[1] دیکھو سنہا کا مضمون "فروخت بامداد باہمی" پر انڈین جرنل آف اکنامکس بابت جنوری ۱۹۲۶ء اور بنگال کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ ۱۶۹ و ۱۸۲۔

باب

ایک تیسرا قانون "بمبئی کے کپاس کے بازاروں کا قانون بابت ۱۹۲۷ء[1]" کے نام سے وضع کیا گیا ہے جو اگرچہ برار کے نمونے (یعنی برار کے کپاس اور غلے کے بازاروں کے قانون ۱۸۹۷ء[2]) پر مبنی ہے، لیکن بعض اعتبارات سے اس سے بھی آگے بڑھا ہوا ہے۔ یہ قانون اختیاری نوعیت رکھتا ہے اور کپاس کے کھلے بازاروں کے اعلان کی اجازت دیتا ہے جہاں کسان کی لائی ہوئی بے گانٹھ کی روئی کی تجارت مناسب ضوابط اور ذیلی قواعد کے تحت ہوتی ہے۔ ان قواعد و ضوابط کی پابندی کی نگرانی بازار کی کمیٹی کرتی ہے جس میں کسانوں کی نمایندگی ہوتی ہے۔ اس طرح ناجائز منہائیوں، جھوٹے ناپ تول اور ناواجب طور پر اونی قیمتوں کے طریقے جو کسان کی معاملے طے کرنے کی قوت کے نقصان اور جہالت کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، ان سے کسان کو بچانے کے لیے قواعد وضع کیے گئے ہیں۔ چنانچہ ان کے عمل درآمد کے باعث کسان اب اپنے موافق معاملہ طے کرنے کی توقع کر سکتا ہے۔ ایک اور فائدہ یہ ہے کہ ایسی تنظیم کی بدولت کسان کو خریداروں کی بڑی تعداد سے وہ تقرب حاصل ہو جاتا ہے جس کو کھلے بازاروں کی فروخت فروغ دیتی ہے۔ دوسرے صوبوں میں بھی ایسے منظم بازاروں کی تجویز کی تقلید فائدے کے ساتھ کی جا سکتی ہے۔

یہ فطری امر ہے کہ پہلے روئی کے بارے ہی میں فروخت کی باقاعدہ تنظیم کی ترقی کی جانب توجہ مبذول کی جاتی، اس لیے کہ روئی ہی اہم ترین تجارتی پیداوار ہے۔ لیکن مناسب یہ ہے کہ اس اصول کو دوسری پیداواروں کی حد تک بھی وسیع کیا جائے۔ بازار کی موجودہ تنظیم میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ فروخت کے حالات و شرائط مثلاً پیداوار اکھٹا کرنے، ذخیرہ کرنے، ڈھونے، اس میں الٹ پھیر کرنے اور ہر منزل میں قیمتوں کی ترکیب کا مفصل تجزیہ کرنے کے بارے میں معلومات کا فقدان ہے۔ اس قسم کی معلومات، فروخت کے انتظام کی اصلاح و ترقی کی اطمینان بخش پالیسی مرتب کرنے کے لیے ضروری ہے۔ ہندوستانی مرکزی کپاس کمیٹی نے کچھ سال پیشتر (۱۹۲۵ء تا ۱۹۲۶ء) میں کسانوں کی کپاس کی فروخت اور مالی امداد کے بارے میں کسی حد تک تحقیقات کی ہے اور ان کی رپورٹیں قابل قدر معلومات سے

---

[1] Bombay cotton Act.

[2] Berar cotton & Grain Market Act.

باب

پر ہیں[۱]۔ زرعی کمیشن نے فروخت کے متعلق تحقیق کرنے اور مطلوبہ عملے کی تربیت کرنے کی ضرورت پر شد و مد کے ساتھ زور دیا۔ اس نے یہ سفارش کی کہ ہر صوبے میں محکمۂ زراعت کے تحت فروخت کے انتظام کے لیے ایک ماہر افسر کا تقرر کیا جائے[۲]۔ بنک کاری کی مختلف صوبہ واری کمیٹیوں نے جن میں حیدر آباد جیسی بعض دیسی ریاستیں بھی شامل ہیں مختلف صوبوں کے فروخت کے حالات و انتظامات پر بہت کچھ توجہ دی ہے، اور ان کی رپورٹیں ہندوستان کے مختلف علاقوں کے فروخت کے متعدد مسائل پر بہت کچھ روشنی ڈالتی اور بتلاتی ہیں کہ فروخت کے انتظام کے حالات مختلف صوبوں میں اور مختلف قسموں کی پیداوار کے لیے ایک ہی صوبے میں کس طرح مختلف ہیں۔ بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی یہ سفارش کرتی ہے کہ صوبہ واری حکومتوں کو چاہیے کہ ہر صوبے میں آئین و قوانین وضع کر کے منظم بازار تیار کرنے کی غرض سے صوبہ واری محکمہ جات فروخت قایم کرنے کی تجاویز کو جانچیں۔ صوبہ واری محکمہ جات فروخت کو دوسرے کئی اہم فرائض بھی انجام دینے پڑیں گے۔ مثلاً گودام اور مال گھر تعمیر کرنے اور فروخت بہ امداد باہمی کا انتظام کرنے کی تجاویز کی ہمت افزائی کرنا، گھریلو صنعتوں کی پیداوار کے فروخت کرنے میں مدد دینا اور مختلف پیداواروں کے رعیت کے ہاتھ سے آخری بازار تک منتقل ہونے میں ان کی فروخت کو جو حالات و شرائط متعین کرتے ہیں ان کی تحقیق کرنا۔ افسر انتظام فروخت (مارکٹنگ افسر) کا ان محکموں سے بہت ہی قریبی تعلق ہوگا۔ بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی نے اس بات پر بھی مزید زور دیا کہ صوبہ واری فروخت کے محکموں کے اعمال و افعال میں اتحاد و نظم پیدا کرنے کی غرض سے خاص کر بیرونی ممالک کو برآمد کی جانے والی زرعی پیداوار کے بارے میں کسی نہ کسی مرکزی ایجنسی کا ہونا ضروری ہے تاکہ وہ صوبائی نظامات کو مشورے اور تحقیق کی شکل میں مدد دے سکے۔ زرعی تحقیق کی شاہی کونسل اس کام کو اگر ضرورت ہو تو ایک علحدہ محکمے کے

278

[۱] دیکھو مرکزی ہندوستانی کپاس کمیٹی کی عام رپورٹ اور انفرادی رپورٹیں "کسانوں کی کپاس کی فروخت اور مالی امداد کی آٹھ تحقیقاتوں کے" بارے میں۔

[۲] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ، فقرات ۳۴۷ و ۳۴۸۔

باب

ذریعے سے اچھی طرح انجام دے سکتی ہے۔[1]

۲۴۔ فروخت کا جدید انتظام

اگرچہ صوبائی حکومتوں نے ان سفارشوں کو منظور کرلیا جو زرعی کمیشن نے بازار کی تحقیق اور صوبہ واری محکمہ جات زراعت میں فروخت کے ماہر عہدہ داروں کے تقرر کے بارے میں پیش کی تھیں، لیکن مالی مشکلات نے ان حکومتوں کو معقول ترقی کرنے سے باز رکھا۔ حکومت ہند اس نتیجے پر پہنچی کہ مالی مشکلات کے زمانے میں اس مسئلے کے کل ہند پہلوؤں پر غور کرنے کی غرض سے مرکزی حکومت کی آمدنی سے رقم خرچ کرنا اس واقعے کے مدنظر حق بجانب تھا کہ زرعی پیداوار کی فروخت کے انتظام کی اصلاح و ترقی ملک کی عام معاشی بحالی کے حق میں مفید ثابت ہوتی ہے۔ ہندوستان کے مستقبل کی حفاظت کی خاطر بھی ایسا کرنا ضروری تھا، اس لیے کہ غیر ملکی مسابقت اپنی شدید صورت میں موجود تھی اور مسابقتی ملکوں کی جدید سائنسی اور معاشی ترقیوں کے نتیجے کے طور پر محسوس کی جارہی تھی۔ غرض صوبائی حکومتوں سے اور زرعی تحقیق کی شاہی کونسل کی مجلس مشاورت سے مشورہ کرنے کے بعد حکومت ہند نے نئی سمت میں پہلا قدم یہ اٹھایا کہ اپریل ۱۹۳۴ء میں مسٹر اے ام لونگ سٹون کو جو برطانیہ کی وزارت زراعت کے شعبۂ فروخت کے سینیئر عہدہ دار تھے، زرعی تحقیقاتی کونسل کا مشیر زراعت برائے فروخت مقرر کیا۔ زرعی پیداوار کی فروخت کا مسئلہ صوبہ وار معاشی کانفرنس میں بھی زیر غور رہا جو اپریل ۱۹۳۴ء میں منعقد ہوئی، اور اس بات پر عام طور پر اتفاق کیا گیا کہ زرعی پیداوار (صرف فصلوں کی پیداوار بلکہ مویشیوں کی پیداوار)

[1] دیکھو نمبر ۔ ۔ کلاتھ کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، فقرات (۲۸۴ تا ۲۸۶) ۲۸۹۰۔ کمیٹی یہ بھی سفارش کرتی ہے کہ جرمنی اور اکثر دوسرے ممالک کی طرح یہاں بھی صوبہ داری یا علاقہ داری بنیاد پر ایوان ہائے زراعت قائم کیے جائیں۔ یہ ایوان ایک ایسے مشترکہ بحث مباحثے کے مقام کا کام دیں گے جہاں ماہران زراعت، زرعی مالیہ، پیدائش اور فروخت کے متعلق مسائل پر اپنے خیالات کے اظہار اور غور و فکر کے بعد صنعت کی ترقی کے بارے میں عمدہ راہ عمل تیار کرسکیں گے۔

فروخت کی سہولتیں مہیا کرنے کے لئے ایک تدریجی پروگرام تیار کیا جائے،
اس لئے کہ اس کے متعلق یہ توقع تھی کہ اس سے بہترین ممکنہ نتائج پیدا ہوں گے۔
کمیشن نے حسب ذیل طریقوں پر کام کرنے کی سفارش کی :- ہندوستانی
پیداوار کے لیے غیر ملکی بازاروں میں معلومات کی اشاعت اور پروپگنڈا؛
اور خاص پیداواروں کی درجہ بندی، ان کا ذخیرہ کرنے اور حفاظت کا
انتظام؛ گلنے سڑنے والی چیزوں کے لیے خاص بازار کا انتظام؛ ہندوستان کے
اندر اور باہر کے صارفوں کی ضرورتوں کی اطلاع ہندوستان کے پیداکنندوں کو؛
مال کی تنظیم خوبی اور طلب کی بنیاد پر؛ منظم بازاروں کا قائم کرنا اور ترقی دینا؛
ہندوستان بھر کے لیے ایک مشترک خاکہ مرتب کرنے اور پوری طرح منظم
"مستقبل" کے بازاروں، اشیا کے صرافوں اور ذخیرہ گھروں کو قائم کرنے کی
غرض سے بازاروں کی تحقیق کرنا۔ حکومت ہند نے ایک قرارداد میں جو
جولائی ۱۹۳۴ء کو جاری کی گئی پیداوار کی فروخت کے انتظام کے بارے میں
کمیشن کی سفارش کے مطابق اپنی جدید پالسی کا اعلان کیا تاکہ مختلف صوبے
اور دیسی ریاستیں مل کر اس پر عمل کریں[1]۔ اس غرض کے لیے انتظام فروخت
کا مرکزی اور صوبہ داری عملہ بھی مقرر ہو چکا ہے۔ مرکزی عملے میں زرعی پیداوار کی
فروخت کے لیے ایک مشیر، سات سینیر افسران فروخت اور دس مددگار افسران فروخت
شامل ہیں۔ صوبہ داری عملہ ایک سینیر افسر فروخت اور جونیر افسران فروخت پر
مشتمل ہے۔ مرکزی حکومت دو لاکھ روپے سالانہ کے صوبائی مصارف
پانچ سال کی مدت کے لیے برداشت کرے گی۔

مرکزی اور صوبائی عملۂ فروخت مشترک طور پر جو کام انجام دیں گے وہ
تین بڑی قسموں میں تقسیم ہوتا ہے: (۱) تحقیقاتی کام؛ (۲) اصلاح و ترقی کا کام؛
اور (۳) درجہ واری معیار بندی کا کام۔ تحقیقاتی کام میں اناج، روغن دار تخم،

[1] اس جدید پالسی میں شاہی زرعی کمیشن کی ان سفارشوں پر وسیع حد تک عمل کیا گیا ہے
جن کو مرکزی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی نے عام طور پر پسند کیا تھا۔

باب

تمباکو، ریشے اور میوے جیسی زیادہ اہم اشیا اور حیوانات اور شیر خانے کی پیداوار اور مویشیوں کی فروخت کے متعلق سلسلہ وار تحقیق شامل ہے۔ بعض عام مسائل مثلاً منظم بازاروں، اشیا کی نقل و حمل، ان کے ذخیرہ کرنے اور محفوظ رکھنے کے مسائل کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ جس وقت فروخت کے حالات کی تحقیق مکمل ہو جائے گی اس وقت یہ بات مفصل طور پر معلوم ہو گی کہ انفرادی طور پر تمام صوبوں کے بارے میں اور مختلف صوبوں اور مختلف ریاستوں کے درمیان متعلقہ اشیا کی فروخت کا موجودہ طریقہ کیا ہے اور ان کی تجارت خارجہ کی کیا حالت ہے، اور اس طرح کل ہندوستان کے موجودہ حالات کا نقشہ اور

280

اس کی مستقبل ترقی کی ایک مشترک بنیاد ہمارے سامنے ہو گی۔ فروخت کے حالات کی تحقیقاتی رپورٹوں میں ضروری اور قابل عمل اصلاح و ترقی کے متعلق تجاویز بھی پیش کی جائیں گی جن کو عملی جامہ پہنانے کا کام مرکزی و صوبائی عملہ ہائے فروخت کے درمیان تقسیم ہو گا۔ اور تحقیقات کے خاکے کی تیاری، مواد کی فراہمی اور نتائج کی ترتیب کا کام مرکزی عملے کے متعلق ہو گا۔ رہا نشو و نما اور ترقی کا کام تو ظاہر ہے کہ اس کا انحصار فروخت کے حالات کی تحقیقات کے نتائج پر ہو گا، اور اس میں صارفوں کی ضرورتوں سے پیدا کنندوں اور تاجروں کو باخبر رکھنے کی غرض سے پیش کی ہوئی سفارشوں میں سے کسی کا مظاہرہ، اور معیاری قسموں اور معیاری ناپ تول کا رواج وغیرہ شامل ہو گا۔ بعض صورتوں میں انڈوں اور میووں جیسی اشیا کے بحفاظت روانہ کرنے کے چھوٹے اسٹیشن قائم کیے جا سکتے ہیں تاکہ اسبات کا مظاہرہ کیا جائے کہ چھوٹی بڑی اشیا کو چھانٹ کر الگ کرنے، مختلف درجے اور قسمیں قائم کرنے، اور ان کو بحفاظت بند کر کے بھیجنے کا کیا طریقہ ہے اور نئے معیار اور اوزان سے کام لینے کے تجارتی فوائد کیا ہیں۔ ہر شئے کی نشو و نما و ترقی کا کام زیادہ تر صوبائی عملۂ فروخت کو کرنا پڑے گا۔ درجہ واری معیار بندی کا کام فنی نوعیت کا ہو گا جو روغن دار تخموں، غلے، میوہ وغیرہ جیسی پیداوار کی طبیعی اور کیمیائی خصوصیات، اور عملی حالات کے تحت درجہ بندی کے طریقے اور ساز و سامان

کے متعلق ہوگا۔ یہ امر اطمینان بخش ہے کہ اکثر ہندوستانی ریاستوں نے بھی زرعی پیداوار کی فروخت کے انتظام کی اصلاح و ترقی کے بارے میں اپنے تعاون کا پیشکش کیا ہے۔ یہ توقع کی جاتی ہے کہ اس طرح جو عظیم الشان متحدہ کوشش شروع کی گئی ہے یقینیاً طور پر ایسے نتائج پیدا کرے گی جو ہندوستانی کسانوں کے حق میں بالعموم نہایت مفید ہوں گے۔[1]

۲۴۔ ذخیرہ گھروں، اور معیاری اوزان اور پیمانوں وغیرہ کی ضرورت

فروخت کے انتظام کی ایک اور اصلاح و ترقی جس طرح ہو سکتی ہے کہ اشیا ذخیرہ کرنے کے لیے مناسب گودام تیار کرائے جائیں اور کسانوں کو ذخیرہ گھر کے صداقت نامے جاری کیے جائیں اور ان کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ ان صداقت ناموں کی کفالت پر امداد باہمی کے بنکوں اور دوسرے بنکوں سے پیشگی زر حاصل کرسکیں۔ اس کی بدولت کسان اپنی پیداوار کو قیمتوں میں موافق تغیر ہونے تک اپنے ہاں رکھنے کے قابل ہو جائے گا۔ اس سلسلے میں ہم اجازت یافتہ مال گھروں کے امریکن طریق پر اور چھوٹے کسانوں کی امداد کی غرض سے کپاس کی ضمانت و کفالت پر قرضے دینے کی مصری تجویز پر توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں۔[2] بنک کاری کی مختلف صوبہ واری کمیٹیوں کی رپورٹیں، ہندوستانی حالات کے بارے میں ان دونوں تجاویز کا اطلاق کرنے کے مسئلے پر بہت کچھ روشنی ڈالتی ہیں اور ذخیرہ گھروں کو اجازت دینے اور دوسرے طریقوں سے ان کی نگرانی کرنے کے لیے قانون وضع کرنے کے بارے میں مختلف رائیں پیش کرتی ہیں؛ مثلاً پنجاب کی کمیٹی یہ رائے ظاہر کرتی ہے کہ بزمانۂ موجودہ ذخیرہ گھروں کا قیام قبل از وقت ہے، لیکن ممکن ہے کہ

281

[1] دیکھو حکومت ہند کا رزولوشن مورخہ ۵ مئی ۱۹۳۴ء ایک رپورٹ بنام "روئیداد صوبائی معاشی کانفرنس" شائع شدہ ۱۹۳۴ء؛ اور "انڈین ایر بک" شائع شدہ ۱۹۳۵ء، ص ۳۰۴۔

[2] دیکھو یادداشت جو چھوٹے کسان کی امداد کی غرض سے کپاس کی کفالت پر قرضے دینے کی مصری تجویز کے بارے میں پیش کی گئی تھی اور جس پر ہندوستانی مرکزی کپاس کمیٹی نے جولائی ۱۹۲۹ء میں غور کیا تھا۔

باب

آیندہ چل کر ان کی ضرورت ہو۔[1] اس کے برخلاف بمبئی کی کمیٹی یہ سفارش کرتی ہے کہ آزمایش اور ابتدا کے طور پر چند اہم مرکزوں میں اجازت یافتہ ذخیرہ گھر قایم کیے جائیں۔[2] بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی اس سلسلے میں کئی مفید سفارشیں پیش کرتی ہے۔ وہ یہ خیال ظاہر کرتی ہے کہ صوبہ وار حکومتوں کو چاہیے کہ خانگی ایجنسیوں کے ذریعے سے ذخیرہ گھر مہیا کرنے، ان کو اجازت عطا کرنے اور ان کی تعمیر کی غرض سے سرمایہ فراہم کرنے کے مسئلے کو اپنے ہاتھوں میں لیں، اور زرعی تحقیقات کی شاہی کونسل کو چاہیے کہ ان حکومتوں کے ساتھ تعامل اور تعاون کرے۔ ریلوں کے ذخیرہ گھر قائم کرنے کا مسئلہ ریلوے بورڈ کے زیر انتظام طے ہونا چاہیے اور ہندوستانی ریلوں سے استدعا کرنی چاہیے کہ وہ تخم مرکزوں میں تجربوں کا آغاز کریں۔ صوبہ واری حکومتوں کو چاہیے کہ انجمن ہائے امداد باہمی کو رعایتی شرح سود پر طویل مدت کے قرضے دیں تاکہ وہ ایسے مرکزوں میں گودام تعمیر کر سکیں جو اچھی منڈیوں کا کام دیں۔[3] عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ہندوستان میں "مصر کی کپاس کی اسکیم" کو اختیار کرنا قبل از وقت ہے، اس لیے کہ اول تو مصر ہی میں اس کا افادہ بین طور پر ظاہر نہیں ہوا ہے اور دوسرے یہ کہ موجودہ حالات میں یہ ہرگز مناسب نہیں ہے کہ چھوٹے کسان کی ہمت افزائی کی جائے کہ وہ اپنی پیداوار کو قیمت بڑھنے کی امید میں بڑی مدت تک روک رکھے۔[4]

ایک اور بہت ہی ضروری اصلاح اوزان اور پیمانوں کی معیاریت ہے۔ چنانچہ اس پر زرعی کمیشن، مختلف صوبوں کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹیوں اور بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی نے بہت زور دیا ہے۔ اس سلسلے میں صوبۂ متوسط کے "اوزان اور پیمانوں کے قانون" منظورہ ۱۹۲۶ء کی جانب توجہ مبذول کرانا

[1] دیکھو پنجاب کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ (۹۲)

[2] دیکھو بمبئی کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ (۱۵۱)

[3] دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ (۲۷۹ تا ۲۸۲)

[4] دیکھو پنجاب کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ (۹۳) اور صوبۂ متوسط و برار کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ (۱۰۸۵)۔

باب ۸

مناسب ہوگا جس میں اوزان اور پیمانوں کی اکائیاں مقرر کی گئی ہیں اور حکومت کو مجاز گردانا گیا ہے کہ اس قانون کے اغراض کے لیے خاص رقبوں کا اعلان کر کے معیارت قائم کرے۔ حال ہی میں (یعنی ۱۹۳۵ء میں) اس قسم کا ایک قانون احاطۂ بمبئی میں بھی نافذ ہوا ہے۔ صوبۂ متوسط کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی اس تجویز کو پسند کرتے ہوئے یہ توقع ظاہر کرتی ہے کہ حکومت کے لیے یہ ممکن ہوگا کہ وہ جلد دیہی حکام کو معیاری اوزان اور پیمانے مہیا کرے اور اگر ضرورت ہو تو اس غرض کے لیے خفیف سا محصول (ابواب) بھی عائد کرے[1]۔

2/32 غلے کے "بالاگودام"[2] کے طریقے کے بارے میں یہاں کچھ کہنا مناسب ہوگا۔ بالاگودام لازمی طور پر ایک درجہ واری گودام ہے، اور اس کی تعریف حسب ذیل کی گئی ہے:۔ "وہ ایک شفاخانہ ہے بھیگے ہوئے غلے کو خشک کرنے، خس و خاشاک سے پاک کرنے، کونپلوں سے کاٹ چھانٹ کر الگ کرنے، گلے سڑے غلے کو صاف کرنے، اس کی ظاہری شکل کی اصلاح و ترقی کی غرض سے اس کو موسمی حالات کے مطابق رکھنے اور اس کے اوصاف برقرار رکھنے کا۔" دوسرے الفاظ میں بالاگودام میں غلہ کو خاص کر بین الاقوامی تجارت کے نقطۂ نظر سے اور کسان کے بیش ترین فائدے کے زاویۂ نگاہ سے پوری طرح قابل فروخت حالت میں رکھا جاتا ہے۔ کھلے مال اور ڈھیروں کے ڈھونے کے طریقے کے رواج، چھکڑوں کی زو دروی اور غالبًا سال تمام آمد و رفت کی زیادہ مساویانہ تقسیم کی بدولت گودام کے انتظام اور کام میں بڑی حد تک کفایت ہوتی ہے۔ موجودہ زمانے میں ہندوستان میں صرف ایک ہی بالاگودام ہے جو ضلع لیال پور پنجاب میں واقع ہے۔ حکومت نے خاص کر حال کے اس تجربے کے مدنظر کہ غلے کے موسم میں ریلوں پر یورش ہوتی ہے ہندوستانی غلے کو مناسب طریقے پر رکھنے کے مسئلے کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔

تجارت برآمد کی حد تک زرعی کمیشن جدید وضع کے بالاگودام کے طریقے کو رائج

---

[1] دیکھو صوبۂ متوسط و برار کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ (۱۰۶)۔

[2] (Elevator)

کرنے کی تائید نہیں کرتا، خاص کر اس امر کے مدنظر کہ بڑی جنگ کے بعد کے زمانے میں کراچی سے گیہوں کی برآمد (جو سب غلوں سے زیادہ متاثر ہوا) بہت کم ہو گئی۔ اس طریقے کے مصارف بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہندوستانی گیہوں کی مانگ جون اور جولائی میں بہت زیادہ ہوتی ہے، اس لیے کہ وہ اس زمانے میں دوسرے ذرائع سے آنے والی رسد کی کمی پورا کرتا ہے۔ اس لحاظ سے جدید وضع کے بالاگودام کا طریقہ پورے سال میں برآمد کو یکساں حالت میں نہیں رکھ سکتا۔ تجارت داخلہ کی حد تک، کمیشن مذکور بتلاتا ہے کہ اس مسئلے کے زرعی اور تجارتی پہلوؤں کی کافی جانچ نہیں کی گئی ہے۔ کسانوں کی ناخواندگی، ان کی قلیل اور منتشر پیداوار، مطلوبہ قسموں کی بڑی تعداد، اور ذیلی عملے کی نگرانی و تربیت کی مشکلات، یہ سب زبردست رکاوٹ پیدا کرتی ہیں۔ ممکن ہے کہ بند سکر اور پنجاب کی آب رسانی کی مختلف تجاویز مکمل ہو جانے کے بعد جدید وضع کے بالاگودام کا طریقہ قابل عمل بن جائے[1]۔

---

[1] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ، فقرہ (۳۴۴)۔

283

باب ۹

دیہی قرض داری

ا۔ دیہی قرضداری ایک نازک اور اہم مسئلہ ہے

زمین کی زرخیزی، محنت کی افراط اور معتد بہ موروثی زرعی مہارت کے اعتبار سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے ہندوستان کو ایک خوش حال زرعی ملک بنایا ہے۔ تاہم ہندوستانی زراعت بہت ہی پسماندہ حالت میں ہے اور ہندوستان کے متوسط درجے کے کسان کی حالت نہایت خستہ وخراب ہے۔ یہ بات عام طور پر تسلیم کر لی گئی ہے کہ اس صورت حال کے اہم اسباب میں سے ایک یہ ہے کہ قرضوں کا بوجھ اسے پیسے ڈال رہا ہے۔ جیسا کہ مسٹر ایچ، ولف لکھتے ہیں :۔ ''سارا ملک مہاجن کے پنجے میں پھنسا ہوا ہے، اور قرضے کی زنجیریں زراعت کی راہ میں رکاوٹ پیدا کر رہی ہیں''[1] بھاری قرض داری، جس کا بڑا حصہ غیر پیداآور ہے، ہر جہت میں اصلاح و ترقی کو روکتا ہے اور ہندوستان کی زرعی معیشت کے اہم ترین مسائل میں سے ایک ہے۔

[1] دیکھو۔ ایچ، ولف کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان میں امداد باہمی"۔ صفحہ ۳۔

باب

۲۔ قرضداری کی وسعت: ابتدائی تحقیقات

سنہ ۱۸۷۵ء میں دکن کا بلوہ کمیشن، ضلع احمد نگر واقع بمبئی کے بارہ مواضع کی صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچا کہ سرکاری زمین کے قابضوں کا ایک تہائی حصہ قرضے کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا، یہ کہ ان قرضوں کی مقدار کا اوسط شخصہ آملی سے اٹھارہ گنا زیادہ تھا، دو تہائی قرضہ زمین کو رہن کرکے حاصل کیا گیا تھا اور قرضے کی اوسط مقدار فی قابض ۳۷۱ روپیہ تھی۔

سنہ ۱۸۸۰ء کے قحط کمیشن نے ہندوستان کے طول وعرض سے شہادتیں فراہم کرکے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ زمینداروں کی جماعت کا ایک تہائی حصہ قرض کے جال میں پھنسا ہوا تھا جس سے اس کا نکلنا غیر ممکن تھا، اور کم از کم اسی کے مساوی تعداد اگرچہ قرضے میں مبتلا تھی، لیکن اس کی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ خود کو سنبھال نہ سکتی۔ سنہ ۱۸۹۵ء میں سر فریڈرک نکل سن نے یہ اندازہ کیا تھا کہ مدراس کے دیہی قرضے کی مجموعی مقدار ۴۵ کروڑ روپیہ تھی۔

سنہ ۱۹۰۱ء کا قحط کمیشن اس نتیجے پر پہنچا کہ بمبئی کے کسانوں کی ایک چوتھائی تعداد اپنی زمینوں کی ملکیت سے محروم ہوگئی تھی، $\frac{1}{5}$ سے کچھ ہی کم تعداد قرضے سے بچی ہوئی تھی اور باقی سب کم وبیش قرضوں میں مبتلا تھے۔

سر ایڈورڈ میک لاگن نے نکل سن کے مدراس کے اندازے کی بنیاد پر یہ اندازہ لگایا کہ برطانوی ہند کی زرعی قرضداری کی مجموعی مقدار ۳۰۰ کروڑ روپیہ تھی۔ ام، ال، ڈارلنگ تیس سال سے زائد مدت پیشتر کے مدراس کے عدد کے مقابلے میں موجودہ زمانے کے پنجاب کے عدد کو زیادہ مستند و مرجح قرار دیتے ہوئے یہ حساب لگاتے ہیں کہ برطانوی ہند مجموعی حیثیت سے ۶۰۰ کروڑ روپیہ کا قرضدار ہے۔" پنجاب کی قرضداری کا اندازہ ۹۰ کروڑ روپیہ کیا گیا ہے جو اس صوبے کی زمین کی مالگزاری سے ۱۹ گونہ زیادہ ہے۔ اگر برطانوی ہند بہ شمول برما کی سنہ ۱۹۲۳ء تا سنہ ۱۹۲۴ء کی مالگزاری (یعنی ۳۵ء۴۵ کروڑ روپیہ) پر اس مضاعف کا اطلاق کیا جائے تو، قرضے کی مجموعی مقدار ۶۷۴ کروڑ روپیہ نکلتی ہے۔ لیکن یہ خیال کرنے کا معقول سبب ہے کہ دیہی

284

باب ۹

ہندوستان کے دوسرے اکثر علاقوں کے مقابلے میں پنجاب بہت زیادہ مقروض ہے۔ چنانچہ اکثر امور اس نتیجے کی جانب اشارہ کرتے ہیں؛ مثلاً ایک تو قرض دہندوں کی تعداد جس کا پنجاب میں آبادی سے تناسب، باقی برطانوی ہند کے مقابلے میں تین گو نہ زائد ہے؛ اور دوسرے وہ مخصوص قوانین جو قرض دہندے کے مقابلے میں کسان کو محفوظ رکھنے کے لیے وضع کرنے پڑے۔ اس لحاظ سے یہ زیادہ محفوظ ہوگا کہ ۹ اکا مضاعف لینے کی بجائے ۷ اکا مضاعف لیا جائے۔ چنانچہ اس کی بنا پر قرضے کی مجموعی مقدار ۶۰۳ کروڑ روپیہ ہوتی ہے۔ یہ مقدار بھی غالباً زیادہ ہی ہے اس لیے کہ جہاں کہیں دوامی بندوبست ہے وہاں کی مالگزاری دوسرے مقامات کے مقابلے میں بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ برطانوی ہند کی مالگزاری کا جو عدد لیا گیا ہے اس میں وہ مالگزاری شامل نہیں ہے جس سے منتقل الیہ یا قائم مقام متمتع ہوتے ہیں، اگرچہ پنجاب میں یہ شامل کی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں اگر ہم پنجاب کے عدد کا اطلاق آبادی کے اعتبار سے کریں تو مجموعی مقدار ۸۰۰ اکرور ہوتی ہے؛ اس لیے کہ پنجاب کی دیہی آبادی، برطانوی ہند کی دیہی آبادی کے مقابلے میں محض ۱ : ۱۲ کا تناسب رکھتی ہے۔ اس لحاظ سے بالکل امتحانی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ برطانوی ہند کے دیہی قرضے کی مجموعی مقدار اس کی ۲۴۷ ملین آبادی کے لیے ۶۰۰ کرور روپیہ سے کم نہیں ہے۔[1]

گو مولۂ بالا تحقیقات بلاشبہ منتشر مقامات کے متعلق تھی اور اس کا کچھ حصہ کافی وسیع نہ تھا، لیکن اگر بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو وہ دیہی ہندوستان میں قرض داری سے پیدا ہونے والی مشکلات کی نزاکت کو کافی واضح طور پر ثابت کرتی ہے۔ بنک کاری کی مختلف صوبہ واری تحقیقاتی کمیٹیوں کی حالیہ تحقیقات کے نتیجے کے طور پر زیادہ جامع انداز سے مرتب ہوئے ہیں جو نہ صرف اس عام خیال کی تصدیق کرتے ہیں جو ابتدائی تحقیقات کی بنا پر ذہن میں قائم ہوا تھا

[1] دیکھو ڈارلنگ کی کتاب مولۂ بالا (۱۹۲۸ء کا ایڈیشن) ص ۱۷؛ نیز دیکھو ۱۹۳۲ء کا ایڈیشن ص ۱۸ تا ص ۱۹۔

بلکہ اس میں ایک حد تک قطعیت بھی پیدا کرتے ہیں۔[1]

۳۔ زرعی قرضداری کا اندازہ بنک کاری کی صوبہ وار تحقیقاتی کمیٹیوں کی نظر میں۔

ہم ذیل میں دیہی قرض داری کے اندازے پیش کرتے ہیں جو بنک کاری کی مختلف صوبہ واری تحقیقاتی کمیٹیوں کی ۱۹۳۰ء میں شایع شدہ رپورٹوں سے ماخوذ ہیں۔[2]

(۱) بمبئی:۔ بشمول سندھ کل صوبے کی زرعی قرضے کی مجموعی مقدار کا اندازہ ۱۸۰ کروڑ روپیہ کیا گیا ہے۔ قرضے کی مقدار، زمین کی مشخصہ مالگزاری سے پندرہ گونہ زیادہ ہے اور صوبے کی مجموعی زرعی پیداوار کی اوسط مالیت کا تقریباً ۳۵ فی صد ہے۔ قرضے کا اوسط فی خاندان ۳۲۹ روپیہ نکلتا ہے۔ غیر مقروض خاندانوں کا فی صد سندھ میں ۱۲، شمالی گجرات میں ۱۲، جنوبی گجرات میں ۲۳ اور کنکان میں ۲۹ ہے، (دیکھو رپورٹ کے فقرات ۴۹ تا ۵۰ اور ۵۴)

(۲) مدراس:۔ مدراس کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ یہ خیال ظاہر کرتی ہے کہ سال بھر کے قرضے کی مجموعی مقدار زیادہ سے زیادہ تقریباً ۵۰ کروڑ روپیہ ہے اور سال بہ سال جاری رہنے والے قرضے کی مقدار موجودہ زمانے میں تقریباً ۲۰ کروڑ روپیہ ہے۔ احاطۂ مدراس کا اوسط قرضہ بحساب فی روپیہ مشخصہ مالگزاری ۱۹ روپے ہے: (دیکھو فقرات ۹۶ اور ۹۸)

(۳) بنگال:۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ کل بنگال کے زرعی قرضے کی مجموعی مقدار ۱۰۰ کروڑ ہے۔ اوسط قرضہ بحساب فی زرعی خاندان ۱۶۰ روپیہ ہے؛

[1] زرعی کمیشن یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ محکمۂ امداد باہمی کو چاہئے کہ زر کے لین دین پر میعادی رپورٹیں مرتب اور جاری کرے، تاکہ دیہی قرضداری کے مختلف پہلوؤں پر کچھ روشنی پڑے۔ دیکھو کمیشن کی رپورٹ (فقرہ ۳۶۰)

[2] مختلف صوبوں میں زرعی قرضے کا اندازہ کرنے کی غرض سے جو طریقے اختیار کئے گئے تھے ان کی تفصیلات کے متعلق بنک کاری کی مختلف صوبہ وار تحقیقاتی کمیٹیوں کی رپورٹیں ملاحظہ کی جائیں۔ رپورٹوں میں اس امر کو واضح کر دیا گیا ہے کہ یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ اندازے بالکل صحیح ہیں، لیکن وہ اس اعتبار سے مفید ہیں کہ قرضداری کی مجموعی مقدار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

بار

(دیکھو فقرہ ۹۰ متعلقہ رپورٹ میں)۔

(۴) صوبۂ متحدہ :۔ صوبۂ متحدہ کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کل صوبے کے زمینداروں، ملکی کاشت کاروں اور کسانوں کے قرضے کی مجموعی مقدار ایک بستہ رقم کی شکل میں ۱۲۴ کرور روپیہ ہے" (دیکھو رپورٹ کا ضمیمہ نمبر ۲)۔

(۵) پنجاب :۔ پنجاب کے متعلق یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ اس کے زرعی قرضے کی مجموعی مقدار سنہ ۱۹۲۱ء کے ۹۰ کرور کے مقابلے میں سنہ ۱۹۲۹ء میں ۱۳۵ کرور تھی، جس سے اول الذکر سال کے مقابلے میں ۵۰ فی صد کا اضافہ ظاہر ہوتا ہے۔ مالگزاری کے مقابلے میں قرضے کا تناسب سنہ ۱۹۲۱ء کے ۱ : ۹ کے مقابلے میں سنہ ۱۹۲۹ء میں ۱ : ۲۷ تھا۔ زراعت پر گزارہ کرنے والوں میں قرضے کی مقدار بحساب فی کس سنہ ۱۹۲۱ء کے ۷۶ روپے کے مقابلے میں سنہ ۱۹۲۹ء میں ۱۰۴ روپے تھی۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں قرضے کی مقدار فی مزروعہ ایکڑ کے حساب سے ۳۱ روپے تھی جو سنہ ۱۹۲۹ء میں بڑھ کر ۴۵ روپے ہوگئی"۔ (دیکھو فقرہ ۲۲)۔

(۶) صوبۂ متوسط و برار :۔ اس صوبے کے قرضے کی مجموعی مقدار ½۳۶ کرور روپیہ ہے، جو معمولی مجموعی خام پیداوار کی مالیت کا تقریباً ۴۹ فی صد ہے۔ سود کے مطالبات کی مقدار مالگزاری کے مجموعی مطالبات سے ½۲ گونہ زیادہ ہے، اور زرعی آمدنی کی اوسط بچت کے ¼ سے بھی زیادہ ہے۔ کسانوں کے قرضے کی مجموعی مقدار ۲۲۷ روپیہ فی خاندان ہے" (دیکھو فقرات ۴۳، ۶۳ و ۶۵ تا ۶۴)۔

(۷) بہار و اڑیسہ :۔ کل صوبے کی دیہی قرضداری کی مجموعی مقدار کا اندازہ معتبر طریقے پر ۱۵۵ کرور روپیہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ خیال کرنا حق بجانب ہوگا کہ اس کے منجملہ زمینداروں کا قرضہ ۲۴ کرور روپیہ معمولی کسانوں کو خارج کرکے دوسرے دیہی گھرانوں کا قرضہ ۲ کرور روپیہ اور معمولی کسانوں کا قرضہ ۱۲۹ کرور روپیہ ہے" (دیکھو فقرہ ۹۰)۔

(۸) آسام :۔ آسام کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی یہ اندازہ کرتی ہے کہ

باب 286

میدانی علاقوں کی زرعی قرض داری کی مجموعی مقدار ۲۲ کروڑ روپے سے کچھ زائد ہوگی۔ یہ قرضہ سالانہ مالگزاری سے ۱۲ گونہ زیادہ ہے۔ اوسط قرضہ فی خاندان ۲۴۲ روپیہ ہے۔ جملہ خاندانوں میں صرف ۱۵ فی صد قرض سے بچے ہوئے ہیں' (دیکھو فقرہ ۳۲)۔

(۹) برما:- برما کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی یہ خیال ظاہر کرتی ہے کہ اس صوبے کی قرض داری کی مجموعی مقدار کا اندازہ ۵۰ تا ۶۰ کروڑ روپیہ حق بجانب معلوم ہوتا ہے' (دیکھو فقرہ ۱۰۳)۔

(۱۰) مرکزی رقبہ جات :- مرکزی نظم و نسق کے تحت کے رقبوں کی قرض داری کی مجموعی مقدار کا اندازہ ۱۰ کروڑ روپیہ کیا گیا ہے۔

(۱۱) کورگ :- اس کی قرض داری کا اندازہ ۳۵ اور ۵۵ لاکھ کے درمیان کیا گیا ہے۔

ان تخمینوں سے ظاہر ہوگا کہ برطانوی ہند کے صوبوں کی زرعی قرضداری کی مجموعی مقدار ۹۰۰ کروڑ روپیہ کے لگ بھگ ہے' اگرچہ ان کی بابت کامل صحت کا کوئی ادعا نہیں کیا جا سکتا۔ پنجاب کے اعداد سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ سال ادھر سے دیہی قرض داری میں خاصا اضافہ ہوا ہے اور اس کو ملک کی حقیقی صورت حال کا آئینہ خیال کیا جا سکتا ہے۔ سنہ ۱۹۲۱ء سے فصلوں کی قیمتوں کی کمی کے مدنظر خاص کر اکتوبر سنہ ۱۹۲۹ء کے بعد سے' قرضداری کا بار بہت بڑھ گیا ہے جس کے نیچے کسان بری طرح دبا جا رہا ہے۔[1]

لیکن قرضے کا خطرناک ہونا نہ تو اس کی مقدار میں مضمر ہے' اور نہ اس کی ترقی کی رفتار میں؛ اس لیے کہ فی نفسہ یہ دونوں چیزیں ملک کی وسعت پر نظر کرتے ہوئے نہ تو خوف و ہراس کے قابل ہیں اور نہ دوسرے ملکوں میں بے نظیر ہیں۔ پریشانی اور فکر کا اصل سبب یہ ہے کہ قرضے کا بیشتر حصہ غیر پیدا آور ہے۔ چنانچہ بقول ڈارلنگ پنجاب میں زمین کی اصلاح و ترقی کی غرض سے لیے ہوئے قرضے کا

---

[1] دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ (۷۷)

تناسب ۱۵ فی صد سے بھی کم ہے۔ غیر پیدا آور قرضے کے نقائص میں سے ایک یہ ہے کہ وہ خود بخود بڑھتا چلا جاتا ہے۔ پیدا آور قرضہ زمین کو زرخیز بنا کر اپنی ادائی کا ذریعہ خود ہی مہیا کر لیتا ہے؛ لیکن غیر پیدا آور قرضہ بمشکل ادا ہو سکتا ہے[1]۔

۴۔ **قرض داری کے اسباب**[2] اگر قرضداری افلاس کا باعث ہے تو اس کا بالعکس بھی مساوی طور پر صحیح ہے۔ اس لحاظ سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ قرضداری کی توجیہ کے سلسلے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ بڑی حد تک ہندوستان کی دیہی آبادی کے افلاس کی بھی توجیہ کر دیتا ہے۔ چنانچہ دیہی قرض داری کے اہم اسباب حسب ذیل بیان کئے جا سکتے ہیں:-

(۱) زمین پر آبادی کا انتہائی دباؤ۔
(۲) تقسیم و انتشار اراضی۔
(۳) گھریلو صنعتوں کا زوال اور خالی رہنے کے زمانے میں ذیلی پیشے کی عدم موجودگی کے باعث رعیت کو آمدنی کا ٹوٹا[3]۔
(۴) رعیت کی صحت کی خرابی۔ بعض موسموں میں ملیریا جیسے امراض کسان کو ایسے زمانے میں جبری بے کاری میں مبتلا

---

[1] دیکھو بنگال کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ (فقرہ ۱۰۴)۔
"زرعی قرضداری کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اکثر صورتوں میں وہ مصیبت کی علامت ہوتی ہے اور یہ کہ برخلاف دوسری صنعتوں میں روزمرہ کا معمولات میں داخل ہے۔ چونکہ قرضے زیادہ تر غیر پیدا آور اغراض کے لیے حاصل کئے جاتے ہیں اس لیے رعیت پر قرضداری کا دباؤ بہت شدت کے ساتھ پڑتا ہے۔ قرضے کی مقدار بڑی ہونے کے معنی لازمی طور پر یہ نہیں ہیں کہ اتنا ہی معقول مقدار میں جس کی بنا پر پیدا آوری بڑھے۔ چنانچہ اسی میں قرضداری کی تباہ کن کار راز مضمر ہے۔ اگر قرضہ محض اعتبار کی دوسری شکل ہوتا جیسا کہ اس کو ہونا چاہئے تو قرضداری کا مسئلہ بہت آسانی کے ساتھ حل ہو جاتا۔"
[2] مختلف صوبوں میں قرضداری کے مختلف اسباب کی تفصیلات کے لیے بنک کاری کی مختلف صوبہ واری تحقیقاتی کمیٹیوں کی رپورٹیں (زرعی قرضداری کے متعلق ابواب) اور مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ کا فقرہ (۸۱) ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔
[3] دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ (۸۱)۔

باب ۹

کرد یتے ہیں جبکہ اس کی محنت کی بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے اور اس کی مستعدی اور کارکردگی کو عام طور پر بہت بڑی حد تک گھٹا دیتے ہیں۔

(۵) فصلوں کا غیر محفوظ ہونا۔ یہ خصوصیت اس بیان کو حق بجانب قرار دیتی ہے کہ ہندوستانی زراعت بارش پر قمار بازی کرنے کا دوسرا نام ہے اور بارش بقول مسٹر ڈارلنگ "مشرقی حکمران کے ضرب المثل تلون کی پوری شان رکھتی ہے"۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ پنجاب زراعتی دور میں ایک سال کی فصل اچھی اور ایک سال کی بری ہوتی ہے اور باقی تین سالوں کی فصلیں نہ اچھی ہوتی ہیں نہ بری۔ لیکن کسان صرف اچھے سالوں ہی میں اپنے آپ کو قرضے سے بچائے رکھنے کے قابل ہوتا ہے۔

(۶) قحط اور امراض کے باعث مویشیوں کا نقصان۔ طاعون مویشی جیسے امراض، کسان کی مالی پریشانی اور معاشی مصیبتوں کا دوسرا ظاہری سبب ہیں۔ چنانچہ اس کا ثبوت ان قرضوں کی بڑی مقدار سے ہم پہنچتا ہے جو امداد باہمی کی انجمنوں کی جانب سے مویشی کی خریداری کی غرض سے دیے جاتے ہیں۔

(۷) فرسودگی۔ قرضداری کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ خستہ حال مویشی اور فرسودہ آلات کشاورزی کی جگہ پر کرنے کا معقول انتظام نہیں ہوتا۔ چنانچہ جب ان کا افادہ ختم ہو جاتا ہے تو اس کمی کو پورا کرنے کے لیے قرضہ لینے کے سوا کوئی دوسرا فنڈ ان کے پاس نہیں ہوتا۔ اس طرح سرمایہ مسلسل اور مستقل طور پر صرف ہوتا رہتا ہے۔ اس کا باعث زیادہ تر یہ ہے کہ واقعات کا پورا اندازہ نہیں لگایا جاتا۔

لیکن وہ ایک حد تک اعلیٰ معیار زندگی کی خواہش کا نتیجہ بھی ہے۔ ایسی حالت میں جبکہ اکثر پسندیدہ و مطلوبہ اشیا، خواہ وہ سامان تعیش ہوں یا نہ ہوں، گھر میں مفقود ہوتی ہیں، مویشی وغیرہ کی فرسودگی کے لیے علیٰحدہ فنڈ قائم کرنا دشوار ہوتا ہے۔ یہ دشواری، بنک کاری کی سہولتوں کی عدم موجودگی اور پس اندازی کے روایات کے فقدان کے باعث اور بھی بڑھ جاتی ہے۔[۱]

(۸) مقدمہ بازی کا انتہائی شوق۔ گو ہندوستانی رعیت کی یہ خصوصیت بہتر تعلیم کے ذریعے سے اصلاح پا سکتی ہے لیکن موجودہ زمانے میں تو وہ بلاشبہ رعیت کی مالی مشکلات اور پریشانیوں میں اضافہ کرنے والا ایک اہم عامل ہے۔

(۹) رعیت کا اسراف اور ناعاقبت اندیشی۔ ہندوستانی کسان کے اسراف اور ناعاقبت اندیشی کو امور ذیل پر محمول کیا جا سکتا ہے: وہ معاشی رسم و رواج کے پھندے میں پھنسا ہوا ہے، تعلیم سے بے بہرہ ہے، اور اس کا پیشہ سٹے کی نوعیت رکھتا ہے جس کے باعث اس کی ذہنیت قمار بازی کی ہوگئی ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسراف اور ناعاقبت اندیشی موجود ہے اور قرضداری کو بڑھانے میں اثر انداز ہو رہی ہے۔ گو ہندوستانی کسان معمولاً انتہائی کفایت شعاری اور احتیاط کی زندگی بسر کرتا ہے، لیکن اس کا بلاشبہ قرینہ ہوتا ہے کہ وہ خاص خاص موقعوں پر اپنے مصارف کو اسراف کی حد تک پہنچا دے۔ لیکن دکن بلوہ کمیشن (۱۸۷۵ء) کو اس امر سے اتفاق نہیں ہے کہ شادی بیاہ کے موقعوں پر جو فضول خرچی کی جاتی ہے وہی قرض داری کا اصلی سبب ہے۔ چنانچہ کمیشن کے الفاظ

---

[۱] دیکھو برما کی بنک کاری کی صوبہ واری تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، (فقرہ ۱۱۳)۔

یہاں نقل کردینا مناسب ہوگا: "یہ کہنا نادرست ہوگا کہ قرضداری کا باعث ناعاقبت اندیشی نہیں ہے۔ لیکن یہ ناعاقبت اندیشی اسراف یا آمدنی کے بے جا اور غلط استعمال پر اس قدر مبنی نہیں ہے جس قدر کہ ایک جاہل طبقے کے مستقبل کے متعلق تنگ نظری پر اور موجودہ ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کسی شرط پر بھی آیندہ کی آمدنی کو گھٹانے پر مبنی ہے۔ رعیت کی قرضداری کے سبب کے طور پر بیاہ اور دوسرے تقاریب کے مصارف کو ناواجب اہمیت دی گئی ہے۔ ایسے موقعوں کے مصارف کسان کی آمدنی کے مقابلے میں بلاشبہ اسراف میں داخل کیے جا سکتے ہیں لیکن ایسے مواقع بہت ہی شاذ پیش آتے ہیں، بلکہ عموماً لمبا سالہا سال کے بعد۔ اس طریقے سے جو رقم خرچ کی جاتی ہے اس کی مجموعی مقدار اس سے زیادہ نہیں ہوتی جتنی کہ اس کی حیثیت کا آدمی معاشری اور خانگی تفریحات میں خرچ کرنے میں حق بجانب ہے۔ یہ مصارف بجائے خود قرضداری کی بنیاد نہیں معلوم ہوتے۔ رعیت کی قرضداری میں بیاہ کی اتفاقی مد سے بدرجہا زیادہ حصہ غذا اور دوسری ضرورتوں، تخم، بیلوں اور سرکاری لگان کی چھوٹی چھوٹی وائدوں کا ہوتا ہے۔ چنانچہ بنگال کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی اس خیال کی توثیق کرتی ہے" (دیکھو نقرہ ۹۵)۔

ہمیں اس رائے سے پوری طرح اتفاق نہیں ہے اور ہم اس عام خیال کی جانب مائل ہیں کہ ازدواجی، معاشری اور مذہبی رسوم کے مصارف قرضے کے اہم ترین اسباب میں سے ہیں۔ چنانچہ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کئی مثالیں ملتی ہیں کہ ایسے موقعوں پر بڑی مقدار میں قرضے لیے گئے اور قرض گیر قرض کے بار سے کبھی سبکدوش نہ ہو سکا۔ علاوہ ازیں دیہی علاقوں

اب

میں ایسے مواقع پر مصارف کا معیار کچھ سال ادھر سے نمایاں طور پر بڑھ گیا ہے۔

(۱۰) موروثی قرضہ۔ دکن بلوہ کمیشن نے یہ خیال ظاہر کیا کہ موجودہ قرضداری کا اصلی سبب موروثی یا آبائی قرضہ ہے جو باپ سے بیٹے کو پشت در پشت کسی منصفانہ روک ٹوک کے بغیر ترکے میں ملتا آرہا ہے۔ آبائی قرضے کے کمر توڑ بار کا باعث یہ ہے کہ رعیت اس قانونی نکتے سے لاعلم ہے کہ متوفی کا قرضہ اس کے وارثوں پر صرف اس صورت میں اترتا ہے جبکہ وہ متوفی کی املاک کے مالک بنیں اور اس ملکیت کی مالیت کی حد تک قرضے کی ادائی ان پر واجب ہوتی ہے۔ قرضداری کا سبب یہ بھی ہے کہ رعیت قدیم روایت کے زیر اثر اپنے موروثی قرضوں کو اپنی عزت و آبرو کا معاملہ خیال کرتی ہے، اور قانونی مفروضے کی بنا پر موروثی قرضہ ادا کرنا ایک مقدس اور اخلاقی فرض خیال کیا جاتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کسانوں کو ان کے حقوق سے واقف کرایا جائے اور ان کو کام میں لانے کی ترغیب دی جائے۔ دیہی حالات کے مطابق دیہات میں ایک سادہ قانون دوالہ نافذ کرنے کے بارے میں احتیاط کے ساتھ غور ہونا چاہئے۔ جیسا کہ زرعی کمیشن کا کہنا ہے "کوئی شخص یہ دیکھنے کا آرزومند نہیں ہے کہ کلیتہً دوالہ نکالے جانے کو روا رکھا جائے گا اور ساتھ ہی ہمیں یقین ہے کہ کوئی شخص ایسے نظام کو برقرار رکھنے کا بھی خواہاں نہیں ہے جس کے تحت لوگوں کی بڑی تعداد مقروض پیدا ہوتی، مقروض زندگی بسر کرتی اور مقروض مرتی ہے بلکہ مرنے کے بعد بھی اپنے ورثا کے سر اپنا بوجھ تھوپ جاتی ہے" (دیکھو رپورٹ کا فقرہ

289

۲۶۷۔ اس سفارش پر بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی[1] نے بھی زور دیا ہے: چنانچہ وہ مجوزہ "قانون دیہی ناداری" میں بعض خاص شرایط داخل کرنے کا مشورہ دیتی ہے۔ (دیکھو رپورٹ کا فقرہ ۹۲۰)

(۱۱) کسان کی معاشی حیثیت میں جدید تبدیلی۔ سلطنت برطانیہ میں امن وامان اور ترقی پذیر حکومت کا قائم ہونا، حاصل کا مشخص ومعین کردیا جانا؛ ذرایع آمدورفت میں اصلاح وترقی ہونا، نئے شہروں کا وجود میں آنا اور قیمتوں میں اضافہ ہونا، ان سب چیزوں کی بدولت زمین کی قیمت اور اس کی بنیاد پر قرضہ حاصل کرنے کی صلاحیت بڑھ گئی ہے۔ گو اس کی وجہ سے معاشی مشکلات رفع ہوگئیں لیکن گروی کے قرضے میں سریع اضافہ بھی ہوگیا علاوہ ازیں غیر معمولی خوش حالی کے مختصر دوروں نے، جیسے کہ امریکا کی خانہ جنگی کے باعث ۱۸۶۰ء کی کپاس کی گرم بازاری کے زمانے میں اور اس کے بعد حالیہ جنگ عظیم کے زمانے میں اور اس کے کچھ زمانے بعد رونما ہوئے، رعیت پر بحیثیت مجموعی مخرب اخلاق اثر ڈالا۔ خوش حالی بھی قرضے کا اتنا ہی سبب ہے جتنا کہ فصلوں کا غیر محفوظ ہونا۔ ممکن ہے کہ خوشحالی کے زمانے میں قرضہ لینے کی ضرورت کم ہو، لیکن قرضے کا موقع وقرینہ زیادہ ہوتا ہے اور دونوں حالتیں طلب پیدا کرتی اور بڑھاتی ہیں۔ خاص کر جب خوشحالی کسان کے مساعی کے باعث نہ ہو تو اس کا قرینہ ہوتا ہے کہ جاہل اور ناخواندہ رعیت پر اس خوشحالی کے مضرت رساں اثرات

[1] مزید دیکھو بمبئی کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ ۵۶

باب ۹

پڑیں، اس لیے کہ اس کی بنا پر اکثر نقائص رونما ہوتے ہیں مثلاً شراب نوشی، فضول خرچی، قمار بازی، رشوت دہی اور بے اعتدالی یا زمین پر سرمایے کو بے احتیاطی کے ساتھ اور تباہ کن طریقے پر لگانا۔ ایسی خوشحالی معیار زندگی کو بڑھا دیتی ہے، جو بجائے خود ایک پسندیدہ نتیجہ ہے، لیکن جب یہ خوش حالی بالکل اچانک طور پر رونما ہوتی ہے اور اس کے بعد کساد بازاری اور قلت کے دور آتے ہیں تو حالات کی تبدیلی کے لحاظ سے معیار زندگی میں فوراً مطابقت نہیں پیدا کی جا سکتی اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قرض داری بڑھ جاتی ہے[1]

(۱۲) قرض دہندہ اور ربا کا طریقہ[2]۔ یوں تو دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی سود کے لین دین کا طریقہ ہمیشہ سے رائج رہا ہے، لیکن برطانوی دور حکومت سے قبل کے زمانے میں قرض دہندے پر دو قسم کے روک قائم تھے:۔ ایک تو یہ کہ ایک طاقتور دیہی برادری موجود تھی جو قرض دہندوں کے لیے بے بس کسان سے غیر معقول معاملہ کرنا غیر ممکن نہیں تو مشکل ضرور بنا دیتی تھی۔ اور دوسرے، قرضہ واپس دلانے کے لیے

[1] اس موضوع کی باقاعدہ بحث کے لیے دیکھو ڈارلنگ کی محولہ بالا کتاب ۱۹۲۵ء کا ایڈیشن باب ۱۲۔ بمبئی کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ کے فقرہ (۰۰) میں بتلایا گیا ہے کہ جنگ کے زمانے میں اور اس کے بعد اعتبار کی عارضی افراط اور اس کے بالمقابل قیمتوں کے اضافے کی وجہ سے زمین کی تخمینی خریداریاں اعلیٰ قیمتوں پر کی گئیں اور بھاری لگان ادا کر کے زمین پٹے پر حاصل کی گئی۔ اعلیٰ قیمتوں نے مصارف کاشت میں بھی اضافہ کیا اور معیار زندگی کو بھی بلند کر دیا۔ لیکن جب قیمتوں اور اعتبار میں کمی ہوئی تو ان سب معاملات میں مناسب تبدیلی نہیں کی گئی۔ جہاں مصارف میں مستقل اضافہ ہوا تھا آمدنی میں کمی ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرض داری میں معتدبہ اضافہ ظاہر ہوا۔

[2] مختلف قسم کے قرض دہندوں کے لیے جو دیہی قرضے مہیا کرتے ہیں اور ان کے کاروبار،

میں حکومت کی بے اعتنائی۔ یہ کام دیہی پنچایتیں انجام دیتی تھیں یعنی بقایا وغیرہ کے مسائل کا فیصلہ مستعدی اور عجلت کے ساتھ اور منصفانہ طریق پر کرتی تھیں۔ برطانوی حکومت کے تحت یہ روک یا بندشیں بڑی حد تک اٹھ گئی ہیں۔ دیہی برادری کی شکست نے کسان کی حیثیت کو کمزور کر دیا اور قرض دہندوں اور رہن لینے والوں نے موقع سے خوب فائدہ اٹھایا اور کسان کو لوٹنے میں اپنے بہتر ذرائع اور برتر چالاکی سے پوری طرح کام لیا۔ اصول عدم مداخلت اور معاہدے کے تصورات کی بنیاد پر دیوانی قانون کے جدید نظام کے انصرام کی غرض سے دیوانی عدالتوں کے قائم ہونے اور ایک دقیق و پیچیدہ طریق کار روائی اختیار کئے جانے کی وجہ سے رعیت کے حق میں مزید مشکلات پیدا ہو گئیں۔ غیر معمولی کثرت کار کے باعث دیوانی عدالتوں کے ججوں نے کمترین مقاومت کا طریقہ اختیار کیا اور معاہدے کی تفصیلات میں پڑنے کی کوشش کئے بغیر قانون کا سختی کے ساتھ اور لفظ بلفظ اطلاق کرنے کو پسند کیا۔ علاوہ ازیں چونکہ ان کی زندگی عام طور پر شہروں میں بسر ہوتی تھی اور وہ دیہی حالات سے ناواقف تھے اس لیے ہوشیار اور تیز فہم ساہوکار کے ہاتھ میں بآسانی کٹھ پتلی بن جاتے تھے۔ برطانوی دور حکومت سے پیشتر کے زمانے میں دیوانی ڈگری کے تحت قرضے کی ادائی کے لیے مرہونہ زمین کی فروخت کا طریقہ بہت ہی شاذ اختیار کیا جاتا تھا، لیکن اب اس پر معمولی طور پر عمل درآمد ہونے لگا ہے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ طریق کے لیے دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ باب ۷۔

باب ۷

سود در سود کا طریقہ اور سود کی اعلیٰ شرحیں' رعیت کو لوٹ رہی تھیں اور " اس سے اس کا منافع اسی طرح چھین رہی تھیں جس طرح بکرے کے جسم سے اس کے بال مونڈ کر الگ کر لیے جاتے ہیں" (ڈارلنگ)۔ برطانوی دور حکومت سے پیشتر کے زمانے میں رسم و رواج نے سود در سود کی شرح کو نقد کے لیے عام طور پر ۵۰ فی صد اور غلے کے لیے ۱۰۰ فی صد (دام دوپٹ) تک محدود رکھا تھا۔ برطانوی عہد حکومت میں اس قسم کی بندش کو تسلیم نہیں کیا گیا' چنانچہ سود غیر محدود طریقے پر جمع ہوتا گیا اور اس کو عدالتوں نے بھی جائز رکھا۔ ساہوکار' رشوت خوار اور کم تنخواہ پانے والے اہلکاران عدالت سے ساز باز کر کے عام طور پر یکطرفہ ڈگریاں حاصل کر لیا کرتے تھے۔ ایک طرف دیہی برادری کو زوال آیا' دیوانی عدالتیں قائم ہوئیں اور قابل کفالت زمین کی قیمت میں اضافہ ہوا تو دوسری طرف قرض دہندے کا تسلط غیر محدود طریقے پر بڑھنا شروع ہوا' اور گزشتہ صدی کے آخری نصف حصے میں قحطوں کے سلسلے نے تو کسان کو بالکل قرض دہندے کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ قرضہ واپس لینے کے بارے میں دیوانی عدالتوں کی مہیا کی ہوئی سہولتوں اور دوسرے عاملوں نے گھٹیا قسم کے قرض دہندوں کی جماعت پیدا کر دی تھی جو عزت و آبرو کا پاس و لحاظ ویسا نہ کرتی تھی جیسا کہ قدیم قابل احترام ساہوکاروں کی جماعت۔ عام طور پر دیکھا جائے تو رعیت اور قرض دہندہ کے درمیان قدیم سے رواج کے طور پر جو ہمدردانہ تعلقات قائم تھے ان کی جگہ لین دار اور دین دار کے قانونی تعلقات نے لے لی اور سوائے مالی تعلق کے کوئی دوسرا تعلق یا رشتہ ان کے

291

درمیان باقی نہیں رہا۔ اس لحاظ سے کوئی تعجب نہیں کہ زمین رعیت کی ملکیت سے نکل کر ساہوکار کی ملکیت میں خطرناک طریقے پر منتقل ہونے لگی اور خاص کر بمبئی اور پنجاب میں "ملکی کاشتکاری کی حقیت" بگڑ کر "مارواڑی حقیت" کی شکل اختیار کرنے لگی اور "کسان اصلاً" سرعت کے ساتھ ساہوکار کے غلام" کی صورت میں تبدیل ہونے لگا۔

قرض دہندہ کے ہاتھوں کسانوں کا اخراج اور بے دخلی عمل میں آنے کے باعث کسانوں میں بے اطمینانی و بددلی اور ساہوکاروں سے نفرت پیدا ہوگئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برانگیختہ کسانوں نے قاتلانہ بغاوتیں کیں۔ چنانچہ اس کی مثال سنتھال بغاوت (۱۸۵۵ء)، دکن کا بلوہ (۱۸۷۵ء)[1] اور اجمیر کے فسادات (۱۸۹۱ء) ہیں۔

قرض دہندے کے متعلق مذکورۂ بالا بیان سے ہمیں یہ نتیجہ اخذ کرنے کی جانب مائل نہ ہونا چاہیئے کہ وہ غیر فطری طور پر ظلم و ستم کا عفریت ہے۔ وہ اپنے اندر معمولی انسانوں کے اوصاف بھی رکھتا ہے اور کمزوریاں بھی، اگرچہ جن کسانوں سے اس کی قسمت وابستہ ہے ان کی حالت ایسی ہے جو اس کے اوصاف کے مقابلے میں اس کی کمزوریوں کو زیادہ عمل کرنے کا موقع دیتی ہے۔ قرض دہندہ کسانوں کی جہالت نا عاقبت اندیشی اور بے قاعدگی کے باعث بہت بڑے جوکھم برداشت کرتا ہے اور اسی لیے ان سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لیے وہ اعلیٰ شرح سود وصول کرتا ہے۔ علاوہ ازیں خود قرض دہندہ کو سرمایے کی کمی کی شکایت ہوتی ہے، اور

---

[1] دیکھو دکن بلوہ کمیشن کی رپورٹ۔

باب ۱۰

کثیر تعداد میں چھوٹے چھوٹے قرض گیروں کو دیے ہوئے قرضوں کا انتظام کرنے اور ان کو وصول کرنے کے مصارف، سرمایہ مشترک کے بنک کے اسی کے مماثل مصارف سے بدرجہا زیادہ ہوتے ہیں۔ قرض دہندے کے اعلیٰ شرح سود کا مطالبہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ عوام جاہل اور ان کے عادات قدامت پرستانہ ہوتے ہیں اور خود اس کی حیثیت نیم اجارہ دارانہ ہوتی ہے[1]۔ ساہوکار کے اعلیٰ شرح سود وصول کرنے کو حق بجانب قرار دینے کے لیے اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اس کے پیشے کی عدم مقبولیت کا بھی لحاظ کرنا چاہیئے[2]۔ علاوہ ازیں چونکہ اس کے اصل کی کھپت کا کوئی دوسرا راستہ کھلا ہوا نہیں ہوتا اس لیے وہ قرضہ دے کر ہی اس سے مستفید ہو سکتا ہے۔ کسان کو قرضے کی لازمی طور پر ضرورت ہوتی ہے اور اس کو پورا کرنے والا واحد شخص ساہوکار ہے[3]۔ اگر ان حالات میں وہ عام طور پر سختی کے ساتھ معاملات طے کرتا ہے اور

292

[1] دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ' (فقرہ ۱۱۴۳)۔

[2] لیکن یہ کلیۃً صحیح نہیں ہے کہ ہندوستان میں ساہوکار کے پیشے سے کوئی خاص کراہیت یا نفرت وابستہ ہو۔ اس کے برخلاف اس کا احترام کیا جاتا ہے' اس لیے کہ دیہی برادری کے لیے اس کی خدمات ناگزیر ہیں۔ جب کوئی ساہوکار غیر مقبول ہو جاتا ہے تو وہ عام طور پر اس کا مستحق بھی ہوتا ہے۔ جس حد تک یہ کراہیت یا نفرت موجود ہے اس حد تک اس سے بچنے کی واحد صورت یہ ہوگی کہ ساہوکار اور قرض گیر رعیت کے مابین کوئی اجتماعی نظام مثلاً قرضہ و امداد باہمی کی انجمنیں' ارضی بنک وغیرہ قائم کیے جائیں۔ اکثر اعتبارات سے موجودہ نظام' جس کے تحت اصل قلیل مقداروں میں گمنام اصلداروں کی جانب سے معمولی تجارتی معلومات رکھنے والے اشخاص کو دیا جاتا ہے' کامل تبدیلی کا طالب ہے۔

[3] قرضہ و امداد باہمی کا طریق اب بھی ساہوکار کی جگہ کامل طور پر لینے سے قاصر ہے۔ چنانچہ بمبئی پریسیڈنسی میں زرعی آبادی کے مطلوبہ قرضے کا صرف تقریباً ۱۰ فی صد حصہ امداد باہمی کے طریقے سے فراہم ہوتا ہے

اس عظیم الشان قوت کا غلط و بے جا استعمال کرتا ہے جو اس کو حاصل ہے تو یہ محض انسانی فطرت ہے،“ اس کو ملامت کرنا بنی نوع انسان کے استقام کو ملامت کرنا ہے۔ ہمیں اس پورے سانچے کو برا کہنا چاہئے نہ کہ اس شخص کو جو اس سے ڈھل کر نکلا ہے[۱]۔

تا وقتیکہ دیہی ضرورتوں کو تمام و کمال پورا کرنے کے لیے کوئی بہتر اعتباری نظام مرتب نہ ہو، ساہوکار کا وجود ناگزیر رہے گا۔ گو جب کبھی یہ معلوم ہو کہ ساہوکار اپنے معاملات میں کسان کی حاجتمندانہ حیثیت سے ناواجب فائدہ اٹھا رہا ہے تو اس کی حوصلہ شکنی کی کوشش ہر ممکن طریقے سے کرنی چاہئے لیکن ہمیں اس کے مفید کام سے چشم پوشی بھی نہ کرنی چاہئے جو وہ موجودہ زمانے میں دیہی معیشت میں انجام دے رہا ہے۔ ساہوکار ”بے اعتدالی اور ناعاقبت اندیشی کے بحر ناپید اکنار میں کفایت شعاری کا واحد ٹاپو ہے،“ ہندوستانی دیہی معیشت کے سادہ نظام کا سنگ بنیاد ہے،“ اور ”مستعدی کے ساتھ قرضے دینے والا ایسا مرکز ہے جہاں کسان اپنی“ ”جملہ ضرورتوں کی تکمیل کے لیے ہر وقت رجوع ہو سکتا ہے۔ نہ محض قرضے کی رسد ہی مہیا نہیں کرتا بلکہ مختلف طریقوں سے گاؤں کی خدمت کرتا ہے۔ مثلاً وہ عام طور پر غلے کا سوداگر بھی ہے اور اس حیثیت سے قحط و خشک سالی کے زمانے میں اس لیے خاص طور پر کارآمد ہے کہ وہ مصیبت کے وقت غلہ دیتا ہے اور

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ (دیکھو بمبئی کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ ۲۲)۔

[۱]۔ دیکھو ام، ال ڈارلنگ کی موزۂ بالا تصنیف (۱۹۳۲ء کا اڈیشن) صفحہ ۲۰۔

کسانوں کی مشکلوں کو آسان کرتا ہے۔ اس لحاظ سے "ساہوکار کو ختم کردو" کا نعرۂ جنگ بالکل نامناسب ہوگا۔ دیہی قرضہ یا اعتبار کی کسی دوسری قابلِ عمل تجویز مثلاً قرضۂ امداد باہمی کی انجمنوں یا زمین گروی بنکوں کی تجویز کے تحت بھی ساہوکار کو جدید اعتباری اداروں کا جزو لاینفک بنانا اور اس کو یہ ترغیب دینا کہ وہ ان جدید نظامات کے ذریعے سے اپنی معلومات اور سرمایے کو دوسروں کے لیے قابلِ حصول بنائے بہت فائدہ رساں عمل ثابت ہوگا۔

(۱۳) مالگزاری کی پالیسی۔ آر سی دت کی طرح اور اشخاص بھی گرانبار ارضی محصول اور اس کے وصول کرنے کے سخت گیر طریقے کو دیہی قرضداری کے اسباب میں سے ایک سبب خیال کرتے ہیں۔ وہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ تقریباً گزشتہ پچاس سال میں ملک کے اکثر علاقوں میں کئی قحط سالیوں یا فصلوں کی جزوی خرابی اور پیداوار کی کمی کے باوجود مالگزاری وصول کی گئی اس کی مقدار زیادہ رہی۔ چنانچہ ۱۸۸۰ء کا قحط کمیشن بظاہر اسی خیال کی تائید کرتا ہے اور یہ رائے ظاہر کرتا ہے کہ "اچھے سالوں میں کسان کو بمشکل ضرورتیں پوری کرنے کے سوا اور کوئی توقع نہیں ہوتی اور برے سالوں میں وہ عوام کے رحم و کرم پر گزر کرتا ہے۔" اس کے برخلاف ۱۹۰۱ء کا قحط کمیشن اس سلسلے میں حسب ذیل خیال ظاہر کرتا ہے: "واقعہ یہ ہے کہ وہ زمیندار جنھیں کوئی مالگزاری ادا کرنی نہیں پڑتی یا برائے نام چکوتا ادا کرنا پڑتا ہے عام طور پر قرض میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں، جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مالگزاری کی ادائی قرضے کا اصلی سبب نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی تمام آمدنی اپنی ذات پر خرچ کر ڈالے اور اپنے ذمے کا لگان یا محصول

293

باب ۹

ادا کرنے کے لیے اس کو قرض لینا پڑے تو یہ کہنا بمشکل حق بجانب ہوگا کہ اس کی قرضداری کا باعث یہ واقعہ ہے کہ اس کو لگان یا محصول ادا کرنا پڑا، خصوصاً جبکہ ان مطالبات کا تناسب اس کی آمدنی سے ویسا ہی معمولی ہے جیسا کہ مالگزاری کا زمین کی مجموعی خام پیداوار سے[1] کسان سرکاری مالگزاری ادا کرنے کے لیے عام طور پر قرضہ حاصل کرتا ہے۔ لیکن محض اس وجہ سے مالگزاری کو قرضداری کا سبب تخم اور خوراک سے زیادہ نہیں قرار دیا جا سکتا، اس لیے کہ وہ تخم اور خوراک کے لیے بھی قرضہ لے سکتا ہے۔

لیکن قرضداری کی حالت کو مالگزاری سے منسوب کرنا صرف اس صورت میں بالکل حق بجانب ہوگا جبکہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ مالگزاری سختی کے ساتھ وصول کی گئی خواہ یہ سختی بھاری محصول عائد کرنے کی صورت میں ہو یا غیر لچکدار طریقے پر وصول کرنے کی صورت میں۔ اس امر کو کہ مالگزاری کے طریق میں اس طرح کے بعض اسقام ہیں وہ لوگ بھی تسلیم کرتے ہیں جو یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ دیہی قرض داری کی ذمہ داری کسی حد تک ارضی محصول پر عائد ہوتی ہے۔ چنانچہ پنجاب کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر ام، ال، ڈارلنگ تسلیم کرتے ہیں کہ گو برطانوی حکومت کے قائم ہونے کے بعد سے مالگزاری کا مطالبہ گھٹ گیا اور جنس سے نقد میں مبدل ہوگیا لیکن ابتداً اس میں اتنی کافی کمی نہیں کی گئی کہ وہ وصول یابی کے کم لچکدار طریق کے مناسب ہوتا[2]۔ تاہم وہ آگے بڑھ کر یہ استدلال

[1] دیکھو قحط کمیشن کی رپورٹ (۱۸۸۰ء) صفحہ ۱۳۲
[2] دیکھو ڈارلنگ کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۲۲۱۔

کرتے ہیں کہ ”گو مالگزاری کی بنا پر عام طور پر قرضہ لیا جاتا ہے پھر بھی مالگزاری ہی قرضے کا اساسی سبب نہیں ہے۔“ لیکن یہ ایک ایسا امتیاز ہے جو بلا تفریق ہے۔ اساسی سبب اور معاون سبب کا امتیاز کسی اصول پر مبنی نہیں معلوم ہوتا۔ جو کچھ ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ آیا مبینہ سبب حقیقی سبب ہے یا نہیں ممکن ہے کہ کوئی شخص پہلے سے آبائی قرضے سے زیربار ہو اور اپنی قرض داری میں بیاہ کے رسوم میں فضول خرچی کرنے کی غرض سے قرضہ لے کر اور اضافہ کرے؛ لیکن اس کی بنا پر شادی کے رسوم کے مصارف کو قرضداری کا سبب قرار دینے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ تمام محصلہ قرضے خواہ ان کا باعث خود رعیت کی بدنہادی و بے اعتدالی ہو یا ساہوکار کی غیر منصفانہ لوٹ یا گاہ گاہ مالگزاری وصول کرنے میں حکومت کی حد سے زیادہ سخت گیری، لازمی طور پر قرضداری کا سبب شمار ہوں گے۔ علاوہ ازیں یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ مالگزاری کی کمی قرضے میں کمی نہ کرے گی، اس لیے کہ آبادی کا اضافہ ہر حالی کو زائل کردے گا[1]۔ خواہ یہ سرکاری مالگزاری کے بار کو کم کرنے کا معقول سبب ہو یا نہ ہو لیکن وہ یقیناً یہ خیال کرنے کی معقول بنیاد نہیں فراہم کرتا کہ بھاری مالگزاری قرضے کا سبب نہیں قرار دی جا سکتی۔ جس استدلال پر ہم اعتراض کر رہے ہیں وہ دراصل اس سے انکار نہیں کرتا کہ مالگزاری قرض داری کا سبب ہو سکتی ہے، بلکہ یہ استدلال صرف اس بات پر زور دیتا ہے کہ اگر یہ سبب ہٹا دیا جائے تو دوسرا سبب یعنی اضافۂ آبادی اس کی جگہ لے لے گا۔ ممکن ہے کہ

[1] دیکھو ڈارلنگ کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۲۴۲

غیر محدود افزائش نسل سخت گیر طریق محصول کی تنسیخ کے مفید اثر
کو زائل کر دے جس طرح وہ دراصل کسی قسم کی خرابی کی اصلاح
کے اثر کو زائل کر سکتی ہے۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا
کہ بھاری اراضی محصول قرض داری کا اساسی سبب نہیں ہے
بعض دور ایسے بھی رہے ہیں جن میں محصول مسلسل طور پر بھاری
رہا ہے، مثلاً دکن میں جس وقت تک "پرنگل بندوبست"
کا نفاذ رہا۔ علاوہ ازیں التوا اور معافی کے طریق پر عمل
کرنے میں رعیت کی حیثیت و حالت کو ہمیشہ مناسب طریقے
سے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ موجودہ زمانے میں بھی مالگزاری
کے طریق میں بحیثیت مجموعی ترمیمات اور اصلاح و ترقی کے
باوجود یہ بتایا جا سکتا ہے کہ ایسی انفرادی مثالیں پائی جاتی
ہیں جن میں نامناسب طور پر سخت برتاؤ کیا گیا اور دادرسی
کا کوئی موثر انتظام نہیں ہے۔

جس حد تک یہ نقائص گزشتہ زمانے میں موجود رہے
اور اب بھی ہیں[1] ان کو قرض داری کے اسباب میں شامل کرنا
غیر معقول نہیں ہے۔ پھر بھی اس واقعے کا لحاظ کرتے ہوئے کہ
مالگزاری کی مقدار مجموعی دیہی قرض داری کا غالباً ۱/۱۲ یا اس
سے بھی کم حصہ ہے اور یہ امر ذہن نشین رکھتے ہوئے کہ کل
مالگزاری کو قرض داری دور کرنے والا سبب نہیں قرار
دیا جا سکتا اس کو ہمارے زیر غور خرابی کے اسباب میں
بہت ثانوی جگہ دی جا سکتی ہے۔ یہ بتلانے کی بہ مشکل

[1] سنہ ۱۹۳۲ء کی تحقیقات بر معلوم نے پر قوی بدگمانی پیدا کر دی ہے کہ مالگزاری کے موجودہ نظام کا حقیقی عمل اس سے بہت زیادہ سخت اور غیر منصفانہ ہے جتنا کہ اب تک خیال کیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں گزشتہ چند سالوں میں زرعی پیداوار کی قیمتوں کے بری طرح گر جانے کی وجہ سے مالگزاری کا بار بہت بڑھ گیا ہے اور اکثر علاقوں میں امداد کا کام ضروری ہو گیا ہے۔

باب

ضرورت ہے کہ ایسا کہنے کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ مالگزاری کا موجودہ طریقہ نقائص سے کلیتہً پاک ہے[1]۔

۵۔ دیہی قرضداری کے بارے میں سرکاری پالیسی[2]

اب ہم ان تدابیر پر تبصرہ کر سکتے ہیں جو اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے حکومت نے اختیار کیں۔ گزشتہ صدی کے ساتویں عشرے کے شروع میں اس مسئلے نے عوام کی توجہ پوری قوت کے ساتھ اپنی طرف منعطف کرائی۔ ۱۸۷۵ء اور ۱۹۰۱ء کے دکن کے بلووں کے کمیشن اور قحط کمیشن نے وقتاً فوقتاً اس مسئلے پر غور کیا اور وہ مسودہ قانون بابت امداد کاشتکاران دکن (۱۸۷۹ء) قانون قرضہ جات تقاوی (۱۸۸۳ء تا ۱۸۸۴ء) زرعی بنک اسکیم (۱۸۸۴ء) نکلسن رپورٹ (۱۸۹۵ء) مسودۂ قانون انتقال اراضی پنجاب (۱۹۰۰ء) اور مسودۂ قانون انجمن ہائے امداد باہمی (۱۹۰۴ء) کے مباحث اور مراسلوں کا مرکز و محور بنا رہا۔

295

سر ایڈورڈ میک لے گن، ہندوستانی زرعی قرضداری کے بارے میں اپنی یادداشت میں حکومت کی اختیار کی ہوئی تدابیر کو مندرجۂ ذیل چار مدوں میں تقسیم کرتے ہیں :۔ (۱) غیر ضروری قرضے سے بچنے کی ہمت افزائی کرنے کے متعلق تدابیر؛ (۲) زرعی قرضوں کے سلسلے میں دیوانی قانون کی اصلاح و ترمیم کے متعلق تدابیر جن میں سودی قرض کی تنظیم کی تدابیر بھی شامل ہیں؛ (۳) انتقال اراضی کو روکنے کی تدابیر؛ اور (۴) اعتبار مہیا کرنے یا برقرار رکھنے کے مقصد سے اختیار کردہ تدابیر۔ ان میں ہم ایک اور کا اضافہ کر سکتے ہیں یعنی (۵) قرضے کی بیباقی اور تصفیے کی تدابیر، جن پر نمبر (۲) کے بعد غور کیا جائے گا۔

---

[1] لیکن محض قرضداری کی زیادتی کو یہ ثابت کرنے کی دلیل کے طور پر استعمال نہیں کیا جا سکتا کہ زراعت منفعت بخش نہیں ہے اور مالگزاری گراں اور تکلیف دہ ہے۔ اس کے برخلاف اپنے قرضے کی موجودگی خود جو زمین کی کفالت پر حاصل کیا جائے اس امر کی شہادت ہے کہ زمین اچھی کفالت ہے۔ قرضے کی وسعت اس کفالت کی مالیت کا اشاریہ و نمایندہ ہے۔" (دیکھو بروانی رپورٹ، فقرہ ۱۱۹)۔

[2] دیکھو بیس، سی، رائے کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان میں زرعی قرضداری اور اس کا علاج" شائع کردہ کلکتہ یونیورسٹی۔

باب ۹

۶۔ غیر ضروری قرضوں سے بچنے کی تدابیر۔ اس عنوان کے تحت ہم ان مساعی کا ذکر کر سکتے ہیں جو دیہی علاقوں میں ابتدائی تعلیم کی اشاعت کی غرض سے کی گئیں تاکہ رعایا کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ اپنی قرضداری کو زیادہ کاروباری نقطۂ نظر سے دیکھے اور ساہوکار سے زیادہ مساویانہ بنیاد پر مقابلہ کرے لیکن تعلیم کم وکیف کے اعتبار سے قابل افسوس طریقے پر گھٹیا ہے۔ حکومت نے کسان کے ذرائع میں اضافہ کرنے کی غرض سے جو دوسری تمام تدابیر اختیار کیں وہ منطقی لحاظ سے اس عنوان کے تحت آسکتی ہیں، لیکن ان میں سے اکثروں پر پچھلے بابوں میں بحث کی جا چکی ہے۔ قحط سالیوں میں مالگزاری کے التوا اور معافی کی منظوریاں جزوی علاج و اصلاح کے طور پر دی جاتی ہیں لیکن یہ طریقہ زیادہ فراخ دلی کے ساتھ انتظام چاہتا ہے۔ تاکہ اس کے پیش نظر مقصد بخوبی پورا ہو۔ دیہات میں ڈاک خانوں کے سیونگ بنک قائم کئے گئے ہیں تاکہ لوگوں میں پس اندازی اور کفایت شعاری کے عادات پیدا ہوں۔ لیکن ان سہولتوں کو اس سے زیادہ موثر طریق پر وسیع کرنے کی ضرورت ہے جتنی کہ وہ اب ہیں، تاکہ کفایت شعاری میں ترقی ہو اور رعیت کی چھوٹی چھوٹی پس اندازیاں مفید طریقے پر صرف کرنے کے لیے جمع کی جا سکیں۔

۷۔ دیوانی قانون کی اصلاح و ترمیم کی تدابیر جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں "عدم مداخلت" کی قدیم پالیسی حکومت کو اس لیے ترک کرنا پڑی تھی کہ وہ لین دار اور دین دار کے قدیم توازن میں بے جا طور پر خلل انداز ہوتی تھی[1] اور

[1] یہ بلاپس وپیش تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ برطانوی دور حکومت کے آغاز سے جو تغیرات رونما ہوئے ہیں مثلاً زیادہ معین حقوق املاک، معاہدات کی قوت کا زیادہ مکمل طور پر تسلیم کیا جانا اور دیوانی عدالتوں کے ذریعے سے ان کا زیادہ سختی کے ساتھ نفاذ، تو وہ اس بات کی علامت ہے کہ معاشری نظام میں تغیر ہوا ہے اور اس نے ترقی کے مدارج طے کئے ہیں۔ لیکن اکثر کسانوں کے حق میں یہ تبدیلیاں اس لیے فوراً تباہ کن اور مضرت رساں ثابت ہوئیں کہ کسانوں نے نہ تو تعلیمی حیثیت سے کافی ترقی کی تھی اور نہ ان کی معاشی حالت اتنی ترقی یافتہ تھی کہ وہ ان تبدیلیوں سے مستفید ہوتے۔

باب ۹

296

یہ ضروری معلوم ہوا تھا کہ مساہوکار کے ہاتھ میں جو ہتیار غیر عاقلانہ طور پر دیدیے گئے تھے اور جن کا غلط طریقے پر استعمال کیا جانا ثابت ہوگیا تھا ان میں سے اکثروں کو واپس لیا جائے اور رعیت قانونی سے کورانہ اور بے رحمانہ طریق پر کام لینے کے بجائے انسانوں کے ساتھ خردمندانہ طریق پر انصاف کیا جائے[1] لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے یہ بات نہایت ضروری بھی ہے اور مشکل بھی کہ دیہی ساہوکار کے جائز کاروبار میں شدید مداخلت کے امکان کے خلاف تحفظ کیا جائے تاکہ اس مداخلت کے باعث اعتبار میں تباہ کن انقباض واقع نہ ہو۔ قانون کو چاہیئے کہ وہ ساہوکار کی مزاحمت کے بجائے اس کے جائز و معقول مطالبات کے پورا کرنے میں دراصل مدد کرے۔ رعیت کو ظلم و زیادہ ستانی سے یقیناً محفوظ رکھنا چاہیئے، لیکن اسی کے ساتھ اس کے ذرائع کی پوری حد تک اس کو اپنے ذمے کے جائز قرضے ادا کرنے پر بھی مجبور کرنا چاہیئے۔ رعیت کے تحفظ کے لیے اس کے خلاف تعمیل ڈگری کی حد تک ضابطۂ قوانین دیوانی میں کئی تبدیلیاں کی گئیں، مثلاً آلات کشاورزی کھیتی باڑی کے لیے مطلوبہ مویشی اور کسان کا سامان خانہ داری، قرقی یا نیلام سے مستثنیٰ کیے گئے؛ قرضدار کسان بھی عدالت کی ڈگری کی بنا پر گرفتار کیے جانے سے مستثنیٰ کیا گیا اور اس کے ساتھ یہ مراعات بھی کی گئی کہ اپنے ذمے کے قرضے کو باقساط ادا کرے۔

۱۸۷۹ء میں "قانون امداد مزارعین دکن" بابت ۱۸۷۹ء دکن کے بلوہ کمیشن کی سفارش پر منظور کیا گیا جو دکن کے بعض علاقوں میں بلووں اور ہنگاموں کی تحقیقات کی غرض سے مقرر کیا گیا تھا۔ چنانچہ ان بلووں کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ مظلوم قرضداروں نے ساہوکاروں پر پرتشدد حملہ کردیا تھا۔ اس قانون کی رو سے عدالتوں کو اجازت دی گئی کہ وہ معاہدے کی اساس پر نظر کریں اور اس کو کسان کی موافقت میں اس طرح تبدیل کریں کہ

[1] دیکھو سرتی ہوپ کی تقریر گورنر جنرل کی کونسل میں "مسودۂ قانون امداد مزارعین دکن" ۱۸۷۹ء پر۔

تکلیف دہ شرح سود میں کمی ہوجائے، زمین کو اس وقت تک فروخت نہ کیا جائے جس وقت تک وہ خاص طور پر مکفول نہ کی گئی ہو اور فریقین کے درمیان بیع کی دستاویز مکمل ہوجانے کے بعد بھی کسان کو زمین واپس کردی جائے۔ اس قانون کی رو سے یہ لازم گردانا گیا کہ لین دار حسابات پیش کریں اور رسیدات جاری کریں اور کسان تحریری رہن نامہ مرتب کریں۔ سنہ ۱۸۵۹ء کے بعد سے مقدمے کی سماعت کی مدت صرف تین سال تھی، اس کو اب کسانوں کے خلاف مقدمات میں بارہ سال تک وسیع کردیا گیا، بشرطیکہ مقدمہ رجسٹری شدہ دستاویز پر مبنی ہو؛ اور دوسری صورتوں میں ۶ سال مدت قرار دی گئی۔ گو اس قانون کا مقصد نیک تھا، پھر بھی بحیثیت مجموعی وہ غیر موثر بلکہ قطعاً نقصان رساں پایا گیا۔ اس ایکٹ نے مقدمہ بازی میں اضافہ کردیا ہے اور رعایا اور ساہوکار کے باہمی معاملات میں انتہائی عدم تیقن پیدا کرکے معمولی اعتبار میں خلل پیدا کردیا ہے۔ اس قانون کی بنا پر کسانوں کو اس بات کا موقع ملا کہ مراعات سے غلط اور بے جا فائدہ اٹھائیں اور ساہوکار اس قابل ہوگئے کہ کسانوں سے معاملہ کرنے میں زیادہ احتیاط اور سخت گیری سے کام لیں، اور اس طرح قرضہ حاصل کرنے کی مشکلات اور بھی زیادہ ہوگئیں۔ قانون مذکور میں "کسان" کی تعریف بھی حد سے زیادہ وسیع ہے؛ چنانچہ اس سے ایسے اشخاص کے فائدے کے لیے بے جا کام لیا جاتا ہے جن کو فائدہ پہنچانا مقصود نہ تھا، اور قانون ان کو اس قابل بناتا ہے کہ عدالتوں کو فریب اور دیانت دار لین داروں کو زک دیں۔ جیسا کہ سنہ ۱۹۱۰ء کے تحط کمیشن نے خیال ظاہر کیا تھا، یہ خیال کرنے کی قطعی گنجائش موجود تھی کہ اس ایکٹ کے منظور ہونے کے بعد انتقال ملک بذریعۂ فروخت و رہن عام ہوگیا تھا۔ چنانچہ حال ہی میں بمبئی کی ایک کمیٹی نے یہ مشورہ دیا ہے کہ قانون میں مکمل طور پر تبدیلیاں کردی جائیں تاکہ وہ قابل عمل اور کسان کے لیے دراصل فائدہ رساں بن جائے[۱]۔

۱۔ بنکنگ انکوائری کمیٹی کی رپورٹ؛ کے ۔ ایس گپتے کی یادداشت (روداد شہادت) جلد دوم۔

باب ۹

بمبئی کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی کے روبرو متعدد گواہوں نے اس قانون کی کامل تنسیخ پر زور دیا اور یہ جتلایا کہ اس قانون کو ربائی قرضوں کا قانون[1] (بابت ۱۹۱۸ء) اور عدالتوں کا یہ اختیار و اقتدار کہ وہ غیر معقول معاملات سے بچانے کے لیے امداد کر سکتی ہیں، غیر ضروری بنا دیتا ہے۔ گو بمبئی کی تحقیقاتی کمیٹی نے یہ مشورہ دیا کہ " ربائی قرضوں کے قانون سے اس سے زیادہ استفادہ کرنا چاہئیے جتنا کہ موجودہ زمانے میں کیا جا رہا ہے۔ لیکن یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ وہ قانون امداد مزارعین دکن[2] کی پوری پوری جگہ نہیں لے سکتا۔ چنانچہ کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ موخر الذکر قانون کو منسوخ کر دینا چاہئیے اور اس کی جگہ ایک نیا قانون جاری کرنا چاہئیے جس میں بعض چھوٹے اور اصلی کسانوں کے اغراض کے تحفظ کے لیے چند شرائط ہونے چاہئیں۔ ساہوکاروں کے لیے مناسب کھاتوں کا رکھنا لازم کر دینا چاہئیے تاکہ پچھلے معاملات کی تحقیقات ممکن ہو۔ اس کا بھی انتظام کرنا چاہئیے کہ قرضے معقول و مناسب اقساط میں ادا کرنے کا موقع ملے اور ایک مدت مقرر کرنی چاہئیے جس کے اندر جائداد کی فروخت کے حق بجانب ہونے کے خلاف دعویٰ دائر کیا جا سکے[3]

دیوانی قانون کے تغیر کی دوسری مثال کے طور پر ۱۸۹۹ء کے ایکٹ کا ذکر کیا جا سکتا ہے جس کے ذریعے سے قانون معاہدہ میں کچھ تبدیلیاں کی گئیں اور " ناواجب اثر" کی اصطلاح کی وسعت اس طرح بڑھا دی گئی کہ اس میں وہ سب مقدمات آ سکیں جن میں ساہوکار اپنی فائق حیثیت سے ناواجب فائدہ اٹھائے۔ جب کبھی معاملہ بظاہر غیر معقول طریق پر انجام پائے ناواجب اثر کی عدم موجودگی کے ثبوت کا بار ساہوکار پر ڈالا گیا۔ ربائی قرضوں کا قانون ۱۹۱۸ء میں ترمیم کے بعد از سر نو مرتب و منظور ہوا

[1] Usurious Loans Act 1918

[2] Deccan Agriculturists Relief Act

[3] بمبئی کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ (فقرہ ۲۳۹ تا ۲۴۰)۔

۔۱۱ اس میں قابل وصول سود کی قانونی اور انتہائی مقدار مقرر کی گئی ہے' واجب الادا سود کی شرح گھٹا دی گئی ہے اور انتہائی شرح مقرر کر دی گئی ہے۔ یہ قانون سب اشخاص پر عائد ہوتا ہے' خواہ وہ مزارعین ہوں یا غیر مزارعین۔" اس قانون کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ عدالت مقدمے کو ایک مرتبہ اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد اپنی ہی تحریک پر قدیم معاملات کو از سر نو دیکھ سکتی اور شرائط کی نصفت کی تحقیقات کر سکتی ہے۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں اس قانون میں ترمیم ہوئی اور اس میں ایسے مقدمات بھی شامل کر لیے گئے جن میں ڈگری کے فریقین میں سے کوئی چارہ سازی کا خواستگار ہو۔ قرضہ غیر مکفول ہونے کی صورت میں قرضدار اپنے لین دار کو عدالت میں لیجا سکتا ہے اور اس طرح اپنے قرضے کی تجدید سے انکار کی سادہ تدبیر اختیار کر کے لین دار کو اس قانون کے دائرے کے اندر لا سکتا ہے[1]۔ زرعی کمیشن یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ یہ قانون تمام صوبوں میں حرف متروک بن چکا ہے اور سفارش کرتا ہے کہ ہر صوبے میں اس امر کی تحقیقات کی جائے کہ اس سے استفادہ نہ کرنے کے اسباب کیا ہیں اور ایسی تدابیر اختیار کی جائیں جن کی بنا پر اس کا اطلاق آیندہ یقینی ہو جائے چنانچہ یہ مسئلہ ان مسائل میں سے ایک ہے جن کی تحقیق کے بارے میں صوبہ واری تحقیقاتی کمیٹیوں کو ہدایت دی گئی تھی۔

اس مسئلے کے بارے میں مختلف کمیٹیوں کے خیالات اور سفارشیں متفقہ اور یکساں نہیں ہیں[2]۔ بعض کمیٹیاں (مثلاً صوبہ متحدہ پنجاب' آسام اور مدراس کی کمیٹیاں) زرعی کمیشن کے اس خیال سے اتفاق نہیں کرتیں کہ یہ قانون

۲۹۶

[1] زرعی کمیشن کی رپورٹ' فقرہ (۳۶۵)۔

[2] دیکھو بنک کاری کی مختلف صوبہ داری کمیٹیوں کی رپورٹیں:۔

آسام کی رپورٹ (فقرہ ۱۶۹)' بمبئی کی رپورٹ (فقرہ ۲۴۱)؛ بنگال کی رپورٹ (فقرہ ۳۰۹)؛ برما کی رپورٹ (فقرہ ۶۹۴ تا ۶۹۷)؛ صوبہ متوسط کی رپورٹ (فقرہ ۱۴۳۲ و ۱۶۶۰)؛ مدراس کی رپورٹ (فقرہ ۳۶۴ تا ۳۶۵)؛ پنجاب کی رپورٹ (فقرہ ۱۰۰)؛ صوبہ متحدہ کی رپورٹ (فقرہ ۲۲۳)؛ نیز مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ (فقرہ ۱۱۶)۔

حرفِ متروک بن چکا ہے۔ آسام اور مدراس کی کمیٹیاں یہ بھی خیال ظاہر کرتی ہیں کہ یہ قانون اطلاق کے بغیر بھی سود کی شرحوں پر روک کا کام کرتا ہے۔ اس کے برخلاف بمبئی اور بنگال کی کمیٹیاں یہ خیال ظاہر کرتی ہیں کہ اس قانون سے بہت شاذ ہی کام لیا جاتا ہے۔ بمبئی کی کمیٹی قانون کی ناکامی کا باعث اس کی تقابلی ندرت، اس کی موجودگی سے عام ناواقفیت اور یہ واقعہ قرار دیتی ہے کہ قانون امداد مزارعین دکن کے تحت کسان بدرجہا بہتر امداد حاصل کرسکتا ہے۔ بنگال کی کمیٹی اس استدلال کی جانب اشارہ کرتی ہے کہ قانون اس وجہ سے ناکام ثابت ہوا کہ قرضدار قانون سے کام لینے سے قاصر رہا۔ برما کی کمیٹی یہ خیال ظاہر کرتی ہے کہ اس امر کا تعین کرنا بہت دشوار ہے کہ شرح سود کب زیادہ ہوتی ہے اور یہ مشورہ دیتی ہے کہ اس معاملے کا فیصلہ کرنے میں مدد دینے کے لیے عدالتوں کی قطعی طور پر رہنمائی کرنی چاہئے۔ مدراس اور بنگال کی کمیٹیاں اس امر پر زور دیتی ہیں کہ اس بارے میں خفیف ترین شبہہ بھی نہ ہونا چاہئے کہ اگر جج چاہے تو اس کو اس امر کا پورا اختیار رہے کہ اس قانون کا اطلاق اپنی تحریک پر اور اپنے حسب صوابدید کرے۔ مرکزی تحقیقاتی کمیٹی یہ خیال ظاہر کرتی ہے کہ اکثر صوبوں میں اس قانون پر قرضدار کے فائدے کے لئے عمل کیا جاسکتا ہے، لہذا اس کو برقرار رکھنا چاہئے اور اس کے عملدرآمد کے متعلق ایک خاص رپورٹ دیوانی عدالتوں کے نظم و نسق کی سالانہ رپورٹوں میں شامل کرنی چاہئے۔ ہم صوبۂ متوسط کی بینک کاری کی کمیٹی کے اخذ کردہ نتیجے کی پوری طرح تائید کرتے ہیں کہ ربائی قرضوں کے ایکٹ کی طرح کا قانون اپنے ناگزیر تحدیدات رکھتا ہے۔ ہم اس کی پرزور تائید کرتے ہیں۔ ایسا قانون سنگین قسم کے انفرادی معاملات میں تو چارہ سازی کرسکتا ہے، لیکن اس کی بنا پر زر کے بازار کی اس طرح نگرانی نہیں کی جاسکتی کہ سود کی موجودہ شرحوں میں عام کمی رونما ہو۔

۸۔ قرض دہندوں کی نگرانی کرنے اور اجازت نامے دینے کے متعلق وضع قوانین۔

ا ب

299

مختلف ملکوں میں سودی قرض کے کاروبار کی نگرانی کی تدابیر اس لیے اختیار کی گئی ہیں کہ اس کا بہت امکان ہوتا ہے کہ قرض دہندے اس اقتدار کو جو ان کو قرض گیرندوں پر حاصل ہوتا ہے غلط اور بے جا طور پر استعمال کریں۔ یہ بات خاص طور پر غیر محتاط قرض دہندوں کے بارے میں اور زیادہ تر ٹھٹیا یا ٹٹ پونجیے ساہوکاروں کے بارے میں صادق آتی ہے جو کوئی بڑی حیثیت نہیں رکھتے۔ اس قسم کے اشخاص کی تعداد اور ان کی چالبازیوں کے پھیلاؤ کا انحصار اس برادری یا جماعت کی پسماندگی کے درجے پر ہوتا ہے جس میں یہ اپنا جال بچھاتے ہیں۔ شاہی زرعی کمیشن صوبہ واری حکومت کے غور کے لیے ان اصول کی سفارش کرتا ہے جو مسودۂ قانون تنظیم حسابات پنجاب[1] (جو سنہ ۱۹۳۰ء میں ایکٹ کی شکل میں منظور ہوا) اور برطانوی قرض دہندوں کے قانون بابت سنہ ۱۹۲۷ء کی تہ میں مضمر ہیں۔ پنجاب کا ایکٹ جملہ قرضدہندوں کے لیے اس امر کو لازمی کرداتا ہے کہ وہ باقاعدہ حساب کتاب اور کھاتوں کا استعمال کریں اور ہر قرضدار کے پاس ہر ششماہی پر صاف و صریح فرد حساب اپنے یا اپنے گماشتے کے بدستخط سے پیش کریں جس میں صرف یہی درج کرنا کافی نہیں کہ واجب الادا رقم کتنی ہے بلکہ یہ بھی بتایا جائے کہ قرض کی بابت گزشتہ ماہ میں جملہ لین دین کتنا ہوا۔ اگر کوئی حساب نہ رکھا جائے تو عدالت قرضدہندے کو کسی مقدمے میں واجب الوصول سود سے کلی یا جزئی طور پر محروم کر سکتی ہے اور خرچۂ عدالت بھی اس کے ذمے عائد کر سکتی ہے۔ انگریزی ایکٹ کی رو سے قرضدہندوں کے لیے اجازت نامے حاصل کرنا ضروری ہے، سود در سود ممنوع قرار دیا گیا ہے اور قرضدہندوں پر لازم ہے کہ وہ قرضداروں کے مطالبے پر قرضے کی حالت کی بابت متعلقہ دستاویزات کی تحریری نقلیں

[1] (Punjab Regulation of Accounts Bill)

اور معلومات بہم پہنچائیں۔ کمیشن یہ خیال کرتا ہے کہ اس قسم کے قوانین کے نفاذ سے اعتبار میں انقباض پیدا ہونے کا کوئی خطرہ نہیں ہے، اس لیے کہ امداد باہمی کی تحریک، منتظم اعتباری نظام قائم کر رہی ہے، علاوہ ازیں وہ اصل بھی لازمی طور پر کاروبار کے لیے مل جائے گا جو اس وقت قرضے کی شکل میں مصروف ہے۔ زرعی کاروبار کی جائز ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے دیانت دارانہ کاروبار کا وسیع میدان آیندہ کئی سال تک باقی رہے گا" (دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ فقرہ ۳۶۶)۔[1]

بنک کاری کی مختلف صوبہ واری تحقیقاتی کمیٹیاں ساہوکاروں کو اجازت نامے جاری کرنے کی عملی ضرورت کے بارے میں متفق نہیں ہیں[2]۔ بمبئی کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی ساہوکاروں کو اجازت ناموں کا پابند بنانے کی اس بنا پر مخالفت کرتی ہے کہ یہ طریقہ ناقابل عمل ہے۔ وہ یہ استدلال کرتی ہے کہ ہندوستان میں بے لکھے پڑھے قرض گیرندوں سے سابقہ پڑتا ہے جو لین داروں پر بھروسا کرتے ہیں اور ان کا اعتماد کھونا نہیں چاہتے۔ قانون وضع اور منظور کرنا اس لیے بھی تحصیل حاصل ہے کہ ساہوکار اپنی مستحکم حیثیت کی وجہ سے اس سے بچ سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں قانون امداد مزارعین دکن کے علمدرآمد کے تجربے سے یہ معلوم ہوا کہ قرض دہندوں پر جتنی زیادہ بندشیں عائد کی جائیں گی اتنی ہی قرض گیرندوں کی حیثیت زیادہ خراب ہوتی جائے گی۔

[1] بشر ڈارلنگ اس بارے میں کم رجائی ہیں اور وہ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ سودی قرض کے لین دین کے پیچ در پیچ تفصیلات اور مقررہ فرد حساب کے نفاذ کی دقتیں ایسے موضوعہ قانون کی کامیابی کے خلاف عمل کرتی ہیں۔ یہ قانون زمانے سے بہت آگے بڑھا ہوا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ زمانے سے پیچھے رہ جائے اس لیے کہ امداد باہمی کی تحریک کی توسیع اور جدید سہولتوں کی سریع ترقی گو ساہوکار کو ابھی تک زیر نہیں کر سکا ہے لیکن اس کی بربادی یقینی ہے (دیکھو ان کی محولۂ بالا تصنیف صفحہ ۲۱۶)

[2] اجازت یافتہ ساہوکاروں کے حقوق اور اجازت ناموں کے مجوزہ شرائط کے بارے میں تفصیلات کے لیے دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ (فقرہ ۱۲۰ تا ۱۲۱)۔

قرض دہندوں میں ان لوگوں کی بڑی جماعت کو شامل کرنے کا انتظام کرنا بھی دقت طلب ہوگا جو اگرچہ خود قرض دہندے نہیں ہیں لیکن اپنا زائد از ضرورت زرگاہ گاہ دوسروں کو بطور قرض دیتے ہیں۔ بمبئی کی کمیٹی یہ خیال ظاہر کرتی ہے کہ موجودہ صورت حال کی بڑی حد تک اصلاح کی جاسکتی ہے، بشرطیکہ ایسے قوانین وضع کئے جائیں جو قانون تنظیم حسابات پنجاب (بابت ۱۹۳۰ء) کے اصول کے مطابق ہوں۔ ایسا قانون دیانت دار فریقین کی حیثیت کو محفوظ بنادے گا، معاملات کی سرگزشت کو جانچنے میں عدالتوں کے کام میں سہولت پیدا کرے گا اور عدالت میں پیش ہونے والی جھوٹی شہادتوں میں بڑی حد تک کمی کر دے گا۔ کمیٹی مذکور یہ بھی مشورہ دیتی ہے کہ قرض دار کو ایک مقررہ نمونے کی پاس بک دیے جانے اور اس میں حسابات پابندی سے درج کئے جانے کا انتظام کیا جائے۔ اگرچہ گزشتہ زمانے میں یہ طریقہ کامیاب ثابت نہیں ہوا ہے لیکن وہ یقیناً تعلیمی قدر و قیمت رکھتا ہے اور کسانوں کی جماعت پر مفید اثر ڈالے گا۔ اس ایکٹ کو وسعت کے لحاظ سے ایسے اشخاص تک محدود رکھا جاسکتا ہے جو باقاعدہ کاروبار کے طور پر قرضے دیتے ہیں[۱]۔ لیکن پنجاب کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی قانون تنظیم حسابات پنجاب کو ایک تجربہ قرار دیتی ہے کہ اس کی تقلید کرنے سے بیشتر اس کو جانچنا غالباً زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ کمیٹی یہ خیال ظاہر کرتی ہے کہ ہزاروں قرض دہندوں کی طرف سے لاکھوں کسانوں کو ششماہی فرد حسابات کی روانگی اور سپردگی بہت مشکل کام ہے۔ اگر ان مشکلات اور دوسری دقتوں کے رفع کرنے میں کامیابی ہو تو قانون لین دار اور دین دار دونوں کو زیادہ کاروباری بنانے میں مدد دے سکتا ہے۔ آسام کی کمیٹی بھی اسی کے

۱۔ دیکھو بمبئی کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ ۲۴۲ تا ۲۴۳، نیز بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ ۱۱۸ تا ۱۱۹۔

باب

مماثل خیال ظاہر کرتی ہے[1]۔ صوبۂ متحدہ کی کمیٹی، دوسری چیزوں کے منجملہ موجودہ زمانے میں عوام کی ناخواندگی اور اس واقعے کے مدنظر کہ دیہی ساہوکار کو بھی کسان ہی کی طرح تعلیم کی ضرورت ہے، ساہوکار کی نگرانی اور روک ٹوک کی مناسبت کو شک وشبہے کی نظر سے دیکھتی ہے (فقرہ ۷۷۴ تا ۷۸۴)۔ اس کے برخلاف بنگال کی کمیٹی یہ خیال کرتی ہے کہ پیشہ ور قرض دہندوں کے خلاف کسی تنظیم کو نافذ کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کو اجازت نامے جاری کئے جائیں اور ان کا نام اور پتہ درج رجسٹر کیا جائے۔ وہ یہ رائے ظاہر کرتی ہے کہ قرض دہندوں کو اس کے خلاف غم وغصے کا اظہار کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ رجسٹری اور اجرائے اجازت نامہ جات کا طریقہ معززترین پیشوں میں سے ایک کے ارکان یعنی وکیلوں اور قانون دانوں کے بارے میں رائج ہے۔ کمیٹی یہ چاہتی ہے کہ ایسی تنظیم پیشہ ور قرض دہندوں تک محدود رہے اور گاہ گاہ قرضہ دینے والے مستثنیٰ رکھے جائیں (فقرہ ۳۲۰)۔ صوبۂ متوسط کی کمیٹی بھی ساہوکاروں کی تنظیم بذریعۂ لائیسنس کی حمایت اس خیال کے مدنظر کرتی ہے کہ کالی بھیڑیں چھنٹ جائیں اور قرض دہندوں کا طبقہ فاسد مادے سے پاک صاف ہو جائے (فقرہ ۱۶۷۸ تا ۱۶۸۰)۔ برما کی کمیٹی یہ چاہتی ہے کہ رنگون کے پیشہ ور قرض دہندوں کے بارے میں مذکورۂ بالا طریق پر ابتدا کرے (فقرہ ۷۰۴)۔

301

مذکورۂ بالا تبصرے سے معلوم ہوگا کہ گو سخت گیر اور غیر دیانت دار قسم کے قرض دہندے کے خلاف قرض گیرندے کو محفوظ کرنے کی ضرورت کے بارے میں اختلاف آرا نہیں ہے، تاہم طریق عمل کے بارے میں اتفاق نہیں ہے۔ چنانچہ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بمبئی کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی اور مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کے مجوزہ طریق کار کے بموجب احتیاط کے ساتھ ابتدا کی جائے۔ موخرالذکر کمیٹی نہ تو قرض دہندوں کو اجازت نامے عطا کرنے کے جبری طریق کی تائید کرتی ہے اور نہ اختیاری طریق کی، لیکن یہ سفارش کرتی ہے کہ دوسرے

[1] دیکھو پنجاب اور آسام کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹیوں کی رپورٹوں کے فقرے علی الترتیب (۱۶۲) اور (۱۷۰)

صوبوں کی حکومتیں بھی "قانون تنظیم حسابات پنجاب" کے شرائط کو نافذ کرنے پر غور کریں۔ قرض ادا کرنے میں تاخیر واقع ہونے کی بنا پر سود کا بڑھانا قانوناً ناجائز ہونا چاہئے۔ ساہوکار کو اس کی اجازت نہ دینی چاہئے کہ وہ قرض گیرندے کو قرضہ دینے کے عارضی مصارف قرض گیرندے ہی سے وصول کرے۔ قرضے کی واپسی کا کوئی معاہدہ اس وقت تک قابل نفاذ نہ ہونا چاہئے جب تک کہ وہ قرض گیرندے کے دستخط سے تحریر میں طے نہ پائے۔ کمیٹی سود در سود کے امتناع کی اس لیے مخالفت کرتی ہے کہ اس کی وجہ سے تازہ تمسکات پر قرضوں کی غیر ضروری اور جلد جلد تجدید شروع ہوجائے گی اور سود اصل میں جمع کیا جانے لگے گا۔ موجودہ زمانے کے مقابلے میں اس صورت میں ساہوکار عدالتوں میں جلد جلد رجوع ہونے پر مجبور ہو جائے گا اور اس طرح نہ صرف اس کے مصارف میں اضافہ ہوگا بلکہ قرض گیرندے پر عائد کردہ سود بھی بڑھ جائے گا۔[1] یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ انجمن قرضہ امداد باہمی اور زمین گروی بنک کی طرح کی دوسری اعتباری ایجنسیوں کی مسابقت آخر کار قرض دہندے کو مجبور کرے گی کہ وہ اپنی شرحوں میں کمی کرے اور اپنے طریق کار کو بدل ڈالے۔ چنانچہ یہ مناسب نہیں ہے کہ معاملات کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے جس سے اس خوشگوار مقصد کی تکمیل میں تاخیر واقع ہو۔[2]

۹۔ قرضوں کا تصفیہ بذریعہ مصالحت

جیسا کہ بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی نے مشورہ دیا ہے یہ معلوم کرنے کی سنجیدہ کوشش کرنی چاہئے کہ کسان کی دیرینہ قرضداری کو کم از کم غیر پیدا آور قرضے کی حد تک کس طرح دور کیا جا سکتا ہے۔ کمیٹی مذکور کے خیال میں سب سے موثر علاج یہ ہے کہ صوبہ واری حکومتیں بذریعہ مصالحت قرضہ ادا کرانے کی سرگرم پالیسی پر عمل پیرا ہوں۔ اس غرض کیلئے ہر صوبہ میں خاص افسر مقرر ہونے چاہئیں جن کا کام یہ ہو کہ پروپگنڈا کے ذریعے سے لین دار اور دین دار کو یہ

302

---

[1] دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ ۱۱۲ اور ۱۲۲)

[2] قرض دہندوں کی رجسٹری کے متعلق فقرہ جو مسودہ قانون تحفظ قرضداران پنجاب کی اہم شرطوں میں سے تھا، دوسری خواندگی کے موقع پر نومبر ۱۹۳۵ء میں مسترد کر دیا گیا۔ اختلاف کے وجوہ میں سے ایک یہ تھی کہ بنک کاری کی تحقیقات کے اعداد و شمار کے مطابق پنجاب میں کم و بیش ۱۹۰۰ زرعی قرض دہندے تھے۔

ترغیب دیں کہ باہمی سمجھوتے کی بنا پر موجودہ قرضے کو بشکل نقد فوراً یا مساوی اقساط میں چند سالوں کے اندر رہبے باق کردیں۔ موجودہ انجمن ہائے امداد باہمی کو ایسی ایجنسی کے طور پہ کام میں لانا چاہیئے جو قرض گیرندہ کی طرف سے لین دار کو قرضہ ادا کرے اور قرض گیرندہ کو انجمن امداد باہمی کا رکن بنانا چاہیئے تاکہ انجمن اس کی آیندہ روزمرہ کی ضرورتیں پوری کر سکے۔ حکومت کو چاہیئے کہ انجمن ہائے امداد باہمی کو پیشگیاں ادا کرنے کا باقاعدہ نظام عمل بنائے تاکہ جب لین دار نقد کا مطالبہ کرے تو انجمن قرضدار کو (جو اس کا رکن ہو) ادائی کے لیے زر دے سکے۔ اگر ضرورت ہو تو یہ کل انتظام وضع قوانین کے ذریعے سے روبہ عمل لانا چاہیئے۔ ایسی صورتوں میں جبکہ لین دار باہمی رضامندی سے قرضے کے تصفیے کے لیے تیار نہ ہو' یہ ضروری ہوگا کہ قانون وضع اور نافذ کرکے جبری تصفیے کی کارروائی کی جائے[1]۔

۱۰۔ قرضے کی بذریعۂ مصالحت ادائی کے متعلق حال میں وضع کردہ قوانین

چونکہ کساد بازاری کے باعث زرعی پیداوار کی قیمتوں میں کمی واقع ہوئی تھی اور مقروض کسانوں کے طبقے پر اس کا بہت برا اثر پڑا' اس لیے قریب قریب کل صوبہ واری حکومتوں نے دیہی قرضوں کی بذریعۂ مصالحت ادائی کے مسئلے پر توجہ دی۔ چنانچہ دیہی قرض دار کی امداد کی غرض سے جس کی سخت ضرورت تھی کئی آئین و قوانین جو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی سفارشوں پر مبنی تھے' منظور کئے گئے۔ اس قسم کے آئین و قوانین کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ انجمن ہائے مصالحت قرضہ قائم کئے گئے ہیں۔ اس معاملے میں صوبۂ متوسط و برار کی حکومت سب سے پہلی حکومت ہے جس نے قانون ادائی قرضہ بذریعۂ مصالحت کی رو سے جو فروری ۱۹۳۳ء میں منظور ہوا انجمن ہائے مصالحت قرضہ قائم کرنے کا تجربہ شروع کیا۔ اس امر کا لحاظ کرتے ہوئے کہ صرف فریقین کی باہمی رضامندی ہی سے قرض کی ادائی ہو سکتی ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت تک جتنی ترقی ہوئی ہے وہ اطمینان بخش ہے۔

---

[1] دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ (فقرہ ۹۱ تا ۹۲)۔

صوبۂ متوسط کے اکثر اضلاع میں انجمن ہائے مصالحت قرضہ قائم ہو چکی ہیں، اور ایک سرکاری اطلاع کے مطابق جو اخبارون میں حال ہی میں شائع ہوئی ان انجمنوں نے اگست ۱۹۳۵ء کے ختم تک ۱۲۸۰۳۲ لاکھ روپے کا قرضہ ۱۶۵۰۷ لاکھ روپے میں بے باق کروا دیا اور اس طرح مطالبات کا ۴۹ فی صد حصہ معاف کرا دیا۔ علاوہ ازیں ۲۱۰۸ مقدمات میں جن میں مطالبات کی مقدار ۲۳۰۹۴ لاکھ روپے تھی، اس مضمون پر مشتمل صداقت نامے جاری کیے گئے کہ لین داروں نے بذریعۂ مصالحت تصفیہ سے غیر معقول طور پر انکار کیا۔ یہ قرضہ جن لین داروں کو وصول طلب ہے وہ نالش کر کے نہ تو خرچے کے حق دار ہو سکیں گے اور نہ صداقت ناموں کے اجرا کی تاریخ کے بعد سے کوئی سود وصول کر سکیں گے بجز ۶ فی صد سالانہ سادہ سود کے جو صداقت نامہ جاری کرنے کی تاریخ سے واجب الادا رقم پر لگایا جائے گا۔ قرضے کی اقساط دین داروں کی ادائی کی صلاحیت کے لحاظ سے مقرر کی جاتی ہیں، اور جو قرضے بطریق مصالحت ادا کئے جاتے ہیں ان پر آیندہ کوئی سود نہیں لگایا جاتا۔ حکومت صوبۂ متوسط یہ بیان کرتی ہے کہ ان انجمنوں کی جد و جہد نے خانگی طور پر دین داروں کی بندلۂ مصالحت ادائی کے حق میں محرک کا کام کیا، اور یہ کہ انجمنوں کی مساعی نے روزمرہ کی ضرورتوں کے واسطے لئے جانے والے زرعی قرضوں میں کوئی بڑی کمی نہیں کی۔ بعض دوسرے صوبوں نے بھی صوبۂ متوسط کے تجربے کی تقلید کی۔ چنانچہ ہم پنجاب کا خاص طور پر ذکر کر سکتے ہیں جہاں ۱۹۳۴ء میں "قانون امداد قرضداری" نافذ کر کے انجمن ہائے مصالحت قرضہ کا طریقہ رائج کیا گیا ہے۔ مقامی حکومت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ ایسی انجمنیں قائم کر کے لین داروں اور دین داروں میں باہمی رضامندی سے تصفیہ کرائے بشرطیکہ قرضے کی مجموعی مقدار دس ہزار روپے سے زائد نہ ہو۔ انجمن ایک صدر اور حکومت کے مقرر کئے ہوئے دو یا دو سے زائد ارکان پر مشتمل ہوتی ہے۔ تصفیے کی غرض سے لین دار یا دین دار کی طرف سے انجمن کو درخواست دی جا سکتی ہے۔ راضی نامہ ہو جانے کے بعد عدالت دیوانی کے فیصلے کے ہم پلہ سمجھا جاتا ہے صوبۂ متوسط کی طرح

یہاں بھی یہ شرط موجود ہے کہ اگر لین دار مناسب پیش کش قبول کرنے سے انکار کرے تو دین دار کو صداقت نامہ دیا جاسکتا ہے۔ اس انجمن کے فیصلے قطعی اور آخری ہوتے ہیں۔ "دام دوپٹ"[1] کے قاعدے کی پابندی کی جاتی ہے۔ صوبۂ متحدہ میں بھی انجمن ہائے مصالحت قرضہ قائم ہیں۔ بنگال میں ایک مسودۂ قانون بنام "بنگال کے زرعی قرض داروں کا قانون" حال ہی میں پیش کیا گیا ہے، اور ایک منتخب کمیٹی نے اس کی تائید میں رپورٹ پیش کی ہے۔ یہ مسودۂ قانون صوبۂ متوسط اور پنجاب کے قوانین کے مطابق بنایا گیا ہے۔ مدراس میں حکومت کے مقرر کئے ہوئے ایک خاص افسر نے قرضوں کا بار گھٹانے کی غرض سے حال ہی میں یہ رپورٹ پیش کی کہ انجمن ہائے مصالحت قرضہ قائم کئے جائیں، نیز ایک غیر سرکاری مسودۂ قانون کی اصولی طور پر تائید کی جو صوبۂ متوسط کے ایکٹ کے نمونے پر مرتب کیا گیا ہے۔ بمبئی میں بھی آج کل اسی قسم کا ایک غیر سرکاری مسودۂ قانون زیر غور ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ انجمن ہائے مصالحت قرضہ کی کامیابی کی شرط یہ ہے کہ وہ امداد باہمی کے زمین گروی بنکوں سے مل کر کام کریں، تاکہ کسان کو یا اس لین دار کو جو اپنے مطالبے کے بارے میں مصالحت کرنے کے لیے تیار ہو ضروری امداد مہیا ہوسکے۔ اسی لیے حکومت صوبۂ متوسط نے ۱۹۳۲ء میں امداد باہمی کے دس زمین گروی بنک ایسے مقامات پر قائم کئے جہاں قرضوں کا بار صوبے بھر میں سب سے زیادہ ہے۔

صوبۂ متوسط اور دوسرے علاقوں میں یہ خیال نشوونما پاچکا ہے کہ اگر قرضوں کے تصفیہ بذریعۂ مصالحت کے طریق کو بجا طور پر ترقی دینا ہے تو اس میں "ارادی" اور "اختیاری" اصول کو نکال کر اس کی جگہ "جبری" اصول رکھنا چاہئے۔ بنگال کے مسودۂ قانون میں، اگرچہ کوشش تو یہ کی گئی ہے کہ اختیاری طریق پر قرضوں کا تصفیہ کرایا جائے، لیکن ایسی انجمنیں قائم کرنے کی

[1] دگنی قیمت، دگنے دام۔

گنجائش بھی رکھی گئی ہے جن کو یہ اختیارات حاصل ہوں کہ اگر لین دار باہمی سمجھوتے کی بنا پر قرضہ چکانے سے انکار کریں تو ان کو مختلف طریقوں سے مجبور کیا جائے۔ لیکن "جبری" اصول کو استعمال کرنے کے لیے اس لیے بہت احتیاط کی ضرورت ہے کہ ہر وہ قانون جو لین دار میں خوف و اضطراب پیدا کرے گا کسان کی ساکھ پر مضر اثر ڈالے گا، کیونکہ وہ مالی امداد کے لیے ابھی تک قرض دہندے ساہوکار ہی پر انحصار کرتا ہے۔ لیکن انجمن ہائے مصالحت قرضہ کو ایسے اختیارات حاصل ہونے چاہئیں، جن کی بنا پر وہ خود قرضوں کی تحقیق شروع کر سکیں۔

بھاؤنگر، میسور اور ٹراونکور، جیسی بعض ہندوستانی ریاستوں نے بھی انجمن ہائے مصالحت قرضہ قائم کرنے کے بارے میں تدابیر اختیار کی ہیں چنانچہ سب سے نمایاں کامیابی بھاؤنگر میں ہوئی ہے، یہاں قرضوں کا تصفیہ اور ان میں بڑی حد تک کمی کر دینے کے بعد باقی رقم کی ادائی کو دربار نے اپنے ذمے لے لیا اور لین داروں کے مطالبات کو تمام و کمال پورا کر دیا۔ لیکن یہ امر بخوبی ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ برطانوی ہند میں بذریعہ مصالحت قرضہ چکانے کی کسی تجویز کو کامیابی کی ویسی ہی توقعات کے ساتھ اور اتنی آسانی سے عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکتا، جس طرح کہ بھاؤنگر جیسی چھوٹی ریاست میں ممکن ہوا۔ اس لیے کہ یہاں نہ صرف والئ ریاست مالگزاری کا بقایا معاف کرنے کے لیے تیار تھا بلکہ ایک قابل اور نیک دل مشیر سر پربھاشنکر پٹانی موجود تھا، اور ساہوکار بھی حقیقی صورت حال سے متاثر ہو کر اپنی ذہنیت بدلنے اور اپنے مطالبات میں ۲۵ فی صد کمی کرنے کے لیے آمادہ تھے۔ اس کے برخلاف کسی برطانوی صوبے میں کئی مشکلات حائل ہوتی ہیں، اس لیے کہ یہاں آبادی بھی بہت زیادہ ہوتی ہے، اور قرض دہندے اور لین دار بھی غیر متجانس ہوتے ہیں[1]۔ آخر میں

[1] دیکھو (Indian Co-operative Review) بابت اپریل ۱۹۳۵ء صفحہ (۱۴۹)۔

باب ۹

یہ کہدینا مناسب ہوگا کہ بذریعۂ مصالحت قرض چکانے کا مقصد صرف دیہی قرض داری کے اصلی اسباب کو دور کرنا ہے نہ کہ آیندہ قرض داری سے باز رکھنا، اور اسی لیے اس کا افادہ بھی محدود ہے۔

۱۱۔ انتقال اراضی پر بندشیں۔ انیسویں صدی کے آخری چالیس یا پچاس سال کے عرصے میں، ہندوستان میں قریب قریب ہر جگہ "حقوق ملکیت" اور "حقوق کاشت" کی قدر و قیمت بہت بڑھ گئی، جس کی وجہ سے کسان کے اعتبار میں بے نظیر توسیع عمل میں آئی لیکن اس اعتبار کو بڑی حد تک غلط طریقے پر استعمال کیا گیا۔ جاہل اور غیر کفایت شعار کسانوں کے طبقے کو بیش قیمت زمین کی اعلیٰ کفالت کی، بنیاد پر بے سوچے سمجھے قرضے لینے سے باز رکھنے کے لیے کسی قسم کی احتیاطی تدبیریں اختیار نہیں کی گئیں، نتیجہ یہ ہوا کہ زمین کسان کے قبضے اور ملکیت سے بسرعت نکلتی گئی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ حکومت انتقال اراضی کو روکنے کی بجائے ابتداءً انتقال اراضی کا دراصل خیر مقدم کر رہی تھی۔ خیال یہ کیا گیا تھا کہ انتقال اراضی میں سہولت پیدا کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زمین ایسے کسانوں کے قبضے میں آجائے گی جن کے پاس اس سے پوری طرح کام لینے کے کافی ذرائع ہوں۔ چنانچہ بمبئی کی "مشترکہ رپورٹ" کے مصنفوں نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ انتقال اراضی میں سہولت پیدا کرنے کے لیے خاص تدبیریں اختیار کرنی چاہئیں، خاص کر اس لیے کہ ملک کے رسم و رواج انتقالات اراضی کے خلاف تھے۔ بہر حال حکومت کو رفتہ رفتہ اس امر کا احساس ہوا کہ غیر کاشتکار طبقے کو اراضی کی منتقلی ایسی حالت پر پہنچ گئی تھی جو معاشی اور سیاسی دونوں حیثیتوں سے خطرناک تھی اور اس لحاظ سے یہ ضروری خیال کیا گیا کہ آزادانہ انتقال کی روک تھام کی جائے۔ اراضی کے آزادانہ انتقالات پر قانونی بندش عائد کرنے کے حامیوں کا مقصد یہ تھا کہ اولاً زمین کو غیر کاشت کار طبقوں کے ہاتھوں میں منتقل ہونے سے روکا جائے، اگرچہ انھوں نے ایسی بندش کے ثانوی اثر یعنی اعتبار کی کمی کا بھی اس لیے خیر مقدم کیا کہ

باب ۸

اس کی بدولت یہ قرینہ تھا کہ کسانوں کا طبقہ جس رفتار سے قرضے حاصل کر رہا تھا اس میں کمی ہو جائے گی۔ چنانچہ کسی نہ کسی شکل میں یا تو عملی تدبیر اختیار کی گئی یا اس پر عمل کرنے کے متعلق غور کیا گیا؛ اور اس کی سب سے نمایاں مثال پنجاب کی ہے۔ "قانون انتقال اراضی پنجاب" (بابت ۱۹۰۰ء) کے تحت غیر زرعی طبقوں کو نہ تو کسی زرعی طبقے کے رکن سے زمین خریدنے کی اجازت ہے اور نہ زمین کو بیس سال سے زیادہ کے لیے رہن لینے کی۔ ساہوکار کو ملکی کاشتکار کی زمین چھین لینے یا اس کو بے دخل کرنے سے باز رکھنے میں اس قانون کی کامیابی یقینی ہے۔ تاہم اس قانون میں کچھ نقص یا غالباً کئی نقائص پائے جاتے ہیں۔ اولاً یہ کہ ایک تعلیم یافتہ شہری کو اپنی پونجی، ذہانت اور جو صلہ مندی کے ذریعے سے زمین رہن لینے کی اجازت نہیں۔ کو پورا کرنے میں جو مشکلات پیش آتی ہیں وہ زرعی ترقی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ اس کے برخلاف انگلستان میں زراعت کی ترقی کا بڑا سبب سب سے بڑا سبب اسی قسم کی روشن خیال جو صلہ مندی ہے بلکہ خود زراعت پیشہ طبقے اعتبار کی اس ناگزیر تقلیل سے متاثر ہوئے ہیں۔ دوسری بڑی اور خلاف امید خرابی یہ ہوئی کہ زراعت پیشہ ساہوکار نمودار ہونے لگے اور ان کا اثر بڑھنے لگا۔ قانونی بندشیں اس کی حد تک کارگر ثابت نہیں ہوئیں، اور وہ اپنی مخصوص و محفوظ حیثیت سے فائدہ اٹھا کر اپنے بھائی کسان کا خون اسی طرح بے دردی کے ساتھ چوستا ہے جس طرح کہ قدیم ساہوکار۔ اس لحاظ سے جہاں قانون نے کسانوں کے قبضے میں زمین کو باقی رکھنے میں معقول حد تک مدد دی ہے، وہیں اس امر میں شبہہ ہے کہ آیا اس نے قرض داری کی خرابی کو معقول حد تک رفع کیا ہے۔[1]

---

[1] دیکھو ڈارلنگ کی کتاب محولۂ بالا صفحہ ۳۰۰ اور صفحہ ۲۱۰ اور پنجاب کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ ۵۰۰۔ ۱۹۰۳ء میں بندیل کھنڈ میں بھی اسی کے مماثل "انتقال اراضی کا قانون" منظور ہوا۔ صوبۂ متوسط اور بمبئی میں جو بندشیں قدیم وحشی اقوام کی طرف سے انتقال اراضی کے بارے میں عائد کی گئی تھیں تاحال موجود ہیں۔

۱۲۔ زر اور اعتبار کی رسد[1]

"تقاوی قرضے" ہندوستان میں رعیت کی سرکاری امداد کی بہت ہی دیرینہ شکل ہیں، اور برطانوی حکومت نے بھی سنہ ۱۸۷۱ء، سنہ ۱۸۷۶ء اور سنہ ۱۸۷۹ء میں علی الترتیب کئی قوانین تقاوی منظور کیے۔ لیکن حقیقی امداد کا کوئی کام اس وقت تک انجام نہیں پایا جب تک کہ قحط کمیشن (سنہ ۱۸۸۰ء) کی سفارش کی بنا پر قانون قرضہ جات برائے اصلاح و ترقی اراضی (بابت سنہ ۱۸۸۳ء) اور قانون قرضہ بہ کاشتکاران بابت سنہ ۱۸۸۴ء منظور نہیں ہوا۔ اول الذکر قانون کے تحت یہ طے پایا کہ زمین کی مستقل اصلاح و ترقی، مثلاً: کنوؤں کی کھدائی اور پشتوں کی بنوائی کے لیے قرضے دیے جائیں اور موخر الذکر قانون کے تحت قلیل مدت کے قرضے زرعی ضرورتوں مثلاً تخم، مویشی، کھاد، آلات کشاورزی وغیرہ کے لیے دئے جانے لگے۔ یہ قرضے کسانوں کے لیے خاص گران کے آڑے وقت میں بہت مفید ثابت ہوئے، چنانچہ ان کی بدولت سود کی مروجہ شرحوں میں کمی ہوگئی اور زر کے مقامی دیہی بازار اور وسیع تر بازار میں جہاں سے حکومت بعض اوقات اس غرض کے لیے قرضہ لیتی ہے ایک حد تک تعلق قائم ہوگیا۔

لیکن تقاوی قرضوں کو کبھی قبول عام حاصل نہیں ہوا۔ آبپاشی کمیشن (سنہ ۱۹۰۱ء تا سنہ ۱۹۰۳ء) نے یہ اندازہ قائم کیا ہے کہ اس طرح قرض پر دی ہوئی رقم کی مجموعی مقدار ۶ کروڑ روپیہ تھی جو گویا سمندر میں ایک قطرہ تھی۔ بنک کاری کی صوبہ واری تحقیقاتی کمیٹیوں نے مذکورۂ بالا دو قوانین کے تحت دئے ہوئے قرضے کے جو اعداد مرتب کئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ

---

[1] موجودہ زمانے میں دیہات میں قرضہ حاصل کرنے کے ذرایع یہاں بیان کردینا مناسب ہوگا:- (۱) ساہوکار قرض دہندے پیشہ ور اور غیر پیشہ ور دونوں (جن میں ادھار فروخت کرنے والے بھی شامل ہیں) (۲) ملکی ساہوکار (۳) امداد باہمی کی انجمنیں۔ (۴) حکومت۔ (۵) تجارتی بنک بشمول امپیریل بنک آف انڈیا، مبادلۂ بنک اور مشترک سرمائے کے بنک (۶) بنگال کی قرضے کی کوٹھیاں۔ (۷، ۸) اس میں نیدھی اور چٹ فنڈ۔ دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، (فقرہ ۱۰۴)۔

باب ۹

حکومت نے دیہی قرضے کی بہم رسانی کے معاملے میں بہت ہی حقیر حصہ لیا[1]۔ یہ قرضے صرف مخصوص اغراض کے لیے دیئے جاتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کسان اپنی ساکھ کو ساہوکار کے پاس خطرے میں ڈالنے کے بجائے جس سے وہ (کسان) تمام اغراض کے لیے قرضے لے سکتا ہے سرکاری قرضہ لینے سے باز رہنے کو اس وقت تک ترجیح دیتا ہے جب تک کہ وہ قطعی طور پر مجبور نہ ہو جائے۔ یہ ناممکن ہے کہ سرکاری قرضوں کے کسی نظام کو ساہوکارے کے نظام کی طرح لچکدار اور تغیر پذیر بنایا جائے۔ تقاوی کے طریق میں ایک اور مجبوری یہ ہے کہ قرضے کی واپسی میں سخت گیری کی جاتی ہے جس کی بنا پر یہ طریق غیر مقبول بن جاتا ہے۔ ان سب پر طرّہ تقاوی کی تقسیم میں بے انتہا تاخیر، دفتر کے تحتانی اہلکاروں کی نوچ کھسوٹ اور محکمۂ مالگزاری کے نظم ونسق کی عادتی ضابطہ پسندی جیسے نقائص ہیں۔ اس نظام کی نگرانی بھی غیر معمولی طور پر دشوار رہی، اور وہ معاملے کی تہ کو اس لحاظ سے نہیں پہنچا کہ وہ رعیت کے عادات و خصائل پر کوئی تعلیمی و تربیتی اثر ڈالنے سے قاصر ہے؛ بلکہ بعض لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ وہ رعیت کے لیے مخرب اخلاق ہے۔ آخر میں یہ کہ چونکہ حکومت کا اعتبار اور اس کے ذرائع محدود ہیں، لہٰذا مطلوبہ حد تک قرضہ نہیں دیا جا سکتا[2]۔ یہ طریقہ زراعت کو مالی مدد دینے کا عام ذریعہ ہونے کی حیثیت سے ناکام ہے اگرچہ مخصوص قحط زدہ اور پسماندہ علاقوں میں وہ محدود افادہ رکھتا ہے[3]۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت تقاوی کے انتظام کی اصلاح و ترمیم کی ضرورت کو محسوس کر رہی ہے۔ چنانچہ اس کی مثال کے طور پر ہم اس موضوع پر حکومت کی حال کی ایک قرارداد کا حوالہ دے سکتے ہیں جس میں تخمت طریق کارکو

307

[1] دیکھو "بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ" فقرہ ۲۳۱۔

[2] دیکھو ولف کی کتاب محولۂ بالا، ص۱ تا ص۳۔

[3] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ (روئداد شہادت) جلد سوم سرینواس آچاریار کی شہادت، نیز بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ (۲۴۱)۔

باب ۹

نرم بنانے کے متعلق ہدایات ہیں۔ سنہ ۱۹۱۷ء میں زراعتی بورڈ نے یہ سفارش کی کہ تقاوی قرضے زیادہ آزادی کے ساتھ دئے جائیں تاکہ محکمہ جات زراعت کی سفارش کی بموجب رعیت کھاد، ترقی یافتہ تخم اور آلات کشاورزی خرید سکے۔ بمبئی میں سنہ ۱۹۲۲ء میں مرتب کردہ قواعد کے مطابق حکومت نے مستقل اصلاح و ترقی کی غرض سے ان طویل مدت کے قرضوں کی تقسیم کرنے کے لیے محکمۂ امداد باہمی کی وساطت سے فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ اس غرض کے لیے پراونشل کوآپریٹو بنک (بمبئی) کو سالانہ ایک مشخص رقم دی جاتی ہے۔ تقاوی قرضوں کے کل نظام پر بنک کاری کی مختلف صوبہ داری تحقیقاتی کمیٹیوں اور مرکزی کمیٹی[۱] نے حال ہی میں (سنہ ۱۹۲۹ء تا سنہ ۱۹۳۰ء) تبصرہ کیا ہے اور کئی مفید سفارشیں پیش کی گئی ہیں:۔ مثلاً اطلاعات عامہ کے ایک محکمے کی تخلیق۔

منظورہ ایکٹس یا قوانین کے باہر حکومت نے بعض مشہور خاندانوں مثلاً[۲] ٹاگور خاندان کو تباہی سے بچانے کے لیے وقتاً فوقتاً قرضے دئے۔ علاوہ ازیں حکومت نے زیر بار جاگیروں کے قوانین[۳] اور کورٹ آف وارڈز کے قوانین کی رو سے بڑی جاگیروں یا معین رقبے کے مقروض املاک کی طرف سے خاص تدابیر اختیار کرنے کا اقتدار اس غرض سے حاصل کیا کہ زیر بار جاگیروں کی مدد کی جائے اور ایسی زمینداریوں کو تباہی سے بچایا جائے جن کے بصورت دیگر دیوالیہ ہو جانے کا امکان ہو۔

---

[۱] بنگال کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی "قانون قرضہ جات اصلاح و ترقی اراضی" کے ایک اساسی نقص کی جانب اشارہ کرتی ہے اور یہ خیال ظاہر کرتی ہے کہ اسی نے قانون کی سود مندی کو گھٹا دیا ہے۔ اس کے تحت قدیم قرضوں کی ادائی اور کھیتیوں کے استمال و انضمام کے لئے حکومت کی جانب سے قرضے منظور نہیں کئے جا سکتے حالانکہ زرعی ترقی کے یہی دو اساسی لوازم ہیں۔ (دیکھو رپورٹ فقرہ ۱۳۰)۔

[۲] دیکھو رپورٹ کا فقرہ ۲۳۸ تا ۲۴۵۔

[۳] (Encumbered Estatcs Actes)

لیکن یہ سب تدبیریں قرض داری کے اہم مسئلے کو حل کرنے سے قاصر رہیں اور کسانوں کے لیے اعتبار اور قرضے کا مناسب اور ارزاں طریقہ تا حال مفقود ہے۔ جیسا کہ مسٹر ایوبنک نے کہا ہے "محض وضع قوانین کے ذریعے نافذ کردہ حکم، معاشی قانون کے عمل درآمد کی تنظیم نہیں کرسکتا"۔ حکومت نے ۱۸۸۲ء ہی میں اس کو محسوس کرلیا تھا؛ چنانچہ وائسرائے نے وزیر ہند کے موسومہ مراسلے میں اس بات پر زور دیا کہ رباخوار کے جانشین کے طور پر خانگی بنک قائم کیا جائے اور قرضہ ادا کرنے کے قابل اسامی کو سرمایہ ارزاں شرائط پر فراہم کیا جائے۔ سر ولیم ویڈربرن اور ام، جی، راناڈے کے القاکے تحت ۱۸۸۳ء میں ضلع پونا کے سرمایہ داروں کی ایک کمیٹی اس غرض سے بنائی گئی کہ تعلقہ پرا ندھر کے کسانوں کو قرضہ دینے کے لیے ایک بنک قائم کیا جائے۔ مالگذاری کے عہدہ داروں کی وساطت سے قرضہ واپس وصول کرنے کے اقتدار اور دوسری چند خفیف مراعات مثلاً بنک کے قرضوں کو تفوق و تقدم اور رسوم اسٹامپ کی معافی وغیرہ پر بھروسہ کرکے کمیٹی نے دس لاکھ کا سرمایہ فراہم کیا اور یہ تہیّہ کیا کہ رعایا کے ذمے کے قرضوں کی ادائی شروع کی جائے۔ گو اس تجویز کو حکومت بمبئی اور حکومت ہند دونوں نے منظور کرلیا تھا، لیکن اس وقت کے وزیر ہند لارڈ کمبرلی نے اس کو حسب ذیل وجوہ کی بنا پر مسترد کردیا:-

(۱) بنک کی حیثیت واقعی طور پر ایک سرکاری ادارے کی ہوگی۔ (۲) تجویز مالی اعتبار سے غیر مستحکم تھی؛ اس لیے کہ پرا ندھر تعلقے کی مالگزاری کی بنا پر اندازہ کیا جائے تو رعایا کسی معقول مدت کے اندر سود یا قرضے کی رقم ادا نہیں کرسکتی تھی، اور (۳) موجودہ حالت میں تمام ضرورتوں کی تکمیل ۱۸۸۳ء و ۱۸۸۴ء کے قوانین تقاوی (جن کا ذکر اوپر آچکا ہے)، قانون امداد کاشتکاران دکن، بہتر عدالتی انتظامات اور حقوق ملکیت کی مناسب طریقے پر رجسٹری کے ذریعے سے کافی بڑی حد تک کی جاسکتی ہے۔ علاوہ ازیں

ملے دیکھو "آر، بی، ایوبنک کی کتاب موسوم بہ "انجمن ہائے امداد باہمی کا دستور العمل" صفحہ (۲)۔

باب ۹

وزیر موصوف نے یہ بھی بتلایا کہ رعیت جو کچھ چاہتی تھی وہ یہ تھا کہ ساہوکار کے ہاں جس طرح رواں کھاتہ رہتا تھا اسی طرح بنک میں بھی ہو لیکن بنک اس کو روا نہیں رکھ سکتا تھا۔

۱۳۔ قرضۂ امداد باہمی۔ یہ خیال کہ ہندوستان میں دیہی قرض داری کے مقابلے کی غرض سے اور اعتبار کی فراہمی کے واسطہ کے طور پر "امداد باہمی" کے طریق کو استعمال کیا جائے سب سے اول مدراس کے ایک سیویلین مسٹر فریڈرک نکلسن نے پیش کیا جو یورپ میں زرعی بنکوں اور دوسرے زمیندارہ بنکوں کی خاص طور پر تحقیق کر چکے تھے۔ بنا بریں حکومت مدراس نے ان کے ذمے یہ کام سپرد کیا کہ وہ اس مسئلے کی تحقیقات کریں کہ آیا احاطۂ مدراس میں زرعی بنک یا دوسرے زمیندارہ بنکوں کا قائم کرنا قابل عمل ہوگا یا نہیں۔ نکلسن نے اپنی مشہور رپورٹ شائع شدہ ۱۸۹۵ء تا ۱۸۹۷ء میں اس امر کی پرزور سفارش کی کہ ہندوستان میں قرضۂ امداد باہمی کی انجمنیں قائم کی جائیں۔ انھوں نے اس خیال پر زور دیا کہ ہندوستان جیسے ملک میں کوئی اسکیم اس وقت تک کارگر نہیں ہو سکتی جب تک اس میں اس امر کو ملحوظ نہ رکھا جائے کہ قرض دہندے کے لیے خواہ وہ فرد واحد ہو یا انجمن، یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ قرض گیرندے کے حالات سے گہری واقفیت رکھے۔ نیز یہ کہ گو دیہی ساہوکار قرض گیرندہ کے حالات سے عام طور پر واقف ہوتا ہے، پھر بھی وہ ایک الگ تھلگ اکائی ہوتا ہے جس کا ملک میں اعتبار کی عام رسد سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ نکلسن نے بتلایا کہ یورپ کے زمیندارہ بنک صرف بڑے کسانوں کے لیے مفید ثابت ہوئے۔ انھوں نے اس خیال کی مخالفت کی کہ سرکاری بنک قائم کر کے قرض داری کا

لے۔ دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ فقرہ ۳۵۹ تا ۳۶۰ مصر کے زرعی بنک کے بیان کے لیے۔

علاج کیا جا سکتا ہے، اس لیے کہ اعتبار کی سب سے بڑی کسوٹی یہ ہے کہ قرض دہندے کو قربت اور ضمانت حاصل ہو اور قرض گیرندے کو سہولت اور حفاظت میسر ہو، اور ان شرائط کو پورا کرنے کے لیے بنکوں کی اتنی بڑی تعداد قائم کرنی ہوگی جو عملاً غیر ممکن ہوگی اور ایک دقیق اور پیچیدہ دفتری انتظام درکار ہوگا۔ علاوہ ازیں گورنمنٹ مطلوبہ فنڈ فراہم نہیں کر سکتی، اور انتہائی استبدادی مداخلت کی بنا پر لوگوں کی ہمت افزائی کرے گی کہ معمولی سے معمولی حالات زندگی میں بھی گورنمنٹ سے مدد مانگیں۔ اس پر طرہ یہ کہ گورنمنٹ کو ٹیکس کے محصل کے علاوہ بیلف کی بھی صلواتیں سننی پڑیں گی۔ نکلسن نے آخر میں یہ نتیجہ نکالا کہ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں کسان کو کبھی کم اور کبھی زیادہ مقدار میں لگاتار قرضہ فراہم کرنے کا واحد اطمینان بخش طریقہ صرف امداد باہمی ہے۔ انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ قرضہ امداد باہمی کے بنکوں کی حد تک مدراس کے حالات، یورپ کے حالات سے بہت مختلف نہ تھے، اس لیے کہ برطانیہ عظمیٰ کی فرنڈلی سوسائٹیز (میت بھاون) اور بلڈنگ سوسائٹیز (تعمیر بھاون) کے مقابلے میں یہاں کامیاب ملکی انجمنیں موسوم بہ نیدھی[1] کثیر تعداد میں کام کر رہی تھیں۔ انھوں نے یہ مشورہ دیا کہ حکومت کو چاہیے کہ آئین و قوانین وضع کرے اور مناسب بالواسطہ طریقہ اختیار کر کے کسانوں کے لیے امداد باہمی کے بنک کھولنے کی ہمت افزائی کرے، اگرچہ کامیابی کے لیے انفرادی خلوص، سعی اور سرگرمی ضروری تھی۔ انھوں نے اپنے نتائج کا خلاصہ دو لفظوں میں پیش کیا: "رفیزن مہیا کرو"۔ ۱۸۹۹ء میں حکومت مدراس نے ان کی رپورٹ پر تبصرہ کیا، لیکن کل مسئلے کو یہ کہہ کر بالائے طاق رکھ دیا کہ

۱؎ (Nidhis)

باب ۹

اس پر کوئی کارروائی کرنا غیر ضروری تھا' اس لیے کہ حکومت کی رائے میں دیہی قرضے کا مسئلہ فوری توجہ کا محتاج نہ تھا۔[1] اس اثنا میں صوبۂ متحدہ کی سیول سروس کے ممبر ڈوپرنے نے ایک دلچسپ کتاب بعنوان "ہندوستان کے عوام کے بنک" شائع کی تھی۔ اس طرح امداد باہمی کا جو تصور عوام کے ذہن میں اس کتاب اور نکلسن کی رپورٹ کے ذریعے سے قائم ہوا تھا' وہ اب بار آور ہونا شروع ہوا۔ صوبۂ متحدہ' بنگال اور پنجاب کے بعض علاقوں میں بعض عہدہ داران ضلع نے جدت دکھا کر امداد باہمی کی چند ابتدائی انجمنیں قائم کیں۔ لیکن یہ مساعی منتشر اور غیر منظم تھیں اور یہ بھی محسوس کیا گیا کہ خاص قوانین وضع کئے بغیر کوئی حقیقی ترقی ممکن نہ تھی' اس لیے کہ قانون انجمن ہائے سرمایۂ مشترک اپنے پیچ در پیچ شرائط کی بنا پر امداد باہمی کے دیہی بنکوں کے لیے بدیہی طور پر ناموزوں تھا۔[2] قحط کمیشن (سنہ ۱۹۰۱ء) نے اپنی اس پرزور سفارش سے امداد باہمی کے نظریے کے حق میں ایک اور محرک کا کام کیا کہ رفیزن کے اصول پر دیہی بنک قائم کئے جائیں۔ اسی سال لارڈ کرزن کی حکومت نے نکلسن کی رپورٹ کے بارے میں مقامی حکومت کے خیالات دریافت کرنے کے بعد سر ایڈورڈ لا کی صدارت میں ایک زبردست کمیٹی قائم کی۔ اس کمیٹی کو ہنری ولف آنجہانی کے مشورے کا فائدہ حاصل ہوا۔ جن کو امداد باہمی کے مسئلے پر ان کے زمانے کا سب سے زیادہ مستند انگریز خیال کیا جاتا تھا۔ کمیٹی کی سفارشیں مان لی گئیں اور اس کے نتیجے کے طور پر مرکزی مجلس قانون ساز میں سر ڈنزل ابٹسن نے سنہ ۱۹۰۳ء میں ایک مسودۂ قانون پیش کیا جو قانون نمبر (۱۰) بابت سنہ ۱۹۰۴ء

---

[1] دیکھو گورنمنٹ آف انڈیا کی یادداشت انجمن ہائے قرضۂ امداد باہمی کے قانون (سنہ ۱۹۰۴ء) کے متعلق۔

[2] دیکھو میک لے گن کی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ (۴)۔

باب ۹

کی شکل میں منظور اور "قانون انجمن ہائے قرضۂ امداد باہمی" (سنہ ۱۹۰۴ء) کے نام سے موسوم ہوا۔

لیکن امداد باہمی کا مسئلہ اس قدر کافی اہم ہے کہ وہ بحث کے لیے ایک الگ باب کا مستحق معلوم ہوتا ہے۔
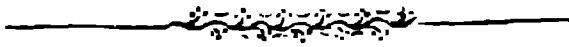
ہندوستان میں امداد باہمی کی تحریک

۱۔ امداد باہمی کا مفہوم۔

مندرجۂ ذیل اقتباسات امداد باہمی کی امتیازی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہیں:۔ ""امداد باہمی کا نظریہ اجمالی طور پر یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ایک منفرد اور کمزور آدمی دوسرے اشخاص سے اتحاد قائم کر کے اخلاقی نشوونما اور باہمی تعاون کے ذریعے سے وہ مادی فوائد اپنی حیثیت کے لحاظ سے حاصل کر سکتا ہے جو دولتمند اور طاقتور اشخاص کو حاصل ہوتے ہیں اور اس طرح اپنی فطری قابلیتوں کی انتہا تک خود کو ترقی دے سکتا ہے۔ مادی ترقی، قوتوں کے اتحاد سے حاصل ہوتی ہے، خود اعتمادی متحدہ عمل سے فروغ پاتی ہے اور یہ توقع کی جاتی ہے کہ ان اثرات کے باہمی عمل سے ایک ایسا اعلیٰ معیار زندگی موثر طریقے پر حاصل ہوگا، جو زیادہ خوش حالی پر مبنی ہوگا، چنانچہ اس اعلیٰ معیار زندگی کی خصوصیت ' بہتر کاروبار، بہتر کاشت اور بہتر زندگی ' بیان کی جاتی ہے[1]۔

""جب افراد کی کوئی جماعت ایک مشترکہ مقصد کو حاصل کرنے کے لیے

۱۔ دیکھو میک لےگن کمیٹی کی رپورٹ فقرہ (۲)۔

مشترکہ سعی کے ذریعے سے اتحاد قائم کرتی ہے تو اس کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ امداد باہمی کے اصول پر کام کر رہی ہے۔ مثلاً: فٹبال ٹیم، چوروں کی ٹولی یا تحصیلی کاروبار کرنے والی کمپنی کے معنے دار۔ "امداد باہمی" کے مفہوم کو اس کی ایک صدی کی سرگزشت نے زیادہ قطعی بنا دیا ہے۔ امداد باہمی کے معنی یہ ہیں کہ ایک مشترکہ معاشی مقصد کو دیانت دارانہ طریق پر حاصل کرنے کے لیے اتحاد قائم کیا جائے۔ امداد باہمی کی اکثر شکلوں میں یہ بھی ضروری ہے کہ افراد کو ایک دوسرے کے متعلق ذاتی معلومات ہوں[1]۔"

"امداد باہمی کا مفہوم، فنی اعتبار سے، دولت کی پیدائش و تقسیم میں مسابقت کا ترک کرنا اور ہر قسم کے بیچ ڈالوں کو درمیان سے ہٹانا ہے[2]۔" "امداد باہمی، تعاون باہمی سے شروع ہوتی ہے تاکہ اس کا انجام کسی مشترک مقصد کی تکمیل پر ہو[3]۔"

"امداد باہمی، معاشی تنظیم کی ایک خاص شکل ہے جس میں لوگ بعض قطعی کاروباری قواعد کے تحت قطعی کاروباری اغراض کے لیے مل کر کام کرتے ہیں۔ امداد باہمی کے تصور کی بنیاد یہ ہے کہ کاروبار اور اخلاق کے درمیان ایک ایسا تعلق قائم کیا جائے جو اس تجارتی دیانت داری سے بھی بلند و برتر ہو جو ہمارے موجودہ صنعتی نظام کے لیے ضروری ہے[4]۔"

اس طرح یہ معلوم ہوگا کہ انجمن امداد باہمی میں (۱) مشترکہ معاشی مفاد کو حاصل کرنے کے لیے افراد کا اتحاد خالصاً رضاکارانہ حیثیت رکھتا ہے؛ (۲) مادی کاروباری پہلو پر جتنا زور دیا جاتا ہے اتنا ہی اخلاقی پہلو پر بھی دیا جاتا ہے؛ (۳) امداد باہمی کی جد و جہد کے تعلیمی و تربیتی اثر سے خاص اہمیت

[1] دیکھو سی۔ ایف۔ اسٹرک لینڈ کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان میں امداد باہمی" صفحہ ۱۲۔

[2] دیکھو ہیلگ من کی تصنیف محولۂ بالا، صفحہ ۱۵۱۔

[3] دیکھو ہیرک کی کتاب موسوم بہ "وفاقی زرعی قرضے کا طریق" صفحہ ۱۰۔

[4] دیکھو گارڈن اور او براین کی کتاب موسوم بہ "ڈنمارک میں امداد باہمی"۔

311

باب

وابستہ کی جاتی ہے۔

بہرطور امداد باہمی کا دائرہ نظری اعتبار سے ویسا ہی وسیع ہے جیسا کہ خود معاشیات کا۔ لیکن عملی حیثیت سے صنعت میں اس کا محدود اطلاق اب تک صرف پیدائش دولت پر کیا گیا ہے، اگرچہ دستی کرگھے کی پارچہ بافی جیسی گھریلو صنعتوں کے انتظام کو بھی جن میں سرمایہ، جدت اور کاروباری مہارت اور قابلیت کی زیادہ ضرورت نہیں ہوتی، امداد باہمی کا طریق مدد دے سکتا ہے۔ ہی موجودہ زمانے کی بڑے پیمانے کی صنعت جس میں بیش قیمت اور پیچیدہ کلیں استعمال کی جاتی ہیں اور ماہرانہ کاروباری انتظام اور ضبط کی ضرورت ہوتی ہے، تو اس میں امداد باہمی کے طریق کا اطلاق عملاً موثر نہیں پایا گیا۔ لیکن خریداری، صرف دولت اور اعتبار کے میدان میں امداد باہمی کو بڑی حد تک کامیابی ہوئی ہے؛ اور جیسا کہ آگے چل کر بیان کیا جائے گا، ہندوستان کا تجربہ اس عام میلان سے مستثنیٰ نہیں قرار پاتا۔

۲۔ جرمنی اور ڈنمارک میں امداد باہمی۔

ہندوستان میں امداد باہمی کی تحریک، بیرونی ممالک مثلاً جرمنی اور ڈنمارک کی امداد باہمی کی دو نہایت نمایاں مثالوں سے بڑی حد تک متاثر ہوئی ہے۔ گزشتہ صدی کے تقریباً وسط میں جرمنی کے معاشی حالات، جس حد تک ان کا تعلق کسان اور دیہی دستکار سے تھا، موجودہ زمانے کے ہندوستانی حالات سے بہت زیادہ مختلف نہ تھے۔ ٹٹ پونجیے کسان اور دستکار عام طور پر مہاجن کے پنجے میں پھنسے ہوئے تھے جو ان کا خون چوس رہا تھا اور معاشی جمود طاری تھا۔ اس صورت حال نے نوع انسانی کے دو ہمدردوں کو جو ایک دوسرے کے معاصر تھے، سخت متاثر کیا۔ اپنے وطنی بھائیوں کی تباہی اور مصیبت دیکھ کر ان کے دل پر چوٹ لگی اور ہر ایک نے جوش میں آکر اس مصیبت و تباہی کو دور کرنے کے لیے الگ الگ کام شروع کیا۔ ان میں سے ایک شخص شلتسے ڈیلتش[1]

[1] Schulze-Delitch

(شولز ڈیلش) نامی نے قرضے کی انجمنیں اس غرض سے قائم کیں کہ گھٹیا تاجروں اور دستکاروں کی معاشی حالت کو سدھارے۔ اس طبقے سے اس کا گہرا رابطہ اس وقت قائم ہوا تھا جب کہ وہ دیہی مرچیج یا منصف تھا۔ دوسرا شخص رائف آئزن[1] (رینیزن) نامی، پرشیا کے سب سے کم زرخیز علاقوں میں سے ایک کا مقدم یا میر بلدیہ تھا؛ جہاں کے نیم فاقہ زدہ کسان مہاجنوں کے فولادی پنجے میں پھنسے ہوئے تھے۔ اس نے ان مفلس کسانوں کے لیے اولاً قرضے کی انجمنیں اور بعد میں دوسری انجمنیں قائم کیں۔ ابتداءً ان دونوں قومی خادموں کو اپنی اپنی حکومت کی مخالفت سے دوچار ہونا پڑا اور اس کے نتیجے کے طور پر تحریک کی ترقی کی رفتار بہت سست رہی۔ لیکن یہ مشکلات راستے سے بہت جلد ہٹ گئیں اور تحریک نے ایسے شاندار نتائج پیدا کیے کہ ڈنمارک، اٹلی اور آئرلینڈ جیسے دوسرے ممالک میں جرمنی کو نمونۂ تقلید خیال کیا جانے لگا۔

چونکہ ہندوستان میں زرعی اور غیر زرعی قرضے کی انجمنیں علی الترتیب رائف آئزن اور شلنسے ڈیلتش کے اصول پر مبنی رہیں، لہٰذا ان کی اہم خصوصیات کو الگ الگ بیان کر دینا مناسب ہوگا۔

(۱) رائف آئزن کے اصول پر قائم شدہ انجمن میں مندرجۂ ذیل لوازم پر عام طور پر زور دیا جاتا ہے:۔ (۱) اس کے کاروبار کا رقبہ محدود ہو؛ (۲) حصص نہ ہوں یا حصص کی رقم تھوڑی ہو، تاکہ مقسوم طلبی کو روکا جائے اور غریب سے غریب اشخاص کو بھی رکن بننے کے قابل بنایا جاسکے؛ (۳) ذمہ داری غیر محدود ہو تاکہ ساکھ اچھی رہے اور باہمی نگرانی ممکن ہو؛ (۴) قرضے تاحدِ امکان کاروباری یا پیداآور اغراض کے لیے صرف ارکان ہی کو دیے جائیں؛ (۵) قرضے ایک حد تک طویل مدت کے لیے دیے جائیں اور بہ اقساط واپس کرنے کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں؛ (۶) ایک مستقل اور ناقابل انتقال محفوظ

[1] Raiffeisen

سرمایہ قائم کیا جائے؛ (۷) منافع کی ہوس اور تقسیم طلبی کو روکا جائے اور ان کو سرمائیہ محفوظ میں جمع کر دیا جائے؛ (۸) انتظام و نگرانی کا کوئی معاوضہ یا محنتانہ نہ دیا جائے اور جمہوری اصول پر انتظام کیا جائے؛ اور (۹) ارکان کی مادی و اخلاقی ترقی کی جانب توجہ کی جائے۔

(ب) ذیل میں وہ خصوصیات درج کی جاتی ہیں جو شلتسے ڈیلتش کے اصول پر قائم کی ہوئی انجمنوں کو رائفت آئزن کی انجمنوں سے ممتاز کرتی ہیں:-

(۱) کاروبار کا دائرہ وسیع ہو؛ (۲) حصص کے اصل کو نسبتہً زیادہ اہمیت دی جائے؛ (۳) ذمہ داری محدود ہو؛ (۴) قلیل مدت کے لیے قرضے دیے جائیں؛ (۵) سرمائیہ محفوظ قلیل ہو، اور منافع کا صرف ایک جزو اس سرمائے میں جمع کیا جائے؛ (۶) نفع یا مقسوم زیادہ آزادی کے ساتھ تقسیم کیا جائے؛ (۷) انتظام کو بہتر بنانے کے لیے اجرت دی جائے؛ اور (۸) انجمن کے اخلاقی نتائج کے مقابلے میں کاروباری پہلو پر زیادہ زور دیا جائے۔

دونوں طرز کی انجمنیں ضروری ہیں، اس لیے کہ عوام کی جن دو جماعتوں کے لیے وہ مطلوب ہیں ان کی مختلف ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے وہ موزوں ہیں۔ اس معاملے پر اس وقت تفصیلی بحث کی جائے گی جب کہ ہندوستان میں قائم شدہ قرضے کی انجمنوں پر تبصرہ کیا جائے گا۔

ڈنمارک کے امداد باہمی کے طریق کی حد تک ہمیں یہ بتلانے پر اکتفا کرنا چاہیے کہ اس کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ کسان کی ہر جداگانہ ضرورت کے لیے ایک جداگانہ انجمن امداد باہمی قائم کی جاتی ہے، حتیٰ کہ امداد باہمی کی بنیاد پر زراعت کی تنظیم کا اس کی تمام حالتوں کے لیے ایک مکمل نظام تیار کیا گیا ہے اور بیچ والوں کو کم و بیش مکمل طور سے ہٹا دیا گیا ہے۔ شیر خانے کی پیداوار کی تجارت برآمد کا انتظام بھی امداد باہمی کا ایک مخصوص ادارہ کرتا ہے۔ ڈنمارک کی زرعی امداد باہمی کی یہ خصوصیت اس امر کی مستحق ہے کہ ہندوستان میں اس کا بغور مطالعہ کیا جائے۔

امداد باہمی کی تحریک تمام دنیا میں ہر طرف پھیل گئی ہے، اور کچھ

سال ادھر سے اس نے اپنے لازمی طور پر ہمدردانہ مقاصد و رجحانات کے باعث بین الاقوامی نوعیت اختیار کرلی ہے۔ چنانچہ حال ہی میں ایک ادارہ بنام "سالگرہ بین اقوامی امداد باہمی" قائم ہوا ہے جو اس اصل شاہی دور میں جس میں ہم آجکل رہتے سمجھتے ہیں امداد باہمی کی عالمی ضرورت و اہمیت کو مناسب طور پر ظاہر کرتا ہے اور بتلاتا ہے کہ کس طرح تمام ملکوں میں امداد باہمی کو عوام کی سب سے بڑی امیدوں میں سے ایک خیال کیا جانے لگا ہے۔ 313 سرمایہ داری کے طریق کی خرابیوں کے دور کرنے میں اشتراکیت اور دوسرے مجوزہ علاجی تدابیر کے مقابلے میں امداد باہمی کا طریقہ اس لحاظ سے تفوق کا مدعی ہے کہ وہ نہ صرف ذاتی مفاد کے محرک کو برقرار رکھتا ہے بلکہ اس کو ایک اعلیٰ تر معیار پر اور اجتماعی سعی کی بنیاد پر منظم کرتا ہے۔

۳۔ امداد باہمی اور اس کے فوائد ہندوستان میں۔ ہندوستان میں امداد باہمی ہمارے لیے ایک خاص پیغام رکھتی ہے۔ ہماری آبادی کا بڑا حصہ چھوٹے چھوٹے کسانوں اور دستکاروں پر مشتمل ہے، اور ہمارے ترقی پذیر شہروں میں بھی امداد باہمی کے اصول پر مفید کام انجام دئے جاسکتے ہیں! مثلاً متوسط طبقے اور مزدوروں کے فائدے کے لیے مناسب مکانات تعمیر کرنا وغیرہ۔ علاوہ ازیں، گو یہ ممکن ہے کہ امداد باہمی کی بعض مغربی شکلیں ملک کے لیے نئی ہوں، لیکن امداد باہمی کا اصول اور جذبہ کسی حال ملک کے مزاج سے اجنبیت نہیں رکھتا، اس لیے کہ وہ ملک کے اکثر نوعی و امتیازی رسم و رواج مثلاً ذات پات اور مشارکت خاندانی کے طریق کی تہ میں مضمر ہے اور مدراس کے "نیدھی" جیسے نظامات سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔

۴۔ ایکٹ بابت ۱۹۰۴ء ہم ان حالات پر تبصرہ کرچکے ہیں جن کی بنا پر ۱۹۰۴ء میں "قانون انجمن ہائے قرضۂ امداد باہمی" منظور ہوا۔ اس قانون نے محض قرضے کی انجمنیں قائم کرنے کی اجازت دی اور غیر قرضی امداد باہمی کی جملہ شکلوں کو ملتوی رکھا۔ یہ پالسی ارادۃً اختیار

کی گئی تھی، جس کی وجہ یہی نہ تھی کہ دوسری قسموں کی امداد باہمی کی ناگزیر اہمیت کو پوری طرح تسلیم نہیں کیا گیا تھا بلکہ یہ خیال کیا گیا تھا کہ ممکن ہے کہ ایسی آبادی میں جو کسی حد تک پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ ہو، دولت کی پیدائش و تقسیم کے کاروبار کی تنظیم کی مشکلات، ترقی کے لیے سنگ راہ ثابت ہوں۔ قرضے کی انجمنوں کی تنظیم سہل تھی، ان کا طریق انتظام سادہ تھا، اور وہ امداد باہمی کے اصول سیکھنے اور ان پر عمل کرنے کا سہولت بخش میدان مہیا کرتی تھیں، اسی بنا پر دوسری انجمنوں کے مقابلے میں ان ہی انجمنوں پر زیادہ تر توجہ مبذول کی گئی[1]۔ علاوہ ازیں شہری قرضے کے مقابلے میں دیہی قرضے پر خاص زور اس لیے دیا گیا کہ دیہی قرضے کا مسئلہ بلحاظ نوعیت زیادہ اہم اور اشد ضروری تھا۔

اب ہم قانون مذکور کے اہم شرائط پر غور کر سکتے ہیں۔ دس بالغ و عاقل اشخاص کی کوئی جماعت رجسٹری کے لیے درخواست کر سکتی تھی اور اپنی ایک انجمن امداد باہمی قائم کر سکتی تھی۔ لیکن یہ ضروری تھا کہ درخواست گزار اور ہونے والے ارکان ایک ہی مقررہ گاؤں کے باشندے ہوں یا ایک ہی قبیلے یا ذات کے رکن ہوں یا ایک ہی قصبے کے رہنے والے ہوں۔ اگر انجمن قرضۂ امداد باہمی کے ارکان میں سے ⅘ کسانوں پر مشتمل ہوں تو ایسی انجمن کو دیہی اور اس کے خلاف ہو تو شہری، انجمن کہا جاتا تھا۔ دیہی انجمنوں کی حد تک غیر محدود ذمہ داری عام قاعدہ تھی؛ شہری انجمنوں میں اس معاملے کو انجمن کی مرضی و خوشی پر چھوڑا گیا تھا۔ دیہی انجمن کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ اپنے کل منافع کو ایک ناقابل انتقال یا غیر منفک سرمایۂ محفوظ میں جمع کرے، الاّ اس صورت کے کہ مقامی حکومت خاص خاص حالتوں میں اس کے برعکس عمل کرنے کی ہدایت کرے، شہری انجمنوں کی حد تک منافع کا ایک چوتھائی حصہ سرمایۂ محفوظ میں رکھا جاتا تھا۔ جہاں کہیں حصص کے ذریعے سے اصل فراہم

[1] دیکھو میک لےگن کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ (۸)۔

باب

کیا جاتا تھا۔ ہاں اس کی مقدار پر بعض حدود قائم کئے گئے تھے؛ مثلاً یہ کہ کوئی رکن کل حصص کے ۱/۵ سے زیادہ نہیں خرید سکتا تھا؛ رکن واحد کے حصوں کی مالیت ۰۰ روپے سے متجاوز نہ ہوسکتی تھی؛ اور کسی رکن کو ایک رائے سے زیادہ کا حق نہ تھا۔ انجمنیں دانے کی ٹیں 'حصص' ارکان کی امانتوں اور بیرونی قرضوں کے ذریعے سے مطلوبہ کاروباری اصل مہیا کرسکتی تھیں اور اس طرح حاصل کی ہوئی رقوم کو محض ارکان میں تقسیم کرسکتی تھیں۔ ایک انجمن سے دوسری انجمن صرف مسجل (رجسٹرار) کی اجازت کے تحت قرضہ لے سکتی تھی۔ کل صوبوں کو مجاز گردانا گیا تھا کہ وہ اس تحریک کی نگرانی و تنظیم کی غرض سے مسجل مقرر کریں۔ حکومت نے اپنے لیے بعض اختیارات محفوظ رکھے تھے؛ مثلاً (۱) جبری معائنہ اور حسابات کی تنقیح؛ (۲) انجمن کی جبری برخاستگی اگر ضروری ہو اور مسجل تجویز کرے؛ لیکن اس صورت میں صوبائی حکومت کے پاس مرافعہ دائر کیا جاسکتا تھا؛ اور (۳) قواعد سازی کا وسیع اختیار۔

اس تحریک کو حکومت کی ہمدردی، اعانت اور نگرانی کا عام طور پر قطعی یقین تھا۔ مذکورۂ بالا شرائط کے بارے میں حکومت کے پیش نظر دو اہم مقاصد سادگی اور لچکداری تھے۔ سادگی اس لحاظ سے کہ رعایا کی فہم سے بالاتر پیچ تجاویز کو ترک کیا جائے؛ اور لچکداری اس معنی میں کہ تحریک کی نشو و نما کا میدان اسی اسلوب پر مہیا کیا جائے جو ہر صوبے کے لیے موزوں اور رایکٹ کے بنیادی عام اصول کے تابع ہو[1]۔ حکومت نے اس تحریک کی ہمت افزائی کی غرض سے قانون کے تحت رجسٹری شدہ انجمنوں کو چند مراعات اور حقوق بھی عطا کئے؛ مثلاً انکم ٹکس، رسوم اسٹامپ اور رجسٹری کی فیس سے استثناء؛ مشترک سرمایے کی انجمن کے خاص حقوق؛ مالگزاری کے بعد انجمن کے رکن کو معمولی لین داروں پر تقدم، حاجات کی

لہ۔ دیکھو سر ڈنزل ابٹ سن کی تشریحی یادداشت جو ۱۹۰۴ء کے قانون کے سلسلے میں پیش کی گئی تھی۔

بلا معاوضہ سرکاری تنقیح وغیرہ۔ حکومت نے یہ بھی وعدہ کیا کہ انجمنوں کو ابتدائی تین سال تک بے سودی قرضہ دے گی لیکن اس شرط کے تابع کہ مطلوبہ قرضہ دو ہزار روپے سے متجاوز نہ ہوگا اور صرف اس رقم کی مساوی مقدار تک دیا جائے گا جو متعلقہ انجمن اپنے طور پر فراہم کرلے۔

۵۔ سنہ ۱۹۰۴ء تا سنہ ۱۹۱۲ء کی ترقی پر ایک نظر۔ صوبہ واری حکومتوں نے امداد باہمی کی جدید اسکیم کو عملی جامہ پہنانے میں وقت ضائع نہیں کیا اور اس کی نگرانی کی غرض سے مسجل مقرر کئے گئے۔ نئے اصول پر انجمنیں ملک میں جاگزین ہو گئے اور ان کی ترقی نہایت نمایاں رہی جیسا کہ مندرجۂ ذیل اعداد و شمار سے معلوم ہوگا:۔

سال	انجمنوں کی تعداد	ابتدائی انجمنوں کے ارکان کی تعداد	کاروباری اصل کی مقدار روپیہ
سنہ ۱۹۰۶ء تا سنہ ۱۹۰۷ء	۸۴۳	۹۰۸۴۴	۲۳,۷۱,۶۸۳
سنہ ۱۹۰۷ء تا سنہ ۱۹۰۸ء	۱۳۵۷	۱۴۹,۱۶۰	۴۴,۱۴,۰۸۶
سنہ ۱۹۰۸ء تا سنہ ۱۹۰۹ء	۱۹۶۳	۱۸۰,۳۳۸	۸۲,۳۲,۲۲۵
سنہ ۱۹۰۹ء تا سنہ ۱۹۱۰ء	۳۴۲۸	۲۲۴,۳۹۷	۱,۲۴,۶۸,۳۱۲
سنہ ۱۹۱۰ء تا سنہ ۱۹۱۱ء	۵۳۲۱	۳۰۵,۰۵۸	۲,۰۳,۰۵,۸۰۰
سنہ ۱۹۱۱ء تا سنہ ۱۹۱۲ء	۸۱۷۷	۴۰۳,۳۱۸	۳,۳۵,۷۴,۱۶۲

تحریک نے کم از کم انجمنوں کی تعداد پر نظر کرتے ہوئے، بہت جلد اپنے خیرخواہوں کی بہترین تمناؤں سے بھی زیادہ ترقی کی اور یہ محسوس کیا گیا کہ

خاص کردو سمتوں میں ۱۹۰۴ء کے قانون میں تبدیلی کی ضرورت تھی۔ اس قانون کے تحت جو انجمن ہائے قرضہ قائم کی گئی تھیں وہ اس بات کا پیش خیمہ ثابت ہوئی تھیں کہ قرضے کے سوا دوسرے اغراض اور تقسیم کے لیے بھی امداد باہمی کی انجمنیں کھولی جائیں، لیکن آئینی طریق پر ان کی حفاظت کا اب تک کوئی انتظام نہ تھا۔ اس کے ساتھ اصل کی آزادانہ بہم رسانی اور ترقی یافتہ طریق نگرانی کی ضرورت کو پیدا کرنے کے لیے مختلف مرکزی ایجنسیاں قائم کی گئی تھیں جو بعد میں "اتحادی انجمن"[له] اور "مرکزی بنک" کے نام سے موسوم ہوئیں، اور جن کا مقصد یہ تھا کہ ابتدائی انجمن ہائے قرضہ کی مالی مدد اور نگرانی کریں؛ لیکن ان کو بھی ۱۹۰۴ء کے قانون نے تسلیم نہیں کیا تھا۔[که] علاوہ ازیں انجمنوں کی تبویب بہ لحاظ دیہی و شہری بے اصول اور غیر سہولت بخش پائی گئی۔ آخر نتیں یہ کہ اس ممانعت کی بنا پر کہ منافع تقسیم نہ کیا جائے غیر محدود ذمہ داری والی دیہی انجمنوں میں دشواری پیدا ہورہی تھی خاص کر پنجاب اور مدراس وغیرہ مقامات میں دقت زیادہ محسوس کی جارہی تھی جہاں حصص کے اصل نے اہمیت حاصل کرلی تھی۔ حکومت ہند نے کل صورت حال کو از سر نو جانچ کر یہ فیصلہ کیا کہ تازہ قوانین وضع کئے جائیں، تاکہ ۱۹۰۴ء کے قانون کے یہ نقائص دور ہوجائیں۔

۶۔ قانون انجمن ہائے امداد باہمی بابت ۱۹۱۲ء

۱۹۱۲ء کے قانون نے غیر قرضی امداد باہمی کی شکلوں کو تسلیم کرلیا جو خرید و فروخت، پیدائش، بیمہ، تعمیر و اصلاح مکانات وغیرہ کے متعلق تھیں۔ اس قانون کی رو سے ابتدائی انجمنوں سے میز تین قسم کی مرکزی انجمنوں کو بھی تسلیم کیا گیا، یعنی (۱) اتحادی انجمنیں جو باہمی نگرانی و تنقیح کے لیے ابتدائی انجمنوں پر مشتمل ہوں؛ (۲) مرکزی بنک

له Union

که۔ دیکھو میک لے گن کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ (۵)

باب ۸

جو کسی حد تک انجمنوں اور کچھ افراد پر مشتمل ہوں؛ اور (۳) صوبہ واری بنک جو افراد پر مشتمل ہوں۔

316 مدراس، پنجاب اور برما جیسے بعض صوبوں میں حصص کے اصل کی اہمیت کے مدنظر یہ اجازت دی گئی کہ متعلقہ صوبہ واری حکومت کی عام یا خاص منظوری کے تحت غیر محدود ذمہ داری کی انجمنوں میں حصص پر مقسوم دینے کا اعلان کیا جائے۔ تمام انجمنوں کو اس کی بھی خاص طور پر اجازت دی گئی کہ وہ اپنے منافع کے ایک چوتھائی حصے کو سرمائیہ محفوظ میں جمع کرنے کے بعد منافع کا ایک جزو جو ۱۰ فی صد سے متجاوز نہ ہو، تعلیمی اور خیراتی اغراض کے لیے الگ کر دیں۔ جدید قانون نے "دیہی" اور "شہری" انجمنوں کی سابقہ تقسیم کو منسوخ کر دیا اور اس کے بجائے ایک زیادہ با اصول تقسیم "محدود ذمہ داری" اور "غیر محدود ذمہ داری" کی شکل میں قائم کی۔ چنانچہ اس قانون کی رو سے یہ قرار پایا کہ اس انجمن کی ذمہ داری محدود ہوگی جس کے ارکان رجسٹری شدہ انجمنیں ہوں؛ اس کے برخلاف ایسی انجمن کی ذمہ داری غیر محدود ہوگی جس کا مقصد اپنے ارکان کو قرضہ مہیا کرنا ہو اور جس کے ارکان کی اکثریت کسانوں پر مشتمل ہو، اور یہ کہ دوسری تمام صورتوں میں ذمہ داری اختیاری ہوگی۔

۷۔ امداد باہمی کی تحریک کی ترقی ۱۹۱۲ء کے قانون کے نفاذ کے بعد

جدید قانون کا فوری اثر یہ ہوا کہ اس نے تحریک امداد باہمی کے حق میں تازہ محرک کا کام کیا۔ جیسا کہ مندرجۂ ذیل گوشوارے سے ظاہر ہوگا، انجمنوں اور ان کے ارکان کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا، گو ترقی کی رفتار تمام صوبوں میں یکساں نہیں رہی ہے۔ کچھ سال ادھر سے انجمن ہائے امداد باہمی کو معاشی کساد بازاری کے زمانے میں مشکلات سے دوچار ہونا پڑا جس کے

باب

نتیجے کے طور پر مختلف صوبوں نے تنظیم و اصلاح کی پالسی اختیار کی اور اس کے باعث ترقی کی رفتار سست پڑ گئی۔

سال	انجمنوں کی تعداد	ابتدائی انجمنوں کے ارکان کی تعداد	کاروباری اصل کی مقدار (۱۰۰۰ روپیہ)
سنہ ۱۹۱۴ء تا سنہ ۱۹۱۵ء	۱۷۳۲۷	۸۲۴۴۶۹	۱۲۲۲۹۲
سنہ ۱۹۱۶ء تا سنہ ۱۹۱۷ء	۲۳۰۳۶	۱۰۴۸۴۲۵	۳۱۱۲۲۵
سنہ ۱۹۲۱ء تا سنہ ۱۹۲۲ء	۵۲۱۸۲	۱۹۷۴۲۹۰	۳۱۱۲۲۵
سنہ ۱۹۲۳ء تا سنہ ۱۹۲۴ء	۶۱۱۰۶	۲۳۱۳۵۶۷	۴۰۵۲۹۷
سنہ ۱۹۲۵ء تا سنہ ۱۹۲۶ء	۸۰۱۸۲	۳۰۵۸۰۲۵	۵۷۶۰۳۹
سنہ ۱۹۲۷ء تا سنہ ۱۹۲۸ء	۹۶۰۹۱	۳۷۸۰۱۷۳	۷۶۷۰۸۷
سنہ ۱۹۲۹ء تا سنہ ۱۹۳۰ء	۱۰۴۱۸۷	۴۱۸۱۹۰۴	۸۹۵۱۷۸
سنہ ۱۹۳۰ء تا سنہ ۱۹۳۱ء	۱۰۶۱۶۶	۴۳۰۸۲۶۲	۹۱۹۱۲۲
سنہ ۱۹۳۱ء تا سنہ ۱۹۳۲ء	۱۰۶۰۵۰	۴۲۹۴۳۳۹	۹۲۶۹۱۵
سنہ ۱۹۳۲ء تا سنہ ۱۹۳۳ء	۱۰۵۲۶۲	۴۲۸۲۸۸۴	۹۵۸۳۸۹
سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء	۱۰۵۰۸۳	۴۳۱۶۲۲۲	۹۵۷۲۵۸

سنہ ۱۹۱۴ء تا سنہ ۱۹۳۲ء میں مختلف صوبوں کی صورت حال کا مقابلہ و موازنہ مندرجۂ ذیل جدول میں کیا گیا ہے[۱]

[۱] دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "اعدادی گوشوارہ متعلقہ تحریک امداد باہمی ہندوستان سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء" خلاصہ جدول (۱ تا ۵)۔

سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء

صوبہ	انجمنوں کی تعداد	انجمنوں کی تعداد ہر ایک لاکھ باشندوں میں	ابتدائی انجمنوں کے ارکان کی تعداد	ارکان کی تعداد بحساب ایک ہزار نفوس	کاروباری اصل کی مقدار (ایک ہزار روپیہ)	آنوں کی تعداد بحساب فی کس آبادی
مدراس	۱۳۵۸۱	۲۹٫۱	۸۸۳۱۰۰	۱۸٫۹	۱۶۱۸۶۷	۵۵
بمبئی	۵۸۱۶	۲۶٫۶	۵۸۷۶۴۹	۲۶٫۸	۱۶۱۶۷۴	۱۱۸
بنگال	۲۳۵۳۰	۴۷٫۰	۷۷۷۸۰۹	۱۵٫۵	۱۷۶۵۷۵	۵۶
بہار و اڑیسہ	۸۹۰۱	۲۳٫۶	۲۵۶۸۰۲	۶٫۸	۵۷۵۴۷	۲۴
صوبۂ متحدہ	۶۰۵۱	۱۲٫۵	۱۵۲۹۳۰	۳٫۲	۲۲۳۹۶	۷
پنجاب	۲۱۳۹۵	۹۰٫۷	۷۰۷۶۸۹	۳۰٫۰	۱۸۴۶۸۲	۱۲۵
برما	۲۰۶۷	۱۶٫۵	۷۲۲۶۷	۵٫۵	۲۳۱۵۲	۲۸
صوبۂ متوسط و برار	۳۷۹۴	۲۴٫۵	۷۱۹۳۴	۴٫۶	۵۵۶۸۹	۵۷
آسام	۱۴۰۰	۱۶٫۳	۶۴۳۳۸	۷٫۵	۸۶۳۰	۱۶
شمال مغربی صوبۂ سرحد	۴۵۱	۱۸٫۸	۱۵۳۳۸	۶٫۴	۱۸۸۰	۱۳
کورگ	۲۳۹	۱۲۴٫۵	۱۵۳۴۰	۷۶٫۷	۱۳۳۹	۱۰۷
اجمیر مرواڑا	۷۰۰	۱۱۷٫۸	۱۹۹۶۹	۳۳٫۴	۵۳۸۶	۱۴۴
حیدرآباد کا برطانوی علاقہ	۲۶	۲۶٫۰	۹۱۲۲	۹۱٫۲	۹۱۴	۱۴۶
دہلی	۲۸۸	۴۸٫۰	۹۹۹۲	۱۶٫۷	۲۶۹۵	۷۲
میزان برطانوی ہند	۸۸۳۶۴	۲۳۱٫۸	۳۶۴۴۲۰۹	۱۳٫۵	۸۶۴۴۲۶	۵۱
میزان ریاستہائے ہند[۱]	۱۶۷۱۹	۴۳٫۱	۶۷۱۹۴۳	۱۷٫۳	۹۲۸۳۲	۳۸
صدر میزان	۱۰۵۰۸۳	۳۴٫۱	۴۳۱۶۲۲۲	۱۴٫۰	۹۵۷۲۵۸	۵۰

[۱] مندرجہ ذیل ریاستیں شامل ہیں اور ہر ایک کے نام کے محاذی جو اعداد قوسین میں درج ہیں وہ انجمنوں

مندرجۂ بالا جدول سے معلوم ہوتا ہے کہ بجز پنجاب، مدراس اور بمبئی کے، دوسرے سب بڑے صوبوں میں تحریک اب تک دیہی آبادی کے بہت ہی قلیل جزو تک پہنچی ہے۔ زرعی کمیشن نے جن اعداد کو نقل کیا ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تین مستثنیٰ صوبوں میں دیہی علاقوں کے خاندانوں کی مجموعی تعداد کے مقابلے میں زرعی انجمنوں کے ارکان کا فی صد تناسب علی الترتیب ۹ر۱۰، ۰۰ر۱۰ اور ۳ر۱۸ ہے۔ اس کے برعکس یہ تناسب صوبۂ متحدہ میں صرف ۸ر۱، بنگال میں ۶ر۴، صوبۂ متوسط میں ۴ر۲، بہار و اڑیسہ میں ۲ر۳، برما میں ۹ر۳ اور آسام میں ۹ر۲ ہے۔ "رعیت واری" صوبوں میں تحریک امداد باہمی کی ترقی کی رفتار اس لیے بہت تیز رہی ہے کہ یہاں کسان کو اپنی زمین پر گروی کے حقوق حاصل ہیں اور وہ مادی ضمانت پیش کر سکتا ہے۔ "زمینداری" صوبوں میں کسان صرف شخصی ضمانت پیش کر سکتا ہے۔[1]

پیداوار کی فروخت، مویشیوں کے بیمے، دودھ کی بہم رسانی، سوت، ریشم اور کھاد کی خریداری، آلاتِ کشاورزی اور معمولی ضروریاتِ زندگی کی خردہ فروشی کے لیے نئی طرز کی انجمنیں قائم کی گئیں اور ان میں سے اکثر نے بظاہر بہت جلد ترقی کر لی۔ مرکزی انجمنوں کی تعداد بسرعت بڑھ رہی تھی اور تحریک بظاہر بہت تیزی کے ساتھ عوام کا اعتماد حاصل کر رہی تھی۔ ۱۹۱۴ء میں حکومتِ ہند نے کل صورتِ حال پر نظرِ ثانی کی اور ایک جامع قرارداد شایع کی جس میں ان عملی نتائج اور اسباق کا عام خاکا پیش کیا گیا تھا جو شروع سے لے کر موجودہ زمانے تک کے تجربے سے اخذ کیے جا سکتے تھے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ کی تعداد کو ظاہر کرتے ہیں:- میسور (۲۱۸۷)؛ بڑودہ (۱۱۴۶۱)؛ حیدرآباد (۲۷۱۳)؛ بھوپال (۹۵۰)؛ گوالیار (۳۱۶۷)؛ اندور (۶۹۲)؛ کشمیر (۲۹۴۰)؛ ٹراونکور (۱۷۶۲)؛ کوچین (۲۴۶)۔

[1] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ، فقرہ (۳۷۲)۔

اس تحریک کے لیے جو رقوم درکار تھیں ان کی مقدار بڑھتی جا رہی تھی، ابتدائی انجمن سے اوپر کے مرحلوں میں مالی انتظام کی مشکلات زیادہ پیچیدہ ہوتی جا رہی تھیں، اور عمل معائنہ و تنقیح کے اصول کو زیادہ واضح بنانے کی ضرورت تھی۔ تحریک کو مزید ترقی دینے اور تقویت پہنچانے کی ذمہ داری لینے سے پیشتر حکومت اس بات کا اطمینان کر لینا چاہتی تھی کہ تحریک معاشی و مالی حیثیت سے مستحکم اصول پر جاری تھی۔[1] ان حالات میں اکتوبر ۱۹۱۴ء میں میک لے گن کمیٹی کا تقرر کیا گیا تاکہ وہ مسئلے کے اس پہلو کی تحقیقات کر کے رپورٹ پیش کرے۔ اس کمیٹی کی معتبر رپورٹ کے ستمبر ۱۹۱۵ء میں شائع ہونے کے بعد تحریک نے ترقی کی تیسری منزل میں قدم رکھا (پہلی دو منزلوں کی نشاندہی علی الترتیب ۱۹۰۴ء اور ۱۹۱۲ء کے قوانین کر رہے تھے)۔ ہم آیندہ کسی موقع پر یہ بیان کریں گے کہ کمیٹی کی اہم سفارشیں کیا تھیں اور ان کی بنا پر حکومت نے کیا کارروائی اختیار کی۔ یہاں ہمیں صرف اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ کچھ سال ادھر سے تحریک نے عوام کی تائید بہت بڑی حد تک حاصل کر لی ہے اور دیہی قرضے کے سوا دوسرے معاملات میں بھی معتدبہ ترقی ظاہر کی ہے۔ ۱۹۱۹ء کے قانون اصلاحات کے نفاذ کے بعد سے، امداد باہمی، صوبہ واری مد مفوضہ بن گئی ہے اور اس کو ایک وزیر کے زیر نگرانی کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کو تحریک کی ترقی کی چوتھی منزل خیال کیا جا سکتا ہے۔ اصلاح یافتہ دستور کے عملدرآمد کے ابتدائی سالوں میں کئی صوبوں نے ترقی کے وہی راستے اختیار کئے جو ان کی مقامی ضرورتوں کے لحاظ سے مناسب ترین معلوم ہوئے؛ اور بمبئی نے ۱۹۲۵ء میں اپنے لیے انجمن ہائے امداد باہمی کا ایک جداگانہ قانون منظور کر کے دوسروں کی رہنمائی کی۔ گو بمبئی کا قانون زیادہ تر ۱۹۱۲ء کے قانون پر مبنی تھا، پھر بھی اس میں مندرجۂ ذیل ترمیمات کی گئیں:-

[1] دیکھو میک لے گن کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ (۶)۔

(۱) مقاصد، مالیہ اور طریق کار کے لحاظ سے مختلف انجمنوں کی نمایاں تبویب و تقسیم[1]؛ (۲) منسوخ شدہ انجمنوں کے حسابات کی بے باقی کے طریق کی اصلاح؛ (۳) ثالثوں یا نائبوں کے فیصلوں کے ذریعے سے بحالی کے سرسری اختیارات کی توسیع؛ اور (۴) مقررہ جرائم کے خلاف تعزیرات کا نفاذ[2]۔ اس طرح بمبئی کی رہنمائی میں دوسرے صوبے بھی اس کی پیروی کر رہے ہیں، مثلاً برما، مدراس، بہار و اڑیسہ۔

گو سنہ ۱۹۲۱ء کے بعد سے کل ہندوستان میں انجمنوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہو گیا ہے، لیکن بعد میں خاص کر حال کی معاشی کساد بازاری کے زمانے میں جو کوششیں کی گئیں ان کا رخ انجمنوں کی مزید سریع توسیع سے بہت زیادہ موجودہ انجمنوں کی اصلاح کرنے اور ان کو مستحکم بنانے کی جانب رہا۔ کچھ سال ادھر سے ایک اور اہم قدم جو آگے بڑھایا گیا وہ یہ تھا کہ کئی صوبوں مثلاً صوبہ متحدہ، صوبہ متوسط، مدراس اور برما نے تحقیقاتی کمیٹیاں قائم کیں[3]۔

۸۔ امداد باہمی کی انجمنوں کی تبویب

اب ہم امداد باہمی کی تحریک کی اہم خصوصیات کو زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی جانب متوجہ ہوتے ہیں[4]۔ انجمن ہائے امداد باہمی کی مندرجۂ ذیل تبویب سے

---

[1] دیکھو صفحہ ۲۰۴ حاشیہ نمبر (۱)

[2] دیکھو ڈی۔ جی۔ کلانٹے کی کتاب موسومہ بہ "قانون انجمن ہائے امداد باہمی بمبئی بابت ۱۹۲۵ء" صفحہ ۳۔

[3] دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ (۱۵۱)۔

[4] مختلف صوبوں میں تحریک امداد باہمی کی ترقی اور موجودہ حالت کے مفصل بیان کے لیے حسب ذیل رپورٹوں کا مطالعہ مناسب ہوگا: (۱) متعلقہ صوبوں کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹیوں کی رپورٹیں اور (۲) بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ باب ۹۔

امداد باہمی کے اس پیچیدہ ڈھانچ کا سرسری اندازہ ہو جائے گا جو ہندوستان میں تیار کیا گیا ہے

انجمنہائے امداد باہمی

مرکزی
(اتحادی انجمنیں، مرکزی بنک اور صوبہ واری بنک)

ابتدائی

غیر قرضی انجمنیں　　　　قرضی انجمنیں

غیر زرعی　　زرعی　　غیر زرعی　　زرعی
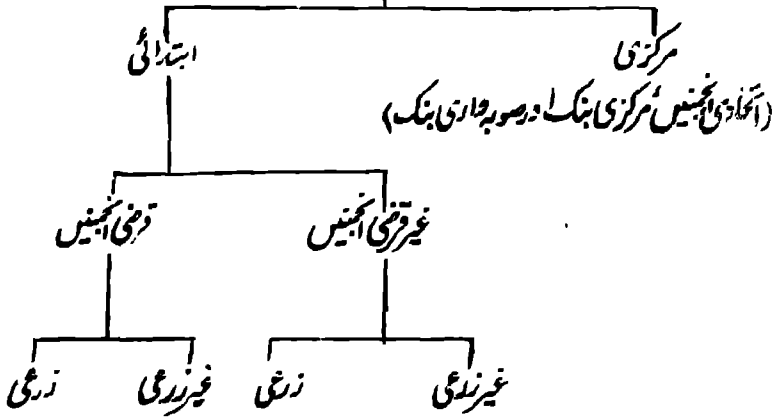
مندرجۂ ذیل جدول سے کسی حد تک یہ اندازہ قائم کیا جا سکتا ہے کہ انجمنوں کی اہم قسمیں کیا اضافی اہمیت رکھتی ہیں۔

انجمنوں کی نوع یا قسم	انجمنوں کی تعداد		ارکان کی تعداد	
	۱۹۰۶ء تا ۱۹۱۰ء (اوسط)	۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء	۱۹۰۶ء تا ۱۹۱۰ء (اوسط)	۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء
مرکزی انجمنیں (صوبہ واری و مرکزی بنک اور بنک کاری کی افعال کو شامل کر کے)	۱۷	۶۱۳	۱۹۸۷	۱۹۷۶۳۳
نگرانی و ضمانت کرنیوالی انجمنیں (بشمول مکرر بیمہ کی انجمنیں)		۸۷۹		۳۵۸۳۰
زرعی انجمنیں (بشمول انجمن ہائے بیمۂ مویشی)	۱۷۱۳	۹۲۴۶۷	۱۰۷،۶۴۳	۲۹۸۸۶۶۷
غیر زرعی انجمنیں	۱۹۶	۱۱۱۲۴	۵۳،۲۶۷	۱۲۲۷۵۵۵
میزان	۱۹۲۶	۱۰۵۰۸۴	۱۶۱۹۱۰	۴۳۱۶۲۲۲
			ابتدائی انجمنوں کے ارکان کی مجموعی تعداد	

"بین الاقوامی ادارۂ زراعت[1] واقع روما کے مشورے پر ہندوستانی صوبوں نے انجمن ہائے امداد باہمی کی جو سرکاری تبویب[2] اختیار کی وہ حسب ذیل ہے :- (۱) قرضے کی انجمن ؛ (۲) خریداری یا خرید و فروخت کی انجمن ؛ (۳) پیدائش دولت کی انجمن ؛ (۴) پیدائش و فروخت کی انجمن ؛ (۵) بیمے کی انجمن اور (۶) دوسرے کاموں کی انجمنیں۔

مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے سرسری طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ۳۳-۱۹۳۲ء تا ۳۴-۱۹۳۳ء تک مختلف قسم کی (۱) زرعی اور (۲) غیر زرعی انجمنوں نے کس حد تک ترقی کی[3] :-

[1] (International Institute of Agriculture)

[2] یہاں اس زیادہ با اصول اور اطمینان بخش تبویب کا ذکر کرنا نامناسب نہ ہوگا جو بمبئی کے ۱۹۲۵ء کے قانون میں اختیار کی گئی تھیں :- (۱) بہم رسانی ضروریات کی انجمن یعنی ایسی انجمن جو اپنے ارکان کے لیے مطلوبہ قرضے، اشیا یا خدمات مہیا کرنے کی غرض سے قائم کی جائے ؛ (۲) دولت پیدا کرنے والوں کی انجمن، یعنی ایسی انجمن جو اپنے ارکان کی اجتماعی ملک کی حیثیت سے اشیا تیار اور فروخت کرنے کی غرض سے قائم کی گئی ہو اور اس میں وہ انجمن بھی شامل ہے جو کسی انجمن کے ارکان کی اشیا کی اجتماعی حیثیت سے نکاسی کرنے کی غرض سے قائم کی گئی ہو ؛ (۳) ساہوکاروں کی انجمن یعنی وہ انجمن جو اپنے ارکان یا دوسرے صارفوں کے لیے اشیا حاصل کرنے، ان کو تقسیم کرنے یا ان کی خدمت انجام دینے کے لیے اور ایسی بہم رسانی و تقسیم سے حاصل شدہ منافع کو انجمن کے قواعد یا ذیلی قواعد کے تحت مقرر کردہ تناسب سے ارکان اور گاہکوں میں تقسیم کرنے کے لیے قائم کی جائے (۴) انجمن تعمیر امکنہ جو اپنے ارکان کے لیے اپنے ذیلی قواعد کے تحت مقرر کردہ شرائط پر مکانات کی تیاری و فراہمی کے لیے قائم کی جائے ؛ (۵) عام انجمن جو مذکورۂ بالا چاروں قسموں میں سے کسی کے تحت شمار نہ ہو سکے۔ دیکھو کیل ورث کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان میں امداد باہمی کے اصول اور قوانین"

[3] دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "ہندوستان میں تحریک امداد باہمی کے متعلق اعدادی تشریح" ۳۳-۱۹۳۲ء تا ۳۴-۱۹۳۳ء صفحہ ۱۲ تا ۱۵۔

قرضہ	خریداری اور فروخت	پیدائش	پیدائش اور فروخت	دوسری شکلیں	انجمنوں کی کل تعداد	اراکین کی تعداد	کاروباری سرمایہ
			زرعی انجمنیں				
۷۸۷۵۸	۳۰۳	۱۱۷۱	۱۸۶۶	۱۱۵۴	۹۲۲۲۶[1]	۲۶۸۵۱۵۸	۳۳۹۰۷۷۹۴۷
			غیر زرعی انجمنیں				
۵۴۱۹	۶۲۶	۱۲	۱۱۶۱	۳۶۰۱	۱۱۱۱۸[2]	۱۳۱۹۱۵۱	۱۱۸۵۷۴۴۴۳

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرضے کی انجمنوں اور خاص کر زرعی قرضے کی انجمنوں کی تعداد غالب اور بہت زیادہ ہے اور دوسری قسم کی انجمنوں نے مقابلۃً کم ترقی کی، گو اس اعتبار سے صورت حال بتدریج ترقی پذیر ہے۔ یہ تبویب اس لحاظ سے ناقص ہے کہ اس پر جو اعداد و شمار مبنی ہیں ان سے یہ بات پوری طرح واضح نہیں ہوتی کہ بعض اہم سمتوں میں ہندوستان میں امداد باہمی نے کتنی ترقی کی ہے۔ جیسا کہ بعد میں چل کر بیان ہوگا، ہندوستان کی قرضے کی اکثر انجمنیں قرضہ دینے کے اصل کاروبار کے علاوہ خریداری یا فروخت یا پیدائش یا ان کاموں میں سے دو یا تین کام ذیلی کاروبار کے طور پر انجام دیتی ہیں[3]۔

۹۔ زرعی قرضے کی ابتدائی انجمنیں اب ہندوستان کی انجمن ہائے امداد باہمی کی مختلف قسموں کو بیان کرنا مناسب ہوگا، اس سلسلے میں دیہی قرضے کی

[1] اس میں ۴۰۹۸ ایسی انجمنیں شامل ہیں جن کی تفصیلات معلوم نہیں ہیں۔

[2] 〃 〃 ۳۹۹ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

[3] دیکھو بی۔ جی۔ بھٹناگر کی کتاب موسومہ بہ "برطانوی ہند میں امداد باہمی کی تنظیم" صفحہ ۲۱۔

انجمنوں پر خاص طور پر زور دیا جائے گا جو انجمنوں کی مجموعی تعداد کا تقریباً ۹۰ فی صد ہیں۔ زرعی قرضے کی ابتدائی انجمن سے شروع کرکے ہم اس پر مختلف عنوانات کے تحت حسب ذیل غور کرسکتے ہیں:۔

(۱) وسعت۔ کسی مجوزہ دیہی قرضے کی انجمن کی رجسٹری کے لیے دس اشخاص مل کر درخواست کرسکتے ہیں۔ انجمن کے ارکان کی انتہائی تعداد ترجیحاً . . . سے متجاوز نہ ہونی چاہئے، اس لیے کہ تعداد کے اضافے کے ساتھ نہ صرف انتظام و نگرانی پر بلکہ اس تربیت کی خوبی پر بھی جو ارکان پاتے ہیں بُرا اثر پڑتا ہے۔

(۲) کاروباری دائرہ۔ قاعدہ تاحد امکان یہ ہونا چاہئے کہ ایک موضع کے لیے ایک انجمن قائم کی جائے اور عام طور پر ہوتا بھی ایسا ہی ہے۔ یہ ارکان کو ایک دوسرے کے حالات سے واقف رکھنے اور باہمی نگرانی کے لیے ضروری ہے۔

(۳) ذمہ داری۔ تاوقتیکہ حکومت اس قاعدے سے استثنا کی اجازت نہ دے، ذمہ داری غیر محدود ہوتی ہے۔ جیسا کہ میک لے گن کمیٹی نے تشریح کی ہے غیر محدود ذمہ داری کے معنی یہ ہیں کہ "جب انجمن اپنے ذمے کے مطالبات اپنے لیندا روں کو ادا کرنے سے قاصر رہے تو جتنا گھاٹا آئے اس کی ادائی میں اول تو کل حصص کی پوری رقم لے لی جائے اور اس کے بعد ارکان سے ان کی املاک کی پوری حد تک فرداً فرداً مسلسل رقم وصول کی جائے، لیکن لیندار کا براہ راست انجمن کے ارکان کے خلاف کوئی کارروائی کرنا ممنوع ہو۔"[1] غیر محدود ذمہ داری، دوہرے فائدے کی حامل ہے ایک تو یہ کہ وہ باہمی نگرانی و تنقیح کو فروغ دے کر ارکان پر تعلیمی و تربیتی اثر ڈالتی ہے۔ دوسرے یہ کہ انجمن کے بیرونی لین داروں میں اعتماد پیدا کرکے انجمن کی ساکھ کو بڑھا دیتی ہے۔

[1] دیکھو میک لے گن کمیٹی کی رپورٹ فقرہ ۷۴۔

باب ۱۰

(۴) انتظام - یہ جمہوری اور اعزازی طریقے پر انجام پاتا ہے[1]۔ انتظام دو جماعتوں کے سپرد کیا جاتا ہے' ایک تو "عام کمیٹی" جو جملہ ارکان پر مشتمل ہوتی ہے اور دوسرے "انتظامی کمیٹی" جو اول الذکر سے چھوٹی جماعت ہوتی ہے اور اول الذکر جماعت کے ارکان میں سے اس کے سالانہ عام جلسے میں پانچ تا نو ارکان کا انتخاب کرکے قائم کی جاتی ہے۔ عام کمیٹی' انتظامی کمیٹی کے ارکان کا انتخاب کرتی ہے' تنخواہ یاب معتمد کا تقرر کرتی ہے (جس کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ انجمن کا رکن ہو) انتظامی کمیٹی کا مرتب کردہ سالانہ چٹھا یا فرد حساب منظور کرتی ہے' مسجل اور تنقیح سازوں کے احکام اور رپورٹوں پر غور کرتی ہے' ارکان کو اگر ضرورت ہو تو خارج کرتی ہے' انجمن کے مجموعی قرضے کی انتہائی مقدار کا اور ارکان انجمن کے انفرادی قرضے کی مقدار کا تعین کرتی ہے' اور انجمن کے ذیلی قواعد کی ترمیم کرتی ہے۔ انتظامی کمیٹی انجمن کے روزمرہ کے کاروبار اور انتظامی معاملات کی ذمہ دار ہے۔ وہ نئے ارکان کو داخل کرتی ہے' ارکان کی قرضے کی درخواستوں پر کارروائی کرتی ہے' ارکان کے ذمے کے بقایا وصول کرتی ہے' ان کی نگرانی کرتی ہے' انجمن کے لیے رقمیں فراہم کرتی ہے اور معتمد کے مرتب کئے ہوئے حسابات کو جانچتی ہے۔

323

(۵) کاروباری اصل۔ اس کو دو ذرایع میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) داخلی (۲) خارجی۔ داخلی ذرایع حسب ذیل مدوں پر مشتمل ہیں:- ارکان کی فیس داخلہ' ارکان کی امانتیں' حصص کا اصل (اگر حصے جاری کئے جائیں)، اور انجمن کے سرمایۂ محفوظ میں زائد اثاثہ۔ ابتدائی مصارف کو پورا کرنے کے لیے

---

[1] اعزازی خدمات اس لیے ضروری ہیں کہ بنک کاری کا اولین مقصد یہ ہے کہ معقول شرح سود پر قرضے کی سہولت بہم پہنچائی جائے۔ اگر مصارف میں کسی طرح کا اضافہ ہوا تو یہ مقصد فوت ہو جائے گا۔ دوسرے یہ کہ مفت خدمت انجام دینے سے فرض شناسی اور کاروباری عادات کی ہمت افزائی ہوتی ہے۔ تیسرے یہ کہ انتظام میں اتنی کم محنت صرف ہوتی ہے کہ اس کا کوئی معاوضہ ادا کرنا بہ مشکل حق بجانب ہو سکتا ہے۔

فیس داخلہ ضروری ہے اور وہ ارکان کے ذہن میں یہ بات بٹھانے کے لیے نہایت مفید کام انجام دیتی ہے کہ رکنیت کے حق کے معنی "قربانی" اور "ایثار" ہیں۔ حصص کا اصل پنجاب، صوبۂ متحدہ اور برما جیسے صوبوں کے سوا دوسرے صوبوں میں بہت ہی ادنیٰ حیثیت رکھتا ہے احاطۂ بمبئی میں خاص کر نہری علاقوں میں حصص کو بہ اقساط ادا کرنے کا طریقہ حال ہی میں رائج کیا گیا ہے اور وہ "حفاظت سے دوسرے سورچے" یا ارکان کی غیر محدود ذمہ داری کے پشتے، کے طور پر بہت پسند کیا گیا ہے۔ اس کی اس بنیاد پر حمایت کی جاتی ہے کہ وہ انجمن کو اپنے طور پر مستقل اصل معقول مقدار میں مہیا کرنے میں مدد دیتا ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی یہ مقصد بہترین طریقے پر یوں پورا ہو سکتا ہے کہ قرضے کے لین اور دین کے سود کی شرحوں میں کافی وسیع فرق پیدا کر کے اس کی بچت سے ایک معقول سرمایۂ محفوظ قائم کیا جائے اور سود کی شرحوں میں معقول فرق قائم کرنے میں ایک طرف تو یہ امر ملحوظ رکھا جائے کہ انجمن کی مالی حالت خراب نہ ہونے پائے اور دوسری جانب یہ خیال رکھا جائے کہ قرضہ بحد ممکنہ ارزاں شرح پر دیا جائے۔ ان دونوں شرحوں میں اچھا خاصا وسیع فرق پیدا کرنا اس لیے ممکن ہے کہ ہندوستان میں قرضوں پر عام طور سے بہت اعلیٰ شرح سود لی جاتی ہے بہت ہی ادنیٰ شرح سود کی بھی مخالفت کرنی چاہیئے، اس لئے کہ ممکن ہے کہ اس کی بنا پر قرض گیرندہ ارکان کو یہ ترغیب ہو کہ رقم حاصل کر کے اپنے طور پر از سر نو قرض دیں۔ مذکورۂ بالا صوبوں میں دیہی قرضے کی انجمنوں کے ارکان نے اس بات کو ترجیح دی کہ سرمایے کے لیے حصے جاری کئے جائیں تاکہ وہ اس قابل ہوں کہ اپنے طور پر سرمایہ فراہم کریں۔ اس پر کوئی اعتراض نہ ہونا چاہئے، بشرطیکہ غریب اشخاص حصص سے محروم نہ رہیں، اور انجمن، معمولی انجمن سرمایۂ مشترک کی طرح مقسوم طلبی کی طرف نہ لے جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ اصل کے لیے بیرونی وسائل پر انحصار کرنے کے طریقے کو روکنے کے لیے یہ عام طور پر ضروری پایا جا رہا ہے کہ حصص جاری کرنے کے چارۂ کار کو اختیار کیا جائے۔ دیہی قرضے کی انجمن کے لیے مطلوبہ اصل مہیا کرنے کا یہ طریقہ نہایت مناسب ہے کہ امانتیں مقامی طور سے جمع کی جائیں، اس لیے کہ

باب ۹

یہ طریقہ "گاؤں والوں کو کفایت شعار بناتا ہے، ایک معقول سرمایہ محفوظ قائم کرتا ہے، اور اشخاص کی ایک کار آمد جماعت کو جو اپنی امانتوں کی خود ہی محافظ ہوتی ہے یہ ترغیب دیتا ہے کہ انجمن کے انتظامی معاملات میں دلچسپی لے۔[1] لیکن مقامی امانتیں، ہندوستان کی دیہی انجمنوں کے مجموعی کاروباری سرمایے کا بہت ہی حقیر جزو ہیں۔[2] بنکوں میں امانتیں جمع کرنے اور اس سے کاروبار کرنے کا طریقہ خاص کر دیہی علاقوں میں ابھی تک اپنے عہد طفولیت میں ہے، اور امانت پر جتنا سود مل سکتا ہے اس سے زیادہ زر کو بطور قرض دینے اور کاروبار میں لگانے سے ملتا ہے۔ ملک کے متمول طبقوں میں ابھی تک زیادہ تر یہ میلان پایا جاتا ہے کہ زمین یا سونا اور چاندی خریدیں۔ علاوہ ازیں عوام کی اوسط آمدنی بہت ہی کم ہے اور پس اندازی کی گنجایش بہت تنگ اور محدود ہوتی ہے لیکن جب تک امانتوں میں معقول اضافہ نہ ہو اس وقت تک امداد باہمی اپنے مقاصد میں سے ایک میں ناکام رہے گی۔ تاہم جبری امانتوں کا اصول غیر معقول ہے اور کفایت شعاری کو ترقی دینے کا بہتر طریقہ تو یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے اقساط میں حصص کی ادائی کے طریقے کو رائج کیا جائے۔[3]

824

اب اصل کے خارجی ذرائع کی جانب توجہ کرنی چاہئے۔ یہ ذرایع زیادہ تر قرضوں اور امانتوں پر مبنی ہوتے ہیں اور دوسری انجمنوں، حکومت اور سب سے بڑھ کر کوٹھی کا کاروبار کرنے والے ثانوی یا مرکزی اداروں مثلاً امداد باہمی کے

---

[1] دیکھو میک لے گن کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ (۴۸)۔

[2] جرمنی میں رایف آئزن کی انجمنوں کے سرمایے کا ۸۰ فی صد سے زاید حصہ امانتوں پر مشتمل ہے، اس کے برعکس ہندوستان میں یہ فی صد صرف ۱۰ ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ یورپ میں بھی امانتیں ابتداءً بہت سستی سے جمع ہوئیں اور یہی حال ہندوستان کا ہے جہاں انجمنیں ابتدائی اور تجربی دور میں ہیں۔ دیکھو میک لے گن کمیٹی کی رپورٹ، نیز بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ (۱۷۵)

[3] دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ (۱۵۵)

مرکزی یا صوبہ واری بنکوں سے حاصل کئے جاتے ہیں، جن کا وجود ہر صوبے میں ناگزیر پایا گیا ہے۔ حکومت نے بڑی دانشمندی کی کہ مالی مدد دینے کی پالیسی سے گریز کیا اور قرضے بھی ہاتھ روک کر دیے۔ امداد باہمی کے مالیے کے مسئلے سے بحث کرتے وقت کومٹی کے کاروبار کے مرکزی اداروں سے دیے جانے والے قرضوں کا تفصیلی طور پر ذکر کیا جائے گا۔ یہاں صرف یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ آج کل قرضے کی دیہی انجمنیں زیادہ تر اسی قسم کے بیرونی قرضوں پر انحصار کرتی ہیں اور ان کے مجموعی کاروباری اصل میں حصص اور امانتوں کا بہت ہی حقیر جزو ہوتا ہے۔

مندرجۂ ذیل اعداد و شمار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۳۳-۱۹۳۲ء میں زرعی انجمنوں کے کاروباری اصل کے مختلف اجزائے ترکیبی کی اضافی حالت کیا تھی۔ چونکہ زرعی انجمنوں کی مجموعی تعداد یعنی ۹۲۲۲۶ کے منجملہ قرضے کی انجمنیں ۸۵۸۰۷ ہیں، لہذا یہ خیال کرنا حق بجانب ہوگا کہ حسب ذیل اعداد عام طور پر قرضوں کی انجمنوں ہی کے متعلق ہیں۔

حصص کا اصل (ادا شدہ) . . . . ۸۰۷،۱۹۱،۳۴ روپیہ

قرضے اور امانتیں جو ختم سال تک مندرجۂ ذیل ذرائع سے حاصل کی گئیں:۔

ارکان	۱۹۷۹۱۷۴۲ روپیہ
غیر ارکان	۱۴۷۶۵۰۴۴ "
انجمنیں	۲۲۱۳۲۷۶ "
صوبہ واری یا مرکزی بنک	۱۷۴۷۶۰۶۵۴ "
حکومت	۱۹۸۸۴۳۵ "
سرمایۂ محفوظ	۸۵۶۳۹۷۰۹ "
میزان	۴۲،۹،۸،۷۷،۹۴۷ "

اس مقام پر ہندوستان کی کل انجمنوں کے کاروباری اصل کے اجزائے ترکیبی کے متعلق ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء کے اعداد و شمار بھی پیش کئے جاسکتے ہیں:۔

حصص کا اصل (ادا شدہ) ــــــــ ۱۹۰،۳۱۱ روپے (۰۰۰، روپے)
قرضے اور امانتیں جو ختم سال تک مندرجہ ذیل ذرائع سے حاصل کی گئیں:۔

ارکان	۷۸۰۳۳
انجمنیں	۴۱۱۷۷
صوبہ داری یا مرکزی بنک....	۲۵۵۲۵۰
حکومت	۱۴۳۷۹
غیر ارکان اور دوسرے ذرائع.....	۲۹۶۶۴۰
سرمایۂ محفوظ اور دوسرے فنڈ.....	۱۴۰۱۸۹
میزان	۸۵۷۲۵۸

(۶) قرضوں کا مقصد۔ قرضے صرف ارکان کو تین مقاصد کے لیے دیے جاتے ہیں:۔ (الف) پیدآور اغراض (ب) غیر پیدآور اغراض اور (ج) سابقہ قرضوں کی ادائی۔ پیدآور قرضوں کی تین قسمیں کی جاسکتی ہیں:۔ (۱) جاریہ زرعی کاروبار کے لیے کم مدت کے قرضے؛ (۲) حکومت کے محصول ادا کرنے کی غرض سے کم مدت کے قرضے: اور (۳) زمین کی مستقل اصلاح و ترقی کے لیے بڑی مدت کے قرضے۔ غیر پیدآور اغراض مثلاً رسوم کے

ـــــــ

لہ۔ دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "ہندوستان کی تحریک امداد باہمی کی اعدادی تشریح برائے ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء خلاصہ جدول (۳)۔

باب

مصارف وغیرہ کے لیے قرضے یوں تو نظری طور پر ناقابل منظوری ہیں، لیکن رعیت کو ساہوکار کے پنجے میں پھنسنے سے باز رکھنے کے لیے ضروری ہیں[1]۔ چنانچہ مناسب یہ ہے کہ ایسے قرضوں کو چھوٹی رقموں تک اور قطعی ضروری اغراض کے لیے محدود کرکے فضول خرچی کو روکنے اور کفایت شعاری کو ترقی دینے کی کوشش کی جائے۔ گزشتہ قرضوں کی ادائی کے مسئلے کی حد تک معیاری پالیسی یہ ہونی چاہئے کہ ارکان کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ ان کل مطالبات کو ادا کرلیں جو ان کے ذمے انجمن کے سوا دوسروں کو واجب الادا ہوں۔ لیکن دو تحدیدی امور قرضوں کی یکمشت ادائی کو ناقابل عمل اور نامناسب بناتے ہیں:۔ ناقابل عمل اس وجہ سے کہ ارکان کے دوسرے اغراض کو پورا کرنے کے لیے مطلوبہ قرضہ مہیا کرنے کے علاوہ اس غرض کے لیے کافی بڑی مقدار میں رقوم فراہم کرنا ناممکن ہے؛ نامناسب اس لحاظ سے کہ ہندوستان کے متوسط درجے کے کسان جیسے شخص کی نفسیات کا لحاظ کرنا ضروری ہے جس کے سر پر زمانۂ دراز سے بھاری قرضوں کا بوجھ لدا ہوا ہے قرضداری کے بوجھ سے ایک ہی جنبش میں کامل سبکدوشی، اگر ایسے شخص کا کو ممکن بھی فرض کرلیا جائے تو، رعیت پر نمایاں طور پر مخرب اخلاق اثر ڈالے گی اور اس کو بے احتیاطی و فضول خرچی کی طرف لے جائے گی۔ کفایت شعاری کو فروغ دینے کی غرض سے یہ ضروری ہے کہ تدریجی طریقے سے قرضے سے رہائی دلائی جائے۔ لیکن اس معاملے کا مفاد تمامتر نظری ہے، اس لیے کہ فنڈ کی قلت کی وجہ سے خوف تو اسی بات کا ہے کہ قرضے کی ادائی کا عمل حد سے زیادہ

328

[1] بمبئی اور مدراس میں معمولی قرضے کے گوشوارے یا فرد حساب کا طریقہ ایجاد کیا گیا ہے جس کی رو سے کسان کی تقریباً ہر ضرورت کے لیے جس میں غیر پیداآور مصارف شادی وغیرہ بھی شامل ہیں قرضہ دیا جاتا ہے، ہر رکن کے قرضہ لینے کی حد موسم کے لحاظ سے پیشگی مقرر کی جاتی ہے اور وقت پر مطلوبہ مالی مدد دینے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی اس طریقے کی حمایت کرتی ہے، دیکھو رپورٹ کا فقرہ (۱۰۳)۔

باب ۱۰

سریع ہونے کی بجائے مدت سے زیادہ سست ہوگا۔

(۷) قرضے کی ادائی۔ قرضے کی واپسی کی مدت کی حد تک عام قاعدہ یہ ہے کہ زرعی قرضہ فصلوں کے زراعتی دور کے تابع ہونا چاہئے اور اس کا اوسط "اچھے، برے اور معتدل" موسموں کے لحاظ سے مقرر ہونا چاہئے۔ دوسرے الفاظ میں ادائی اسی نفع بخش کاروبار کے ماحصل سے ہونی چاہئے جس کے لیے قرضہ دیا گیا ہو۔ رہے غیر پیدا آور قرضے تو ان کی ادائی کا تعین قرض گیر رکن کی حیثیت کے لحاظ سے ہونا چاہئے، تاکہ اس کے لیے ممکن ہو سکے کہ وہ اپنی آمدنی میں سے کفایت شعاری کے ذریعے سے اتنی کافی رقم پس انداز کرے کہ اپنے ذمے کے قرضے کو مدت معینہ پر اقساط کے ذریعے سے ادا کر سکے۔ اس کو اس سے زیادہ رقم بطور قرض نہ دینی چاہئے جتنی وہ مناسب مدت کے اندر سہل اقساط کے ذریعے سے ادا کر سکتا ہو۔ نصب العین یہ ہونا چاہئے کہ قرضہ پابندی سے وقت پر ادا کیا جائے، اس مقصد کو حاصل کرنے کی ہمیشہ کوشش کرنی چاہئے اور اس بارے میں تساہل کو قطعی طور پر روا نہ رکھنا چاہئے۔ صرف حقیقی تکلیف کی شدید صورتوں میں قرضے کی واپسی کے التواء کو منظور کرنا چاہئے۔ من مانی ادائی اور قرضوں کی از خود جلد جلد تجدید کی اجازت نہ دینی چاہئے، اس لیے کہ اس سے انجمن کے اغراض و مفاد کو بہت بھاری نقصان پہنچتا ہے۔ ارکان کی طرف سے قرضے کی مستعدانہ ادائی کو بجا طور پر اس بات کا اہم ترین معیار قرار دیا جاتا ہے کہ انجمن قرضۂ امداد باہمی کامیابی کے ساتھ چل رہی ہے۔ اس معیار سے جانچا جائے تو کہنا پڑے گا کہ ہندوستان میں انجمنوں نے کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کی ہے۔ بنک کاری کی صوبہ واری تحقیقاتی کمیٹیوں نے اس خصوصیت پر خاص طور پر زور دیا ہے کہ قرضے مدت گزر جانے کے بعد بھی ادا نہیں کئے جاتے اور اس کے اثرات بہت خراب ہوتے ہیں۔ حال میں زائد المیعاد قرضوں کی مقدار بہت خطرناک حد تک بڑھ گئی ہے۔ مثلاً ۳۰ رجون ۱۹۳۲ء کو زائد المیعاد قرضوں کا تناسب کاروباری سرمایے سے ۲۸ فی صد تھا اور کل قرضوں سے جو افراد کی طرف سے زرعی انجمنوں

کو واجب الادا تھے ۷ء۴۸ فی صد تھا۔ صورت حال نے اس وجہ سے بہت زیادہ نازک شکل اختیار کر لی کہ زرعی پیداوار کی قیمتوں میں تباہ کن کمی ہو گئی اور تمام دنیا میں کساد بازاری کا دور دورہ تھا جس کی بنا پر قرضے لینے والے کسان کی قرضہ ادا کرنے کی صلاحیت میں بہت کمی ہو گئی[1]۔ قرضے کی ادائی میں پابندی وقت کو یقینی بنانے کے لیے احتیاطی تدابیر اختیار کرنے چاہییں مثلاً۔ ہر رکن کے معمولی قرضے کی مقدار کا تعین، قرضے کی درخواست کرنے والوں میں سے قرض گیرندوں کا بہ احتیاط انتخاب، قرضہ منظور کرتے وقت قرضہ حاصل کرنے کی غرض وغایت اور ادائیگی کی قابلیت کی مناسب جانچ پڑتال اور دوسرے ارکان اور ضامنوں کے ذریعے سے قرض گیرندہ ارکان کے اعمال کی موثر نگرانی۔ وغیرہ۔ یہ بھی ضروری ہے کہ قرضے کی واپسی کی مدت سب قرضداروں کے لیے یکساں مقرر نہ کی جائے، بلکہ انفرادی قرض گیرندوں کی خاص ضرورتوں اور حالات کے لحاظ سے مقرر کی جائے[2]۔

(۴) ضمانت وکفالت۔ امداد باہمی کے قرضوں میں سب سے بہتر ضمانت وکفالت، دیانت داری اور اخلاقی قوت ہے۔ "دیانت داری سے بطور سرمایہ کام لینا چاہیئے"۔ لیکن اگر قرض گیر رکن کو معمولاً ارکان ہی میں سے ضامن پیش کرنے کے لیے کہا جائے اور متوازی کفالت کے طور پر منقولہ وغیر منقولہ جائداد قبول کی جائے تو قرضہ وصول نہ ہونے کا خطرہ کم ہو جائے گا اور بحیثیت مجموعی انجمن کی ساکھ کی اصلاح وترقی ہو سکتی ہے۔ اگرچہ سچ پوچھو تو مادی ضمانت امداد باہمی کے اصول سے تناقض رکھتی ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اگر مادی ضمانت کو کلیۃً خارج کر دیا جائے تو اس بات کا خطرہ ہے کہ مالک اس ضمانت کو ساہوکار کے پاس مکفول کر دے گا۔ اس لیے

827

[1] انڈین ایر بک بابت ۱۹۳۵ء صفحہ ۳۹۳۔

[2] دیکھو میک لیگن کمیٹی کی رپورٹ فقرہ ۲۳، نیز ڈی، ال مہتا کی کتاب موسوم بہ (Studies in Co-operative Finance) صفحہ ۲ تا ۱۳ اور بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ ۱۷۰۔

مناسب یہ ہے کہ اس کو کسی حد تک روا رکھا جائے۔ قانون کے تحت گروی کی کفالت جائز ہے اور صوبہ واری حکومتوں کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اس کو اپنے حسب صوابدید کسی انجمن یا انجمنوں کی حد تک منظم کریں۔ لیکن تمام صورتوں میں سب سے بڑی ضمانت شخصی وذاتی ہونی چاہئیے اور اس میلان کو برقرار رکھنا چاہئے جو جائداد یا ملک کو بطور ضمانت پیش کرنے کے خلاف ہے۔

(۹) تقسیم منافع۔ قرضے کی دیہی انجمن میں معمولی تجارتی مفہوم کے لحاظ سے منافع کی تقسیم عمل میں نہیں آتی، خاص کر اگر حصص کا اصل نہ ہو تو سب منافع سرمایۂ محفوظ میں جمع کر دیا جاتا ہے۔ لیکن ۱۹۱۲ء کے قانون کی رو سے دو صورتوں کو مستثنیٰ کرنے کی گنجایش ہے۔ چنانچہ اس قانون کی رو سے منافع کے ایک مقررہ حصے کو تعلیم اور خیرات جیسے کاموں میں خرچ کرنے کی اجازت ہے اور اگر کسی صورت میں حصص جاری کئے جائیں تو ان کے اصل پر محدود مقدار میں مقسوم تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ منافع کو اس طرح صرف کرنے میں مزید فائدہ یہ ہے کہ تحریک میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن کسی صورت میں بھی انجمن امداد باہمی کو بگاڑ کر جلب منفعت یا مقسوم طلبی کا ذریعہ نہ بنانا چاہئے۔

(۱۰) ثالثی۔ انجمن اور اس کے ارکان کے باہمی نزاعات کے تصفیے کے لیے نیز معمولی دیوانی عدالتوں کی عملداری اور کارروائی سے انجمن کو مستثنیٰ کر کے مقدمے بازیوں کی حوصلہ شکنی کرنے کی غرض سے ثالثی ضروری ہے تاکہ انجمن کا وقت اور مال اور اس کی قوت ضایع ہونے سے بچے۔ چنانچہ اس قسم کے انتظامات بمبئی اور بعض دوسرے صوبوں میں موجود ہیں۔

(۱۱) سرسری اختیارات۔ انجمنوں کو بقایا وصول کرنے کے سرسری اختیارات عطا کرنا نہایت قابل اعتراض امر ہے، اس لیے کہ وہ امداد باہمی کے بنیادی اصول کے خلاف ہے۔ دیوانی عدالتوں کے ذریعے سے قرضہ واپس وصول کرنے کے معمولی طریقے کے قطع نظر، ارکان کی مشترکہ ذمہ داری اور اخلاقی

باب

دبا ڈ ہی قرضے کی واپسی کے واحد ہتھیار ہونے چاہییں۔ انجمن کو سرسری اختیارات عطا کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ گہری باہمی نگرانی اور جانچ میں نقصان دہ طریقے پر تساہل رونما ہوگا۔

(۱۲) انجمنوں کی شکست۔ انجمنوں کو توڑنے کے اقتدار سے ہاتھ روک کر کام لینا مناسب ہے۔ لیکن یہ اقتدار فی نفسہٖ ضروری ہے تاکہ ایسی انجمنوں کو توڑا جاسکے جو کل تحریک امداد باہمی کے دامن پر ایک بدنما داغ ہوں اور جن کے کارآمد ثابت ہونے کی کوئی توقع نہ معلوم ہو[1]۔ قانون کی رو سے رجسٹرار انجمن کے معاملات کی تحقیقات کرنے کے بعد اس اختیار کو کام میں لا سکتا ہے۔

۱۰۔ میک لے گن کمیٹی اور بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی اہم سفارشیں

اس سلسلے میں میک لے گن کمیٹی کی اہم سفارشوں کو مختصراً بیان کرکے قرضے کی ابتدائی دیہی انجمنوں کے تبصرے کو ختم کرنا مناسب ہوگا۔ ان میں سے اکثر سفارشوں پر بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی نے بھی زور دیا ہے۔

میک لے گن کمیٹی قرضے کی دیہی انجمنوں کی اہمیت تسلیم کرتی ہے اور اس بات پر زور دیتی ہے کہ انھیں اولاً امداد باہمی کے اصول پر کام کرنا چاہیئے اور کاروباری اصول کو دوسرے درجے پر رکھنا چاہیئے۔ کمیٹی یہ خیال کرتی ہے کہ حقیقی امداد باہمی کے اصول پر

[1] انجمنوں کی ناکامی کے متعدد اسباب بیان کئے گئے ہیں اور ان میں حسب ذیل شامل ہیں:۔ مناسب نگرانی کا فقدان، بے احتیاطی کے ساتھ قرضے لینا، قرض گیروں کی سرکشی، قرضے کی واپسی میں غیر پابندِ وقت ہونا، قرضوں کا چند افراد تک محدود رکھنا، انجمن کے عہدہ داروں کی غیر دیانت داری یا نا اہلی، ارکان کا غلط انتخاب، انجمن کے دائرۂ کار کا پھیلاؤ کی حد سے زیادہ توسیع، پرانے قرضوں کی پوشیدگی، ناقص دستور العمل اندرونی اتحاد، ارکان کی ناکافی تعداد یا فنڈ کی ناکافی مقدار، ایک رکن کا پوری انجمن پر چھا جانا، اور انجمن کے معاملات میں ارکان کا عام طور سے دلچسپی نہ لینا۔ دیکھو میک لے گن کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ (۸۶)؛ نیز بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ (۱۷۸)۔

کام کرنے کے لئے مندرجۂ ذیل شرائط کی پابندی ضروری ہے:۔ (۱) امداد باہمی کے اصول کی معلومات اور ارکان کا مناسب طریقے پر انتخاب؛ (۲) اعتبار کی اصل بنیاد دیانت داری ہونی چاہیئے؛ (۳) لین دین صرف ارکان تک محدود رہنا چاہیئے؛ (۴) تخمینی اغراض یا سٹے کے لیے قرضے نہ دینے چاہئیں؛ (۵) قرضہ دینے سے پیشتر مناسب جانچ پڑتال کر لینی چاہیئے اور بعد میں مناسب طریقے پر نگرانی کرنی چاہیئے؛ (۶) آخری اقتدار ارکان کے ہاتھ میں رہے نہ کہ عہدہ داروں کے ہاتھ میں؛ (۷) کفایت شعاری کی ہمت افزائی کرنی چاہیئے اور سرمائیہ محفوظ کافی مقدار میں قائم کرنا چاہیئے؛ (۸) ہر رکن کو صرف ایک رائے کا حق ہونا چاہیئے؛ اور ارکان میں انجمن کے اندر معلومات کی پوری طرح اشاعت ہونی چاہیئے؛ (۹) اصل تاحدامکان ارکان اور ہمسایوں کی پس اندازیوں سے مہیا کرنا چاہیئے؛ اور (۱۰) قرضوں کی واپسی پابندی وقت کے ساتھ ہونی چاہیئے[1]۔

نئی انجمنوں کے قائم کرنے کے بارے میں میک لےگن کمیٹی متنبہ کرتی ہے کہ تحریک کی ترقی کی رفتار کو بیرونی ذرایع سے نا واجب طریقے پر تیز نہ کرنا چاہیئے۔ امداد باہمی کا شوق و ولولہ حتی الامکان از خود پیدا ہونے دینا چاہیئے۔ کمیٹی مذکور یہ بھی خیال ظاہر کرتی ہے کہ نا مناسب طور پر ادنی شرح سود سے پیدا کردہ حد سے زیادہ نمائشی اعتبار اور ساکھ کے خطرات سے بچنا اور زرعی مالیے کو زرعی دور پر مبنی رکھنا ضروری ہے۔

کاروباری پہلو پر نظر کرتے ہوئے، دونوں کمیٹیاں یہ رائے پیش کرتی ہیں کہ کاروباری اصل مہیا کرنے کی بہترین صورت یہ ہوگی کہ اس کا بیشتر اور معقول حصہ مقامی امانتوں کے ذریعے سے مہیا کیا جائے، اور یہ خیال ظاہر کرتی ہیں کہ قرضے کی دیہی تحریک کی کامیابی کو اسی معیار کی بنا پر جانچنا چاہیئے۔ میک لےگن کمیٹی یہ سفارش کرتی ہے کہ ارکان کی امانتوں پر کسی قدر اعلی شرح

---

[1] نیز دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ (۱۵۷)۔

باب

سود دینی چاہئے اور کفایت شعاری کو فروغ دینے اور مقامی امانتوں کو اپنی طرف کھینچنے کے لیے بجز جبری امانتوں کے طریق کے دوسری ہر ممکنہ کوشش کرنی چاہئے۔ وہ مدراس کی امانتوں کی موافقت نہیں کرتی، اس لیے کہ ایسی امانتیں محفوظ طریقے پر بطور قرض نہیں دی جا سکتیں۔ اسی سبب سے طویل مدت کی امانتوں کی ہمت افزائی ان پر اعلیٰ شرح سود ادا کر کے کرنی چاہئے۔ لیکن کم مدت کی امانتوں کی اجازت بھی دی جا سکتی ہے تاکہ کم مدت کے قرضوں کے مطالبات پورے کئے جا سکیں۔ کمیٹی کفایت شعاری کو فروغ دینے کے لیے ایک دوسرا استثنا یہ بھی روا رکھتی ہے کہ امانت بعد ... بونگ کی تائید کرتی ہے۔ اس سفارش کی تائید مزید بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی پر زور طریقے پر کرتی ہے۔ چنانچہ وہ اس بات پر زور دیتی ہے کہ نصب العین یہ ہونا چاہئے کہ کوٹھی کا کاروبار کرنے والی مرکزی ایجنسیوں پر قرضے کی دیہی انجمنوں کا موجودہ انحصار کم کیا جائے، اگرچہ وہ اس بات کو بھی تسلیم کرتی ہے کہ اس اثنا میں یہ ایجنسیاں بہت مفید کام انجام دیتی رہی ہیں۔ میک لےگن کمیٹی اور بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی دونوں اس بارے میں ہم خیال ہیں کہ بد انتظامی اور تغلب کو روکنے اور شغل اصل کرنے والے عوام میں ساکھ کو بہتر بنانے کے لیے باضابطہ اور مکمل جانچ اور نگرانی انتہائی طور پر اہم اور ضروری چیز ہے۔ بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی یہ بتلاتی ہے کہ حسابات کی تنقیح، نگرانی اور معائنہ ملے جلے کام ہیں اور ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتے ہیں؛ موجودہ زمانے میں یہ دو اور بعض اوقات تین مختلف ایجنسیوں کے ذریعے سے انجام پاتے ہیں، کام ایک کی حد سے تجاوز کر کے دوسرے کی حدود میں پہنچ جاتے ہیں اور محنت اور زر بکثرت ضایع ہوتا ہے۔ اس نقص کو رفع کرنے کے لیے کمیٹی یہ سفارش کرتی ہے کہ تنقیح حسابات کے دستوری فرائض کو مناسب طریقے سے انجام دینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر ضلع میں ایک ایک اتحادی انجمن قائم کی جائے تاکہ وہ ابتدائی مرکزی

قرضی و غیر قرضی انجمنوں کی تنقیح، نگرانی اور معائنے کے فرائض انجام دے۔ اتحادی انجمن میں اسی عملے سے کام لینا چاہئے جس کی بھرتی مجلس کے معدود اشخاص میں سے ہوئی ہو، لیکن مجلس کو کسی حال اتحادی انجمن کے اندرونی انتظام میں مداخلت نہ کرنی چاہئے۔ ممکن ہے کہ ان انجمنوں کی مجلسوں میں خاص طور پر تربیت یافتہ سرکاری عہدہ دار مقرر ہوں، لیکن بہتر یہ ہے کہ ملحقہ انجمنوں کے نمایندے ان میں شامل کئے جائیں اور سرکاری عہدہ دار بھی ان کے عملے میں کام کرنے کے لیے بھیجے جا سکتے ہیں۔ ضلع واری انجمنیں وفاق کے ذریعے سے ایک جداگانہ صوبہ واری انجمن[1] میں شریک ہو سکتی ہیں یا موجودہ صوبہ واری ادارہ ہائے امداد باہمی[2] میں مقامی حالات کے لحاظ سے ان کی خاص شاخ کے طور پر ملحق کی جا سکتی ہیں۔ صوبہ واری انجمن کے اہم کام یہ ہونے چاہئیں:۔

(۱) ضلع واری انجمنوں کی نگرانی؛ (۲) مرکزی بنکوں اور دوسری مرکزی انجمنوں کی تنقیح؛ (۳) صوبہ واری بنکوں صوبہ واری اداروں اور امداد باہمی کے دوسرے صوبہ واری نظامات کی تنقیح۔ ان کے مصارف ملحقہ انجمنوں کے چندوں اور حکومت کی مالی امداد سے پورے کرنے چاہئیں[3]۔ میکلے گن کمیٹی قرضہ وصول کرنے کے سرسری اختیارات عطا کرنے کی مخالفت کرتی ہے، ثالثی کی تائید کرتی ہے؛ اور قرضے کی دیہی انجمنوں کو تین امکانی خطرات سے متنبہ کرتی ہے یعنی (۱) مقاصد سے برگشتگی اور بے راہ روی؛ (۲) امداد باہمی کے عملی شوق و ولولے کی کمی؛ (۳) قرضے کی ادائی میں غیر پابندی وقت۔ پہلے نقص کے متعلق عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کمیٹی نے اس کی حد تک مبالغے سے کام لیا ہے۔ دوسرے نقص کی حد تک ہماری دیہی قرضے کی اکثر انجمنوں کا عمل لازمی طور پر امداد باہمی

---

[1] Provincial Apex Union

[2] Provincial Cooperative Institutes

[3] دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ (۱۰۳)۔

330

انبلے

کے نصب العین سے بہت بڑی حد تک ہٹا ہوا قرار دیا جا سکتا ہے۔ انجمن کی وساطت سے ارزاں شرح پر قرضہ دینا اہم ترین مقصد خیال کیا جانے لگا ہے، اور اس کے برعکس امداد باہمی کے دوسرے مقاصد اور تحفظات کو نظرانداز کیا جاتا ہے[1]۔ مرکزی ادارۂ امداد باہمی بمبئی، امداد باہمی کی باقاعدہ تعلیم کی اشاعت کرکے اور اس کے لیے جوش و خروش پیدا کرکے بہت ہی مفید کام انجام دے رہا ہے۔ پابندی وقت کے ساتھ ادا نہ کرنے کا نقص یقینی طور پر موجود ہے اور قابل افسوس ہے۔ زائد المعیاد قرضوں کا تناسب حد سے زیادہ ہے۔ اس کا باعث ادائی سے انحراف اس قدر نہیں ہے جس قدر کہ قرضہ وصول کرنے میں تساہل، عام معاشی حالات کی انحطاط پذیری اور انتظامی خرابیاں[2]۔ چنانچہ اس نقص کو رفع کرنے کی تدابیر پر ہم اوپر بحث کر چکے ہیں۔

۱۱۔ غیر زرعی قرضے کی انجمنیں۔ غیر زرعی قرضے کی انجمنوں کی ضرورت کا ذکر کرتے ہوئے میکلےگن کمیٹی یہ خیال ظاہر کرتی ہے کہ:-

[1] "ارزاں قرضے کی بہم رسانی کے بجائے حقیقی امداد باہمی کے طریقے کو ترقی دینے کی ضرورت اور امداد باہمی کے بناوٹی اداروں میں عوام سے امانتیں طلب کرنے کے خطرات ایسے معاملات ہیں جو بہت بڑی حد تک نظرانداز کر دئے گئے ہیں۔ سریع توسیع کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابتدائی انجمنیں اس درجہ کثیر تعداد میں رونما ہوگئیں کہ مسجل اور اس کا عملہ ان سے نپٹ نہ سکتا تھا، اور ایسے نقائص پیدا ہوگئے جو بے احتیاطی، عدم واقفیت اور عدم نگرانی سے غیر منفک ہیں" دیکھو میکلےگن کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ (۱۲)، صوبۂ متحدہ کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی نے یہ مفید مشورہ دیا ہے کہ "امداد باہمی کا شوق و ولولہ پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ قرضے کی انجمنوں سے پہلے دیہات سدھار، زندگی سدھار یا کفایت شعاری کی انجمنیں قائم کرنی چاہئیں، یا اگر یہ ممکن نہ ہو تو دونوں کو ساتھ ساتھ کھولنا چاہئے۔ دیکھو رپورٹ، فقرہ (۲۹۱)۔

[2] دیکھو وی، ال، مہتا کا مضمون بعنوان "بیمہ امداد باہمی"، بمبئی کا ایک رسالہ "بمبئی کوآپریٹیو کوارٹرلی" بابتہ ستمبر ۱۹۲۶ء؛ اور بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ (۱۷۰)۔

باب ۱۱

"ایسی حالت میں جبکہ قیمتیں بڑھ رہی ہوں، مکانات ناکافی اور غیر صحت بخش ہوں، اجرت عام طور پر بقا یا کے طور پر ادا شدنی رہتی ہو، اور تعلیم کی اشاعت کے نتیجے کے طور پر اعلیٰ معیار زندگی کی خواہش عام ہو، صنعتی مشکلات میں اضافہ ہونا لابدی ہے؛ اور ہماری یہ رائے ہے کہ امداد باہمی جیسے نظام کی ہر شکل جو ان مشکلات پر عہدہ برآ ہونے کا میلان رکھتی ہو، لائق تائید و اعانت ہے۔"[1] علاوہ ازیں زرعی انجمنوں کی جانب سے زرعی نہایت شدید موسمی طلب، مرکزی بنکوں کے لیے اس بات کو دشوار بنا دیتی ہے کہ اپنے اصل کو نفع بخش طریقے پر لگائیں۔ گو ابتداءً قرضے کی دیہی انجمنوں کو قائم کرنے کی جانب زیادہ توجہ صرف کی گئی لیکن سلسلۂ ملیتش طرز کی غیر زرعی قرضے کی انجمنوں نے بھی تمام صوبوں میں کسی حد تک ترقی کی ہے؛ اور یہ ترقی اس پالیسی کے مطابق ہوئی ہے جس کی میک لے گن کمیٹی نے سفارش کی تھی یعنی یہ کہ زرعی قرضے پر ابتداءً جو زور دیا جاتا رہا تھا اس کو ترک کیا جائے۔[2] غیر زرعی قرضے کی انجمنوں کی حسب ذیل اہم قسموں پر اب بحث کرنا نامناسب نہ ہوگا:-

(۱) عوام کے بنک۔ لزاتی کے اصول پر کام کرنے والی شہری قرضوں کی انجمنیں، جو خاص طور پر متوسط طبقے کے فائدے کے لیے قائم کی جاتی ہیں، اس لحاظ سے مفید کام انجام دیتی ہیں کہ وہ ہندوستان میں مشترک سرمائے کی بنک کاری کی سہولتوں کی کمی کو کم از کم ایک حد تک پورا کرتی ہیں اور بنک کاری کے نظریے اور عمل کی تحقیق کے لیے تربیت گاہ مہیا کرتی ہیں اگرچہ وہ بالعموم حقیقی امداد باہمی کے اصول پر کام نہیں کرتیں۔ بمبئی میں ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں مکمل شہری بنک ۱۴ تھے جن کا کاروباری اصل ۵۰۰۰ روپیہ سے زائد تھا اور ۴۳۵ دوسرے شہری بنک اور غیر زرعی قرضے کی انجمنیں تھیں۔

---

[1] دیکھو میک لے گن کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ (۱۵)۔

[2] " " " " " (۱۷)۔

ان پر تبصرہ کرتے ہوئے مسجل انجمن ہائے امداد باہمی بمبئی اپنی سالانہ رپورٹ بابت سنہ ۱۹۲۶ء تا سنہ ۱۹۲۷ء میں لکھتا ہے کہ "شہری بنک اور عوام کے بنک شہروں اور قصبات کی زندگی پر جو اثر ڈال رہے ہیں اس کی بابت مبالغہ کرنا مشکل ہے۔ مقامی تجارت ایسے رقبوں میں ترقی و پرورش پا رہی ہے جہاں ان بنکوں کے نہ ہونے کی صورت میں آبادی اور صنعتیں زوال پذیر رہتیں؛ ادنیٰ درجے کے دستکار اور شہری ہر شعبۂ زندگی میں بنک کاری کے خوگر ہوتے جا رہے ہیں[1]؛ اور تقریباً ہر اہم قصبے میں تمام ذاتوں اور پیشوں کے بااثر اشخاص امداد باہمی کی جد و جہد کے اس پہلو کو خدمت عامہ کی اہم شکلوں میں سے ایک کے طور پر اختیار کر رہے ہیں۔" گجرات کی امداد باہمی کی شہری انجمنوں نے حسابات کی اندرونی تنقیح کے لیے اپنی ایک نگران کار اتحادی انجمن ترتیب دی ہے۔

مدراس میں سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء کے ختم پر ۶۹۱ شہری بنک تھے[2]۔

(۲) کفایت شعاری اور بیمے کی انجمنیں۔ شہری انجمن امداد باہمی کی ایک اہم بدلی ہوئی شکل "کفایت شعاری کی انجمن" ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ ہر مہینے دو یا چار سال تک باقاعدہ پس اندازیاں جمع کر کے اور ان کو مفید ترین طریقے پر مشغول کر کے کفایت شعاری کو فروغ دیا جائے۔ اکثر انجمنوں کی طرف سے قرضے بھی دیے جاتے ہیں۔ پنجاب میں اس قسم کی ایک ہزار انجمنیں ہیں جن کے ارکان میں بیشتر حصہ مدرسے کے معلموں کا ہے۔ مدراس اور کسی حد تک بمبئی نے بھی اس سمت میں ترقی کی ہے۔

بیمے کی انجمنیں بمبئی، بنگال اور مدراس میں حال ہی میں قائم ہوئی ہیں۔

[1] بمبئی کی ایک سالانہ رپورٹ" (سنہ ۱۹۲۸ء تا سنہ ۱۹۲۹ء کے فقرہ (۸۰) میں اس خدمت کا اعتراف کیا گیا ہے جو یہ انجمنیں "چک" کے استعمال کو مقبول عام بنانے کے لیے کر رہی ہیں نیز دیکھو بنگال کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ (۲۸۳)۔

[2] ہندوستان کے شہری بنکوں کے سبق آموز بیان کے لیے دیکھو "انڈین کوآپریٹو ریویو" بابت جنوری سنہ ۱۹۳۶ء۔

باب

بمبئی کی انجمن بیمہ امداد باہمی سنہ ۱۹۳۰ء میں کھلی اور اس کی ترقی اچھی رہی۔ حال ہی میں اس انجمن نے اپنی ایک دیہی شاخ کے تحت ایک خاص اسکیم تیار اور جاری کی جس کا مقصد یہ ہے کہ ابتدائی انجمنوں کے ارکان کو فائدہ پہنچایا جائے[1]۔

(۳) فرقہ وار انجمنیں۔ فرقہ وار احساس قوی ہونے کی وجہ سے فرقہ وار قرضے کی انجمنیں امداد باہمی کے اصول پر کام کرنے کے لیے خاص طور پر موزوں ہیں۔ گو وسیع قومی اسباب کی بنا پر ایسے فرقہ وار احساس کی حوصلہ شکنی کرنی چاہئے۔ لیکن بعض مقررہ حدود کے اندر ایسی انجمنیں پسماندہ فرقوں کی تعلیمی و معاشی ترقی و بہبود کے لیے مفید ہیں۔

(۴) بڑے کارخانوں اور سرکاری محکموں کے اہلکاروں کی انجمنیں ایسی انجمنوں کا مقصد زیادہ تر کفایت شعاری اور پس اندازی کی ہمت افزائی ہونی چاہئے نہ کہ گزشتہ قرضوں کی یکمشت ادائی۔ اس قسم کی انجمن قرضہ کو سرکاری سرپرستی اور جانب داری جیسے نقائص سے محفوظ رکھنا چاہئے۔

(۵) دستکاروں کی انجمنیں۔ یہ اپنے دستور اور کاروبار کے اعتبار سے زرعی قرضے کی انجمنوں سے مماثلت رکھتی ہیں۔ ان کے کاروبار کا حلقہ چھوٹا ہوتا ہے، ان کی رکنیت صرف مقررہ پیشے کے اشخاص تک محدود ہوتی ہے حصص کا اصل تھوڑا ہوتا ہے اور کاروبار چلانے کے لیے مرکزی اداروں اور دوسرے ذرائع سے رقوم مستعار لی جاتی ہیں۔ اس لحاظ سے غیر محدود ذمہ داری ضروری ہے اگرچہ از روئے قانون اختیاری ہے۔ اس قسم کی اہم ترین انجمنیں وہ ہیں جو جلاہوں کے لیے قائم کی گئی ہیں۔ چونکہ دستی راچھ کی پارچہ بافی کی صنعت ہی موجودہ زمانے میں بھی اہم ترین گھریلو صنعت ہے اس لیے وہ امداد باہمی کی بنیاد پر تنظیم اور سرکاری امداد چاہتی ہے۔ بمبئی میں

[1] دیکھو بمبئی پریسیڈنسی کی "سالانہ رپورٹ" برائے ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء فقرہ (۵۲)۔

اس سمت میں بڑی حد تک ترقی ہوئی ہے، اور ایسی انجمنوں کو سرکار کی طرف سے براہِ راست مالی امداد دینا بالکل حق بجانب ہوگا۔ چند دوسرے ادنیٰ درجے کے دستکاروں مثلاً ٹوکری بنانے والوں، موچی، آہنگروں، نجاروں وغیرہ کے لیے بھی قرضے کی انجمنیں قائم کی گئی ہیں، لیکن انھوں نے کوئی قابل لحاظ ترقی نہیں کی ہے۔ پھر بھی یہ توقع ظاہر کی جاسکتی ہے کہ امداد باہمی کو ہندوستان میں چھوٹی صنعتوں کے احیا کے آلے کے طور پر کام میں لایا جاسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرضے اور دوسری ضرورتوں کے بارے میں چھوٹے کسان کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے ویسی ہی مشکلات کا سامنا چھوٹے دستکار کو بھی کرنا پڑتا ہے؛ ایسی صورت میں چھوٹے پیمانے کی صنعت کی دونوں شکلوں کے لیے ایک ہی ساتھ تنظیم کی شدید ضرورت ہے۔

(۶) گرنی کے مزدوروں کی انجمنیں۔ بمبئی اور کلکتہ جیسے کارخانوں سے بھرے ہوئے شہروں میں گرنی کے مزدوروں کے لیے ایسی انجمنوں کی شدید ضرورت ہے۔ ان مزدوروں کے معاشی و معاشرتی حالات نہایت غیر اطمینان بخش ہیں۔ کم اجرت، خراب مکانات، بیش خرچ زندگی، جابروں یا کارندوں کی نوچ کھسوٹ، ناخواندگی، ناواقفیت، بھاری قرضداری اور نشہ بازی، یہ ان نقائص میں سے مشتے نمونہ ہیں جن میں مزدور مبتلا ہیں۔ مزدوروں کی امداد باہمی کی انجمنیں قائم کرکے ان حالات کی بڑی حد تک اصلاح کی جاسکتی ہے۔ ٹاٹا جیسے خدمت خلق کا جذبہ رکھنے والے آجروں نے ایسی انجمنوں کی کسی حد تک مدد کی جن میں سے اکثر وں کو بمبئی کی سوشل سروس لیگ (انجمن رفاہ عام) نے مزدوروں کے فائدے کے لیے منظم کیا۔ ارزاں قرضہ مہیا کرنے اور کفایت شعاری کو فروغ دینے کے کام سے قطع نظر کرتے ہوئے، یہ انجمنیں مختلف قسم کی معاشرتی و تعلیمی جد و جہد کے مرکز کے طور پر بھی کام کرتی ہیں جس کا اثر مزدوروں کی خوبی کار پر بھی بہت اچھا پڑتا ہے مزدوروں کی ناخواندگی اور ادھر سے ادھر منتقل ہونے کی عادت کارخانے کے عمال میں امداد باہمی کی سریع ترقی کی راہ میں بہت بڑی مزاحمت پیدا کرتی ہے۔

(۷) نیچ طبقوں کی انجمنیں۔ نیچ طبقوں کے معاشی و معاشرتی حالات،

کارخانے کے مزدوروں سے بدرجہا زیادہ خستہ وخراب ہیں؛ اگر امداد باہمی کی انجمنیں قایم کردی جائیں تو توقع ہے کہ نہ صرف ان کی معاشی حالت کی اصلاح وترقی ہوجائیگی بلکہ وہ اپنے معاشری رتبے کو بھی ارفع واعلیٰ بنانے کے قابل ہوجائیں گے ۔ بمبئی میں سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کے رکن مسٹر جی ' کے ' دیودھر آنجہانی کی نگرانی میں ادائی قرضہ جات کی کمیٹی نے بہت ہی قابل تعریف کام کیا ہے ۔ کمیٹی مذکور نیچ طبقوں کی انجمنوں کی تنظیم کی نگرانی کرتی ہے اور ارکان کو امداد باہمی کے اصول کی تعلیم دیتی ہے ۔ حکومت اس کمیٹی کے مصارف کی تکمیل کے لیے انجمنوں کو مالی مدد دیتی ہے ۔ احاطۂ مدراس میں بھی سوشل سروس لیگ مختلف مرکز قائم کرکے ' اچھوتوں ' کی امداد کے لیے اسی قسم کا کام انجام دے رہی ہے[1]۔

غیر قرضی امداد باہمی کی تحریک

۱۲۔ بعض عام مسائل ۔ غیر قرضی انجمنوں کی مختلف قسموں کی بحث چھیڑنے سے پیشتر اس موضوع کے متعلق بعض عام مسائل کی مختصر بحث مناسب ہوگی ۔

(۱) غیر قرضی تحریک کی حال کی ترقی ۔ " انگلستان میں امداد باہمی کی تحریک کی جن شکلوں نے سب سے زیادہ قبولیت وکامیابی حاصل کی ہے وہ خریداری' پیدائش اور تقسیم کے متعلق ہیں ۔ لیکن ' براعظم ' کے اکثر ملکوں میں ان شعبوں میں اس وقت تک کام نہیں شروع کیا گیا جب تک کہ قرضے کی انجمنوں کی جڑیں مضبوطی سے قائم نہ ہوگئیں ' اور ہندوستان میں بھی تحریک کی نشو ونما براعظم ہی کے نقش قدم پر ہوئی ۔ غیر قرضی امداد باہمی کا روز افزوں مطالبہ ' امداد باہمی کی تحریک کے جاری ہونے کے بعد فوراً بعد ہی رونما ہوا اور یہ مطالبہ نہ صرف اس امر

---

[1] دیکھو وی ' ایل ' مہتا اور وی ' ایس ' سبّیا کی کتاب موسوم بہ " ہندوستان میں امداد باہمی " ص ۱۱۱ تا ص ۱۱۲ ۔

[2] دیکھو میکلےگن کمیٹی کی رپورٹ ص ۱۰ ۔

کی امید افزا علامت تھا کہ امداد باہمی کے اصول کو عوام نے پسند کیا تھا بلکہ بحیثیت مجموعی ملک کی معاشی حالت کی باعتدال و متوازن ترقی کے لیے بھی ضروری تھا۔ سنہ ۱۹۱۲ء کے قانون نے غیر قرضی انجمنوں کو تسلیم کر لیا تھا اور اس میں اسی مطالبے کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن غیر قرضی تحریک کی ترقی تمام صوبوں میں یکساں نہیں رہی ہے۔ دیہی قرضے پر توجہ مرتکز کرنے کی ابتدائی پالیسی میں ابھی تک کوئی قابل لحاظ ضعف نہیں پیدا ہوا ہے اور قرضی امداد باہمی کے مقابلے میں غیر قرضی امداد باہمی کی راہ میں بدرجہا زیادہ مشکلات حائل رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی غیر قرضی اداروں کی اہمیت اب کسی حد تک محسوس کی جا رہی ہے، جیسا کہ زرعی اور غیر زرعی دونوں کاروبار میں، خرید و فروخت، پیدائش، بیمہ اور تعمیر مکانات جیسے مختلف اغراض کے لیے انجمنوں کے قائم ہونے سے تصدیق ہوتی ہے۔ امداد باہمی کی بنیاد پر زراعت کی عام تنظیم جو زراعت کی جملہ منزلوں کو محیط ہو، ایک ایسی تحریک ہے جو اپنے اندر بہت بڑے امکانات رکھتی ہے۔ امداد باہمی کے قرضے کے فوائد کا احساس صرف اس وقت پوری طرح ہو سکتا ہے جبکہ ڈنمارک کی طرح یہاں بھی غیر قرضی اغراض کے لیے انجمہائے امداد باہمی قائم کر کے تمام دوسرے شعبوں سے بیچ والوں کو الگ کر دیا جائے۔ ہمیں بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی اس سفارش سے[1] کامل اتفاق ہے کہ اس تحریک کے غیر سرکاری لیڈروں اور محکمہ امداد باہمی کے عہدہ داروں کو چاہئے کہ خاص خاص قسم کی انجمنیں مثلاً مشترکہ کاشت کی انجمنیں، کھاد، تخم یا دوسری زرعی ضرورتوں کو پورا کرنے والی انجمنیں اور دیہی رقبوں میں ذیلی حرفتوں مثلاً چاول بھونے، ہولہ اوٹنے، غلہ کوٹنے، دودھ کی پیداوار تیار کرنے وغیرہ کاموں کی انجمنیں قائم کرنے کی خاص طور پر سعی کریں۔

(۲) غیر قرضی انجمنوں کی قسمیں۔ ہم غیر قرضی انجمنوں کی دو تقسیمیں یعنی

---

[1] دیکھو رپورٹ فقرہ (۱۷۱)۔

باب

زرعی و غیر زرعی قایم کر سکتے ہیں، جن میں سے ہر ایک ذیلی اقسام میں تقسیم کی جا سکتی ہے، مثلاً اشیائے خام اور آلات کشاورزی خریدنے والی انجمن، پیداوار فروخت کرنے والی انجمن، پیداوار تیار کرنے والی انجمن، تقسیم یا صرف کی انجمن، بیمے کی انجمن، تعمیر و تحصیل املاک کی انجمن اور دیگر متفرق کاموں کی انجمن۔ غیر قرضی انجمنوں کی سرکاری تبویب اور متعلقہ اعداد و شمار کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ اکثر قرضی انجمنیں مختلف غیر قرضی کاروبار بھی انجام دیتی ہیں۔

(۳) ذمہ داری۔ ۱۹۱۲ء کے قانون کے تحت یہ امر غیر قرضی انجمنوں کی مرضی و اختیار پر موقوف رکھا گیا ہے کہ خواہ وہ ذمہ داری محدود رکھیں یا غیر محدود۔ انجمنوں کی مختلف قسموں کی ضرورتوں اور حالات کے لحاظ سے ذمہ داری کی نوعیت بھی مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً زرعی غیر قرضی انجمنیں عام طور پر محدود ذمے داری کو ترجیح دیں گی، اس لیے کہ اگر ان کے ارکان ساتھ کے ساتھ قرضی انجمن کے بھی رکن ہوں تو ممکن ہے کہ وہ موخر الذکر انجمن میں غیر محدود ذمہ داری کا قول دے چکے ہوں۔ اس کے برخلاف ممکن ہے کہ دودھ کی پیداوار اور جلاہوں کی انجمنیں غیر محدود ذمے داری کو زیادہ مناسب پائیں، اس لیے کہ غیر ملکی سرمایے کی انھیں عام طور پر زیادہ ضرورت ہوتی ہے[1]۔

(۴) غیر ارکان کے ساتھ لین دین۔ امداد باہمی کے صحیح نظریے کے لحاظ سے اس قسم کا لین دین نامناسب و ناپسندیدہ ہے۔ دستکاروں کے بیمے اور تعمیر املاک کی انجمنوں کی حد تک لین دین لازمی طور پر ارکان تک محدود ہوتا ہے۔ غیر ارکان سے معاملہ کرنے کا سوال خرید و فروخت کی انجمنوں کے بارے میں پیدا ہوتا ہے۔ اگر غیر ارکان سے لین دین کیا گیا تو اس کا قرینہ ہے کہ رکنیت کا سلسلہ رک جائے اور معمولی تجارتی طریقے پر بے جا نفع حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ علاوہ ازیں خانگی تاجروں سے بھی بے جا مسابقت شروع ہو جائے گی۔ اس لیے کہ

335

---

[1] وکھوری، ال مہتا اور وی سہا کی محولہ بالا کتاب صفحہ ۱۵۱۔

قانون کے تحت انجمن ہائے امداد باہمی کو بعض ایسے حقوق اور مراعات حاصل ہیں جن سے خانگی تاجر محروم ہے۔ لیکن بعض صورتوں میں خاص کر پروپگنڈا کی غرض سے ایسے کاروبار کو روا رکھا جا سکتا ہے۔ تاکہ انجمن کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ نہ صرف اپنے کاروبار کو نفع اور کفایت شعاری کے ساتھ انجام دے بلکہ اپنے افادے کو غیر ارکان پر بھی ظاہر کرے جس کی بنا پر وہ بھی اس میں شریک ہو جائیں۔

(۵) ہر جداگانہ مقصد کے لیے ایک جداگانہ انجمن۔ امداد باہمی کا حقیقی نصب العین اس بات کا متقاضی ہے کہ ہر مقصد کے لیے ایک جداگانہ انجمن ہو اور واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کی تجویز بہت ہی اعلیٰ کاروباری اصول پر مبنی معلوم ہوتی ہے۔ اس بارے میں سب سے بڑا اعتراض اس بنا پر پیدا ہوتا ہے کہ گاؤں میں مختلف قسم کی انجمنوں کے انتظام کے لیے مناسب قسم کا عملہ کمیاب ہے۔ ایسی حالت میں مناسب طریقہ یہ ہے کہ قرضے کی انجمن ہی کو اس کی اجازت دی جائے کہ وہ اپنے اصل کاروبار کے علاوہ دوسرے کام بھی ذیلی طریقے پر انجام دے[۱] کیلورٹ صاحب بتلاتے ہیں کہ بیویریا، اٹلی، بلجیم، آسٹریا وغیرہ میں قرضے کی انجمن یا مقامی بنک، قرضے کے لین دین کے سوا دوسرے اور کئی کاروبار بھی کرتا ہے۔ جاپانی دیہی امداد باہمی کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ خرید فروخت وغیرہ کے مختلف کام عام طور پر ایک ہی انجمن ملا کر انجام دیتی ہے اور وہی انجمن تقریباً ہر صورت میں قرضے کا لین دین بھی کرتی ہے[۲] لیکن اس بارے میں ہندوستان کے کسی صوبے میں بھی اب تک کوئی قطعی قاعدہ یا طریقہ مقرر نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن ترقی کا صحیح اصول ڈنمارک پیش کرتا ہے، جہاں زراعت

---

[۱] اس میں شک نہیں کہ کاروباری اغراض کے لیے مختلف انجمنوں کی موجودگی سہولت پیدا کرے گی، لیکن کسی چھوٹے گاؤں میں ان سب کا انتظام نہ صرف مشکل بلکہ یقیناً زیادہ بیش خرچ ہوگا واقعہ یہ ہے کہ سب کا اس رائے پر اتفاق ہے کہ چھوٹے گاؤں میں بنک کاری اور تجارت کو الگ رکھنا غیر ممکن ہے۔ (ڈارلنگ)۔

[۲] دیکھو کیلورٹ کی کتاب موسومہ بہ "امداد باہمی کا قانون اور اصول" صفحہ ۹۱ تا صفحہ ۹۳۔

کی تنظیم بہ طریق امداد باہمی اعلیٰ درجے کی ترقی یافتہ ہے، اور جہاں انفرادی کسان اپنے گاؤں کی مختلف انجمنوں کا بہ یک وقت رکن ہوتا ہے۔ ایک دوسرے سے متناقص کاروبار کو ایک ساتھ ملا کر انجام دینے یا قرضے کی انجمنوں کی غیر محدود ذمہ داری کو ایسے معاملات میں جن کے لیے وہ کلیتہً نامناسب ہو جوکھم میں ڈالنے سے حتی الامکان باز رہنا ضروری ہے[۱]

۱۳۔ غیر قرضی زرعی تحریک

ہندوستان میں غیر قرضی تحریک نے اپنے دونوں شعبوں، زرعی و غیر زرعی، میں جو ترقی کی ہے اس پر اب بحث کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ غیر قرضی زرعی تحریک کی ضرورت نہایت شدید ہے، اس لیے کہ جیسا کہ ڈنمارک کی مثال سے ظاہر ہوتا ہے جس ملک میں ملکی کاشتکار ہوں وہاں زراعت صرف اس صورت میں ترقی کر سکتی ہے جب کہ اس کا کاروبار امداد باہمی کے اصول پر منظم ہو اور بیچ والوں کی خدمات کی ضرورت باقی نہ رکھی جائے تاکہ سب منافع کسانوں ہی کو مل سکے۔ موجودہ زمانے میں کسانوں کو خرید و فروخت کے معاملات میں ساہوکار (جو عام طور پر پنساری بھی ہوتا ہے اور تاجر بھی) اور دوسرے بیچ والے بھاری نقصان پہنچاتے ہیں[۲] آلات کشاورزی، کھاد اور عمدہ قسم

---

[۱] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ فقرہ (۵، ۳)۔

[۲] "ہر کسان کسی حد تک خود ہی اصل دار و مزدور اور خود ہی خریدار و فروشندہ ہوتا ہے، اور اس کے علاوہ اس سے یہ بھی توقع کی جاتی ہے کہ وہ اعلیٰ درجے کے سائنٹفک طریقے پر زمین سے فائدہ حاصل کرے گا۔ وہ ان سب کاموں میں خصوصی مہارت بہم نہیں پہنچا سکتا، لیکن وہ دوسرے کسانوں سے اتحاد کر سکتا اور ہر شعبے میں ان کے معارف اور تخصیص کے فوائد میں شرکت کر سکتا ہے۔ تجارت بیوپار، نقل و حمل اور کوٹھی کا کاروبار سب منظم ہیں اور تاوقتیکہ کسان بھی اپنے پیشے کی تنظیم نہ کر لے اور اس طرح اپنی آیندہ بہبود کی نگرانی نہ کرے، یہ سب پیشے اس کی گاڑھی پسینے کی کمائی چھین لیجائیں گے وہ جن لوگوں سے معاملہ کرتا ہے ان کی سریع تنظیم ہی اس کو اپنے ہمسایوں سے منظم اتحاد قائم کرنے کی شدید ضرورت کو بجبر محسوس کرا رہی ہے۔" دیکھو کیلورٹ کی کتاب موسوم بہ "امداد باہمی کا قانون اور اصول" ص ۵۔

کے تخم واجبی قیمتوں پر حاصل کرنے کے لیے انجمن ہائے امداد باہمی کی ضرورت ہے' چنانچہ ان میں سے بعض کاموں کے متعلق انجمنیں قائم ہو چکی ہیں اور فروخت بہ امداد باہمی کی چند انجمنیں بھی کام کر رہی ہیں۔ لیکن اس کام میں توسیع کی اور بہت گنجایش باقی ہے اور اب تک جتنی ترقی ہوئی ہے اس کی رفتار سست رہی۔ رسد بہ امداد باہمی نے زیادہ ترقی نہیں کی ہے' اس لیے کہ کاروبار کا پیمانہ چھوٹا ہے' انتظام جیسا عمدہ ہونا چاہئے ویسا نہیں ہے' اور نگرانی کا عملہ بھی تعداد میں کافی نہیں ہے۔[1]

ہندوستان میں جو بعض دوسری قسموں کی غیر قرضی زرعی انجمنیں قائم ہوئی ہیں ان کے متعلق بھی یہاں کچھ کہنا نامناسب نہ ہوگا۔ امداد باہمی کے بیمے کا اصول اب تک صرف مویشیوں کے بیمے کی حد تک استعمال کیا گیا ہے؛ مزرعے کے مکانات' فصلوں اور گھاس کے انباروں کے بارے میں ابھی اس کا اطلاق نہیں کیا گیا ہے۔ کچھ سال ادھر تک مویشیوں کے بیمے کی انجمنوں کے متعلق یہ خیال کیا جا رہا تھا کہ ان کی ترقی نہایت اطمینان بخش تھی۔ لیکن برما کی امداد باہمی کی تحقیقاتی کمیٹی (سنہ ۱۹۲۹ء) نے ایسی انجمنوں کی خاصی بڑی تعداد کا کام غیر اطمینان بخش پایا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ ان کو معطل کرنا ضروری تھا۔ کامیابی کی راہ میں سب سے بڑی مزاحمتیں یہ ہیں:۔ گاؤں کی معاشری نظم و ترتیب کا بگاڑ' طاعون مویشی [illegible] ہر یلے اور متعدی امراض کا مویشیوں میں پھیلنا اور انتظامی و مالی مشکلات۔ [illegible]ن ہمارے زرعی نظام میں امداد باہمی کے بیمے کی توسیع و ترقی کو مستقل نصب العین قرار دینا چاہئے۔ مویشیوں کی حالت کی اصلاح و ترقی اور ان کو قحط سے محفوظ رکھنے کے لیے افزایش نسل مویشیاں کی انجمنوں اور چارے کے معقول انتظام کا بھی سرسری ذکر کر دینا مناسب ہوگا۔ احاطہ بمبئی کی پہلی زرعی نمایش (سنہ ۱۹۲۶ء) کے شعبۂ مویشی نے اس امر کو بخوبی ثابت کر دیا کہ

---

[1] دیکھو مجلس انجمن ہائے امداد باہمی بمبئی کی سالانہ رپورٹ بابت سنہ ۱۹۲۸ء تا سنہ ۱۹۲۹ء فقرہ (۵۳)؛ نیز رپورٹ بابت سنہ ۱۹۲۹ء تا سنہ ۱۹۲۶ء فقرہ (۵۶)۔

اس قسم کی انجمنیں مفید کام انجام دے سکتی ہیں۔ باڑ قائم کرنے کی چند انجمنیں، خاص کر احاطۂ بمبئی کے جنوبی علاقے میں، بنائی گئی ہیں تاکہ فصلوں کو جنگلی خنزیر اور دوسرے موذی جانوروں کی دست برد سے محفوظ رکھا جا سکے۔ آب پاشی بہ امداد باہمی کی چند انجمنیں بھی قائم کی گئی ہیں، چنانچہ وہ خشک علاقوں میں، جہاں آب پاشی بذریعۂ نہر بیش خرچ یا ناممکن ہے، پانی کے مسئلے کا امید افزا حل پیش کرتی ہیں ایسی انجمنوں کو بنگال اور مدراس کے بعض علاقوں میں قابل لحاظ کامیابی ہوئی ہے۔ احاطۂ بمبئی میں اراضی کی اصلاح و ترقی کی آٹھ انجمنیں کام کر رہی ہیں۔

امداد باہمی کی تحریک کی ایک اور نمایاں شکل، جس کا ذکر کیا جا چکا ہے، وہ کام ہے جو پنجاب کے بعض دیہات میں کھیتوں کے اشتمال کے سلسلے میں انجام دیا جا رہا ہے۔ کاشت بہ امداد باہمی کے طریقے کو اب تک بہ مشکل ہاتھ لگایا گیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ کاشت کی اصلاح و ترقی کا کامیاب طریقہ اس بات کا متقاضی ہے کہ امداد باہمی کی بنیاد پر مشترکہ طور پر کاشت کی جائے جیسا کہ اٹلی میں ہو رہا ہے، خاص کر اس وقت تک جب تک کہ زرعی کھیت چھوٹے اور منتشر رہیں۔

صارفوں کی تحریک نے انگلستان میں تو نہایت نمایاں ترقی کی ہے لیکن ہندوستان میں خاص کر دیہی علاقوں میں اس کی ترقی بہت ہی محدود رہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دیہی برادری کی خانگی ضرورتیں محدود و مختصر ہیں جن کی تکمیل مقامی پیداوار یا دیہی بازاروں سے بآسانی ہو جاتی ہے، اور معیار زندگی اس قدر پست اور ادنیٰ ہے کہ اگر ہم دوسری انتظامی دشواریوں کو نظر انداز بھی کر دیں تو تقسیم بہ امداد باہمی کی بہ مشکل ضرورت و گنجائش ہے۔ امید کی جھلک صرف اس بات کے عام طور پر آگے بڑھنے اور ان کے معیار زندگی کی اصلاح و ترقی میں دکھائی دیتی ہے۔ شیر خانے کی انجمنوں کے لیے بہت بڑی گنجائش موجود ہے تاکہ خالص دودھ واجبی قیمتوں پر خاص کر شہروں کو مہیا کیا جا سکے۔ چنانچہ ایسی کچھ انجمنیں ملک میں پائی جاتی ہیں لیکن ابھی ان کو بہت بڑی تعداد میں قائم کرنے کی ضرورت ہے۔

باب

ہندوستان کی زراعت میں امداد باہمی کی تحریک کی ترقی ابھی اپنی ابتدائی حالت میں ہے، اور غیر قرضی زرعی امداد باہمی کے لیے انتہائی مفید کاموں کا بہت وسیع میدان موجود ہے، چنانچہ ڈنمارک اور یورپ کے بعض دوسرے ملکوں میں اس تحریک نے کسان کی حیثیت کو اس درجہ مستحکم بنا دیا ہے کہ وہ سرمایہ دار کسان سے مساوی شرائط پر مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے[1]۔ جیسا کہ ڈاکٹر کلاوسٹن نے کہا ہے "بمبئی کی روئی کی فروخت کی انجمنوں، بنگال کی آب پاشی اور دودھ کی انجمنوں، صوبۂ متوسط کی تخم اور دودھ کی پیداوار کی انجمنوں، اور پنجاب میں کھیتوں کے اشتمال، نہروں سے کیچڑ نکالنے اور پیداوار کی فروخت کی انجمنوں نے اس قدر عمدہ اور قابل قدر کام انجام دیا ہے کہ یہ توقع کرنے کی ہمت ہوتی ہے کہ اگر ضروری و مطلوبہ انتظامی عملہ دستیاب ہو تو امداد باہمی رفتار زمانہ کے ساتھ کسان کو اس کی محنت و مشقت کا ثمر یقینی طور پر دلوانے میں ویسا ہی اہم حصہ لے گی جیسا کہ اس کو ارزان اصل مہیا کرنے میں اس وقت لے رہی ہے"[2] اس غرض کے لیے کہ حکومت اس کام کی تکمیل میں زیادہ موثر طریقے پر مدد دے چند اصلاحیں ضروری ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ محکمۂ امداد باہمی اور محکمہ جات زراعت و علاج حیوانات میں زیادہ قریبی باہمی تعامل و تعاون ہونا چاہئے۔ سچ پوچھو تو امداد باہمی کی انجمنیں یہ امید دلاتی ہیں کہ وہ محکمہ جات زراعت و علاج حیوانات کے پروپگنڈا کے اغراض کے لیے بہترین ایجنسی ثابت ہوں گی۔ چنانچہ صرف غیر قرضی امداد باہمی کی توسیع و ترقی کے ذریعے ہی سے ماہرین زراعت و علاج حیوانات کی تعلیمات کو عوام تک پہنچایا جا سکتا ہے اور کسی سرکاری نظام کی انفرادی طور پر ان تک رسائی ناممکن ہے[3]۔ بمبئی میں اس تحریک کا

388

[1] دیکھو اروِن کی کتاب "دیہی یورپ کی ترکیب" صفحہ ۱۹۵۔

[2] دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "ہندوستان کے زرعی کاروبار پر تبصرہ" (سنہ ۱۹۲۶ء تا سنہ ۱۹۲۷ء)۔

[3] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ فقرہ ۳۸۶۔

بابـ

آغاز ہو چکا ہے اور اس سلسلے میں علاقہ داری بورڈ قائم کئے گئے ہیں جو مددگار مسجل محکمۂ امداد باہمی، نائب ناظم محکمۂ زراعت اور چند دوسرے غیر سرکاری نمایندوں پر مشتمل ہے۔ ان کے کام کو انجام تک پہنچانے کے لیے خصوصی زرعی منتظم مقرر کئے گئے ہیں۔ دیہی رقبوں میں اصل کام انجمن ہائے ترقی تعلقہ Taluka Development Association انجام دیتی ہیں جن کی رجسٹری قانون انجمن ہائے امداد باہمی کے تحت ہوئی ہے۔ زرعی کمیشن اس بات کی مناسبت پر غور کرنے کا مشورہ دیتا ہے کہ ہر صوبے میں نائب ناظم محکمۂ زراعت کے گریڈ کا ایک خصوصی افسر مسجل کے تحت مقرر کیا جائے جو غیر قرضی انجمنوں میں اضافہ کرے، ان کو اصلاح و ترقی دے اور امداد باہمی کی تحریک کی تمام دوسری شکلوں کے امکانات کی تحقیقات کرے[1]۔

۱۴۔ غیر قرضی غیر زرعی انجمنیں

گو اس تحریک نے ابھی تک کافی قوت حاصل نہیں کی ہے تاہم مختلف صوبوں میں وہ کسی حد تک ترقی کر چکی ہے[2]۔ میک لےگن کمیٹی کی تحقیقات کے مطابق "جلاہوں کے لیے سوت اور ریشم، ٹوکری بنانے والوں کے لیے بید، نجاروں کے لیے لکڑی خریدنے مختلف صنعتوں اور حرفتوں کے لیے آلات اوزار اور بعض اوقات جدید وضع کے آلات مہیا کرنے اور ریشمی و سوتی پارچہ دریاں اور فرنیچر تیار اور فروخت کرنے کے انتظام کے سلسلے میں کامیاب کوششیں عمل میں لائی گئی ہیں۔ تعمیر مکانات کی انجمنیں قائم کی گئی ہیں اور روزمرہ کی معمولی ضرورتوں کی اکثر اشیا کی خرید و فروخت کا کام امداد باہمی کے متعدد ذخائر کے ذریعے سے انجام دیا جا رہا ہے[3]۔" اب غیر قرضی غیر [illegible] نظامات کی مختلف قسموں پر بحث کرنا مناسب ہوگا۔ (۱) دستکاروں کی خرید و فروخت کی انجمنیں۔ ہماری گھریلو حرفتوں اور

---

[1] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ فقرہ ۳۸۸۔

[2] دیکھو جدول مندرجہ صفحہ ٤٩٩۔

[3] دیکھو میک لےگن کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ (۱۰)۔

صنعتوں کی معاشی حالت کی اصلاح و ترقی کی غرض سے امداد باہمی کی بنیاد پر قرضہ اور دوسری ضرورتوں کی تنظیم جس طرح کسان کے لیے ضروری ہے اسی طرح دستکار کے لیے بھی ضروری ہے۔ دستی پارچہ کی صنعت اس بات کا امید افزا میدان پیش کرتی ہے کہ اشیائے خام کی تھوک خریداری، جدید وضع کے ترقی یافتہ کرگھوں اور آلات کے رواج اور صارفوں کے ہاتھ پارچے کی براہ راست فروخت جیسے مقاصد کے حاصل کرنے کے لیے امداد باہمی کے اصول پر تنظیم کی جائے۔ مختلف مرکزوں میں امداد باہمی کی جو صنعتی نمائشیں منعقد کی گئیں وہ اس قسم کی امداد باہمی کی پیداوار کے مختلف انواع و اقسام کی اچھی مثال پیش کرتی ہیں۔ بمبئی میں پارچہ بافی بہ امداد باہمی کی اہمیت کو حکومت نے تسلیم کرلیا ہے، چنانچہ محکمۂ امداد باہمی کے زیر نگرانی حکومت پارچہ بافی کے چند مدرسے چلا رہی ہے۔ کفش سازوں، زرگروں، بید بافوں، فرنیچر سازوں اور مس گروں وغیرہ جیسے دستکاروں کے بارے میں خفیف سی ترقی ہوئی ہے۔

(۲) غیر ماہر مزدوروں کی انجمنیں۔ مدراس کے اکثر علاقوں میں غیر ماہر مزدوروں کی انجمنیں پائی جاتی ہیں جو مٹی کے کام، سڑکوں کی مرمت وغیرہ کے بڑے بڑے ٹھیکے لیتی ہیں جن میں زیادہ تر غیر ماہر مزدور درکار ہوتے ہیں۔ ان میں ادنیٰ طبقے کے کسان بہ تعداد کثیر شامل ہوتے ہیں جن کو اپنی زرعی آمدنی کی کمی کو اس طرح پورا کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ ان کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ بدانتظامی اور حقوق قائمہ یعنی خانگی ٹھیکہ داروں کی مخالفت ہے۔ اس طرح دوسری انجمنیں بھی ہیں جو سڑکیں بنانے کا کام مشترکہ طور پر انجام دیتی ہیں[۱]۔

(۳) شہری علاقوں میں صارفوں کی انجمنیں۔ اس کا ذکر کیا جاچکا ہے کہ یہ تحریک دیہی رقبوں میں کتنی پسماندہ حالت میں ہے۔ شہری علاقوں میں

[۱] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ (روئداد شہادت) جلد سوم مسٹر ... محکمۂ امداد باہمی مدراس کی شہادت؛ نیز مسٹر ... کی سالانہ رپورٹ (۱۹۲۷ء تا ۱۹۲۸ء) فقرہ (۸۲)۔

باب ۱۱

صورت حال اس سے کچھ ہی بہتر ہے۔ بمبئی، مدراس، صوبۂ متحدہ وغیرہ میں امداد باہمی کے چند ذخائر قائم کئے گئے ہیں۔ چنانچہ ٹریلی کین اسٹورز مدراس کو ایسے ذخائر میں سب سے زیادہ کامیاب خیال کیا جا سکتا ہے۔ صوبۂ متحدہ اور بمبئی میں کلیہ جات کے اقامت خانوں کے متعلقہ ذخائر بعض صورتوں میں نہایت قابل لحاظ کامیابی کے ساتھ چلائے جا رہے ہیں[۱]۔ ریلوے ذخائر بھی بہت کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی نظر ڈالنے پر ہم اس واقعے سے دوچار ہوتے ہیں کہ یہاں صارفوں کی تحریک کی ترقی مغربی ممالک خاص کر انگلستان کی تحریک کی ترقی کے مقابلے میں نہایت حقیر ہے۔ یہاں کئی مشکلات ایسی ہیں جن پر غالب آنا ضروری ہے۔ جیسا کہ رجسٹرار انجمنہائے امداد باہمی بمبئی کا بیان ہے "ارکان میں وفاشعاری کا فقدان، عمدہ کاروباری انتظام اور مناسب نگرانی کی کمی ہی صارفوں کی اکثر انجمنوں کی ناکامی کا اہم سبب ہے[۲]" دوسری مشکلات یہ ہیں:- تھوک فروشی اور خوردہ فروشی کی قیمتوں کے درمیان قلیل فرق جو صارفوں کے لیے کافی جاذبیت نہیں رکھتا؛ مقررہ میعادی آمدنی پانے والوں کی ایک بڑی جماعت کی عدم موجودگی؛ اور بعض صورتوں میں امداد باہمی کے حقیقی تحفظات مثلاً نقد فروخت اور صرف ارکان سے معاملت سے غفلت و بے اعتنائی وغیرہ۔ اس میں شک نہیں کہ مال تقسیم کرنے والے ذخائر شہروں میں متوسط طبقوں اور مزدور پیشہ جماعتوں کے فائدے کے لیے نہایت ضروری ہیں؛ لیکن

840

---

[۱] مثلاً سڈن ہم کالج کواپریٹو اسٹورز لمیٹڈ

[۲] دیکھو رجسٹرار بمبئی کی سالانہ رپورٹیں (۲۳-۱۹۲۲ء تا ۲۷-۱۹۲۶ء و ۳۱-۱۹۳۰ء تا ۳۴-۱۹۳۳ء) نیز دیکھو بنگال کی بنک کاری کی صوبہ واری تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ (۱۷۹):- "شہری علاقوں کے ذخائر امداد باہمی تقریباً سب کے سب ناکامی سے دوچار رہیں۔ ان کے حسابات کا تصفیہ کرکے انھیں بند کر دینا چاہئے اور شہری یا دیہی علاقوں میں اس وقت تک نئے ذخائر قائم نہ کرنے چاہئیں جب تک کہ ارکان وفاشعاری اور امداد باہمی کے شوق کا بین ثبوت نہ پیش کریں۔"

اس کے باوجود صارفوں کی تحریک ہندوستان میں امداد باہمی کی تنظیم کا سب سے کمزور حصہ ہے تاوقتیکہ لوگوں میں زر کو باقاعدہ اور منظم طور پر خرچ کرنے کے عادات پیدا نہ ہوں اور وہ اشیا خریدتے وقت ان کی خوبی کو اچھی طرح جانچنے کے قابل نہ ہو جائیں ذخائر کی تحریک بہ مشکل سرسبز ہو سکتی ہے۔

۱۵ - مکان بنانے کی انجمنیں۔ کارخانے کے شہروں کے تنگ و تاریک اور گندہ مکانات کے مسئلے کو حل کرنے اور صاف ستھرے مکان مہیا کرنے کے لیے انگلستان میں جو مختلف کوششیں کی گئیں ان میں انجمن ہائے تعمیر و اصلاح مکانات بہ امداد باہمی کا بہت ہی نمایاں حصہ ہے۔ انگلستان میں ان کی کامیابی نے ہندوستان کو ان کی طرف متوجہ کرایا۔ بمبئی اور دوسرے شہری علاقوں میں اسی کے مماثل مسئلے کو حل کرنا ہے۔ اور یہ کام دیہات میں صاف ستھرے مکان مہیا کرنے کے عظیم الشان کام کے علاوہ ہے۔ مدراس، میسور اور حال میں بمبئی کے بعض شہروں میں تعمیر مکانات بہ امداد باہمی کی سمت قدم آگے بڑھایا جا چکا ہے۔ حکومت بمبئی نے مکانات بنانے کی مختلف قسم کی انجمنوں کو مالی مدد دینے کے متعلق جس کے لیے وہ آمادہ ہو گئی ہے چند قواعد حال ہی میں جاری کئے ہیں۔ بمبئی کے شہر میں انجمن مکان سازی بہ امداد (Bombay Co-operative Housing Association) کے زیر سرپرستی اصلاح و تعمیر مکانات کی کئی انجمنیں زیادہ تر متوسط طبقوں کے فائدے کے لیے قائم و منظم کی گئی ہیں۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء تا ۱۹۲۴ء میں احاطہ بمبئی میں ایسی انجمنوں کی تعداد ۹۱ اور ان کے ارکان کی مجموعی تعداد ۶۷۸۳ تھی۔

تعمیر و اصلاح مکان کی انجمنوں کی چار بڑی قسمیں قرار دی جا سکتی ہیں:۔
(۱) انجمن ہائے اراضی جو اپنے ارکان کے لیے محض تعمیر المکنہ کے خطے خریدتی ہیں اور ان پر ہر رکن اپنے طور پر الگ الگ مکان تعمیر کرتا ہے؛ (۲) انجمن ہائے قرضۂ رفاہ باہمی جو امداد باہمی کی بنیاد پر مکان تعمیر کرتی ہیں لیکن آخری مقصد یہ ہوتا ہے کہ قرضہ ادا ہو جانے کے بعد مکان ارکان کی ملک

۱۰۸۰ بن جائیں۔ یہ دونوں قسمیں حقیقی امداد باہمی کی نوعیت اس لحاظ سے نہیں رکھتیں کہ ان کے کاروبار کا بہت ہی قلیل جزو ارکان کی اپنی امداد باہمی پر مبنی ہوتا ہے اور وہ بھی مستقل حیثیت نہیں رکھتا؛ یہ انجمنیں خوشحال طبقے کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے زیادہ موزوں ہیں۔ مندرجۂ ذیل قسمیں ادنیٰ طبقے کی ضرورت کو پورا کرنے کے لحاظ سے زیادہ موزوں ہیں:- (۳) آسامیوں کی اشتراک باہمی کی انجمنیں، جن کے تحت مکانات نہ صرف مشترکہ طور پر تعمیر کئے جاتے ہیں بلکہ مشترکہ ملکیت و انتظام میں رہتے ہیں اور اس کے لیے مطلوبہ رقم ایک تو حصص کے ذریعے سے فراہم کی جاتی ہے جو ارکان خریدتے ہیں؛ اور دوسرے، مشترک املاک کی ضمانت وکفالت پر بیرونی ذرائع سے قرضے حاصل کر کے فراہم کی جاتی ہے؛ (۴) مکان خریدنے اور کرایہ پر لینے کی انجمنیں، جو کارخانے کے شہروں میں مزدور کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے خاص طور پر موزوں ہیں، اس لیے کہ وہ اپنی ذاتی ملکیت کے طور پر مکان مہیا کرنا تو درکنار، مشترکہ طور پر بھی مکانات خرید یا تعمیر نہیں کر سکتا۔[1]

841

۱۶۔ مرکزی انجمنیں اور امداد باہمی کا مالیہ

ہم نے اب تک ابتدائی انجمنوں کی مختلف قسموں پر بحث کی؛ اب امداد باہمی کی ترقی یافتہ مرکزی شکلوں کا مختصر ذکر باقی رہ جاتا ہے جو مختلف قسموں کی ابتدائی انجمنوں کے مالیے کی تنظیم، نگرانی اور مالی امداد کی غرض سے قائم کی گئی ہیں۔ ہم تحریک کے اس پہلو پر مرکزی انجمنوں کی تین قسموں یعنی (۱) اتحادی انجمن (۲) مرکزی بنک اور (۳) صوبہ واری بنک کے حوالے سے غور کر سکتے ہیں۔ مندرجۂ ذیل اعداد و شمار سے ان تینوں قسموں کی انجمنوں کی ترقی کی وسعت

[1] دیکھو وی، ال مہتا اور روی سبھا کی کتاب محولۂ بالا، ص ۱۳۱ تا ص ۱۳۲۔

باب

ظاہر ہوتی ہے:۔

(۱) اتحادی انجمنیں

ملحقہ انجمنوں کا مجموعی کاروباری اصل	ملحقہ انجمنوں کے ارکان کی تعداد	ملحقہ انجمنوں کی تعداد	اتحادی انجمنوں کی تعداد
۲۷۲۴۰۸۵۲۵	۱۴۵۱۲۹۶	۳۵۸۲۰	۸۷۸

(۲) مرکزی بنک

کاروباری اصل	ارکان کی تعداد		بنکوں کی تعداد
	انجمنیں	افراد	
۳۰۸۶۹۹۷۹۷	۸۹۳۹۲	۸۷۵۵۸	۶۰۳

(۳) صوبہ داری بنک

۱۱۰۱۰۵۶۲۱	۱۸۶۹۰	۱۹۹۳	۱۰

(۱) اتحادی انجمنیں (Unions) ہندوستان کے تقریباً سب صوبوں میں امداد باہمی کے کچھ نہ کچھ مرکزی ادارے موجود ہیں جن کی عملداری میں قرضے کی نگرانی اور تشخیص کی غرض سے مالگزاری کے

باب ۵ ضلع سے بھی بڑا رہا چھوٹا رقبہ ہوتا ہے[1]۔ یہ انجمنیں تین قسم کی ہوتی ہیں :-
(الف) ضمانتی انجمنیں، جیسے برما میں؛ (ب) نگرانی کرنے والی انجمنیں، جیسے مدراس اور بمبئی میں یا (ج) بنک کاری کی انجمنیں، جیسے پنجاب وغیرہ میں۔ ہر انجمن پانچ یا اس سے زیادہ سوسائٹیوں پر مشتمل ہوتی ہے جو انجمن کے صدر مقام سے زیادہ سے زیادہ ۵ تا ۸ میل کے دائرے کے اندر واقع ہوتی ہیں۔ انجمن کا انتظام ایک کمیٹی کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو مختلف رکن سوسائٹیوں کے نمایندوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ کمیٹی کے لیے ایک تنخواہ یاب معتمد ہوتا ہے اور ایک ذیلی کمیٹی بھی ہوتی ہے جو رکن سوسائٹیوں کے کاروبار کا معائنہ اور ان کے معاملات کی نگرانی کرتی ہے۔ اگر اتحادی انجمن ضمانتی انجمن بھی ہو تو کمیٹی مزید کام یہ کرتی ہے کہ رکن سوسائٹیوں کے بیرونی قرضوں کی مجموعی مقدار کا تعین کرتی ہے، اسی مقدار کی حد تک قرضے دینے والے مرکزی بنک کے ہاں ان کی سفارش کرتی ہے، اور بعض شرائط کے تحت ان رکن سوسائٹیوں کے قرضوں کے بارے میں بنک کے پاس اپنی ضمانت بھی پیش کرتی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان سفارشوں کو مرکزی بنک معتبر خیال کر سکتے ہیں، اس لیے کہ ابتدائی انجمنیں بنک میں حصہ دار بھی ہوتی ہیں۔ یہ خیال کیا گیا تھا کہ اتحادی انجمنیں نہ صرف رکن انجمنوں کے کاروبار کی نگرانی میں مفید ثابت ہوں گی بلکہ ابتدائی انجمنوں اور قرضہ دینے والے مرکزی اداروں کو جوڑنے والی کڑی ہونے کی حیثیت سے بھی کارآمد ہوں گی، اگرچہ وہ خود قرضے کا لین دین نہیں کرتیں۔
میکلے گن کمیٹی پرزور طریقے پر یہ سفارش کرتی ہے کہ جہاں ابتدائی انجمنیں اور مرکزی بنک قائم ہوں وہاں ایک ضمانتی انجمن بھی قائم کی جائے۔ کمیٹی مذکور یہ خیال ظاہر کرتی ہے کہ جہاں ابتدائی انجمنوں سے براہ راست معاملہ کرنے والا صرف ایک ہی صوبہ واری بنک ہو وہاں ایک ضمانتی

۵۴۲

[1] دیکھو دی، ال مہتا اور وی سیا کی کتاب محولۂ بالا صفحہ۔

انجمن کا ہونا ناگزیر ہے۔ بمبئی میں جو ضمانتی انجمنیں کھولی گئیں وہ کامیاب ثابت نہیں ہوئیں، جس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ اکثر صورتوں میں نام نہاد 'ضمانت' نمائشی اور برائے نام تھی' اور دوسرے یہ کہ فنڈ محدود ہونے کی وجہ سے کوئی قابل نگرانی کرنے والا ملازم نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ کمیٹی کا کام عام طور پر بے قاعدہ اور خراب رہا۔[1] اس لحاظ سے یہ تصفیہ کیا گیا کہ صرف نگرانی کرنے والی اتحادی انجمنوں کی ہمت افزائی کی جائے جیسا کہ مدراس میں کیا گیا جہاں ان کا کاروباری حلقہ وسیع ہے اور اس لحاظ سے ان کی مالی حالت عمدہ نگرانی کی ضامن ہے۔ برما میں ضمانتی انجمنوں کو حال حال تک اس قسم کی تنظیم کی نہایت کامیاب مثال کے طور پر پیش کیا جاتا تھا اور برما کی تحریک امداد باہمی کی روح رواں خیال کیا جاتا تھا۔ لیکن اب یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ یہ خیال غلط تھا' حتیٰ کہ برما کی امداد باہمی کی تحقیقاتی کمیٹی (۱۹۲۸ء تا ۱۹۲۹ء) یہ خیال کرتی ہے کہ زیادہ تر یہی ضمانتی انجمنیں اس صوبے کی تحریک کے نقائص کی ذمہ دار ہیں' اور یہ سفارش کرتی ہے کہ انجمن کی ضمانت کو حتی الامکان جلد منسوخ کر دیا جائے اور اتحادی انجمن کے نظام کی جدید تنظیم کی جائے تاکہ انجمن کی حیثیت محض نگران کار اور تربیتی جماعت کی رہے۔[2]

ابھی اس بارے میں کوئی قطعی رائے ظاہر کرنا قبل از وقت ہے کہ نگران کار انجمنیں نگرانی کرنے والی انجمنوں کی حیثیت سے مفید ثابت ہوئی ہیں۔ بمبئی میں تاسیس تنظیم کمیٹی (۱۹۳۲ء) نے مخالفانہ رائے ظاہر کی اور یہ سفارش کی کہ ان کو توڑ دیا جائے اور ان کو شعبہ واری تنقیح سازوں کے جو فرائض سپرد کیے گئے تھے لے لیے جائیں۔ ممکن ہے کہ نگرانی کا کام غیر سرکاری ایجنسی سے سرکاری ایجنسی کو منتقل کرنے کا یہ رجعت پسندانہ مشورہ حکومت بمبئی قبول

[1] دیکھو اس مسئلے کی مفصل بحث کے لیے بمبئی کے مسل کی سالانہ رپورٹ ۱۹۲۳ء تا ۱۹۲۴ء۔ ص ۹؛ نیز مہتا کی کتاب محولۂ بالا ص ۷۷ تا ص ۸۰۔

[2] دیکھو برما کی امداد باہمی کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ' فقرہ (۵۱ تا ۵۴)۔

نہ کرے، اس لیے کہ وہ تونگران کار انجمنوں کے نظام کو تقویت پہنچانے کے مسئلے پر غور کر رہی ہے، چنانچہ وہ اس بات پر اصرار کر رہی ہے کہ بہتر قابلیت کے ناظر مقرر کئے جائیں اور نگرانی کے لیے ضلع واری بورڈ قائم کئے جائیں تاکہ اتحادی انجمنیں مناسب اور بہتر طریق پر کام کریں[1] مرکزی بنکوں کے مقرر کردہ انسپکٹر بھی نگرانی کے کام میں مدد دیتے ہیں۔

(۲) مرکزی بنک — امداد باہمی کے مرکزی بنک عام طور پر کوٹھی کا کاروبار کرنے والی بڑی ایجنسی ہوتے ہیں جو ہندوستان جیسے ملک کے لیے ضروری ہیں، اس لیے کہ یہاں ابتدائی انجمنوں کے مقامی طور پر فراہم کردہ سرمائے کی مقدار کم ہونے کی وجہ سے اس کی کو زیادہ تر بیرونی اور دور افتادہ زر کے بازاروں سے زر حاصل کرکے پورا کرنا پڑتا ہے[2] اسی وجہ سے اس بات کی ضرورت پیدا ہوتی ہے کہ فوقانی وفاق قائم کئے جائیں جو یکے بعد دیگرے ابتدائی انجمنوں کا تعلق نہایت دور افتادہ شہروں سے قائم کریں اور ان شہروں کے مالی ذرائع سے انجمنوں کے لیے کاروباری اصل مہیا کریں۔ امداد باہمی کے کوٹھی کے کاروبار کا ایسا خصوصی نظام اولاً اس لیے ضروری ہے کہ دیہی مالیہ اس بات کا طالب ہے کہ سرمایہ کثیر مقدار میں اور طویل مدت کے لیے مہیا کیا جائے اور دوسرے اس وجہ سے ضروری ہے کہ معمولی مشترک سرمایہ کے بنکوں کو جو اپنا کاروبار صرف اہم شہروں میں چلاتے ہیں، اس بات کی ترغیب نہیں دی جا سکتی کہ دور افتادہ دیہی انجمنوں کو قرضہ دیں؛ اس لیے کہ

[1] دیکھو نگرانی کی کمیٹی کی رپورٹ (۱۹۲۸ء) اور انڈین ایر بک (۱۹۲۹ء) صفحہ ۳۹۲۔

[2] "زر کے بہاؤ کا رخ صوبہ واری بنک سے مرکزی بنک کی طرف، مرکزی بنک سے دیہی انجمنوں کی طرف اور دیہی انجمنوں سے انفرادی قرض گیرندوں کی طرف ہوتا ہے۔ قرضے کی تقسیم کے اس طریق کی تہ میں یہ خیال مضمر ہے کہ انجمن کے ذرائع کو ہزاروں چھوٹے کسانوں کے لیے قابل حصول بنایا جائے جن کو قرضے کی ضرورت ہو۔" دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ (۱۰۰)۔

خواہ بنک طویل مدت کے لیے قرضے دینے کے قابل ہی کیوں نہ ہوں اصل بات یہ ہے کہ وہ ان انجمنوں کے حالات سے ذرا بھی واقف نہیں ہوتے، اور دوسرے یہ کہ بنک عام طور پر طویل مدت کا قرضہ دے بھی نہیں سکتے۔ اس لحاظ سے میک لے گن کمیٹی یہ سفارش کرتی ہے کہ ہر ضلع میں ایک مرکزی بنک قائم کیا جائے۔

مرکزی بنک، اپنے تحت کی ابتدائی انجمنوں کے کاروباری اصل کی کثرت وقلت میں توازن پیدا کرنے والے مرکز کا کام انجام دیتا ہے۔ وہ ابتدائی انجمنوں کے مطلوبہ زائد اصل کی فراہمی کا انتظام کرتا ہے اور انھیں یا تو براہ راست یا "ضمانتی" انجمنوں کی وساطت سے جہاں کہیں وہ موجود ہیں، قرضے کی رقم مہیا کرتا ہے۔ بعض صورتوں میں مرکزی بنک، انجمنوں کی نگرانی و تنظیم کا کام بھی انجام دے سکتا ہے، خاص کر اگر، جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے، یہ انجمنیں اس کی حصہ دار ہوں۔ لیکن مرکزی بنک لازمی طور پر کوٹھی کا کاروبار کرنے والا ادارہ ہوتا ہے۔ اس کے کاروبار کا دائرہ عام طور پر پورے ایک ضلع کے انتظامی رقبے پر پھیلا ہوا ہوتا ہے، اگرچہ ممکن ہے کہ وہ کبھی ایک بڑے تعلقے یا ایک چھوٹے صوبے میں تنہا کام کرے۔ اگر کاروباری رقبہ بہت چھوٹا ہو تو اس سے انتظامی مصارف میں ناواجب اضافہ ہو جاتا ہے، اس کے برخلاف اگر کاروبار کا دائرہ بہت بڑا ہو تو اس کی وجہ سے نگرانی میں خرابی پیدا ہوتی ہے۔ بہرصورت افراط و تفریط سے بچ کر اعتدال کے راستے پر چلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

844

مرکزی بنک اپنی ترکیب کے اعتبار سے تین قسم کے ہیں:۔ (۱) اصلدار، (۲) مخلوط اور (۳) خالص[1]۔ اصلدار مرکزی بنک، انفرادی حصہ داروں کے زیر تسلط ہوتے ہیں۔ ان کی حیثیت معمولی مشترک سرمایے کے بنکوں کی ہوتی ہے اور حقیقی امداد باہمی کی خصوصیت سے وہ معرا ہوتے ہیں۔

[1] دیکھو دی۔ ال مہتا اور دی سینا کی کتاب محوّلہ بالا صفحہ ۱۲۰۔

لیکن ممکن ہے کہ کچھ مدت تک ان کا وجود ضروری ہوتا کہ اگر اصل دوسرے طریقوں سے مہیا نہ کیا جا سکتا ہو تو وہ انجمنوں کو حسب ضرورت اصل فراہم کر سکیں۔

مخلوط مرکزی بنک' افراد اور انجمنوں پر مشترک طور پر مشتمل ہوتے ہیں اور انجمنوں کو نہ صرف حصص کے اصل کے بارے میں خاص سہولتیں مہیا کرتے ہیں بلکہ مجلس انتظامی میں نمایندگی کا حق بھی عطا کرتے ہیں۔ اس قسم کے بنک اس لحاظ سے قابل قبول ہیں کہ وہ ایسے زینے کا کام دیتے ہیں جو ایک مثالی وفاقی طرز کے بنک یعنی خالص مرکزی بنک کے قیام کی طرف لے جاتا ہے جو صرف انجمنوں پر مشتمل ہو۔ مخلوط مرکزی بنک ایک طرف خوش حال ماہر کاروباری اشخاص اور متوسط طبقے کے ارکان کی مدد و مشورے سے استفادہ کرتا ہے تو دوسری طرف انجمنوں کے مفاد و اغراض کی حفاظت کرتا ہے اور خود ایسے مثالی طرز کے خالص مرکزی بنک میں تبدیل ہو سکتا ہے جس میں انفرادی ارکان کلیتہً غائب ہوتے ہیں۔ مخلوط قسم کا بنک ہندوستان کے موجودہ حالات میں نہایت موزوں ہے اور اس کو تقریباً سب صوبوں میں پسند کیا گیا ہے۔ مثالی وفاقی طرز کا بنک' اگرچہ نظری اعتبار سے بہترین ہے۔ لیکن اس کی راہ میں بعض مشکلات حائل ہیں' یعنی مطلوبہ کاروباری قابلیت بہم پہنچانے کے بارے میں وہ سراسر اپنے ہی پر انحصار کرنے کے ناقابل ہوتا ہے' اور متوسط طبقے کی دلچسپی حاصل کرنے اور اس لحاظ سے ابتدائی انجمنوں کی مالی مدد کی غرض سے کافی ذرائع مہیا کرنے سے قاصر ہوتا ہے۔ بنگال اور پنجاب جیسے بعض صوبوں میں خالص وفاقی مرکزی بنکوں (بنک کار انجمنوں) کی تعداد ترقی پذیر ہے۔

کاروباری اصل کے ذرائع کی حد تک اگرچہ حصص کا اصل ایک اہم مد ہے' لیکن مرکزی بنک اور صوبہ داری بنک دونوں کی حد تک کاروباری اصل کا بڑا حصہ افراد اور انجمنوں کی جمع کردہ امانتوں پر مشتمل ہوتا ہے'

باب

جیسا کہ سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء کے اعداد و شمار سے معلوم ہوگا:[1]

کاروباری اصل کے اجزائے ترکیبی	مرکزی بنک	صوبہ واری بنک
حصص کا اصل	۲۸۹۹۴۰۲۰	۶۷۷۵۳۶۸
مختلف ذرائع سے حاصل کردہ قرضے اور امانتیں		
انجمنیں	۳۱۴۱۵۱۶۰	۶۴۳۴۰۸۰
صوبہ واری یا مرکزی بنک	۲۹۷۷۸۰۶۵	۳۹۷۲۱۳۶۷
حکومت	۴۸۹۳۲۸۰	۱۱۲۱۵۵۰
افراد و دیگر ذرائع	۱۸۴۳۱۲۶۳۴	۴۹۷۹۲۴۹۵
سرمایہ محفوظ اور دیگر فنڈ	۲۹۳۱۶۶۲۹	۶۲۵۰۷۶۱
میزان	۳۰۸۷۰۹۶۹۷	۱۱۰۱۰۵۶۲۱

اس سبب سے نہ صرف کافی مقدار میں نقد ذخیرہ یا سیال ذرائع رکھنا ضروری ہے جس پر میک لے گن کمیٹی خاص طور پر اور جیسا کہ اکثر لوگ خیال کرتے ہیں مبالغہ آمیز طریقے پر زور دیتی ہے[2] بلکہ طویل مدت کی امانتیں کافی

345

[1] دیکھو ایک کتاب موسوم بہ "ہندوستان کی تحریک امداد باہمی کے متعلق اعدادی بیانات (سنہ ۱۹۳۲ء تا سنہ ۱۹۳۴ء) صفحہ ۱۰ تا ۱۱۔

[2] میک لے گن کمیٹی یہ سفارش کرتی ہے کہ مرکزی بنک میں مدرواں اور سیونگ کی امانتوں کے مقابلے میں تقریباً مساوی مقدار میں سرمایہ محفوظ ہر وقت مہیا رکھا جائے، اور اس سے قطع نظر کرتے ہوئے مستقل مد امانت کی مجموعی رقم کی نصف مقدار سیال اثاثہ کی شکل میں بھی رکھی جائے۔ صوبہ واری بنکوں

مقدار میں جمع کرنے کی ترغیب دینا بھی ضروری ہے۔ مرکزی بنکوں کو چاہئے کہ ابتدائی انجمنوں کو قرضہ دینے کا اس طریقے پر انتظام کریں کہ مدت معینہ کے ختم پر امانتوں کو واپس کرنے کے لیے قرضے کی رقم واپس مل سکے۔ بنکوں کے کاروبار کو لچکدار بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ نقدی اعتبار اور بنکوں کے امداد باہمی کے کاغذ پر بٹہ کاٹنے کی سہولتیں مہیا کی جائیں۔ یہ بحث ہمیں صوبہ واری امداد باہمی کے بنکوں کی نوعیت اور ان کے افادے کی بحث پر پہنچاتی ہے۔

(۳) صوبہ واری امداد باہمی کے بنک۔ مرکزی بنکوں کو اپنا کاروبار مناسب طریقے پر انجام دینے کے قابل بنانے کے لیے ایک صوبہ واری مرکزی بنک کی مدد کی ضرورت ہے تاکہ وہ ان کے کاروبار کی تنظیم و نگرانی کرے، ان کے کاروباری اصل کی کثرت و قلت میں توازن پیدا کرنے والے حساب گھر کا کام دے، اور صوبے کے مالی مرکز کی حیثیت سے کام کرے۔ وہ مرکزی بنکوں کو نقدی اعتبار اور بٹہ کاٹنے کی سہولتیں بھی بہم پہنچائے گا جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ مشترک سرمایے کے بنکوں پر اس بارے میں اس لیے انحصار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ پیش کردہ خاص ضمانت قبول نہیں کر سکتے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ: کے لیے اس مجموعی مقدار کے ایک ثلث کا تناسب قائم رکھنا کافی خیال کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ سے قرضہ دینے کی شرحیں بہت اعلیٰ ہو جائیں گی جس کے باعث چھوٹے قرض گیرندے کے لیے امداد باہمی اپنی اصل دلچسپی و دلکشی کھو دے گی۔ علاوہ ازیں شدت کے ساتھ یکساں طریقہ نافذ کرنے سے بنکوں کے لیے اس کا موقع باقی نہ رہے گا کہ بازار کی ضرورت کے مطابق اپنے حسب صوابدید کارروائی کریں۔ اس سے زیادہ قابل عمل تجویز وہ معلوم ہوتی ہے جو وقیع تجارتی بنکوں نے اختیار کی ہے جس کی بنا پر ملکی اصل کے مقابلے میں واجبات کی مقدار کی حد آٹھ گونہ زیادہ مقرر کی جاتی ہے۔ مختلف صوبوں میں جہاں محدود ذمہ داری والی انجمنیں کافی مقدار میں امانتیں حاصل نہیں کر سکتیں، ملکی اصل کے مقابلے میں آٹھ تا بارہ گونہ زیادہ واجبات کی انتہائی حد مقرر کی گئی ہے۔ دیکھو میکلےگن کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ ۱۰؛ نیز مہتا کی کتاب محولہ بالا صفحہ ۱۳۲۔

صوبہ واری بنک، ایک طرف عام زر کے بازار اور شہر کے مشترک سرمایے کے بنکوں اور دوسری جانب ابتدائی دیہی انجمنوں کو ملانے والی کڑی کا مفید کام بھی انجام دیتا ہے۔ اس سلسلے میں بنگال کی ایک دلچسپ تحریک کا ذکر کرنا نامناسب نہ ہوگا اور وہ یہ ہے کہ صوبے واری بنک میں امداد باہمی کی انجمنوں کا جو زاید از ضرورت زر جمع ہوتا ہے اس کو زرعی کساد بازاری کے زمانے میں بیرونی تجارت اور کاروبار کی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے مشترک سرمائے کے بنکوں کی وساطت سے لگایا جاتا ہے جس سے فریقین کو فائدہ ہوتا ہے۔

صوبہ واری صدر مرکزی بنکوں کو ابتدائی انجمنوں سے براہ راست معاملہ نہ کرنا چاہئے، بلکہ انھیں، مرکزی بنکوں کی مالی مدد کرنے والی ایجنسی اور ان کے کاروباری اصل کی قلت و کثرت میں توازن پیدا کرنے والے مرکز کے طور پر اپنی حیثیت کو منظم و مستحکم کرنا چاہئے۔[1] لیکن اس بارے میں طریق کار یکساں نہیں ہے۔ بعض صوبوں میں صدر مرکزی بنک، ابتدائی انجمنوں سے معاملہ ہی نہیں کرتے، لیکن بہار، اوڑیسہ، بمبئی، برما اور میسور جیسے بعض صوبوں میں وہ ابتدائی انجمنوں کی مالی مدد ان علاقوں میں برابر کرتے ہیں جہاں مرکزی بنک قائم نہیں ہوئے ہیں۔ بمبئی کے صوبے واری بنک کی ۴۰ شاخیں ہیں اور یہ سب صرف ان چند اضلاع میں ہیں جن میں کوئی مقامی بنک نہیں ہے یا ان اضلاع کے حصوں میں ہیں جہاں مقامی بنکوں نے کسی نہ کسی سبب سے اپنا کاروبار وسیع نہیں کیا۔[2]

جہاں تک صوبہ واری بنک کے دستور کا تعلق ہے، اس پر انھی امور کا اطلاق ہوتا ہے جو کہ مرکزی بنک پر صادق آتے ہیں۔ ممکن ہے کہ کچھ عرصے تک سرمایہ دار صوبے واری بنک ہی وہ تنہا مرکز رہے جو مرکزی بنکوں اور ابتدائی انجمنوں کے کاروباری اصل کی کمی کو پورا کرنے کی غرض سے کافی فنڈ

---

[1] دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ (۱۵۹)۔

[2] دیکھو "انڈین ایر بک" بابت ۱۹۳۵ء صفحہ ۳۹۰۔

مہیا کرے اور ضروری کاروباری معلومات کی فراہمی کا یقین دلائے۔ لیکن آخرکار اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ ملحقہ ادارہ ہائے امداد باہمی کو رایوں کی کثرت حاصل ہو۔

"صوبہ واری صدر مرکزی بنک" کم و بیش انھی اصول پر مدراس بمبئی، بنگال، بہار و اڑیسہ، پنجاب، برما[1]، صوبۂ متوسط و برار، آسام اور دو ہندوستانی ریاستوں یعنی میسور اور حیدر آباد میں قائم ہو گئے ہیں[2]۔ ان کے منجملہ بمبئی کا صوبہ واری بنک، جو سنہ ۱۹۱۱ء میں مرکزی بنک کی حیثیت سے قائم کیا گیا، متفقہ طور پر بہترین تسلیم کیا گیا ہے اور مختلف قسم کا کاروبار کرتا ہے۔ چنانچہ "امداد باہمی کی تحریک یا ترقی کی کوئی شکل ایسی نہیں ہے، خواہ ملیے کے متعلق ہو یا پروپگنڈا یا نگرانی کے متعلق، جس میں وہ حصہ نہ لیتا ہو[3]۔"

کاروباری اصل، نقد ذخیرۂ محفوظ کی ضرورت اور دوسری سہولتوں مثلاً نقدی اعتبار اور صوبہ واری بنک کی طرف سے پہلی دفعہ بٹہ کئے ہوئے امداد باہمی کے کاغذ پر دوبارہ بٹہ کٹائی کی حد تک وہی امور صادق آتے ہیں جو کہ مرکزی بنک کی صورت میں۔ اب جب کہ (اپریل سنہ ۱۹۳۵ء میں) رزرو بنک آف انڈیا قائم ہو گیا ہے تو یہ مکرر بٹہ کاٹنے اور قرضے کی سہولتوں کو صوبہ واری امداد باہمی کے بنکوں تک وسیع کرے گا[4]۔

(۴) آل انڈیا کواپریٹیو بنک۔ میک لے گن کمیٹی نے یہ سفارش

---

[1] برما کا بنک دیوالیہ ہو گیا ہے۔

[2] یو۔پی کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی نے یو۔پی کے لیے اسی قسم کے بنک کی تجویز پیش کی ہے (دیکھو رپورٹ، فقرہ ۵۰۳) بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی نے اس تجویز کی پرزور تائید کی ہے (دیکھو رپورٹ، فقرہ ۱۵۰)

[3] دیکھو مسجل محکمۂ امداد باہمی بمبئی کی رپورٹ بابت سنہ ۱۹۲۷ء تا سنہ ۱۹۲۸ء)

[4] دیکھو جلد دوم کتاب ہذا باب متعلقہ "بنک کاری"۔

باب۱۰

کی ہے کہ مذکورۂ بالا تمام اقسام کے مالی اداروں کے علاوہ ایک کل ہند صدر بنک امداد باہمی قائم کیا جائے تاکہ وہ صوبہ واری بنکوں کی اسی طرح مدد کرے جس طرح موجودہ کر ایک محدود حلقے میں مرکزی بنکوں کی مدد کرتے ہیں[1]۔

۳۴۷

میک لےگن کمیٹی کی رپورٹ پیش ہونے کے بعد سے ایک کل ہند صدر بنک قائم کرنے کی ضرورت یا مناسبت کے بارے میں خیالات میں بہت بڑی تبدیلی ہو گئی ہے۔ صورت حال میں تبدیلی پیدا کرنے والے عامل یہ ہیں:- (۱) صوبہ واری بنکوں میں زائد از ضرورت زر کثیر مقدار میں بے کار پڑا ہوا ہے، چنانچہ ان میں سے اکثروں میں سیال ذرائع کے اس اعلیٰ معیار سے بھی زیادہ مقدار موجود ہے جس کو برقرار رکھنے کا ۱۹۱۵ء کی کمیٹی نے مشورہ دیا تھا، (۲) مالی مدد کا سیسہ: چنانچہ ان میں سے اکثر بنک امپیریل بنک آف انڈیا[2] یا دوسرے

---

[1] کمیٹی کی رائے میں اسباب مختصراً حسب ذیل بیان کئے جا سکتے ہیں:- موجودہ زمانے میں ہندوستان میں کوئی ایسا بنک نہیں ہے جو امداد باہمی کے بنکوں کو مکرر بٹہ کاٹنے کی سہولتیں بہم پہنچائے اور اس طرح ان کے مالیہ میں اس قسم کا لوچ پیدا کرے جس کے بغیر اس تحریک کی موجودہ ثبات پذیری اور تدریجی ترقی مشکل معلوم ہوتی ہے۔ تجارتی بنک اس کام کو رضاکارانہ طور پر انجام نہیں دیں گے، اور اگر ایسا کوئی انتظام پریزیڈنسی بنکوں سے (جواب امپیریل بنک آف انڈیا کے مقامی صدر دفاتر ہیں) طے نہیں کیا جا سکتا جس کی رو سے وہ امداد باہمی اور زراعت کے کاغذ پر مکرر بٹہ کاٹنے کا فرض انجام دیں تو اس مسئلے کا واحد قابل عمل حل یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک سرکاری صدر مرکزی بنک امداد باہمی قائم کیا جائے۔ (دیکھو رپورٹ فقرہ ۲۱۹ تا ۲۲۰)۔

[2] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض صوبہ واری مرکزی بنکوں کو مالی مدد دینے کے بارے میں امپیریل بنک آف انڈیا کی پالیسی حال میں واضح طور پر تبدیل ہو گئی ہے اور بیان کیا جاتا ہے کہ یہ بنک آج کل ان کی مدد کرنے کے لیے ویسی آمادگی ظاہر نہیں کرتا جیسی کہ سابق میں کرتا تھا۔ یہ بات خاص طور پر بمبئی پراونشل کواپریٹیو بنک کے بارے میں صادق آتی ہے۔ بنک کاری کی مرکزی کمیٹی نے اس امر کی اہمیت پر زور دیا ہے کہ امداد باہمی کی مناسب دستاویزات پر امپیریل بنک آف انڈیا کی طرف سے نقدی اعتبار اور ڈرافٹ (زائد حوالے) کی سہولتیں کشادہ دلی کے ساتھ بہم پہنچائی جائیں۔

بنکوں سے قرضہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں؛ (۳) یہ واقعہ کہ موجودہ زمانے میں امداد باہمی ایک شعبہ منتقلہ یا مفوضہ ہے، اور سب صوبے کامل آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے بے قرار ہیں تاکہ اپنے خاص اسلوب پر ترقی کریں اور کوئی بھی اس کو پسند نہیں کرتا کہ کل ہند صدر بنک کی طرح کا کوئی بیرونی ادارہ ان کو بندشوں میں جکڑے؛ اور آخر میں (۴) قرض کے باہمی لین دین کا مفید طریقہ جو بلا تحریک غیر رونما ہوا اور جس کو مختلف صوبہ واری بنکوں نے ترقی دی[1] علاوہ ازیں اب جب کہ رزرو بنک آف انڈیا قائم ہو گیا ہے، صوبہ واری بنکوں کے لیے صدر مرکزی بنک کی ضرورت باقی نہ رہے گی، اس لیے کہ رزرو بنک ہی مکرر بٹہ کاٹنے اور قرضہ دینے کی سہولتیں صوبہ واری بنکوں کو مہیا کرے گا۔ موجودہ زمانے میں صدر مرکزی (امداد باہمی) بنک کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔[2]

۱۷۔ حکومت کا تعلق امداد باہمی کی تحریک سے

یہ بات متفقہ طور پر تسلیم کر لی گئی ہے کہ امداد باہمی کی تحریک معاشرتی تنظیم و احیاء کا ایک طاقتور آلہ ہے، لہٰذا حکومت کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ اس کی ہمدرد اور خیر خواہ رہے اور نیک صلاح و مشورے کے ساتھ اس کی بہترین طریقے پر خدمت اور رہنمائی کرے۔ ہو سکتا ہے کہ نیک منش سرکاری مداخلت و امداد، کامل سہارے کی شکل اختیار کرے جو ایک قابل اعتراض چیز ہے،

مندرجہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ ہم بھی اس کی پوری پوری تائید کرتے ہیں۔ دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ (۱۷۹)؛ نیز مسجل انجمن امداد باہمی کی سالانہ رپورٹ ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء صفحہ ۴۵۔

[1] دیکھو مہتا کی محولہ بالا کتاب صفحہ ۱۶۶ تا ۱۷۰۔

[2] دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ (۱۵۸)۔

اس لیے کہ وہ امداد باہمی کے اس اساسی اصول کے سراسر خلاف ہے کہ لوگوں کو چاہئے کہ اپنی نجات اپنی ذاتی جدوجہد سے حاصل کریں۔ دوسری طرف یہ ممکن ہے کہ غیر ضروری مداخلت کی خرابیوں کے خوف کی بنا پر حکومت انتہائی عدم مداخلت کی ایسی پالیسی اختیار کرے جو سنگدلانہ تغافل و بے پروائی کی حد تک پہنچ جائے۔ لیکن اعلیٰ تدبر و سیاست دانی کا تقاضا یہ ہے کہ اس افراط و تفریط سے بچ کر اعتدال کے راستے پر قائم رکھا جائے اور ان دونوں اچھائیوں میں سے کسی پر بھی اس قدر شدت کے ساتھ عمل نہ کیا جائے کہ وہ خرابی میں تبدیل ہو جائے۔

ہندوستان میں عوام کی عام جہالت، حکومتی مداخلت کے دیرینہ روایات اور دیہی قرضداری کے مسئلے کی نزاکت کے باعث حکومت نے امداد باہمی کی تحریک پھیلانے میں شد و مد کے ساتھ پیش قدمی کی جو بالکل حق بجانب تھی۔ اسی طرح اس کا یہ فعل بھی بجا تھا کہ وہ مالی حیثیت سے کامل سہارا دینے کی پالیسی سے محترز رہی، اس لیے کہ یہ پالیسی جیسا کہ فرانس کے تجربے سے ثابت ہوا، فائدے سے زیادہ نقصان پہنچاتی ہے۔ بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی اس سفارش کی ہم پوری پوری تائید کرتے ہیں کہ عام ٹکس ادا کرنے والوں کے مفاد کے مدنظر اور خود امداد باہمی میں حصہ لینے والوں میں خود اعتمادی اور اپنی مدد آپ کرنے کی ہمت افزائی کرنے کی خاطر سرکاری امداد عارضی ہونی چاہئے جو انجمنوں کو کسی نازک صورت حال پر غلبہ پانے کے لیے کافی ہو[1]۔ اس نقطۂ نظر سے اگر خانگی کاروباری مہم کی ترقی کا انداز اس تحریک میں لگائے ہوئے کاروباری اصل کی ترقی پذیر مقدار کے اعتبار سے کیا جائے تو سنہ ۱۹۰۴ء سے موجودہ زمانے تک کی قلیل مدت میں یہ مہم نمایاں طور پر کامیاب رہی۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ حکومت نے امداد باہمی کے اداروں کو چند مالی و عدالتی مراعات عطا کیں اور نئی انجمنوں کو محدود مالی مدد دی۔ بمبئی میں حکومت نے اس سے اور بھی چند قدم آگے بڑھائے ہیں اور وہ یہ پالیسی اختیار کرنے میں بہت بڑی حد تک حق بجانب ہے۔ حکومت نے اولاً ایک رعایت

[1] دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ ۱۸۰۔

یہ کی کہ بمبئی کے پراونشل کوآپریٹو بنک کے جاری کردہ ڈبنچروں پر بیس لاکھ روپیہ کی انتہائی مقدار تک ۴ فی صد سود کی ضامن ہوگئی۔ اس رعایت کی بدولت بنک کی ایک نہایت شدید ضرورت پوری ہوگئی یعنی سرکاری خزانے پر بار ڈالے بغیر دیہی مالیے کے لیے معتدل شرح سود پر طویل مدت کے لیے اصل فراہم ہوگیا، اور اس کا بھی امکان نہیں ہے کہ حکومت سے اس کی دی ہوئی ضمانت کو پورا کرنے کا مطالبہ کیا جائے، اس لیے کہ بنک کا کاروبار محفوظ بنیادوں پر قائم ہے۔ دوسری رعایت یہ کی گئی کہ حکومت نے اراضی کی مستقل اصلاح و ترقی کے لئے انجمن ہائے امداد باہمی کی وساطت سے تقاوی قرضے دینے کی پالیسی اختیار کی۔ یہ پالیسی نہایت معقول ہوگی کہ تمام صوبوں میں امداد باہمی کی زیادہ ترقی یافتہ شکلوں مثلاً کھیتوں کے انضمام، تعلیم بالغان، آب پاشی وغیرہ کی فراخدلی کے ساتھ امداد کی جائے۔[1] یہ امر طمانیت بخش ہے کہ ریزرو بنک آف انڈیا ایکٹ (۱۹۳۴ء) میں یہ گنجایش رکھی گئی ہے کہ امداد باہمی کے بنکوں کو ریزرو بنکوں سے ملحق کیا جا سکتا ہے اور ریزرو بنک کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ زرعی قرضے کا ایک شعبہ قائم کرے جس کے ذریعے سے زرعی قرضے کے تمام مسائل کی تحقیق کی جائے اور نہ صرف حکومت کو بلکہ صوبہ وار زرعی امداد باہمی کے بنکوں اور زمین گروی بنکوں کو مشورہ دیا جائے۔[2] یہاں یہ بھی کہہ دینا مناسب ہوگا کہ ۱۹۳۵ء میں حکومت ہند نے دیہات سدھار کی غرض سے ایک کروڑ روپیہ کی جو مجموعی رقم منظور کی تھی اس میں سے پندرہ لاکھ روپیہ اس غرض کے لیے مختص کر دیا گیا ہے کہ مسٹر ام، ال ڈارلنگ، آئی سی ایس نے ریزرو بنک آف انڈیا میں زرعی قرضے کا شعبہ کھولنے کے متعلق رپورٹ میں جو سفارشیں پیش کی ہیں ان کے مطابق اس رقم کو امداد باہمی کی تحریک کی اصلاح و ترقی اور توسیع میں صرف کیا جائے۔

[1] دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ (۱۹۱)۔
[2] اس موضوع پر زیادہ مفصل بحث جلد دوم میں "بنک کاری" کے متعلق باب میں کی گئی ہے۔

امداد باہمی کی تحریک کی سرکاری رہنمائی و نگرانی کی پالیسی کی جانب عود کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ پالیسی بحیثیت مجموعی نہایت معقول رہی ہے چنانچہ بعض حلقوں میں جو مطالبہ کیا گیا تھا کہ رجسٹرار کے بعد فرائض کو افسر ضلع کے تفویض کر دیا جائے اس کو مسترد کرتے ہوئے حکومت نے میک لے گن کمیٹی کی رائے سے بجا طور پر اتفاق کیا۔ کمیٹی مذکور بہت زیادہ سرکاری مداخلت کی مخالفت کرتی ہے اور یہ خیال ظاہر کرتی ہے کہ "کلکٹر جیسے سرکاری ملازم کی حیثیت یہ ہونی چاہئیے کہ وہ الگ رہے اور ضروری معلومات سے باخبر رہتے ہوئے ہمدردانہ اور خیر خواہانہ روش رکھے اور انجمنوں کے انتظامی معلومات میں دخل دینے یا براہ راست کوئی مالی ذمہ داری سر پر لینے سے محترز رہے۔" حکومت نے بسا اوقات اپنا عندیہ صاف طور پر ظاہر کر دیا ہے کہ سرکاری ملازم اس قسم کے معاملات میں کسی بڑی حد تک دلچسپی یا حصہ لینے سے محترز رہیں، اگرچہ واقعہ یہ ہے جیسا کہ زرعی کمیشن بتلاتا ہے "جملہ سرکاری محکمہ جات کے افسروں کا یہ فرض ہونا چاہئیے کہ تحریک کی ترقی میں اس حد تک ہاتھ بٹائیں جس حد تک کہ ان کے متعلقہ فرائض کی نوعیت اجازت دے۔" لیکن محکمہ امداد باہمی اور امداد باہمی کی تحریک کا باہمی تعلق بظاہر اس اصول کا ایک استثنا پیش کرتا ہے۔ گو ابتداءً یہ اصول کارفرما رہا کہ محکمہ امداد باہمی کی مداخلت کو بتدریج کم کر دیا جائے اور جوں جوں انجمنوں میں خود اعتمادی بڑھتی جائے اور نظامات اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل بن جائیں رجسٹرار کی حیثیت کو انجام کار رجسٹری کرنے والے افسر کے درجے تک گھٹا دیا جائے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس اصول پر غیر متناقض طریقے پر اور استقلال کے ساتھ عمل نہیں کیا گیا بلکہ سچ پوچھو تو رجسٹرار کا تسلط روز افزوں ہے اور اس کے فرائض کی فہرست سے بالائی نگرانی و خبر گیری کا عنصر خارج ہونے کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہوتی حقیقت تو یہ ہے کہ بظاہر میک لے گن کمیٹی بھی اس بدیہی رجعی اصول کو حق بجانب قرار دیتی ہے۔ چنانچہ وہ یہ سفارش کرتی ہے کہ رجسٹرار کو مالی منتظم یا ناظر کا اختیار حاصل ہونا چاہئیے، یعنی اس کو تمام قسموں کی انجمنوں کے بارے میں اس بات کی نگرانی رکھنی چاہئیے کہ

باب ۱۲

ان کے محصلہ قرضے کی انتہائی مقدار کیا ہو، سود کی شرحوں کو مقرر کرنا چاہیئے امداد باہمی کے اصول کی اشاعت و تبلیغ کے انتظامات پر نظر رکھنی چاہیئے، اور انجمنوں کے معمولی حسابات کی غیر سرکاری تنقیح کی نگرانی کرنی چاہیئے کمیٹی یہ تجویز پیش کرتی ہے کہ مسجل کے علاوہ ایک نائب مسجل ہر سو انجمنوں کے لیے مقرر کیا جائے۔ کمیٹی یہ خیال ظاہر کرتی ہے کہ ہندوستان میں امداد باہمی کی مسلسل اور باقاعدہ ترقی کے لیے عام طور پر کوئی شرط اتنی ضروری نہیں خیال کی جا سکتی جتنی کہ معقول تنخواہ پانے والے ماہر مسجلوں کی جماعت کے مستقل قیام و انتظام کی شرط۔ بایں ہمہ یہ بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ خفیف سی خرابی کار کا خطرہ بھی برداشت کر کے ذمے دار خانگی کاروبار کی ہمت افزائی کرنی چاہیئے تحریک کو سرکاری اثر سے الگ کرنا چاہیئے اور اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل بنانا چاہیئے[1] اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مدراس کی یہ تجویز کہ غیر سرکاری منظموں کو "اعزازی مددگار مسجل" کے عہدے پر مامور کیا جائے، مناسب اور صحیح اصول کار معلوم ہوتی ہے۔ اس تحریک کو بہ لحاظ نوعیت اور زیادہ غیر سرکاری بنانے کا ایک اور طریقہ یہ ہوگا کہ بمبئی سنٹرل کوآپریٹیو انسٹی ٹیوٹ یا صوبۂ متوسط کے فیڈریشن آف سنٹرل بنکس جیسی غیر سرکاری جماعتوں کی ہر ممکن طریقے سے حوصلہ افزائی کی جائے، انجمنوں کی نگرانی، تنظیم اور تنقیح کے بارے میں ان جماعتوں کو مسجل کے کچھ اختیارات نیابتہً

850

[1] سوال یہ ہے کہ آیا ہندوستان کی امداد باہمی کی تحریک کو حکومت کی نگرانی سے ایک حد تک آزادی دلانے اور سنہ ۱۹۰۴ء میں تولد پائے ہوئے بچے کو، جو اب جوان ہو چکا ہے، بالغ کے اختیارات کام میں لانے کا موقع دینے کا وقت آگیا یا نہیں؟ مسٹر ہنری ولف فرماتے ہیں کہ "اس سوال کا جواب "ہاں" یا "نہیں" دونوں ہو سکتا ہے۔ سرزمین ہند کا بلاشبہہ بہت بڑا علاقہ ابھی ایسا باقی ہے جہاں اس قسم کی تبدیلی کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ لیکن بعض ایسی موافق صورتیں بھی ہیں جن میں امداد باہمی نے کافی ترقی کر لی ہے اور امداد باہمی کرنے والوں کو پوری طرح اس قابل بنا دیا ہے کہ اپنا انتظام خود کر لیں" (دیکھو ایک رسالہ موسوم بہ بمبئی کوآپریٹیو کوارٹرلی مورخہ دسمبر سنہ ۱۹۲۸ء جس میں "زرعی کمیشن رپورٹ" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا گیا ہے)۔

تفویض کئے جائیں اور ان کی ہمت افزائی کی جائے کہ کانفرنسیں منعقد کر کے، انجمن کے عہدہ داروں اور پبلک کے لیے تعلیمی جماعتوں کا انتظام کر کے اور رسالہ جاری کر کے پروپگنڈا کا کام انجام دیں اور دیہی تنظیم کے کام میں مصروف ہوں۔ موجودہ زمانے کی سب سے شدید اور اہم ضرورت یہ ہے کہ غیر سرکاری وفاقی ادارے اور دوسری مرکزی ایجنسیاں قائم کی جائیں جو نگرانی و انتظام کے لیے خود اپنا عملہ مقرر کریں، اس لیے کہ ان کی عدم موجودگی یا عدم قابلیت کی بنا پر سرکار ناگزیر طریقے پر مداخلت کرتی ہے۔ مناسب وقفوں کے ساتھ سرکاری طور پر تنقیح کرنے کا طریقہ باقی رکھا گیا ہے تاکہ انجمنوں کے کاروبار کی مفید طریقے پر نگرانی کی جائے اور عوام کے اعتماد کو یقینی بنایا جائے۔ سرکاری رہنمائی و نگرانی یقیناً ضروری ہے اور ابھی کچھ اور مدت تک ضروری رہیگی۔ محکمے کو اس قابل بنانے کے لیے وہ اپنے دستوری فرائض کو زیادہ بہتر طریقے پر انجام دے دفتری عملہ بڑھانے کی درخواست کرنا اور اس بات پر زور دینا کہ عملہ اعلیٰ تعلیم یافتہ، ماہر و بخوبی تربیت یافتہ ہو اور اس کی تنخواہ اچھی ہو غلط اور غیر معقول نہیں ہے۔ اس امر پر اصرار کرنا بھی بالکل حق بجانب ہے کہ رجسٹرار کے اہم اور مشکل فرائض کے مدنظر رجسٹرار کی شخصیت کا معاملہ بہت اہمیت رکھتا ہے اور اس لحاظ سے اس عہدے پر حتی الامکان بہترین آدمی کا انتخاب ہونا چاہیئے[1]۔ لیکن اس تحریک سے تعلق رکھنے والے سرکاری و غیر سرکاری عہدہ داروں کو چاہیئے کہ جس حد تک حالات اجازت دیں اس حد تک اس تحریک کو جلد سے جلد جمہوری، خود انتظامی اور خود کفیل بنائیں۔ اس لحاظ سے ہم بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی اس سفارش[2] کا خیر مقدم کرتے ہیں کہ امداد باہمی کی تحریک کو مقبول بنانے اور

[1] رجسٹرار کس قابلیت کا ہونا چاہئیے اس مسئلہ پر بحث نیز اس کے فرائض کی ہمہ گیر نوعیت کے بیان کے لیے دیکھو میکلیگن کمیشن کی رپورٹ فقرہ (۲۰۷)، نیز سی ایف اسٹرک لینڈ کی کتاب موسوم بہ "فلسطین میں زرعی امداد باہمی" فقرہ (۲۶ تا ۲۹)۔

[2] دیکھو رپورٹ فقرہ ۱۶۸۔

انجمنوں کے ارکان میں ذمہ داری کے احساس کو ترقی دینے کی غرض سے سرکاری نگرانی کو جو موجودہ زمانے میں کی جا رہی ہے کم کر دینا چاہئے۔

بمبئی کی حد تک ہم کہہ سکتے ہیں کہ سرکاری نگرانی کے ہٹا لیے جانے اور غیر سرکاری اداروں کی ہمت افزائی کئے جانے کے خوشگوار علامات پائے جاتے ہیں۔ قانون انجمن ہائے امداد باہمی بمبئی (۱۹۲۵ء) نے سنٹرل کوآپریٹو انسٹی ٹیوٹ بمبئی کو تسلیم کر لیا ہے جو ایک غیر سرکاری صدر کے تحت احاطۂ بمبئی کی امداد باہمی کی جدوجہد کو مرتکز کرنے کی کوشش کر رہی ہے، اور اس کے ساتھ ہی امداد باہمی کی صوبہ واری کانفرنسیں بھی منعقد کر رہی ہے۔ ۳۰ جون ۱۹۳۵ء کو اس انسٹی ٹیوٹ کے ارکان کی تعداد ۶۱۵۷ تھی (جس میں ۵۲۶۸ انجمنیں اور ۸۹۹ افراد شامل تھے۔ اس کو پروپگنڈا، تعلیم و تربیت اور امداد باہمی کے متعلق لٹریچر کی اشاعت کے تہرے کام کے لیے حکومت سے معقول مالی امداد ملتی ہے۔ اس نے ۱۹۲۶ء میں سورت، پونہ اور دھارواڑ میں امداد باہمی کی درسگاہیں کھولیں جن کا مقصد دیہی معتمدین، نگران کاروں اور بنک کے ناظروں کو تعلیم و تربیت دینا ہے۔ اس کی کئی علاقہ واری اور ضلع واری شاخیں احاطۂ بمبئی میں کاروبار انجام دے رہی ہیں۔ وہ صوبہ واری امداد باہمی کی جمعیتوں سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ موخر الذکر جملہ انجمنوں کا آخری ناق ہیں جن کو تفتیع و نگرانی کے معین و قطعی فرائض تفویض کئے گئے ہیں اور وہ ایک قطعی قانونی حیثیت رکھتی ہیں، اس کے برعکس انسٹی ٹیوٹ (ادارہ) زیادہ تر پروپگنڈا کا ادارہ ہے۔ چنانچہ انسٹی ٹیوٹ قابل تعریف طریقے پر پروپگنڈا کر رہا ہے "تاہم اس نے امداد باہمی کے مسائل کی باقاعدہ تحقیق اور تحریک کے زیادہ تخصیص یافتہ پہلوؤں کے بارے میں ماہرانہ معلومات اور مشورے کی بہم رسانی کے زائد مقاصد کو ابھی تک پورا نہیں کیا ہے"[1]۔ آیا امداد باہمی کی تحریک کی تنظیم امداد باہمی کے دوسرے اداروں مثلاً مرکزی بنکوں کو کرنی چاہئے یا نہیں؟

[1] دیکھو بمبئی کے مسیل کی سالانہ رپورٹ بابت ۱۹۲۶ء تا ۱۹۲۷ء۔

اور جوں جوں نگرانی کرنے والی انجمنیں ترقی کرتی جائیں آیا انسٹی ٹیوٹ مرورِ زمانہ کے ساتھ وفاق قائم کریں یا نہیں؟ یہ ایسے مسائل ہیں جن کو مستقبل میں تحقیق اور حل کرنا ہوگا۔ امداد باہمی کے غیر سرکاری اداروں کی ترقی کی حد تک حال ہی میں ایک دلچسپ تحریک یہ ہوئی کہ آل انڈیا کوآپریٹو انسٹی ٹیوٹس اسوسی ایشن (ادارہ ہائے امداد باہمی کی کل ہند انجمن) کا یکم اکتوبر ۱۹۱۹ء کو افتتاح ہوا جس کو قائم کرنے کے بارے میں کل ہند ادارہ ہائے امداد باہمی کی کانفرنس منعقدہ بمبئی نے ستمبر ۱۹۱۹ء میں متفقہ فیصلہ کیا تھا۔ اس انجمن کا اساسی مقصد یہ ہے کہ رکن اداروں کی وساطت سے امداد باہمی کو توسیع و ترقی دی جائے اور امداد باہمی کے جملہ مسائل کے بارے میں ان اداروں کو مدد اور مشورہ دیا جائے جنوری ۱۹۲۵ء سے انجمن کی طرف سے ایک سہ ماہی رسالہ موسوم بہ "انڈین کوآپریٹو ریویو" شائع کیا جا رہا ہے جس کے اڈیٹر رام داس پنتلو ہیں۔ اس رسالہ میں کل ہندوستان کے متعلق امداد باہمی کی تحریک پر مفید معیادی تبصرہ کیا جاتا ہے۔

امداد باہمی کی ایک اور کل ہند تنظیم انڈین پراونشل کوآپریٹو بنکس اسوسی ایشن (ہندوستانی صوبہ واری امداد باہمی کے بنکوں کی انجمن) ہے جس کا مقصد خاص کر مالیہ، وضع قوانین اور انتظام کے معاملات میں مشترکہ اغراض کی توسیع و ترقی ہے۔ بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی یہ سفارش کرتی ہے کہ "قانون انجمن امداد باہمی" میں اس طرح ترمیم کرلی چاہئے کہ اس کی رو سے کل ہند نوعیت رکھنے والی انجمنوں یا ایک سے زیادہ صوبوں میں کاروبار کرنے والی انجمنوں کی رجسٹری ہو سکے۔ اس سفارش کی تائید نہ صرف رجسٹراروں کی گیارھویں کانفرنس نے کی جس کا اجلاس دہلی میں فروری ۱۹۳۲ء میں ہوا بلکہ آل انڈیا کوآپریٹو انسٹی ٹیوٹس اسوسی ایشن اور آل انڈیا پراونشل بنکس اسوسی ایشن کی مشترکہ کانفرنس نے بھی کی جس کا اجلاس بمقام امراوتی جون ۱۹۳۴ء میں ہوا۔ اگر اس سفارش کو بعجلت عملی جامہ پہنایا جائے اور دونوں اداروں کے عمل کی طاقت اس طرح بڑھائی جائے کہ وہ مالیہ اور تحقیقات کے معاملات میں ملکر کام کرسکیں تو بنک کاری کے غیر ملکی ماہران بنک کاری کے مشورے کے مطابق انتظامی یا نگرانی کے

۹۵۲

باب

فرایض انجام دینے والی کسی دوسری قسم کی کل ہند انجمن یعنی آل انڈیا کوآپریٹو کونسل (کل ہند مجلس امداد باہمی) کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔[1]

۱۸۔ ہندوستان کی امداد باہمی کی تحریک پر نقد و نظر

واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی امداد باہمی کی تحریک ان سب معاشی و معاشری خرابیوں اور نقائص کو دور کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی ہے جس میں ملک آج کل مبتلا ہے۔ دوسری طرف وہ بیش بہا نتائج پیدا کرنے سے بالکل عاری بھی نہیں رہی ہے۔ چنانچہ ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ انجمنوں کی طرف سے ارزاں قرضہ مہیا کئے جانے کی وجہ سے کسانوں اور دستکاروں کے طبقے نے بہت بڑی رقم جس کا اندازہ تقریباً ایک کروڑ روپیہ کیا گیا ہے پس انداز کی' اور یہ توقع بیجا رعائیت نہ ہوگی کہ مستقبل قریب میں یہ عدد کئی گونہ بڑھ جائے گا' بشرطیکہ امداد باہمی کے نظامات کی دوسری شکلیں' طویل مدت کے قرضے مہیا کرنے کی غرض سے قائم کی جائیں۔ علاوہ ازیں امداد باہمی نے خطرناک طور پر آسانی سے مل جانے والے اور اخلاق بگاڑنے والے ساہوکاری قرضوں کی بجائے ایسا طریق رائج کردیا ہے جس کے تحت اعتبار کی نگرانی اور قرضے کی روک تھام کی جاتی ہے۔ چنانچہ امداد باہمی کی تحریک نے کئی مقامات پر ساہوکار کے تسلط کی کامیاب طور پر بیخ کنی کی اور اس کو اپنی شرح سود گھٹانے پر مجبور کردیا۔ قرضے کی ادائی کی حد تک اگرچہ ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے' اور اگرچہ امداد باہمی کاشتکاروں کے طبقے کو اس کے قرضداری کے بار سے کلیۃً سبکدوش کرنے کی عظیم الشان مہم تنہا سر کرنے کی قدرت نہیں رکھتی' پھر بھی

[1] ۔ دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ ۱۹۱؛ اور انڈین کوآپریٹو ریویو بابتہ جنوری ۱۹۳۵ء صفحہ ۰۔

ابل 358

اس معاملے میں خاص کر امداد باہمی کے اصول پر زمین گروی بنک قائم کرنے کی وجہ سے کسی حد تک کامیابی ہوئی ہے[۱]۔ جیسا کہ مسٹر ڈارلنگ کہتے ہیں "گاؤں کی قدیم اجتماعی زندگی کسان کی لوٹ کو روکتی تھی، اب اس کی جگہ تحریک امداد باہمی نے لے لی ہے جس کو اجتماعی زندگی کی نئی شکل قرار دیا جاسکتا ہے، چنانچہ وہ داخلی و خارجی دونوں اعتبارات سے کسان کی حفاظت کرتی ہے[۲]۔" علاوہ ازیں امداد باہمی کی ترقی کے ساتھ ساتھ بنک کاری کی عادت آہستہ آہستہ مگر استقلال کے ساتھ دیہی و شہری علاقوں میں نشوونما پا رہی ہے اور بے کار پڑے ہوئے اندوختے بتدریج نفع بخش طریقے پر کام میں لائے جا رہے ہیں۔ زراعت ملک کی سب سے بڑی صنعت ہے اور وہ امداد باہمی سے مختلف طریقوں سے متمتع ہوئی ہے۔ چنانچہ امداد باہمی نے اصلاح و ترقی کا شوق عوام میں پیدا کرنے، ارزان کھاد اور آلات کاشت دستیاب کر کے انہیں مقبول عام بنانے اور "بہتر کاشت، بہتر کاروبار اور بہتر معیار زندگی" کا نصب العین حاصل کرنے میں مدد دے کر امداد باہمی نے محکمۂ زراعت کے کام میں سہولتیں پیدا کر دی ہیں۔ امداد باہمی اور زراعت کے درمیان حقیقی طور پر منظم و مستحکم رشتۂ ارتباط کی تدریجی ترقی بہت بڑے امکانات پیش کرتی ہے[۳]۔ امداد باہمی نے دیہی حفظ صحت اور دیہی علاقوں میں مناسب طبی سہولتیں بہم پہنچانے کے مسائل کو حل کرنے کا اہم کام بھی آغاز کر دیا ہے۔

خاص خاص غیر زرعی اغراض کے لیے جو انجمنیں کھولی گئی ہیں وہ اگرچہ ابھی تک چھوٹے پیمانے پر کام کر رہی ہیں پھر بھی اپنے متعلقہ شعبوں میں مفید کام کر رہی ہیں۔ امداد باہمی کے فیض رساں اثر کے تحت کارخانے کے مزدوروں، نیچے طبقوں اور ہر قسم کے اجیروں کی حالت بتدریج اصلاح پذیر ہے۔ گھریلو صنعتیں

---

[۱] دیکھو ضمیمہ (۲۱)۔

[۲] دیکھو ایم۔ ایل۔ ڈارلنگ کی کتاب محولۂ بالا، صفحہ (۲۲۱)۔

[۳] دیکھو حکومت ہند کا ریزولیوشن امداد باہمی کے بارے میں بابت ۱۷ جون ۱۹۱۴ء فقرہ (۷)۔

خاص کر دستی کرگہ کی صنعت تحریک امداد باہمی کی سرپرستی اور مدد حاصل کر رہی ہے۔ آخر میں یہ کہ تحریک امداد باہمی نے آبادی کی کمی کے اس سیلان کا ازالہ کرنے میں مفید کام انجام دیا ہے جو ملک کے بعض دیہی علاقوں میں پایا جاتا ہے۔

امداد باہمی کے اہم ترین فوائد میں اس اصطلاح کے وسیع ترین معنوں میں ذہنی و اخلاقی فوائد بھی شامل ہیں، چنانچہ جہاں کہیں انجمن ہائے امداد باہمی قائم ہوئی ہیں وہاں ان سے یہ فوائد بالعموم لازمی طور پر حاصل ہوئے ہیں۔ اس اخلاقی ترقی کا قطعی ثبوت بہم پہنچانا اس لیے مشکل ہے کہ اخلاقی ترقی کے علائم و آثار کو واقعات کی طرح قطعی طریقے پر نہیں بیان کیا جا سکتا، پھر بھی اس تحریک کا دقت نظر سے مطالعہ کرنے والوں کو وہ صاف نظر آتے ہیں۔ عمدہ انجمن امداد باہمی مقدمہ بازی، فضول خرچی، شراب نوشی اور قمار بازی کی حوصلہ شکنی کرتی ہے اور ان کی بجائے محنت و مشقت، خود اعتمادی، راست بازی، تعلیم، پنچایت سبھاؤں، کفایت شعاری، خود مددی، اور باہمی امداد کو فروغ دیتی ہے[1]۔ اس تحریک نے بعض صورتوں میں تعلیم کا گہرا شوق پیدا کر دیا ہے اور سن رسیدہ اشخاص بھی اس کے متلاشی اور استفادہ کرنے کے متمنی پائے گئے ہیں۔ امداد باہمی کی تحریک نے دہقان کے خصائل و عادات کی بھی اصلاح کی ہے، اخلاقی معیار کو بلند کر دیا ہے اور اس جذبے اور احساس کو فروغ دیا ہے کہ "ہر فرد کو جماعت کی اور جماعت کو فرد کی خدمت کرنی چاہئے"۔ مختصر یہ کہ تحریک امداد باہمی، دیہات کی قدیم اجتماعی زندگی کے احیاء اور اہل دہ کے جسم مردہ میں نئی روح پھونکنے کا طاقتور آلہ بننے کی قوی امید دلا رہی ہے۔

لیکن یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ یہ سب فوائد، یعنی اخلاقی، تعلیمی اور خالص معاشی محض بہت ہی چھوٹے پیمانے پر حاصل ہوئے ہیں۔ چنانچہ غیر زرعی امداد باہمی کے میدان میں ابھی بہت کچھ تگ و دو کی ضرورت اور حصول مقصد کی گنجائش باقی ہے۔ زرعی امداد باہمی کی انجمن کا کاروبار بھی عملاً قرضے تک محدود ہے اور اس میں بھی

---

[1] دیکھو ایم ایل ڈارلنگ کی کتاب محولۂ بالا۔

جیسا کہ سر ایم وس ویسوریا نے کہا ہے" "اب تک جو کچھ کیا گیا ہے وہ صرف سطحی کام ہے"[1] علاوہ ازیں قرضۂ امداد باہمی عام طور پر انہی مقامات پر سرسبز ہوا ہے جہاں بارش اعتدال کے ساتھ ہوتی ہے۔ جن علاقوں میں بارش وقت پر اور کافی مقدار میں نہیں ہوتی وہاں واپسیٔ قرضے میں تاخیر اور کوتاہی تکلیف دہ طریقے پر عام ہے[2] علاوہ ازیں جیسا کہ بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی نے بتلایا ہے، امداد باہمی کے نظام کا مہیا کردہ قرضہ کسان کو بعض صوبوں میں اب بھی حد سے زیادہ گراں ملتا ہے، چنانچہ سود کی موجودہ شرحوں کو کم کرنے کے لیے مزید تدابیر اختیار کرنا نہایت ضروری ہے۔

یہ بھی بین طور پر ضروری ہے کہ ہندوستان میں موجودہ زمانے کی تحریک امداد باہمی کے حقیقی عمل کے نقائص و اقسام کو دور کرنے کے قابل بننے کے لیے ہم ان نقائص کو تسلیم کریں، مثلاً:۔ بے پابندی وقت قرضہ ادا کرنا، من مانی ادائی، کثیر مقدار میں باقی داری، ناقص تنقیح حسابات، ناکافی نگرانی، بے نامی قرضے، کنبہ پروری و عزیز نوازی، ضابطہ پرستی، اور امداد باہمی کے مالیے کا بے لوچ اور غیر مکتفی ہونا اور مالی مدد کا سستی سے دیا جانا وغیرہ۔ ارکان کو امداد باہمی کے صحیح اصول کی تعلیم دینے کے لیے جو عملہ مقرر کیا جاتا ہے وہ بعض اوقات جاہل، بے تربیت اور نا اہل ہوتا ہے۔ انتظامی کمیٹیوں اور صدر نشینوں کو تمام اختیارات ناجائز طریقے پر دبا بیٹھنے اور کام میں لانے کا بالعموم ضرورت سے زیادہ موقع دیا جاتا

[1] دیکھو ان کی تصنیف صفحہ ۱۰۵۔ بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی نے بھی یہی پایا ہے کہ تحریک امداد باہمی نے اس وقت کسانوں کو جو اعتباری سہولتیں بہم پہنچائی ہیں ان سے کاشت کاروں کی بہت ہی کم ضرورتیں پوری ہوتی ہیں، (دیکھو رپورٹ، فقرہ ۱۶۹)۔

[2] اگر ان علاقوں میں امداد باہمی کے اصول پر مالی مدد دینے کا انتظام کرنا ہو تو حکومت یا کسی رفاہی ادارہ کو کسی نہ کسی قسم کا ضمانتی فنڈ قائم کرنا ہوگا تاکہ جمع کنندوں کی امانت محفوظ رہے۔ دیکھو بمبئی کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی میں دی ایس بھاگوت آئی۔ سی۔ ایس معتمد انجمن ہائے امداد باہمی بمبئی کی پیش کردہ یادداشت شائع شدہ ۱۹۲۹ء۔

باب

ہے جو عام ارکان کے اغراض کے منافی ہوتا ہے؛ اور اس تحریک کی رہنمائی کرنے والے منتظم اور عہدہ دار ارکان کی غلطیوں اور بے راہ روائی کا تدارک کرنے میں ناواجب نرمی ظاہر کرتے اور اخلاقی جرات سے کام لینے میں ناکام رہتے ہیں اور سنگین سے سنگین بے قاعدگیوں اور بدعنوانیوں سے یہ سمجھ کر چشم پوشی کر لیتے ہیں کہ کوئی سرکاری عہدہ دار کسی دن آن کر حالات کی اصلاح کر دے گا۔ وہ خلاف ورزی کرنے والوں اور خاطیوں کے خلاف سخت کارروائی کرکے اور واجب الوصول بقایا کے متعلق قانونی چارہ جوئی کرکے اپنی ہر دلعزیزی کو خطرے میں ڈالنا پسند نہیں کرتے۔[1] اکثر ارکان اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ امداد باہمی کی تحریک سرکاری انتظام کے تحت چل رہی ہے اور یہ کہ انجمن ان کو جو زر مستعار دیتی ہے وہ سرکاری رقم ہے۔ اکثر ارکان کو امداد باہمی کے مقاصد و اغراض سے ادھوری واقفیت ہوتی ہے جس کی وجہ سے ان میں بے پروائی اور بے دردی پیدا ہوتی ہے جو اس تحریک کے لیے مہلک ہے۔ علاوہ ازیں اکثر ارکان انجمن کو دیہی ساہوکار کا ارزاں بدل خیال کرکے اس کو محض اپنی مطلب براری کا آلہ تصور کر لیتے ہیں اور اس طرح خود کو تحریک سے پورے خلوص کے ساتھ وابستہ کرنے سے قاصر رہتے ہیں جو اس کی کامیابی کے لیے لازمی ہے۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، ہندوستان میں تحریک امداد باہمی کی داغ بیل حکومت نے اپنے ہاتھوں سے ڈالی اور اس کے شروع کرنے میں خود عوام کے ارادہ اور کوشش کو بالکل دخل نہیں ہے۔ لیکن یہ واقعہ کہ اس کی عنان رہنمائی اب بھی بہت بڑی حد تک حکومت ہی کے ہاتھ میں ہے لازمی طور پر بنیادی نقص خیال کیا جا سکتا ہے، اس لیے کہ امداد باہمی کا روح رواں تو "اپنی آپ مدد" ہے۔ زندہ رہنے کا جاندار اصول اور عزم باطن سے پیدا ہونا چاہیے نہ کہ کسی خارجی وسیلے سے۔[2]

---

[1] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ، فقرہ (۳۰۳)؛ برما کمیٹی کی رپورٹ (۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۰ء) فقرہ (۵۱)؛ اور بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ (۱۲۰)۔

[2] تحریک امداد باہمی ابتدا ہی سے بڑی حد تک سرکاری سرپرستی اور رہنمائی کے تحت نشوونما پا رہی ہے۔

فی الحال تحریک ایسی حالت میں سے گزر رہی ہے جس میں وہ مفید طریق پر تنقید ذات اور مشاہدہ نفس میں مصروف ہے۔ دکھاوے کی شاندار کامیابیوں کے لیے اب انہیں بھی جد و جہد نہیں کی جا رہی ہے بلکہ ٹھوس نتائج حاصل کرنے کی طرف زیادہ سے زیادہ میلان پیدا ہو چلا ہے۔ سرکاری طرز عمل کی امتیازی خصوصیت "توسیع" کے بجائے ہر جگہ "استحکام" اور "اصلاح و ترمیم" معلوم ہوتی ہے۔ مقام مسرت ہے کہ حکومت نے تحریک کے بارے میں ویسی اشتہار بازی موقوف کر دی ہے جیسی کہ خوانچہ والا اپنی اشیا کو بیچنے کے لیے چلا چلا کر کرتا ہے، اور اس کے بجائے اب نقائص اور غلطیوں کو رفع کرنے کی غرض سے ان کی تلاش کی پر خلوص خواہش پائی جاتی ہے۔ چنانچہ صوبۂ متوسط، صوبۂ متحدہ، مدراس اور برما میں گہری اقدامانہ تحقیقات عمل میں لائی گئی ہے؛ اور زرعی کمیشن اور صوبہ واری بنک کاری کمیٹیوں نے دوسرے صوبوں میں بھی امداد باہمی کی رفتار کے متعلق اسی کے مماثل تحقیقات عمل میں لانے کی سفارش کی ہے[1]۔ یہ سب کچھ بہتری کے لیے ہی ہو رہا ہے، اس لیے کہ نقائص سے چشم پوشی کرنا یا ان کو نظر انداز کرنا خودکشی ہے۔ نقائص کا دو بدو مقابلہ کرنا چاہیے؛ اور عزم مصمم کے ساتھ ان کو دور کرنا چاہیے۔ تحریک کے کارکنوں کو تحریک سے اس بنا پر مایوس نہ ہونا چاہیے کہ نتائج اب تک ان کے سرگرم توقعات کے مطابق نمودار نہیں ہوئے۔ انھیں امداد باہمی کی تعلیم کو جس کے کارنامے دوسرے ملکوں میں حیرت انگیز رہے ہیں، خوش اعتقادی کے ساتھ قبول کرنا چاہیے اور اس کو ہندوستان میں کامیاب بنانے کے لیے ہمیشہ سے زیادہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ :۔ اس کے غیر سرکاری مویدہ حامی بھی زیادہ تر غیر ملکی اشخاص رہے ہیں۔ وہ از خود رونما نہیں ہوئی اور اس طرح اس میں توازن پیدا کرنے والی قوت اور اندرونی مصلح مفقود ہے۔ (دیکھو مسٹر آر گاڈگل کی کتاب محولہ بالا صفحہ ۲۴۹۔

[1] بمبئی میں کچھ سال سے ایک نہیں بلکہ کئی چھوٹی کمیٹیوں مثلاً "نگرانی کی کمیٹی" (سنہ ۱۹۲۳ء) اور "زمین گروی بنک کی کمیٹی"، (سنہ ۱۹۲۴ء) نے امداد باہمی کی تحریک کی جانچ پڑتال کی۔ اس کے علاوہ "تاس کی تنظیم جدید کی کمیٹی (سنہ ۱۹۲۲ء تا سنہ ۱۹۲۳ء) نے بھی کسی قدر غیر ہمدردانہ و مخالفانہ تنقید کی۔

جوش و خروش کے ساتھ جد و جہد کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ، جیسا کہ زرعی کمیشن رائے زنی کرتا ہے، "اگر امداد باہمی کی تحریک ناکام رہی تو دیہی ہندوستان کے بہترین توقعات خاک میں مل جائیں گے"[1]

زمین گروی بنک

۱۹۔ زمین گروی بنکوں کی ضرورت تحریک امداد باہمی کو شروع ہوئے تیس سال سے زائد زمانہ گزر چکا۔ اس طویل زمانے میں جو تجربہ ہوا اس نے تحریک کے حامیوں کو اس بات پر مجبور کر دیا ہے کہ اس تحریک کی وساطت سے دیہی طبقوں کی قرضداری دور کرنے اور دوسرے اغراض کے لیے بڑی مدت کے قرضے دینے کے امکان کی حد تک اپنے ابتدائی توقعات کو معتدل بنائیں۔ ہندوستان میں قرضۂ امداد باہمی کے مسئلے کے بارے میں جو لوگ سند مانے جاتے ہیں ان میں سے ہر ایک اس بات کو محسوس کر رہا ہے کہ موجودہ ابتدائی انجمنیں، مرکزی بنک اور صوبہ واری بنک اپنے ذرایع کی نوعیت کی بنا پر نیز بنک کاری کے نقطۂ نظر سے باہمی حد بندیوں کے باعث صرف چھوٹی مدت کے قرضے معتدل مقدار میں دے سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے اس کمی کو دوسرے ایسے نظامات کے ذریعے سے پورا کرنا چاہیے جو بڑی مدت کے قرضوں کا خاص طور پر کاروبار کریں[2]۔ اس لیے کہ زرعی کساد بازاری کے گزشتہ چھ سال میں صورت حال نے بہت نازک صورت اختیار کر لی ہے اور موجودہ زرعی قرضوں کو کم کرنے کی ضرورت بہت شدید ہو گئی ہے۔ زمین گروی بنکوں کے قائم کرنے کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اچھے اور مستحق کسانوں کو جو قرضہ

---

[1] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ، فقرہ (۳۷۴)۔

[2] دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ ۱۴۹ و ۱۵۰۔

لینے کے قابل ہوں استحکام دینے کی ضرورت ہے۔

کسان کو اس کی قرضداری سے مستقل طور پر نجات دلانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ کافی طویل مدت کے لیے قرضے دیئے جائیں۔ طویل مدت کے قرضے اس غرض سے بھی ضروری ہیں کہ چھوٹا اور بڑا کسان بیش خرچ اور نفع بخش اصلاح و ترقی عمل میں لانے کے قابل ہو۔ انجمن ہائے امداد باہمی ان ضرورتوں میں سے کسی کی بھی بہم رسانی کافی طور پر نہیں کر سکتیں، اور ان سے زیادہ سے زیادہ یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ کسان کی فصل کی رواں ضرورتوں کو پورا کریں گی۔ وہ اتنی مقدور نہیں رکھتیں کہ اپنی رقوم کو طویل مدت تک پھنسا رکھیں، لیکن کسان کو بہرحال مختلف اغراض کے لیے طویل مدت کے قرضوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں رائفٹ آئیزن طرز کے دیہی بنک کا مقصد بڑی جائداد غیر منقولہ کے مالک کی ضرورتوں کو پورا کرنا نہیں ہوتا اور یہی ساہوکار کا بہت آسانی کے ساتھ اور فوراً شکار ہو جاتا ہے۔ معمولی تجارتی بنکوں اور قرض دہندوں کو بھی اتنی مقدور نہیں ہوتی کہ اپنے اصل کو طویل معیاد کے لیے باندھ رکھیں یا اپنا قرضہ قرض گیرندے کی آمدنی یا پس اندازیوں سے چھوٹے چھوٹے اقساط میں واپس وصول کرتے رہیں۔ اسی وجہ سے اعتباری اداروں کی ان خاص شکلوں کی ضرورت رونما ہوتی ہے جنھیں عام طور پر "زمین گروی بنک" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ بنک نہ صرف مہاجن کی جگہ لیں گے بلکہ سرکاری قرضوں کے موجودہ غیر اطمینان بخش طریقے کی ضرورت بھی باقی نہ رکھیں گے اور ادنیٰ ترشرح سود پر قرضہ دے کر زمیندار کو اس قابل بنائیں گے کہ وہ ہر قسم کی مفید اصلاح و ترقی عمل میں لائے۔[1]

۲۰۔ زمین گروی بنک اور امداد باہمی

زمین گروی بنکوں کے خلاف یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ اصلدارانہ طریق پر کاروبار کرنے پر مجبور اور امداد باہمی کی انجمنوں کے اخلاقی و تربیتی افادے سے خالی ہوتے ہیں لیکن اگر ہم اس اعتراض کو صحیح بھی مان لیں تو اس استدلال کا

357

[1] دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ (۳۰۱) و (۳۰۴)۔

باب

کیا جواب ہے کہ جب پرانے قرضے رعیت کے معاشی احیاء کی راہ میں سنگین رکاوٹ ہیں اور ان کی بے باقی ایک ایسا کام ہے جو امداد باہمی کی معمولی انجمنوں کے بس سے اسی طرح باہر ہے جس طرح مستقل اصلاح و ترقی کے مساوی اہم کام کے لیے مالی مدد دینا تو اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے دوسری مناسب تدابیر لازماً اختیار کرنی پڑیں گی، خواہ ان میں امداد باہمی کی بعض امتیازی خصوصیات وصفات مفقود ہی کیوں نہ ہوں۔ ہمیں یہ بھی ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ سابقہ قرضوں کی موجودہ پیمانے پر موجودگی، امداد باہمی سے پوری طرح فوائد حاصل کرنے کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے۔ اس لحاظ سے قرضداری کے مرض کو دور کرنے اور رعیت کی معاشی حیثیت کو قوی کرنے والی کسی شے کو امداد باہمی کا حریف خیال کرنے کے بجائے اس کا ناگزیر معاون تصور کرنا چاہئے۔ علاوہ ازیں بنیادی اصول کے عینہ اختلافات جو زمین گروی بنکوں اور انجمن ہائے قرضۂ امداد باہمی کے درمیان ہیں امداد باہمی کے اصول کے مطابق زمین گروی بنکوں کو منظم کرکے دور کئے جا سکتے ہیں[1] زمین گروی بنک تین قسم کے ہو سکتے ہیں:- (۱) امداد باہمی (۲) غیر امداد باہمی اور (۳) مثل امداد باہمی۔ ادنیٰ درجے کے کسانوں اور چھوٹے کھیتوں کے مالکوں کو مدد دینے کی حد تک "امداد باہمی" کی قسم موزوں ترین ہے، اس لیے کہ وہ ارکان کے تعاون و تعامل اور جائداد مرہونہ کی باہمی ضمانت پر مبنی ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ ہندوستان میں سب سے زیادہ رواج "مثل امداد باہمی" قسم کا ہے۔ اگرچہ جملہ زمین گروی بنکوں میں امداد باہمی کے نظریے اور عمل کے عناصر معقول حد تک موجود ہیں، لیکن ان کو قرض گیرندوں کی محدود ذمہ داری کی انجمن خیال کیا جاتا ہے جس میں قرضہ نہ لینے والے چند افراد اس خیال سے شریک کر لیے جاتے ہیں کہ ابتدائی کاروبار کے لیے مطلوبہ اصل کو اور بہتر انتظام کے لیے مطلوبہ کاروباری و انتظامی قابلیت کو کشش و ترغیب ہو۔ غیر امداد باہمی یا تجارتی زمین گروی بنک غالباً بڑے بڑے زمینداروں یا

358

[1] دیکھو اسٹرک لینڈ کی کتاب موسوم بہ "یورپ کے طریق امداد باہمی کی تحقیق" صفحہ ۲ تا صفحہ ۴۔

صاحبان جائداد کی مالی مدد کے لیے زیادہ موزوں ہوسکتا ہے[1]۔

۱۲۔ ہندوستانی زمین گروی بنکوں کی سرگزشت[2]

ابتداءً ۱۸۶۳ء میں ایک کمپنی لینڈ مورگیج بنک اف انڈیا لمیٹڈ کے نام سے جس کا ذیلی لقب (Credit foncier Indien) تھا، لندن میں رجسٹر ہوئی۔ اس کمپنی کے ایجنٹ کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں، اور تحتانی ایجنٹ بنگال، مدراس، اودھ وغیرہ صوبوں کے تمام بڑے شہروں، قصبات اور اضلاع میں موجود تھے۔ قرضے بہ یک وقت سات سال کے لیے، ۱۰ فی صد شرح سود پر دئے جاتے تھے۔ بنک کا آغاز اچھی طرح ہوا اور تقریباً بیس سال تک وہ کامیابی کے ساتھ کاروبار کرتا رہا۔ لیکن اس کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بتدریج تنزل پذیر ہوا جس کے اسباب کے منجملہ چند یہ تھے:۔ اس کا چائے کے کاروبار کے لیے بڑی مقدار میں قرضے دینا (حالانکہ چائے کی قیمت اس زمانے میں گر رہی تھی)، تمام ملک میں دوامی بندوبست کی توسیع کے بارے میں بنک کی توقعات کا پورا نہ ہونا، بنگالی کوٹھیوں جیسے رقیبوں کا رونما ہونا، جنھوں نے زمینداروں کو قرضہ دینا شروع کیا۔ زمین گروی بنک کے کاروبار میں اس پورے جوکھم کی ناکامی پر افسوس کرنے کی غالباً ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ جیسا کہ پنجاب گورنمنٹ نے ۱۹۱۰ء میں بتلایا، اہل ہند کی بہبود کے معاملے کو ایک ایسے طاقتور بنک کے تفویض کر دینا جس کا صدر دفتر لندن میں تھا اور جو زیر ہند پر اثرات ڈال سکتا تھا سیاسی حیثیت سے قابل اعتراض تھا[3]۔ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ سر ولیم ویڈربرن کے مشورے کے مطابق ۱۸۸۲ء میں پونا کے علاقے کے لیے ایک گروی بنک قائم کرنے کی تجویز ناکام رہی۔ سر فریڈرک نکل سن

[1] دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ (۱۹۰ تا ۱۹۹)

[2] ان بنکوں کی ابتدائی سرگزشت کے لیے دیکھو جے۔ سی۔ سنہا کا مضمون "زمین گروی بنکوں کے کاروبار" جو بعد ہندوستانی معاشی کانفرنس منعقدۂ لکھنؤ (۱۹۲۳ء) میں پڑھا گیا۔ ان کی موجودہ حالت کے لیے دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ (۲۰۲ تا ۲۱۰)۔

[3] دیکھو پی۔ جے۔ سامپسن کی کتاب موسوم بہ "معاشیات ہند کے اصلی اجزا" صفحہ ۲۲۶۔

نے ۱۸۹۵ء میں یہ خیال ظاہر کیا کہ زمین گروی بنک احاطۂ مدراس کی رعایا کے لیے موزوں نہیں تھے اور نہ ان کو ایسے بنکوں کی ضرورت تھی۔ ڈوپرنے اپنی کتاب موسوم بہ "شمالی ہند کے عوام کے بنک" میں اس بات کی حمایت کرتے ہیں کہ صوبۂ متحدہ کی مقروض و زیر بار ریاستوں کے فائدے کی غرض سے زمین گروی بنک قائم کئے جائیں۔ سر ڈنشا واچا بھی مصری وضع کے زمین گروی بنکوں کے بڑے حامی تھے اور ان ہی کو قرض داری کے مسئلے کا واحد اطمینان بخش حل خیال کرتے تھے۔ ۱۹۱۹ء میں سر جیمس میسٹن اس وقت کے وزیر مالیہ نے ان زمین گروی بنکوں کے حق میں تقریر کی جو زیادہ تر بعض مقامی اشخاص نے حوصلہ مندی کے ساتھ کھولے تھے اور جن کو بعض ذہین اور سر برآوردہ زمیندار مقامی انتظام و نگرانی میں چلا رہے تھے؛ لیکن اسی کے ساتھ سر جیمس میسٹن نے یہ بتلایا کہ حکومت کے لیے یہ مناسب نہ تھا کہ اس قسم کے کام کو بڑے پیمانے پر انجام دے۔ یہ معلوم ہوگا کہ اکثر ابتدائی تجاویز میں رعایا کو ان کے کھیتوں کی ضمانت پر قرضہ دینے کا خیال اس لیے پیش نظر نہ تھا کہ ان کی بنیاد پر زیادہ تر بڑے زمینداروں کو قرضہ دینا مقصود تھا۔ لیکن اس کے بعد کے زمانے میں اس بارے میں خیالات میں تبدیلی واقع ہوئی ہے اور یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ رعایا کی فلاح کے لیے ہندوستان میں ایسے بنک قائم کرنا سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں نے اپنا مسلک قرار دے لیا ہے، چنانچہ حال ہی میں (۱۹۲۶ء میں) بمبئی کے مسجلوں کی ایک کانفرنس میں بھی یہی مسلک اختیار کیا گیا۔

359

اس معاملے میں پنجاب کو رہنما بننے کی عزت حاصل ہوئی۔ چنانچہ اس کا پہلا امداد باہمی کا زمین گروی بنک ۱۹۲۰ء میں بمقام جھنگ کھلا۔ چند ہی سالوں کے اندر ایسے بنکوں کی تعداد بڑھ کر بارہ ہوگئی۔ بدنصیبی سے اس وقت پنجاب میں یہ تحریک سرد پڑی ہوئی ہے نہ کوئی نئے بنک کھولے جا رہے ہیں اور نہ نئے قرضے دیے جا رہے ہیں۔ زمین گروی بنکوں کے کاروبار کا جو تجربہ بطور رہنمائی کیا گیا تھا اس کی ناکامی کے چند اہم اسباب یہ معلوم ہوتے ہیں:۔ قرضہ دینے میں بے احتیاطی قرضوں کی کفالت اور قرضہ حاصل کرنے کی غرض کے بارے میں نظما کی طرف سے

مناسب تحقیقات کا فقدان، اور قرضے منظور کرنے میں نظما کو غیر محدود اختیار تمیزی حاصل ہونا جس کو غیر عاقلانہ طور پر کام میں لایا گیا۔ اس کے علاوہ دوسرے عاملین بھی برسرکار رہے۔ جب بنک کھلے تو قیمتیں بہت اعلیٰ سطح پر تھیں اور زرعی خوشحالی کا معیار بھی بڑھا ہوا تھا۔ اس کے بعد جو کساد بازاری رونما ہوئی اس نے واجبات کو پورا کرنے کی حد تک قرض گیرندوں کی حیثیت پر بڑا اثر ڈالا۔ غیر نفع بخش قیمتوں پر زمین خریدنے کا جنون بھی شروع ہوا، اور زمین کا قرضہ ادا کرنے کے لیے جو زر مستعار لیا گیا اس کو زمین کی خریداری میں مشغول کیا گیا۔ نظما کی بدعہدی، طرفداری اور کرم نمائی نے صورت حال میں مزید پیچیدگی پیدا کردی۔[1]

مدراس، بنگال اور آسام میں بھی اسی قسم کے بنک کھولنے کی تدابیر اختیار کی گئیں اور بمبئی میں اس قسم کے ۱۳ ادارے ریاستہائے متحدہ امریکا کی قومی زرعی قرضے کی انجمنوں کے نمونے پر صوبے کے منتخب اضلاع میں قائم ہو چکے ہیں حکومت برمانے تجربے کے طور پر ایک تجویز کو منظور کرلیا ہے۔ صوبۂ متوسط کی حکومت نے ۱۹۳۵ء میں امداد باہمی کے ۱۰ زمین گروی بنک قائم کئے اور ۵ لاکھ روپیہ کی حد تک اصل اور سود کی ضمانت دی۔ جرمنی کے زمین گروی بنکوں (Landschaften) کی کامیابی نے ہندوستان میں زمین گروی بنک قائم کرنے کی تحریک کو بہت بڑی حد تک متاثر کیا ہے؛ اور ہندوستان میں خاص کر شاہی زرعی کمیشن، بنک کاری کی صوبہ واری تحقیقاتی کمیٹیوں اور مرکزی تحقیقاتی کمیٹی نے اس نمونے پر بنک قائم کرنے کے مسئلے کی بغور تحقیق کی ہے۔ حال کی کساد بازاری کے زمانے میں صوبہ واری حکومتیں اس مسئلے کی طرف روز افزوں توجہ دے رہی ہیں، اور مرکزی حکومت بھی زمین گروی بنکوں کے قائم کرنے میں پوری دلچسپی لے رہی ہے، چنانچہ دہلی میں اپریل ۱۹۳۴ء میں جب صوبہ واری معاشی کانفرنس منعقد ہوئی تو اس کے ایجنڈا کی ایک اہم مد ان ہی بنکوں کے کھولنے کا مسئلہ تھا۔

---

[1] "زمین گروی بنکوں کے بارے میں پنجاب کے تجربے" کے متعلق دیکھو شیخ عطاء اللہ کا سبق آموز مضمون انڈین جرنل آف اکنامکس بابت جنوری ۱۹۳۶ء میں۔

360

باب

موجودہ زمانے میں زمین گروی بنکوں کی توسیع کے لیے بعض حالات موافق
ہیں۔ چنانچہ اولاً تو یہ کہ دیہی علاقوں کے قرض دہندے چھوٹی لیکن یقینی اقساط
صورت نقد قبول کرکے اپنے بقایا کے بڑے حصے کو معاف کرنے کے لیے آمادہ
ہیں۔ چنانچہ ان بنکوں کی طرف سے واجب الادا قرضوں میں بڑی حد تک
ی کرنے کے خیال سے مصالحت قرضہ کے پروگرام پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ دوئم
یہ کہ زر کے بازار میں ارزاں زر کی کثیر مقدار آسان شرائط اور عمدہ ضمانت پر
ستیاب ہوسکتی ہے۔" اب یہ بنکوں کا کام ہے کہ زر کی ارزانی سے فائدہ اٹھائیں
ور کسان کی مدد کریں جو پیداوار کی ارزانی کے باعث مشکلات میں پھنسا ہوا ہے۔
رعی پیداوار کی قیمتوں کی کمی کے مدنظر یہ ضروری ہوگیا ہے کہ کسان کی آمدنی کو
ڑھانے کے ذرائع اختیار کئے جائیں اور اس کو زرعی اصلاح و ترقی مثلاً کھیتوں
کے انضمام (اشتمال)، معمولی آب پاشی، جانوروں کی پرورش اور ان کی نسل کی
فزائش، گھٹر باندھنے اور بہتر قسم کے آلات کشاورزی وغیرہ کے لیے قرضے
دیے جائیں۔[1]

۲۲۔ زمین گروی بنکوں کو سرکاری امداد

ہندوستان میں زمین گروی بنکوں کے کاروبار کو کامیابی سے
چلانے کے لیے سرکاری مدد کی اہمیت پر ہمیں زور دینے کی
بمشکل ضرورت ہے۔ سرکاری امداد حسب ذیل شکلوں میں
دی جاسکتی ہے:- اصل رقم قرض اور سود دونوں کی واپسی
کے بارے میں ضمانت، زمین کی کفالت کے بونڈ یا ڈبنچروں
کے ایک جزو کی حکومت کی طرف سے خریداری،[2] ایسے بونڈوں کے متعلق

---

[1] دیکھو بمبئی کی زمین گروی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ ۱۱ تا ۱۲۔

[2] زرعی کمیشن اس امر کی تائید کرنے کے باوجود کہ حکومت زمین گروی بنکوں کو ان کے ڈبنچروں کے سود کی
ضمانت کی شکل میں مدد دے، اس کی کوئی سفارش نہیں کرتا کہ حکومت ڈبنچروں کا کوئی جزو خریدے، اگرچہ
وہ تسلیم کرتا ہے کہ اس قسم کی ہمت افزائی شروع شروع میں ضروری ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ایسی ہمت افزائی
اعتماد پیدا کرنے کے لیے ایسے زمانے تک ضروری ہے جب تک کہ گروی بنک اپنے پیروں پر کھڑے ہونے
کے قابل نہ ہو جائیں۔ علاوہ ازیں کمیشن یہ مشورہ بھی دیتا ہے کہ ان بنکوں کو چاہئے کہ "قانون قرضہ برائے اصلاح

اشاریہ

توثیقی تمسکات[1] ہونے کا اعلان، گروی دار کی حیثیت سے بنک کو خاص سہولتوں اور حقوق کا عطا کرنا، جیسا کہ جرمنی میں ہوتا ہے، انجمن ہائے امداد باہمی جن مراعات سے متمتع ہوتے ہیں ویسی مراعات ان کو عطا کرنا، اور کاروبار کے مصارف کو پورا کرنے کے لیے مالی امداد دینا۔ اس قسم کی سرکاری مراعات کی عدم موجودگی میں اس کا قرینہ نہیں ہے کہ زمین گروی بنک اپنے بونڈ بازار میں مناسب قیمت پر اور معتدل شرح سود پر فروخت کرنے کے قابل ہوں گے۔ بمبئی کے پراونشل کواپریٹو بنک کی طرف سے ۱۰ لاکھ روپے کے ڈبنچروں کا کامیاب اجرا جس پر وزیر ہند کی جانب سے ۴ فی صد سود کی ضمانت دی گئی تھی، اس سلسلے میں ہمت افزائی کی مثال کی طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ زرعی کمیشن یہ سفارش کرتا ہے کہ ہر بنک کی انتظامی کمیٹی میں ایک سرکاری رکن ہونا چاہئے تاکہ سرکاری اغراض کی حفاظت کرے اور مسلسل عمدہ انتظام کا یقین دلائے[2]۔

361

زرعی کمیشن یہ بتلاتا ہے کہ زمین گروی بنکوں کی تنظیم میں احتیاط کی بہت ضرورت ہے۔ ایسے بنک نہایت گہری ابتدائی تحقیق کے بعد قائم کرنے چاہئیں، ان کا دستور اور کاروبار حتی الامکان سادہ ہونا چاہئے؛ انتظام نہایت اعلیٰ درجے کا ہونا چاہئے اور قرضے کی بروقت واپسی کی بہ جبر پابندی کرانی چاہئے۔ خراب بنک کی کوتاہی اچھے بنکوں کی نیک نامی پر بٹہ لگا سکتی اور اس طرح ڈبنچروں میں عوام کے اعتماد کو تباہ کرسکتی ہے۔ اس امر کی نگرانی بھی ضروری ہے کہ زمین گروی بنک

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:۔ دہ ترقیاتی ہائی" کے تحت قرضوں کی تقسیم کے لیے مناسب واسطہ قائم کریں، (دیکھو رپورٹ فقرہ ۲۱۳)۔ بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی اصل رقم قرضہ کی واپسی کے بارے میں حکومت کی طرف سے خاص ضمانت دیے جانے کو پسند نہیں کرتی، لیکن اس بارے میں بھی اس کو کوئی اعتراض نہیں ہے کہ اگر کسی صوبے میں ضرورت ہو تو حکومت ڈبنچر خریدے، (دیکھو رپورٹ، فقرہ ۲۲۱)۔

[1] مرکزی مجلس قانون ساز میں حال ہی (۱۹۳۲ء) میں انڈین ٹرسٹی ایکٹ میں جو ترمیم ہوئی ہے اس کی رو سے زمین گروی بنکوں کے جاری کردہ ڈبنچروں کو توثیقی تمسکات کی فہرست میں شامل کر لیا گیا ہے۔

[2] دیکھو رپورٹ کا فقرہ ۳۰۳؛ نیز دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ ۲۱۱ تا ۲۲۹۔

باب ۹

ترقی کر کے ایسے ادارے کی شکل نہ اختیار کر لیں جو آبائی جائداد کے مالک سے اس کی املاک چھین لے[۱]۔ قرضہ دینا اگر قرض گیرندے کے لیے معاشی لحاظ سے منفعت بخش نہ ہو تو اس کو قرض نہ دینا چاہیے۔

۲۳۔ مدراس اور بمبئی کی تجاویز

امداد باہمی کے اصول پر زمین گروی بنکوں کی تنظیم کے متعلق بمبئی اور مدراس کی تجاویز کی جانچ سے ایسے بنکوں کی ہیئت ترکیبی، مالیہ اور انتظام پر روشنی پڑے گی۔ (۱) مدراس کی تجویز — ۱۹۲۴ء تا ۱۹۲۵ء میں خصوصی زمین گروی بنکوں کی ایک تجویز منظور ہوئی۔ "اس تجویز کا اولین مقصد یہ ہے کہ زرعی زمین کی گروی کی ادائی میں سہولت پیدا کی جائے اور اس طرح رعیت کو گروی کے قرضوں کی زیر باری سے نجات دلائی جائے۔ زمین گروی بنکوں کے مقاصد میں زرعی زمینوں اور طریق کاشت کی اصلاح و ترقی شامل ہوگی۔ مجوزہ بنکوں کے ارکان کو دیے جانے والے قرضوں کی کفالت زرعی زمین کی گروی کے ذریعے سے کی جائے گی اور کاروباری اصل کا بیشتر حصہ ڈبنچروں کے اجرا کے ذریعے سے حاصل کیا جائے گا جن کی کفالت مرہونہ اراضی سے ہوگی"۔ حکومت مدراس نے جاری کردہ ڈبنچروں کی نصف تعداد ڈھائی لاکھ روپیے کی انتہائی مقدار تک خریدنے کی ذمہ داری لی، بشرطیکہ عوام کم از کم اتنی ہی مقدار میں ڈبنچر خریدیں۔ اس قسم کی سرکاری امداد کا مقصد عوام میں اعتبار و اعتماد پیدا کرنا اور انھیں زمین گروی بنکوں کے ڈبنچر خریدنے کی ترغیب دینا ہے۔ کاروباری اصل کا ایک جزو ڈبنچروں اور امانتوں (موخر الذکر تین سال سے کم کے لیے قبول نہیں کی جاتیں) کے علاوہ حصص کے اصل پر مشتمل رکھا گیا اور حصص کی قیمت کم رکھی گئی تاکہ چھوٹا کسان بھی بنک میں حصہ لینے کے قابل ہو۔ ان بنکوں کو ترقی کے بیش بہا ارقبوں تک محدود رکھا گیا۔

یہ مناسب سمجھا گیا کہ کاروبار کے لیے ایک محدود رقبہ ہو جو بنک کے صدر مرکز سے چھ یا سات میل کے اندر کے دیہات پر مشتمل ہو تاکہ باہمی معلومات

---

[۱] دیکھو رپورٹ فقرہ (۳۰۲)۔

باب

کسی حد تک حاصل رہیں اور گروی کی جانے والی زمین کی شناخت اور قیمت کی تشخیص میں بنک کو سہولت ہو اور پیشہ ور ماہروں کی مدد کی ضرورت نہ ہو لیکن بعد میں یہ رجحان رونما ہوا کہ اس محدود رقبے کو وسیع کیا جائے۔ کئی کسانوں نے جو اس رقبے میں ارضی جائداد کے مالک تھے اور جنھوں نے قرض دہندوں کے پاس زمین گروی رکھوائی تھی اتحاد باہمی کے ذریعے سے امداد باہمی کا زمین گروی بنک قائم کیا۔ مرکزی زمین گروی بنک کے قائم ہونے سے پیشتر قدیم تجویز کو اس طرح بیان کیا گیا "کسان اپنی زمینوں کو بنکوں کے پاس مکرر رہن رکھوائیں گے اور بنک ان کفالتوں کی ضمانت پر ڈبنچر جاری کرے گا۔ یہ ڈبنچر کھلے بازار میں فروخت کئے جائیں گے اور متحصلہ رقم کو بنک اپنے ارکان کو قرضہ دینے کے کام میں لائے گا یعنی رہن ناموں کے معاوضے میں انھیں رقم ادا کرے گا .... ڈبنچروں کی مجموعی قیمت ان مرہونہ جائدادوں کی مجموعی قیمت سے متجاوز نہ ہوگی جو ارکان کے ایک گروہ کی جانب سے جن کے لیے ڈبنچروں کا خاص سلسلہ جاری کیا گیا ہو پیش کئے جائیں۔" ڈبنچر کے اجرا کی مدت معمولی طور پر بارہ سال سے کم اور بیس سال سے زائد ہوتی تھی اور سود کی شرح ۶ فی صد سے متجاوز نہ ہوتی تھی۔ ڈبنچروں پر ادا کئے جانے والے سود کی شرح ابتداءً ۶ فی صد مقرر کی گئی۔ مسجل کو ان بنکوں کا امین یا متولی مقرر کیا گیا تاکہ وہ ڈبنچروں کے قابضوں کے اغراض کی حفاظت کرے۔[1] ان بنکوں کی تنظیم "محدود ذمہ داری" کی بنیاد پر عمل میں آئی اس لیے کہ ایک شخص بیک وقت "غیر محدود ذمہ داری" کی انجمنوں کا رکن نہیں بن سکتا قرضے کی کفالت کے طور پر جو زمین گروی کی جائے اس کی مالیت قرضے کی مقدار سے کم از کم دونی ہونی چاہیے۔[2] جیسا کہ مدراس

۱۔ جرمنی کے مشہور زمین گروی بنکوں Landschaften کی حد تک گروی کے متملکات اور مکفول جائداد (جس پر اول الذکر مبنی ہوتے ہیں) کے باہمی قانونی تعلق کی ضمانت ایک خاص نگرانی کے کمیشن کے ذریعے سے کی جاتی ہے۔

۲۔ دیکھو مسجل مدراس کی تجویز کا مسودہ جو انھوں نے اپنے مراسلہ موسومہ وزیر ہند (صیغہ ترقیات) میں بتاریخ ۹ جون ۱۹۲۲ء پیش کی تھی۔

کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی (۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۰ء) نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے، زمین گروی بنکوں کی تعداد ۲۰ تھی۔ ان کے منجملہ صرف آٹھ نے ڈبنچر جاری کیے۔ سرکاری امداد کے باوجود ان بنکوں نے بحیثیت مجموعی محدود ترقی کی جس کا باعث زیادہ تر یہ تھا کہ وہ اپنے ڈبنچر عوام کے ہاتھ فروخت کرنے سے قاصر رہے۔ امداد باہمی کے بارے میں جو ٹاؤنسنڈ کمیٹی (۱۹۲۷ء تا ۱۹۲۸ء) مقرر کی گئی اس نے ان بنکوں کی صورت حال کی جانچ پڑتال کی اور یہ پایا کہ یہ بنک اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتے جب تک کہ ایک مرکزی زمین گروی بنک قائم نہ کیا جائے جس کے ارکان میں افراد اور معمولی زمین گروی بنک ہوں اور جو معمولی زمین گروی بنکوں کی طرف سے مرکزی بنک میں منتقلہ کفالتوں کی مالیت کے مطابق ڈبنچر جاری کرے[1]۔ چنانچہ مرکزی زمین گروی بنک مدراس میں دسمبر ۱۹۲۹ء میں قائم کیا گیا اور اس کا مقصد بڑی حد تک مدراس کی تجویز کے ایک سنگین نقص کو دور کرنا ہے، اور وہ نقص یہ ہے کہ مدراس میں منتشر غیر منظم اور چھوٹے زمین گروی بنک کثیر تعداد میں ہیں جو بازار میں ایک دوسرے کے مقابلے میں ڈبنچروں کی بھرمار کرتے ہیں۔ مدراس گورنمنٹ نے اس مرکزی بنک کو کچھ سہولتیں عطا کی ہیں، مثلاً ایک تو یہ کہ ابتدائی پانچ سالوں میں بنک جو ڈبنچر ۵۰ لاکھ کی حد تک جاری کرے اس پر ۶ فی صد شرح سود کی ضمانت دی گئی ہے جو ڈبنچر کے اجرا کی پوری مدت کے لیے رہے گی؛ حال ہی میں (۱۹۳۵ء میں) اس حد کو ایک کروڑ روپے تک وسیع کر دیا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ دو نائب تحصیلداروں کی خدمات مستعار دی گئی ہیں تا کہ وہ مقامی زمین گروی بنکوں کا معائنہ کریں، اور دس مددگار نائب تحصیلدار مقرر کیے گئے ہیں تا کہ وہ مقامی زمین گروی بنکوں کی طرف سے تحقیقات میں ہاتھ بٹائیں؛ اور تیسرے ۲۵ ہزار روپے کی مالی امداد مرکزی بنک کے کاروبار کے مصارف کے لیے دی گئی ہے۔ حکومت

363

[1] زرعی کمیشن اور مرکزی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی بھی ڈبنچروں کے اجرا کے لیے ایک مرکزی بنک قائم کرنے کی سفارش کرتی ہے۔

اشٹل

کے اغراض کی حفاظت کے لیے بورڈ میں حکومت کی نمایندگی رجسٹرار اور رجسٹرار کا نامزد کردہ ایک شخص جس کے لیے حکومت کی منظوری ضروری تھی کرتا تھا۔ "مرکزی زمین گروی بنک" کی پہلی مجلس نظما میں امداد باہمی کے سربرآوردہ حامیوں کے علاوہ احاطۂ مدراس کے ذی حیثیت کاروباری اشخاص اور قومی کارکن شریک کئے گئے۔ بنک کی طرف سے ڈبنچر جاری ہوئے تو شغل اصل کرنے والے عوام نے اس کا اچھا جواب دیا۔ بنک کی ترقی کی رفتار بہت اچھی اور حمی ہوئی رہی،[1] البتہ صرف ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۲ء کے عارضی زمانے میں جمود طاری رہا جو سخت مالی پریشانی کا سال تھا۔ مرکزی زمین گروی بنک سے ۶۲ ابتدائی زمین گروی بنک ملحق ہیں اور اس بنک میں ۱۹۰ منفرد ارکان بھی شریک ہیں۔ بنک نے نومبر ۱۹۳۵ء تک ۵۰ ½ لاکھ روپے کی مالیت کے ڈبنچر جاری کئے جن میں سے ½ ۲۵ لاکھ روپے کے ڈبنچر ادا ہوئے۔ قانون "زمین گروی بنک امداد باہمی مدراس" بابت ۱۹۳۴ء کی رو سے مقامی حکومت کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ مرکزی زمین گروی بنک کے جاری کئے ہوئے ڈبنچروں (اصل اور سود) کی ضمانت دے اور بنک کو کارگر اختیارات دیے گئے ہیں کہ ادائی میں کوتاہی کرنے والوں سے رقم وصول کرے۔ قانون مذکور کی رو سے کئی قانونی مزاحمتیں بھی دور ہوگئیں جو ان بنکوں کے کامیابی کے ساتھ کاروبار کرنے کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتی تھیں۔

(۲) بمبئی کی تجویز۔ احاطۂ بمبئی کے لیے زمین گروی بنک قائم کرنے کے مسئلے پر ابتداءً اپریل ۱۹۲۳ء میں گجرات کی علاقہ واری امداد باہمی کانفرنس میں غور کیا گیا۔ ستمبر ۱۹۲۶ء میں حکومت بمبئی نے اس وقت کے رجسٹرار مسٹر جے۔ اے مدن آئی، سی، ایس کی مرتبہ تجویز کے مسودے کو منظور کرلیا جس پر وزیر امداد باہمی کی طلب کردہ کانفرنس اور ایک خاص کمیٹی پہلے غور کرچکی تھی۔ حکومت نے تجربے کے طور پر دو زمین گروی بنکوں کی رجسٹری دھاڑواڑ اور بروچ کے اضلاع کے لیے منظور کی۔

364

[1] دیکھو ڈی، آسٹن آئی، سی، ایس کا مضمون "احاطۂ مدراس کے زمین گروی بنکوں" پر ایک رسالہ موسوم بہ "انڈین کوآپریٹو ریویو" بابت جنوری ۱۹۳۵ء میں۔

یہ بنک ریاستہائے متحدہ امریکا کی قومی زراعتی قرضی انجمن کے نمونے پر قائم کیے گئے اور طے پایا کہ ان کی مالی مدد عارضی طور پر بمبئی کا صوبہ واری امداد باہمی بنک کریگا۔ حکومت نے اس بات کو بھی منظور کر لیا کہ اس صوبہ واری بنک کے ۵ لاکھ روپے کے ڈبنچر خریدے جن کی شرح سود ۴ فی صد تھی۔ زمین گروی بنکوں کو سرمایہ کافی مقدار میں فراہم کرنے کی غرض سے ہر بنک کے لیے زمین کی مالیت کی تشخیص کے ایک افسر کی خدمات ایک سال تک مفت مہیا کرنے کا بھی انتظام کیا گیا۔ بعد میں چل کر پاچورا واقع مشرقی خاندیس کے لیے ایک زائد شاخ کھولنے کی منظوری دی گئی، چنانچہ سنہ ۱۹۲۶ء میں اس کی رجسٹری ہوئی جنوری سنہ ۱۹۲۹ء میں دھارڑواڑ اور بروچ کے بنکوں کی رجسٹری ہوئی۔ حکومت نے صوبہ واری امداد باہمی بنک کے جاری کیے ہوئے دو لاکھ روپے کے مالیتی ڈبنچر خریدے۔ صوبہ واری امداد باہمی بنک نے اپنے نئے فرائض انجام دینے کے لیے ایک الگ شعبہ زمین گروی کے لیے کھولا۔ بروچ اور دھارڑواڑ کے بنک تو کل ضلع کے ارکان کی مالی مدد کر رہے تھے اور پاچورا بنک کے کاروبار صرف تعلقے تک محدود رہے۔ ہر قرضے کی آخری منظوری صوبہ واری امداد باہمی بنک بمبئی اور رجسٹرار سے حاصل کرنی پڑتی تھی۔ انفرادی قرضے کی حد دس ہزار روپیہ مقرر کی گئی۔ قرضوں کا بیشتر حصہ پچھلے قرضوں کی ادائی کے لیے دیا گیا اور صرف چند ہی صورتوں میں قیمتی کلیں اور مشین نصب کرنے اور زمین کی اصلاح و ترقی کی غرض سے قرضے دیئے گئے۔ رکنیت صرف قرض گیرندوں تک محدود تھی، لیکن آیندہ قرضہ لینے والے بھی شریک ہو سکتے تھے۔

ضلع بروچ کا تجربہ بہت ہی ہمت افزا ثابت ہوا، لیکن زمین گروی کمیٹی بمبئی نے جس کو حکومت بمبئی نے امداد باہمی گول میز کانفرنس منعقدہ پونا (سنہ ۱۹۳۲ء) کی سفارش پر ان بنکوں کے کاروبار کی جانچ کے لیے مقرر کیا تھا، پاچورا بنک اور دھارڑواڑ بنک کے بارے میں چند نقائص بے نقاب کیے۔ چنانچہ یہ پایا گیا کہ قرض گیرندوں کی ادائی کی قابلیت کے اندازے ناقص تھے اور یہ کہ قیمتوں کے تغیرات اور ناموافق موسموں کا کافی لحاظ نہیں رکھا گیا تھا۔ اس کے

علاوہ چند دستوری نقائص بھی تھے، مثلاً صرف قرض گیرندے اور آیندہ قرض لینے والے ہی رکن بن سکتے تھے اور اس کے نتیجے کے طور پر ناموافق سالوں میں ابتدائی بنکوں کی مجالس نظما کی جانب سے اقساط کی ادائی کے لیے کافی دباؤ نہیں ڈالا جاتا تھا۔ ان مجالس کو اس قدر محدود اختیارات حاصل تھے کہ ان کو بنکوں کے کاروبار میں دلچسپی بڑھانے کے محرک کے طور پر استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔

365 لیکن جیسا کہ زمین گروی کمیٹی بمبئی نے بتلایا، یہ ایسے اعتراضات نہیں ہیں جن کو دور نہ کیا جا سکتا ہو یا جو ان بنکوں کی کامیابی کی راہ میں رکاوٹ ہوں۔ اس لحاظ سے کمیٹی نے پرزور سفارش کی کہ صوبۂ بمبئی کے مختلف اضلاع میں زمین گروی بنک کھولے جائیں اور اس کے لیے ایک مرمہ تجویز مرتب کی جس میں ڈبنچر جاری کرنے کے لیے امریکی طریق کے ''وفاقی زمین بنک'' کے مماثل ایک الگ مرکزی زمین گروی بنک قائم کرنے کا انتظام بھی شامل تھا۔ صوبہ واری امداد باہمی بنک بمبئی عوام سے کم مدت کی امانتیں وصول کرتا ہے اور نہ صرف معمولی ابتدائی قرضی انجمنوں کے لیے بلکہ چھوٹی مدت کے قرضے دینے والے ضلع واری مرکزی امداد باہمی بنکوں کے لیے بھی صدر مرکزی بنک کا کام کرتا ہے، لیکن وہ ابتدائی زمین گروی بنکوں کو قرضہ اور مالی مدد دینے کے لیے بالکل ناموزوں ہے[1]۔ علاوہ ازیں موخرالذکر ایک خاص طرز کا کاروبار ہے جس کو علیحدہ انجام دینے کی ضرورت ہے اور جو خاص طور پر ماہر عملہ چاہتا ہے۔

حکومت بمبئی نے حال ہی میں (یعنی ۱۹۳۵ء میں) زمین گروی کمیٹی کی سفارشوں کو عملی جامہ پہنایا۔ تجربے کے طور پر پہلے جو تین بنک کھولے گئے تھے ان کے علاوہ یکم اپریل ۱۹۳۵ء سے مزید ۱۰ ابتدائی زمین گروی بنکوں کی رجسٹری ہوئی ہے اور اس طرح اب مجموعی تعداد ۱۳ ہو گئی ہے۔ کاروبار کا رقبہ ایسے مقامات تک محدود کر دیا گیا ہے جہاں قلت و قحط کا امکان کم ہے اور جن میں امداد باہمی کی تحریک نے معقول ترقی کر لی ہے۔ اسی کے ساتھ ایک جدید مرکزی زمین گروی بنک کھولنے

---

[1] دیکھو بمبئی کی بنک کاری کی ''تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ (۱۹) اور بمبئی کی زمین گروی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ (۲۱)۔

کی تدابیر اختیار کی گئیں۔ چنانچہ صوبہ واری امداد باہمی زمین گروی بنک بمبئی کی رجسٹری قانون امداد باہمی بمبئی کے تحت ۵ ماہ دسمبر ۱۹۳۵ء کو ہوئی۔ اس کا ابتدائی اصل دس لاکھ روپیہ تھا جس میں سے نصف کی ادائی بنک کھلنے کے چھ مہینے کے اندر ضروری تھی۔ سر لالو بھائی سامل داس اس بنک کے پہلے صدر رہیں۔

نئے بنک کے اہم فرائض یہ ہوں گے کہ ڈبنچر جاری کرکے ابتدائی زمین گروی بنکوں کو قرضہ دیا جائے' ان کے کاروبار کا معائنہ کیا جائے اور ان کو مشورہ اور مدد دی جائے۔ یہ بنک مساوات پر ڈبنچر جاری کرے گا جس کے ساتھ سودی پرچے بھی ہوں گے جن کی مدت ۲۵ سال سے متجاوز نہ ہوگی۔ بمبئی کی مجلس قانون ساز نے گزشتہ سال (۱۹۳۵ء) کے موازنے کے اجلاس میں ایک قرارداد منظور کی جس میں حکومت کو مجاز گردانا گیا کہ بنک کی طرف سے ۵۰ لاکھ روپے کی حد تک جو ڈبنچر جاری کیے جائیں ان کے اصل اور سود کے بارے میں ضمانت دی جائے۔ لیکن حکومت نے صرف دس لاکھ روپے کی حد تک ڈبنچر جاری کرنے کی عارضی منظوری دی۔ اب یہ اعلان کیا گیا ہے کہ یہ ڈبنچر تولیتی تمسکات ہیں۔ اس لحاظ سے یہ یقینی ہے کہ یہ منقل اصل کا ایک مقبول عام ذریعہ ثابت ہوں گے۔

صوبہ واری زمین گروی بنک' ابتدائی گروی بنکوں کی وساطت سے کسانوں کو ان کی زمینوں کی کفالت پر قرضے دے گا۔ ابتدائی بنک' زمینوں کے حق ملکیت' آمدنی اور کسانوں کی ادائی قرضہ کی قابلیت کی تحقیقات کریں گے۔ قرضے صرف ارکان کو دیے جائیں گے اور وہ بھی ابتدائی بنکوں کی مجلس نظما کی سفارش پر جس کا صوبہ واری زمین گروی بنک کے پاس پیش ہونا ضروری ہے۔ منفرد ارکان کو اس طرح جو قرضے دیے جاسکتے ہیں ان کی انتہائی مقدار دس ہزار روپے تک محدود رکھی گئی ہے۔ اس انتہائی مقدار کے تابع کوئی رکن ابتدائی بنک سے اپنے حصص کے ادا شدہ اصل کی بیس گونہ مقدار یا اپنی غیر منقولہ جائداد کی نصف قیمت سے زائد قرضہ نہیں لے سکتا۔ کوئی قرضہ بیس سال سے زائد مدت کے لیے نہیں دیا جاسکتا۔ صوبہ واری بنک کی طرف سے ابتدائی بنکوں کو اور ابتدائی بنکوں کی طرف سے افراد کو ابتدائی حالتوں میں قرضے دیے جانے کی صورت میں رجسٹرار کی منظوری ضروری ہے۔ ابتدائی بنک

ہاشیہ[1]

کے دیے ہوئے قرضے کے سود کی شرح اس شرح سے صرف ½ فی صد زائد ہونی چاہیے جو صوبہ واری زمین گروی بنک وصول کرتا ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ اس طرح ارکان ½ ۶ فی صد شرح پر قرضہ حاصل کرنے کے قابل ہوں گے۔ یہ شرح ان موجودہ بھاری شرحوں سے بہت کم ہوگی جو قرض دہندے کسان قرض گیرندوں سے وصول کرتے ہیں۔ چنانچہ خود یہی چیز قرضداروں کے ذمے کے موجودہ واجبات کو بہت بڑی حد تک کم کر دیگی۔ قرضے کی ادائی یا تو اصل کی مساوی سالانہ اقساط سے ہوگی اور باقی رقم پر سود لیا جائے گا یا اصل اور سود ملا کر مقررہ سالانہ اقساط سے ہوگی۔ ابتدائی بنک جن زمینوں کو گروی لیں گے وہ مرکزی زمین گروی بنک کے پاس اس قرضے کے لیے بطور کفالت رکھی جائینگی جو موخرالذکر دے گا۔ اس طرح قرضہ دینے والے بنک کے پاس اچھی کفالت رہے گی۔

ابتداً قرضے زیادہ تر پرانے قرض ادا کرنے کی غرض سے دیے جائیں گے۔ یہ بنک 'خانگی انجمن ہائے مصالحت کی وساطت سے قرض دہندوں اور لین داروں سے معاملہ کریں گے اور قرض دہندہ کی واپس شدنی رقم میں کمی کرانے کی غرض سے قرض دہندے کے اس اضطراب سے فائدہ اٹھائیں گے جو اس کو اپنی رقم کی واپسی کے بارے میں ہوگا۔ ممکن ہے کہ ابتدائی بنک 'زراعت کی پیداآوری بڑھانے کی غرض سے اپنی جدوجہد کو وسیع کریں اور اصلاح و ترقی کے کام کے لیے جس میں قیمتی زرعی پلانٹ اور کلوں کا خریدنا اور نصب کرنا شامل ہے قرضہ دیں۔[1]

حکومت بمبئی نے یہ طے کیا ہے کہ صوبہ واری امداد باہمی زمین گروی بنک جو ڈبنچر جاری کرے اس کے اصل اور سود دونوں کی ضمانت دے کر بنک کی معقول مدد کرے اور اس کے علاوہ حسب ذیل مراعات عطا کرے:۔ (۱) رسوم عدالت اور رسوم رجسٹری سے استثنا اور بنک کے نفع اور حصوں کے مقسوم پر انکم ٹکس کی معافی 'جیسا کہ دوسری انجمن ہائے امداد باہمی کے بارے میں کیا جاتا ہے' اور (۲) سالانہ مالی امداد دینا تاکہ ابتدائی تین سالوں میں بنک کے کاروبار میں جو گھاٹا آئے اس کو دور کیا جائے اور

367

[1] دیکھو صوبہ واری امداد باہمی زمین گروی بنک لمیٹڈ بمبئی کے ذیلی قواعد اور ابتدائی زمین گروی بنک کے ذیلی قواعد (دو ورقی رسالہ نمبر "ال 'ال")۔

باب ۱
پہلے سال دس ہزار روپے کی انتہائی مقدار دی جائے اور تیسرے سال اس کو کم کرکے... ۲ روپیہ کردیا جائے۔ اس امداد کے علاوہ ۵ ہزار روپیہ سالانہ امداد ابتدائی بنکوں کو ان کے کاروباری مصارف پورے کرنے کے لیے دی جاتی ہے۔ حکومت نے اپنے اغراض کی حفاظت کرنے اور بنکوں کی کاروباری عمدگی کو یقینی بنانے کے لیے صدر مرکزی بنک کی مجلس میں اپنا نمایندہ رجسٹرار کو اور ابتدائی بنکوں کی مجلسوں میں رجسٹرار کا نامزد کردہ شخص مقرر کیا ہے۔ یہ رعایتیں اسی نہج پر دی گئی ہیں جس پر آجکل احاطۂ مدراس میں عمل ہورہا ہے۔

صوبہ واری زمین گروی بنک کی رکنیت کا دروازہ نہ صرف افراد کے لیے بلکہ ابتدائی بنکوں اور امداد باہمی کی انجمنوں کے لیے بھی کھلا ہوا ہے۔ اگرچہ مخلوط رکنیت، امداد باہمی کے باضابطہ رسمی طریقے سے انحراف ہے، لیکن افراد کے داخلے کا خیر مقدم کرنا چاہئے؛ اس لیے کہ ان کی موجودگی کی بدولت بنک کو سرمایہ اصل کرنے والے عوام کا اعتماد یقینی طور پر حاصل ہوگا اور کاروباری اصول کی سختی سے پابندی کی جائے گی۔ ذیلی قواعد کی رو سے مقسوم طلبی کو رد کیا گیا ہے، چنانچہ خالص نفع میں سے ۲۵ فی صد کو سرمایۂ محفوظ میں رکھنا ضروری ہے اور حصوں پر ½ ۶ فی صد مقسوم سے زیادہ ادا کرنے پر بندش قائم کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں ابتدائی بنکوں کے لیے یہ انتظام کیا گیا ہے کہ وہ صدر مرکزی بنک کی مجلس نظما میں حسب ضرورت نمایندے بھیجیں۔ چنانچہ ان کو مجاز کیا گیا ہے کہ وہ پندرہ نظمار کی مجموعی تعداد میں سے پانچ کا انتخاب پانچ حلقہ ہائے انتخاب میں رائے شماری کے ذریعے سے کریں۔ باقی دس نظما کی تقسیم حسب ذیل کی گئی ہے:- (۱) رجسٹرار، بنک کے حصہ داروں میں سے دو کی نامزدگی حکومت کی منظوری سے کرے؛ (۲) ایک کی نامزدگی صوبہ واری امداد باہمی بنک بمبئی کرے؛ (۳) پانچ کا انتخاب صوبہ واری زمین گروی بنک کے ارکان کریں؛ (۴) ایک رجسٹرار اور (۵) ایک بنک کا مینیجنگ ڈائرکٹر۔ بہرحال رجسٹرار اور اس کے دو نامزدہ اشخاص کا شریک کرنا ابھی کچھ زمانے تک نہ صرف اس لیے ضروری ہے کہ حکومت نے بنک کے قرضہ ادا کرنے کی قابلیت اور عاقلانہ انتظام کی پرجوکھم ذمہ داری لی ہے بلکہ اس لیے بھی کہ بنک میں عوام کا اعتماد پیدا کرنا مقصود ہے۔

حاشیہ

ڈبنچر کے قابضوں کے اغراض کی حفاظت کی غرض سے یہ انتظام کیا گیا ہے کہ حکومت کی طرف سے رجسٹرار یا کوئی دوسرا شخص امین یا متولی کے طور پر مقرر کیا جائے تاکہ ڈبنچروں کے قابضوں کی حد تک بنکوں کی ذمہ داریوں کو پورا کروائے۔ بنک کی کل جائداد جس کی کفالت پر ڈبنچر جاری کئے جاتے ہیں، امین کے اختیار اور قبضہ میں ڈبنچروں کے اجرا کی تاریخ سے رہے گی۔

368

ابتدائی زمین گروی بنکوں کی رکنیت صرف قرض گیرندہ ارکان تک مقید نہیں رہے۔ قرض نہ لینے والے حصہ داروں کو مجلس نظما میں الگ نمایندگی دی جاتی ہے۔ ابتدائی زمین گروی بنکوں کے ذیلی قواعد کی رو سے رجسٹرار کو اختیار دیا گیا ہے کہ ابتدائی تین سال کے لیے مجلس نظما کو نامزد کرے۔

مالی نقطہ نظر سے یہ مسئلہ بہت پرمشکل اور نازک ہے اور اس مسئلے کو ہاتھ لگانے میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں لارڈ برابورن نے جو اس وقت بمبئی کے گورنر تھے، صوبہ داری زمین گروی بنک کے افتتاح کے موقع پر جو الفاظ کہے تھے وہ اس کے مستحق ہیں کہ سب متعلقہ اشخاص ان کو یاد رکھیں۔ ہز اکسلنسی نے زمین گروی بنکوں کے متعلق بمبئی کی جدید اسکیم کو ایک "بڑا تجربہ" قرار دیتے ہوئے کہا کہ "میں اس کو ایک تجربہ کہنے کے لیے معذرت نہیں کرتا ہوں گا۔ جن اصول پر یہ بنک قائم کئے گئے ہیں یا ان اصول پر کامیابی کے ساتھ عمل کرنے سے جو مفید نتائج برآمد ہوں گے ان کے بارے میں نظریاتی اعتبار سے شبہے کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ لیکن نظریہ عمل نہیں ہے۔ چنانچہ ہمیں ابھی یہ یقین حاصل کرنا ہے کہ کاروباری مصارف، ڈوبے ہوئے قرضے اور کئی غیر متوقع مدات جو فاضلات کو ہمیشہ کم کرتے رہتے ہیں، ان سب کا مناسب لحاظ کرنے کے بعد مرکزی بنک اور ابتدائی اور ضلع داری یا علاقہ واری بنکوں کے قرضوں کی لین دین کی شرحوں کے درمیان نفع کی خاصی گنجایش باقی رہے گی۔" بمبئی کے تین ابتدائی بنکوں کے کام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لارڈ برابورن نے بتلایا ہے کہ اس سے ایک بڑا سبق یہ حاصل کرنا چاہئے کہ بعتا یا اور

باب ۱۰

ڈوبے ہوئے قرض کا وجود ہی نہ ہونا چاہیئے اور جدید بنک اس معیار کو جس حد تک پورا کرے گا اسی پر اس کی کامیابی کا انحصار ہے۔" اگر ابتدائی بنک احتیاط اور ہوشیاری سے کام کریں تو صوبہ واری بنک کو دگنی احتیاط اور ہوشیاری سے کام کرنا چاہیئے، اس لیے کہ یہی کل نظام کی مالی بنیاد ہوتا ہے۔"

ہمیں زمین گروی بنکوں کی بعض ناگزیر حد بندیوں کو واضح طور پر سمجھنا چاہیئے۔ اولاً یہ ظاہر ہے کہ وہ کل زرعی قرضے کا بار اپنے ذمے منتقل نہیں کر سکتے؛ اس لیے کہ قرضوں کی انتہائی مقدار کی حد اور دوسری ضروری بندشیں، زمین پر بطور مادی کفالت قبضہ اور قرض گیرندوں کا ہوشیاری کے ساتھ انتخاب، یہ سب چیزیں قرضے کے منتقل کرنے کو ناممکن بناتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ زمین گروی بنک قرضے کو اپنے ذمے منتقل کر کے اور شرح سود میں کمی کر کے صرف قرضے میں کمی کر سکتے ہیں، اور قرضے کو کامل طور پر ادا نہیں کر سکتے۔ اور اگر ایسا عمل ممکن بھی ہو تو وہ خود کسان کے اغراض کے لیے ناپسندیدہ و نامناسب ہے۔ صرف عاقبت اندیش کسان ان سہولتوں سے فائدہ اٹھائے گا جو چھوٹی قسطوں میں اس کے قرضے کی ادائی کے لیے مہیا کی جائیں گی۔ تاوقتیکہ وہ ہر جہتی کفایت شعاری اختیار نہ کرے، خاص کر تقاریب اور رسوم کی غرض سے غیر نفع بخش قرضہ لینا ترک نہ کرے، اور اپنی آمدنی میں اضافے کی کوشش نہ کرے، پرانے قرضوں کا بار سر سے پوری طرح دور کرنے کے توقعات کچھ بہت زیادہ روشن نظر نہیں آتے۔ کسان کو اس قابل بنانے کی غرض سے کہ وہ اپنی کمانے کی قابلیت کو ترقی دے یہ ضروری ہے کہ معاشی منصوبوں اور دیہات سدھار کی ایک جامع اسکیم مرتب کی جائے۔

۴۲۔ تجارتی زمین گروی بنک۔ بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی یہ سفارش کرتی ہے کہ ہندوستان میں مشترک سرمایئے کے تجارتی زمین گروی بنک ان زمینداروں کی جماعت کثیر کے فائدے کے لیے

369

قائم کرنے چاہییں جو قرضۂ امداد باہمی کے نظامات سے کافی مدد حاصل نہیں کرسکتے۔ مقامی حکومتیں ان بنکوں کے ابتدائی اصل کا ایک جزو مہیا کرکے اور ان کے جاری کئے ہوئے ڈبنچروں کے سود کی ضمانت دے کر ان بنکوں کی مدد کرسکتی ہیں۔ ایسے زمین گروی اداروں کی ضرورت ان صوبوں میں خاص طور پر محسوس کی جاتی ہے جہاں دوامی بندوبست کا طریقہ رائج ہے۔ ان بنکوں کو چاہئے کہ زمینداروں کے طبقے کے قرضوں کو بے باق کریں اور ان کی طویل مدت کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے مالی مدد دیں[1]۔

---

[1] دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ (۲۳۲ و ۲۳۴)۔

حکومت اور زراعت سے اس کا تعلق

۱۔ محکمہ جات زراعت کا ارتقا

ایک طرف تو یہ سوال بحث مباحثے کا مرکز بنا رہا ہے کہ آیا حکومت کو ملک کی صنعتی ترقی میں سرگرم عملی مدد دینی چاہیئے یا نہیں، اور دینی چاہیے تو کس حد تک، لیکن دوسری جانب بہت زمانے قبل حکومت نے یہ بات قطعی طور پر تسلیم کر لی تھی کہ اس کا کسان اور زرعی طریق کی اصلاح و ترقی میں دلچسپی لینا ضروری تھا[1] زراعت کو ایک خاص سرکاری محکمے کے ذریعے سے اصلاح و ترقی دینے کا خیال سب سے اول ۱۸۶۶ء کے قحط اوڑیسہ کے سلسلے میں زیر بحث آیا۔ اس کے بعد لارڈ میو کی حکومت کی توجہ اس پر مبذول ہوئی لیکن اس نے عملی جامہ ۱۸۸۰ء کے قحط کمیشن کی سفارشوں کے نتیجے کے طور پر ۱۸۸۱ء میں پہنا، اور لنکاشائر کی سوتی کپڑے کی صنعت کی نیابت و وکالت کو بھی اس میں دخل

[1] اس معاملے میں تفصیلی معلومات کے لیے دیکھو ہے' کمک کیتا کی مولہٰ بالا تصنیف؛ نیز زرعی کمیشن کی رپورٹ فقرہ ۱۵ یا ۲۰ -

باب ۱۱

تھا جس کی ہندوستان کے لانبے ریشے کی روئی کی ترقی میں دلچسپی کا سبب بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے۔ غرض مختلف صوبوں میں زراعت کے محکمے نظما، نائبان نظما، متعلموں اور ناظروں کے زیرنگرانی قائم کیے گئے۔ اگرچہ ابتداءً زرعی تحقیق، امداد، قحط، اور اراضی کی اصلاح و ترقی کے متعلق کام کرنے کا خیال تھا، لیکن چند اعداد و شمار کی فراہمی و ترتیب کے سوا دوسرا کوئی کام انجام نہیں پایا۔ بدقسمتی سے ان محکموں کو ایسے گوناگوں کاموں سے لاد دیا گیا جو ان کے متعلق نہ تھے، مثلاً کاشتکاروں کے حقوق اراضی اور کھیتوں کی حفاظت، اور اراضی کی رجسٹری کی نگرانی۔ ان کی راہ میں مزید مشکلات یہ تھیں کہ انھیں بہت ہی قلیل رقمی منظوریاں دی گئی تھیں۔ ۱۸۸۹ء میں ڈاکٹر ویلکر کی آمد کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔[1] انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہندوستانی زراعت اس قدر پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ حالت میں نہ تھی جتنی کہ عام طور پر بیان کی جاتی تھی، لیکن یہ کہ موجودہ زمانے کے طریق کاشت کے نقطۂ نظر سے اس کا ساز و سامان ناقص تھا، لہٰذا انھوں نے زرعی تعلیم اور اصلاح و ترقی کی اہمیت پر بہت زور دیا۔ اس دوران میں محکمے مالیہ کی اصلاح اس طرح ہوئی کہ تیج کیس ایک امریکی نووارد اور سر ڈیوڈ سیسون نے فیاضانہ عطیے دیے۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں ایک صدر مہتمم زراعت (انسپکٹر جنرل) کا تقرر مرکزی و صوبہ داری حکومتوں کو مشورہ دینے کی غرض سے عمل میں آیا۔ اس تقرر کی بنا پر مرکزی محکمہ زراعت کو پہلی دفعہ ایسے صدر کی خدمات حاصل ہوئیں جو زرعی معاملات میں مہارت رکھتا تھا۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں اس عہدے کو توڑ دیا گیا اور اس کے فرائض ناظم ادارۂ تحقیقات زرعی پوسا کے تفویض کیے گئے، جو حال حال تک (سنہ ۱۹۲۹ء) حکومت ہند کا زرعی مشیر تھا۔ پوسا کا ادارہ زرعی سنہ ۱۹۰۳ء میں قائم ہوا اور اس کے ساتھ اعلیٰ تعلیم و تربیت اور مخصوص و مختصر عملی اسباق دینے کے لیے ایک کالج بھی ملحق کیا گیا۔ لارڈ کرزن کی ان تھک مساعی و سرگرمی کی بدولت سنہ ۱۹۰۵ء میں محکموں کے انتظام میں بہت کچھ اصلاح و ترقی ہوگئی، انھیں زائد کام سے جو ان کے سر منڈھ دیا گیا تھا سبکدوش کر دیا گیا، اور زرعی تجربوں، تحقیقات، مظاہرے اور تعلیم و تربیت کی ترقی کے لیے زیادہ رقمیں الگ رکھی جانے لگیں۔ پونا کا زراعتی کالج سنہ ۱۹۰۸ء میں کھلا، اور اس کے ساتھ ایک تحقیقاتی درسگاہ ملحق کی گئی تا کہ [illegible] کا قائم شدہ سائنس کالج پونا کی متعلقہ جماعت ہائے زراعت میں طلبہ کی کثرت کو کم کیا جائے۔ متعاقب سالوں میں اسی

871

[1] دیکھیے صفحہ ۲۴۳

باب ۱۱

قسم کے کالج کانپور، ناگپور، لیال پور، کوئمبتور اور مانڈلے میں قائم کئے گئے۔
کچھ سال ادھر سے خاصکر آب پاشی کے لیے زرعی کلوں کے رواج کی سریع ترقی و توسیع کے نتیجے کے طور پر زرعی انجنیر مقرر کئے گئے ہیں، تاکہ کسانوں کو مشورہ دیں اور ضروری کلوں کی تنصیب کا انتظام کریں۔ آخر میں یہ کہ ۱۹۰۵ء میں ایک کل ہند محکمۂ زراعت (بورڈ آف اگریکلچر) قائم کیا گیا جس کا مقصد صوبہ واری محکموں میں زیادہ گہرا ارتباط پیدا کرنا، اپنے سالانہ جلسوں میں زرعی کام کے نظام العمل پر بحث کرنا اور حکومت ہند کے پاس سفارشیں پیش کرنا تھا۔ اصلاحات کے نتیجے کے طور پر صوبہ واری محکموں پر حکومت ہند کی مرکزی نگرانی بڑی حد تک کم ہو گئی ہے اور ۱۹۲۱ء سے زراعت ایک وزیر کے تحت شعبۂ مفوضہ ہو گئی ہے۔ موجودہ زمانے میں مرکزی محکمۂ زراعت کا اہم ترین کام صرف کل ہند اہمیت کے زرعی مسائل کے متعلق ہے اور اس کے زیر انتظام حسب ذیل ادارے قائم ہیں:۔ (۱) زرعی تحقیقاتی ادارہ پوسا؛ (۲) امپیریل انسٹی ٹیوٹ آف ویٹری نری (علاج حیوانات) ریسرچ مکتیسر؛ (۳) امپیریل انسٹی ٹیوٹس آف اینمل ہس بینڈری (ادارۂ پرورش حیوانات زرعی) اینڈ ڈیری اِنگ (شیر سازی)، واقع بنگلور و ویلنگٹن؛ (۴) مزرعۂ افزائش نسل مویشیاں، کرنال؛ (۵) مکھن سازی کا کارخانہ واقع انند (۶) شاہی مزرعۂ نیشکر، کوئمبتور؛ اور (۷) کارخانۂ شکر سازی پوسا۔ موخر الذکر کارخانے کو حال میں (اپریل ۱۹۳۱ء) کانپور منتقل کر کے ماہر فن شکر سازی کے زیر انتظام چلایا جا رہا ہے۔ حکومت ہند کا مشیر زرعی حال حال تک ان اداروں کی انتظامی نگرانی کا ذمہ دار تھا؛ اس کے مشیرانہ فرائض، شاہی مجلس زرعی تحقیقات کے ہمہ وقتی ارکان کو منتقل کر دیے گئے ہیں۔ یہ مجلس جولائی ۱۹۲۹ء میں شاہی زرعی کمیشن کی سفارشوں کے مطابق قائم کی گئی تھی۔ اسی کمیشن کی سفارش کے مطابق شاہی ادارۂ تحقیقات زرعی پوسا اور امپیریل انسٹی ٹیوٹ آف ویٹیری نری ریسرچ مکتیسر کے لیے اب جداگانہ ناظموں کا تقرر عمل میں آیا ہے۔ اکتوبر ۱۹۲۹ء میں ڈاکٹر کلاوستن کے وظیفہ یاب ہونے پر حکومت ہند کے مشیر

372

۱؎ دیکھو اس باب کی فصل (۸)

باب ۱۱

زراعت کا عہدہ توڑ دیا گیا۔ نئی قائم شدہ شاہی مجلس زرعی تحقیقات نے زراعتی مطبوعات کی ذمہ داری بھی اپنے سر لے لی جو پہلے مشیر زراعت اور مجلس ادارۂ تحقیقات پوسا کے زیر ادارت شائع ہوتی تھیں [۱]۔ اس امر کی جانب اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اپریل ۱۹۳۴ء میں حکومت ہند کے مشیر فروخت پیداوار زرعی کی ایک جدید جائداد قائم کی گئی۔

محکمہ جات زراعت کے کام میں مدد دینے اور ان سے تعاون کرنے کی غرض سے بعض دوسری جماعتیں مثلاً مختلف ضلع واری انجمن ہائے زراعت بھی قائم کی گئی ہیں۔ چند ہی سال پیشتر بمبئی میں ضلعے اور تعلقے کے ڈیولپمنٹ بورڈ (مجالس ترقی) قائم کیے گئے ہیں جو محکمہ جات زراعت و امداد باہمی کے نمایندوں اور غیر سرکاری افراد اور دونوں محکموں کے کام میں تطابق و ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ احاطۂ بمبئی میں حکومت کی مستقبل پالسی یہ ہے کہ محکمۂ امداد باہمی اور غیر سرکاری تنظیمات دونوں کو محکمۂ زراعت کے کام کی مدد اور ترقی کے لیے استعمال کیا جائے۔ شاہی زرعی کمیشن کی رائے میں یہ طریقہ دوسرے صوبوں کے لیے بھی قابل تحقیق و غور ہے [۲]۔

۲۔ محکمہ جات زراعت کے فرائض

صوبہ واری محکمہ جات زراعت مزرعوں اور تجربہ خانوں میں تجربے اور تحقیقات کرتے ہیں اور جدید طریقوں اور ترقی یافتہ آلات کو رائج کرنے کی غرض سے مظاہرے و پروپگنڈا کرتے ہیں۔ وہ نئے اور مصنوعی کھاد کے رواج اور فصلوں کی ترقی یافتہ انواع کے خالص تخموں کی پیدائش، داشت اور تقسیم کے کاموں میں بھی دلچسپی اور عملی حصہ لیتے ہیں۔ علاوہ ازیں سرکاری مزرعوں یا کسانوں کے کھیتوں پر مظاہرے کیے جاتے ہیں۔

اہم ہندوستانی فصلوں کے تبصرے کے دوران میں ہم محکمۂ زراعت کے اس مفید کام کا ذکر کر چکے ہیں جو خاص کر گیہوں، نیشکر، مونگ پھلی، روئی، تمباکو اور چارے کی فصلوں کے بارے میں انجام دیا گیا ہے۔ دوسری اہم فصلیں جو اب محکمۂ مذکور کی توجہ کا

---

[۱] مجلس تحقیقات آجکل تین رسالے شایع کر رہی ہے: (۱) انڈین جرنل آف ویٹرنری سائنس اینڈ اینمل ہسبنڈری (۲) انڈین جرنل آف اگریکلچرل سائنس اینڈ اگریکلچر اور (۳) ہندوستانی مویشی۔

[۲] دیکھو رپورٹ فقرہ (۱۴۵)

باب ۱۱

مرکز بن رہی ہیں، سن، آلو، چاول وغیرہ ہیں۔ مندرجۂ ذیل جدول میں اہم ترقی یافتہ انواع کے زیر کاشت رقبہ (برطانوی ہند) ایکڑوں میں بتایا گیا ہے[1]

فصل	سنہ ۱۹۲۳ء تا سنہ ۱۹۲۴ء	سنہ ۱۹۲۷ء تا سنہ ۱۹۲۸ء	سنہ ۱۹۳۰ء تا سنہ ۱۹۳۱ء
روئی	۲۳۴۸۸۸۲	۳۲۷۲۶۳۸	۳۵۰۸۴۴۶
گیہوں	۱۳۹۸۸۸۵	۳۵۱۷۵۵۲	۵۳۸۲۶۷۴
چاول	۶۰۳۶۰۳	۹۵۳۲۳۶	۱۲۸۷۲۹۸
سن	۲۱۰۲۶۲	۹۸۹۱۰۵	۱۱۰۴۹۹۷
نیشکر	۵۰۶۰۴	۲۶۸۶۸۸	۱۰۶۴۴۸۲
دوسری فصلیں[2]	۴۶۷۱۴۶	۹۶۴۰۳۷	۱۱۵۰۵۹۶
میزان	۵۰۷۹۳۸۲	۹۹۶۵۲۵۶	۱۳۴۹۰۴۸۳

مندرجۂ بالا جدول سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۹۳۰ء تا سنہ ۱۹۳۱ء میں جتنا رقبہ ترقی یافتہ انواع کے زیر کاشت بتایا گیا ہے وہ سنہ ۱۹۲۳ء تا سنہ ۱۹۲۴ء کے بعد کے رقبے کے دگنے سے زائد تھا۔ یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ ان انواع کی پیدائش کا اوسط سالانہ نفع ۱۲ روپیہ فی ایکڑ مان لیا جائے تو ملک کی زراعتی فصلوں کی سالانہ آمدنی میں سنہ ۱۹۲۹ء تا سنہ ۱۹۳۰ء میں تقریباً ۱۶ کروڑ روپے کا اضافہ ہوا۔ اس اضافے کی حد تک نتیجہ بے شک قابل قدر و لائق ستائش ہے، لیکن وہ کافی اطمینان بخش نہیں ہے۔ ترقی کی ابھی اور کتنی گنجائش باقی ہے اس کا اندازہ یہ غور کرنے پر ہوگا کہ چاول کے زیر کاشت ۸۰ ملین ایکڑ کے مجموعی رقبے کے منجملہ صرف ۱/۲ ملین ایکڑ رقبے پر زیادہ پیداوار دینے والی دھان کی

[1] دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ ہندوستان کے زرعی کاروبار پر تبصرہ بابت سنہ ۱۹۲۸ء تا سنہ ۱۹۲۹ء اور سنہ ۱۹۳۰ء تا سنہ ۱۹۳۱ء

[2] اس میں حسب ذیل فصلیں شامل ہیں:۔ مونگ پھلی (۲۵۱۲۲۳)، باجرا (۲۸۹۱۱۴)، چنا (۲۲۲۲۰۳)، آلو (۱۳۲۷۵) وغیرہ بابت سنہ ۱۹۳۰ء تا سنہ ۱۹۳۱ء۔

باب

انواع کاشت ہوتی ہیں اگرچہ گیہوں، روئی اور سن کے بارے میں صورتِ حال زیادہ طمانیت بخش ہے۔ کچھ سال ادھر سے چاول اور نیشکر کے بارے میں شاہی مجلس زرعی تحقیقات کی زیرِ سرپرستی جو کام انجام پا رہا ہے اس کی بدولت چاول اور نیشکر کی ترقی یافتہ قسموں کے زیرِ کاشت رقبے میں بہت خاصا اضافہ ہوا ہے۔ روئی کی زیادہ طمانیت بخش صورتِ حال کا باعث ہندوستانی مرکزی کپاس کمیٹی کا کام ہے جو اپنا جداگانہ مالیہ رکھتی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوسری فصلوں کی ترقی کے لیے بھی اسی کے مماثل جماعتیں قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ زرعی کمیشن نے "سن" کے لیے ایسی ہی کمیٹی قائم کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ فصلوں کا خاکہ مرتب کرنے کی غرض سے ایک کل ہند کانفرنس نے ۱۹۳۴ء میں یہ سفارش کی کہ معاشی عدم تیقن کی موجودہ گڑبڑ میں یہ انتظام کرنا چاہیے کہ مخصوص و مناسب کمیٹیوں کی وساطت سے گیہوں اور چاول جیسی اہم ہندوستانی پیداوار کی کاشت کے متعلق مسائل کی باقاعدہ اور مسلسل بحث و تحقیق کا کوئی نظام قائم کیا جائے۔ اس سفارش کو حکومت نے منظور کر لیا ہے۔ یہاں ہم ایک بجا شکایت کا ذکر کر سکتے ہیں، اور وہ یہ کہ محکمۂ زراعت نے اصلاح کے متعلق جد و جہد کو اب تک صرف برآمد کی جانے والی

374

فصلوں کی حد تک مرتکز رکھا؛ اور جوار، باجرا، میوہ اور ترکاریوں جیسی غیر برآمدی فصلوں سے ایک حد تک بے اعتنائی اور غفلت برتی جو نہ صرف آبادی کی غذا کی ضرورتوں کے نقطۂ نظر سے بلکہ کسان کے نفع کے زاویۂ نگاہ سے بھی اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن آجکل شاہی مجلس زرعی تحقیقات ان میں سے بعض ضرورتوں، خاص کر میووں کی کاشت کی ترقی کی طرف دن بہ دن زیادہ توجہ دے رہی ہے۔ چنانچہ احاطۂ بمبئی میں مجلس مذکور ان حالات کی اہم تحقیقات کے لیے مالی مدد دے رہی ہے جن کے تحت اہم ہندوستانی میووں کا ذخیرہ اور نقل و حمل کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ نت نئے طریقوں اور ترقی یافتہ آلات کشاورزی کے مظاہرے۔

فصلوں کے بارے میں جو معاشی کام انجام دیا جا رہا ہے اس کے علاوہ زراعتی کیمیا، زراعتی جرثومیات[1]، نباتی امراضیات[2]، فطریات[3]

[1] (Bacteriology) [2] (Pathology) [3] (Mycology)

باب ۱۱

حشرات[1] کے بنیادی مسائل کے متعلق تحقیق و تفتیش شروع کر دی گئی ہے۔ چنانچہ اس وقت جن معاملات کی تحقیقات جاری ہے ان میں سے حسب ذیل قابل ذکر ہیں۔ زمین میں جوتنے کی ضرورت، نمکی زمینوں کی بازیافت، زمین کی رطوبت کا تحفظ، نائٹروجن کی تثبیت، مصنوعی زرعی کھاد کی تیاری، زمین میں کھاد کی تکلیح (Nitrification) قدرتی مقامی فاسفیٹ کے ذرائع سے استفادہ، گھی میں آمیزش کی شناخت، حیوانی تغذیہ (Nutrition)، نیشکر کا مرض (Mosaic disease) اور اناج کے ناس کرنے والے جانوروں کی روک تھام[2]۔

مغربی ممالک میں زرعی نمائشوں اور میلوں کے عظیم افادے اور ان کی تعلیمی قدر و قیمت اچھی طرح مانی جاتی ہے، اور ان پر کثیر رقوم صرف کرنے کو نہایت مفید شغل اصل تصور کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کو میعادی نمائشیں منعقد کرنے کی اہمیت کا احساس بہت ہی حال کے زمانے میں ہوا ہے۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۲۶ء میں بمقام پونا احاطۂ بمبئی کی پہلی زرعی نمائش منعقد ہوئی اور یہ ایشیا کی سب سے بڑی نمائش تھی۔ اس نمائش کو دیکھنے والوں کی تعداد ایک لاکھ ۸۵ ہزار سے زائد تھی جن میں سے قریب ۹۰ فیصد کسان تھے۔ نمائش کے سب سے زیادہ جاذب توجہ اور اہم ترین حصے "اصلاح و ترقی اراضی" "آب رسانی" "کلوں" "مویشی اور مرغبانی" "دیہی حرفتوں" اور "امداد باہمی" پر مشتمل تھے۔ یہ طے کیا گیا کہ اس قسم کی نمائشیں احاطۂ بمبئی کے مختلف مرکزوں میں ہر سال قائم کی جائیں، اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ بعض دوسرے صوبے بھی اسی کے مماثل نمائشیں قائم کرنے کے متعلق غور کر رہے ہیں۔ پونا کی نمائش کی طرح کی بڑی نمائشیں تا حد امکان جلد جلد منعقد کرنے کے علاوہ ہر ڈویژن، ضلع، اور تعلقے میں بھی چھوٹے پیمانے پر نمائشوں کا انتظام کرنا چاہیے تاکہ مقامی حالات و ضروریات کے اختلافات کا پوری طرح لحاظ رکھا جا سکے اور نمائشوں کے سبقوں کو ملک کے طول و عرض میں

---

[1] (Entomology)

[2] دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ ہندوستان کے زرعی کاروبار پر تبصرہ بابت ۲۷-۱۹۲۶ تا ۲۹-۱۹۲۸ء، ص ۴۸

باب 373

پہنچایا جاسکے۔

اس طرح محکمہ جات زراعت مختلف سمتوں میں مفید کام کر رہے ہیں اور ان کے تجربے اور معلومات میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے لیکن زرعی اصلاح و ترقی کی رفتار بہت سست رہی ہے۔ اس کو ایک حد تک سرکاری ضابطہ پرستی سے منسوب کیا جاسکتا ہے، اور کسی دوسرے محکمے سے زیادہ محکمۂ زراعت کو اسے بالائے طاق رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ پھر بھی دوسرے اہم اسباب یہ ہیں: کسان کو جتنے اصل پر دسترس حاصل ہے وہ تھوڑا اور غیر یقینی ہے؛ آب پاشی کی سہولتیں ناکافی ہیں اور عوام عام طور پر جاہل اور قدامت پرست واقع ہوئے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ محکمۂ زراعت کے لیے جو مالی موازنہ منظور کیا گیا ہے اس کی مقدار بہت تھوڑی ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۳۴ء میں مرکزی اور صوبہ داری محکمہ جات زراعت کے خاص مصارف کی مقدار کم و بیش صرف ۲۴۴½ لاکھ روپیہ تھی جس کے معنی یہ ہوئے کہ ملک کی سب سے بڑی اور بنیادی صنعت کی ترقی پر ملک کی آمدنی کا نہایت ہی قلیل جزو خرچ کیا جاتا ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ اپنے وفاقی و ریاستی محکمہ جات زراعت پر ہندوستان کے مقابلے میں تقریباً گیارہ گونہ زیادہ خرچ کرتے ہیں، پھر بھی وہاں کی آبادی کا صرف ۲۰ فیصد حصہ کھیتی باڑی کرتا ہے۔ جاپان کی مثال لیجیے جس کی آبادی صرف ۵ کروڑ ۹ لاکھ نفوس ہے؛ وہ بھی زرعی اصلاح و ترقی پر ہندوستان کے مقابلے میں ۵ گونہ زیادہ رقم خرچ کرتا ہے[1]۔ موازنے کی حالیہ اصلاح و ترقی اور موجودہ وائسرائے (لارڈ لنلتھگو) کی زرعی معاملات میں عملی دلچسپی نے محکمہ جات زراعت کے حق میں بہت بڑے محرک کا کام کیا ہے اور وہ غیر معمولی سرگرمی دکھا رہے ہیں۔

۴۔ سرکاری امداد کی دوسری مدیں۔

سرکاری امداد کی دوسری مدوں پر مختصر تبصرہ کرنا مناسب ہوگا۔

(۱) اراضی کے متعلق پالیسی۔ اس سلسلے میں قابل توجہ نمایاں خصوصیات کسانوں کو زمین کے بارے میں عطا کردہ حقوق کا تحفظ اور خاص موضوعہ قوانین کے ذریعے سے زمینداری علاقوں میں اسامیوں کی تامین

[1] دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ ہندوستان کی زرعی کاروبار پر تبصرہ صفحہ ۱۰۳ تا صفحہ ۱۰۴ ۔

ہیں۔ حکومت کی طرف سے کسان کو جو دوسرے حقوق دیے گئے ہیں ان کے منجملہ ایک آزادی انتقال کا حق ہے، جو، جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، کلیتہً بے ضرر یا خالصتاً مفید ثابت نہیں ہوا ہے۔ رہی مالگزاری کی پالیسی تو اس پر ایک جداگانہ باب میں بحث کی جائے گی۔ حکومتی امداد مثلاً کارہائے آب پاشی کی حکومت کی طرف سے تعمیر اور کسان کو اپنے طور پر مستقل اصلاح و ترقی میں حصہ لینے کے قابل بنانے کے لیے تقاوی قرضوں کی منظوری، وغیرہ کا ذکر اوپر آ چکا ہے[1]۔

(۲) محصول کرورگیری۔ انتظام محصول کے ایک رُخ یعنی اشیائے خوردنی، اشیائے خام اور کھاد کے محصول برآمد پر بحث کی جا چکی ہے اور اس سلسلے میں یہ بھی کافی واضح کیا جا چکا ہے کہ مختلف تجاویز کا زرعی خوش حالی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ رہا محصول درآمد تو اس مسئلے نے ہندوستانی بازاروں میں آسٹریلیائی گیہوں کے مقابلے کے باعث حال میں کسی حد تک اہمیت حاصل کر لی ہے۔ چنانچہ ہم قانون محصول درآمد گندم بابت ۱۹۳۱ء کا ذکر کر چکے ہیں جس کی بعد کے سالوں میں تجدید کی گئی اور جس کا مقصد ہندوستان کے گیہوں بونے والے کی مدد کرنا ہے۔ اس سے زیادہ اہم مثال ہندوستانی شکر کی صنعت کی ہے جس کو اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ صاف شکر بنانے کی صنعت اتنی کافی قومی اہمیت رکھتی ہے کہ اس کے مدنظر ٹیرف بورڈ کی سفارش کے مطابق حال میں (۱۹۳۲ء میں) عائد کردہ تامینی محصول درآمد حق بجانب قرار پاتا ہے۔ ۱۹۳۵ء میں ارزاں قسم کی کنگنی کی درآمد پر محصول عائد کر کے بھی ہندوستانی کسان کی حفاظت کرنی پڑی۔

حکومت نے قرضہ، ساز و سامان پیدائش، امداد باہمی اور انتظام فروخت کے بارے میں جو کچھ کام کیا ہے اس پر گزشتہ بابوں میں مفصل بحث کی جا چکی ہے۔

(۳) تعلیم۔ زرعی مہارت و کارکردگی پر اثر انداز ہونے والی دیہی تعلیم کے مسئلے کو متاثر کرنے والے عام اصول پہلے بیان کیے جا چکے ہیں۔ اب اس کا مختصر حال بیان کرنا باقی رہ جاتا ہے کہ سرکار نے تعلیم کا انتظام کیا کیا ہے[2]۔

[1] نیز دیکھو جی کیٹنگ کی کتاب موسوم بہ "بمبئی دکن میں دیہی معیشت" باب ۱۲۔

[2] ہندوستان میں دیہی تعلیم کا جو طریق رائج ہے اس کے مفصل بیان کے لیے دیکھو (۱) زرعی کمیشن کی

باب ۱۱

(۱) زرعی کالج۔ بردست مختلف صوبوں میں بمقام پونا، کوئمبتور، ناگپور، کانپور لیال پور اور رانڈلے جیسے کالج قائم ہیں۔ ان کے قائم کرنے کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ محکمہ جات زراعت کے لیے مستقبل میں تربیت یافتہ عملہ مہیا کیا جائے اور دوسرے یہ کہ ان لوگوں کو جدید طریقوں کی تعلیم و تربیت دی جائے جو زمینداروں یا اُن کے کاشتوں کی حیثیت سے واقعی طور پر زراعت میں مصروف ہوں یا مصروف ہونا چاہتے ہوں۔ علاوہ ازیں یہ کالج، سائنٹفک زرعی تحقیقات کے صوبہ داری مرکز بھی ہیں۔ ان کالجوں میں مکمل ڈگری کے نصابوں کے علاوہ زراعت کے سرٹیفیکیٹ یا ڈپلوما کے لیے ایک یا دو سال کے مختصر نصاب کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ یہ نصاب عملی کاشت کاروں کے لیے مقرر کئے گئے ہیں لیکن ضمناً وہ ایسی تربیت گاہ بھی مہیا کرتے ہیں جو تحتانی زراعتی ملازمتوں میں بھرتی کے لیے امیدوار تیار کرتی ہے۔ زرعی کمیشن نے یہ سفارش کی ہے کہ بمقام پوسا پوسٹ گریجوئٹ تعلیم و تربیت کا انتظام ان امیدواروں کے لیے کیا جائے جو اعلیٰ زراعتی عہدوں میں داخلے کے خواہاں ہوں۔ کمیشن اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ کالجوں کے نصاب میں زرعی معاشیات کو بہت زیادہ اہمیت دی جائے۔ زرعی گریجوئیٹوں کو کاشت کاری اختیار کرنے کی ترغیب دینے کی غرض سے حکومت پنجاب ایسا طریقہ رائج کرنے کے مسئلے پر غور کر رہی ہے جس کی رُو سے انھیں سرکاری مدد سے آسان شرائط پر کھیت پٹے پر دیے جائیں۔

877

(ب) زرعی وسطانی مدرسے۔ زرعی پیشہ ورانہ وسطانی مدارس قائم کرنے کا مقصد کسانوں کے بچوں کو مخصوص تربیت دینا ہے۔ چنانچہ بمبئی میں بردست ایسے دو مدارس قائم ہیں، ایک دھولیا میں اور دوسرا دیوی ہوسر دھارواڑ ضلع میں۔ بمبئی میں اس قسم کا پہلا مدرسہ سنہ ۱۹۱ء میں کھولا گیا۔ زرعی وسطانی مدارس یو پی میں توفنی یا حرفتی

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ رپورٹ (روئداد شہادت) جلد اول، صفحہ ۱۰۲ تا صفحہ ۱۱۱؛ جے اے ریچی کمشنر تعلیمات حکومت ہند کی یادداشت؛ (۲) رپورٹ باب ۱۰؛ (۳) ایک رپورٹ موسوم بہ ہندوستان کے زرعی کاروبار پر تبصرہ بابت سنہ ۱۹۳۰ء تا سنہ ۱۹۳۱ء باب ۹؛ (۴) ایک رپورٹ موسوم بہ ہندوستان سنہ ۱۹۳۰ء تا سنہ ۱۹۳۱ء میں صفحہ ۲۰۲ تا صفحہ ۲۰۴۔

باب

مدارس ہیں جن میں زراعت کی عملی تعلیم دی جاتی ہے اور طلبار کا داخلہ عام تعلیمی نصاب ختم کرنے کے بعد تقریباً تیرہ سال کی عمر میں ہوتا ہے۔ ان مدارس میں دیسی زبانوں کے ذریعے سے تعلیم دی جاتی ہے۔ اصل مقصد یہ ہے کہ طلبا کو تعلیم پانے کے بعد ان کی زمین پر واپس بھیجا جائے، تاکہ وہ اس پر بہتر طریقے پہ کاشت کرنے کی غرض سے اپنی معلومات کو کام میں لائیں؛ لیکن یہ خوف کیا جاتا ہے کہ یہ مقصد عام طور پر پورا نہیں ہو رہا ہے۔ یہی شکایت کی جاتی ہے کہ ان مدارس میں کسان کسی قابل لحاظ اشتیاق کے ساتھ اپنے بچوں کو داخل نہیں کراتے، مدارس میں تعلیمی مصارف بہت زیادہ ہیں، مدارس تعلیمی نظام کا قدرتی نشو ونما نہیں ہیں بلکہ اس کا نمایشی و مصنوعی ضمیمہ ہیں؛ اگرچہ بمبئی اس بات کا مدعی ہے کہ یہ مدارس کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔ رزمی صاحب کہتے ہیں کہ "بظاہر زراعتی وسطانی مدارس کا مستقبل اس وقت تک شاندار نہیں ہو سکتا جب تک کہ والدین میں زراعت کا معیار، بظاہر ہے اور محکمۂ زراعت کے کام کی بدولت اس قدر بلند نہ ہو جائے کہ زرعی تعلیم کی اہمیت تسلیم کی جانے لگے"۔ زرعی کاروبار، آج کل جس طرح انجام پا رہا ہے، ایک ذہین اور ہونہار لڑکے کے لیے بہت کم جاذبیت رکھتا ہے اس لیے کہ اس کی بلند حوصلگی و اولوالعزمی اس کی توجہ دوسرے مشاغل کی جانب پھیر دیتی ہے اور وہ زرعی وسطانی مدرسے کے بند کوچے میں خود کو پھنسانا نہیں چاہتا۔

(ج) "زراعت" کا بحیثیت مضمون عام نصاب میں شریک کیا جانا۔ زراعت کی عملی تعلیم ابتدائی مدارس میں نہیں دی جاتی بلکہ صرف معمولی مطالعۂ قدرت کے اہتمام پر اکتفا کیا جاتا ہے جس کا مقصد دیہی زندگی کی موافقت میں میلان پیدا کرنا ہے۔ زرعی میلان پیدا کرنے والے مدارس، تعلیمی نظام کو دیہی برادری کی ضرورتوں کے مطابق بنانے میں روز بہ روز اہم قدم تصور کیے جا رہے ہیں؛ اور پنجاب اور صوبۂ متحدہ میں اس امر کی نگرانی کے لیے کہ آیا اساتذہ کو مناسب تربیت دی جا رہی ہے یا نہیں قطعی معین تدابیر اختیار کی گئی ہیں۔ اسی طرح احاطۂ بمبئی میں بھی اکثر مدارس میں زرعی میلان پیدا کرنے والی جماعتیں حال ہی میں کھولی گئی ہیں اور بیان کیا جاتا ہے کہ طلبا کی بڑی تعداد نے اپنے متعلقہ دیہات میں زراعت شروع کر دی ہے[1]۔

---

[1] دیکھو احاطۂ بمبئی کے محکمۂ زراعت کی سالانہ رپورٹ برائے ۱۹۲۴ء تا ۱۹۲۵ء صفحہ ۲۳۔

پنجاب نے دوسرے صوبوں کی طرح زرعی وسطانی مدارس کھولنے کے بجائے معمولی وسطانی مدرسوں میں (جن میں دیسی زبان ذریعۂ تعلیم ہے) عملی زراعت کی تعلیم کا طریقہ رائج کیا گیا ہے، تاکہ "زراعت" کا مضمون لینے والے طلبہ کو، اگر وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہیں تو کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ مدارس سے مزرعے ملحق کئے گئے ہیں جہاں زراعت سکھائی جاتی ہے اور یہ عام طور پر بہت بڑی حد تک کامیاب ثابت ہوئے ہیں، چنانچہ اس کا قرینہ ہے کہ دوسرے صوبے بھی اس کل تجویز کو اختیار کرلیں۔ زرعی کمیشن، بمبئی کے نمونے کے مدارس کی زیادہ تر اس بنیاد پر سخت مخالفت کرتا ہے کہ ان کے مصارف غیر متناسب طور سے کثیر ہیں اور پنجاب کے طرز کو نہایت شد ومد کے ساتھ مرجح قرار دیتا ہے، اس لیے کہ وہ دیہی علاقوں میں وسطانی مدارس کی تعلیم کو ماحول کے مطابق بنانے کے مسئلے کا تحقیقی حل پیش کرتا ہے۔ کمیشن مذکور یہ توقع رکھتا ہے کہ یہ مدارس ترقی کرکے دیہی بیداری کے مرکز بن جائیں گے۔ دیہی علاقوں کے فوقانی مدارس کی حد تک کمیشن یہ سفارش کرتا ہے کہ ان مدارس میں زراعت کے موجودہ مضامین میں اعلیٰ نصاب تعلیم کا بھی اضافہ کیا جائے۔[1]

مندرجۂ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ گو حکومت نے اس ملک کی زرعی ترقی کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کیا ہے، پھر بھی وہ ابھی اور بہت کچھ کرسکتی ہے۔ تعلیم یافتہ طبقہ بھی ابھی تک اس امر سے آگاہ نہیں ہوا ہے کہ ہندوستان میں زراعت کی عظیم اہمیت کی قدردانی کس طرح کی جائے۔ قومی کارکنوں نے اپنی توجہ کو ابھی تک صرف شہروں اور ان کے مسائل تک تقریباً محدود کر رکھا ہے۔ پسماندہ دیہی علاقوں میں سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی جیسی بعض انجمنوں نے جو کام شروع کیا ہے وہ امید افزا ہے، لیکن اس کو بڑے پیمانے پر کرنے کی ضرورت ہے۔ پالیسی کے تسلسل کو یقینی بنانے اور طویل مدت تک اس پر استقلال کے ساتھ عمل کرنے کے مدنظر انفرادی کوشش پر منظم انجمنوں کے ذریعے سے کام کرنے کو ترجیح دینا چاہیے۔[2] ہندوستان کی اکثر جامعوں نے زرعی معاشیات کے مضمون کو نصاب میں رکھنے سے اب تک بے اعتنائی برتی۔ لیکن اس کی ایک وجہ منجملہ

[1] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ، فقرہ ۴۲۵۔

باب

دوسرے وجوہ کے غالباً یہ ہے کہ سیاسی طور پر ہمارا تعلق انگلستان سے ہے جو زیادہ تر صنعتی ملک ہے؛ اور دوسری وجہ یہ کہ ہالینڈ اور ڈنمارک جیسے یورپ کے ترقی پذیر زرعی ممالک سے ہم بے تعلق اور ناواقف ہیں۔ اس کی اصلاح ایک حد تک اس طرح ممکن ہے کہ ہر جامعہ میں ایک خاص شعبہ کھولا جائے جس میں زراعت سے متعلق غیر ملکوں کی تصانیف کا انگریزی اور اردو میں ترجمہ کیا جائے۔ زرعی کمیشن یہ بتلاتا ہے کہ یونیورسٹیاں اپنے آپ کو دو سمتوں میں مفید بنا سکتی ہیں:- ایک تو فنی معاملات کے بارے میں جیسے معاشری معاملات کی معاشی تحقیق؛ اور دوسرے دیہی برادریوں میں رہنمائی اور خدمت کے جذبات ابھارنے میں"[1]

دیہات سدھار- گڑگاؤں کا تجربہ

جیساکہ زرعی کمیشن بجا طور پر کہتا ہے "زراعت میں کوئی بڑی اصلاح و ترقی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ کسان میں معیار زندگی کو بہتر بنانے کا ارادہ اور اعلیٰ دماغی قابلیت اور جسمانی صحت حاصل کرنے اور ان سہولتوں سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت نہ پیدا ہو جو سائنس، مفید و زیرک قوانین، اور عمدہ نظم و نسق اس کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ خوشحالی پیدا کرنے والی کاشت کے سب عاملین میں اہم ترین خود کسان کا مطمح نظر اور تصور زندگی ہے۔ دیہات کے عام حالات کی اصلاح کی ارادی اور متحدہ کوشش ہی زندگی کا معیار بلند کرنے کے حق میں محرک کا کام کر سکتی ہے، اور اس معاملے میں ابتدا کرنے کی ذمہ داری حکومت کے سر عائد ہوتی ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ان سب محکموں کی جانب سے ایک منظم اور مستقل کوشش کی جائے جن کی جد و جہد کا تعلق دیہی آبادی کی زندگی اور ماحول سے ہو۔ عوام کی ہمدردی، دلچسپی اور عملی تائید بھی ضروری ہے۔ دہقانوں کے رہنماؤں کی تمام تر توجہ دہقانوں کو یہ مشورہ دینے میں صرف ہونی چاہیے کہ وہ متحدہ عمل کے ذریعے سے کس طرح دیہات میں اپنے آرام و آسایش کا سامان بڑھا سکتے ہیں۔ لیکن کسان کو گاؤں اور اس کے ماحول کی اصلاح و ترقی کے لیے متحدہ عمل کے قدیم روایات کی تجدید کی طرف مائل کرنے کی غرض سے روشن خیال رہنمائی ضروری

879

[1] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ، فقرہ ۴۲۶۔

باب

اس کو مہیا کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ دیہات کی اصلاح و ترقی کے خیالات ہزاروں دیہی عہدہ داروں مثلاً پٹیل پٹواری وغیرہ میں ابھارے جائیں۔ ایک اور حل "دیہی رہنماؤں کا طریقہ" ہے جو ایف ایل برین[1] نے پنجاب کے ضلع گڑگاؤں میں رائج کیا ہے۔ "کسانوں کے لڑکوں کو ایک خاص نصاب تربیت کی تکمیل کرنی پڑتی ہے جو ان میں باہمی فائدے کے لیے جماعتی محنت کے وقار کا احساس پیدا کرنے کے علاوہ ان کو حفظ صحت، ابتدائی طبی امداد، زرعی اصلاح و ترقی اور امداد باہمی کے اصول سے واقف کرنے اور سادہ گھریلو صنعتوں اور حرفتوں کے کچھ معلومات مہیا کرنے کا کام انجام دیتا ہے، تاکہ ہر آدمی جب اس کی تربیت کا زمانہ ختم ہو تو، وہ ان دیہات کے حلقے میں جہاں وہ متعین کیا جائے "رہنما، معلم اخلاق، اور ہمدرد ہمسایہ کی حیثیت سے کام کرسکے۔ مقصد یہ ہے کہ فنی معاملات میں اس کی معلومات اس کو اس قابل بنادے کہ وہ دیہاتیوں کو خود مشورہ دینے کے بجائے ان کی رہنمائی اس مقام تک کرسکے جہاں ان کو یہ مشورہ مل سکے۔" خیال یہ ہے کہ کسانوں کے لیے اس میں زیادہ سہولت ہوگی کہ ان کی خبر گیری و خدمت پیچیدگیاں پیدا کرنے والی کئی ایجنسیوں کے ذریعے سے کرنے کے بجائے کوئی ایک معتبر آدمی کرے۔ وہ ایسے توسط کا کام دے گا جس کے ذریعے سے مختلف شعبوں کے ماہروں کا مشورہ دہقانوں کو مل سکے گا۔

لیکن دیہی رہنماؤں کو نئے نئے خیالات کے محرک کی ہمیشہ ضرورت ہوگی اور ان رہنماؤں کو کاہلی میں مبتلا ہونے سے بچانے کے لیے ان کے کام کی ہمت افزائی اور قدردانی کرنی پڑے گی۔ اس لحاظ سے گڑگاؤں کے سدھار کی تجویز "ایک طاقتور مرکزی قوت محرکہ مہیا کرنے کی سعی ہے جو جوش و ولولے کی ہمت افزائی کرے گی، رفاہ عام کے میلان کو نشوونما دے گی اور عملی کارکنوں کو دیہی زندگی کی اصلاح و ترقی کی موافقت میں

---

[1] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ، فقرہ ۳۲۴۔ مسٹر برین اپنی حسب ذیل کتابوں میں گڑگاؤں کے تجربے کا ذکر کرتے ہیں اور دیہات سدھار کے متعلق اپنے طریقوں کو بیان کرتے ہیں:-

(۱) **The Re-making of Village India.**

(۲) **Socrates in an Indian Village**

(۳) **Socrates persists in India.**

باب
380

اپنی مہم جاری رکھنے کے لیے مناسب مدد بہم پہنچائے گی۔ یہ تجویز حکومت کے ہر اُس شعبے کے کام کو محیط ہے جو دیہی علاقوں میں مصروف کار ہے؛ وہ ایک مجوزہ منظم پروپگنڈا کی مہم کے ذریعے سے ماہروں کے مشورے سے قطعی طور پر اختیار کیے جانے میں مدد دینی ہے؛ اس کی کامیابی کا انحصار صرف اس بات پر ہوتا ہے کہ اس تحریک میں ہر اُس شخص کو شریک کرے جو مدد کرنے پر راضی اور اس کی قابلیت رکھتا ہو خواہ وہ سرکاری ہو یا غیر سرکاری؛ بلکہ تلاش کر کے ایسے لوگوں کو شریک کرے جن کی خوش حالی اور فلاح مقصود ہے۔ تقریر، نظم، ڈراما، طلسمی فانوس، سینما اور مکبر الصوت سے بھی تا حد امکان اس طرح کام لیا جاتا ہے کہ لوگوں کو اس بات کے محسوس کرنے کی ترغیب ہو کہ وہ اپنی ناپسندیدہ و قابل افسوس حالت کے زیادہ تر خود ہی ذمہ دار ہیں۔

مسٹر ڈارلنگ آئی سی ایس کو اپنی کتاب موسوم بہ (Rusticus Loquitur) میں مسٹر برین کے گڑگاؤں کے کام پر تبصرے اور تنقید کا موقع ملا، گو ان کی تنقید کا رنگ ہمدردانہ ہے لیکن وہ حقیقت میں بالکل تخریبی ہے[1]۔ گڑگاؤں کے تجربے میں اس لحاظ سے ندرت تھی کہ ہندوستان کے کسی حصے میں دیہات کی اصلاح و ترقی کے لیے پروپگنڈا اس قدر شد و مد کے پیمانہ اور وسیع رقبے پر نہیں کیا گیا تھا اور اس کے ساتھ سرکاری اقتدار سے کبھی اس سے قبل اتنے مکمل طریقے پر کام نہیں لیا گیا تھا۔ دیہی فلاح کے کاموں میں دلچسپی لینے والے مبصرین کی مشتاق نظریں اس تجربے پر لگی رہیں اور یہ توقع کی گئی تھی کہ دوسرے مقامات پر اسی کے مماثل جد و جہد کے لیے وہ ایک بیش بہا جیتی جاگتی مثال ثابت ہوگا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بدقسمتی سے اس تجربے کو ویسی کامیابی نصیب نہیں ہوئی جیسی کہ اس کے بانی مبانی کو توقع تھی۔ اس کی ناکامی کا ایک اہم سبب یہ تھا کہ باوجود اس کے اصلاح و ترقی کا کل نظام العمل برداشتہ خاطر نیلی تربیت پذیر دہقانی پر عائد کر دیا گیا تھا لیکن اس کے کل تفصیلات پر پوری احتیاط کے ساتھ پہلے سے غور نہیں کر لیا گیا تھا۔ چنانچہ مسٹر برین کے مشورے کے مطابق

---

[1] دیکھو ایم ایل ڈارلنگ کی کتاب موسوم بہ (Rusticus Loquitur) جلد ۱۲۱ تا ۱۲۸ و ۱۵۵ تا ۱۵۹
نیز دیکھو ڈی ایچ سپنسر ہیچ کی کتاب موسوم بہ (Up from Poverty) باب (۲) اور تعلیقات

مجلس ضلع نے ۶۰۰ سے زائد حصار کے بیل مقامی نسل کی اصلاح و ترقی کے لیے خریدے۔ ان جانوروں پر دو لاکھ روپیہ صرف ہو گیا لیکن اس کے باوجود وہ غیر اطمینان بخش پائے گئے، اس لیے کہ وہ "اپنے کام میں سست تھے اور وہاں کی کمی گایوں کے لیے ضرورت سے زیادہ بڑے اور بوجھل ثابت ہوئے"۔ اس تدبیر نے اور مسٹر برین کی مہم فلاح کے سلسلے میں مجلس کی اختیار کردہ دوسری کارروائیوں نے مجلس کو کلیتہً دیوالیہ بنا دیا۔ علاوہ ازیں دیہی مشیر، جن سے یہ توقع تھی کہ وہ دہقانوں کو بطور رہنما اور مشیر کے مدد دیں گے، ان کا انتخاب جلد بازانہ ہوا، وہ ناکافی تربیت یافتہ تھے اور ان پر نگرانی غیر تسکین تھی۔ مزید براں چونکہ مشیر کم سن اور جاہل تھے اس لیے وہ دہقانوں پر اپنا کوئی اثر قائم نہ کر سکے۔ اس پر طرہ یہ کہ ان کے کل مصارف ۲۰ ہزار سالانہ ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں یہ بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ مقامی حالات کے اختلافات کا کافی لحاظ نہیں کیا گیا۔ چنانچہ اس امر کو ہمیشہ ذہن نشین نہیں رکھا گیا کہ "ایرانی چرخ" صرف اس صورت میں اطمینان بخش طریقے پر کام کر سکتا ہے جبکہ کنووں کی گہرائی کم ہو۔ اس کے علاوہ کھاد کے گڑھے ایسے مقامات پر مہیا کیے گئے جہاں وہ مطلوب نہ تھے۔ واقعہ یہ تھا کہ مسٹر برین کوئی بڑا کارنامہ پیش کرنے اور جلد پیش کرنے کے لیے بے چین تھے۔ انھوں نے اپنی ڈپٹی کمشنری کے مختصر دور میں یہ پختہ عزم کر لیا تھا کہ دیہات کی گندگیوں اور کثافتوں کو ہمیشہ کے لیے دور کر دیں اور ایک ایسے اٹل فیصلے پر پہنچیں جس سے ضلع اور بیرونی دنیا پوری طرح مطمئن ہو جائے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اصلاحات کا نفاذ جن مواضع میں ہوا ان میں سے ہر گاؤں کے متعلقہ حالات کی جانچ اور تحقیق سطحی اور غیر تسکین رہی۔ اس تجربے کی جزئی ناکامی کا ایک سبب، جس پر مسٹر ڈارلنگ نے زور دیا ہے، یہ تھا کہ ضرورت سے زیادہ شدید اور بے موقع پروپگنڈا کیا گیا اور حقیقی تعلیم از حد کم کر دی گئی۔ ممکن ہے کہ پروپگنڈے کی بدولت لوگ بہت تیزی سے کام کرنا شروع کریں لیکن ایسا پروپگنڈا غور و فکر کو ناممکن بنا دیتا ہے؛ اس کے برخلاف تعلیم، اصطلاح کے حقیقی مفہوم میں، آزاد خیالی کی قطعی طور پر ہمت افزائی کرتی ہے اور اگرچہ ممکن ہے کہ اس کے نتیجے کے طور پر خصائل و عادات میں آہستہ تبدیلی ہو، لیکن یہ تبدیلی یقینی اور زیادہ دیرپا ہوگی، اس لیے کہ وہ گہرے تیقن کی پیداوار ہوگی۔ اس تجربے کی کامیابی

باب ۱۲

اس لیے عارضی تھی کہ اس میں محض پروپگنڈا پر حد سے زیادہ اعتماد کیا گیا اور سرکاری اقتدار سے ضرورت سے زیادہ کام لیا گیا۔ مسٹر دارلنگ کہتے ہیں کہ گڑگاؤں میں کسان کو اس بات پر مجبور کیا گیا تھا کہ ان خرابیوں سے اپنے کو بچانے کے لیے جو اس پر ترغہ کیے ہوئے تھیں وہ ایسے ہتیاروں سے مسلح ہو جائے جن کے سنبھالنے کی طاقت یا رغبت اس میں نہ تھی۔ چونکہ کسان انتہائی اطاعت پذیر تھا اس لیے اس نے کافی مستعدی کے ساتھ اپنا سر جھکا دیا اور کل ہتیار باندھ لینے کی بہتیری کوشش کی۔ جس وقت تک یہ دباؤ قائم رہا، وہ ان ہتیاروں سے اپنی مقدور بھر برابر کام لیتا رہا، اگرچہ ان کی کثرت اور وزن سے اس کی کمر بیٹھی جاتی تھی لیکن جب یہ دباؤ کم ہوا تو ہتیار بھی اس کے کندھوں سے ایک ایک کر کے پھسلنے اور گرنے لگے۔ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں کسانوں کا طبقہ اوپر سے چلی ہوئی ہر شے کو بطور حکم ماننے کا زمانۂ دراز سے عادی رہ چکا اور تحتانی عہدہ داروں کا انبوہ کثیر ترغیب و تحریص کے بجائے زیادہ تر تحکمانہ طریقے پر کام لینے کا خوگر ہو رہا ہو، دفتری اثر کو دل کھول کر کام میں لا کر تقریباً ہر مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسے کارنامے بے اصل ہوتے ہیں اس لیے کہ ان کا واحد محرک شخصی اقتدار ہے جس کا دباؤ غیر یقینی اور رُخ بدلتا رہتا ہے۔ اگر حکم کے ذریعے سے کام کرنا مقصود ہو تو واحد اطمینان بخش طریقہ وضع آئین و قوانین ہے، اس لیے کہ اس کے ذریعے سے احکام براہِ راست اور مستقل طور پر نافذ کیے جا سکتے ہیں؛ علاوہ ازیں یہ احکام کسی ایک عہدہ دار کی مرضی پر موقوف نہیں ہوتے جو ممکن ہے کہ آج ایک مقام پر رہے تو کل دوسرے مقام کو چلا جائے۔ لیکن اگر کسی خاص علاج یا اصلاح کے لیے وضع آئین و قوانین کی ضرورت نہ ہو (جیسا کہ دیہی تنظیم کے میدان میں اس کی کم ضرورت ہوتی ہے) تو مستقل طور پر علاج یا اصلاح کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کو یہ باور کرایا جائے کہ وہ ان ہی کے فائدے کے لیے ہے اور اس کا احساس ان میں اتنی قوت کے ساتھ پیدا کیا جائے کہ وہ خود اس پر عمل کرنے لگیں۔ ایسی صورت میں قوتِ محرکہ یا تو انفرادی ارادہ یا رائے عامہ کی اجتماعی قوت ہوگی جو دیہی برادری یا غالباً انجمن امداد باہمی کی وساطت سے ظاہر ہوگی[1]۔

---

[1] دیکھو مسٹر دارلنگ کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۱۵۶ تا صفحہ ۱۵۷۔

باب ۱۱ 392

گڑگاؤں کے تجربے کو مندرجۂ ذیل سبق ذہن نشین کرنے کے کام میں لایا جاسکتا ہے :۔ (۱) کسی قسم کی تبدیلیوں کی حمایت کرنے سے پیشتر ہمیں اس امر کا پوری طرح اطمینان کرلینا چاہیے کہ وہ درحقیقت مفید اور قابل عمل ہیں۔ ان کی مخالفت کی بنیادوں پر انصاف اور بے غرضی سے غور کرنا چاہیے۔

(۲) دیہی اصلاح و ترقی کا مسئلہ انفرادی کوشش کے ذریعے سے کامیابی کے ساتھ حل نہیں کیا جاسکتا۔ ایک مستقل نظام ضروری ہے تاکہ "ایک مسلسل پالسی کو یقینی بنایا جائے اور طویل مدت تک مستقل دباؤ قائم رکھا جائے"۔ تمام نقطہ ہائے نظر کی منصفانہ سماعت کو یقینی بنایا جائے اور ناواجب طور پر عاجلانہ کارروائی کو روکا جائے۔ اس لحاظ سے صوبۂ متحدہ میں رائے بریلی کے دیہی علاقے کی مثال، جہاں دیہی ضلع واری انجمن اور ایجنسیاں دیہات کی اصلاح و ترقی کے لیے قائم کی گئی ہیں، سبق آموز ہے۔ تمام انسانی تدابیر اور خاکوں میں غلطی کا احتمال اور قرینہ ہوتا ہے[1] لیکن جوشیلے افراد کے مقابلے میں نظامات میں غلطیاں کمتر اور کم سنگین ہوں گی۔ (۳) اصلاح کے لیے قوت کو پوشیدہ یا علانیہ استعمال کرنے کے بجائے ترغیب و تحریص و تعلیم سے کام لینا چاہیے۔ (اس نقطۂ نظر سے مثالی دیہات کے عظیم فوائد بدیہی ہیں) لیکن یہ ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ بعض صورتوں میں مثلاً ضدی اور سرکش اقلیت کی مخالفت پر غالب آنے کے لیے جبر و قوت کا استعمال ضروری ہوسکتا ہے۔ جوں جوں لوگ اصلاح کی قدر و قیمت محسوس کرتے جائیں گے ویسے ویسے جبر کا احساس مرور زمانے کے ساتھ معدوم ہوتا جائے گا (۴) مسٹر برین کے اختیار کردہ طریقوں کے بارے میں مسٹر ڈارلنگ کے اعتراضات بڑی حد تک حق بجانب اور معقول ہیں لیکن ممکن ہے کہ کسی غافل قاری کے دل میں یہ خیال گزرے کہ موجودہ زمانے میں صرف اس بات کی محفوظ طریقے پر کوشش کی جاسکتی ہے کہ تعلیم کی سہولتیں مہیا کردی جائیں اور دہقان کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے لیکن ایسا کرنا ضرورت سے زیادہ عدم مداخلت کے اصول پر کاربند ہونا ہے۔ ہندوستان میں دیہات سدھار کا سوال اس قدر اہم اور ضروری ہے کہ اس کو محض چپ چاپ بے مزاحمت کے حل نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کسی معقول حد تک کم مدت میں حقیقی ترقی حاصل کرنا مقصود ہو تو یہ ضروری ہے کہ

[1] ۔ دیکھو سین پیس ہیرڈ آئی سی ایس کی کتاب موسوم بہ "ذات اور اقتدار" باب ۵ ۔

ایک قطعی مجوزہ منظم اور مستقل مہم ان کئی خرابیوں کے خلاف جاری کی جائے جن میں ملک مبتلا ہے[۱]۔

۶۔ دیہات کی اصلاح و ترقی کی حالیہ تجاویز

گزشتہ چند سالوں میں دیہات سدھار کام میں بہت ہی وسیع اور گہری دلچسپی ظاہر کی گئی ہے، جس کا باعث کئی صوبہ وار حکومتوں کی جد وجہد، خاص کر سر فریڈرک سائیکس کی گورنری کے آخری سال (۱۹۳۳ء میں) حکومت بمبئی کی رہنمائی ہے۔ سر فریڈرک سائیکس نے دیہات سدھار کا ایک نظام العمل شایع کیا جس میں وہ طریقے بتائے گئے جن کے ذریعے سے احاطۂ بمبئی کے مختلف ڈویژنوں اضلاع، تعلقوں اور دیہات میں عہدہ داروں اور غیر عہدہ داروں کو شامل کر کے ضروری انتظام کیا جائے[۲]، اتفاق یہ طے کیا گیا کہ دیہی اصلاح و ترقی سے تعلق رکھنے والی مختلف ایجنسیوں اور محکموں کو ایک انتظام کے تحت منسلک کیا جائے، تاکہ ان میں تازہ جوش اور افادہ پیدا ہو۔ بمبئی کی اس جدید اسکیم کے تحت دیہی اصلاح و ترقی کا کام کرنے والی صدر ایجنسی "ضلع وار دیہات سدھار کمیٹی" ہے۔ ضلع کا کلکٹر اس کمیٹی کا صدر نشین اور ضلع کے مقامی بورڈ کا صدر اس کا نائب صدر نشین ہوتا ہے۔ مختلف متعلقہ محکموں کے سینیر مقامی

---

[۱] دیکھو پیچ کی کتاب محولۂ بالا باب ۲۔ پنجاب کا ایک اور تجربہ جس کو زرعی کمیشن دوسرے مقامات پر تقلید کے قابل سمجھتا ہے " دیہی برادری" کی تحریک ہے۔ دیہی برادری کا ایک مرکزی بورڈ (Central Rural Community Board) قائم کیا گیا ہے جو زیادہ تر عہدہ داروں پر مشتمل ہے۔ اس کو دیہی برادری کی کونسل" سے ملحق کیا گیا ہے جو ہر ضلع میں قائم کی گئی ہے اور زیادہ تر غیر عہدہ داروں پر مشتمل ہے۔ دیہی ترقی سے تعلق رکھنے والے مختلف محکموں یعنی محکمۂ تعلیمات، محکمۂ زراعت، محکمۂ علاج حیوانات و امداد باہمی کے نمایندے ہر کونسل کو اس کے کام میں مدد دیتے ہیں۔ کونسلیں جملہ محکمہ جات ترقی کے پروپگنڈا کے کام میں ہم آہنگی پیدا کرتی ہیں۔ ان کی مالی امداد "دیہی برادری کا مرکزی بورڈ" کرتا ہے اور اس کی مدد حکومت کرتی ہے۔ دیہات سدھار کی پنجابی تحریک کی خصوصیت اس کی وسعت، جامعیت اور ارتکاز جد وجہد ہے۔ دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ فقرہ ۴۲۱ تا ۴۲۸۔

[۲] چنانچہ اس کو سرکاری نیلی کتاب موسوم بہ " رسالۂ دیہی اصلاح و ترقی" کی شکل میں شایع بھی کر دیا گیا ہے۔

باب ۱۵ عہدہ دار اور ممتاز غیر عہدہ دار اشخاص بھی کمیٹی میں رکھے گئے ہیں کمیٹی کا فرض یہ ہے کہ دیہات کی اصلاح و ترقی کے مختلف شعبوں مثلاً تعلیم، زراعت، انتظام حکومت، صحت، مقدمات کی قرضداری اور گھریلو صنعتوں کے کام میں ہم آہنگی پیدا کرے اور اس کی نگرانی کرے[۱] بمبئی کی دیہات سدھار اسکیم خاص کر مرکزی ڈویژن میں ہمت افزا ترقی کر رہی ہے اور دیہی پنچایتوں میں نئی جان ڈالی جا رہی ہے۔ اسکیم کا مقصد یہ ہے کہ خود گاؤں کے اندر محرک پیدا ہو۔ پنجاب، صوبۂ متوسط، مدراس اور بنگال جیسے صوبے بھی دیہات سدھار کام میں اسی قسم کی دلچسپی لے رہے ہیں۔ صوبہ وار معاشی کانفرنس (۱۹۳۴ء) کے غور و مباحث نے دیہات سدھار تحریک کے حق میں محرک کا کام کیا لیکن سب سے نمایاں کام حکومت ہند نے کیا، چنانچہ اس نے ۱۹۳۵ء کے معازنے کی توفیر سے ایک کروڑ روپیہ اس غرض سے الگ رکھ دیا کہ اس کو مختلف صوبوں میں دیہاتی علاقوں کی اصلاح و ترقی اور معاشی نشو و نما کے لیے تقسیم کیا جائے۔ اس عطیے کو مرکزی حکومت کے مشورے سے دیہات سدھار کاموں میں خرچ کرنا پڑتا ہے۔ بمبئی کا حصہ ۷ لاکھ روپیہ ہے اور یہ دیہات سدھار کام کے حق میں ایک نیا محرک ثابت ہوا ہے۔ مرکزی حکومت نے سال رواں میں بھی ایسا ہی عطیہ کر منظور کیا ہے۔ لیکن مرکزی حکومت کی طرف سے اس قسم کے عطیے اُن رقوم کا صرف ایک جزو فراہم کر سکتے ہیں جو دیہی تنظیم کے مصارف کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ اس لحاظ سے یہ نہایت ضروری ہے کہ مختلف متعلقہ صوبے بھی رقوم فراہم کریں۔ 384

۷۔ شاہی زرعی کمیشن

شاہی زرعی کمیشن اپریل ۱۹۲۶ء میں مقرر کیا گیا تھا اور یہی پہلا کمیشن تھا جو ہندوستان کے زرعی و دیہی معیشت کے حالات کو خاص طور پر جانچنے اور ان کے متعلق رپورٹ پیش کرنے کے لیے قائم کیا گیا تھا کمیشن نے ایک جامع رپورٹ میں جو جولائی ۱۹۲۸ء

[۱] انڈین نیشنل کانگرس نے حال ہی میں (۱۹۳۴ء) ایک کل ہند انجمن صنائع دیہی (All India Village Industries Association) قائم کی جس کا مقصد دیہی صنعتوں کی تجدید و تقویت کی ہمت افزائی کرنا ہے۔ دیکھو ایک کتاب موسوم بہ "ہندوستان ۱۹۳۳ تا ۱۹۳۴" باب ۹ صفحہ ۳۷۔

باب

ں شایع کی گئی اپنی سفارشیں پیش کیں اور یہ سفارشیں ہندوستان کی دیہی برادری کی خوشحالی
. اثر انداز ہونے والے مختلف مسائل سے تعلق رکھتی ہیں چنانچہ ان کو مناسب موقع
ر محل سے بیان کیا جا چکا ہے۔ کمیشن کی مساعی کی بدولت زراعت میں عام طور پر
زسر نو دلچسپی لی جانے لگی ہے اور ہندوستان کے لیے اس کی عظیم اہمیت کو زیادہ
مل طور پر محسوس کیا جانے لگا ہے۔ رپورٹ نے اس لحاظ سے بھی مفید کام کیا ہے کہ
تلف صوبوں میں دیہی اصلاح و ترقی کے مسائل کو حل کرنے کے بارے میں جو تدابیر
ختیار کی جا چکی تھیں ان کو ایک ہی جگہ درج کر دیا ہے۔ اب تک صوبوں نے اپنی
ملداری کے اندر تنہا کام کرنے پر قناعت کی اور باہمی امداد، معلومات یا مشورے سے
ہت کم فائدہ اُٹھایا تھا۔ لیکن رپورٹ ان میں لازمی طور پر امداد باہمی کی زیادہ ترغیب
ور ایک کو دوسرے سے سبق سیکھنے کی زیادہ خواہش پیدا کرے گی۔

کمیشن کے کام سے نیز عملی نتائج حاصل کرنے کے مدنظر ہر صوبے کو کمیشن کی
فارشوں کے مطابق جو لازماً عام نوعیت کی ہیں اپنے حالات کے متعلق خاص تحقیقات
مل میں لانی پڑے گی۔ حد سے زیادہ عاجلانہ نتائج کی توقع نہ کی جائے تو مایوسی سے
ی بچ سکتے ہیں۔ کمیشن کی سفارشوں کو عملی جامہ پہنانے کا کام ناگزیر طور پر سست اور دشوار
وگا اور قبل اس کے کہ دیہی ہندوستان مصائب و مشکلات کی بھیانک تاریکی سے نکلنے
ور خوشحالی اور مسرت کے دن دیکھنے کی توقع کر سکے حکومت اور قوم کے تمام ذرایع کو
ئی سال تک مرتکز و مجتمع کرنا پڑے گا۔

۸۔ رپورٹ کے بارے میں حکومت کی کارروائی۔ شملہ کانفرنس۔

اکتوبر ۱۹۲۸ء میں شملے میں ایک زرعی کانفرنس منعقد ہوئی جو صوبہ واری نمایندوں (یعنی محکمہ جات زراعت کے نظما، اور وزرا، انجمن ہائے امداد باہمی کے رجسٹراروں وغیرہ) پر مشتمل تھی۔ اس میں کمیشن کی اہم سفارشوں پر بحث
ی گئی۔ بعض سفارشوں کے بارے میں مختلف صوبوں نے جو کارروائی اختیار کی اس کا حال
علوم کیا گیا اور کمیشن کی تجاویز کے مالی پہلوؤں پر زور دیا گیا جو ان تجاویز کو فوراً یا
بہ یک وقت اختیار کرنے کو ناممکن بنا دیتے تھے۔ کمیشن کی رپورٹ، دیہی تنظیم اور زرعی ترقی

باب ۱۱

کی اساس کی حیثیت ہے اور ہر صوبے کے حالات کے مطابق سفارشوں کو بتدریج عملی صورت دینے کی بنیاد کے طور پر تسلیم کرلی گئی۔ شاہی تحقیقاتی مجلس قائم کرنے اور مرکزی حکومت کی جانب سے اس کی مالی امداد کیے جانے کے بارے میں جو سفارش کی گئی تھی اس کو عام شرائط کے ساتھ منظور کرلیا گیا۔[1]

385

۹۔ زرعی تحقیقات کا انتظام۔

جیسا کہ زرعی کمیشن بجا طور پر کہتا ہے، "زرعی ترقی کی بنیاد تمام تر تجربہ ہے۔ مظاہرہ اور پروپگنڈا کے لیے جو انتظام کیا جائے خواہ وہ کتنا ہی منظم اور باقاعدہ کیوں نہ ہو، اس کی حیثیت اس وقت تک محض ریت پر بنائے ہوئے مکان جیسی رہے گی جب تک کہ اس کو تحقیقات کی فراہم کی ہوئی مستحکم بنیادوں پر نہ قائم کیا جائے"۔ حکومت اس سلسلے میں کمیشن کی سفارشوں کو چند ترمیموں کے ساتھ عملی جامہ پہنانے کی تدابیر اختیار کرچکی ہے۔ چنانچہ ایک کل ہند مجلس زرعی تحقیقات موسوم بہ شاہی مجلس زرعی تحقیقات جولائی ۱۹۲۹ء میں قائم کردی گئی ہے، اور انجمنوں کی رجسٹری کے قانون بابتہ ۱۸۶۰ء کے تحت انجمن کی حیثیت سے اس کی رجسٹری بھی ہوچکی ہے۔ اس عمل سے اس کو بہت بڑی حد تک مالی آزادی مل گئی ہے۔ اس کا اولین مقصد ہندوستان بھر میں زرعی تحقیقات کو ترقی دینا، اس کی نگرانی ورہنمائی کرنا اور اس میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔ یہ ایک ایسی انجمن ہے جس سے مرکزی و صوبہ واری محکمہ جات زراعت (انتظامی نگرانی کے تابع ہوئے بغیر) تحقیقات کے متعلق تمام معاملات میں مشورہ اور مدد طلب کرتے ہیں، اور جس کے پاس ان محکموں کی مجوزہ تحقیقات کے نظام العمل بغرض منظوری پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ انجمن زراعت و علاج حیوانات سے متعلق معاملات میں معلومات و اطلاعات کی تقسیم کے ادارے کا بھی کام کرے گی اور ہندوستان سے تحقیقاتی

[1] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ ۵۳ تا ۷۴۔

باب ۱۱

کاموں کو سلطنت برطانیہ کے دوسرے علاقوں اور ممالک غیر کے تحقیقاتی کاموں سے ملحق کرنے والی کڑی ثابت ہوگی۔ اس کو تحقیقاتی کام کرنے والوں کی تربیت کے انتظامات بھی کرنے پڑیں گے[1]۔ یہ مرکزی انجمن دو حصوں میں منقسم ہے:۔ انتظامی جماعت، جس کا صدر وائسرائے کی مجلس تنفیذی کا رکن متعلقہ ہوتا ہے اور جو حسب ذیل ارکان پر مشتمل ہے:۔ صوبہ واری محکمہ جات زراعت کے وزرا، مرکزی مجلس قانون ساز کے تین نمایندے، تجارتی مفادات کے دو نمایندے، مجلس مشاورتی (آگے تفصیل آئے گی) کے منتخب کردہ دو ارکان، اور ایک ہمہ وقتی نائب صدر نشین جو کونسل کا سب سے بڑا انتظامی عہدہ دار ہوتا ہے۔ (۲) مجلس مشاورتی، جس کا کام سائنٹفک مقاصد کے سلسلے میں پیش کردہ تجاویز کی جانچ کرنا ہے۔ اس مشاورتی بورڈ کا صدر نشین، کونسل کا سب سے بڑا انتظامی عہدہ دار ہوتا ہے، اور اس کے ارکان حسب ذیل ہوتے ہیں:۔ دو ہمہ وقتی عہدہ دار یعنی ایک زرعی معاملات کے متعلق اور دوسرا علاج حیوانات کے متعلق، دوسرے کئی نامزد کردہ و منتخب کردہ سائنس داں ارکان، مثلاً صوبہ واری محکمہ جات زراعت و علاج حیوانات کے صدر جن میں ان دیسی ریاستوں کے عہدہ دار بھی شامل ہیں جو اس میں شریک ہونا چاہیں، ہندوستانی جامعات، ہندوستانی مرکزی کپاس کمیٹی، انجمن ہائے امداد باہمی، ادارۂ تحقیقات جنگلات ڈیرہ دون کے نمایندے اور چند دوسرے ارکان۔ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کو یہ اقتدار حاصل ہے کہ مجلس انتظامی و مجلس مشاورتی دونوں میں حسب ضرورت زائد ارکان کو نامزد کریں۔ چنانچہ اس اقتدار کو سلطنت حیدرآباد (جو کونسل میں سنہ ۱۹۲۹ء میں شریک ہوئی[2]) ریلوے بورڈ اور محکمہ جات فوج و علاج حیوانات کی

386

---

[1] دیکھو امپیریل کونسل آف اگریکلچرل ریسرچ کی انجمن کی یادداشت۔

[2] اس کے بعد میسور، بڑودہ، کوچن، ٹراونکور، رامپور، بھوپال کی ریاستوں کو بھی کونسل کی انتظامی مجلس میں نمایندگی دی گئی ہے۔

باب

نمایندگی کے سلسلے میں کام میں لایا جا چکا ہے۔ کونسل یعنی مجلس انتظامی و مجلس مشاورتی کا منعقدہ اجلاس بعض ابتدائی امور کے تصفیے کے لیے جون ۱۹۲۹ء میں ہوا اور اس کی رجسٹری، انجمنوں کی رجسٹری کے قانون کے تحت ایک انجمن کی حیثیت سے عمل میں آئی۔ مجلس مشاورتی کا اجلاس سال میں دو دفعہ اور ہر مرتبہ مختلف مقام پر ہوتا ہے، اس طرح باری باری سے ہر صوبے میں اس کی پیچ ہوتی ہے۔ مجلس مشاورتی کا کاروبار یقیناً سال کے بارہ مہینے جاری رہتا ہے لیکن اس کے فرائض زیادہ تر خاص خاص ذیلی کمیٹیوں کے ذریعے سے انجام پاتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں کونسل کی حسب ذیل مجالس قائم کام کر رہی ہیں:۔ شکر کمیٹی، کھاد کمیٹی، ٹڈا کمیٹی، کمیٹی برائے صنعت روغن برار، مشترکہ کمیٹی برائے شاہی مجلس زرعی تحقیقات اور ہندوستانی مرکزی کپاس کمیٹی، حیوانی تغذیہ کمیٹی، شیر خانہ کمیٹی، پرورش مویشیاں کمیٹی[1]۔ مجلس مشاورتی کی ذیلی کمیٹیاں مخصوص مسائل کی مفصل جانچ کے لیے ضرورت کے لحاظ سے وقتاً فوقتاً مقرر کی جاتی ہیں۔ مجلس مشاورتی تحقیقات کے متعلق ان تمام تجاویز کو جانچتی ہے جو صوبہ واری حکومتوں، جامعات یا خانگی اداروں کی جانب سے اس کے پاس بغرض تصفیہ پیش کئے جاتے ہیں اور یہ تصفیہ کرتی ہے کہ کس تجویز کو پہلے لینا چاہیے، ہر مسئلے کو کس طرح حل کرنا چاہیے اور ہندوستان کے کس حصے میں اس کے متعلق خاص کام بہترین طریقے پر کیا جا سکتا ہے۔ مجلس مشاورتی کے فیصلے مجلس انتظامی کی منظوری اور بحیثیت مجموعی سوسائٹی کے خیالات کے تابع ہوتے ہیں۔ مجلس انتظامی، کونسل کے رقوم کا انتظام اور نگرانی کرتی ہے۔ اس کا صدر مرکز شملہ میں ہے اور اس کو نو قایم شدہ امپیریل اگریکلچرل بیورو سے ملحق کر دیا گیا ہے جس کا مقصد سلطنت برطانیہ کے جملہ محققین کو ان ہی کے متعلقہ مضامین کی حد تک جدید ترین انکشافات سے باخبر رکھنا ہے۔

[1] دیکھو ایک کتاب موسوم "ہندوستان ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۲ء میں" صفحہ ۹۱؛ اور انڈین ایر بک بابتہ ۱۹۲۵ء صفحہ ۱۹۳۔

شملاً روتھم اسٹیڈ میں ایک محکمہ ہے جہاں سائنٹفک کام خاص طور پر زمین کے متعلق انجام دیا جاتا ہے۔ ایک اور ادارہ کیمبرج میں ہے جہاں تحقیقات کا خاص موضوع نباتی توالد و تناسل ہے۔ ہندوستانی انجمن اس ادارے کے مصارف کے لیے کچھ چندہ دیتی ہے اور اس کی انتظامی مجلس میں انجمن کا ایک نمایندہ بھی شریک رہتا ہے۔ ہندوستانی کونسل کی مجلس انتظامی جو ابتدائی تدابیر اختیار کرنے والی ہے ان کے منجملہ تحقیقات کرنے والوں کے لیے پوسٹ گریجوئیٹ اسکالرشپ کا انتظام بھی شامل ہے۔ مجلس مذکور نے دہلی میں تحقیقات اور حوالے کے لیے ایک کتاب خانہ بھی کھولا ہے۔ جن مسائل پر توجہ دی جا رہی ہے وہ چاول، فن شکر سازی، نیشکر کی کاشت میوہ اور خشک کاشت کی تحقیقات، زرعی پیداوار کی فروخت کا انتظام، کھاد کی تحقیقات، ٹڈیوں کی تحقیقات، آلو کی کاشت، حیوانوں کی داشت وغیرہ ہیں۔ جامعوں کو اس غرض سے مالی امداد دی جاتی ہے کہ یونیورسٹی کے اسٹاف میں سے کام کرنے والوں کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ زرعی اہمیت کی تحقیقات کو توسیع دیں یا دوسری تحقیقات کے زرعی پہلوؤں کو ترقی دیں۔

زرعی کمیشن نے یہ سفارش کی تھی کہ ابتداً زرعی تحقیقاتی کونسل کے لیے ۵۰ لاکھ روپیہ کا فنڈ وقف کر دیا جائے۔ لیکن اس کے بجائے حکومت ہند نے اعلان کیا کہ اس نے ابتداً ۲۵ لاکھ روپیہ بحیثیت دینے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کے علاوہ ایک مقررہ رقم سالانہ بھی دی جائے گی۔ سالانہ امداد ۵ء۷۲ لاکھ روپیہ کی دی جائے گی جس کے منجملہ ۵ لاکھ روپیہ کونسل کے سائنٹفک اغراض کے لیے اور باقی ۲۵ء۲ لاکھ روپیہ اس کے عملہ اور معتمدی کے مصارف کے لیے ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۲ء کی تخفیف کی مہم میں سالانہ تحقیقات کی امداد موقوف کر دی گئی۔ کونسل کے قائم ہونے کے بعد کے کل زمانے یعنی چھ سال میں حکومت ہند نے کم و بیش ۱۰۱ لاکھ روپیہ مختلف کاموں کے لیے منظور کیا یعنی ۵۰ لاکھ روپیہ عام تحقیقاتی کام کے لیے، ۲۰ لاکھ روپیہ شکر کی تحقیقات کے لیے، ۲۵ لاکھ روپیہ مرکز میں اور صوبوں میں پیداوار کی فروخت کے

باب

انتظام کی تجاویز کے لیے ۱ء۵ لاکھ روپیہ شیر خانہ کے جدید تحقیقاتی ادارہ کے لیے۔ اس میں ۱ء۱ لاکھ روپیہ کا اضافہ بھی کرنا چاہیے، جس کا عہدہ آیندہ پانچ سال کے لیے ایک مرکزی ادارۂ شکر کی تجویز کے واسطے کیا گیا۔

کمیشن کی سفارش کے مطابق تمام صوبوں میں صوبہ واری تحقیقاتی کمیٹیاں قائم کی گئی ہیں۔ یہ کمیٹیاں شاہی مجلس زرعی تحقیقات کے ساتھ مل کر کام کریں گی اور ان تمام درخواستوں کے بارے میں رپورٹ پیش کریں گی جو صوبوں کی جانب سے تحقیقاتی مجلس میں رقم کی منظوری کی غرض سے پیش ہوں گی۔ ان کمیٹیوں کا اہم ترین کام اس تحقیقات کو ترقی دینا اور اس میں ربط و ہم آہنگی پیدا کرنا ہے جو صوبے کے اندر وہی اصلاح و ترقی کے لیے عمل میں لائی جائے۔ کونسل نے اس مقصد کو بڑی حد تک پورا کر دیا ہے جس کے لیے اس کو وجود میں لایا گیا تھا۔ مختلف صوبوں کی رپورٹوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کونسل کی عطا کردہ مالی امداد کی بدولت زرعی تحقیقات کو برقرار رکھنے کا موقع ملا اور صوبوں کی انفرادی کوشش نے مالی پریشانی کے زمانے میں بھی اس تحقیقات کو کسی قدر وسیع کرنے کا موقع بہم پہنچایا۔ اس طرح درمیان میں مرکزی امداد میں جو کمی رونما ہوئی اس کو پورا کر دیا گیا اور مساعی میں ہم آہنگی قائم رہی۔ اسی کے ساتھ یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ مالی ملحوظات نے کونسل کو وہ سب کچھ کرنے سے باز رکھا جس کے متعلق شاہی زرعی کمیشن نے اس سے توقع کی تھی۔

۴۶۸

کمیشن تحقیقات کی تنظیم کے بارے میں اپنی سفارش کو اپنی پیش کردہ قطعی تجاویز میں اہم ترین خیال کرتا ہے۔ اور حکومت نے بہت اچھا کیا کہ اس سفارش پر عمل کرنے کے لیے قطعی تدابیر اختیار کرنے میں وقت ضایع نہیں کیا۔ تحقیقات کے نظام سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی غرض سے ظاہر ہے کہ ایک قابل اور کارآمد عملہ کا انتخاب ضروری ہے تاکہ تحقیقات کا کام جاری رکھا جائے اور اس خوف کو کوئی جگہ نہ دینی چاہیے جو بعض نقاد ظاہر کرتے ہیں کہ کمیشن کی سفارشوں کو اختیار کرنے کی وجہ سے مستقر ار تنخواہوں کی کئی جائدادیں قائم کرنی پڑیں گی اور ریوڑیاں "ماہر" درآمد کرنے پڑیں گے جو در اصل ماہر نہ ہوں گے۔

باب ۱۵

ایک طرف تو ہمیں جہاں حتی الامکان خوب پھیلا کر بچھانا چاہیے اور بہترین تربیت یافتہ دماغوں اور اعلیٰ ترین مہارت و قابلیت رکھنے والوں سے جہاں کہیں سے ہم انھیں پائیں کام لینا چاہیے؛ اور دوسری جانب جدید تحقیقات کے اسلوب پر ہندوستانیوں کی ترتیب کرنے اور ان کو ذمہ دارانہ کام سپرد کرنے میں ہر ممکن سہولت بہم پہنچانی چاہیے۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ اگر مناسب سہولتیں بہم پہنچائی جائیں تو ہندوستانی اس کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ تحقیقات کے کام میں اپنے جوہر دکھائیں۔ یہ ایسا معاملہ ہے جس کے لیے مجالس قانون ساز اور ذی علم و فہم عوام کی گہری توجہ اور انتہائی چوکسی ضروری ہوگی۔

۱۰۔ معاشی تحقیق کے صوبہ وار مجالس۔ اس باب کو ختم کرتے ہوئے ہم بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی اس سفارش کی طرف توجہ مبذول کرانا مناسب سمجھتے ہیں کہ ہر صوبے میں معاشی تحقیق کی ایک مجلس مستقل بنیاد پر قائم کی جائے، تاکہ ترقی پذیر اور تعمیری زرعی پالیسی پر عمل کرنے کے لیے وہ حکومت کو مطلوبہ معلومات اور اطلاعات بہم پہنچائے۔ کمیٹی مذکور اس سلسلے میں مجلس معاشی تحقیق پنجاب کی طرف اشارہ کرتی ہے جس میں معاشی مسائل کی تحقیق سے دلچسپی رکھنے والے عہدہ دار اور غیر عہدہ دار دونوں شریک ہیں اور جو ۱۹۱۹ء میں قائم ہوئی۔ مالی اعتبار سے اس کمیٹی کا انحصار سرکاری امداد پر ہے، اور اس نے کئی دیہات کا جائزہ لیا اور بہت سے معاملات کے متعلق معلومات فراہم کی ہے، مثلاً کھیتوں کی وسعت اور تقسیم، صرف شدہ غذا کی شرحیں، زرعی اراضی کی گروی، کھیت کے مسایات، خاندان کا موازنہ وغیرہ: اور کسان کی معاشی حالت کے متعلق بہت ہی وافر اور مفید مواد پیش کیا ہے۔ بنگال میں بھی معاشی تحقیق کی ایک مجلس موجود ہے۔ اسی طرح ضرورت ہے کہ ہر صوبے میں ایک بورڈ قائم کیا جائے جو کسان پر اثر انداز ہونے والے سب معاشی عاملین کو اکٹھا کرے، ان کا باہمی تعلق دریافت کرے اور ان کی تحلیل کرے، اور تحقیق کے نتائج مناسب شکل میں پیش کرے۔[1]

[1] دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ (۲۷)۔

باب ۱۱

ملک اور ملک کے باہر کی دنیا کے بدلنے والے معاشی حالات سے مسلسل مطابقت پیدا کرنے کی ضرورت اس قسم کے انتظام کو آج کل کی شدید مسابقت اور معاشی منصوبہ سازی کے زمانے میں اور بھی زیادہ ضروری بنا دیتی ہے۔

890

باب ۱۲

مالگزاری

۱۔ ہندوستان میں مالگزاری پر تاریخی نظر

ہندوستان میں قدیم ترین زمانے سے حکومت کسانوں سے زمین کی پیداوار کے ایک حصے کی دعویدار رہی ہے۔ چنانچہ قوانین منو میں مجموعی خام پیداوار کے $\frac{1}{6}$ حصے کا ذکر ہے یعنی فصلیں کٹنے کے بعد اناج کا جو انبار لگا دیا جاتا تھا اس میں سے $\frac{1}{6}$ حصہ بادشاہ کا جائز حق سمجھا جاتا تھا اگرچہ جنگ کے زمانے اور دوسرے مفاجی حالات میں یہ تناسب بڑھ کر $\frac{1}{4}$ ہوسکتا تھا۔ مجموعی خام پیداوار کے ایک حصے کے تعین کی تجویز، معاشرے کی ابتدائی اور غیر ترقی یافتہ حالت میں کئی سہولتیں بہم پہنچاتی تھی۔ زمین کی کل پیداوار گاہنے کے فرش پر انبار در انبار اکٹھا کی جاتی تھی اور بادشاہ کے عہدہ دار کی موجودگی میں اس انبار سے حکومت کا حصہ الگ کر لیا جاتا تھا۔ ایسی حالت میں حکومت کا مطالبہ، پیداوار کی مقدار کے لحاظ سے خود بخود بدلتا رہتا تھا، اور مالگزاری کی معافی اور التوا کا کوئی دقت طلب طریقہ اختیار کرنا ضروری نہ تھا۔ لیکن اس طریقے کے نقائص بھی مساوی طور سے بدیہی ہیں۔

باب ۱۲

آبادی کے اضافے اور کاشت کی توسیع کے ساتھ ساتھ مالگزاری بہ شکل جنس وصول کرنا روز افزوں دشوار ہوتا گیا۔ تا وقتیکہ عہدہ داروں کا ایک بڑا عملہ تقسیم کی نگرانی کی غرض سے ملازم نہ رکھا جائے، کسان غلہ چھپا سکتے یا کھیت سے باہر لے جا سکتے تھے، یا مقامی محصل کسان اور حکومت دونوں کو خسارے میں ڈال کر اپنا پیٹ بھرتے تھے۔ ممکن تھا کہ گاہنے کے فرش پر غلہ محض اس وجہ سے سڑتا پڑا رہتا کہ بادشاہ کا عہدہ دار ایک مدت دراز تک تقسیم کی نگرانی کے لیے نہیں آیا۔ ان نقائص نے جلد یا بدیر مالگزاری وصول کرنے کے دوسرے طریقوں کو بطور بدل اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ کھڑی کھیتی کا اندازہ کر کے اس کے مطابق سرکاری حصے کا تعین کیا جا سکتا تھا بلا لحاظ اس کے کہ فصل کی کٹائی پر حقیقت میں کتنی پیداوار حاصل ہوئی اور اس کا اندازے سے کم یا زیادہ ہونا ممکن تھا۔ اس طریقے اور اس کے مثل دوسرے طریقوں کی جگہ [illegible] طریقے نے لے لی۔ چنانچہ اس تغیر و ترقی عمل کی رفتار کو بعض اسلامی سلطنتوں کی سریع توسیع نے بہت تیز کر دیا جس کی بنا پر قدیم طریق کے مطابق مالگزاری بہ شکل جنس وصول کرنا ناممکن ہو گیا[1]۔ تیمور کے قوانین و ضوابط پیداوار کے سرکاری حصے کو بہ شکل زر متعین کرنے کی پہلی باقاعدہ کوشش ہے۔ دوسری کوشش شیر شاہ (۱۵۴۰ء تا ۱۵۴۵ء) نے کی، لیکن ان کی جد و جہد اس لیے نامکمل رہی کہ ان کا دور حکومت مختصر تھا۔ تیسرا اور نہایت مشہور و معروف بندوبست اکبر اعظم کے دور میں ان کے قابل وزیر مالیہ ٹوڈرمل کے ذریعے سے ہوا۔ چنانچہ مطلوبہ مالگزاری کے تعین کی لازمی بنیاد کے طور پر یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ زمینوں کی ادائی محصول کی قابلیت کی زیادہ باقاعدہ اور مفصل تحقیقات کی گئی۔ اراضی کی پیمائش بہت احتیاط کے ساتھ کی گئی اور زرخیزی کے مختلف مدارج کے لحاظ سے اس کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ حکومت کا حصہ مجموعی خام پیداوار کا 1/3 مقرر کیا گیا۔ مالگزاری نقد ادا کرنے کا بھی اختیار دیا گیا اور اس کی مقدار بندوبست سے پیشتر کے انیس سالوں کے دوران میں اناج کی اوسط قیمتوں پر مبنی رکھی گئی۔ بندوبست کی میعاد نو سال مقرر کی گئی۔

891

[1] دیکھو محصول کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ (۵۲)

باب ۱۲

اس طرح مغلوں نے مالگزاری کے قدیم ہندو طریق میں کوئی اساسی تغیرات نہیں کیے، بلکہ محض ہندو نظم و نسق کے رواجی اور غیر مکتوب طریقوں کو مربوط و مدون کیا۔ لیکن سلطنت کے مالی ذرائع کے متعلق قطعی معلومات حاصل کرنے کی غرض سے باقاعدہ رجسٹروں اور کتابچوں اور مالگزاری کے حسابات کے طریقے کو رائج کرنے کا سہرا مغلوں ہی کے سر بندھتا ہے۔ دکن میں اسی قسم کے تغیرات رونما ہوئے، خاص کر ملک عنبر (احمد نگر) کے دور حکومت میں جس نے مالگزاری کی بعض شرحیں موسوم بہ "عین" یا "لازمی شرحیں" رائج کیں۔ یہ مجموعی خام پیداوار کی نقد قیمت کا ۱/۳ ہوتی تھیں[۱]۔ مرہٹوں نے ان شرحوں کو اپنے طریق کی بنیاد کے طور پر قبول کر لیا، اور انھیں اس معیار تک بڑھا دیا جسے وہ "کمال" کہتے تھے یعنی وہ انتہائی یا اعلیٰ ترین شرح جو صرف بہترین زمینوں پر قابل ادائی تھی۔ اکثر صورتوں میں مالگزاری کی تشخیص عارضی ہوتی تھی، لیکن دکن میں "میراثی" حقیقت اراضی کے نتیجے کے طور پر تشخیص مستقل ہوتی تھی[۲]۔ "میراث دار" اپنی زمین پر مستقل قابل ارث حقیت کے لحاظ سے قابض ہوتا تھا جس میں ایک مقررہ محصول ادا کرنا پڑتا تھا خواہ زمین زیر کاشت ہو یا نہ ہو[۳]۔ اکثر صورتوں میں

---

[۱] کننگ ملک عنبر کے طریق کا مقابلہ اکبر کے طریق سے کرتے ہوئے بتلاتے ہیں کہ اگرچہ ملک عنبر کی تشخیص مالگزاری اکبر کی تشخیص مالگزاری کے مماثل تھی، لیکن ملک عنبر کے خیالات حقیت اراضی کے بارے میں مختلف تھے۔ چنانچہ اس کا مقصد کسان کو زمین سے وابستہ کرنا تھا، اور اس مقصد سے اس نے زمین کے بہت بڑے حصے کو کسانوں کی خانگی ملک بنا دیا، اس حق مالکانہ کے ساتھ ساتھ انھیں زمین فروخت کرنے کا اختیار بھی عطا کیا گیا اور دیہی برادری کی مشترکہ جائداد کے طور پر دوسری زمینیں بھی عطا کی گئیں۔ (دیکھو ان کی کتاب موسوم بہ "بمبئی دکن میں دیہی معیشت"

(Rural Economy in Bombay Deccan.)

[۲] مرہٹوں کے دور حکومت میں ایک بہت ہی معین حقیت اراضی بھی تھی جس کو "اپری" کہتے تھے یہ اپری "حکومت کا اسامی غیر دخیلکار ہوتا تھا جس کے ذمہ کا لگان بڑھایا جا سکتا تھا اور جو ہر سال جتنی زمین چاہے کاشت کرنے کے لیے حاصل کر سکتا تھا۔ وہ فصل یہ جتنی پیداوار حاصل کرتا تھا اس کے لحاظ سے مالگزاری ادا کرتا تھا۔

[۳] دیکھو کیٹنگ کی تصنیف محولۂ بالا، صـ ۵۔

باب ۱۲

کئی دوسرے ابواب عائد کر کے حقیقی مالگزاری میں اضافہ بھی کر دیا جاتا تھا۔ یہ پایا گیا کہ یہ تغیر تمام ہندوستان میں جہاں کہیں مرکزی حکومت کا اقتدار کمزور پڑ گیا تھا رونما ہو گیا تھا۔ سر جان شور کے تخمینہ کے مطابق معیاری مالگزاری کے مقابلے میں ابواب کا تناسب بعض صورتوں مثلاً بنگال میں ۲۳ اور ۳۵ فیصد کے درمیان تھا۔[1]

392

مالگزاری اور حقیت اراضی کی سرگزشت کی دوسری اہم ترین خصوصیت، مالگزاری کی متاجری کا رونما ہونا تھا، جو ایک سے زیادہ صوبوں میں حقیت اراضی کے مقامی نظام کی ترقی میں نہایت اہم حال تھا۔ یہ طریق اس خیال سے اختیار کیا گیا تھا کہ مرکزی حکومت کے خزانے میں مستقل آمدنی کو یقینی بنایا جائے، اس لیے کہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے زمانے میں حکومت کے لیے یہ بات روز افزوں مشکل ہو رہی تھی کہ دور افتادہ علاقوں کے عہدہ داران مالگزاری کی نگرانی کرے۔ اس طریق کی ابتدا کی ٹھیک تاریخ نہیں تو بتلائی جا سکتی، لیکن شہنشاہ فرخ سیر کے دور حکومت (۱۷۱۳ء تا ۱۷۱۹ء) سے وہ بنگال میں اچھا خاصا پھیل گیا۔ اس طریق کے تحت مالگزاری کا متاجر حکومت کو وصول کردہ رقم کا ۹/۱۰ حصہ ادا کرتا تھا اور باقی اپنے محنتانے کے طور پر رکھ لیا کرتا تھا۔ لیکن بعد کے زمانے میں انحطاط کا ایک اور دور رونما ہوا جب کہ کسی پرگنے یا ضلع کی مالگزاری وصول کرنے کا حق نیلام کے ذریعے سے سب سے بڑی بولی بولنے والوں کو دیا جانے لگا جو اس بات کے ذمہ دار قرار دئیے گئے کہ اس طرح مقرر کردہ رقم یکمشت سرکاری خزانے میں داخل کریں اور اس سے زائد جو کچھ وصول ہو اس کو اپنے پاس رکھ لیں۔ بعض صورتوں میں ہندو راجاؤں یا سرداروں کو، جو بزور شمشیر حکومت مغلیہ کے تابع فرمان بنائے گئے تھے، شاہی منشور کے تحت متاجر مالگزاری بنایا گیا۔ اگرچہ ابتداً متاجر مالگزاری کا عہدہ موروثی نہ تھا اور سرکاری عہدہ داروں کی نگرانی کے تابع تھا لیکن جوں جوں مرکزی اقتدار کو زوال آتا گیا اس کا میلان موروثی بننے کی طرف زیادہ ہوتا گیا۔ مالگزاری کے متاجر نے سیاسی بدنظمی سے اور اس کی بنا پر اپنی طاقت کو بڑھانے کے خاص موقعوں سے پورا فائدہ اٹھا کر اپنی حیثیت کو بتدریج مستحکم کر لیا۔

---

[1] دیکھو محصول کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ ۵۳۔

وہ اپنی زمین سیر کے علاوہ بڑے افتادہ رقبے پر کاشت کر کے پہلے اپنی تحویل کی زمین کی ملکیت کا مدعی بنا اور بعد میں چل کر اس نے چھوٹے چھوٹے ہمسایہ کسانوں کی زمین جائز یا ناجائز طریقے سے خرید لی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لارڈ کارنوالس کے دور حکومت تک مالگزاری کے مستاجر ترقی کر کے ایک ایسی طاقتور جماعت بن گئے تھے کہ ان میں اور باضابطہ مالکان زمین میں کوئی فرق باقی نہیں رہا تھا۔ جیسا کہ روبرٹس اپنی کتاب موسوم بہ "تاریخی جغرافیہ ہند" میں لکھتا ہے، "زمیندار کی حیثیت ابتداً ایک موروثی معاہدہ کی ایجنسی کی تھی جس کے ذریعے سے مالگزاری وصول کی جاتی تھی، لیکن اب وہ ایک حد تک مقطعہ یا جاگیر کے مشابہ ہو گئی"۔ مغلیہ دور حکومت کے آخری زمانے کی بدانتظامی اور حکومت کی دیرینہ مالی مشکلات نے مستاجروں کی حیثیت کو روز بروز قوی کیا، اس لیے کہ آڑے وقت میں حکومت کے کام آنے والا اور نقد لینے کا یہی ایک ذریعہ تھا۔ مالگزاری کے نظم و نسق کی نگرانی کا سرکاری انتظام مفقود ہو جانے کی وجہ سے مستاجر کے کاروبار بے روک ٹوک انجام پانے لگے، اور حکومت کا نظام اس درجہ بگڑ گیا تھا کہ اس میں ان کے دستبرد اور جبر و ستم سے کسان کو محفوظ رکھنے کی خواہش یا سکت باقی نہیں رہی تھی۔

مالگزاری کی مستاجری ابتداً مغلیہ سلطنت اور خاص کر صوبۂ بنگال تک محدود رہی لیکن بعد میں وہ بہت جلد اسی کے مماثل اسباب کی بنا پر ملک کے دوسرے علاقوں میں بھی رائج ہو گئی، حتیٰ کہ مرہٹوں نے بھی، جن کا مالگزاری کا طریق اٹھارویں صدی کے آخری نصف حصے میں نانا فرناویس کے تحت عام طور پر بہت عمدہ اور منصفانہ تسلیم کر لیا گیا تھا، نانا فرناویس کے انتقال کے بعد آخر نااہل پیشوا کے دور حکومت میں اس کو بہت جلد اختیار کر لیا۔ یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ اگرچہ یہ طریق اس طرح عام طور پر پھیل گیا پھر بھی اس کے اثرات یکساں نہ تھے۔ شمالی ہند میں، جہاں وہ سب سے پہلے رائج ہوا اور جہاں مرکزی اقتدار بہت جلد کمزور پڑ گیا، یہ اثرات زیادہ مکمل اور دیرپا تھے، جیسا کہ بنگال میں زمینداری حقوق کی ترقی سے ثابت ہوتا ہے۔ دوسرے مقامات مثلاً دکن میں

ؔ تمام مستاجر بلحاظ اپنی اصلیت و نوعیت کے "زمیندار" اور بعض اوقات "تعلقدار" کہلاتے تھے لیکن ان القاب کے مفہوم میں اراضی کے بارے میں کوئی قطعی حق مالکانہ لازمی طور پر داخل نہ تھا۔

اس کے مستقل آثار باقی نہ رہے، بجز کون کن جیسے سرحدی علاقوں کے جہاں گوتوں نے جو ایک زمانے میں مالگزاری کے مستاجر تھے، زمیندارانہ حقوق حاصل کر لیے تھے۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیانی علاقے، مثلاً صوبۂ متحدہ میں مستاجروں نے صرف چند زمیندارانہ حقوق حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ یہی بات کم و بیش پنجاب کے بارے میں صادق آتی تھی۔ مالگزاری کی مستاجری اور عام انتظامی خرابیوں کا عام نتیجہ یہ دیکھا گیا کہ حقیت اراضی و حقوق ملکیت میں روز افزوں زیادہ پیچیدگیاں پیدا ہوتی گئیں، اور سابقہ معمولات مثلاً باقاعدہ بندوبست اور تشخیص لگان کے طریقے سے جو اکبر اعظم کے زمانے سے رائج تھا بتدریج انحراف کیا گیا۔ ان تمام امور نے جدید برطانوی حکمرانوں کے کام کو مالگزاری کے نظم و نسق کی کسی معقول تجویز کی عدم موجودگی میں بہت دشوار بنا دیا۔ اس لحاظ سے یہ بالکل قدرتی امر تھا کہ ابتدا غلطیاں سرزد ہوئیں، اور ایک زمانۂ دراز کے بعد مختلف صوبوں کے لیے کوئی معقول نظام تشکیل پایا۔

۴۔ حقیت اراضی کی تین قسمیں[1]

حقیت اراضی کے مسئلے کی اصلی دلچسپی سے قطع نظر کرتے ہوئے اس مسئلے کو اچھی طرح سمجھ لینا اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس کے متعلق کافی معلومات حاصل کیے بغیر مالگزاری کے بندوبست کے طریقوں کو، جو مختلف صوبوں میں رائج ہیں، سمجھنے میں بہت دشواری ہوگی۔ چنانچہ حقیت اراضی کی قسم اور طرز یعنی یہ امر کہ زمین کس طریقے پر قبضے میں ہے اس شخص یا ان اشخاص کا تعین کرتی ہے جو مالگزاری ادا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ گویا یہ قسم اور طرز ہی بندوبست کی شکل، زمین کے حقوق اور مفادات کے مختلف مدارج، حقوق کی شناخت اور باہمی تعلق اور مالگزاری کی تشخیص کے بارے میں اختیار کردہ طریقے کی نوعیت کا تعین کرتی ہے۔

ہندوستان کی حقیت اراضی کا طریقہ ہر ممکنہ نوع ظاہر کرتا ہے یعنی اس کے

---

[1] اس باب میں بیان کردہ امور کے بیشتر حصے کے لیے ہم بی۔ ایچ بیڈن پاؤل کے ممنون ہیں جن کی کتاب موسوم بہ "برطانوی ہند کے نظام ہائے اراضی" نیز دوسری کتاب موسوم بہ "برطانوی ہند میں لگان اور حقیت اراضی" سے ہم کو مدد ملی۔

باب ۱۲ 394

تحت نہ صرف بڑی جائدادیں اور جاگیریں ہیں جن میں ہزاروں اسامی اور کسان کام کرتے ہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے کھیت بھی ہیں جن کا رقبہ ایک ایکڑ سے بھی بہت کم ہے۔ پھر بھی بخوبی معین قسموں میں کھیتوں کی تبویب کرنا ممکن ہے[1]۔ ہندوستان میں حقیت اراضی کی تین بڑی قسمیں حسب ذیل ہیں:۔ (۱) زمینداری حقیت کی مختلف شکلیں ہیں، جن میں ایک شخص یا زیادہ سے زیادہ چند مشترک مالک، کل جائداد کے لیے مالگزاری کی رقم یکشت ادا کرنے کے ذمہ دار قرار دیے جاتے ہیں جیسا کہ بنگال میں ہوتا ہے؛ (۲) چھوٹی جائدادیں، جو اول الذکر قسم ہی کی نوعیت رکھتی ہیں، لیکن ان کی بعض نمایاں خصوصیات بھی ہیں۔ یہ دیہی جائدادیں ہیں جو مشترکہ جماعتوں یا دیہی برادریوں کے قبضے میں ہوتی ہیں جن کے ارکان کو مشترکہ طور پر اور فرداً فرداً مالگزاری کا ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے۔ اس صورت میں ہمیں "اجتماعی یا "معیاری" زمیندار سے سابقہ پڑتا ہے، (۳) آخر میں یہ کہ منفرد اور آزاد کھیتوں کی شکل میں بھی زمین پر قبضہ کیا جاتا ہے جن کے مالک الگ الگ افراد ہوتے ہیں، اگرچہ وہ مقامی طور پر دیہات میں یکجا ہوتے ہیں اور انفرادی مالک، مالگزاری کی ادائی کے لیے فرداً فرداً ذمہ دار ہوتے ہیں۔ حقیت اراضی کی ان تینوں قسموں کو علی الترتیب (۱) زمینداری طریق (۲) مشترک دیہی (دیہی برادری کا) طریق یا محل واری طریق، اور (۳) رعیت واری طریق کہتے ہیں۔

۳۔ گاؤں کی ترکیب کی دو بڑی شکلیں[2]

ہم ان عام اسباب کو بیان کر چکے ہیں جو ایک خاص طرز آبادی موسوم بہ "گاؤں" کی نوعیت و ابتدا کی توجیہ کرتے ہیں[3]۔ ہم نمونے کے ایک گاؤں کی اہم خصوصیات مثلاً بعض دیہی عہدہ داروں، دستکاروں اور ادنیٰ ملازموں وغیرہ کی موجودگی کا ذکر بھی ایسے عام طریقے پر کر چکے ہیں

---

[1] دیکھو ایک کتاب موسوم بہ "ہندوستان ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۱ء میں"۔ صفحہ ۱۶۹۔

[2] ہندوستانی دیہات کی شکلوں اور نوعیت کے دلچسپ اور نزاعی مسئلے کے لیے دیکھو بیڈن پاول کی کتاب موسوم بہ "برطانوی ہند میں مالگزاری اور حقیت اراضی"، صفحہ ۸۵ تا صفحہ ۹۰۔

[3] دیکھو باب ۵۔

باب ۱۲ کہ اس کا اطلاق ہندوستان کے اکثر دیہات پر ہوتا ہے۔ اب اندرونی ترکیب کی حد تک ہندوستانی دیہات کے باہمی فرق و اختلاف پر زور دینا ضروری ہے، اس لیے کہ یہ مالِ حقیت اراضی کی نوعیت پر اور حقیت ارضی کے توسط سے بندوبست مالگزاری کی شکل پر بہت اہم اثر ڈالتا ہے۔ ہندوستان میں دو نمایاں قسم کے دیہات ہیں، ایک تو رعیت واری یا انفرادی ملکیت کے گاؤں اور دوسرے زمینداری یا مشترکہ گاؤں، موخر الذکر قسم کئی دلچسپ چھوٹی چھوٹی ذیلی قسموں میں تقسیم ہے[1]۔

(۱) رعیت واری گاؤں۔ رعیت واری گاؤں کی اندرونی ترکیب مقابلتہً سادہ ہے۔ زمین انفرادی ملکیت میں ہوتی ہے اور اس پر مختلف مالک الگ الگ کاشت کرتے ہیں، اور ممکن ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے ملکیت وراثت میں پایا ہو یا خریدا ہو یا صحرا کے ایک خطے کو خس و خاشاک سے پاک کر کے قبضہ کیا ہو۔ 395 ان جدا گانہ و منفرد کسانوں، مالکوں اور ان کے کھیتوں کے مجموعے پر رعیت واری گاؤں مشتمل ہوتا ہے۔ گاؤں کی افتادہ اور بنجر زمین حکومت کی ملک ہوتی ہے، اگرچہ ممکن ہے کہ دہقان ان کو چراگاہ کے طور پر یا لکڑی کاٹنے وغیرہ کے لیے استعمال کریں۔ ہر کھیت کی مالگزاری الگ شخص کیجاتی ہے اور اس کی ادائی کی ذمہ داری انفرادی ہوتی ہے۔ مشترکہ دیہی عہدہ داروں کے تابع ہونے اور دیہی دستکاروں اور ادنیٰ خدمت گاروں کی خدمات سے مشترکہ طور پر استفادہ کرنے کے علاوہ دہقانوں میں ربط و اتحاد قائم کرنے والا کوئی اور بندھن نہیں ہوتا۔ ان تمام امور سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ گاؤں کے چودھری یا پٹیل اور عام طور پر دیہی عہدہ داروں کی اہمیت، زمینداری گاؤں کے مقابلے میں رعیت واری گاؤں میں زیادہ ہوتی ہے۔ اس قسم کے گاؤں مدراس، بمبئی، برار اور وسطی ہند میں عام طور پر پائے جاتے ہیں اور مالگزاری اور زمینداری حقوق علی الترتیب قایم کیے جانے سے پیشتر صوبۂ متوسط اور بنگال میں بھی موجود تھے۔

(۲) زمینداری یا مشترکہ گاؤں:۔ نام نہاد زمینداری گاؤں یا تو ایک منفرد

---

[1] دیکھو بیڈن پاول کی کتاب موسوم بہ "برطانوی ہند میں نظام ہائے اراضی" جلد اول، باب ۴۔

باب ۱۲

زمیندار یا شرکار کی ایک جماعت کی ملکیت ہو سکتا ہے جو ممکن ہے کہ ایک جدی
خاندانوں کے گروہ کی نمایندگی کرے اور اجتماعی طور پر گاؤں کے زمیندار کی حیثیت سے
موجودہ ملکیت کی حقدار ہو یا خود اپنی قوت بازو سے زمینداری قایم کرے، لیکن بہرصورت
گاؤں ایک منفرد اکائی مانا جاتا ہے۔ انفرادی یا اجتماعی زمیندار یہ دعوی کرتا ہے کہ
وہ دوسرے زراعت پیشہ اسامیوں کے مقابلے میں اونچی ذات اور مرتبے کا ہوتا ہے،
گو ممکن ہے کہ بعض اوقات شرکا اپنے طور پر زمین پر کاشت کریں۔ گاؤں کی افتادہ
زمین بحیثیت مجموعی دیہی برادری کی ملک ہوتی ہے چنانچہ وہ اسامیوں کو لگان پر
دی جاسکتی ہے اور وصول شدہ لگان برادری کے ارکان میں تقسیم ہو سکتا ہے یا
اس زمین کو حکومت کی اجازت کے بغیر اجزا میں تقسیم کیا جاسکتا یا زیر کاشت لایا جاسکتا ہے
اس کی مالگزاری بحیثیت شخص کی جاتی ہے جس کے ادا کرنے کی ذمہ داری شرکار کی
کل جماعت مجموعی و انفرادی حیثیت سے ہوتی ہے، اگرچہ مشترک ذمہ داری سے
خاص طور پر استثنا حاصل کیا جاسکتا ہے اور کوئی شریک لگان کا انفرادی حصہ
حکومت کی اجازت سے خاص طور پر الگ کر سکتا ہے۔ گاؤں کے مشترکہ معاملات
کا انتظام ابتداءً پنچایتوں یا نمایندہ جماعتوں کے ذریعے سے ہوتا تھا جو ممتاز شریک کار
خاندانوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ سچ پوچھو تو کوئی ایک شخص گاؤں کا بڑا یا چودھری
نہ ہوتا تھا، اگرچہ ممکن ہے کوئی فرد "نمبردار" کی حیثیت سے منتخب کر لیا جائے تاکہ
دیہی برادری کے نمایندے کے طور پر حکومت سے معاملات طے کرے، خاص کر
بندوبست مالگزاری کے سلسلے میں۔ اس قسم کا گاؤں پنجاب میں خاص طور پر بہت
ترقی یافتہ حالت میں ہے اور زیادہ تر مسلمانوں کے خیالات اور نظریے کے مطابق ہے
اور رعیت واری گاؤں سے جو ہندو طرز حکومت اور ہندو خیالات کے مطابق ہے
نمایاں امتیاز رکھتا ہے۔ اس طرز کا گاؤں نہ صرف جاٹ، گوجر اور وسطی پنجاب کے
دوسرے فرقوں میں بلکہ فاتح آرین قوموں اور دوسرے علاقوں کے سرداروں اور
راجاؤں کے اخلاف میں بھی پایا جاتا ہے۔

396

۴۔ مشترکہ یا زمینداری دیہات کی قسمیں اور ترکیب۔

اس قسم کے دیہات کی اندرونی ہیئت ترکیبی کے مزید تفصیلات کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے

باب

ہم ان تین نمایاں انواع کا ذکر کر سکتے ہیں جن کا انحصار اُن اصول پر ہے جن کے مطابق شرکا، زمین یا زمین کا منافع اور پیداوار آپس میں تقسیم کرتے ہیں۔ (۱) اولاً آبائی دیہات کو لیجیے[1]، جن میں آبائی یا خاندانی حصے کا طریق رائج ہے جس کے تحت شرکا کی جماعت کا ہر رکن، کل کا اتنا ہی جز ولیتا ہے جو شجرے میں اس کے درجے کے مطابق قرار پائے۔ آبائی دیہات کی حسب ذیل قسمیں ہیں:۔ (ا) وہ دیہات جو مشترکہ جماعت کے قبضے میں اسی طرح غیر منقسم ہوں جس طرح مشترکہ غیر منقسمہ خاندان کے تحت ہوتے ہیں، (ب) وہ دیہات جو آبائی حصے کے طریق کے تحت منقسم ہوں (پٹی داری) اور (ج) وہ گاؤں جو آبائی یا موروثی طریق پر جزوی حیثیت سے منقسم ہوں (غیر مکمل پٹی داری)۔ (۲) غیر آبائی دیہات، جن میں حقیقی "بھائی چارہ"[2] کے حسب ذیل اصول کے تحت حصے بخرے کے خاص رواجی طریقے ہوتے ہیں:۔ (ا) زمین کو مصنوعی طریق پر کئی مساوی خطوں میں تقسیم کر کے حصہ دینا، (ب) ہلوں کے حساب سے حصہ دینا جس میں ہلوں کی تعداد کے لحاظ سے زمین تقسیم کی جاتی ہے، یا (ج) پانی کے لحاظ سے حصے، یا (د) کنوؤں کے لحاظ سے حصے۔ لیکن ان سب صورتوں میں تقسیمات کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ایک سالم مشترک ملک کے حصے ہیں۔ (۳) حقیقی کھیتوں کا طریق، جس میں حصہ داری کا کوئی معین قاعدہ نہیں ہوتا اور موجودہ کھیت حقیقی ملک تسلیم کیے جاتے ہیں۔ مثلاً ممکن ہے کہ یہ طریقہ ایسے دیہات کے قدیم خاندانی طریق کی شکست سے اخذ کیا گیا ہو جو ایک زمانے میں پٹی داری تھے، لیکن جہاں تغیرات و حادثات زمانہ کے باعث اور بوجھل اور گراں بار مالگزاری کے اثرات کی وجہ سے قدیم حصہ داری کا طریق درہم برہم ہو گیا ہو اور اس لحاظ سے حقیقی ملکی کھیتوں کا اصول تسلیم کر لیا گیا ہو، یا یہ ممکن ہے کہ اس کا رواج ہمیشہ سے

---

[1] آبائی دیہات میں منفرد زمینداری دیہات بھی شامل ہیں جہاں زمین یا حصص کی تقسیم کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔

[2] "بھائی چارہ" کی اصطلاح سرکاری طور پر زیادہ وسیع مفہوم میں استعمال کی جاتی ہے اور غیر آبائی زمینداری دیہات کی تمام قسموں کو محیط ہے۔

چلا آرہا ہو جس کے تحت حقیقی ملکی کھیت شروع ہی سے تسلیم کر لیے گیے ہوں۔

موروثی دیہات میں لگان کا بار کم و بیش قریب قریب اور اصولی طور پر جائداد کے حصے کے تناسب مقرر کیا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف غیر موروثی شکلوں میں مالگزاری کا بار بھائی چارہ، یا حقیقی کھیت کے اصول کے مطابق حقیقی کھیتوں کے تناسب سے مقرر کیا جاتا ہے۔

حصہ داری کے ان تین مختلف اصول کے متعلق یہ خیال کرنا چاہیئے کہ وہ ان تین ممکنہ طریقوں میں سے کسی نہ کسی طریقے کی پیداوار ہیں جن کی بنا پر سب مشترکہ یا زمینداری دیہات قائم کیے گیے ہیں یعنی (۱) وہ یا تو ایسی جماعتیں تھیں جو مشترکہ طور پر ایسی گاؤں کی وارث ہوئی ہیں جو ابتداءً ایک مشترک جد اعلیٰ کے قبضے میں تھا اور یہ ممکن ہے کہ یا تو اس کا بانی مبانی یا معطی یا مالگزاری کا مستاجر ہوتا ہو یا کوئی حکمراں سردار ہو جس کی حیثیت گھٹ کر زمیندار کی ہو گئی ہو، جیسا کہ صوبۂ متحدہ میں ہوا یا (۲) وہ ایسی جماعتیں ہیں جو کئی خاندانوں پر مشتمل ہوں اور یہ خاندان کسی توطن پذیر یا فاتح قبیلے سے تعلق رکھتے ہوں جس نے اپنے رسم و رواج کے مطابق رقبہ تقسیم کیا ہو یا (۳) وہ محض امداد باہمی کے اصول پر نوآبادیات قائم کرنے والی جماعتیں ہوں اور ایسے حالات کے تحت قایم کی گئی ہوں جن کی بنا پر وہ مشترک سرمایہ کے اصول پر کاشت کرنے کی جانب مائل ہوئی ہوں۔

یہاں یہ کہہ دینا نامناسب نہ ہوگا کہ گاہ گاہ یہ ممکن ہے کہ دیہی زمینداری جماعتوں کے اوپر اودھ و آگرہ کے تعلقداروں کے مثل حکمراں جاگیردار رونما ہوں۔ یہ تعلقدار کئی دیہی برادریوں کے حکمراں زمیندار ہوتے ہیں لیکن یہ برادریاں وہی اساسی اصول برقرار رکھتی ہیں جیسے کہ آزاد دیہی برادریاں۔ ان حکمراں جاگیری حقوق کا منبع و ماخذ آزاد زمینداری دیہات کے منبع و ماخذ کے مشابہ ہے۔

۵۔ جاگیریں یا بڑی زمینداریاں جن میں ایک سے زائد گاؤں ہوتے ہیں۔

بعض بڑی جاگیریں ایک گاؤں کے رقبے سے زاید رقبے پر پھیلی ہوئی ہوتی ہیں بلکہ غالباً پورا ایک ضلع یا پرگنا ان میں شامل ہوتا ہے، اگرچہ وہ گاؤں جو ان کے

باب ۱۲

اجزائے ترکیبی ہیں اس صورت میں بھی اپنی اہمیت کو برقرار رکھتے ہیں۔ یہ بڑی زمینداریاں بہ لحاظ نوعیت کوئی خاص خصوصیات نہیں پیش کرتیں اور اس کی توجیہ وہی زمینداری کے اصول پر کی جا سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ موجودہ مالک زمین کسی علاقے کے سابق سردار یا حکمراں کا جانشین یا مالگزاری کے کسی ٹھیکہ دار یا دوسرے عہدہ دار یا کسی ریاست کے موہوب الیہ یا جاگیردار یا انعامدار کا وارث ہو۔ ایسی حالت میں جائداد کے رقبے کے وسیع ہونے کا باعث محض یہ واقعہ ہے کہ زمیندار نے کسی عالی مرتبہ جاگیردار سے جائداد ورثے میں حاصل کی یا اس کا تعلق براہ راست کسی حکمراں سے تھا۔ ایسی جاگیریں جن کے مالک زمیندار ہیں، بنگال میں بہت بڑے پیمانے پر اور آگرہ و اودھ میں کسی حد تک پائی جاتی ہیں جہاں تعلقداروں کی جماعت موجود ہے۔ پنجاب میں ان کی تعداد بہت ہی کم بلکہ برائے نام ہے۔ صوبہ متوسط میں زمینداروں کی خاصی بڑی جماعت موجود ہے جنھیں مالگزار کہتے ہیں۔ ان کی جاگیروں کا تناسب صوبے کے مجموعی رقبے کے لحاظ سے بہت بڑا ہے تاہم وہ بنگال کے مفہوم کے لحاظ سے زمیندار نہیں ہیں۔ بمبئی میں بھی مختلف قسم کی بڑی زمینداریاں ہیں۔ جاگیرداروں اور انعامداروں کے طبقے کے علاوہ گجرات کے تعلقدار اور دکن کے مغربی ساحل کے "کھوٹ" اسی ذیل میں آتے ہیں۔ مدراس میں خاص کر شمالی علاقے میں کئی بڑی زمینداریاں بنگال کے نمونے کی موجود ہیں۔

ہندوستان میں مالکانہ حقیت اراضی کا یہ تبصرہ ان شکلوں کی گوناگوں پیچیدگیوں اور مختلف انواع کو واضح کرتا ہے جو کئی تاریخی عاملین مثلاً جنگ و جدال، حملوں، فرقہ وارانہ اور مقامی فتوحات اور حکمراں خاندانوں کے عروج و زوال کے نتیجے کے طور پر رونما ہوئی ہیں۔ زمین کو صاف کر کے اس پر قبضہ کرنے کا حق تو ابتداءً لازمی طور سے اہم تھا ہی، اس میں زمین کی فتح، ہبہ اور فطری برتری وغیرہ کے حق کا اضافہ ہو گیا۔

۶۔ ذیلی مالکانہ و کاشتکارانہ حقوق 59

فتح، ہبہ یا متاجری کے نتیجے کے طور پر متعدد حقوق کے ایک کے اوپر ایک قائم ہونے کے اس عمل میں جس طرح نئے زمیندارانہ حقوق پیدا ہو سکتے ہیں اسی طرح ویسے ہی مالکانہ حقوق بھی گھٹ کر ذیلی مالکانہ یا کاشتکارانہ حقوق

کی شکل اختیار کر سکتے ہیں۔ بعض صورتوں میں سابق مالکان زمین جاگیردار کے تحت رہ کر بھی اپنی حقوق یافتہ حیثیت برقرار رکھ سکتے تھے اور مالک کی حیثیت سے کسی شخص کے بالادست تسلیم کر لیے جانے کی وجہ سے اس کے زیردستوں کا تسلیم کیا جانا بھی ضروری ہو گیا۔ حقوق اراضی اور خاص کر ان کے کثیر مدارج کی وجہ سے جو بدنظمی اور پیچیدگیاں پیدا ہوئیں ان کی بنا پر ان حقوق کا تسلیم کرنا بہت دشوار ہو گیا۔

چونکہ رعیت واری علاقوں میں حقوق کی اتنی کثرت نہ تھی، اس لیے مسئلہ نہایت سادہ تھا اکثر صورتوں میں کسان ہی زمیندار بھی ہوتا تھا۔ جن صورتوں میں کہ اسامیوں سے کام لیا جاتا تھا، وہاں اس بارے میں کوئی شبہہ نہ تھا کہ وہ معمولی تعہدی اسامی تھے جو مالک زمین فراہم کرتا تھا اور اس لحاظ سے انھیں قانونی طور پر تسلیم کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ زیادہ سے زیادہ چند صورتوں میں یہ ممکن تھا کہ چھوٹا سا جاگیردارانہ حق موجود ہو، جس کا پوری طرح انتظام اسطرح کیا جاتا تھا کہ مستقل مالک مقررہ لگان ادا کر دیا کرتا تھا۔ لیکن زمینداری علاقوں اور مشترک دیہی زمینداریوں میں صورت حال بدرجہا زیادہ پیچیدہ تھی اس لیے کہ کئی درمیانی مدارج پیدا ہو گئے تھے۔ بیڈن پاؤل مندرجۂ ذیل جدول میں ان مختلف حقوق و مفادات کی تشریح کرتے ہیں جو حکومت اور حقیقی کسان کے درمیان حائل اور رونما ہو سکتے ہیں۔ حکومت، مالگزاری کے حقوق اور گاہ گاہ راست ملکیت زمین کے حقوق رکھتی ہے اور تمام حقوق کا سرچشمہ ہونے کی حیثیت سے سب سے اوپر ہے، اور حقیقی کسان، جہاں کہیں اس کو قبضے کے مستقل حقوق حاصل ہوں، سب سے نیچے ہے[1]۔

(۱) ذیلی مالکانہ حقوق۔ ذیلی مالکانہ حقیت اراضی کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ کسان اپنے مخصوص کھیت کی حد تک پوری طرح مالک ہوتا ہے، لیکن نہ تو کل جائداد

[1] دیکھو بیڈن پاؤل کی کتاب موسومہ "قانونی ہند کی مالگزاری اور حقیت اراضی" صفحہ ۱۲۹۔ نیز دیکھو بنگال کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ ۱۰۔ ... فرنگج کی ایک زمینداری میں مالک اور کسان کے درمیان یکے بعد دیگرے کم از کم تیس حقوق ... [illegible]

باب	ایک حق	دو حقوق	تین حقوق	چار حقوق	
	۱۔ حکومت تنہا مالک ہو۔	۱۔ حکومت ۲۔ رعیت یا قابض زمین جو معین حقوق رکھتا ہو اسامی نہ ہو جیسے کہ مدراس، بمبئی، برار وغیرہ میں۔	۱۔ حکومت ۲۔ زمیندار، تعلقہ دار یا مشترکہ دیہی جماعت جو بحیثیت مجموعی زمین کی مالک ہو۔ ۳۔ حقیقی کھیتی باڑی کرنے والے کسان انفرادی شرکا وغیرہ	۱۔ حکومت ۲۔ زمیندار ۳۔ ذیلی مالک یا حقیت دار ۴۔ رعیت یا حقیقی کسان۔	۱۔ حکومت ۲۔ صدر زمیندار یا اعلیٰ جاگیردار۔ ۳۔ حقیقی مالک زمین یا زمیندار (بالعموم دیہی جماعت) ۴۔ حقیقی کسان، انفرادی شرکا وغیرہ۔

یا اس کے منافع میں اس کا کوئی حصہ ہوتا ہے اور نہ اس کے انتظام میں کوئی دخل۔ اس قسم کی مثالیں بنگال میں ملتی ہیں جہاں بعض اشخاص کو جنھیں "حقیت دار" کہتے ہیں مقررہ معاوضے پر مستقل، قابل توریث اور قابل انتقال حقیت اراضی کی رعایتی حیثیت عطا کی گئی ہے اس لیے کہ وہ اس حیثیت کو زمیندار طبقے کے تمام تسلط و غلبے کے باوجود برقرار رکھنے کے قابل تھے۔ ان کی حیثیت کو معین کرنے میں جو مشکل تھی اس کی بنا پر آخر کار اس قاعدہ کو اختیار کرنا پڑا جو ۱۸۹۵ء کے قانون کے تحت بنایا گیا تھا۔ کہ وہ سب اشخاص جو زمیندار سے نیچے تھے اور ایک سو بیگہ زمین رکھتے تھے، "حقیت دار" کی حیثیت اور درجے کے مستحق تھے۔

اس قسم کے حقوق کی ایک اور جدید مثال پٹی داروں کے طبقے سے بہم پہنچتی ہے جن کو زمینداروں کی طرف سے مستقل انتظامی پٹہ ان کے علاقے کے ایک جزو کے لیے دیا گیا تھا، اور زمینداروں نے ایسا اس لیے کیا کہ وہ اپنی جائداد غیر منقولہ کو حد سے زیادہ بوجھل پاتے تھے اور اپنے ذمے کی مالگزاری ادا کرنے میں دوسروں کو

باب ۱۲

شریک کرنے کے خواہاں تھے۔ یہ پٹی دار اپنے طور پر "در پٹی دار" کے نام سے دوسری اسامیاں قائم کرتے تھے، ان کو بھی اس قسم کے حقوق دیے جاتے تھے اور ان کی مالگزاری کی ذمہ داریاں بھی اسی قسم کی ہوتی تھیں۔ چنانچہ ان حقوق کو بنگال ریگولیشن بت ۱۸۱۹ء میں تسلیم کر لیا گیا۔

ذیلی مالکوں کی ایک اور قسم ان صورتوں میں پائی جاتی ہے جن میں کہ موجودہ زمیندار جماعت کسی قدیم جماعت کے اوپر رونما ہو گئی ہو، بعض خاندان صرف سرکاری مالگزاری ادا کر کے اپنی حیثیت کو مستحکم رکھنے کے قابل تھے اور اپنے کھیتوں کی حد تک بالادست زمیندار کو کوئی لگان ادا نہ کرتے تھے۔ صوبۂ متوسط میں، اس قدیم پالیسی کے زیر اثر جو شمالی ہند میں مالگذاری کی ذمہ داری ہر گاؤں میں (خواہ وہ رعیت واری ہی کیوں نہ ہو) ایک ہی زمیندار پر عاید کرنے کے بارے میں اختیار کی گئی تھی، "مالگزاروں" کی ایک جماعت بنائی گئی اور اس جماعت کے بنانے کی وجہ سے ذیلی مالکانہ حقوق کو تسلیم کرنا ضروری ہو گیا۔ آخر میں یہ کہ اودھ میں گاہ گاہ تمام ایسی جماعتیں، آزاد انتظام کے بارے میں اپنے حقوق کو اس شرط کے تابع محفوظ رکھنے کے قابل تھیں کہ تعلقدار کو ایک مقررہ لگان ادا کیا جائے۔ چنانچہ ان کے ذیلی مالکانہ حقوق ان سے ایک جداگانہ ذیلی معاہدہ طے کر کے تسلیم کر لیے گئے ہیں اور ان کے ذمہ کے لگان کو جو وہ تعلقدار کو ادا کریں گے مقرر کر دیا گیا ہے، حکومت تعلقداروں سے براہ راست معاملہ کرتی ہے۔

(۲) لگان دار کے دوامی حقوق[۱] اب ہم زمین کی مستاجری کے حقوق کی بحث کریں گے یعنی معمولی تعہدی اسامیوں کے حقوق کی نہیں بلکہ خاص حقوق اور حیثیت رکھنے والے اسامیوں کے حقوق کی۔ ہم ہر صوبے کی چھوٹی تفصیلات میں پڑے بغیر پہلے تمام صوبوں کی مشترکہ خصوصیات کے بیان پر توجہ مرتکز کریں گے۔

400

---

[۱] دیکھو بیڈن پاؤل کی کتاب محولۂ بالا، باب ۱، فصل (۵)، اور محصول کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ (۶۰)۔

باب ۱۲

جو عام خصوصیات زمیندارانہ حقوق کے پیدا ہونے کی توجیہ کرتی ہیں وہی مختلف قسم کے اسامیوں کے حقوق کی تشریح و توجیہ کرتی ہیں۔ جو لوگ اس وقت زمینداری جائدادوں میں، خواہ وہ مشترکہ ہوں یا انفرادی، اسامی شمار کیے جاتے ہیں وہ کسی زمانے میں لازمی طور پر اعلیٰ تر حیثیت رکھتے ہوں گے۔ زمیندارانہ یا جاگیردارانہ حقوق جتنے زیادہ مکمل ہوں گے اور ان حقوق کو حاصل کرنے والے اشخاص کو جتنی زیادہ مدت اور سہولتیں حاصل ہوں گی اتنا ہی ادنیٰ درجے والوں کی حیثیت زیادہ گھٹتی جائے گی۔ اس طرح مختلف قسم کے اسامیوں کے حقوق رونما ہوں گے اور ان کا انحصار اس دباؤ پر ہوگا جو اوپر سے پڑے گا۔ برطانوی حکومت کو اسامیوں کے حقوق کے تسلیم و معین کرنے میں دو مشکلات پیش آئیں۔ ایک تو یہ کہ تمام صورتوں میں اس امر کا براہ راست ثبوت نہیں مل سکتا تھا کہ اسامیوں کو سابق میں اعلیٰ حیثیت حاصل تھی، اور دوسرے یہ کہ ان اشخاص کے علاوہ جو سابقہ مالکانہ حیثیت کی بنیاد پر تسلیم کیے جانے کے مستحق تھے دوسرے ایسے اسامی بھی تھے جو ایک لحاظ سے حقوق یافتہ جماعت تھے، اس لیے کہ زمینداروں نے انھیں یہ حیثیت معاہدے کی بنا پر دی تھی، لیکن ایسے زمانے میں دی تھی جب کہ اسامیوں کا وجود اس قدر بیش بہا تھا کہ ان کا اخراج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اصلی اور نقلی اسامیوں کے درمیان امتیاز قایم کرنا پڑا۔ اصلی اسامی وہ تھے جن کی تائید میں قطعی واقعات پیش اور ثابت کیے جا سکتے تھے، نقلی اسامی وہ تھے جو اپنے حقوق کی ابتدا اور قرائن کا مین اور قطعی ثبوت نہیں پیش کر سکتے تھے۔ نقلی اسامیوں کا معاملہ طے کرنے کی غرض سے بنگال، آگرے اور ایک حد تک صوبۂ متوسط میں بھی بارہ سالہ قاعدہ اختیار کیا گیا۔ بنگال اور آگرے میں ۱۸۵۹ء کے قانون لگان داری کی رو سے اسامی کو دخیل کار پٹہ دار کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا، بہ شرطیکہ اس نے ایک ہی زمین پر مسلسل بارہ سال تک کاشت کی ہو۔ لیکن اس قانون کے عملدرآمد سے زمینداروں نے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی، چنانچہ انھوں نے اس کو ناممکن بنا دیا کہ کوئی پٹہ دار ایک ہی خطۂ زمین پر مطلوبہ مدت تک مسلسل قابض رہے

باب ۱۲

اور اسی لیے بنگال میں اس میں ۱۸۸۵ء میں ترمیم کر دی گئی۔ اس طرح اب یہ ضروری نہ رہا تھا کہ کاشت لازمی طور پر ایک ہی خطۂ زمین پر ہو بلکہ ایک ہی گاؤں میں کسی خطۂ زمین پر مسلسل بارہ سال تک ہو۔ آگرے میں اس قانون کی باقاعدہ ترمیم اس طریقے پر نہیں کی گئی بلکہ ایک نئے قانون کے ذریعے سے جو ۱۹۰۱ء میں منظور ہوا کئی بندشیں عائد کی گئیں تاکہ زمیندار کو اس امر سے باز رکھا جائے کہ وہ قوانین کے مقصد کو فوت کرے۔[1] اودھ میں حقوق دخیل کاری ابتداءً ۱۸۶۸ء کے قانون کے تحت ایسے اسامیوں تک محدود تھے جو کسی زمانے میں مالکانہ حقوق سے متمتع ہونے کے بعد محروم ہو گئے تھے لیکن بعد میں وہ سابق مالکوں تک بھی وسیع کیے گئے جن کے حقوق مالکانہ، فروخت یا قرقی کے ذریعے سے منتقل ہو گئے تھے۔ پنجاب میں دخیل کاری صرف ایسے اسامی حاصل کر سکتے ہیں جن کے مطالبات بعض تاریخی بنیادوں پر قائم ہوں اور محض مرور زمانہ پر مبنی نہ ہوں۔ پنجاب ایکٹ (بابت ۱۸۶۸ء) میں دخیل کار اسامیوں کی تعریف یہ کی گئی ہے: "وہ لوگ جنھوں نے دو نسلوں تک مالکوں کو نہ تو لگان ادا کیا اور نہ ان کی کوئی خدمت انجام دی ہو بلکہ صرف سرکاری مالگزاری ادا کرتے رہے ہوں۔" صوبۂ متوسط میں بھی ابتداءً بارہ سالہ قاعدہ نافذ کیا گیا لیکن بعد میں چل کر اس کو ترک کر دیا گیا اور اس کے بجائے ایسا انتظام کیا گیا جس کی رُو سے حق دخیل کاری، سالانہ لگان کے ۲ یا ۲½ گونہ رقم ادا کرنے پر خریدا جا سکتا تھا۔ یہ انتظام بھی بدل دیا گیا اور اس کی بجائے دوسرا قاعدہ ۱۹۰۲ء میں مرتب کیا گیا۔ چنانچہ اس جدید قاعدے کی رو سے دخیل کار اسامیوں کی دو قسمیں تسلیم کر لی گئیں اور ان دونوں کو بعض شرائط کے تحت قابل انتقال حقوق حاصل تھے۔ مدراس کے زمینداری علاقوں میں ہر وہ رعیت جو قانون زمینداری بابت ۱۹۰۸ء (جو بنگال ایکٹ بابت ۱۸۸۵ء کے نمونے پر مرتب کیا گیا تھا)،

401

[1] آگرے اور اودھ میں لگان اور مالگزاری کے آئین و قوانین کی وضع کے بارے میں مزید تفصیلات کے لیے دیکھو صوبۂ متحدہ کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ ۳۲۷ تا ۳۲۸۔

بابُ کی منظوری کے زمانے میں رعیتی زمین (یعنی ایسی زمین جو مالک کی زمین سیر یا ملکی زمین نہ ہو) کی مالک ہو اور ہر وہ رعیت جس کا قبضہ رعیتی زمین پر زمیندار تسلیم کر لے دخیل کاری کا دوامی حق رکھتی ہے۔ اس طرح اس کی حیثیت رعیت داری رقبوں کے دخیل کار کے مشابہ کر دی گئی ہے۔ بمبئی میں ۱۸۸۰ء کا مخصوص قانون کھوٹوں کے متعلق، قدیم مقیم اسامیوں کی اسی طرح حفاظت کرتا تھا جس طرح دوسرے مقامات کے دخیل کار اسامیوں کی۔ مخصوص حقیت اراضی کی دوسری شکلیں بھی ہیں، مثلاً تعلقداری حقیت جن کے ساتھ خصوصی قانون بابت ۱۸۶۲ء کے تحت سلوک کیا جاتا ہے۔

۷۔ دخیل کار اسامیوں کے علاوہ دوسرے اسامی

ہم نے زیادہ تر دخیل کار اسامیوں پر اس قدر زیادہ توجہ اس لئے مبذول کی کہ وہ زمینداری رقبوں میں متوق دار اسامیوں کی اہم ترین جماعت ہیں لیکن یہ بھی کہدینا ضروری ہے کہ اسامیوں کی دوسری مختلف جماعتیں بھی ہیں جو دخیل کار اسامیوں سے بعض صورتوں میں اعلیٰ تر اور بعض صورتوں میں ادنیٰ تر حیثیت رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر ہم بنگال کے اسامیوں کی اعلیٰ جماعت کا ذکر کر سکتے ہیں جو حقیت داروں کے نام سے موسوم کی جاتی ہے اور جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے، یعنی ایسی رعیت جو مقررہ لگان ادا کرتی ہے اور جس کا نہ تو اخراج کیا جا سکتا ہے اور نہ زاید لگان ادا کرنے کا ذمہ دار بنایا جا سکتا ہے۔ اسی طریقے سے صوبۂ متحدہ میں بنارس کے دوامی بندوبست کے اضلاع میں بعض اسامی مقررہ شرح سے لگان ادا کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں صوبۂ متوسط میں قطعی دخیل کار اسامیوں کی جماعت موجود ہے جس کے متعلق ابتدائی بندوبست میں یہ تسلیم کر لیا گیا کہ وہ قومی و مستحکم حیثیت رکھتی ہے۔ ان کا اخراج کسی سبب سے بھی نہیں کیا جا سکتا۔ علاوہ ازیں وہ ایک خاص لگان ادا کرتے ہیں جس کو عہدہ دار بندوبست، بندوبست کی کل میعاد کے لیے مقرر کر دیتا ہے۔ دوسری طرف بعض ادنیٰ قسم کے اسامی بھی ہیں جو رعیت واری علاقوں کے اسامی غیر دخیل کار کے مشابہ ہیں لیکن تحفظات سے ایک خاص حد تک متمتع ہوتے ہیں جن سے موخرالذکر محروم ہیں۔

باب ۲
402

۸۔ حقوق دخیلکاری کی عام خصوصیات

اب اس تحفظ کی نوعیت مختصر طور پر بیان کر دینا مناسب ہوگا جس سے دخیل کار اسامی متمتع حاصل کرتے ہیں۔ (۱) اضافۂ لگان کی ایک حد ہوتی ہے نہ صرف مقدار کے بارے میں بلکہ اس مدت کے بارے میں بھی جو لگان میں اضافہ کرنے سے پیشتر گزرنی چاہیے۔ اضافہ صرف معاہدے کے نتیجے کے طور پر یا معقول وجوہ کی بنا پر عدالت کے فیصلے کے ذریعے سے عمل میں آسکتا ہے۔ بنگال میں قانون کی رو سے یہ قرار دیا گیا ہے کہ یہ معاہدات لازماً تحریری ہوں، اضافہ پندرہ سال میں ایک مرتبہ سے زائد نہیں کیا جاسکتا، اور اضافہ روپے میں دو آنے سے زیادہ نہیں ہوسکتا۔ اضافے کے اسباب، جو مقدمہ دائر ہونے کی صورت میں عدالت کی جانب سے تسلیم کیے جاتے ہیں، یہ ہیں:۔ ہمسایہ زمین کے مقابلے میں لگان کی کمی، قیمتوں کا اضافہ، یا مالک کی بہم پہنچائی ہوئی یا دریا کے بہاؤ کے عمل کے باعث زمین کی پیداآوری کی اصلاح و ترقی۔ اسامی، لگان کی کمی کا دعویٰ، زمین کی مستقل خرابی یا مقامی قیمتوں کی مستقل کمی کی بنیاد پر کرسکتا ہے۔ صوبۂ متوسط میں لگان عہدہ دار بندوبست کی جانب سے اسی طرح معین کیا جاتا ہے جس طرح کہ مطلق دخیل کار اسامیوں کے بارے میں، لیکن بندوبست کی کل مدت کے لیے اس لیے نہیں کیا جاسکتا کہ ہر دس سال کے بعد اس کی نظر ثانی کا امکان ہوتا ہے۔ مدراس میں یہ یک وقت ۱۲½ فیصدی سے زیادہ اضافہ لگان میں نہیں کیا جاسکتا۔ (۲) بعض قانونی شرطیں بجز خاص حالات کے اسامی دخیل کار کو اخراج سے محفوظ رکھتی ہیں یہ شرطیں دراصل ان شرائط کا ضمیمہ ہیں جو اضافۂ لگان کے سلسلے میں طے کی گئی ہیں۔ ان دونوں قسموں کی شرائط میں سے کوئی ایک اس وقت تک بے کار ہے جب تک کہ دوسری اس کے ساتھ موجود نہ ہو۔ (۳) حق دخیل کاری موروثی ہے، اور بعض شرائط کے تحت خاندان سے باہر قابل انتقال ہے۔ (۴) لگان کے بارے میں قرقی کے بعض قوانین موجود ہیں جن سے مویشی، آلات کشاورزی اور تخم پاشی کے غلے وغیرہ کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں بہرصورت زمین خالی کر دینے کے لیے مناسب نوٹس دینا ضروری ہے؛

باب ۱۲

اور لگان کی ادائی یہ اقساط ہوتی ہے ۔ (۵) مالگزاری کی معافی اور ادا
حکومت کی جانب سے زمینداروں کے حق میں خراب فصل میں منظور کر
اس کی اتباع میں زمینداروں کو بھی اپنے اسامیوں کے حق میں ایسی
رعایتیں کرنا ضروری ہیں ۔ (۶) آخر میں زمین کے لگان کے اضافے
کی اصلاح و ترقی کو بہ عمل لانے کا حق بھی بعض حدود کے اندر محفوظ رکھا گیا
اعلیٰ لگان عائد کیے جانے کی صورت میں اس کی تلافی کرنا ضروری ہے
مختصر یہ کہ ان قواعد کا مقصد آئرستان کے قوانین اراضی کے مشہ
تہرے حقوق دینا ہے ۔ یعنی واجبی (مناسب لگان) مقررہ حیثیت ار
آزادی انتقال ۔

۹ ۔ رعیت واری صوبوں کے اسامیوں کے حقوق ۔

یہاں کسان اور حکومت کے مابین زمیندار
شخص کا مصنوعی طریقہ یا ... دار مہوا ۔
لحاظ سے یہاں اسامیوں کے مالکانہ حقوق
کو تسلیم کرنے کی ویسی ضرورت نہیں ہے جب
ہندوستان میں جہاں بندوبست کے ملے
اور انواع پر یہ احتیاط غور و توجہ کرنے کی ضرورت ہے ۔ جیسا کہ پہلے بیان
رعیت واری صوبوں میں بھی بعض زمینداریاں ہیں مثلاً مدراس کے زمیندار
کھوٹ اور تعلقدار اور ان شکلوں میں سے اکثروں کے لیے جیسا کہ اوپر بیا
مخصوص قوانین لگان مرتب کئے گئے ہیں ۔ مدراس یا بمبئی یا کسی دوسر
میں جہاں زیادہ تر رعیت واری طریقہ نافذ ہے رعیت واری مالکو
کے معمولی تعداد اسامیوں کی حد تک کوئی خاص قانون اس مقصد
نہیں کیا گیا ہے کہ لگان کے جبری اضافے یا سرسری اخراج سے انھیں
اگرچہ واقعہ یہ ہے کہ عام قانون لگان فریقین کے مابین کسی طے شد
شرائط کی پابندی کرا سکتا ہے یا معاہدے کی عدم موجودگی میں متعلقہ مق
رسم و رواج کے احکام کو نافذ کر سکتا ہے ۔ اسامیوں کی تعداد کے اض
کے لیے اسامیوں میں بکثرت مقابلے نے رعیت واری علاقوں میں بہ

408

صورت حال پیدا کر دی ہے جو اسی اسلوب پر قوانین لگان وضع کرنے کی طالب ہے جیسا کہ زمینداری صوبوں میں اختیار کیا گیا ہے۔

۱۰۔ بندوبست کسے کہتے ہیں۔؟

حقیت اراضی کی ابتدائی بحث کے ذریعے سے میدان صاف کر لینے کے بعد اب ہم مالگزاری کے بندوبست پر غور کرنے کے قابل ہیں۔ ہم اصطلاحاً جس چیز کو "مالگزاری کا بندوبست" کہتے ہیں وہ حسب ذیل امور کے تعین پر مشتمل ہے:۔ (۱) پیداوار یا لگان کا وہ حصہ جس کی حکومت مستحق ہے؛ (۲) وہ شخص یا اشخاص جو اس کو ادا کرنے کے ذمہ دار ہیں، اور (۳) زمین کے تمام خانگی حقوق اور اغراض کی یادداشت۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، ان زمینداری رقبوں میں خواہ وہ انفرادی ہوں یا مشترکہ آخری امر خاص طور پر اہمیت رکھتی ہے جہاں ارضی جائداد کے قابل تسلیم حقوق و اغراض میں باقاعدہ درجہ بندی ہے۔

۱۱۔ بندوبست کے لوازم[۱]

بندوبست مالگزاری کے عمل میں تین اہم باتیں تمیز کی جا سکتی ہیں:۔ (۱) کاغذات اراضی کی تیاری؛ (۲) تشخیص مالگزاری؛ اور (۳) مشخصہ مالگزاری کی وصولیابی۔ (۱) کاغذات اراضی (Cadastral Record)[۲] یہ کاغذات اراضی میں گاؤں کا نقشہ، کھیوٹ اور کتابچہ حقوق شامل ہوتا ہے۔

یہ کاغذات، مختلف کھیتوں کی مفصل پیمائش اور سرحدوں کے تعین کے بعد تیار کئے جاتے ہیں تاکہ قابل کاشت زمین کا صحیح حال اور ہر قسم کی زمین کی وسعت اور اس کی مخصوص شرح محصول معلوم ہو اور صحیح کتابچہ حقوق کی تیاری عمل میں آسکے۔ اس پیمائش کے ذریعے سے ہر گاؤں کا نقشہ تیار کیا جاتا ہے جس سے جداگانہ کھیتوں کا حال اور قابل کاشت اور بنجر زمین کی نوعیت اور رقبہ معلوم ہوتا ہے۔ گاؤں کے نقشے کے جواب کے طور پر عام طور پر کھیتوں کا ایک رجسٹر مرتب کیا جاتا ہے اور ان دونوں سے ایک کھیوٹ یا کتابچہ مالگزاری تیار کیا جاتا ہے جس میں مالگزاری ادا کرنے والوں کی صحیح فہرست ہوتی ہے اور ان کے ناموں کے مقابل مالگزاری کی مقدار درج ہوتی ہے۔

[۱] دیکھو امپیریل گزیٹیر جلد چہارم باب ۔
[۲] cadastral کے لفظی معنی قابل محصول زمین کی وسعت، قیمت اور ملکیت کو ظاہر کرنا ہیں۔

باب ۱۲ ان کے ضمیمے کے طور پر اعداد و شمار کی جدولیں اور گوشوارے ہوتے ہیں جن سے گاؤں کی موجودہ حالت اور پچھلی سرگزشت معلوم ہوتی ہے۔ آخر میں کتابچہ حقوق الگ یا کھوٹ کے ضمیمے کے طور پر تیار کیا جاتا ہے جس میں حقیت اراضی، زمینداروں، شرکا، ذیلی مالکوں، ذیلی کاراسامیوں وغیرہ کے مختلف حقوق اراضی اور رہن، فروخت، پٹے وغیرہ سے پیدا شدہ حقوق درج ہوتے ہیں۔ یہ سب کاغذات سرکاری طور پر اندراجات کر کے اور کل تغیرات کی رجسٹری کے ذریعے سے جدید ترین حالت میں رکھے جاتے ہیں۔ اس طرح درج کردہ حقوق کی یادداشت کو تاوقتیکہ ان کے خلاف ثبوت فراہم نہ ہو، قانوناً جائز اور ناقابل تنسیخ مانا جاتا ہے۔

(۲) مالگزاری کی تشخیص۔ مالگزاری کا مطالبہ معین کرنے کی غرض سے زمین کی قیمت اور آمدنی کی تشخیص کی جاتی ہے، مالگزاری کی شرحیں مقرر کی جاتی ہیں، ان کی میزان کی جاتی ہے۔ اور ان کو قرینے سے مرتب کیا جاتا ہے۔ اس طرح یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھیت یا جائداد کے ذمے کتنی رقم واجب الادا ہے۔ بعض صورتوں میں اس مجموعے کی تقسیم شرکا میں متعین کرنے اور اسامیوں کے لگان کا تصفیہ کر دینے کے لیے ذیلی کارروائیاں ضروری ہوتی ہیں[1]۔ مختلف صوبوں میں مالگزاری کی تشخیص کی جو مختلف بنیادیں اختیار کی گئی ہیں ان پر عنقریب توجہ کی جائے گی۔

(۳) مالگزاری کی جمعبندی۔ (ا) اقساط۔ مالگزاری ادا کرنے والوں کی سہولت کے مدنظر مالگزاری یکمشت کی بجائے بذریعۂ اقساط وصول کی جاتی ہے۔ مثلاً متوسط درجے کا زمیندار اس وقت تک مالگزاری ادا نہیں کر سکتا جب تک کہ فصل کی کٹائی نہ ہو اور پیداوار فروخت نہ ہو لے۔ اقساط کے طریق کے سلسلے میں ایک اور قابل لحاظ امر یہ ہے کہ یہ یک وقت نقد کی بڑی مقدار کا مطالبہ کرنے سے بچنا چاہیے اس لیے کہ ممکن ہے کہ اس مطالبے کی وجہ سے قیمتیں گھٹ جائیں اور شرح سود نامناسب حد تک بڑھ جائے۔

(ب) مالگزاری کے بقایا وصول کرنے کا طریقہ۔ بقایا وصول کرنے کا طریقہ

---

[1] دیکھو بیڈن پاول کی کتاب محولۂ بالا، صفحہ ۱۱۔

باب ۱۲

دوامی بندوبست اور عارضی بندوبست کے خطوں کے لئے جدا جدا ہے۔ اول الذکر صورت میں زمینداری حق کے عطیے کے ساتھ یہ شرط وابستہ تھی کہ مالگزاری قطعی پابندی وقت کے ساتھ ادا کرنی چاہئے ورنہ جائداد فوراً فروخت کر دی جائے گی، اور یہ طریق کار نبادل طریق یعنی بڑے زمیندار کو حراست میں رکھ کر یا اس کی جائداد منقولہ کی قرقی کرکے بے وقعت کرنے کے طریقے کے مقابلے میں قابل ترجیح خیال کیا گیا تھا۔ عارضی بندوبست کے علاقوں میں طریق کار اس قدر شدید نہیں ہے اور زمین کی فروخت یا نیلام پہلی کارروائی نہیں ہوتی بلکہ عام طور پر مختلف کارروائیوں کے سلسلے کی آخری کڑی ہوتی ہے۔

(ج) مالگزاری کی معافی اور ادائی کا التوا۔ چونکہ مالگزاری بندوبست کے زمانے کے اوسط موسموں اور حالات کے لحاظ سے مشخص کی جاتی ہے، اس لیے یہ فرض کر لینے کے باوجود کہ کسان خراب سال سے اپنا تحفظ کرنے کے طور پر اچھی فصل سے فائدہ اٹھانے کا ارادہ اور قوت رکھتا ہے، (حالانکہ ایسا بہت شاذ ہوتا ہے) اس کا امکان ہوتا ہے کہ وسیع یا مقامی غیر معمولی تباہ کاریاں، مثلاً سیلاب، پالا، بارش یا دوسرے ذرایع آب پاشی کا کامل نقدان یا زمانۂ حال کے شکل زرعی پیداوار کی قیمتوں کا اتار وغیرہ تمام تخمینوں اور حسابات کو درہم برہم کردیں۔ 405 ان حالات میں خرابی فصل کے درجوں کے لحاظ سے امداد ضروری ہے جو ادائی کے جزوی یا کامل التوا یا معافی کی شکل اختیار کرسکتی ہے۔ ملتویہ مالگزاری بعد کی فصلوں کی نوعیت و حالت کے لحاظ سے وصول یا معاف کی جاسکتی ہے۔ کامل یا جزوی معافی ایک سال سے زائد تک فصلوں کے مسلسل خراب ہونے کی صورت میں دی جاتی ہے۔ یہ کہ دینا مناسب ہوگا کہ التوا یا معافی کی شکل میں کوئی امداد دوامی بندوبست کے خطوں میں نہیں دی جاتی، اس لیے کہ یہاں مقررہ لگان کا بار بحالت موجودہ بہت ہلکا ہونے کی وجہ سے امداد کی بہ مشکل ضرورت ہوتی ہے۔

۱۲۔ بندوبست کی تبویب

بندوبست اپنی مدت کے لحاظ سے دو قسموں میں منقسم ہوتا ہے۔ جہاں حکومت کا حصہ مستقل اور دائمی طور سے مقرر ہوا جیسا کہ بنگال میں ہے، وہاں اس کو دوامی بندوبست کہتے ہیں؛

باب ۱۳

اور جہاں وہ عارضی طور پر کسی مدت کے لیے مقرر کیا جائے وہاں اس کو عارضی بندوبست کہتے ہیں۔ بمبئی، مدراس اور صوبۂ متحدہ میں تیس سال صوبۂ متوسط میں بیس سال اور پنجاب میں چالیس سال کی میعاد مقرر ہے۔

بندوبست کی تبویب حقیت اراضی کے طریقے کے لحاظ سے بھی کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ حقیت اراضی کی تین اہم قسمیں اوپر بیان ہو چکی ہیں، ان کے مقابل اور زیر اثر بندوبست کی تین اہم قسمیں حسب ذیل ہیں:۔

(الف) منفرد جائدادوں کا بندوبست جو ایک زمیندار کے تحت ہوتی ہیں۔ اس عنوان کے تحت حسب ذیل قسمیں آتی ہیں:۔

(۱) دوامی بندوبست، بنگال، شمالی مدراس اور بنارس کے زمینداروں کے ساتھ۔

(۲) عارضی بندوبست بنگال کے بقیہ زمینداروں کے ساتھ[1]۔

(۳) عارضی بندوبست تعلقداران اودھ کے ساتھ۔

(ب) مالکانہ حقوق رکھنے والی جماعتوں اور بالعموم دیہی برادریوں کی جائدادوں کا بندوبست۔ اس کو "محل واری بندوبست" کہتے ہیں۔ اس کے سب انواع عارضی بنیاد پر قایم ہوتے ہیں:۔

(۱) صوبۂ متحدہ آگرہ و اودھ کا "محل واری" بندوبست (جہاں تعلقدار نہیں ہوتے بلکہ صرف دیہی برادریاں ہوتی ہیں)۔

406

(۲) پنجاب کا محل واری بندوبست۔

(۳) صوبۂ متوسط کا مالگزاری بندوبست۔

(ج) انفرادی جائدادوں یا کھیتوں کا بندوبست۔

[1] زمینداری بندوبست لازمی طور پر دوامی بندوبست نہیں ہے اور رعیت واری بندوبست لازمی طور پر عارضی بندوبست نہیں ہے۔ زمینداری بندوبست عارضی بھی ہوتے ہیں مثلاً اودھ اور بنگال میں۔ علاوہ ازیں کوئی چیز رعیت واری بندوبست کے دوامی بننے میں مانع نہیں ہے، اگرچہ جیسا کہ واقعہ ہے، بظاہر اس کی کوئی حقیقی مثال موجود نہیں ہے۔

باب۱۲

اس کے تحت کی سب انواع عارضی بنیاد پر قایم ہوتی ہیں:۔
(۱) مدراس کا رعیت واری طریقہ۔
(۲) بمبئی اور برار کا رعیت واری طریقہ۔
(۳) برما، آسام اور کورگ کے خاص طریقے (جو اصولاً رعیت واری ہیں لیکن سرکاری طور پر اس طرح موسوم نہیں کیے جاتے)۔
اس طرح یہ ضروری ہے کہ ہر بندوبست کا تعلق مذکورۂ بالا تین قسموں میں سے کسی نہ کسی سے ہو اور یہ بندوبست عارضی ہوگا یا دوامی[1]

۱۳۔ زمینداری بندوبست:۔ بنگال کا دوامی بندوبست۔

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ مالگزاری کی متاجری کی ترقی نے خاص کر بنگال میں کیسے اس امر کا موقع بہم پہونچایا کہ قدیم رعایا کی جگہ زمینداروں کی نئی جماعت نے لے لی۔ ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ سلطنت مغلیہ کی شکست کے باعث شہنشاہ اکبر کا قایم کیا ہوا مالگزاری کا قدیم باقاعدہ انتظام کس طرح مایوسانہ طریقے پر تباہ و برباد ہوا اور کسان ایک طرف زمینداروں کی لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے اور دوسری طرف صوبہ داروں کے کئی زائد محصول زمین عائد کرنے کے نتیجے کے طور پر پس رہے تھے۔ یہ صورت حال جیسی کچھ تھی ۱۷۶۵ء میں دیوانی عطا کئے جانے کے بعد کمپنی کی حکومت کے ابتدائی سالوں میں اور بھی ابتر ہو گئی۔ کلائیو کے دوہرے طریق حکومت نے اس میں مزید پیچیدگی اور بدنظمی پیدا کر دی۔ چنانچہ اس طریق کے تحت نواب کے عہدہ داران مالگزاری

[1] سنہ ۱۹۲۸ء سنہ ۱۹۲۹ء میں رعیت واری کھیتوں کا مجموعی رقبہ ۳۳۴۵۹۸،۰۰۰ ایکڑ یا کل رقبے کا ۵۱ فی صد تھا، دوامی بندوبست کی زمینداری یا دیہی برادری کے کھیتوں کا مجموعی رقبہ ۱۱۲،۰۷۰،۰۰۰ ایکڑ یا کل رقبے کا ۱۹ فیصد تھا، اور عارضی بندوبست کی زمینداری یا دیہی برادری کے کھیتوں کا مجموعی رقبہ ۱۹۸،۹۰۲،۰۰۰ ایکڑ یا کل رقبے کا ۳۰ فی صد تھا۔
(دیکھو ایک کتاب موسوم بہ "ہندوستان سنہ ۱۹۳۰ء تا سنہ ۱۹۳۱ء میں" صفحہ ۱۶۹)۔

یا ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازموں میں سے کوئی بھی ملک کی بہتر و منظم حکمرانی کی ذمہ داری محسوس نہیں کر رہا تھا؛ نتیجہ یہ ہوا کہ عوام کو چکی کے دونوں پاٹ پیس رہے تھے اور تحفظ کسی طرف سے بھی نہ تھا۔ ۱۷۶۹ء میں مالگزاری کے ناظر اس غرض سے مقرر کیے گئے تھے کہ کسان کو زمینداروں کی لوٹ کھسوٹ سے محفوظ رکھیں؛ لیکن یہ چونکہ نوجوان اور ناتجربہ کار عہدہ دار تھے اس لیے وہ معاملات کی ذرا بھی اصلاح نہ کر سکے۔ ۱۷۷۰ء کے خوفناک قحط نے مشکلات میں مزید اضافہ کر دیا۔ ۱۷۷۲ء میں کورٹ آف ڈائرکٹرس (مجلس نظما) نے دیوان کی حیثیت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا اور وارن ہیسٹنگز کو یہ ہدایت کی گئی کہ وہ مالگزاری کے انتظام کی راست نگرانی کریں۔ وارن ہیسٹنگز نے کلکٹر مقرر کرکے اور بعد میں چل کر علاقہ واری، صوبہ واری اور مرکزی مجالس مالگزاری قائم کرکے جمعبندی کے انتظام کی کسی خفیف حد تک اصلاح کی۔ لیکن مالگزاری کی تشخیص کے طریقے کی تبدیلی، تباہ کن ثابت ہوئی۔ محصول جمع کرنے کے لیے ابتداءً پنج سالہ اور اس کے بعد سالانہ ٹھیکے سرکاری نیلام کے ذریعے سے سب سے زیادہ بولی بولنے والے کے ہاتھ فروخت کیے جاتے تھے؛ اس طرح اس زمانے کے زمینداروں کو نظرانداز کر دیا گیا اور سرمایہ داروں اور محنتوں کی ہمت افزائی کی جا رہی تھی جو کسانوں سے ان کی زمینوں کی بابت لگان اور زاید ابواب من مانے طریق پر زیادہ سے زیادہ مقدار میں ناجائز طور پر وصول کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مالیات کی افسوس ناک حالت اور اس کا اپنے حصہ داروں کو اعلیٰ مقسوم دینے کے بارے میں اضطراب جدید نظام کی تہ میں کارفرما تھا۔ چنانچہ انھی معاملات کی اصلاح اور بنگال میں زرعی مصائب کو دور کرنے کے خیال سے ۱۷۸۶ء میں لارڈ کارنوالس ہندوستان بھیجے گئے۔

407

لارڈ کارنوالس کی حکمرانی کا اہم ترین کارنامہ "بنگال کا دوامی بندوبست" ہے۔ یوں تو سرکاری مطالبہ دواماً مقرر کرنے کا خیال سب سے پہلے فرانس نے پیش کیا جس کے بعد فاکس نے اپنے "انڈیا بل" میں اس کو اختیار کر لیا، اور آخر کار ۱۷۸۶ء میں مجلس نظما نے ہندوستانی حکام کے پاس اس خیال کی سفارش کی؛ تاہم یہ بات لارڈ کارنوالس کے حصے میں آئی کہ انھوں نے سر جان شور کی مدد سے

باب ۱۲

بنگال میں دوامی بندوبست کے اصول کو عملی جامہ پہنایا۔ تین سال تک تحقیقات کرنے کے بعد زمینداروں سے بندوبست طے پایا اور وہ ان تمام رقبوں کے کامل مالک قرار دیے گئے جہاں سے ان کو مالگزاری وصول ہوتی تھی، تاکہ ان کی کچھ نہ کچھ قانونی حیثیت قایم ہو سکے، جو ان کو اس قابل بنا دے کہ اپنے ذمے کے واجبات حکومت کو ادا کریں اور اپنی جائدادوں میں دلچسپی لینے کی ترغیب دے۔ لیکن یہ حق اس شرط پر دیا گیا تھا کہ زمین کی مالگزاری ادا کی جائے گی اور یہ ذمہ داری لی جائے گی کہ عدم ادائی کی صورت میں جائداد کے نیلام کے ذریعے سے واجبات ادا کیے جائیں گے۔ حکومت نے اپنا یہ حق بھی محفوظ رکھا کہ اپنے تحت کے تعلقداروں، رعایا اور دوسرے کسانوں کی حفاظت و بہبودی کے لیے اپنے حسب صوابدید مناسب و ضروری تدابیر اختیار کرے گی۔ زمینداروں کو رعیت سے جو لگان وصول ہوتا تھا اس کا تقریباً ۱۰/۱۱ حصہ بطور مالگزاری مشخص و مقرر کر دیا گیا اور باقی ۱/۱۱ ان کی محنت و ذمہ داری کے صلے کے طور پر ان کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ مالگزاری کے واجبات کام چلاؤ طریقے پر اغراض و حقوق اراضی کی تحقیق یا تحریری اندراج کیے بغیر مقرر کیے گئے، اور مختلف قسموں کی زمین کی پیداآوری و زرخیزی کے بارے میں بھی کوئی تحقیق نہیں کی گئی۔ ۱۷۹۳ء میں مجلس نظماء کے مشورے سے بندوبست کو دوامی اور ہمیشہ کے لیے ناقابل تغیر قرار دیدیا گیا، اور حکومت نے قطعی طور پر اس کا اقرار کر لیا کہ زمینداروں یا ان کے ورثا یا جانشینوں سے ان کی متعلقہ جائدادوں کی اصلاح و ترقی کے نتیجے کے طور پر سرکاری مالگزاری میں اضافہ کرنے کا مطالبہ نہ کرے گی۔[1] یہاں یہ کہدینا مناسب ہوگا کہ زمینداروں کو تسلیم کرنے کی حد تک سرجان شور، لارڈ کارنوالس سے متفق الرائے تھے لیکن سرجان شور ترجیحاً یہ چاہتے تھے کہ بندوبست کے دوامی ہونے کا اعلان نافذہ بندوبست کی دہ سالہ مدت گزرنے پر کیا جائے۔

۱۴۔ ۱۷۹۳ء کے بنگال کے زمینداری بندوبست پر اعتراضات

اس طرح جو بندوبست عمل میں آیا وہ مختلف وجوہ سے قابل اعتراض ہے۔

408

[1] دیکھو کمیٹی محصولات کی تحقیقاتی رپورٹ، فقرہ ۵۵۔

باب ۱۶

اولاً یہ کہ بندوبست کرنے سے پیشتر ابتدائی لوازم یعنی مفصل مساحت، زمینوں کی تبویب اور کتابچۂ حقوق کی تیاری وغیرہ نظرانداز کر دیے گئے۔ اس میں شک نہیں کہ اس فروگزاشت کے کئی وجوہ تھے جو کم وبیش معقول تھے۔ چنانچہ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے اول تو تحقیقی اور باقاعدہ مساحت اس لیے دشوار تھی کہ تربیت یافتہ عملہ کم اور نااہل تھا، دوسرے یہ کہ جائدادوں کے اندرونی معاملات کی چھان بین خلاف مصلحت اور زمینداروں میں بدگمانی پیدا کرنے والا ممکنہ محرک خیال کی گئی۔ رعیت کی حد تک یہ توقع کی گئی تھی کہ زمیندار اس سے سمجھوتہ کر لے گا اور ان کے حقوق کی حفاظت کرے گا۔ پھر بھی جیسا کہ بیڈن پاول کہتے ہیں "یہ واقعہ کہ دوامی بندوبست کو کسی مساحت اور حقوق اراضی اور اغراض کی تحریری یادداشت کے بغیر روبہ عمل لایا گیا غالباً بندوبست کی کسی دوسری خصوصیت سے زیادہ مذموم نتائج سے مملو ثابت ہوا ہے"[1]

اس بنا پر ہماری توجہ دوامی بندوبست کی دوسری بڑی خرابی کی طرف مبذول ہوتی ہے، اور وہ یہ کہ رعیت کے حقوق اور اغراض کی حفاظت نہیں ہوئی، اور وہ دوہری ناانصافی کا شکار رہی؛ ایک تو یہ کہ وہ مالکانہ حقوق سے غیر معین طریقے پر محروم کر دی گئی، دوسرے یہ کہ وہ تمام تر زمینداروں کے رحم وکرم پر چھوڑ دی گئی، جو اس سے کروڑ لگان وصول کرتے تھے[2]۔ اس میں کلام نہیں کہ اس کا عام طور پر انتظام کیا گیا تھا کہ کھیتوں کا رقبہ، شرائط اور حالات متقرر کر کے رعیت کو پٹے دیے جائیں، لیکن یہ انتظام عملاً بے سود تھا، اس لیے کہ پٹے بہ جبر نہیں دیے جا سکتے تھے

[1] برطانوی ہند کے نظام ہائے اراضی جلد اول۔ صفحہ ۲۸۹۔

[2] "دوامی بندوبست میں دو غلطیاں کی گئی تھیں، ایک تو یہ کہ جملہ دیہی حقوق کو خواہ وہ مالکانہ ہوں یا خیلکارانہ قربان کر دیا گیا اور ان کو زمیندار کا حق مالکانہ مستقل طور سے ہمہ گیر تسلیم کر کے اس کے حق میں ضم کر دیا گیا؛ اور دوسرے یہ کہ ایک پرآشوب قانون وضع کر کے کسانوں کو قربانی کا بکرا بنا دیا گیا جس کی بنا پر زمینداران سے اپنے حسب مرضی یا صوابدید شرائط پر تصفیہ کر سکتا تھا ماخوذ از تصنیف جے۔ اے۔ کرل بررک جس کا حوالہ سر ٹی مارلین نے اپنی کتاب موسوم بہ "ہندوستانی صوبے کی منتقی تنظیم" صفحہ ۲۷ میں دیا ہے۔

اور بعض صورتوں میں رعیت پٹہ لینے پر اس خوف کی بنا پر راضی نہ تھی کہ مبادا اس کی حیثیت گھٹیا تسلیم کر لی جائے اور وہ ایسے شرائط مان لینے کی پابند ہو جائے جن کو وہ خود پوری طرح نہ سمجھتی تھی۔ لیکن یہ ماننا ضروری ہے کہ رعیت کی ناگفتہ بہ حالت کا باعث بڑی حد تک بھاری لگان تھا جو بہت سختی کے ساتھ وصول کیا جا رہا تھا۔ چنانچہ عدم ادائی کی صورت میں جائداد فوراً نیلام کر دی جاتی تھی۔ ایسی حالت میں

اسامیوں کے ذمے کے لگان کو وصول کرنے میں زمیندار کی مدد کرنا ضروری تھا تاکہ زمیندار اپنے ذمے کے سرکاری مطالبات قطعی پابندی کے ساتھ ادا کر سکے۔ علاوہ ازیں چونکہ اکثر صورتوں میں زمیندار سرکاری مطالبہ ادا کرنے کے قابل نہ تھا، اس لیے اپنی جائداد فروخت کر دیتا تھا اور اس کا جانشین، قبل اس کے کہ اس کو اس جائداد کے خریدنے کی ترغیب دی جائے واضح حق اور حیثیت کا طالب تھا۔ اس کے معنی یہ تھے کہ رعیت کے حقوق اور زیادہ پامال ہوں اور نئے زمیندار کی طرف سے رعیت پر اور زیادہ سختی کے ساتھ مطالبات کیے جائیں۔ اس طرح اسامی کو قریب قریب تین چوتھائی صدی تک انتظار کرنا پڑا قبل اس کے کہ اس تکلیف دہ زیادتی سے نجات دلانے کی کوشش ۱۸۵۹ء اور ۱۸۸۵ء کے قوانین لگان کے ذریعے سے کی گئی۔

یہ سوال کیا گیا ہے کہ آیا زمینداروں کو ایسے غیر مشروط طریقے پر مالکانہ حیثیت دینا قطعی طور پر ضروری تھا یا نہیں؟ عام طور پر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ چونکہ لارڈ کارنوالس خود ایک انگریز زمیندار تھے، اس لیے ان کا فطری میلان امراو شرفا کی طرف داری کی جانب تھا اور وہ انگلستان کے مثل یہاں بھی ذی رتبہ شریف زمینداروں کی ایک جماعت قائم کرنا چاہتے تھے، حالانکہ دونوں ممالک کے حالات ایک دوسرے سے ازحد مختلف تھے۔ باوجود اس کے سچ پوچھو تو دوامی بندوبست کمپنی کے متوسط درجے کے ملازموں کی پرمعنی کارگزاری تھی اور بہت ممکن ہے کہ لارڈ کارنوالس زیادہ تر اس بنا پر کہ وہ خود انگریز شرفا و امرا کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے، اس پالسی کی منظوری پر آسانی سے راضی ہو گئے ہوں جس سے ان کا نام منسوب کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ کہنا یقیناً غلط ہے کہ وہ

باب ۸

اس کے اصل بانی مبانی تھے دوسرا قابل لحاظ امر یہ ہے کہ جس وقت وہ یہاں آئے انھوں نے زمینداروں کو ایسی مستحکم حیثیت میں پایا کہ ان کو نظر انداز کرنا اور ایک صدی کی ترقی سے چشم پوشی کر کے معاملے کی تہ میں جانا اور زمینداروں کے مقابلے میں (جو مالگزاری کی مستاجری سے ابتدا کر کے اس درجے پر پہنچے تھے) حقیقی مالکان زمین کی تفتیش وتلاش کرنا نا ممکن تھا اس لحاظ سے یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ لارڈ کارنوالس کو ایک اٹل فیصلے کو مان لینے کی ترغیب واقعات کی کمر منطق نے دی۔ علاوہ ازیں یہ بھی ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ "دیوانی" ملنے کے بعد کی مالگزاری کی پالیسی کے متواتر تغیرات کے باعث اور ۱۷۷۰ء کے خوفناک قحط کے نتیجے کے طور پر بنگال کی زراعت اس وقت ہر طرف سے تباہی میں گھری ہوئی تھی اور اس گتھی کو سلجھانے کے لیے کسی فوری کارروائی کی سخت ضرورت تھی۔ ان حالات میں زمینداروں کو مالکوں کی حیثیت سے تسلیم کر لینا مناسب خیال کیا گیا، اس لیے کہ مالگزاری وصول کرنے کا یہی ایک منظم آلہ کار تھا جو دستیاب ہو سکتا تھا اور ان کے تسلیم کر لیے جانے ہی میں زراعت کے احیاء کا واحد موقع مضمر معلوم ہوتا تھا۔

بندوبست بنگال کا تیسرا اور اہم ترین پہلو یعنی مالگزاری کا دوامی تقرر ایسا مسئلہ ہے جو صرف بنگال تک محدود نہیں ہے بلکہ بدرجہا زیادہ وسیع اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ آئندہ کسی مناسب موقع پر اس پر بحث کی جائے گی۔

410

۱۵۔ بنارس اور مدراس میں دوامی بندوبست

برطانوی حکومت بنارس میں بنگالی نمونے کی تقلید کرنے کے لیے متفکر تھی، لیکن مشترکہ حقیت اراضی کے مخصوص نظام سے پوری طرح واقف نہ تھی اس لیے اس نے زمینداری دیہات کی موجودگی کو نظر انداز کر دیا جن کا تعلق ملا تفریق قبیلے یا برادری سے تھا، اور ہم شرکا میں سے ایک سے یا کسی دوسرے ممتاز شخص سے دوامی بندوبست (۱۷۹۵ء) کی بنیاد پر معاملہ طے کر لیا۔ مدراس میں کوئی قطعی تدبیر میسور اور اضلاع کرناٹک کی حوالگی عمل میں آنے تک اختیار نہیں کی گئی اور اس کے بعد

باب۱۰

کل احاطۂ مدراس میں اگرچہ رعیت واری اصول پر بندوبست عمل میں لایا جا چکا تھا، دوامی زمینداری بندوبست کو وسعت دینے کی کوشش کی گئی اس بارے میں بہت بڑی حد تک اختلاف آرا رہا کہ دوامی بندوبست کو رائج کرنے کے لیے کونسا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے، لیکن مجلس نظما نے اس امر سے متاثر ہو کر بنگال کے دوامی بندوبست کے تحت مالگزاری پابندی کے ساتھ ادا کی جا رہی تھی، حکومت مدراس کو ہدایت کی کہ زمینداروں سے دوامی معاہدہ طے کیا جائے۔ شمالی مدراس میں اور جنوبی مدراس کے بعض علاقوں میں منفرد زمیندار موجود تھے جو زیادہ تر سابق حکمراں رئیسوں اور سرداروں کے جانشین اور اخلاف تھے، لہٰذا ان سے معاملہ طے کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی۔ لیکن جنوبی مدراس میں ان زمینداروں یا نام نہاد "پالی گاروں" میں سے چند کو تسلیم کیا گیا اور باقی کو برطانوی اقتدار کی مقاومت کی پاداش میں ملکیت سے محروم و بے دخل کر دیا گیا۔ لیکن احاطۂ مدراس کے بیشتر حصے میں رعیت واری دیہات موجود تھے جہاں اس قسم کے درمیانی اشخاص موجود نہ تھے، چنانچہ مجلس نظما کے ہدایات کے تحت عالی ہمت و بلند حوصلہ ٹھیکہ داروں میں سے ان کے بدل تیار کرنے کی کوشش کی گئی۔ مختلف دیہات کو ملا کر کئی مصنوعی ضلعے یا خطے قایم کیے گئے اور نیلام کے ذریعے سب سے زیادہ بولی بولنے والوں کے ہاتھ فروخت کر دیے گئے۔ اس طرح یہ لوگ کل جائداد کے زمیندار بن گئے۔ یہ تجربہ تباہ کن طریقے پر ناکام رہا اس لیے کہ وہ اسی کا مستحق تھا۔ جیسا کہ بیڈن پاول نے کہا ہے "جب حقیقی زمینداری اپنی ڈیڑھ صدی کی فطری ترقی کے دوران میں کافی برا ثابت ہوا تھا تو کمرۂ نیلام کے زمیندار کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے؟ یہ طریق یقینی طور پر بری طرح ناکام رہا"۔[۱] اس لحاظ سے اس تجربے کو رعیت واری طریق کے حق میں ترک کر دیا گیا۔ منرو نے اس طریق کی پرزور تائید کی تھی اور اس کو

---

[۱] دیکھو ان کی کتاب موسومہ "برطانوی ہند کے نظام ہائے اراضی" جلد اول صفحہ ۲۹۲۔

ترقی یافتہ شکل میں پیش کیا تھا اگرچہ وہی اس کے مصنف نہ تھے۔ لیکن قبل اس کے کہ رعیت واری طریق معتبر طریقے پر اختیار کیا جاتا احاطۂ مدراس کا ۱/۵ تا ۱/۴ علاقہ دوامی بندوبست کے تحت آچکا تھا۔ اب رہے مدراس کے زمینداری علاقوں کے قوانین لگان تو ان کا حال پہلے ہی بیان ہوچکا ہے۔

۱۶۔ دوامی بندوبست کی مابعد سرگزشت

(ا) کمپنی کے تحت

کمپنی کے دور حکومت میں ولزلی، منٹو، ہیسٹنگز، بینٹنک اور منرو[1] سبھوں نے دوامی بندوبست کو ہندوستان کے دوسرے علاقوں پر اس بنیاد پر وسیع کرنے کی پرزور حمایت کی تھی کہ بنگال کی مثال پر نظر کرتے ہوئے جہاں اس طریقے کے تحت حیات تازہ کے عظیم الشان آثار نمودار ہوئے تھے یہ طریق بظاہر سریع زرعی ترقی کے قطعی توقعات پیش کرتا تھا۔ لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظما نے معاہدہ مقدس وعدوں اور ضمانتوں اور ان توقعات کے باوجود جو ملک میں پیدا ہوئے تھے، ۱۸۲۱ء میں تجاویز مسترد کردیں۔[2]

(ب) تاج کے تحت

کمپنی کی تنسیخ کے بعد کرنل بیرڈ اسمتھ کی سفارش پر، جو ۱۸۶۱ء کے اوڑیسہ کے تحت قحط کے سلسلے میں مصائب کے

---

[1] لیکن یہ سوال زیر بحث رہا ہے کہ آیا منرو دراصل دوامی بندوبست کی موافقت میں تھے یا نہیں۔ اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ "مستقل" یا "دوامی بندوبست" سے ان کا مطلب دراصل رعیت کی ملکیت کو ان کے کھیتوں پر دوامًا محفوظ کرنا تھا، نہ کہ لگان کی مقدار کو ناقابل تغیر بنانا جس کے متعلق وہ یہ خیال کرتے تھے کہ حکومت کی ضرورتوں کے لحاظ سے اس میں کمی بیشی کی جاسکتی ہے۔ دیکھو ایک کتاب موسوم بہ "حکومت ہند کی مالگزاری کی پالسی" صفحہ ۱۶۷۔

[2] جیسا کہ مسٹر جسٹس رانا ڈے نے کہا ہے، "کپتان ون گیٹ اور ان کے رفقا بمبئی کے بندوبست کے عظیم ترین رہنما رہے ہیں، اور وہ ہمیشہ یہ خیال کرتے تھے کہ اراضی کے متعلق ان کی پالسی کی منزل مقصود دوامی بندوبست تھی جہاں رسائی حاصل کرنے کے لیے میعادی بندوبست ایک درمیانی یا طیاری کی منزل تھی۔" دیکھو بمبئی کی تشخیص مالگزاری کی رپورٹ شایع شدہ ۱۹۲۶ء، صفحہ ۷۳۔

اسباب کی تحقیق کرنے اور ان کو دور کرنے کی تدابیر پیش کرنے کے لیے مقرر کیے گئے تھے، لارڈ کیننگ نے اس مسئلے پر از سر نو توجہ کی۔ سر چارلس وڈ (وزیر ہند) نے اگرچہ اس سفارش کو منظور کر لیا، لیکن اس کو عملی جامہ پہنانے میں ناکام رہے۔ ان کے بعد کے وزیر ہند سر اسٹیفورڈ نارتھ کوٹ نے ۱۸۶۷ء میں بعض شرائط کے تابع دوامی بندوبست نافذ کرنے کی تحریک پیش کی، مثلاً یہ کہ جہاں قابل زراعت زمین کا ۸۰ فیصد حصہ زیر کاشت لایا گیا ہو اور اس کی توقع نہ ہو کہ نہری آب پاشی کے ذریعے سے پیداوار میں ۲۰ فیصد سے زائد اضافہ ہوگا وہاں حکومت کا مطالبہ دواماً مقرر کر دینا چاہیئے۔ ان شرائط کا مفہوم یہ تھا کہ جس وقت تک زمین کی آمدنی میں اضافہ ہو رہا ہے دوامی بندوبست کو ملتوی رکھنا چاہیئے۔ لیکن لارڈ کمبرلی وزیر ہند نے آخر کار اس تجویز کو ۱۸۸۳ء میں اس بنیاد پر کلیتہً مسترد کر دیا کہ ملک ابھی ترقی یافتہ نہ تھا۔ اس کے بعد سے حکومت کا طرز عمل دوامی بندوبست کے مسئلے کو ختم شدہ خیال کرنے کا رہا ہے، اگرچہ وقتاً فوقتاً دوامی بندوبست بمقابلہ عارضی بندوبست کی دیرینہ بحث کی صدائے بازگشت برابر سنائی دیتی ہے۔

۷۔ بنگال کے بقیہ زمینداروں اور تعلقداران اودھ کے ساتھ عارضی بندوبست

بنگال کے وہ علاقے جہاں کسی نہ کسی سبب سے دوامی بندوبست نہیں ہوا، عارضی بندوبست کی ذیل میں آتے ہیں جس کی رو سے واصلات کا فیصد تناسب بہت اعلیٰ یعنی دراصل تقریباً ۷۰ فیصد ہے۔ اس بندوبست کے تحت قابض بالعموم ایسے طبقے کے درمیانی اشخاص ہوتے ہیں جن کے لیے واصلات کا ۳۰ فیصد معقول معاوضہ خیال کیا جاتا ہے۔ تشخیص کے طریق کی حد تک بنگال میں اختیار کردہ طریق آگرے کے طریق کے مشابہ ہے جو ذیل میں بیان کیا گیا ہے۔

تعلقداروں کی ملک میں جو دیہات شامل ہیں وہ اس قدر اہمیت و وقعت رکھتے ہیں کہ اودھ کے بندوبست کو واقعی مشترکہ دیہی بندوبست کے طریق کی ترمیم شکل خیال کیا جا سکتا ہے، چنانچہ ہم اب اسی طریق کو بیان کریں گے۔

412

باب

۱۸۔ محل واری بندوبست

عارضی بندوبست جیسا کہ صوبۂ آگرہ میں رائج کیا گیا، وہی عام شکل رکھتا ہے جو ان صوبوں میں جہاں زیادہ تر زمیندارانہ حقوق رکھنے والی دیہی برادریوں سے سابقہ ہوا اختیار کی گئی۔ ابتداءً یہ کوشش کی گئی کہ مالگزاری کے مستاجر یا کسی دوسرے ممتاز شخص سے دیہات کا بندوبست دوامی طور پر طے کیا جائے۔ لیکن برطانوی حکومت دوامی بندوبست کی طرفداری میں کچھ بھی سننا نہیں چاہتی تھی علاوہ ازیں ہولٹ میکنزی نے ۱۸۱۹ء میں تحقیقاتی کمیشن کے معتمد کی حیثیت سے اس امر کی طرف توجہ مبذول کرائی کہ دیہات میں اجتماعی مالک موجود تھے۔ اور بتلایا کہ ان سے نبٹنا ضروری تھا، یہ کہ منفرد زمیندار کا تخیل جو بنگال سے اخذ کیا گیا تھا پوری طرح عمل میں نہیں لایا جاسکتا تھا، یہ کہ مناسب مساحت اور جملہ اقسام کے حقوق کا یہ احتیاط تحریری اندراج ناگزیر و لابدی تھا اور یہ کہ عام تدبیر کے طور پر دوامی بندوبست کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

اڑیسہ کے بندوبست کا مسئلہ بھی اسی زمانے میں رونما ہوا جس زمانے میں کہ صوبجات شمال مغربی (جنھیں آج کل صوبۂ متحدہ آگرہ و اودھ کے نام سے موسوم کرتے ہیں) میں تحقیقاتی کام آغاز کیا گیا، اور ان دونوں معاملات کو طے کرنے کے لیے ۱۸۲۲ء کا مشہور ضابطہ نمبر (۷) منظور کیا گیا۔ یہ ضابطہ اور دوسرے متعاقب ترمیمات عارضی بندوبست کے ان سب طریقوں کی اساسی بنیاد ہیں جو زمینداروں اور دیہی جماعتوں سے طے کئے گئے۔

آگرے میں انفرادی زمینداروں اور آگرے کے تعلقداروں کی چند مثالوں سے قطع نظر کرتے ہوئے، اکثر صورتوں میں دیہی جماعتوں کے اوپر کوئی شخص نہ تھا۔ اس لحاظ سے ان سے براہ راست اجتماعی طریقے پر بندوبست طے کیا گیا، اگرچہ شرکا میں سے کسی ایک کو جو باوقعت اور حیثیت دار ہوتا تھا اس غرض سے منتخب کر لیا جاتا تھا کہ وہ مالگزاری کی ادائی کی اصلی ذمہ داری اپنے سر لے، چنانچہ وہی سب شرکا کی جانب سے بندوبست کے معاہدے پر دستخط کر دیتا تھا اور شرکا فرداً فرداً اور مشترکہ طور پر ادائی کے ذمہ دار بنائے جاتے تھے۔ چونکہ آگرے کے تعلقداروں کے زمیندارانہ حقوق، اودھ کے تعلقداروں کے مالکانہ حقوق سے بہت گھٹیا تھے، اس لیے اول الذکر کے مطالبات کے تصفیے کا طریقہ یہ تھا کہ ان کے تحت کی

باب ۱۴
413

دیہی جماعتوں کے ذمے کی واجب الادا مالگزاری میں حسب ضرورت اضافہ کر دیا جاتا تھا اور مالگزاری کا ۱۰ فیصد الاؤنس تعلقداری کے طور پر ان کو براہ راست سرکاری خزانے سے ادا کیا جاتا تھا۔ آگرے کی دیہی برادریوں کے ساتھ تصفیے کی جانب عود کرتے ہوئے یہ کہدینا ضروری ہے کہ گاؤں کا کوئی طبقہ یا ذ ایک مقررہ حد کے اوپر) انفرادی شریک بھی مالگزاری کی مشترکہ ذمہ داری کی بجائے انفرادی وجداگانہ ذمہ داری کی تحریک کر سکتا ہے۔ بندوبست کا کام ایک حد تک عدالتی اور ایک حد تک مالی ہے' گویا وہ علی الترتیب ایک طرف حقوق اراضی کی دریافت اور تحریری یادداشت سے تعلق رکھتا ہے اور دوسری طرف مطالبۂ مالگزاری کی تشخیص اور بعض صورتوں میں اسامیوں کے لگان کے تقرر کے متعلق ہے۔ جہاں تک بندوبست کا تعلق ہے' حدود بندی' مساحت' کھیتوں اور حقوق کے تحریری اندراج' اور آخر میں تشخیص مالگزاری وغیرہ کے معمولی مرحلے طے کرنے پڑتے ہیں۔

۱۹۔ محل واری طریقوں میں مالگزاری کی تشخیص کے اصول

ہم ابھی جن اصول تشخیص کو بیان کرنے والے ہیں ان کے متعلق یہ ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ وہ تمام محل واری طریقوں کے بارے میں صادق آتے ہیں۔ مختلف طریقوں کے تجربے مثلاً خالص پیداوار کے تخمینے وغیرہ کے بعد حکومت نے مالگزاری کی تشخیص کا مندرجۂ ذیل طریقہ اختیار کیا۔ گاؤں کی زمینوں کی حقیقی آمدنی بشکل لگان کو مالگزاری کی تشخیص کی براہ راست یا بالواسطہ بنیاد کے طور پر لیا جاتا ہے۔ مالگزاری کو اصطلاحی طور پر کسی جائداد کی اس آمدنی یا اصلات کے ایک جزو پر مشتمل کہا جاتا ہے جو اس سے سالانہ وصول ہوتی ہے۔ اس جزو میں وقتاً فوقتاً تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ چنانچہ ابتداءً ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت یہ جزو بہت اعلیٰ یعنی ۹۰ فیصد سے بھی زاید تھا؛[1]

---

[1] چنانچہ معتبر طریقے پر بیان کیا گیا ہے کہ اڑیسہ میں سنہ ۱۸۲۲ء میں ۹۰ واصلات کا ۳ر۸۳ فیصد تھا؛ سنہ ۱۸۳۳ء میں ۶۵ فیصد مقرر ہوا جس میں ۶ فیصد تک کمی کرنے کی اجازت تھی؛ لیکن سنہ ۱۹۰۰ء کے نظرثانی شدہ بندوبست میں اس کو گھٹا کر ۵۴ فی صد کر دیا گیا۔
دیکھو ایک کتاب موسومہ بہ "حکومت ہند کی مالگزاری کی پالسی" صـ ۱۳۔

باب ۱۲

۱۸۲۲ء میں لارڈ ولیم بنٹنک نے اس کو گھٹا کر ۶۶ فیصد مقرر کیا۔ ۱۸۵۵ء کے قواعد سہارن پور کے تحت اس کو مزید کمی کے بعد تقریبا ۵۰ فی صد تک کر دیا گیا، اور سرکاری حقوق کے مطابق اکثر صورتوں میں جو حقیقی جزو وصول کیا جاتا ہے اس کی مقدار موجودہ زمانے میں ۵۰ فیصد سے بہت کم ہے۔

واصلات زیادہ تر حسب ذیل مدوں پر مشتمل ہوتے ہیں:- (۱) حقیقت میں وصول شدہ مجموعی لگان، جو آگرے کی حد تک اہم ترین فیصلہ کن عامل ہے؛ (۲) ان زمینوں کی تخمینی آمدنی بہ شکل لگان جو خود مالکوں کے قبضے میں ہوں یا ان کی طرف لگان معاف کر کے دوسروں کو دیدی گئی ہوں؛ اور (۳) بعض متفرق منافع، مثلاً قیمتی افتادہ زمین، چرائی، میووں اور جنگلی پیداوار وغیرہ کی آمدنی۔ تین مدوں کے منجملہ پہلی دو مدیں، جو جائداد کے واجب الوصول لگان پر مشتمل ہوتی ہیں، اساسی عامل ہیں۔

آگرہ، اودھ، پنجاب اور صوبۂ متوسط کے مختلف قسم کے محل واری بندوبست میں تشخیص کا یہی عام اصول ہے؛ اگرچہ مختلف صوبوں میں تفصیلات کی حد تک اختلافات ہیں۔ بندوبست کے زمانے میں لگان کی جو حقیقی شرحیں ادا کی جاتی تھیں وہی آگرے کی تجویز کی بنیاد ہیں۔ صوبۂ متوسط میں لگان کے بار کو زیادہ مکمل طریقے سے مساوی کرنے کی ضرورت کی بنا پر ایک خاص طریقہ اختیار کیا گیا جس پر بعد میں بحث کی جائے گی۔ پنجاب میں چونکہ بیشتر زمینیں مالکوں یا ایسے اسامیوں کے قبضے میں ہیں جو جنس کی شکل میں لگان ادا کرتے ہیں، اس لیے نقد کی شکل میں لگان کا حساب کرنے کا طریقہ براہ راست اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لحاظ سے یہ ضروری ہے کہ ایک مقررہ قسم کی تمام زمینوں کے لیے نمونے کے کھیتوں کی حقیقی نقد ادائیوں کی بنیاد پر کوئی مناسب شرح معین کی جائے، اور ان معیاری رقموں کا اطلاق گاؤں کی سب زمینوں پر کیا جائے۔

414

۲۰۔ محل واری بندوبست کا عمل صوبۂ متحدہ میں

صوبۂ متحدہ میں بندوبست کے عمل کے آغاز سے پیشتر، ایک عہدہ دار بندوبست دیہات کا معاینہ کرتا ہے اور تشخیص مالگزاری کے لحاظ سے انہیں مختلف حلقوں میں تقسیم کرتا ہے جن کی زمین اور طبعی خصوصیات عام طور پر یکساں اور ایک دوسرے کے مشابہ ہوتی ہیں۔ اس کے بعد ہر حلقے کی زمین

باب ۱۱

کا لگان مقرر کیا جاتا ہے۔ اس غرض کے لیے معمولی فصلوں کی ان زمینوں کا نقد لگان بطور رہنما لیا جاتا ہے جو ایسے مستقل اور ذمہ دار اسامیوں کے قبضے میں ہوں جن کا ذریعۂ معاش محض ان کے کھیت ہوں۔ عہدہ دار بندوبست، ذرایع آمدورفت، اضافۂ آبادی، فصل کے اعداد و شمار اور مزروعہ رقبے کے اضافے کا لحاظ کرنے کے بعد مقررہ جمعبندی کے حوالے سے مالگزاری کی شرح معین کرتا ہے[1]۔ جہاں نقد لگان کا طریقہ نہیں ہے وہاں، عہدہ دار بندوبست اپنی بنیاد کے طور پر یا تو وہ لگان لیتا ہے جو گاؤں میں اس کے مماثل زمینوں کے لیے ادا کیا جاتا ہے یا اپنے ہی حلقے کی شرحیں کو لیتا ہے۔

اودھ میں اس طریقے کا اطلاق

اودھ کا بندوبست، آگرے کے بندوبست سے بشمول تشخیص تمام خصوصیات میں مشابہ ہے، بجز اس کے کہ بندوبست گاہ گاہ دیہی برادریوں سے طے کیا جاتا ہے، اور اکثر صورتوں میں ایسی جائداد کے لیے جو دیہات کی کم یا زیادہ تعداد پر مشتمل ہو انفرادی تعلقداروں سے ایک ہی مجموعی رقم کی شکل میں معاملہ کیا جاتا ہے۔ تعلقدار کے ذمے کی مالگزاری ان رقموں کے مجموعے پر مبنی ہوتی ہے جو اس کے علاقے کے ہر گاؤں پر بطور لگان عاید کی جاسکتی ہیں۔ بعض صورتوں میں، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، جہاں تعلقدار کے تحت کی دیہی برادریاں اپنے حقوق کے تحفظ میں کامیاب رہی ہیں، وہاں ان سے ذیلی بندوبست کیا جاتا ہے، اور تعلقدار کو مقررہ لگان ادا کیا جاتا ہے تاکہ تعلقدار کو کچھ نفع مل جائے جو کسی صورت میں بھی مالگزاری کے ۱۰ فیصد سے کم نہیں ہوتا۔

۲۱۔ پنجاب کا بندوبست محل واری

یہاں بھی مساحت اور کتابچۂ حقوق وغیرہ کے بارے میں یہی طریقہ رائج ہے۔ لیکن طریق تشخیص کی حد تک تفصیلات میں اختلاف ہے۔ اسامیوں کی کوئی بڑی جماعت نہیں ہوتی اور اگر ہوتی ہے تو وہ بشکل جنس لگان ادا کرتی ہے۔ اس لحاظ سے عہدہ دار بندوبست، دیہی جائداد میں ہر قسم کی زمین

[1] دیکھو محصول کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ (۶۷)۔

باب ۱۲

کے لیے مالگزاری کی شرحوں کا براہ راست تخمینہ بحساب فی ایکڑ کرتا ہے اور ان کو اس چیز پر مبنی قرار دیتا ہے کہ نقد لگان یکساں طور پر ادا کرنے کی صورت میں لگان کے واصلات کیا ہوں گے۔ اس غرض کے لیے رقبے کو مختلف حلقوں میں تقسیم کیا جاتا ہے جن میں سے ہر ایک میں زمین کی چند ممتاز قسمیں قرار دی جاتی ہیں۔ اس طرح ہر قسم کی زمین کی نمایندگی کرنے والے مناسب نمونے کے کھیتوں کی کچھ تعداد لینے اور یہ تحقیق کرنے کے بعد کہ وہ بصورت نقد در اصل کتنا ادا کرتے ہیں اور یہ نہ معلوم ہو سکے تو لگان بہ شکل جنس کی نقد قیمت کیا ہے، بعض مناسب معیاری شرحیں مقرر کر دی جاتی ہیں۔ ان معیاری شرحوں سے مالگزاری کی تشخیص کی عام بنیاد کے طور پر کام لیا جاتا ہے۔ پنجاب میں، اگرچہ نظری طور پر مالگزاری انفرادی کسانوں سے نہیں بلکہ یہی جائدادوں کے شترکہ قابضوں سے وصول کی جاتی ہے جو شترکہ یا انفرادی طور پر اس کو ادا کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں، تاہم عملاً ہر ایک سے مالگزاری کا حصہ واجب الوصول ہوتا ہے وہ تقسیم کر دیا جاتا ہے اور فرداً فرداً وصول کیا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے کسانوں کی عام طور پر وہی حیثیت ہوتی ہے جو کہ بمبئی اور مدراس کے ملکی کاشتکاروں کی۔

415

۲۲۔ صوبۂ متوسط کا "مالگزاری بندوبست"

علاوہ ازیں مالگزاری کی تشخیص کی بنیاد کی حد تک صوبۂ متوسط کا طریقہ عملاً ویسا ہی ہے جیسا کہ آگرے کا۔ لیکن ایک اہم خصوصیت کے بارے میں اختلاف ہے۔ صوبۂ متوسط میں دیہات کی مالگزاری وصول کرنے کا انتظام مرہٹوں نے ان افراد کے سپرد کر رکھا تھا جن کو عام طور پر "مالگزار" کہتے تھے۔ لیکن برطانوی حکومت کے اس اضطراب کی بنا پر کہ وہ انفرادی زمینداروں سے معاملہ کرنا چاہتی تھی ان کو مالکانہ حیثیت دے دی گئی اور وہ دیہات کے صدر یا سردار تسلیم کر لیے گئے، اگرچہ یہاں کے دیہات بمبئی اور مدراس کے مثل رعیت واری قسم کے تھے اور کسانوں کے مجموعوں پر مشتمل تھے جن میں سے ہر ایک اپنے کھیت کی کامل اور بلا شرکت غیرے ملکیت کا مدعی تھا۔ پس اس امر کا لحاظ کرتے ہوئے کہ یہ کسان مالکوں کی حیثیت سے گرا کر "مالگزاروں" کے اسامیوں کے درجے تک پہونچا دیے گئے تھے، ان کا بہت ہی وسیع تحفظ کرنا پڑا۔

باب ۱۲

اس لحاظ سے عہدہ دار بندوبست کو نہ صرف اس مالگزاری کا مطالبہ معین کرنا پڑتا ہے جو مالگزاروں سے وصول طلب ہوتی ہے بلکہ اس لگان کا بھی جو سب قسم کے اسامیوں کی طرف سے مالگزاروں کو ادا شدنی ہوتا ہے[1]۔ پس یہ ظاہر ہے کہ لگان کی مالیت کا اندازہ کرنے کا طریقہ اس سے بہت زیادہ صحیح ہونا چاہئے جتنا کہ وہ حکومت کے مالگزاری کے مطالبے کی عام بنیاد کے طور پر کارآمد ہو سکتا ہے۔

اس طرح صوبۂ متوسط میں لگان کا تعین ایک نہایت پیچیدہ عمل ہے، جو دیدہ ریزی کے ساتھ "ارضی اکائیوں" کی شکل میں زمین کی گروہ بندی کر کے پورا کیا جاتا ہے۔ ان اکائیوں کے قایم کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ زمین کی زرخیزی اور پیداآوری کی صلاحیت کے پیمانے کا کام دیں۔ "آمدنی کے متعلق یہ فرض کیا جاتا ہے کہ اس کا انحصار کاشت کے اوسط خالص منافع پر ہے، اور ہر حیثیت و قسم کی زمین کا ایک حصہ مقرر کیا جاتا ہے جو دوسری زمینوں کے مقابلے میں اس کی آمدنی کو ظاہر کرتا ہے! اس طرح ارضی اکائی نہ صرف زمین کی زرخیزی کے اعتبار سے بلکہ اس کی حیثیت اور موقع کے لحاظ سے بھی مختلف ہوتی ہے"[2]

416

۲۳۔ رعیت واری بندوبست: مدراس کا رعیت واری طریقہ

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں[3] کہ مدراس میں دوامی بندوبست رائج کرنے کی کوششوں کی ناکامی کے بعد رعیت واری طریقہ کس طرح اختیار کیا گیا۔ بندوبست کے اصول کسی مجموعۂ ضوابط کی شکل میں مرتب نہیں کئے گئے ہیں

---

[1] "لگان کا تعین، جو بندوبست کا اہم ترین عمل ہے، مالگزاروں کے اس عام اور روز افزوں میلان کی وجہ سے پیچیدہ ہوگیا ہے کہ وہ اس کو روا رکھتے ہیں کہ لگان کی مقدار کم رہے اور دست برداری کی بنا پر واپس شدہ کھیتوں کو از سر نو پٹے پر دے کر یا پہلی دفعہ زمین کو پٹے پر اٹھا کر نذرانہ وصول کرتے ہیں"۔ دیکھو محصول کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ ۶۹۔

[2] دیکھو محصول کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، مزید تفصیلات کے لیے دیکھو بیڈن پاؤل کی کتاب موسومہ بہ "برطانوی ہند میں مالگزاری اور حقیت اراضی" صفحہ ۱۸۶ تا صفحہ ۱۸۸

[3] دیکھو صفحہ ۱۲۱ انگریزی متن۔

باب۱۴

اور عام و وسیع ہدایات سے اخذ کیے گئے ہیں۔ ہر گاؤں کی صحت کے ساتھ پیمائش کی جاتی ہے اور گاؤں کا ایک نقشہ جس کے ساتھ تمام کھیتوں کا ایک تفصیلی رجسٹر ہوتا ہے تیار کیا جاتا ہے۔ اراضی کو، زمین کی پیدآ ور صلاحیت کے مطابق تقسیم کیا جاتا ہے، اور پیدآور قوت کا اندازہ معمولی غلے کی فصلوں میں سے کسی فصل کی مقدار کے حوالے سے کیا جاتا ہے! غلے کی قدر کو زر کی قدر میں مبدل کیا جاتا اور نقد قیمت مقرر کی جاتی ہے جو بندوبست سے پیشتر کے بیس غیر قحط زدہ سالوں کے اوسط پر عام طور پر مبنی ہوتی ہے۔ اسی میں سے مصارف کاشت نہا کرنے کے بعد خالص پیداوار حاصل ہوتی ہے جس کا تقریباً نصف، بیشتر ین مالگزاری کے طور پر مقرر کیا جاتا ہے۔ تاجروں کے لیے منافع کی گنجایش چھوڑنے اور بازار تک غلے کی نقل وحمل کی مسافت، موسمی انقلابات اور غیر نفع بخش علاقوں کا لحاظ کرکے مالگزاری میں کمی کی جاتی ہے۔ اس کے بعد ان زمینوں کو، جن کی آمدنی بہ شکل جنس ایک دوسرے کے مماثل ہوتی ہے، بلا لحاظ ان کی درجہ بندی کے احکام موسوم بہ "ترم" (Taram) کے تحت توس میں رکھا جاتا ہے اور ان میں سے ہر ایک کی شرح تشخیص جدا ہوتی ہے۔ ان شرحوں میں نہ صرف ان دیہات کی حیثیت کے لحاظ سے جن میں کہ زمینیں واقع ہیں بلکہ آب پاشی کے ذرایع کی نوعیت کے اعتبار سے بھی مزید ترمیم کردی جاتی ہے۔ اس غرض کے لیے دیہات کو مختلف زمروں یا حصوں میں تقسیم کردیا جاتا ہے، خشکی کی زمینوں کی حد تک، سڑکوں اور بازاروں کی قربت کے لحاظ سے اور تری کی زمینوں کی حد تک، آبرسانی کی نوعیت وکیفیت کے لحاظ سے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف اراضی پر جن کی زمینیں ایک دوسرے کے مماثل ہوتی ہیں لیکن جو مختلف زمروں میں واقع ہیں یا مختلف اقسام آب پاشی کے تحت ہیں مشخصہ مالگزاری کی مختلف شرحیں عاید کی جاتی ہیں۔ اس طرح جو مالگزاری مشخص ومقرر کی جاتی ہے وہ سطح زمین کی کاشت میں حکومت کے حصے بہ شکل زر کی نمایندگی کرتی ہے۔ لیکن اگر زمین میں معدنیات دریافت ہوں تو اس کے لیے جداگانہ مالگزاری مشخص کی جائے گی[1]

---

[1] دیکھو محکمۂ مالگزاری مدراس کے مستقل احکام جن کا اقتباس محصول کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ ۴۶ میں موجود ہے۔

۲۴۔ بمبئی کا رعیت واری طریق

مدراس کے برعکس بمبئی میں مجموعۂ ضوابط مالگزاری موجود ہے جس کے تحت بندوبست کے متعلق معاملات طے پاتے ہیں۔ اس کے علاوہ خاص ایکٹ یا قوانین خاص قسم کی جائدادوں مثلاً گجرات کے تعلقداروں کوکن کے کھوتوں اور اضلاع کھیرا اور بروچ کے چند مشترکہ دیہات وغیرہ کے متعلق موجود ہیں۔

ہم مالگزاری کے متعلق اپنے عام تاریخی تبصرے میں مرہٹوں کے انتظام مالگزاری کا ذکر کر چکے ہیں اور یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ مالگزاری کی بابت مستاجری کے طریق کے رواج کے نتیجے کے طور پر آخری پیشواؤں کے تحت اس انتظام میں خرابیاں پیدا ہوگئیں۔ جس وقت برطانوی حکومت نے دکن کو پیشواؤں سے لے لیا تو انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ مستاجری کے تباہ کن طریقے کو ختم کر دیا جائے اور نانافرنویس کے زیادہ منصفانہ طریق کی طرف عود کیا جائے۔

کئی عارضی تجربوں اور مختلف تجاویز کے بعد (جن میں محل واری طرز پر عام دیہی بندوبست کی تجویز شامل تھی) آخر کار رعیت واری طریق اختیار کر لیا گیا۔ ۱۸۲۴ء میں پرنگل کو زمین کی مفصل پیمائش کا حکم دیا گیا انھوں نے بھی دیدہ ریزی کے ساتھ یہ کوشش کی کہ محصلہ خالص منافع کی بنیاد پر انتہائی صحت کے ساتھ زمین کی قسمیں قرار دی جائیں۔ لیکن اس کام کے لیے بہت سے فروع اور تفصیلات کی ضرورت تھی؛ اور چونکہ اس تجربے کے نتیجے کے طور پر مالگزاری کی بہت ہی اعلیٰ شرح مشخص ہوئی اس لیے یہ کل تجربہ ناکام ثابت ہوا۔ تحقیقات کی پیچیدہ نوعیت اور مواد فراہم کرنے کے لیے مقرر کردہ تحتانی اہلکاروں کی کثیر تعداد کی نگرانی کے ناممکن کام نے صریحاً باقاعدہ تحقیقات کو بالکل غیر معتبر بنا دیا۔ جس چیز کی حقیقت میں ضرورت تھی وہ یہ تھی کہ اس وقت کی مالگزاری کی شرحوں میں بڑی حد تک کمی کی جاتی؛ اس لیے کہ اس کو عام طور پر بہت بھاری خیال کیا جاتا تھا۔ تجربے کی ناکامی قحط کا دور دورہ مسلسل کئی سال تک رہنے کی وجہ سے نمایاں ہوگئی۔

اس لحاظ سے حکومت نے یہ ہدایت کی کہ کل عمل کو از سر نو شروع کیا جائے؛

باب ۱۲

اور ۱۸۳۶ء میں اس کام کو دو عہدہ داروں یعنی مسٹر گولڈ اسمڈ اور لفٹنٹ ون گیٹ کے سپرد کیا۔ ان دونوں نے جو طریق رائج کیا وہی وقت بوقت ترمیم پانے کے بعد موجودہ خاص شکل میں نافذ ہے[1] ۱۸۴۷ء میں انھوں نے اپنی رپورٹ پیش کی جس میں احاطۂ بمبئی کے حالات کے لحاظ سے مساحت اور بندوبست کی بنیاد کے لیے عام اصول مقرر کیے گئے تھے۔ انھوں نے سفارش کی کہ مالگزاری کی معتدل شرح مقرر کی جائے، بندوبست تیس سالہ رہے، بندوبست کی میعاد میں اراضی کی اصلاح و ترقی کو محصول سے محفوظ رکھا جائے، زمین کی ملکیت تسلیم کیجائے، اور فروخت، انتقال اور ذیلی اسامیوں پر لگائے ہوئے لگان کے انتظام وغیرہ کے بارے میں کامل آزادی دی جائے۔ بعد میں چل کر ان عہدہ داروں سے تعامل کرنے کے لیے کپتان ویوڈسن کو مقرر کیا گیا اور ۱۸۴۷ء میں ان سبھوں نے ایک رپورٹ پیش کی جو "مشترکہ رپورٹ" کے نام سے اچھی طرح مشہور ہے؛ اس میں وہ اصول پیش کیے گئے ہیں جو موجودہ طریق کی تہ میں مضمر ہیں۔

اس رپورٹ میں اختیار کردہ طریقے کے مطابق خالص منافع کی بنیاد جو پرنگل کے طریق کے تحت زمین کی تقسیم و تبویب کے لیے اختیار کی گئی تھی، ترک کردی گئی۔ اس کی بجائے زمین کی گہرائی اور ساخت کو ملحوظ رکھا گیا۔ مالگزاری کی مقدار کو، تجربی شرحوں کے ذریعے سے بارش، زرعی قیمتوں، زمین کی حالت وغیرہ امور کی بنیاد پر منظم کیا گیا؛ لیکن اساسی اصول یہ تھا کہ کسان سے اس سے زیادہ طلب نہ کیا جائے جتنا کہ وہ بآسانی ادا کرسکتا تھا۔ قدیم زمانے کے "میراثی" اور "اوپری" حقوق اراضی ایک یکساں حیثیت اراضی میں ضم کردیے گئے جسے "پیمایشی یا ونیلکارانہ حیثیت" کہتے تھے۔ کسان کا استحقاق اس کے کھیت پر اس وقت تک غیر فانی قرار دیا گیا جس وقت تک کہ وہ مقررہ مالگزاری ادا کرتا رہے۔ وہ اپنے ذمے کے واجبات کو اپنے مالی ذرایع کے مطابق بنالینے کے خیال سے موجودہ کھیت سے دست بردار ہونے یا دوسرے کھیتوں پر قبضہ کرنے کا استحقاق

418

[1] دیکھو تشخیص مالگزاری کی کمیٹی کی رپورٹ (بمبئی) شائع شدہ ۱۹۲۶ء صفحہ ۳ تا صفحہ ۹۔

باب ۱۱

رکھتا تھا۔ چنانچہ اسی بنیاد پر اس کی حیثیت و حالت کی تعریف و تعیین بمبئی کے ضابطۂ مالگزاری میں کردی گئی ہے۔ اس طرح قایم کردہ حقیقت اراضی "رعیت واری" کے نام سے موسوم ہے جس کے تحت ملکی کاشتکار حکومت سے براہ راست ملکیت حاصل کرکے اپنے قبضے میں لاتا ہے کامل حقیت دخیلکاری قابل توریث و قابل انتقال ہے، لیکن بلا اجازت حکومت منتقل نہیں کی جاسکتی۔ اگر محصول ادا نہ کیا جائے تو دخیلکاری ضبط کی جاسکتی ہے۔ قابض یا دخیلکار کی طرف سے اراضی کی اصلاح و ترقی عمل میں آئے تو اس کے بارے میں یہ ضمانت دی گئی ہے کہ کوئی زائد محصول عائد نہیں کیا جائے گا[۱]۔

۲۵ بمبئی کے بندوبست کی اہم خصوصیات[۲]

بمبئی کا رعیت واری طریقہ وہی عام خصوصیات رکھتا ہے جو مدراس کے طریقے کے ہیں، مثلاً سرحدوں کی نشان اندازی، سروے نمبرات کا تعین جو ایک مرتبہ مقرر کردیے جانے کے بعد بدلے نہیں جاتے، اور زمین کی درجہ بندی و تبویب، لیکن تشخیص کا طریق مدراس کے طریقے سے مختلف ہے۔ زمینوں کی اضافی آمدنیاں، ہیئت کے لیے ان کی گہرائی، ساخت، رطوبت روکنے کی صلاحیت اور زرخیزی پر اثر انداز ہونے والے دوسرے طبیعی خواص کے مطابق مختلف درجوں میں تقسیم کردی جاتی ہیں اور روپے کے کسور کی شکل میں ظاہر کی جاتی ہیں؛ چنانچہ سولہ آنے بہترین قسم کی زمین کی نمایندگی کرتے ہیں۔ اس درجہ بندی و تبویب کا مقصد مدراس کے طریقے کے برعکس خالص پیداوار پر تشخیص کو مبنی کرنا نہیں ہے بلکہ محض یہ کہ عام امور کا لحاظ کرکے اس رقبے کے لیے مالگزاری کا جو مجموعی مطالبہ مقرر کیا جائے اس کی تقسیم کی بنیاد کے طور پر اس خالص پیداوار کو استعمال کیا جائے۔

مالگزاری کی تشخیص و تعیین کا عمل حسب ذیل تین اہم کارروائیوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:— (۱) پہلی کارروائی یہ ہے کہ آب وہوا، محل وقوع اور کاشت کی

---

[۱] دیکھو کیٹنگ کی کتاب موسوم بہ "بمبئی دکن میں دیہی معیشت" صفحہ ۲۰ تا صفحہ ۲۱۔

[۲] بمبئی کے طریق کے زیادہ مفصل بیان کے لیے دیکھو ایک کتاب موسوم بہ "حکومت ہند کی مالگزاری کی پالیسی" باب ۶۔

باب ۱۲

عام حالت وغیرہ کے نمایاں اور مستقل اختلافات کے لحاظ سے تعلقوں کو مختلف قسموں میں تقسیم کیا جائے؛ (۲) دوسری کارروائی یہ ہے کہ مقررہ رقبے کے لیے (جو عام طور پر تعلقہ ہوتا ہے) مالگزاری کے مجموعی مطالبے کا تعین اس رقبے کی مالگزاری اور معاشی سرگذشت کے اعتبار سے کیا جائے۔ (۳) آخری کارروائی یہ ہے کہ مجموعی مالگذاری کے مطالبے کے اجزا کا تعین کیا جائے۔ یہ سب کارروائی، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، زمین کی "آنے واری" تقسیم و تبویب کی مدد سے کی جاتی ہے جو شرح تدریجی کا کام دیتی ہے۔ مثلاً اگر ۱۶ آنے والے کھیت کے لیے بیشترین شرح ۳ روپے فی ایکڑ ہو تو آٹھ آنے والے کھیت کے لیے شرح فی ایکڑ ڈیڑھ روپیہ ہوگی[1]۔ بمبئی کے طریق کی خالص تجربی نوعیت اس واقعے سے ثابت ہوتی ہے کہ مالگزاری کی شرحوں کے بارے میں افسر بندوبست کے فیصلے کا انحصار "نظریے کی بنیاد پر نتائج باضابطہ اخذ کرنے پر نہیں ہوتا بلکہ مقامی معلومات اور تجربے کے شخصی تاثرات پر ہوتا ہے"[2]۔ لیکن کچھ سال ادھر سے آمدنی بہ شکل لگان جو پٹے، بیع اور دوسرے اسی قسم کے امور کے متعلق اسلہ اور یادداشتوں سے متعین ہو، مالگزاری کی تشخیص کی بنیاد کے طور پر عملاً اختیار کی جا رہی ہے[3]۔ اگرچہ "کتابچہ مساحت و بندوبست"[4] میں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ "مالگزاری کے اضافے کے دلائل عام امور کی بالواسطہ شہادت پر مبنی ہونے چاہئیں اور یہ کہ لگان کے متعلق اعداد و شمار سے صرف

419

---

[1] برار کے بندوبست کا طریق ٹھیک اس طریق کے مماثل ہے جو بمبئی میں رائج ہے۔ سندھ میں تشخیص کی شرحوں کا دارومدار آب پاشی پر ہے نہ کہ بارش پر جو بہت کم مقدار میں ہوتی ہے اور بندوبست کی مدت احاطۂ بمبئی کے مقابلے میں بہت چھوٹی ہوتی ہے۔

[2] دیکھو ایک کتاب موسوم بہ (The Bombay Survey & Settlement Manual) جس کا حوالہ محصول کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ کے فقرہ ۶۶ میں دیا گیا ہے۔

[3] دیکھو حکومت بمبئی کی قرارداد تشخیص مالگزاری کی کمیٹی کی رپورٹ (شائع شدہ ۱۹۲۷ء) کے بارے میں۔

[4] (The Survey & Settlement Manual)۔

باب ۱۱

ایسی روک کے طور پر کام لینا چاہیے جو مالگزاری میں حد سے زیادہ اضافہ ہونے دے۔"

مالگزاری کی نظر ثانی کے نتیجے کے طور پر اضافہ کرنے کی صورت میں چند بندشیں قائم ہیں؛ چنانچہ اسی کے مطابق اضافہ کل تعلقے کے لیے مجموعی مقدار کے ۳۳ فیصد گاؤں کے لیے ۶۶ فیصد اور منفرد کھیت کے لیے ۱۰۰ فیصد تک محدود ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، اراضی کی خانگی اصلاح و ترقی محصول سے محفوظ ہے۔ اس لیے کہ وہ نظری طور پر زائد مالگزاری سے کلیتہً مستثنیٰ ہے۔ لیکن اس بارے میں واضح و معین ہدایات موجود نہ ہونے کی وجہ سے کہ اصلاح و ترقی کس کو قرار دیا جائے اور کس کو قرار نہ دیا جائے یہ شکایت کی جاتی ہے کہ افسر بندوبست کی رائے پر بہت کچھ انحصار رکھا گیا ہے اور اس طرح اصلاح و ترقی بھی بعض اوقات محصول کی زد میں آجاتی ہے۔ دوسری طرف نظری طور پر اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ کیوں ہر قسم کی اصلاح و ترقی کو مستقل طور پر مستثنیٰ رکھا جائے۔ اگر استثناء صرف اس مدت تک روا رکھا جائے جس میں اصلاح و ترقی کے مصارف کا بار سر سے اتر جائے تو کافی ہے۔

۲۶۔ برما اور آسام کے خاص طریق (جو اصولاً رعیت واری ہیں)۔

(۱) برما۔ برما کا موجودہ طریق مدراس کے طریق کے بہت بڑی حد تک مشابہ ہے؛ اس لیے کہ یہ خالص پیداوار پر مبنی ہے اور قدیم طریق کی جگہ قائم کیا گیا ہے جس کے تحت جنوبی برما میں مجموعی خام پیداوار کی قیمت کا ۱/۵ اور شمالی برما میں "تھتھامیڈا" (Thathameda) لیا جاتا تھا؛ موخرالذکر ایک قسم کا عام ٹکس تھا جو تمام زمینوں پر لگایا جاتا تھا۔

420

(۲) آسام۔ آسام میں واحد مالک، قدیم اضلاع بنگال کے دوامی بندوبست نے زمیندار اور چند دوسرے دوامی کاشتکار تھے جو ایک خاص حق موسوم بہ "حق کاشتکاری" سے متمتع ہوتے تھے؛ یہ حق ۱۸۸۶ء کے ضابطے سے قبل دس سالہ قبضۂ زمین پر اور ضابطے کے بعد دس سالہ عطیے یا پٹے پر مبنی تھا۔ زمین کے بڑے حصے پر ایسے اجازت نامے یا پٹے کے ذریعے سے بھی قبضہ رکھا جاتا ہے جس کی سالانہ تجدید کی جاتی ہے یا کم از کم ایسے پٹے کے ذریعے سے جو دس سال سے کم کے لیے ہو۔ آسام میں افتادہ زمین کے قواعد خاص طور پر اہم ہیں اس لیے کہ یہاں کے کسی ضلع کا بمشکل ۲۵ فیصد رقبہ زیر کاشت ہے۔

باب ۱۲

بچانے کے باغ حقیقت پٹہ پر طویل مدت کے لیے اور مالگذاری کی ادنیٰ شرح پر قبضے میں لیے جاتے ہیں۔ پٹے کی مدت کے ختم پر قوانین نافذہ کے تحت زمین پر مالگذاری عائد کی جاسکتی ہے البتہ بشرطیکہ اس کی شرح اس محصول سے زائد نہ ہو جو کسی معمولی زرعی فصل کی کاشت کرنے والے ضلع میں مالگذاری کی اعلیٰ ترین شرح والی زمین کے لیے مقرر کیا گیا ہو۔ یہ سوال کہ حکومت کو آمدنی کے اس اضافے کا کم از کم ایک جزو کس طرح وصول کرنا چاہیے جو ان زمینوں سے حاصل ہو رہا ہے، حکومت کی توجہ اپنی طرف منعطف کر رہا ہے۔[1]

۲۷۔ سرکاری ملکیت بمقابلہ انفرادی ملکیت

قبل اس کے کہ موجودہ زمانے کے مالگذاری کے طریق اور اس سلسلے میں پیدا ہونے والے کئی نزاعی مسائل کی ناقدانہ تحقیق کی جائے ہم ایک مباحثے کو نبٹائیں گے جو اس قدر اہم خیال کیا جاتا ہے کہ مالگذاری سے تعلق رکھنے والے تقریباً ہر اہم مسئلے کی بابت فیصلے کا انحصار اس نقطۂ نظر پر مانا جاتا ہے جو ہم اس معاملے میں اختیار کریں گے۔ ہمارا مطلب اس سوال سے ہے کہ آیا کوئی عمومی زمیندار ہے یا نہیں یا آیا ہندوستان میں زمین کی خانگی ملکیت مسلم ہے یا نہیں! شروع ہی میں یہ کہہ دینا مناسب ہوگا کہ اس طرح پیش کیے ہوئے سوال کا کوئی واضح قطعی اور فیصلہ کن جواب نہیں دیا جاسکتا اور دوسرے یہ کہ بہر صورت جملہ عملی اغراض کے لیے اس امر کا نفس معاملہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ ہم "مالگذاری" کو "لگان" کہیں کہ "محصول"۔

پہلے ہم اس مسئلے پر معمولی طریقے سے بحث کریں گے۔ جو خاص خاص امور تنقیح طلب رونما ہوتے ہیں ان کو محصول کی تحقیقاتی کمیٹی نے حسب ذیل بیان کیا ہے:۔ (۱) کیا (و) ہندو عہد حکومت اور (ب) مسلم دور حکومت کے تحت سرکار کو زمین پر مالکانہ حقوق حاصل تھے؟ (۲) کیا برطانوی حکومت جانشین کے طور پر ان حقوق کی مالک بنی؟ (۳) کیا حکومت موجودہ زمانے میں (ز) زمینداری یا (ب) رعیت واری طریق کے تحت زمین کی مالک ہے؟ (۴) اگر وہ مالک نہیں ہے تو کیا زمیندار اور کاشتکار علی الترتیب مالگذاری کی ادائی کی شرط کے تابع حقوق مالکانہ رکھتے ہیں؟ (۵) زمین کی مالگذاری کو "محصول" کہنا چاہیے یا "لگان"؟

پہلے دو امور کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ برطانوی راج سے پیشتر زمین پر حکومت کو کبھی حقوق مالکانہ بلا شرکت غیرے حاصل ہی نہ تھے اور یہ کہ اس لحاظ سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ حکومت برطانیہ

421

[1] دیکھو محصول کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ ۱۱۔

باب ۱۲

سم کے کسی حق کی وراثتہً مالک ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں مونٹ اسٹورٹ الفنسٹن ' ایچ ' ایچ ولسن '
ڈن پاؤل وغیرہ کی رائیں نیز عدالت العالیہ بمبئی کا ایک فیصلہ کنڑ کے ایک مقدمہ منفصلہ ۱۸۷۵ء کے بارے
بطور سند پیش کیا جاتا ہے۔ زیر بحث فیصلہ ولسن کے اس خیال کی تصدیق کرتا ہے کہ بادشاہ کے حق مالکانہ
ہندوؤں کے قدیم قوانین اور آئین و رواجات سے کوئی سند جواز حاصل نہیں ہے[۵]۔ اور جدید ہندو
انون داں بھی اس فیصلے کو انفرادی ملکیت کے مخالف خیال نہیں کرتے۔ علیٰ ہٰذا اسلامی شرع کی حد تک
زل گیلوے نے اپنے نتائج کا حسب ذیل خلاصہ پیش کیا ہے:۔ "زمین کاشتکاروں کی ویسی ہی ملک تھی
یسی کہ ہوسکتی تھی؛ جس وقت تک وہ اپنے ذمے کے محصول ادا کرتا رہے اس وقت تک اس کے
خراج کا یا اس کو بے دخل کرنے کا اقتدار نہ تو از روئے قانون تھا اور نہ کوئی محرک پالسی کے لیے تھا لیکن
ر وہ محصول ادا نہ کرے تو اس کی اراضی قرق کی جاسکتی تھی؛ اور یہی بات درجہ اول کے انگریز رئیس پر بھی
ادق آسکتی تھی جو انگریزی قانون کے تحت مستحکم ترین حیثیت اراضی رکھتا ہو۔ ہندوستانی کاشتکار کا حق 'حق
ضہ و تصرف اور حق انتقال پر مشتمل ہے؛ اور اس کے ذمے کے محصول ارضی کی شرح مقررہ ہوتی تھی؛ بلکہ
لعموم مقدار کا تعین کردیا جاتا تھا پس اس کا حق ملکیت کس اعتبار سے انگریز زمیندار کے حق ملکیت سے ادنیٰ یا گھٹیا ہے[۴]"

شمالی ہند پر اور مسلمان حکمرانوں کے عمل پر جو بات صادق آتی ہے وہی اس سے زیادہ شد و مد کے ساتھ
ذبی ہند کی حالت پر بھی صادق آتی ہے؛ جہاں زمین کی خانگی ملکیت کا وجود بہت زیادہ واضح اور یقینی طور پر
لیم کیا گیا؛ خاص کر ملک کے ان علاقوں میں جو مسلمانوں کے قبضہ و تسلط میں کبھی نہیں آئے۔

اس لحاظ سے پہلے دو امور کے بارے میں محصول کی تحقیقاتی کمیٹی متفقہ طور پر یہ رائے ظاہر کرتی ہے کہ
ندو اور مسلمانوں کے عہد ہائے حکومت میں سرکار کو زمین کے بارے میں کوئی قطعی یا بلا شرکت غیرے حق ملکیت
مل نہ تھا اور حکومت خانگی ملکیت کے وجود کو قطعی طور پر تسلیم کرتی تھی[۵]۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات اور اس ملک میں برطانوی حکومت کے
حکم طور پر قائم ہونے کے درمیانی دور میں صوبائی گورنروں اور مہمات پسندوں نے ہر قسم کے حد سے متجاوز

۔ "زمین اسی کی ملک ہے جس نے پہلے اس کو جنگلی اور خودرو درختوں سے صاف کیا ہو اسی طرح جس طرح ہرن کا
ل وہی ہے جو اس کو پہلے مار ڈالے"۔ (دیکھو قوانین منوجی کا حوالہ بیڈن پاؤل نے اپنی کتاب موسومہ بہ برطانوی ہند
س مالگزاری اور حیثیت اراضی صفحہ ۱۳۳ میں دیا ہے)۔

۵ ـ دیکھو محصول کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ' فقرہ (۸۰)۔

۵ - نیز دیکھو برگس کی کتاب موسومہ بہ "ہندوستان کا محصول ارضی" صفحہ ۱۲۴۔

باب ۱۲

مطالبات پیش کیے۔ اس بدنظمی کے دور کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ لگان مقررہ حد سے زیادہ مقدار میں بہ جبر وصول کیا جاتا تھا؛ چنانچہ اس طرز عمل سے لوگوں میں یہ میلان پیدا ہوگیا کہ زمین پر اپنے خانگی حقوق کے تسلیم کرانے پر کم سے کم اصرار کریں۔ وہ اس بات کے لیے بے چین تھے کہ اپنے حسب دلخواہ زمین سے دست بردار ہونے کی آزادی حاصل کریں اور اس طرح اپنے لیے مالگذاری کی ادائی سے بچنے کی راہ نکالیں۔ اس طرح حکومت نے بلاشرکت غیرے ملکیت کے دعاوی پیش کیے جن کے خلاف لڑنے کی لوگوں نے پروا نہ کی۔ اس لحاظ سے بیڈن پاول کا یہ کہنا غالباً صحیح ہے کہ "مسٹر جیمس گرانٹ، کرنل منرو اور دوسرے کئی اشخاص کو اس واقعے کے متعلق غلط فہمی ہوہی نہیں سکتی تھی کہ ان کے زمانے میں (یعنی بنگال کے دوامی بندوبست کے زمانے میں) اجلہ حکومتیں زمیندار ہونے کی مدعی تھیں"۔[۱]

تاہم جیسی کچھ تاریخی شہادت موجود ہے اس پر نظر کرتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اگر سیاسی بد انتظامی و بے ترتیبی کے اس دور کو خارج کردیا جائے جو برطانوی عہد حکومت سے بالکل پیشتر تھا تو زمین کی خانگی ملکیت مستحکم طور پر قائم ہوگئی تھی اور فرمانرواؤں نے اس کو تسلیم

۴۲۹

[۱] کہا جاتا ہے کہ زمین کے بارے میں بادشاہ کا حق ملکیت سلطان ٹیپو نے قطعی طور پر جتایا۔ دوسری طرف مونٹ اسٹورٹ الفنسٹن مرہٹوں کے تحت میراثی حقیت اراضی کی تحقیق کرتے ہوئے حسب ذیل رقمطراز ہیں :۔ "رعایا کا بڑا حصہ اپنی جائداد وں کا مالک ہے اور ایک مقررہ محصول حکومت کو ادا کرنے کا پابند ہے؛ ان کی ملک قابل توریث و قابل فروخت ہے؛ اور جس وقت تک وہ محصول ادا کرتے رہیں اس وقت تک وہ بے دخل نہیں کیے جاتے؛ اور محصول ادا نہ کرنے کی صورت میں اگر بے دخل بھی کر دیے جائیں تو ایک طویل مدت تک (یعنی کم از کم تیس سال تک) ان کو یہ حق حاصل رہتا ہے کہ سرکاری بقایا ادا کرکے اپنی جائداد کو دوبارہ اپنے قبضے میں لے آئیں۔" دیکھو ایک کتاب موسومہ

Report on the Territories conquered From the Peshwas

باب۱۱

کرلیا تھا۔ ہم نے یقینی طور پر اس واقعے کو فراموش نہیں کیا ہے کہ ہندوستان میں کوئی دور ایسا نہیں آیا جس میں تمام ہندوستان میں ایک ہی بادشاہ کی حکومت متفقہ طور پر تسلیم کی گئی ہو؛ اور چونکہ سارا ملک کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا اور ہر ایک کی الگ تاریخ تھی؛ اس لیے ہم یہ دعویٰ نہیں کرسکتے کہ ہر صورت میں خانگی ملکیت کا رواج قطعی طور سے قائم ہوگیا تھا؛ اور اگر ہم برطانوی حکومت کے حقوق کے بارے میں ان تمام سابقہ حکمرانوں کے ادعا کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیں جن کو اس نے بے دخل کردیا تو ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ برطانوی حکومت نے اپنے ارضی حقوق و مفادات کی حد تک مختلف وراثتوں کے ایک سلسلے پر قبضہ کیا۔ لیکن وسیع نقطۂ نظر سے صورت حال ویسی ہی تھی جیسی کہ ہم نے بیان کی۔

تاہم اس کی کوئی وجہ نہیں کہ سابقہ حکومتوں نے کوئی عمل اختیار کیا ہے تو جانشین حکومتیں اس کی پابندی اپنے اوپر کیوں عائد کرلیں۔ اس نقطۂ نظر سے ہمیں ان حقوق اور دعووں کو جانچنا پڑے گا جو خود برطانوی حکومت نے پیش کیے ہیں۔ لیکن برطانوی دعوے اور حقوق یکساں یا غیر متناقص نہیں رہے ہیں اگرچہ یہ بتایا جاسکتا ہے کہ ان کی پالیسی کا عام رجحان خانگی ملکیت زمین کو تسلیم کرنے کی جانب رہا ہے۔ دیہات اور جاگیروں کی مزروعہ زمین کا ذکر کرتے ہوئے (زیادہ زمین یا وہ خاص نہیں یا نہیں جن کی حکومتیں مسلسل طور پر براہ راست مالک ہوتی ہیں) بیڈن پاول کہتے ہیں کہ برطانوی حکومت نے ہر جگہ زمین کے بارے میں خانگی حق عطا یا تسلیم کیا ہے اور اس نے ملک کے بڑے رقبوں میں (مثلاً بنگال، اودھ اور کل شمالی ہند میں) زمینداروں اور دیہی مالکوں کے حق مالکانہ کا واضح طور پر اعلان کردیا ہے[1]۔ اس لحاظ سے یہ عام دعویٰ پیش کرنا اب ناممکن ہے کہ حکومت، مالگزاری کے طور پر جو کچھ لے رہی ہے وہ حقیقت میں لگان ہے جو زمینداروں سے اس کے اسامیوں کے طور پر وصول ہوتا رہا ہے۔

423

---

[1] لیکن بعض اوقات اس کے متعلق سرکاری طور پر شک و شبہہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اس پر زور دیا جاتا ہے کہ بنگال میں بھی زمینداروں کو کامل مالکانہ حقوق نہیں دیے گئے ہیں؛ یہ کہ دوامی بندوبست ان کے لیے بطور رعایت منظور کیا گیا جو عمدہ حکمت عملی تصور کی جاتی تھی؛ یہ کہ دوامی بندوبست سابقہ دیسی حکومتوں کے اصول یا عمل پر مبنی نہ تھا؛ اور یہ کہ ناقابل تغیر محصول قطع نظر کرتے ہوئے حکومت اب بھی مالک کی حیثیت رکھتی ہے اور زمیندار کی حیثیت مالگزاری وصول کرنے والے ایجنٹ یا حکومت کے تحتانی اسامی کی ہے۔

باب ۱۲

یہ بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ بنگال اور دوسرے مقامات کی زمینداری جائدادوں کی حد تک زمین کی خانگی ملکیت میں کوئی شبہہ یا اعتراض نہیں ہے۔ دوسری طرف یہ امر بھی مساوی طور پر یقینی ہے کہ حکومت کو افتادہ زمینوں اور "خانس محل کی جائدادوں" پر کامل حقوق مالکانہ حاصل ہیں مثلاً بنگال اور بہار میں جہاں وہ براہِ راست سرکاری نگرانی میں ہیں۔ رہی رعیت واری زمین تو اس کی حد تک کسی قدر نمایاں اختلاف رائے ہے۔ ایک طرف تو یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ رعیت یا قابض (جیسا کہ اس کو بمبئی میں موسوم کیا جاتا ہے) کی حیثیت مختلف نہیں ہے اور یہ کہ وہ زمین پر کامل مالک کی طرح قابض و متصرف ہوتا ہے بشرطیکہ وہ مقررہ مالگزاری ادا کرے۔ یہ واقعہ کہ اگر قابض مقررہ محصول ادا نہ کرے تو حکومت اس کی زمین اپنے قبضے میں لے سکتی ہے' یہ ثابت نہیں کرتا کہ قابض' زمین کے بارے میں حق مالکانہ نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ یہ کسی طرح خلاف دستور یا غیر معمولی شرط نہیں ہے' اور اس کا اطلاق جملہ خانگی ملک پر ہوتا ہے جو حکومت عدم ادائی محصول کی صورت میں قرق کرسکتی ہے۔ انتہائی بات جو ہم کہہ سکتے ہیں یہ ہے کہ حکومت' زمین کے متعلق یہ خیال کرتی ہے کہ وہ اس کے پاس مقررہ مالگزاری کی ادائی کے لئے آخری چارۂ کار کے طور پر بطور ضمانت مکفول ہے۔[1] رعیت واری زمینوں اور زمینداری زمینوں میں امتیاز کرنے والی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ اول الذکر سے قابض اپنی مرضی سے دست بردار ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ اس نظریے کے لئے بہت ہی کمزور بنیاد معلوم ہوتی ہے کہ رعیت واری علاقوں میں حکومت ہی حقیقی زمیندار ہے۔ یہ خصوصیت' قابض یا دخیلکار' کی اصطلاح کے شکل اس زمانے سے مروج چلی آتی ہے جبکہ کاشتکار جور و ستم اور استحصال بالجبر سے تنگ آکر اس بات کو ناپسند کرتا تھا کہ زمین سے مستقل طور سے وابستہ کردیا جائے اور مالگزاری کے مطالبے کی ادائی کا غیر مشروط طریقے پر ذمہ دار بنایا جائے۔

---

[1] دیکھو بیڈن پاؤل کی کتاب موسومہ بہ "برطانوی ہند میں مالگزاری اور حقیت اراضی" صفحہ ۲۴۹۔

باب ۱۲ | 424

اراضی سے دست برداری کا اختیار کسان کے فطری خوف کی بنا پر اس کی اپنی رضامندی سے تھا؛ اور اس کا باعث یہ نہ تھا کہ برطانوی حکومت کسانوں کو حق ملکیت سے محروم کرنے کا ارادہ رکھتی تھی' برطانوی حکومت تو دراصل انھیں یہ حق عطا کرنے کے لئے بے چین تھی۔ ایک اور بات' جو سرکاری ملکیت کے نظریے کی موافقت میں پیش کی جاتی ہے' یہ ہے کہ بعض صوبوں میں زرعی زمین کو حکومت کی اجازت کے بغیر غیر زرعی کاموں میں نہیں لگایا جا سکتا اور اگر اجازت دی گئی تو زمین کا محصول نظر ثانی کا محتاج ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کو خانگی ملکیت کے استعمال پر عائد کی ہوئی ان بندشوں میں سے ایک خیال کیا جاتا ہے جو تمام مہذب ممالک میں عام طور پر پائی جاتی ہیں مثلاً صحت عامہ کے اغراض کے لئے عائد کی ہوئی بندشیں۔ اس لحاظ سے ہم اس خیال کی تائید کر سکتے ہیں جو محصول کی تحقیقاتی کمیٹی نے ظاہر کیا ہے کہ زمیندار اور رعیت دونوں' اس شرط کے تابع حقوق مالکانہ رکھتے ہیں کہ مالگزاری ادا کریں' اگرچہ موخر الذکر صورت میں قابض زمین کی حیثیت کی صحیح اور عام تعریف کرنا ممکن نہیں ہے[1]۔ ہم ایک اور نقطۂ خیال کا بھی ذکر کر سکتے ہیں اور وہ یہ کہ حقیقت اراضی کی بابت ہندوستانی تصور سرکاری ملکیت کے انتہائی تصور اور انگریزی نظریۂ قطعی ملکیت اراضی کی ایک درمیانی شکل ہے؛ گویا وہ دونوں میں سے کسی کے مطابق نہیں ہے بلکہ دونوں کے بین بین ہے۔ چنانچہ اس صورت حال کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ یا تو وہ محدود سرکاری ملکیت ہے یا محدود خانگی ملکیت۔ زمیندار یا رعیت کا استحقاق تسلیم تو کیا جاتا ہے؛ لیکن حکومت کے مشترکہ مفاد یا مشترکہ ملکیت زمین کی حد بندی کے تابع ہے' اور شمالی ہند میں تو یہ استحقاق؛ اسامیوں کے نیم مالکانہ حقوق مثلاً مستقل حقیت اراضی کے دعوے کا بھی تابع ہے[2]۔

[1] دیکھو محصول کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ' فقرہ ۴۳۔

[2] دیکھو مسٹر ٹی' مارسین کی کتاب موسوم بہ "ہندوستانی صوبے کی صنعتی تنظیم" صفحہ ۱۳۱۔

باب ۱۲

۲۸۔ مالگزاری ٹیکس ہے کہ لگان؟

اگر زمین کی ملکیت خانگی تسلیم کرلی جائے تو اس سے بظاہر یہ منطقی نتیجہ نکلتا ہے کہ مالگزاری ٹیکس ہے نہ کہ لگان۔ سرکاری زمینداری کی تائید یا مخالفت میں جتنے دلائل پیش کئے جاتے ہیں وہ سب اس امر کا فیصلہ کرنے میں کہ مالگزاری ٹیکس ہے یا لگان، وہی مقررہ معقولیت (یا عدم معقولیت) رکھتے ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ ہم اور چند امور کا ذکر کرسکتے ہیں جو ٹیکس یا لگان کے مسئلے کے متعلق خاص طور پر پیش کئے جاتے ہیں[1]۔ مثلاً یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ مالگزاری ٹیکس سے مختلف شے ہے اور لگان سے اس بنا پر مشابہ ہے کہ جس طویل مدت کے لئے وہ مقرر کی جاتی ہے اس کے اندر سرکاری ضرورتوں کے لحاظ سے اس میں تبدیلی نہیں کی جاسکتی، نیز مالگزاری ادا کرنے والوں کو مراعات عطا کی گئی ہیں، مثلاً معافی محصول کے ساتھ مکان بنانے کی زمین، عام چراگاہوں کا مفت استعمال وغیرہ۔ اس کے مقابلے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ لگان پر نظر ثانی کرنے سے حکومت کو کوئی چیز بجز مصلحت عمل ضرورت اور کفایت کے ملحوظات کے نہیں روک سکتی۔ علاوہ ازیں یہ ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ خانگی زمینوں کا زر لگان لازمی طور پر طویل مدت کے لئے مقرر نہیں کیا جاتا۔ بلکہ سچ پوچھو تو یہ بات عام طور سے مشہور ہے کہ اکثر پٹے ہر سال قابل تجدید ہوتے ہیں[2]۔ لگان معاف سکونتی خطوں،

428

[1]۔ دیکھو محصول کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ ۴۴ تا ۵۴۔

[2]۔ ایک اور جواب یہ کہہ کر دیا جاتا ہے کہ زمیندار کے کئی فرائض ایسے ہیں جو حکومت بجا نہیں لاتی۔ لیکن یہ استدلال اس مقصد کے لئے بے سود معلوم ہوتا ہے جس کے لئے وہ پیش کیا گیا ہے، اس لئے کہ بالکل بجا طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ حکومت موجودہ زمانے میں بعض ایسے فرائض یقیناً انجام دیتی ہے جو قدیم زمانے میں منفرد زمیندار انجام دیتے تھے، مثلاً امن وامان کا قیام اور کسانوں کے جان ومال کا تحفظ۔ وہ اراضی کی مستقل اصلاح وترقی میں بھی حصہ لیتی ہے مثلاً آب پاشی کی نہریں، بدررو اور ریلیں تعمیر کرنا وغیرہ۔ علاوہ ازیں ہم سرکاری زمینداری پر محض اس بنیاد پر اعتراض نہیں کرسکتے کہ حکومت ایسے فرائض انجام دینے سے قاصر رہتی ہے جو زمینداری کی

مشترکہ چرائی کی زمینوں وغیرہ کی حد تک یہ سب مراعات، موجودہ بحث میں ہیں بہت زیادہ اہم اور قطعی نوعیت کی نہیں معلوم ہوتیں۔ حکومت ایک روشن خیال مالک کی حیثیت سے اور کاشتکاروں کی خوش حالی کی خواہشمند ہونے کے لحاظ سے اس قسم کی سہولتیں، زمیندارانہ حق جتائے بغیر، مہیا کرسکتی ہے۔ علاوہ ازیں اس خیال کی تائید میں کہ مالگزاری ٹیکس ہے ایک اور معمولی دلیل یہ ہے کہ اس کی تشخیص و جمعبندی کا طریقہ اس طریقے کے مشابہ ہے جو ٹیکس میں استعمال کیا جاتا ہے۔

یہ ثابت کرنے کے لئے کہ مالگزاری ٹیکس نہیں ہے بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ "ابتدائی صورت حال خواہ کچھ ہی رہی ہو، حکومت کا مطالبہ اکثر صورتوں میں اس وجہ سے پوری طرح بے باق اور منتقل ہو چکا ہے کہ اراضی دوسروں کے ہاتھ قیمت پر فروخت اور منتقل ہو چکی ہیں اور اراضی کے موجودہ قابضوں پر حکومت کے مطالبے کی حیثیت ٹیکس کی نہیں رہی"۔ لیکن ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس استدلال کا مالگزاری کی نوعیت سے کیا تعلق ہے۔ اس سے تو محض یہ ثابت ہوتا ہے کہ مالگزاری بے باق اور اس کو وصول کرنے کا حق منتقل ہو چکا، لیکن اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا گیا ہے کہ آیا مالگزاری، لگان ہے یا ٹیکس ہے؟ اس امر سے سب واقف ہیں کہ اشیائے اصل پر جو دوسرے تفریقی محصول عائد کئے جاتے ہیں وہ بے باقی اور کامل ادائیگی کی مثال پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ اس صورت میں ہم صرف یہی کہتے ہیں کہ ٹیکس دائمی طور پر ادا ہو چکا ہے جس کو فروشندے نے اشیا کی قیمت میں کمی کرکے ادا کردیا ہے اور یہ کمی محصول (ٹیکس) کی سربستہ مالیت کے مساوی ہوتی ہے؛ ہم یہ نہیں کہتے کہ عائدہ اس لحاظ سے ٹیکس نہیں ہے بلکہ کچھ اور ہے۔ علاوہ ازیں کامل بے باقی اور ادائیگی اس وجہ سے نہیں ہو سکتی کہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ حیثیت سے وابستہ ہوتے ہیں؛ اس لئے کہ ایسے کئی خانگی زمیندار ہیں جو محض لگان وصول کرتے اور اس سے متمتع ہوتے ہیں، اور متعلقہ زمیندارانہ فرائض انجام ہی نہیں دیتے۔

مشخصہ مالگزاری میں آیندہ جو اضافے ہونے والے ہیں ان سب کا پہلے سے اندازہ کرنا ناممکن ہے۔

آخر میں ہم ایک اور استدلال کا ذکر کر سکتے ہیں جو زمین کی خانگی ملکیت کی تائید میں پیش کیا گیا ہے۔ ۱۸۸۶ء کے انکم ٹیکس ایکٹ کی رو سے زرعی آمدنیاں مستثنیٰ قرار دی گئیں، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ یہ چیز اس امر کا قطعی اقبال کرنے کے برابر ہے کہ اراضی کی آمدنیوں پر محصول ادا کیا جاتا ہے۔ اگر مالگزاری لگان ہوتی یعنی حکومت کو زمیندار ہونے کے اعتبار سے اور اس کا حق ملکیت تسلیم کرتے ہوئے محصول ادا کیا جاتا تو اس کے علاوہ ایک اور محصول عائد کرنا حق بجانب ہوتا۔[1]

مذکورۂ بالا بحث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کل مسئلہ انتہائی طور پر پیچیدہ ہے اور کوئی ایک قطعی جواب نہیں دیا جا سکتا، اگرچہ خانگی ملکیت کی دلیل سرکاری زمینداری کی دلیل سے بدرجہا زیادہ قوی ہے۔ ہمیں بیڈن پاول کے اس فیصلے سے اتفاق ہے کہ یہ بحث "بے سود لفظی نزاع" ہے۔ یہ بحث بے سود اس لئے ہے کہ لامتناہی ہے۔ ان مخالف نظریوں میں سے ہر ایک کی موافقت و مخالفت میں دلائل موجود ہیں؛ بعض لوگ ایک قسم کے دلائل سے متاثر ہوتے ہیں اور بعضے اس کے برعکس دلائل سے۔ لیکن اس کی وجہ لازمی طور پر یہ نہیں ہے کہ کسی ایک دلیل کی دیدہ و دانستہ طرف داری کی جاتی ہے۔ یہ بحث اس وجہ سے

[1] لیکن یہ کہدینا ضروری ہے کہ یہ استدلال خانگی ملکیت کی موافقت میں قطعی نہیں ہے، اس لئے کہ یہ استدلال کرنا قطعاً ممکن ہے کہ زرعی آمدنیاں محصول سے اس وجہ سے مستثنیٰ رکھی گئی ہیں کہ ان کاشتکاروں کی تعداد نسبتاً قلیل ہے جن کی آمدنیاں، سرکاری مالگزاری ادا کرنے کے بعد محصول آمدنی کی اقل ترین معافی کی حد سے اوپر ہیں، اور یہ کہ ان پر محصول عائد کرنے کی کوشش کرنا عبث اور بے فائدہ ہے، یا دوسرے یہ کہ حکومت یہ توجیہ کر سکتی ہے کہ اراضی کی آمدنیوں پر محصول نہ لگانا محض ایک فروگذاشت ہے جس کی اصلاح وہ ہر وقت کر سکتی ہے؛ اور سب سے آخر میں یہ بتایا جا سکتا ہے کہ انگلستان میں محصول اراضی کے علاوہ زرعی منافع پر انکم ٹیکس عائد کیا جاتا ہے لیکن اس کی بنا پر وہاں زمین کی خانگی ملکیت معرض بحث میں نہیں ہے۔

بھی بے سود ہے کہ موجودہ زمانے میں حقیقی پالسی کا کوئی اہم زیر بحث مسئلہ اس بات پر منحصر نہیں معلوم ہوتا کہ اس کو کس طرح حل کیا جاتا ہے؛ اور واقعہ تو یہ ہے کہ فنی قانونی صورتِ حال کے مقابلے میں معاملے کے عملی پہلو ہی زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ اگر مالگزاری اس طرح محدود نہ کی جائے کہ اس کی بنا پر مالک کو معمولی قوت لایموت سے زیادہ مل سکے تو، رعیت کے حق مالکانہ کا اس کے کھیت پر کامل اور غیر مشروط طریقے پر تسلیم کر لیا جانا اس کے حق میں قطعاً مفید نہ ہوگا، ٹھیک اسی طرح جس طرح اگر زمین کی فروخت، رہن وغیرہ کے بارے میں اس کے جملہ موجودہ حقوق بحال خود رکھے جائیں اور مشخصہ مالگزاری معتدل ہو تو رعیت پر اس امر کا کوئی اثر نہیں پڑتا کہ حکومت خود کو پورا زمیندار تصور کرے۔ اب ہم چند مثالوں کے ذریعے سے اس صورتِ حال کی تشریح کریں گے کہ کل بحث، عملی حیثیت سے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ مثلاً مالگزاری کے معاملے میں جماعت عاملہ پر جماعت قانون سازی کی نگرانی کا مسئلہ اس مسئلے سے قطعاً کوئی تعلق نہیں رکھتا کہ آیا حکومت زمین کی مالک ہے یا نہیں؛ اگر حکومت ہی زمیندار ہو تو حکومت محض جماعت عاملہ کو تعبیر نہیں کرتی۔ حکومت کے ایک جزو یعنی جماعت قانون ساز کو اس کے دوسرے جزو یعنی جماعت عاملہ کے مصالح و صوابدید میں کس حد تک مداخلت کرنا چاہیے، کلیۃً انتظامی سہولت، خوبی کار اور سیاسی معیارات کا معاملہ ہے؛ اور یہ بخوبی استدلال کیا جاسکتا ہے کہ چونکہ مالگزاری کا طریق اس ملک کے لاکھوں نفوس کی خوشحالی سے تعلق رکھتا ہے، اس لیے اس پر جماعتِ قانون سازی کی زیادہ سخت نگرانی مناسب ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کاملاً ذمہ دار حکومت جن جملہ محصولوں کی منظوری لازماً جماعت قانون ساز دیتی ہے، لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ خالص محصولوں کے علاوہ دوسرے مطالبات کی منظوری اسی طریقے پر نہیں دی جاسکتی۔ انتہائی طور پر ہم یہ مان سکتے ہیں کہ جماعت قانون سازی کی نگرانی کا معاملہ، بغیر قطعی لزوم کے، اس مفروضے کی بنا پر کسی قدر تقویت حاصل کر لیتا ہے کہ مالگزاری ٹیکس ہے، نہ کہ لگان۔

باب ۱۲

علاوہ ازیں بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ اگر ہم سرکاری زمینداری کو تسلیم کرلیں تو ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ حکومت کو پورا معاشی لگان وصول کر لینے کا حق حاصل ہے لیکن یہ ایک ایسا نتیجہ ہے جس سے ہم کما حقہٗ بچ نہیں سکتے، خواہ ہم یہ ثابت ہی کیوں نہ کر دیں کہ سرکار زمیندار نہیں ہے؛ اس لئے کہ یہ محصول کا عام طور پر مسلمہ کلیہ ہے کہ نظری طور پر کل معاشی لگان، محصول ادا کرنے والے کو کسی طرح نقصان پہونچائے بغیر محصول میں محسوب کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ اس کا قطعی یقین ہو کہ معاشی لگان (آمدنی کا حقیقی غیر اکتسابی اضافہ) کو الگ کر دیا گیا ہے اور اس میں دوسرے عناصر مثلاً اجرت، منافع اور سود شامل کئے گئے ہیں۔ مالگزاری کی تشخیص کے بارے میں ہم خواہ لگان کے قواعد کا اطلاق کرنے کے مدعی ہوں یا ٹیکس کے قواعد کا اس کے عملی نتائج ایک دوسرے سے بہت مختلف نہ ہوں گے۔ یہ بات اس واقعے سے ثابت ہوتی ہے کہ حکومت نے، اس خیال کو قطعی طور سے تسلیم کئے بغیر کہ مالگزاری محصول ہے

لہ۔ بردولی کی تحقیقات کی رپورٹ سے دی، جی، کالے صاحب جو سبق حاصل کرتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس مسئلے کی بحث کو عملی اہمیت حاصل ہے کہ آیا حکومت زمیندار ہے یا فرد واحد (دیکھو ایک مضمون موسوم بہ "بردولی کا ایک سبق" ایک رسالہ "انڈین جورنل آف اکنامکس" بابت جولائی ۱۹۲۹ء میں)۔ بردولی کا ہنگامہ اس بات کا نتیجہ تھا کہ ایف، جی، ایچ اینڈرسن سابق کمشنر بندوبست بمبئی کے نظریہ "لگان کی آمدنی اور مالگزاری کا اشاریہ" کا اطلاق عملی طور پر کرنے کی سطحی کوشش کی گئی تھی اور اینڈرسن، ریکارڈو کے نظریۂ لگان کا حرف بہ حرف قائل اور معتقد تھا۔ یہاں تک مان لینے میں کوئی مضایقہ نہیں، لیکن ہمیں ابھی یہ معلوم کرنا ہے کہ ریکارڈو کا نظریۂ لگان اپنی خالص شکل میں بھی سرکاری ملکیت زمین کے بارے میں کسی مفروضے پر مبنی ہے۔ اینڈرسن خود یہ کہتا ہے کہ "مالگزاری، حکومت کو واجب الادا ہوتی ہے بلالحاظ اس کے کہ زمین کس کی ملکیت ہے" دیکھو ایک کتاب موسوم بہ (**Facts and Fallacies of the Bombay Land Revenue System**) صفحہ ۱۴۲۔

باب ۱۲

اور لگان نہیں ہے، محصول کی تحقیقاتی کمیٹی کو یہ ہدایت کرنے میں کوئی نقصان نہیں دیکھا کہ وہ مالگزاری کے بارے میں تحقیق کرے اور تحصیل (محصول) کے قواعد کے نقطۂ نظر سے یہ بتلائے کہ اس طریق میں کیا نقص ہے بلکہ اگر ضرورت ہو تو طریق کی کامل تبدیلی کا مشورہ دے۔ استبدادی طریق پر زیادہ مالگزاری تشخیص کرنے یا اس کی وصولیابی میں سخت گیری کرنے کی حد تک کوئی مہذب حکومت اس قسم کے ظلم و جور کو اس بنیاد پر حق بجانب قرار دینے کا خیال نہیں کر سکتی کہ وہ زمیندار ہے اور اس لحاظ سے اس امر کا قانونی طور پر استحقاق رکھتی ہے کہ زمین کے استعمال کے لئے اپنے حسب دلخواہ مطالبہ عائد کرے۔ حکومت محض قانونی حقوق پر اپنی حیثیت کو برقرار نہیں رکھ سکتی؛ اس کو اخلاقی معیاروں کی بنا پر جانچے جانے کے لئے تیار رہنا چاہئے، اور اس ملک کی حکومت نے محض سرکاری زمینداری کے نظریے کی آڑ میں پناہ لے کر حد سے زیادہ مالگزاری کے متعلق شکایتوں کو رفع کرنے کی کوشش شاذ ہی کی ہے۔ اس نے کامیابی کے ساتھ ہو یا ناکامی کے ساتھ عام طور پر یہ استدلال کرنے کی کوشش کی کہ مالگزاری دراصل اتنی بھاری نہیں ہے جتنی کہ اس کے نقاد اس کو بیان کرتے ہیں۔ اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ سرکار زمیندار ہے تو ہمیں یہ توقع رکھنی چاہئے کہ وہ کم از کم روشن خیال زمیندار کی طرح پیش آئے گی اور اس لحاظ سے آخر کار اپنے ذاتی مفاد کے لئے اس کو مالگزاری اس طریقے سے منظم کرنی چاہئے کہ منافع میں خلل نہ واقع ہو اور اس کے کام کرنے کا ولولہ سرد نہ پڑے یا اس کی کارکردگی میں کمی نہ ہو۔ چنانچہ نیک دل اور روشن خیال زمیندار غیر نفع بخش کھیتوں سے لگان وصول نہ کرے گا بلکہ کھیتوں کے انضمام و اشتمال کی کوشش کرے گا اور صرف اس صورت میں لگان عائد کرے گا جبکہ کھیتوں کا رقبہ اتنا ہو جس سے مصارف پورے ہونے کے بعد کچھ حصہ بچ رہے گا۔ پس غیر نفع بخش کھیتوں کو مستثنیٰ کرنے کے بارے میں سرکاری زمینداری کے مفروضے کی بنیاد پر اتنے ہی مکمل طور سے اور خوبی کے ساتھ استدلال کیا جا سکتا ہے جتنا کہ اس کی برعکس بنیاد پر۔ معتدل محصول عائد کرنے کا اصول اس لحاظ سے مزید تائید کا مستحق ہے کہ حکومت کے اغراض رعایا کے

428

باب ۱۲

اغراض سے مختلف نہیں ہوتے۔ حکومت اپنا مقصد بہترین طریق پر اس طرح پورا کر سکتی ہے کہ رعایا کی خدمت کرے اس لئے کہ حکومت یا ریاست، رعایا کو تعبیر کرتی ہے۔[1]

اس مباحثے کے سلسلے میں یہ بتا دینا نہایت مناسب ہوگا کہ اس کے مختلف پہلوؤں کی تائید کرنے والے اشخاص کے درمیان بعض اساسی معاملات کے بارے میں اتحاد واتفاق ہے۔ مثلاً اگرچہ حکومت سرکاری زمینداری کے نظریے سے بعض اوقات کھیلتی رہی ہے، اس کی حقیقی پالسی یہ رہی ہے کہ انفرادی ملکیت کا قوی احساس پیدا کیا جائے اور اس کو فروغ دیا جائے اور وہ اس خیال کی دل سے تائید کرتی رہی ہے کہ انفرادی ملکیت میں خلل اندازی کی کوشش کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ حتیٰ کہ بالشوک بھی زمین کی خانگی ملکیت میں مداخلت کئے بغیر اس کی حالت پر چھوڑ دینے پر اس خوف کی بنا پر مجبور ہوئے کہ کہیں بغاوت کی آگ نہ بھڑک اٹھے۔ بالشویک ہر شے کا مقابلہ کر سکتے اور اس کو ٹھکرا سکتے تھے، لیکن غریبوں کی خانگی ملکیت کے دیرینہ آئین و رواج کو چیلنج نہیں دے سکتے تھے۔[2] ہندوستان کے اوسط درجے کے بھولے بھالے سیدھے سادے کسان کو اس بارے میں کسی قسم کا شبہہ نہیں ہے کہ جس وقت تک اس کو اپنی جائداد منقولہ کے فروخت کرنے، پٹے پر دینے، گروی رکھنے اور وراثۃً منتقل کرنے کی آزادی حاصل ہے (اور یہ وہ حقوق ہیں جس میں مداخلت کرنے کے لئے سرکاری زمینداری کے انتہائی سے انتہائی حامی بھی تیار نہیں ہیں)، اس وقت تک 'سرکاری زمینداری' اگر اس نے کبھی ایسی شے کا نام سنا ہو تو،

---

[1] ایک غیرملکی استبدادی حکومت کی موجودگی نے، جو حال حال تک کسی بڑی حد تک عوام کی نگرانی سے تابع نہ تھی، حکومت اور رعایا کے مابین اس قسم کا جھوٹا تضاد قائم کرنے میں مدد دی۔ اگر دستور کو بتدریج جمہوریذیر کر دیا جائے تو یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اس خیال کی شدت میں کمی ہو جائے گی کہ حکومت اور رعایا کے باہمی اغراض میں تصادم ناگزیر ہے۔

[2] دیکھو اوردن کی کتاب موسوم بہ "دیہی یوروپ کی ترکیب" میں جی کے چسٹرٹن کا "مقدمہ" صفحہ ۸ تا صفحہ ۹۔

محض برائے نام ہوتی ہے؛ لیکن وہ حکومت کی جانب سے اپنے موجودہ حقوق میں کسی سنجیدہ مداخلت کو برداشت نہیں کرے گا۔[لے] یہ بات بھی عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ محصول کے بار کا لحاظ کرتے ہوئے مالگزاری کو ٹیکس تصور کرنا چاہئے؛ چنانچہ محصول کی تحقیقاتی کمیٹی اس خیال کی تائید اس بنیاد پر کرتی ہے (اگرچہ وہ انوکھی ہے) کہ مالگزاری قومی مقسوم سے نہا کیا ہوا حصہ ہے۔[لے]

علاوہ ازیں مالگزاری کی پالیسی کے کل اہم مسائل جیسے کہ مالگزاری کی انتہائی مقدار اور بندوبست کی مدت وغیرہ پر اس مباحثے کے سنجیدہ حوالے کے بغیر کہ آیا مالگزاری ٹیکس ہے یا لگان بحث کی جاسکتی اور کی جاتی ہے۔ ان حالات میں ہمارا یہ خیال ہے کہ اگر حکومت صریح اور قطعی الفاظ میں یہ اعلان کردے کہ وہ زمین کے بارے میں خانگی ملکیت کو تمام و کمال تسلیم کرتی ہے اور زمیندار کلی ہونے کے دعاوی سے دست بردار ہوتی ہے تو سیاسی حیثیت سے اس کا یہ فعل دانشمندانہ ہوگا۔ ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ اس کی وجہ سے جہاں مہمل بے سود اور تلخی پیدا کرنے والی بحث بڑی حد تک رک جائے گی اور لوگوں کے دلوں میں از سر نو اطمینان و یقین پیدا ہو جائے گا و ہیں خانگی ملکیت کو تسلیم کر لینے سے مالی یا کسی دوسرے نقطۂ نظر سے بھی کوئی دقت یا دشواری نہ ہوگی۔

۲۹۔ دوامی بمقابلہٴ عارضی بندوبست گزشتہ صدی کے اواخر میں ملک کے طول و عرض میں شدید قحطوں کے رونما ہونے کی وجہ سے ہندوستان میں لوگوں کی بہت بڑی تعداد مصائب و تکالیف کا شکار ہوئی۔ ان واقعات نے حکومت کی مالگزاری کی

لے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ عام گرجا مع کہاوت کہ "بھوگر ادھنی راج ہو بھو مر ادھنی راج ہو" میواڑ میں زبان زد خاص و عام ہے۔ اس کہاوت کے معنی یہ ہیں: "محصول بادشاہ کا، زمین رعایا کی"۔ دیکھو برگس کی کتاب محولۂ بالا صفحہ ۹۰ یہ طرز عمل میواڑ کے کاشتکار سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ہندوستان کے تمام علاقوں کی رعایا میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔

لے۔ دیکھو محصول کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ ۸۴۔

پالسی کی طرف توجہ منعطف کرائی۔ چنانچہ آر۔ سی۔ دت نے عام حیثیت سے اور ہر صوبے کے حالات کے لحاظ سے فرداً فرداً اس پالسی پر بحثہ چینی کی اور انڈین سروس کے وظیفہ یاب یورپین ارکان کی شارکت سے وزیر ہند کے پاس اس معاملے کے بارے میں ایک محضر پیش کیا۔ اس سے کچھ مدت پیشتر (سنہ ۱۹۰۰ء میں) آر۔ سی۔ دت نے لارڈ کرزن والیسرائے وقت کے نام "کھلی چٹھیاں" بھی بھیجی تھیں۔ چنانچہ لارڈ کرزن کی حکومت نے سنہ ۱۹۰۲ء میں ایک اہم رزولوشن شایع کیا جس میں اعتراضات کا جواب دیا گیا تھا اور مختلف صوبہ واری حکومتوں کی پیش کردہ رپورٹوں پر غور کرنے کے بعد حکومت کی عام پالسی کا خاکہ کھینچا گیا تھا۔

دت نے جن امور پر زور دیا ان میں سے ایک یہ تھا کہ اگر دوامی بندوبست چالیس سال قبل یعنی اس زمانے میں جبکہ اس کی توسیع کے بارے میں لارڈ کیننگ نے سنہ ۱۸۶۲ء میں تجویز پیش کی تھی رائج کیا جاتا تو ہندوستان انیسویں صدی کے اختتام کے خوفناک اور تباہ کن قحطوں سے محفوظ رہتا۔ دت نے بنگالی رعایا کی خوشحالی، فصلی خرابی کے زمانے میں ان کی زیادہ قوت مقاومت و کثرت ذرایع زرعی کاروبار کو فروغ دینے میں ان کی ہمت پسندی اور ان کا خانگی اصل کو مشغول اور فراہم کرنا اور اس کو مفید صنعتوں، رفاہ عام کے اداروں اور کاموں میں لگانا وغیرہ امور کو دوامی بندوبست ہی سے منسوب کیا ہے۔ اگرچہ دوامی بندوبست کے حامیوں کی تعداد عہدہ داروں غیر عہدہ داروں میں اب اتنی زیادہ نہیں ہے جتنی کہ پہلے کبھی تھی، تاہم اس مسئلے کی بحث ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ چنانچہ کئی گواہوں نے بھی تشخیص مالگزاری کی کمیٹی (سنہ ۱۹۲۴ء تا سنہ ۱۹۲۵ء) کے روبرو شہادت دیتے ہوئے دوامی بندوبست کی تائید میں خیال ظاہر کیا۔ اس لحاظ سے یہ نامناسب یا بے محل نہ ہوگا کہ ہم بنگال میں اس کے عمل درآمد کے خاص حوالے سے اس کے موافق و مخالف دلائل کا خلاصہ پیش کریں۔

اس کے حامیوں کا یہ استدلال ہے کہ اس کو بنگال میں شاندار کامیابی ہوئی ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ (۱) مالی اعتبار سے یہ طریق، حکومت کو ایک مستقل و مقررہ آمدنی دلوانے کا ضامن ہے، اور میعادی تشخیص اور جمعبندی کے سلسلے میں

غیر ضروری بھاری مصارف عائد نہیں کرتا۔ (۲) سیاسی اعتبار سے اس نے زمینداروں کی وفاداری حاصل کرلی ہے۔ (۳) معاشری حیثیت سے اس نے زمینداروں کو اس قابل بنا دیا ہے کہ رعایا کے فطری رہنماؤں کے طور پر کام کریں اور تعلیم کی اشاعت میں مدد دیکر اور حفظ صحت اور رفاہ عام کے دوسرے کاموں کی بابت مفید مشورے دے کر اپنے خدمت خلق کے جذبے کا عملی طریق پر مظاہرہ کریں۔ (۴) معاشی حیثیت سے اس نے زرعی ستعدی اور خوش حالی اور با وسیلہ کاشتکاروں کا طبقہ پیدا کردیا ہے، جس نے خشک سالی اور قحط کے زمانے میں مقاومت کی عجیب و غریب قوت ظاہر کی ہے۔ (۵) آخر میں یہ کہ دوامی بندوبست ان خرابیوں سے محفوظ رکھتا ہے جو عارضی بندوبست سے منسوب کی جاتی ہیں؛ مثلاً نظر ثانی کے زمانے میں کسان کو ایذا رسانی، تجدید بندوبست کے لئے بیش خرچ انتظامات کی ضرورت، بندوبست کی مدت کے ختم پر زمین میں انحطاط کا میلان، جو مالگزاری کے اضافے سے خود کو بچانے کی نیت سے کسان کی دیدہ و دانستہ غفلت کی بنا پر رونما ہوتا ہے، صنعت و حرفت اور اراضی کی اصلاح و ترقی میں مزاحمت، اور ستبدانہ اقتدار کا ارتکاز عہدہ داران مالگزاری کے ہاتھوں میں، جو ابھی تک قانونی و عدالتی نگرانی کے تابع نہیں ہیں۔

(۱) سب سے بدیہی اور اسی کے ساتھ اہم ترین دلیل دوامی بندوبست کے خلاف یہ ہے کہ حکومت کو زمین کی آمدنی کے مستقبل و متوقعہ اضافے سے بالکل ہاتھ دھو بیٹھنا اور نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ گویا ایک مستقل اور مقررہ آمدنی کا فائدہ بہت زیادہ نقصان اٹھا کر حاصل کیا جاتا ہے۔ اس استدلال کی قوت کو تمام و کمال سمجھنے کے لئے صرف یہ کہہ دینے کی ضرورت ہے کہ بنگال میں دوامی بندوبست کے نفاذ کے زمانے میں جہاں لگان کی مجموعی خام مقدار تقریباً $3\frac{1}{4}$ کروڑ روپیہ سالانہ تھی، وہاں ۱۹۱۸ء میں اس کا تخمینہ $16\frac{1}{4}$ کروڑ روپیہ تھا[1] لیکن اس کے باوجود حکومت کو روپیے کے حوالے سے

[1] دیکھو ایک کتاب موسوم بہ "حکومت ہند کی مالگزاری کی پالسی" صفحہ ۴۶۔

مقررہ مقداریں جو مالگزاری وصول ہو رہی ہے وہ ۱۷۹۳ء کے مقابلے میں بلا شبہ بدرجہا کم قوت خرید کی نمایندگی کرتی ہے۔ موجودہ زمانے میں حکومت بنگال کے لئے یہ ایک بہت بڑا سنگ راہ ہے اور کئی سمتوں میں جہاں حکومت کی جدوجہد کی ضرورت ہے رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ یہ توقع کہ دوامی بندوبست کے نتیجے کے طور پر سرکاری آمدنی کے دوسرے ذرایع میں اضافہ ہوگا، متوقعہ حد تک پوری نہیں ہوئی ہے۔ اس طرح قوم اپنے اس جائز حق سے فائدہ اٹھانے سے محروم کر دی گئی ہے کہ زمینداروں کی روزافزوں خوش حالی میں شریک ہو، اور یہ زیادہ تر زمینداروں کی ذاتی مساعی کا براہ راست نتیجہ نہیں ہے بلکہ ایسے معاشری عاملین کے باعث ہے جو ان کی دسترس سے باہر ہیں، مثلاً: اضافہ آبادی، ذرایع آمد و رفت کی اصلاح و توسیع، قیمتوں کا اضافہ وغیرہ[1]۔

(۲) یہ سیاسی دلیل کہ دوامی بندوبست نے زمینداروں کی وفاداری کو مستحکم کر دیا ہے، اگر سابق میں کچھ قدر و قیمت رکھتی بھی تھی تو اس سے اب قطعاً محروم ہو چکی ہے۔ علاوہ ازیں یہ ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ زمیندار جماعت کی حیثیت سے ان صوبوں میں بھی جہاں دوامی بندوبست منظور نہیں کیا گیا، اسی طرح وفادار رہے ہیں جس طرح کہ بنگال میں۔

(۳) رہا یہ توقع، کہ متمول، نیک نفس اور فیض رساں زمینداروں کی ایک طاقتور جماعت قائم ہو جائے گی جو رعایا کے حق میں فطری رہنماؤں کا کام کرے گی اور ان کے سدھار کی کوشش کرے گی، تو یہ بات عام طور پر مان لی گئی ہے کہ یہ توقع پوری نہیں ہوئی ہے۔ اس کے برعکس "گو بنگال میں (اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں کا بھی یہی حال ہے) کئی لایق، کشادہ دل اور روشن خیال زمیندار موجود ہیں، پھر بھی بر بناے زمینداری، غیر ہمدرد ایجنٹوں کے ذریعے سے جائداد کا انتظام، یا زمیندار اور اسامی کے ناخوشگوار باہمی تعلقات اور زمیندار اور کسان کے مابین حقیت داروں اور درمیانی اشخاص کی بڑی تعداد کی

---

[1] بنگال کے دوامی بندوبست کے بعض نتائج کی بحث کے لئے دیکھو سائمن کمیشن کی رپورٹ فقرہ ۱۸۳ تا ۲۸۲۔

مختلف شکلوں اور حیثیتوں میں موجودگی کی خرابیاں کم از کم اتنی ہی نمایاں اور ترقی پذیر ہیں جتنی کہ دوسرے مقامات میں۔"

(۴) رہا یہ سوال کہ بنگال کی خوش حالی کا دار و مدار دوامی بندوبست پر ہے تو اس کے متعلق یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ اس خوش حالی کا باعث بالکل دوسرے ہی امور ہیں؛ مثلاً یہ کہ اسامی خاص قوانین لگان کی بناء سے فائدہ اٹھاتے ہیں، بنگال، آب ہوا کی بے ثباتی اور نیرنگی سے ایک حد تک محفوظ ہے، یہاں وسائل نقل و حمل اور ذرائع آمد و رفت نہایت عمدہ ہیں، اس کو سن کی پیداوار کا قدرتی اجارہ حاصل ہے اور تجارت اور مہم پسندانہ کاروبار کا مرکز و معبر کلکتہ ہے۔ لیکن آر سی دت نے نہایت شد و مد کے ساتھ اس خیال کی مخالفت کی: چنانچہ، انھوں نے یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ قوانین لگان، دوامی بندوبست کے انجام دادہ عمدہ کام کی تکمیل و توثیق کرنے کے لئے ضروری ہیں، حکومت کے اس خیال کے خلاف احتجاج کیا کہ قوانین لگان کی منظوری سے قبل دوامی بندوبست نے کوئی عمدہ کام ہی نہیں کیا اور اس کی تردید کے لئے لارڈ ویلزلی، لارڈ منٹو، لارڈ ہیسٹنگز وغیرہ جیسے ممتاز مدبرانِ سیاست کی سند پیش کی۔

(۵) آخرش، اس دعوے کی حد تک کہ بندوبست کی نظر ثانی کے باعث دیہات کا معاشی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور کسان کو بہت کچھ ایذا اور تکلیف پہنچتی ہے، یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ دیرینہ محصلہ تجربے کی بدولت نظر ثانی کا کام، بمقابلۂ سابق اب بدرجہا زیادہ سہولت و سرعت کے ساتھ انجام پاتا ہے۔ کتابچۂ اراضی کے طریقے، سرحدوں کے تحفظ، اور زمینوں کی کم و بیش مستقل تبویب و تقسیم کے باعث ہر نئے بندوبست کے زمانے میں کام کی کثرت اور تازہ تحقیقات بڑی حد تک کم ہو گئی ہے: علاوہ ازیں نیا بندوبست طویل وقفوں یعنی ۲۰ تا ۳۰ سال کی مدت کے بعد انجام دیا جاتا ہے اس لحاظ سے دیہی معاشی نظام میں ممکنہ حد تک کم ترین خلل واقع ہوتا ہے اور حکومت کے مصارف میں بھی حال حال میں بڑی حد تک کی کفایت ہو گئی ہے۔

باب ۱۲

اس امر کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ تحتانی اہلکاروں سے کام نہ لیا جائے اور مطلوبہ تحقیقات کے بیشتر حصے کو ذمہ دار اور ذی حیثیت حکام کے سپرد کیا جائے جو کسان سے ہمدردی و خلوص کے ساتھ پیش آئیں۔ علاوہ ازیں اراضی کی خانگی اصلاح و ترقی کو محصول کی زیادتی سے یا تو مستقلاً یا کافی طویل مدت کے لئے محفوظ رکھا جاتا ہے تاکہ زمین کو ترقی دینے کے لئے لگان کے اضافے کا خوف کسان کی راہ میں مانع و حائل نہ ہو۔ یہ بھی دعویٰ کیا جاتا ہے کہ جمعبندی میں سختی کا استعمال دوامی بندوبست کے طریقوں کا کم و بیش منطقی نتیجہ ہے لیکن عارضی بندوبست کے طریق میں مالگزاری کی معافی اور التوا کے متعلق قواعد کا اطلاق زیادہ سے زیادہ کشادہ دلی سے کرکے اس سختی سے بچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ موجودہ زمانے کے عارضی بندوبست کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس میں ایک طرف مستقل بندوبست کی اکثر مستحسن خصوصیات موجود ہیں تو دوسری طرف اس کی خرابیاں مفقود ہیں اور حکومت اور کسان کے درمیان ان کے جائز مطالبات حقوق اور سہولتوں کے متعلق خوشگوار طریقے پر تصفیہ کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔

آج کل دوامی بندوبست کے متعلق حکومت کا خیال یہ ہے کہ اس کی توسیع ان رقبوں میں جن کا عارضی بندوبست کیا گیا ہے نامناسب ہے جیسا کہ لارڈ ڈارون نے چند سال پیشتر کہا تھا "لارڈ کارنوالس کے زمانے سے تجارت اور دنیا کے بازاروں میں ہندوستان کی جو حیثیت رہی ہے اور اس کے مالی و معاشری مسائل نے جو روزافزوں پیچیدہ صورت اختیار کی ہے اس کی بنا پر کئی نئے عامل رونما ہوگئے ہیں جو سرکاری مصارف اور آمدنی میں لوچ اور لچکداری کو ضروری بنا دیتے ہیں۔ حکومت سے ہمیشہ نئے نئے کام انجام دینے اور پرانے کام کی اصلاح کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ زیادہ سے زیادہ رقم [illegible] ہے اور اس لحاظ سے حکومت کے لئے یہ ناممکن ہوگا کہ وہ زمین کی آمدنی کے اضافے سے اپنا جائز حصہ وصول کرنے سے محض زیادست کش رہے۔ جس وقت ہم یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ عارضی

باب ۳

بندوبست کے موجودہ طریق کسی حال مکمل نہیں ہیں، تو ہم نہ صرف اس خیال کی تائید کرتے ہیں، بلکہ ڈاکٹر آر پی پرنج پی کے ہم خیال ہو کر حکومت سے اس بات کا مطالبہ بھی کریں گے کہ وہ بنگال اور دوسرے مقامات میں دوامی بندوبست کے طریق کی نظر ثانی کی کوشش کرے، محصول کے بار کو مناسب طریقے پر تقسیم کرے اور مالگزاری میں لچکداری پیدا کرے۔[1] اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس اصلاح سے ایک مقدس پیمان اور معاہدہ ٹوٹ جائے گا تو اس کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ سوا صدی کے گزر جانے کے بعد ابتدائی معاہدہ اپنا اثر کھو چکا ہے اور منصفانہ نہیں رہا ہے، نیز یہ کہ اس کو روا نہ رکھنا چاہیے کہ حقوق قایمہ کو عوام کے فلاح و بہبود پر غیر معین مدت تک تسلط حاصل رہے۔" جو کچھ قول و قرار کیا گیا وہ گزشتہ زمانے کی ضرورت کے لحاظ سے کیا گیا اور زمانۂ حال کی ضرورت کے لحاظ سے اس قول و قرار کے خلاف بھی کیا جا سکتا ہے۔" یہ میکیاولی کے مقولوں میں سے ایک ہے جو اس کے مخصوص انداز صاف گوئی کا مرقع ہے، لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ وہ ایک پر مغز حکمت عملی کو ظاہر کرتا ہے، خاص کر جب ہم یہ خیال کریں کہ "ماضی" اور "حال" میں جن کا ہم اب ذکر کر رہے ہیں، ایک صدی سے زائد پر از واقعات طویل وقفہ حائل ہے۔

38

۳۰۔ بندوبست کی مدت۔

اس بارے میں کہ آیا بندوبست کی مدت حتی الامکان مختصر ہونی چاہیے یا بڑی، بہت کچھ اختلاف آرا ہے۔ بعض اشخاص دس سال کی چھوٹی مدت کی حمایت کرتے ہیں، اور بعض اس میں ۹۹ سال تک توسیع کرنے کے خواہاں ہیں۔ چھوٹی مدت کی تائید میں یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ وہ حکومت اور قوم کو اس قابل بناتی ہے کہ آمدنی کے غیر اکتسابی اضافے میں سے جو عام ترقی کے نتیجے کے طور پر رونما ہوا اپنا اپنا مناسب حصہ وصول کرے؛ یہ استدلال خاص طور پر ان علاقوں پر صادق آسکتا ہے جہاں معاشی ذرائع تیزی کے ساتھ ترقی کر رہے ہوں،

[1] دیکھو محصولات کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ ۵ تا ۵۰۴۔

باب ۱۲

اور یہ کہ دوسری جانب چھوٹی مدت اس امر کو ممکن بناتی ہے کہ مالگزاری میں کمی کی جائے اور کسانوں کو عاجلانہ امداد دی جائے ۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ حد سے زیادہ طویل پٹے کے اختتام پر وصول ہونے والے بڑے اضافوں کے مقابلے میں جلد جلد وصول ہونے والے چھوٹے اضافوں کا لوگوں کو عادی بناکر چھوٹی مدت کا بندوبست بے اطمینانی کو کم کر دیتا ہے ۔ دوسری طرف یہ بتلایا جاتا ہے کہ بڑی مدت کا بندوبست مالگزاری اداکرنے والے کے حق میں کم تکلیف دہ ہوتا ہے اور اس میں یہ فائدہ ہے کہ لوگوں کے ذرائع کو بڑھا دیتا ہے اور ان کو اس قابل بناتا ہے کہ اعلی مالگزاری کے باعث اراضی کی اصلاح و ترقی کے فوائد سے محروم ہونے کے خوف کے بغیر اصلاح و ترقی کا کام جاری رکھیں ۔ اگر مالگزاری کا کوئی منظم اور باقاعدہ طریق قرض کیا جائے تو بندوبست کی مدت کا انحصار ان مخالف امور کے توازن پر ہوگا اور کھرے پن سے صحت کے ساتھ یہ کہنا ناممکن ہے کہ کوئی مخصوص مدت ہی مناسب ترین مدت ہے' اس کے سوا دوسری مدت مناسب نہیں ہے ۔ ملک کا عام میلان بڑی مدت کے حق میں ہے' اور نظر ثانی کی مدت میں زیادتی کو عام طور پر ترقی کا ایک قدم خیال کیا جاتا ہے ۔ بمبئی کی تشخیص مالگزاری کی کمیٹی تیس سالہ مدت کے تعین کی تائید کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کرتی ہے کہ :" کسان کی عمر میں تیس سال کی مدت ایک نسل ہوتی ہے ۔ اگر اس مدت کے آغاز ہی میں اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ حکومت اس کے ذمے کی مالگزاری میں اضافہ کرنے والی ہے تو اس کو واجب الادا مالگزاری کے تناسب سے اپنے مصارف اور طرز زندگی عام طور پر منظم کرنے کا کافی وقت مل جاتا ہے ؛ اور اگر بندوبست کی میعاد کے اندر اس کی زمین کی آمدنی بڑھ جائے' قیمتوں میں اندریں بھی اضافہ رونما ہو اور بازاروں اور آمدورفت کی سہولتوں میں اصلاح و ترقی ہو جائے تو اس کی معاشی حالت ایسی رہتی ہے کہ وہ بندوبست کی متعاقب نظر ثانی کے موقع پر لگان کے مناسب اضافے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر سکتا ہے ۔" اندرسن تیس سال کی طویل مدت کی مخالفت کرتے ہیں' اس لئے کہ منجملہ اور چیزوں کے ۳۳ فیصد

434

باب ۱۲

اضافے کے قاعدے کے ساتھ ساتھ وہ ان تدابیر کے اختیار کرنے سے باز رکھتی ہے جو بمبئی کے نظام کے سنگین نقائص میں سے ایک کو رفع کرنے کے لیے ضروری ہیں؛ یعنی یہ کہ ہر جگہ کاشت کے نفع سے یکساں حصہ نہیں لیا جاتا۔ ہر تیس سال کی مدت میں لگان یا نفع میں اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ اضافہ ہوتا ہے جتنا کہ مالگزاری میں ۳۳ فیصد کی انتہائی شرح سے ہو سکتا ہے[1]

۳۱۔ مالگزاری کی تشخیص کے اصول

جیسا کہ ہم نے ہندوستان کے بندوبست کے مختلف طریقوں کے تبصرے میں بیان کیا، یہاں مالگزاری کی تشخیص کا کوئی ایک بھی طریق ایسا نہیں ہے جس کے اصول واضح طور پر مسلم ہوں اور غیر متناقض طور پر استعمال کئے جائیں۔ اساسی اصول ہر صوبے میں مختلف ہیں اور ان میں متعدد و متفرق عاملوں کے شامل ہو جانے کی وجہ سے مزید تغیر و تبدل ہو گیا ہے؛ اور افسر بندوبست کو اپنی صوابدید پر کام کرنے کا بہت موقع دیا جاتا ہے۔ چنانچہ صوبۂ متحدہ پنجاب اور صوبۂ متوسط میں مالگزاری کی تشخیص کی نظری بنیاد معاشی لگان ہے، تو مدراس اور برما میں خالص پیداوار؛ بمبئی میں حال حال تک مالگزاری کی تشخیص کے قطعی اصول کی موجودگی کا دعوی ہی نہیں کیا جا سکتا تھا اور واضح طور پر تجربی طریق پر عمل کیا جاتا تھا جو افسر بندوبست کے تاثرات کے اعتبار سے عام معاشی ملحوظات پر منحصر ہوتا تھا۔

۳۲۔ لگان کی مالیت مالگزاری کی تشخیص کی بنیاد

بمبئی میں لگان کی مالیت کو مالگزاری کی تشخیص کی اساسی بنیاد کے طور پر استعمال کرنے کی جو کوشش حال میں کی گئی اس نے ایسے مسائل پیدا کئے جو خالص مقامی دلچسپی سے بہت زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ زرعی نفع کی علامت کے طور پر لگان کے اعداد و شمار پر تکیہ کرنے کی اس بنا پر

[1] دیکھو ایک کتاب موسوم بہ Facts and Fallacies of the Bombay Land Revenue System صفحہ ۱۰۹۔

حمایت کی گئی ہے کہ یہ طریقہ زیادہ قطعی اور صحیح ہے[1] اور یہ کہ وہ اس قابل بناتا ہے کہ افسر بندوبست کے اعمال کو دوسرے متبادل طریقوں کے مقابلے میں (جو فصلی تجربوں، قیمتوں اور وسائل آمد و رفت کی ترقی وغیرہ پر مشتمل ہیں) زیادہ موثر طریقے سے جانچا جائے[2] لیکن بردولی کے حالیہ ہنگامے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس کا امکان ہے کہ لگان کے اعداد و شمار تا وقتیکہ بہت احتیاط کے ساتھ استعمال نہ کئے جائیں سنگین غلطیوں اور مالگزاری کی ناقابل برداشت زیادتی کا موجب ہوں۔ حقیقی لگان، لگان کی صحیح مالیت کے اعتبار سے کئی اسباب کی بنا پر بہت زیادہ ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ کسانوں میں بہت زیادہ مسابقت ہو؛

---

[1] ۔ مسٹر ای، آر گاڈگل یہ شبہہ ظاہر کرتے ہیں کہ بمبئی میں "لگان کی مالیت" کو مالگزاری کی تشخیص کی بنیاد کے طور پر استعمال کرنا" حکومت کی طرف سے اپنے اس دعوے کو ثابت کرنے کی پوشیدہ کوشش ہے کہ مالگزاری لگان ہے نہ کہ محصول" (دیکھو ان کی کتاب موسوم بہ "بمبئی کا مالگزاری کا طریقہ" صفحہ ۔ ۱)۔ یہ بہت ہی دور از کار خیال ہے جو دل میں قطعی طور پر بس گیا ہے۔ جس مل پر اعتراض کیا گیا ہے وہ محض زرعی نفع کے نمایندے کے طور پر خانگی لگان کو استعمال کرنے کی کامیاب یا ناکام کوشش ہے۔ علاوہ ازیں شمالی ہند کے زمینداری خطوں میں جہاں عارضی بندوبست ہے لگان کی مالیت مالگزاری کی تشخیص کی اساسی بنیاد ہے اور اس کے باوجود حکومت نے یہاں خانگی مالکانہ حقوق ارضی کو رعیت واری علاقوں سے زیادہ قطعی و یقینی طور پر تسلیم کیا ہے۔

[2] ۔ اپنے افسر بندوبست سے کہئے کہ لگان کا "لحاظ کرنا چاہئے" تو وہ تساہل و تاخیر کے ساتھ لگان کے چند اعداد فراہم کرے گا اور اس کے بعد اپنی سفارشوں میں زیادہ تر دوسری مبہم اور سطحی چیزوں پر رہنمائی کے لئے تکیہ کرے گا۔ اس لئے کہ جس وقت تک آپ کی نظر صرف مبہم تعمیمات پر رہے گی اس وقت تک گرفت کرنا بہت دشوار ہوگا۔ لیکن اس سے یہ کہئے کہ اس کو زیادہ تر لگان کے اعداد پر تکیہ کرنا چاہئے اور بجز ان صورتوں کے جن میں لگان کے اعداد مبہم اور غیر قطعی ہوں اور مطابقت یا رہنمائی کی ضرورت ہو عام امور کا لحاظ نہ کرنا چاہئے، تو بندوبست منصفانہ اور معقول ہوگا۔ دیکھو انڈرسن کی کتاب موسوم بہ Facts and Fallacies of the Bombay Land Revenue System صفحہ ۵۸ و صفحہ ۶۴۔

باب ۱۱

زمیندار کی حیثیت لین دار کی اور کسان کی حیثیت دین دار کی ہو جائے اور موخر الذکر کسی ناقابلِ ادائی لگان کو منظور کرنے پر مجبور ہو جائے؛ ممکن ہے کہ لگان زرِ مستعار کے سود کی نمایندگی کرے اور زمین کی پیداآوری سے غیر متعلق رہے؛ ممکن ہے کہ لگان کے اعداد گرم بازاری کے دور کے متعلق ہوں اور اس لحاظ سے معمولی سالوں میں صحیح ہدایت کا کام نہ دیں؛ ممکن ہے کہ مقررہ لگان اسامی کے زمانۂ خوشحالی کی ادائی کی قابلیت پر مبنی ہو اور خراب سالوں میں معقول مہائیاں کرنی پڑیں؛ ممکن ہے کہ لگان زیادہ تر دوسرے ذرائع سے حاصل شدہ آمدنی سے ادا کیا جائے اور زمین کی آمدنی سے ادا نہ کیا جائے؛ نقد لگان پر بطور پٹہ لی ہوئی زمینوں کا تناسب اجناس خورد و نوش کے مقابلے میں روئی جیسی صنعتی فصلوں کے بارے میں بدرجہا بڑھا ہوا ہوتا ہے اور یہی تناسب فطری طور پر لگان کے اعداد و شمار میں بھی ظاہر ہو گا گو ایسے اعداد و شمار عام طور پر نہیں ملتے پھر بھی ممکن ہے کہ ان کو اسی طرح خیال کیا جائے؛ گاہ گاہ یہ ممکن ہے کہ کسان بے انداز لگان ایسی زمین کے لئے ادا کرے جس میں اس بات کے سوا کوئی اور خوبی نہیں ہوتی کہ وہ کسان کی زمین سے متصل واقع ہے؛ ممکن ہے کہ زیر بندوبست خطے کی مجموعی زمین کا صرف بہت ہی چھوٹا جزو نقد لگان کے پٹے پر لیا گیا ہو؛ اور اگرچہ ممکن ہے کہ لگان کی مالیت کا اندازہ کسی حد تک فروخت کے معاملات سے کیا گیا ہو (بہ شرطیکہ معمولی اور کسی خلل انداز ہونے والے عاملین سے متاثر نہ ہوں) پھر بھی اس طرح فراہم کردہ راست اور بالواسطہ مواد صحیح تعمیم کے لئے بالکل ناکافی ہو سکتا ہے[1]۔ بردولی کمیٹی رپورٹ کے الفاظ میں "خام مواد کے غیر متعین تغیرات کے لیے ہمیشہ بہت وسیع گنجائش چھوڑنی چاہیے" اور لگان کے اعداد کو بخوبی جانچ لینا چاہیے قبل اس کے کہ ان سے مالگزاری کی تشخیص کے لئے نتائج اخذ کیے جائیں۔ یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ اگر لگان کے

[1] ان معاملات کی زیادہ مفصل بحث کے لئے دیکھو ایک رپورٹ موسومہ بہ "بردولی کی نظر ثانی بندوبست کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ" فقرہ ۲۹ تا ۳۸؛ نیز ڈی آر گاڈگل کی کتاب موسوم بہ "بمبئی کی مالگزاری کا طریق"۔

باب ۱۲
436

متعلق مواد مناسب احتیاط کے ساتھ فراہم کیا جائے اس کو ایسے طریقے سے گوشوارے کی شکل میں مرتب کیا جائے جس سے اس کی حقیقی اہمیت ظاہر ہو اور اس کو متعلقہ معاملات کے مطالب کے مناسب حوالے سے استعمال کیا جائے تو وہ تقریباً واحد قطعی ثبوت بہم پہنچائے گا جس کو مالگزاری کی تشخیص کی نظر ثانی میں اعتماد کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے لگان اور پیداوار کی فروخت کے معتبر اعداد فراہم کرنے کی ہر ممکنہ سعی کرنی چاہئے اور ان کی باحتیاط تدوین کرنی چاہئے[1] لیکن مالگزاری کی تشخیص کی نظر ثانی کی غرض سے اعدادی و دیگر معلومات کے کسی مقررہ مجموعے کو جانچنے کا کام افسر بندوبست یا دوسرے سرکاری عہدہ داروں کے سپرد نہ کرنا چاہئے بلکہ ماہر اور ہوشیار مشیروں کی کمیٹی کے سپرد کرنا چاہئے جس کے لئے حال میں عوام کی طرف سے سخت مطالبہ بلکہ تقاضا کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اس صورت میں بھی جب کہ لگان کی مالیت کے اعداد و شمار کم و کیف کے اعتبار سے معقول حد تک اطمینان بخش معلوم ہوں، ان کے علامات کی جانچ دوسرے عاملین مثلاً وسائل آمد و رفت، بازاری قیمتوں، معاشی حالات، فصل تجربات وغیرہ کے اعتبار سے بمبئی کی مالگزاری کی تشخیص کی کمیٹی کی سفارشات کے مطابق کرنی چاہئے۔ چنانچہ لگان کے مواد کی ایسی تائیدی شہادت کو غیر ضروری سمجھ کر بہتر ہی شاذ ہی صورتوں میں بلا خدشہ ترک کیا جا سکتا ہے۔ حکومت بمبئی نے جو مسودہ قانون مالگزاری کی ترمیم کے متعلق مرتب کیا ہے اس میں لگان کی مالیت ہی کو اصل چیز قرار دیا گیا ہے لیکن ہنگامہ بردولی کے نتیجے کے طور پر اس طریقے کے خلاف جو میلان رونما ہوا ہے اس کا لحاظ کرتے ہوئے حکومت نے سابقہ مسودہ قانون کو دانشمندی کے ساتھ ترک کر دیا اور اپنے اس فیصلے کا اعلان کیا کہ وہ معقول اور ترقی پذیر بنیاد پر ایک ایسا جدید مسودہ مرتب کرنا چاہتی تھی جو بردولی کی تحقیق کے سیکھے ہوئے اہم اسباق پر مشتمل ہو۔ تاہم یہ مسودہ ابھی تک مجلس قانون ساز کے سامنے پیش نہیں ہوا ہے۔

[1] دیکھو بردولی کے بندوبست کی نظر ثانی کی کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ ۲۰۔

باب ۱۲

۲۳۔ ریکارڈو کا نظریہ ہندوستانی مالگزاری کے تعلق سے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، مالگزاری کی تشخیص کو متعین کرنے والے اصول باضابطہ بیان کی حد تک مختلف صوبوں میں مختلف ہیں۔ لیکن حکومت کا عام دعویٰ یہ ہے کہ عام حیثیت سے برطانوی ہند میں مالگزاری ہر جگہ معاشی لگان کا کچھ نہ کچھ مناسب جزو ہوتی ہے۔ اگر ہم غیر معاشی کھیتوں کی بڑی تعداد کا لحاظ کریں جن کی موجودگی سے حکومت کو انکار نہیں ہے، تو صورت حال اس کے برعکس ہے۔ چنانچہ جیسا کہ پروفیسر واڈیا و جوشی کہتے ہیں محصول ارضی کے ذریعے سے زمین کی غیر اکتسابی زائد آمدنی کو حاصل نہیں کیا جاتا بلکہ کسان کے پاس گذر بسر کے لیئے جو کم از کم مقدار بچ رہتی ہے اس کو چھین لیا جاتا ہے[۱] اگر دوسری صورتوں میں خالص معاشی لگان سے زائد محصول حقیقی طور پر نہیں لیا جاتا تو ایسا صرف اتفاقی طور پر ہو سکتا ہے نہ کہ ارادی طور پر؛ اس لئے کہ نام نہاد توفیر کا حساب کرنے میں مصارف پیدائش کے جملہ اجزائے ترکیبی کو خام مجموعی آمدنی سے منہا نہیں کیا جاتا۔ مثلاً ملکی کاشتکار اور اس کے خاندان کی محنت کا ہر صورت میں لحاظ نہیں کیا جاتا ممکن ہے کہ حقیقی لگان کی مالیت جس پر مالگزاری کی شرحیں مبنی ہوتی ہیں مثلاً شمالی ہندوستان میں حقیقی معاشی لگان سے ایسے ملک میں بدرجہا زیادہ ہو جہاں زراعت ہی باشندوں کا تقریباً واحد پیشہ ہو اور جہاں دستیاب ہونے والے اصل و محنت کے لیئے مختلف پیشوں میں کوئی مسابقت نہ ہو۔ کسان زمین سے وابستہ رہتا ہے، خواہ اسے حد سے زیادہ بھاری لگان ادا کرنے کے لئے فاقے ہی کیوں نہ کرنے پڑیں اور کتنی ہی مصیبت سے زندگی کے دن گزارنے پڑیں۔ "اگر بدل کے طور پر صنعت اور دستکاری کی شکل میں دوسرا پیشہ اختیار کیا گیا تو اس میں شبہ نہیں ہو سکتا کہ کھیتوں کی بہت بڑی تعداد جن پر آج ضرورۃً کاشت کی جا رہی ہے وہ کل غیر مزروعہ بن جائے گی[۲] لگان کی مالیت معاشی لگان کے

437

[۱]۔ دیکھو واڈیا اور جوشی کی مصنفہ کتاب، صفحہ ۲۸۱۔

[۲]۔ دیکھو واڈیا و جوشی کی محولہ بالا کتاب، صفحہ ۲۸۱۔

نمایندے کی حیثیت سے بھی ناقابل اعتماد ہے' اس لئے خالص معاشی ضرورت کے باعث جو جوع الارض ہوتی ہے اس کو اس روایتی اس لئے کہ جذبے سے تقویت پہنچتی ہے جو زمین میں شغل اصل کرنے کے حق میں ہوتا ہے' اور یہ جذبہ صرف اس صورت میں کمزور ہوسکتا ہے جب کہ شغل اصل کے مختلف راستے صنعتی ترقی کی شکل میں بطور بدل کھلے ہوئے ہوں۔ ریکارڈو کے مفہوم کے لحاظ سے معاشی لگان' مالگزاری کی تشخیص سے کوئی قطعی و معین تعلق نہیں رکھتا گو ہم یہ کہنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ ہر صورت میں مالگزاری کی زد اکتسابی آمدنی پر پڑتی ہے۔ لیکن ہم یہ استدلال بھی تسلیم نہیں کر سکتے کہ محض اس بنا پر کہ مالگزاری زمین کی پیداوار پر پہلا محصول یا مطالبہ ہے وہ معاشی لگان کا جزو نہیں ہوسکتا' اس لئے معاشی لگان تو ریکارڈو کے نظریے کے مطابق پیداوار پر آخری مطالبہ یا محصول ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ معاشی لگان آخری مطالبہ ہے تو ہم مختلف ادائیوں کے وقت کی ترتیب کو پیش نظر نہیں رکھتے بلکہ لگان کے معاشی تجزیے کی ترتیب کا خیال کرتے ہیں۔ جس طرح اجرت پیشگی ادا کی جاتی ہے' اگرچہ وہ آخر کار مزدور کی تیار کردہ پیداوار ہی سے نکالی جاتی ہے' اسی طرح زر لگان بھی توفیر حاصل ہونے سے پیشتر وصول کیا جا سکتا ہے' اگرچہ اس توقع کی بنا پر پیشگی وصول کیا جاتا ہے کہ توفیر حاصل ہوگی۔ نکتہ چینی کا صحیح طریقہ یہ ہوگا کہ یہ ثابت کیا جائے کہ مالگزاری بعض اوقات اس وقت عائد اور وصول کی جاتی ہے جب کہ توفیر حاصل ہونے کی کوئی توقع نہیں ہوتی' اور یہ کہ جس وقت توقع کے مطابق توفیر در اصل حاصل نہیں ہوتی تو مالگزاری معاف یا واپس نہیں کی جاتی۔ مالگزاری کے التوا اور معافی کے طریق کے عمل در آمد کی ضمانت نہیں دی جا سکتی اور اس طریق پر ہمیشہ عمل نہیں ہوتا۔ اس طرح مالگزاری مجموعی خام آمدنی کے کسی جزو میں داخل نہ ہونا چاہیئے اس لئے کہ یہ آمدنی حقیقی معاشی لگان یا غیر اکتسابی آمدنی نہیں ہوتی۔

لے۔ دیکھو واڈیا اور جوشی کی مصنفہ کتاب محولۂ بالا۔

۳۴۔ مالگزاری کی تشخیص کی نئی بنیاد

محصول کی تحقیقاتی کمیٹی یہ سفارش کرتی ہے کہ آیندہ سے سالانہ سربستہ مالیت کی یکساں بنیاد ہر صوبے میں اختیار کرنی چاہیئے اور یہ کہ افسر بندوبست کے کام کو سالانہ سربستہ مالیت کے تعین تک ایسے شرائط کے تحت محدود رکھنا چاہیئے جو ہر صوبے کے خاص حالات کے لحاظ سے ضروری ہوں۔ "سالانہ سربستہ مالیت" سے کمیٹی کا مطلب "مجموعی خام پیداوار بہ منہائی مصارف پیدائش ہے جن میں کسان اور اس کے خاندان کی لگائی ہوئی محنت کی اجرت اور جوکھم برداشت کرنے کا معاوضہ شامل ہے" ایسے لگان کی صورت میں جو قوانین لگان کے تابع ہو یا ایسے رسم ورواج کے تابع ہو جو قانون کی قوت رکھتا ہے یا ایسی صورت میں جب کہ لگان افسر بندوبست مقرر کرے یہ سفارش کی گئی ہے کہ ایسے لگان کو سالانہ سربستہ مالیت شمار کرنا چاہیئے۔ سالانہ سربستہ مالیت کی تجویز صحیح سمت میں ایک اصلاح وترقی معلوم ہوتی ہے؛ اس لئے کہ وہ مالگزاری کی تشخیص کے ان اصول کی مبہم نوعیت کا خاتمہ کردے گی جو موجودہ زمانے میں رائج ہیں۔ ہمارے مفہوم کے مطابق، سالانہ سربستہ مالیت اور حقیقی تقابلی لگان کی سربستہ مالیت، دونوں ایک ہی شئے نہیں ہیں؛ اس لئے کہ موخر الذکر یا تو بہت اعلیٰ ہوسکتی ہے مثلاً جب کہ دوسرے پیشوں کی عدم موجودگی کے باعث اور زراعت کے حق میں قوی میلان اور روایات کی بنا پر اسامیوں میں مسابقت سخت ہو؛ یا شاذ صورتوں میں حد سے زیادہ ادنیٰ ہوسکتی ہے مثلاً جب کہ اسامی اور زمیندار سازش کریں اور لگان کو عمداً کم ظاہر کریں تاکہ مالگزاری کا واجبی بار اٹھانے سے بچے رہیں۔ سالانہ سربستہ مالیت کی بنیاد اس لحاظ سے بھی زیادہ با اصول ہے کہ اس میں کسان اور اس کے اہل وعیال کی محنت کا نیز مہم پسندی کے معاوضے کا لحاظ کیا جاتا ہے۔

۳۵۔ مالگزاری کی شرح پر ایک سفارش

محصول کی تحقیقاتی کمیٹی دوسرے ملکوں کی مثال کی تقلید میں سالانہ سربستہ مالیت کا تناسب مقرر کرنے کی حد تک یہ سفارش کرتی ہے کہ مقابلۃً ادنیٰ معیاری

باب ۱۲

شرح اختیار کی جائے جو سالانہ سرلیتہ آمدنی کے ۲۵ فیصد سے متجاوز نہ ہو۔ چونکہ اس بارے میں معین اور قطعی معلومات مفقود ہیں کہ مختلف صوبوں میں سالانہ سرلیتہ مالیت کا کتنا فیصد لیا گیا اور اس بنا پر اس سفارش کے فوراً اختیار کرنے کی راہ میں مشکلات پیش آنے کا احتمال ہے لہذا کمیٹی یہ مشورہ دیتی ہے کہ ابتدائی ماہرانہ تحقیقات عمل میں لائی جائے تاکہ قبل اس کے کہ ہر صوبے کے لئے اس کی مجلس قانون ساز ایک مشترکہ شرح مقرر کرے یہ معلوم کر لیا جائے کہ موجودہ زمانے میں مالگزاری کس شرح سے وصول کی جاتی ہے۔ کمیٹی یہ بھی سفارش کرتی ہے کہ معیاری شرح کے علاوہ مقامی اجسام کی طرف سے مقامی اغراض کے لئے محصول عاید کیا جانا چاہئے اور اسی کے ساتھ یہ مشورہ دیتی ہے کہ معمولی مقامی محصولوں کی انتہائی مقدار مالگزاری کا تقریباً ۲۵ فیصد ہونا چاہئے۔ اس واقعے کا لحاظ کرتے ہوئے کہ مقامی اجسام زیادہ تر کاشتکاروں اور زمینداروں پر مشتمل ہوں گی نیز اس امر کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ مقامی محصولوں کا حاصل ایسے معاملات پر خرچ ہوگا جو خود اس مقام کی اصلاح و ترقی سے متعلق ہوں گے یہ پیش اندازہ کیا گیا ہے کہ ان محصولوں کی ادائی میں اس سے زیادہ رضامندی کے ساتھ ایثار کیا جائے گا جتنا کہ حکومت کے عام اغراض میں استعمال ہونے والی مالگزاری میں اضافہ کرنے کی صورت میں کیا جاتا۔ یہ معلوم ہوا ہے کہ محصول اراضی کی یکساں اور معمولی معیاری شرح کے ساتھ ساتھ مقامی محصولوں کا طریقہ یورپ کے اکثر ملکوں میں جہاں کہیں رائج ہے اطمینان بخش طور پر کام کر رہا ہے۔

۳۶۔ اضافے کے حدود کیا ہونے چاہئیں؟

مالگزاری میں بہت بڑے اضافے کو روکنے کی غرض سے کچھ مزید تحدید ضروری معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم بمبئی کی مالگزاری کی تشخیص کی کمیٹی کی اس سفارش کی تائید کرتے ہیں کہ اضافے کی حد عام اور یکساں طور پر ۲۵ فیصد تک محدود ہونی چاہئے اور مختلف گروہوں دیہات یا کمیتوں میں جیسا فرق و امتیاز آجکل کیا جاتا ہے ویسا نہ کرنا چاہئے بہ شرطیکہ زیر بحث تعلقوں کی مکرر نظر ثانی ہو چکی ہو۔

439

۴۷۔ اصول محصول کا اطلاق مالگزاری پر۔[1]

(۱) محصول کا پہلا اصول یہ ہے کہ محصول مقررہ و معین ہونا چاہیئے۔ اس اصول کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس طرح تشفی بخش طور پر پورا ہو جاتا ہے کہ مالگزاری بندوبست کی میعاد کے لئے مقرر کی جاتی ہے۔ کسان کو اس کا صحیح علم ہوتا ہے کہ اسے کتنی مقدار ادا کرنی ہے۔ اگرچہ مالگزاری کی تشخیص کی بنیاد ابھی تک مبہم ہونے کی وجہ سے مالگزاری کی نظر ثانی کے زمانے میں عدم تعین کا عنصر موجود ہوتا ہے جس سے بچنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ بندوبست کی یکساں بنیاد کا نفاذ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے اس عدم تعین کو بڑی حد تک دور کر دے گا۔ (۲) محصول کا دوسرا اصول سہولت ہے۔ اس کو تشفی بخش طور پر پورا کرنے کے لئے مالگزاری جیسا کہ کہا جا چکا ہے کسان کی سہولت کے لحاظ سے اقساط میں وصول کی جاتی ہے۔ لیکن "مقررہ و معین" محصول کے اصول پر "سہولت" کے اصول کو ایک حد تک قربان کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ بندوبست اوسطوں پر مبنی ہوتا ہے۔ اور حقیقی مقررہ و مشخصہ مالگزاری اس چیز کے اوسط کی نمایندگی کرتی ہے جس کا مطالبہ اچھے اور خراب سالوں کے لئے ملا کر بجا طور پر کیا جا سکتا ہے۔ مفروضہ یہ ہوتا ہے کہ کسان اچھی فصل کے زمانے میں اس غرض سے پس انداز کرے گا کہ خراب سالوں کی کمی اس سے پوری کرے۔ لیکن یہ مفروضہ واقعات کے مطابق نہیں بیٹھتا۔ نتیجہ یہ کہ اوسط مشخصہ مالگزاری تنگی اور خشک سالی کے زمانے میں حد سے زیادہ سخت اور جابرانہ خیال کی جاتی ہے۔ مالگزاری کے التوا اور معافی کے طریقے پر، جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کافی لچکداری کے ساتھ عمل نہیں کیا جاتا۔[2] چنانچہ محصول کی

---

[1] دیکھو محصول کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ ۹۶ تا ۹۸

[2] مالگزاری کی تحصیل میں زیادہ لچکداری پیدا کرنے کے خیال سے پیداوار اور مصارف کاشت وغیرہ کے متعلق اعدادی اندراجات اور کتابچے نہایت مکمل حالت میں رکھنے کا انتظام ضروری ہے۔ چنانچہ حکومت بمبئی نے اسی مقصد کو حاصل کرنے کی غرض سے مناسب انتظام کرنے اور کتابچوں کو مکمل طور سے مدون ہونے سے پیشتر عوام کی جانچ کے لئے کھلا رکھنے کے بارے میں اپنے

باب ۱۲

تحقیقاتی کمیٹی کی رائے میں مالگزاری کے طریق میں لچکداری نہ ہونے کی وجہ سے خراب موسموں میں کسان بڑی تعداد میں ساہوکار کے پاس رجوع ہوتے ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک اور دقت بڑی مدت کے بندوبست کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ کسان اپنے معیار زندگی کو اس مالگزاری کی بنیاد پر منظم کرتا ہے جو اسے بندوبست کے جاری رہنے کے زمانے میں ادا کرنی پڑتی ہے؛ اور اگر دوسرے بندوبست کے موقع پر مالگزاری میں اضافہ کر دیا جائے تو اسے اپنے خانگی مالیے کو اس تبدیلی کے مطابق فوراً منظم کرنے میں دقت ہوتی ہے۔ اگرچہ بڑی مدت کا بندوبست اسی مفروضے پر منظور کیا جاتا ہے کہ کسان کو ممکنہ اضافے کے لئے خود کو تیار کرنے کی کافی مہلت مل جائے گی۔ اس بنا پر پیدا ہونے والی مشکل کو دور کرنے کی کوشش اس طرح کی جاتی ہے کہ بڑے اضافے بتدریج اور آہستہ آہستہ عائد کئے جاتے ہیں اور ان کی تحدید کی جاتی ہے۔[1] از سر نو بندوبست کرنے کے عمل سے جو خلل پیدا ہوتا ہے اسے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، کاغذات اراضی کے طریقے کو بتدریج مکمل کر کے اقل حد تک گھٹا دیا گیا ہے، اگرچہ ممکن ہے کہ بعض صورتوں میں اس عمل کی تکمیل میں کئی سال تدقیق و تحقیق کرنی پڑے۔

(۳) "کفایت" کے اصول کی حد تک مالگزاری کے انتظام اور محکمے کے قیام پر جو کثیر مصارف عاید ہوتے ہیں وہ کلیتہً مالگزاری کی تشخیص و تحصیل کے مصارف شمار نہیں کئے جا سکتے، اس لئے کہ اب بھی محکمہ مالگزاری کو بلحاظ نوعیت اہم اور بے شمار متفرق کام، جو خالص مالگزاری کے حدود سے باہر ہیں، انجام دینے پڑتے ہیں۔

(۴) اصول "قابلیت" کے بارے میں سرکاری دعویٰ یہ ہے کہ حکومت کے حصے میں تدریجی کمی کیے جانے کی وجہ سے اس اصول کو زیادہ سے زیادہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ ۵۰ م کا حال ہی میں اعلان کیا ہے۔ (دیکھو رکن مالگزاری کی تقریر بمبئی کی مجلس قانون ساز میں بتاریخ یکم اگست ۱۹۱۹ء)۔

[1] دیکھو حکومت ہند کی مالگزاری کی پالیسی صفحہ ۳۰ تا صفحہ ۴۰۔

پیش نظر رکھا جا رہا ہے۔ چنانچہ اس استدلال کی تائید میں ہم اعداد پیش کر چکے ہیں۔ مالگزاری کی پالیسی کے بارے میں آر سی دت نے جو بحث شروع کی اس کے نتائج میں سے ایک یہ ہوا کہ معیاری شرحیں بیشتر ین شرحوں سے مبدل کر دی گئیں[1]۔ محصول کی تحقیقاتی کمیٹی یہ ثابت کرنے کے لئے اعداد و شمار پیش کرتی ہے کہ حکومت کے حصے (محصول) میں کمی کا میلان ۱۹۰۰ء سے ۱۹۲۲ء تک مسلسل کس طرح جاری رہا۔ چنانچہ اس دور میں گو قیمتوں میں ۷۰ فیصد اضافہ ہوا، مالگزاری صرف ۲۰ فیصد بڑھی[2]۔ علاوہ ازیں مالگزاری کے اضافے کے کچھ جزو کا باعث یقیناً یہ ہوا ہوگا کہ ظاہر کردہ رقبے میں قریب ۷ فیصد کا اضافہ ہوا۔

441

رہا مالگزاری کا بار، تو چونکہ مختلف صوبوں بلکہ مختلف اضلاع میں مختلف طریقے رائج ہیں اس لئے کوئی عام خیال قائم کرنا ناممکن ہے۔ پانچ ممکنہ معیاروں کا اطلاق کیا جا سکتا ہے یعنی: (۱) مالگزاری کا تناسب آبادی سے کیا ہے؛ (۲) مالگزاری کا تناسب مقبوضہ رقبے سے کیا ہے یعنی اوسط مالگزاری فی ایکڑ کیا ہے؛ (۳) مالگزاری بحساب فی اکائی زمین کا مقابلہ؛ (۴) مالگزاری کا تناسب مجموعی خام یا خالص پیداوار سے کیا ہے؛ اور (۵) مالگزاری کا تناسب لگان

---

[1] آر سی دت نے یہ خیال ظاہر کیا کہ مشخصہ مالگزاری کا بھاری ہونا ملک میں گزشتہ صدی اور خاص کر اس کے آخری حصے کے دوران میں قحطوں کے نمودار ہونے کے اہم ترین اسباب میں سے ایک تھا۔ قحطوں اور مالگزاری کے باہمی تعلق کی حد تک ہمارے جو خیالات ہیں وہ ان خیالات کے مشابہ ہیں جو مالگزاری اور قرضداری کے باہمی تعلق کی بابت اسی قسم کی بحث کے سلسلے میں ظاہر کئے جا چکے ہیں۔ ہماری دانست میں مالگزاری کو قحطوں کا محض معمولی سبب خیال کیا جا سکتا ہے اسی طرح جس طرح اس کو دیہی قرضداری کا سبب اسی کے مماثل وجوہ سے تصور کیا جا سکتا ہے۔

[2] لیکن حالیہ سالوں میں خاص کر اکتوبر ۱۹۲۹ء سے زرعی پیداوار کی قیمتوں کی عظیم کمی نے محصول کی تحقیقاتی کمیٹی کے بیان کردہ میلان میں بری طرح خلل پیدا کر دیا ہے۔

یا سالانہ سربستہ آمدنی سے کیا ہے۔ محصول کی تحقیقاتی کمیٹی سب سے موخرالذکر طریقے کو سب سے کم اطمینان بخش خیال کرتی ہے؛ لیکن اس بارے میں کسی مکمل اور معتبر مواد کی عدم موجودگی کی وجہ سے کمیٹی مختلف صوبوں میں محصول کے حقیقی بار کی بابت کسی قطعی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر ہے۔

۳۸۔ رسمی انصاف کا اصول۔ مالگزاری کے موجودہ طریقے کے تحت اس اصول کی خلاف ورزی ہوتی ہے؛ اس لئے کہ اول تو یہاں مختلف صوبوں بلکہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، مختلف اضلاع میں مختلف طریقے رائج ہیں اور دوسرے یہ کہ زمین کی آمدنیوں اور دوسرے ذرائع میں محصول کے اغراض کے لئے فرق و امتیاز کیا جاتا ہے۔

(۱) مختلف صوبوں میں فرق و اختلاف۔ پہلے معاملے کی حد تک ظاہر ہے کہ دوامی بندوبست کے رقبوں پر عارضی بندوبست کے رقبوں کے مقابلے میں موجودہ زمانے میں بہت کم محصول لگایا جاتا ہے۔ عارضی بندوبست کے علاقوں کی حد تک پنجاب کے گیارہ اضلاع میں جن کا حال میں بندوبست کیا گیا ہے۔ مالگزاری کا تناسب خالص لگان سے ۹ ا تا ۳۶ فیصد یا اوسطاً ۲۵ ہے۔ صوبۂ متحدہ میں یہ تناسب ۲۰ تا ۴۲ فیصد یا اوسطاً ۲۷ ہے۔ رعیت واری صوبوں میں خاص کر بمبئی میں، مالگزاری کا لگان سے تناسب احاطۂ مذکور کے مختلف حصوں میں ۱۷ تا ۵۰ فیصد ہے۔ برار میں، روئی کی کاشت کے دو تعلقوں میں جن کا حال ہی میں بندوبست ہوا ہے، اوسط ۱۰ فیصد ہے۔ مدراس کے اضلاع کی نصف تعداد میں اوسط تقریباً ۱۷ فیصد ہے[۱]۔ یہ اعداد قطعی طور پر صحیح تو نہیں ہیں، لیکن وہ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی معتبر شہادت بہم پہنچاتے ہیں کہ مختلف صوبوں میں مالگزاری کے بار میں بہت نمایاں فرق و اختلاف موجود ہے۔ اگر حکومت کے حصے کے طور پر سالانہ آمدنی کے ۲۵ فیصد کا یکساں معیار اختیار کرنے کے بارے میں

[۱] دیکھو محصول کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ ۹۴۔

محصول کی تحقیقاتی کمیٹی کی سفارش پر عمل کیا جائے تو رسمی انصاف کا حق ادا ہوگا۔
(۲) مالگزاری کا مقابلہ انکم ٹیکس سے۔ دوسرے معاملے پر بحث کرتے ہوئے اگر محصول ارضی اور محصول آمدنی (انکم ٹیکس) کا مقابلہ کیا جائے تو ان دونوں قسم کی آمدنیوں کی نوعی ترکیب کے بارے میں ہمیں نمایاں فرق ظاہر ہوتے ہیں۔

پہلا فرق یہ ہے کہ زمین کے بارے میں ایسی کوئی اقل حد نہیں ہے[۱] جہاں ٹیکس معاف ہو جیسی کہ انکم ٹیکس کے بارے میں ہے؛ دوسرا فرق یہ ہے کہ انکم ٹیکس کا آمدنی سے فیصد تناسب مالگزاری کی حد تک نسبتہً بدرجہا اعلیٰ ہے۔ تیسرا فرق یہ ہے اور یہی وہ واحد فرق ہے جو مالک زمین کی موافقت میں ہے کہ محصول متزائد کا طریقہ رائج نہیں ہے۔ ان دونوں قسموں کے محصولوں میں مشابہت پیدا کرنے کے دو طریقے ہیں: ایک طریقہ تو یہ ہے کہ انکم ٹیکس کو تمام اعتبارات سے مالگزاری کے مطابق بنایا جائے، اور دوسرا یہ کہ مالگزاری میں اس طرح تبدیلی کی جائے کہ وہ ہر اعتبار سے انکم ٹیکس کے مشابہ ہو جائے۔ اول الذکر طریقہ ناقابل عمل ہے اور رجعی طریقہ ہوگا، اس لئے کہ اس کی وجہ سے درجہ بندی اور حد استثنا کے قوی اور معقول اصول کا ترک لازم آئے گا۔ اس لحاظ سے ہمیں دوسرے طریقے پر عمل کرنے کے امکان اور اس سے پیدا ہونے والی پیچیدگی کو جانچنا اور سب سے اول یہ غور کرنا چاہئے کہ انکم ٹیکس کی طرح ایک ہزار روپیہ سے کم کی ارضی آمدنیوں کو محصول سے مستثنیٰ قرار دینے کا اثر و نتیجہ کیا ہوگا۔ اس طریقے کو اس لحاظ سے فوراً مسترد کر دینا چاہئے کہ سردست اس پر عمل کرنا ناممکن اور خام خیالی ہے، اس لئے کہ وہ حکومت کے مالیے کو متاثر

---

[۱] اس واقعے کو کہ نظری طور پر مالگزاری صرف غیر اکتسابی آمدنی سے لی جاتی ہے معافی محصول کی اقل حد کی عدم موجودگی کا نعم البدل بہ مشکل خیال کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ زرعی آمدنیوں کا دائرہ عام طور پر بہت ہی تنگ میدان کو محیط ہوتا ہے، خاص کر رعیت واری علاقوں میں، اس لئے اگر مالگزاری موجودہ انکم ٹیکس کے اصول پر منقرر کی گئی تو زرعی آمدنیوں کا بڑا حصہ محصول سے بالکل بچ جائے گا۔

باب ۱۲

کرے گا؛ اس کے مماثل نتیجہ مذکورہ بالا دوسرے فرق کی حد تک مجبوراً اخذ کرنا پڑے گا اور سمی انصاف کے اصول کو بہت آوری یا عملی ضرورت کے اصول پر قربان کرنا پڑے گا۔ اگر محصول کی تحقیقاتی کمیٹی کی اس سفارش کو کہ مالگزاری یکساں طور پر لگان کی سالانہ سرپستہ مالیت کے ۲۵ فیصد کے حساب سے مقرر کی جائے اور اس میں مقامی محصولوں کی شکل میں اضافہ کیا جانے علی جامہ پہنایا بھی گیا تو بھی فیصد تناسب تغیر زرعی آمدنیوں کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ ہوگا (اگر ہم اس بڑی بہت ہی اعلیٰ آمدنیوں کی قلیل تعداد کو نظر انداز کر دیں جن پر انکم ٹیکس اور سوپر ٹیکس کی شکل میں بہت بھاری تناسب سے محصول واجب الادا ہوتا ہے)۔ لیکن طریق تنزاید یا تدریجی زیادتی کے اصول کو مالگزاری کے بارے میں استعمال کیا جا سکتا ہے جیسا کہ یورپ کے ترقی یافتہ ملکوں اور جاپان میں ہوتا ہے جہاں زرعی آمدنیوں پر یا تو انکم ٹیکس عاید کیا جاتا ہے یا محصول مرگ[1]۔

اس لحاظ سے بحیثیت مجموعی مالگزاری کو انکم ٹیکس سے پوری طرح مشابہ کرنے کا خیال بالکل ناقابل عمل ہے اور بہر نوع کچھ مدت تک اول الذکر کو محصول کے اغراض کے لئے بلا شبہ ایک علحدہ شے خیال کرنا پڑے گا۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس کو ہمیشہ کے لئے محصول کے معمولی عمل سے باہر رکھا جائے۔ مالگزاری اور انکم ٹیکس (موجودہ زمانے میں موخر الذکر کسی حال مکمل نہیں ہے) میں تدریج ترمیم و اصلاح کرنی چاہیئے یہاں تک کہ دونوں محصول کے ایک ہی مقررہ اصول

[1] سر والٹر لے ٹن ساٹمن کمیشن کے فینانشل اسیسر کی اس تجویز پر کہ زرعی آمدنیوں پر جو انکم ٹیکس سے سر دست مستثنیٰ ہیں انکم ٹیکس عاید کیا جائے کتاب ہذا کی جلد دوم کے باب ۱۱ میں بحث کی گئی ہے۔

[2] محصول کی تحقیقاتی کمیٹی ڈاکٹر گریگوری کے نظریے کو تسلیم کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کرتی ہے کہ مالگزاری لازمی طور پر اشیا پر عاید کردہ ٹیکس ہے نہ کہ اشخاص پر عائد کردہ ٹیکس؛ اور یہ کہ اس لحاظ سے طریق تنزاید کے اطلاق کی وہ متحمل نہیں ہو سکتی (دیکھو کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ ۹۰)۔

باب ۱۲

کے مطابق بن جائیں۔ بے نقص ٹیکس کے لئے ضروری ہے کہ (۱) وہ نہ تو کسی آلۂ پیدائش یا اساسی یا مفید عمل پیدائش کے محرک کو بے دخل کرے یا خطرے میں ڈالے اور (۲) نہ صرف کے کسی اساسی یا مفید عنصر کو دور یا کم کرے[1]۔ ان اصول کی سختی سے پابندی کے معنی یہ ہیں کہ صرف غیر اکتسابی زائد آمدنیوں پر محصول لگایا جائے خواہ وہ زمین سے وصول ہوں یا دوسرے ذرائع سے؛ یا اگر اکتسابی اور غیر اکتسابی دونوں قسم کی آمدنیوں پر محصول لگانا ہے تو اول الذکر پر موخر الذکر کے مقابلے میں بہت ہی ادنیٰ شرح سے لگانا چاہئے[2]۔ اس لئے حکومت نظری طور پر غیر اکتسابی آمدنی سب کی سب جذب کر سکتی ہے۔

---

۱ - دیکھو جے۔ اے۔ ہابسن کی کتاب موسومہ بہ "نئی مملکت میں محصول"؛ صفحہ ۱۰۱۔

۲ - مالگزاری کی حد تک اس اصول کے عمل کی حسب ذیل تشریح و توضیح کی جا سکتی ہے: فرض کیجئے کہ اکتسابی اور غیر اکتسابی آمدنیوں کے محصول کی شرحیں اس اصول کے مطابق منظم کی جاتی ہیں کہ دو ہزار روپے سالانہ سے کم کی جملہ اکتسابی آمدنیاں مستثنیٰ کی جائیں؛ یہ کہ دو ہزار سے اوپر کی اکتسابی آمدنیوں پر بشرح ۵ فیصد اور غیر اکتسابی آمدنیوں پر بشرح ۵۰ فیصد محصول عائد کیا جائے۔ فرض کیا جائے کہ ایک خاصا بڑا زمیندار ہے جو اپنی زمین کو بٹے پر دینے کے بجائے اس پر خود کاشت کرتا ہے۔ اس کے جملہ مصارف کو منہا کرنے کے بعد اور اس کی ذاتی اُجرت تنظیم اور اس کے اصل کے سود کو علٰحدہ کرنے کے بعد یہ فرض کیجئے کہ اس کی خالص مجموعی آمدنی دو ہزار روپے ہوتی ہے جس کے منجملہ ایک ہزار روپیہ جوکھم برداشت کرنے اور اصل لگانے کا صلہ ہے اور باقی ایک ہزار روپیہ اس کی حقیقی غیر اکتسابی زائد آمدنی ہے۔ چونکہ اس کی اکتسابی آمدنی حد استثنا سے کم ہے اس لئے وہ اس پر کچھ ادا نہ کرے گا؛ بلکہ اپنی آمدنی کے غیر اکتسابی حصے پر صرف ۵۰۰ روپیہ ادا کرے گا۔ اگر اکتسابی آمدنی تین ہزار روپے اور غیر اکتسابی آمدنی ایک ہزار روپیہ ہو تو وہ اول الذکر پر ۵۰ روپیہ اور مابعد الذکر پر ۵۰۰ روپیہ ادا کرے گا۔ اگر وہ اپنی زمین کو بٹے پر اٹھا دے اور ایک مقررہ لگان سالانہ وصول کرے تو بھی ٹھیک یہی استدلال صادق آئے گا۔ اس کو جو محصول ادا کرنا ہوگا اس کا انحصار اکتسابی اور غیر اکتسابی آمدنیوں کے تناسب پر ہوگا جو اس کے وصول کردہ لگان میں شامل ہوں گی۔

باب ۱۲

اگرچہ حقیقی طور پر اس کا صرف ایک مقررہ جزو وصول کیا جا سکتا ہے تاکہ غلطی اگر ہو تو سلامت روی کی جانب اور ان عملی دشواریوں کا لحاظ کیا جائے جو غیر اکتسابی آمدنی کا صحیح حساب کرنے کی راہ میں پیش آتی ہیں۔ انکم ٹیکس کا موجودہ طریقہ اس لئے ناقص ہے کہ اس میں اکتسابی اور غیر اکتسابی آمدنی پر یکساں و مقررہ شرح سے محصول عائد کیا جاتا ہے۔ محصول ارضی اس لحاظ سے ناقص ہے کہ ایسے کھیتوں کی چھوٹی سی چھوٹی زرعی آمدنیوں پر محصول عائد کیا جاتا ہے جو مسلمہ طور پر غیر معاشی ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں تمام زمینوں پر مالگزاری ادا کی جاتی ہے خواہ ان سے حقیقی طور پر آمدنی حاصل ہو یا نہ ہو۔ مالگزاری اور انکم ٹیکس کے درمیان ایک اور فرق یہ ہے کہ موخرالذکر ہر شخص پر اس کی محصلہ آمدنی کی بنیاد پر عائد کیا جاتا ہے؛

۵۵

اس کے برخلاف مالگزاری کی حد تک ہر منفرد خطے کا محصول علیحدہ مقرر نہیں کیا جاتا؛ اور اوسط کے طریقے کے باعث جس سے کام لینا ضروری ہے بعض خطوں پر بہت زیادہ اور بعضوں پر بہت کم محصول لگایا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں نظری اعتبار سے مالگزاری، ماحصل زائد یا توفیر کا ایک جزو خیال کی جاتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ غیر معاشی کھیتوں کی حد تک کوئی توفیر وصول نہیں ہوتی اور اس کے باوجود ان سے مالگزاری وصول کی جاتی ہے۔ اس بنا پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک مقررہ رقبے سے کم رقبے والے کھیتوں کو مالگزاری سے مستثنیٰ کرنے کا طریقہ کس حد تک قابل عمل ہوگا۔ لیکن اس صورت میں بھی ہمیں اس دشواری سے سابقہ پڑتا ہے کہ تمام غیر معاشی کھیتوں کا فوری استثنا حکومت کو بہت ہی شدید مالی مشکلات میں مبتلا کر دے گا۔ ایک اور امر قابل لحاظ ہے اور وہ یہ کہ لوگ محصول ارضی کو اس شکل میں ادا کرنے کے قدیم ترین زمانے سے خوگر رہے ہیں، اس کو چپ چاپ مان لیا اور بلا پس و پیش ادا کیا اور اس طرح محصول ادا کرنے والے کو ناانصافی واضح طور پر محسوس نہیں ہوتی۔ اسی کے ساتھ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ہم اپنے طریق محصول کو معقول بنیاد پر قائم کرنا چاہیں تو نہ صرف غیر معاشی کھیتوں کو جلد یا بدیر مستثنیٰ کرنا پڑے گا[1] بلکہ زمینوں کی ایسی اکتسابی آمدنی

---

[1] غیر معاشی کھیتوں کو مستثنیٰ کرنے کے خلاف ایک عمدہ لیکن مغالطہ آمیز دلیل کے لئے دیکھو ٹامس کی کتاب محولۂ بالا صفحہ ۳۴ تا صفحہ ۴۱۔

باب ۱۲

کو بھی مستثنیٰ کرنا پڑے گا جو ایک مقررہ کمترین حد سے کم ہو اور اس کمترین حد کے مماثل جو ترقی یافتہ نظام کے تحت غیر زرعی آمدنیوں کے لئے مناسب سمجھی جاتی ہے۔

غیر معاشی کھیتوں کو مستثنیٰ کرنے کے خلاف ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس سے تقسیم اراضی کی ہمت افزائی ہوگی لیکن یہ اعتراض بہت زوردار نہیں ہے۔ تقسیم اراضی کی خرابی کو دور کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ مناسب آئین و قوانین وضع کرکے براہ راست نہ کہ بالواسطہ مالگزاری کے طریق میں ہمواری پیدا کی جائے۔

۳۹۔ آئینی نگرانی

یہ ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ مالگزاری کے متعلق معاملات کی آئینی نگرانی کا اصول ہندوستان میں کسی مفہوم میں نرالا یا انوکھا نہیں ہے۔ بمبئی جیسے بعض صوبوں میں مجلس قانون ساز کی جانب سے مالگزاری کا انتظام "ضابطۂ مالگزاری بمبئی" جیسے خاص ضوابط کے ذریعے سے کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاہم موجودہ صورت حال اس لحاظ سے غیر اطمینان بخش ہے کہ بعض صوبوں میں کسی قسم کی آئینی نگرانی نہیں ہے؛ اس کے برخلاف بعض صوبوں میں نگرانی تو موجود ہے لیکن گھٹیا درجے کی ہے' اور مالگزاری کے طریق کو انتظامی استبدادیت کے اس الزام سے بچانے کے لئے جو اس کے خلاف عائد کیا جاتا ہے آئینی نگرانی میں توسیع کرنا ضروری ہے[1]۔ اس سلسلے میں جائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی (۱۹۱۹ء) کے مندرجہ الفاظ قابل ذکر ہیں؛ "ہندوستان کے باشندوں پر مختلف قسم کے محصول بعض صورتوں میں شرحوں کی کوئی قانونی تحدید کئے بغیر اور بعض صورتوں میں مالگزاری کی تشخیص کے طریقوں کو قانونی طور پر پوری طرح مقرر کئے بغیر حاکمانہ طریق پر عائد کرنے کے بارے میں متعدد گواہوں نے جو اعتراضات کیے ہیں ان سے کمیٹی متاثر ہے۔ وہ یہ خیال کرتی ہے کہ اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ نئے محصول بتدریج مجلس قانون ساز کے منشا کے مطابق عائد کئے جائیں؛ اور خاص کر وہ یہ مشورہ دیتی ہے کہ مالگزاری کی تشخیص کی نظر ثانی کے عمل کو قوانین و ضوابط کی

445

[1] دیکھو حکومت ہند کا مراسلہ ۱۹۱۹ء کی دستوری اصلاحوں کے بارے میں، سر سنکرن نائر کی اختلافی رائے۔

باب ۱۲

زیادہ قریبی نگرانی میں لانا چاہیئے۔ کمیٹی مذکور یہ خیال ظاہر کرتی ہے کہ اس بات کا وقت آگیا ہے کہ قانون میں ان اہم اصول کو شامل کرلیا جائے جن کے ذریعے سے مالگزاری متعین ہوتی ہے اور تشخیص کے طریقے' مالگزاری کی انتہائی مقدار' نظرثانی کی مدت' تدریجی اضافوں کے تعین اور دوسرے اہم علوں کے متعلق بھی جو ٹیکس ادا کرنے والوں کی خوش حالی پر اثر انداز ہوتے ہیں قوانین مدون کرلیے جائیں۔ کمیٹی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اس بات کی ضرورت تھی کہ مجالس قانون ساز میں دیہی جماعتوں کی کافی نمایندگی کا انتظام کرنے کے بعد اور اس شعبے کو وزرا کے تفویض کرنے سے پیشتر یہ اصلاح کی جائے۔

۴۴۔ مالگزاری کے متعلق آئین سازی کی ترقی۔

مذکورۂ بالا سفارش صوبہ واری مجالس قانون ساز میں بہت کچھ بحث مباحث کا مرکز بنی رہی۔ چنانچہ ان میں حسب ذیل امور کی بذریعہ قانون زیادہ مکمل تنظیم کرنے پر غور ہورہا ہے۔ (۱) اصول بندوبست اور مالگزاری کی معیاری شرح کا تعین؛ (۲) بندوبست کی نظرثانی کے موقع پر اضافے کی تحدید؛ (۳) بندوبست کی مدت۔ ۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۹ء میں پنجاب' صوبۂ متحدہ اور صوبۂ متوسط کی مجالس قانون ساز میں ایسے مسودہ ہائے قانون منظور ہوئے جن میں مالگزاری کی تشخیص کے اصول کو ضابطۂ قانون کی شکل میں مدون کیا گیا[1]۔ قانون ترمیم مالگزاری پنجاب بابت ۱۹۲۹ء کی روسے حکومت کا حصہ خالص اثاثہ کا ایک چوتھائی مقرر کیا گیا ہے اور بندوبست کی مدت بڑھاکر ۴۰ سال کردی گئی ہے۔ بنگال' بہار اور اوڑیسہ میں وضع آئین اس لئے ضروری نہیں خیال کی گئی کہ ان صوبوں میں بڑے بڑے علاقے دوامی بندوبست کے تحت ہیں۔ مدراس اور آسام میں[2]

---

[1] دیکھو ایک کتاب "ہندستان ۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۹ء میں" صفحہ ۳۲۱۔

[2] آسام میں ستمبر ۱۹۳۱ء میں ایک مسودۂ قانون منظور ہوا جس کی روسے مالگزاری کی انتہائی شرح خام پیداوار کی مالیت کے ½ ۱۲ فیصد کی بجائے جیسا کہ حکومت نے تجویز کیا تھا ۱۰ فیصد مقرر ہوئی۔ مجلس قانون ساز کی مختلف جماعتوں کے نمایندوں میں باہمی سمجھوتے کے نتیجے کے طور پر یہ طے کیا گیا تھا کہ

مالگزاری کی تشخیص کی تنظیم کے متعلق قوانین وضع کرنے کی کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ برما میں اس کے مخصوص حالات کے باعث اس مسئلے پر غور و خوض ملتوی کر دیا گیا ہے۔

بمبئی میں مجلس قانون ساز کی منظورہ قرارداد کی بموجب جون ۱۹۲۴ء میں مالگزاری کی تشخیص کی کمیٹی مقرر ہوئی۔ اس کمیٹی کے غیر سرکاری ارکان نے پرزور سفارش کی کہ مجلس قانون ساز کی ایک مستقل مشاورتی کمیٹی قائم کی جائے جو بندوبست کی نظرثانی کے تمام تجاویز کو جانچے اور یہ کہ اگر کمیٹی کی سفارشیں حکومت منظور نہ کرے تو مجلس قانون ساز کی صریح منظوری کے بغیر تجاویز روبہ عمل نہ لائی جائیں چونکہ حکومت کا قدرتی میلان مالی نقطۂ نظر پر زور دینے کی طرف ہوتا ہے جو مالگزاری ادا کرنے والوں کے خلاف پڑتا ہے اس لئے ایسی کمیٹی کا قیام یقیناً نہایت مناسب ہوگا۔[1] اس تجویز کے بارے میں پہلا سرکاری اعتراض یہ ہے کہ بندوبست کا کام اس قدر فنی ہے کہ مشیروں کی غیر فنی جماعت اس کو مناسب طریقے پر سمجھ نہیں سکتی اور دوسرے یہ کہ ممکن ہے کہ مشاورتی کمیٹی کے ارکان دیہی آرا کو حاصل کرنے اور اپنے رائے دہندوں اور موکلوں کو خوش کرنے کے لئے معتدل اضافوں کی تجاویز کی بھی مخالفت کریں۔ پہلا اعتراض اس قدر قوی نہیں ہے جیسا کہ وہ پہلی نظر میں معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ بندوبست کا عملی طریقہ اس قدر ادق و پیچیدہ نہیں ہے کہ وہ غیر سرکاری ارکان اور خاص کر زرعی و دیہی معاملات کا تجربہ رکھنے والوں کی فہم سے باہر یا بالاتر ہو؛ اور بہر صورت ان کی معلومات کی کمی کو پورا کرنے کے لئے کمیٹی میں دو ایک سرکاری ماہر شریک کر لئے جا سکتے ہیں۔ دوسرے اعتراض کی حد تک یہ خیال کرنا بے انصافی ہے کہ غیر سرکاری ارکان پر یہ بھروسا

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ۔ شرح ½۱۲ فیصد مقرر کی جائے۔ چنانچہ گورنر نے اس مسودۂ قانون کو مکرر غور کے لئے مجلس میں واپس بھیجا لیکن مجلس نے ½۱۲ فیصد کی اعلیٰ شرح منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ اس لئے گورنر نے اس مسودے کو نامنظور کر دیا۔ دیکھو "ہندوستان ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۱ء میں" صفحہ ۵۰۰۔

[1] دیکھو حکومت ہند کی قرارداد بابتہ ۱۹۲۷ء "تشخیص مالگزاری بمبئی کی کمیٹی کی رپورٹ" اور "کمیٹی کے سرکاری ارکان کی رپورٹ" کے بارے میں۔

باب ۱۲

نہیں کیا جا سکتا کہ وہ دیہی رائے دہندہ کو خوش کرنے کے علاوہ کچھ کرے گا اور وسیع نقطۂ نظر سے اپنی آزادانہ رائے کو کام میں لائے گا؛ رہا مالگزاری کے اضافے کی مخالفت کرنے کے بارے میں غیر سرکاری رکن کا میلان طبع تو وہ عاملہ کے اس کے برعکس میلان کو متوازن کرنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ آئینی نگرانی کی مخالفت اس بنیاد پر کرنا کہ مالگزاری کا بندوبست کلیتہً عاملہ کا معاملہ ہے اقتضائے زمانہ کے خلاف ہے۔ مجالس قانون سازیہ ماننے کے لئے کسی حال تیار نہیں ہیں کہ اس معاملے کو ان کی نگرانی سے الگ رکھا جائے چنانچہ وہ اس پر آئینی نگرانی رکھنے کے متعلق تفصیلات پر غور و خوض بھی شروع کر چکی ہیں اور ممکن ہے کہ مشاورتی کمیٹی جیسی مستند جماعت کی عدم موجودگی میں کونسلوں میں حکومت کی بندوبست کی پالیسی کے بارے میں بہت ہی تلخ بلکہ غیر ذمہ دارانہ بحث ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مجلس قانون ساز کے بھرے اجلاس میں بندوبست کی رپورٹ پر غور و بحث ناموزوں ہے۔ چنانچہ اس سے بچنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ایک مشاورتی جماعت کو منظور کر لیا جائے جس پر مجلس قانون ساز اور حلقۂ انتخاب کنندگان کو کافی اعتماد ہو۔ حکومت بمبئی نے حال ہی میں اپنی اس غیر مصالحت پسندانہ روش کو بدل دیا ہے کہ وہ غیر سرکاری نگرانی کی ہر شکل کی مخالف ہے اور جدید مجوزہ مسودۂ قانون مالگزاری کے سلسلے میں یہ یقین دلایا ہے کہ نہ صرف متعلقہ زمینداروں کو بلکہ عوام کی جماعتوں اور انجمنوں کو بھی اس کا موقع دیا جائے گا کہ افسر بندوبست کی تجاویز پر غور و بحث کریں۔ لیکن اس کے علاوہ یہ بھی مناسب ہوگا کہ بمبئی کی تشخیص مالگزاری کی کمیٹی کے غیر سرکاری ارکان کے مجوزہ طریقے کے موجب ایک مستقل مشاورتی کمیٹی ترتیب دی جائے۔

447

448

صنعتوں پر ایک عام نظر

ہندوستان کی مال کی صنعتی تاریخ

اس باب میں ہم ہندوستان کی صنعتی [illegible] ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔ بعد کے بابوں میں خاص [illegible] مسائل مثلاً صنعتی تامین بڑے پیمانے کی صنعتوں اور گھریلو صنعتوں وغیرہ پر بحث کی جائے گی۔ ہم ہندوستان کی صنعتی تاریخ پر قریب قریب بیسویں صدی کے ختم تک تبصرہ کر چکے ہیں[1] اور یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ انیسویں صدی کے آغاز تک ہندوستان کس طرح بہ یک وقت صنعتی اور زرعی ملک تھا۔ اس کی صنعتیں معاصر معیاروں کے مطابق درجۂ کمال پر کس طرح پہنچ گئی تھیں۔ لیکن تھارھویں صدی کے آغاز سے کئی ناموافق اثرات کے نتیجے کے طور پر ان میں کس طرح تحطاط اور زوال شروع ہوا۔ گزشتہ صدی کے آٹھویں عشرے سے اور خاص کر موجودہ صدی کے آغاز سے صنعتی معاملات میں ہندوستان کی پسماندگی [illegible] [illegible] وجی اور راناڈے جیسے محبان وطن اور علمائے معاشیات کی جاذبِ توجہ بن گئی تھی۔

---

[1] دیکھو باب ۴۔

باب ۱۱

اور اسی کو اس بات کا ذمہ دار قرار دیا گیا تھا کہ بار بار وقوع پذیر ہونے والے قحطوں سے ملک تکلیف اٹھا رہا تھا اور عوام انتہائی افلاس میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ قحط بھی افلاس ہی کی علامت تھے۔ ۱۸۸۰ء کا قحط کمیشن یہ خیال ظاہر کرنے میں بالکل حق بجانب تھا کہ ہندوستان میں قحط کے بار بار رونما ہونے کے اہم اسباب میں سے ایک سبب یہ تھا کہ صنعتوں میں تنوع کا فقدان تھا اور کمیشن نے اس نقص کو دور کرنے کے بارے میں زور دیا۔ ۱۹۰۱ء کے قحط کمیشن نے بھی صورت حال کی تشخیص اسی کے مماثل کی اور علاج بھی اسی کے لگ بھگ تجویز کیا۔ یہ خیال ترقی کرتا گیا کہ فطرت نے یہ مقدر نہیں کیا تھا کہ ہندوستان ہمیشہ کے لیے مصنوعات کی حد تک دوسرے ممالک کا محتاج و دست نگر بنا رہے۔ وہ چند صنعتیں بھی جو ملک میں حکومت کی امداد کے بغیر قائم ہوئی تھیں بڑی حد تک بیرونی سرمایہ اور مہم جوئی کی ممنون کرم تھیں۔ یہ ایسی صورت حال تھی جو قومی نقطۂ نظر سے بہ مشکل اطمینان بخش خیال کی جا سکتی تھی۔ حکومت جاپان کی مثال سامنے موجود تھی جس نے اپنے ملک کو حیرت ناک طریقے پر قلیل مدت میں صنعتی قوموں کی صف اول میں لا کھڑا کر دیا تھا اور اس کی یہ سرگرم جدوجہد ہمارے ملک کی حکومت کے تکلیف دہ اور غیر ہمدردانہ طرز عمل اور روش کا بالکل ضد تھی۔ گزشتہ صدی کے اختتام پر لنکاشائر کے دباؤ کے تحت روئی پر محصول چنگی کا عائد کیا جانا اس بدگمانی کو تقویت دے رہا تھا کہ حکومت ہندوستان کی صنعتی ترقی سے محض تغافل ہی نہیں برت رہی تھی بلکہ اس کے حق میں اس سے بھی زیادہ برے طریقے سے پیش آ رہی تھی۔

440

ان حالات میں یہ امر تعجب خیز نہیں ہے کہ عوام کے افلاس کی وجہ سے اور متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے صنعتی میدان میں کھپت کی گنجائش نہ ہونے کے باعث جو معاشی بے اطمینانی پیدا ہو چلی تھی اس نے سیاسی رنگ اختیار کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ ساتھ ۱۹۰۵ء میں ہندوستانی صنعتی کانفرنس کا انعقاد معاشی و سیاسی بے چینی و بے اطمینانی کے ملاپ کی پہلی قطعی علامت تھا، اور اس میل اور اتحاد کو اس ہنگامے اور شورش سے بہت بڑی حد تک تقویت پہنچی جو تقسیم بنگال کو منسوخ کرنے کے لئے رونما ہوئی تھی۔ اسی ایک

باب

متذکرہ مقصد کا اظہار سودیشی کی تحریک کے ذریعے سے ہیجان ۱۹۰۵ء میں اور مقاطعے کے ذریعے سے سلبی شکل میں ہوا۔[1] غرض ملک کے طول و عرض میں صنعتی گرماگرمی اور جوش و خروش کی بہت بڑی لہر دوڑ گئی۔ چنانچہ سوتی پارچہ بافی، پنسلوں، چھری چاقو، قینچی، دیاسلائیوں، شیشہ و آلات وغیرہ کے کئی کارخانے اور فیکٹریاں قائم ہو گئیں؛ لیکن ان میں سے اکثر کارخانے تباہ ہو گئے؛ جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ عملی تجربہ معدوم تھا اور دوسری اس سے بھی بڑی وجہ یہ تھی کہ کاروباری تجربہ مفقود تھا اور آخر میں اس وجہ سے کہ حکومت نے اس تباہی کو روکنے کے لئے اپنی چھنگلیا تک نہیں اٹھائی۔ ریلوں کے کرایے میں امتیازات کی پالیسی کو جاری رہنے دیا گیا جو ہندوستانی صناعوں کے اغراض کے منافی تھی۔ غیر ملکی مسابقت کے لئے کھلا میدان چھوڑ دیا گیا اور اس کی روک تھام تامینی محصول یا دوسرے ذرائع سے نہیں کی گئی۔ اس طرز عمل کا باعث سراسر اصول عدم مداخلت ہی نہ تھا جو کم و بیش غیر متناقض طریقے پر حکومت کا مسلک تھا۔ یہ طرز عمل مقاطعے کو سودیشی کی تحریک سے وابستہ کر دینے کی وجہ سے رونما ہوا۔ چنانچہ اسی بائیکاٹ یا مقاطعے کی بنا پر یہ تحریک نہ صرف حکومت بلکہ بے شمار خانگی افراد کی ہمدردیوں سے محروم ہو گئی۔ صنعتوں کی تباہی نے، خواہ اس کے کچھ ہی اسباب ہوں، بلاشبہ پرزور طریقے پر یہ سبق سکھایا کہ اس ملک میں حکومت کی قومی اور پرجوش امداد کے بغیر صنعتوں کے لئے کم از کم ان کی نشو و نما کے ابتدائی مرحلوں میں کوئی موقع نہ تھا۔ چنانچہ زمانۂ قبل از جنگ میں ہندوستانی صنعتوں نے بہت ہی گھٹیا طریقے پر ترقی کی۔ سچ پوچھو تو بڑی اور منظم صنعتیں جو مستحکم بنیاد پر قائم تھیں، صرف یہ تھیں: ہندوستان کی سوتی پارچہ بافی کی گرنیاں، بنگال کی سن کی صنعت اور بہار، اڑیسہ اور بنگال کی کوئلہ کی کانوں کی کھدائی کا کاروبار۔ لیکن اس امر کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ہندوستانی ہم جوئی کے تحت صنعتی ترقی کے میدان میں ایک نہایت اہم قدم بڑھایا گیا یعنی بمقام سکچی (جمشید پور) ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی کا افتتاح ہوا، جو در اصل ۱۹۰۷ء میں قائم ہوئی اور جس نے

[1] دیکھو مونٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ، فقرہ ۳۳۵۔

باب ۱۲

۱۹۱۳ء سے کاروبار شروع کیا۔ دوسری متعدد متفرق صنعتیں اور حرفتیں مثلاً روئی صاف کرنے اور دبانے کے کارخانے، سن دبانے کے کارخانے، کاغذ کی گرنیاں، چاول کی گرنیاں، شکر کے کارخانے، پٹرولیم صاف کرنے کے کارخانے، کارہائے چرم، انجنیری کے کارخانے وغیرہ بھی معرض وجود میں آئے، لیکن وہ اتنے بڑے پیمانے پر یا اتنے اہم نہ تھے کہ یہاں سرسری ذکر سے زیادہ کسی بیان کے مستحق ہوں۔

450

۴- صنعتی ترقی کے بارے میں حکومت کی پالسی پر ایک نظر [ا]

یہاں ان مختلف تغیرات پر مختصر تبصرہ کرنے کے لئے جو ہندوستانی صنعتوں کے بارے میں حکومت کی پالسی میں واقع ہوئے ہیں کچھ توقف کرنا مناسب ہوگا۔ یہ تو پہلے بیان ہوچکا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی میلانات نے اس کو کس طرح ابتداءً ان صنعتوں کی اصلاح و ترقی کا حامی بنایا جن پر اس کی برآمدی تجارت کا دارومدار تھا۔ لیکن اس پالسی کو انگلستان کے حقوق قائمہ کے دباؤ کے باعث ترک کرنا پڑا، اور ہندوستان ابتدائی طور پر اشیائے خام کا بیش بہا سرچشمہ خیال کیا جانے لگا جو انگلستان کی مصنوعات کی ترقی کے لئے ضروری تھیں۔ یہ طرز عمل قدیم نوآبادیاتی پالسی کا ترکہ تھا، اور کمپنی کے تجارتی جماعت کی حیثیت سے باقی نہ رہنے کے بعد کچھ زمانے تک بلکہ اس کے معدوم ہوجانے اور اس کی جگہ ۱۸۵۸ء میں تاج کی براہ راست حکمرانی قائم ہوجانے کے بعد بھی قائم رہا۔ جس چیز کا محرک ابتداءً ذاتی مفاد تھا اس کو بعد میں چل کر نظریۂ عدم مداخلت کے رواج سے اس زمانے میں انگلستان اور ہندوستان دونوں مقامات پر تقویت حاصل ہوگئی۔ صنعتی ترقی میں حکومت کی دلچسپی گاہ گاہ تو ظاہر ہوئی، لیکن بہت وقفے یا ناغے سے اور اتفاقی طور پر۔ یہ دلچسپی صورت حال کی ضرورتوں

[ا] اس موضوع کی زیادہ مفصل بحث خاص کر زمانۂ جنگ اور زمانۂ بعد از جنگ کے متعلق حالات کی بحث کے لئے دیکھو اے، جی کلو کی کتاب موسوم بہ "حکومت و صنعت" باب ۱ تا باب ۴، نیز ڈی، ایچ بکانن کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان میں اصل دارانہ مہم جوئی کی ترقی" صفحہ ۴۶۰ تا صفحہ ۴۷۵۔

کے لئے مضحکہ خیز طریقے پر ناکافی تھی اور اس نے ایک مدت دراز تک فنی و صنعتی تعلیم اور تجارتی و صنعتی معلومات کی فراہمی و اشاعت کے بہت ہی ناقص انتظام سے تجاوز ہی نہ کیا۔ چند صنعتی نمائشیں منعقد کی گئیں اور ہندوستانی صنعتوں کے بارے میں چند رسالے اور مضامین شائع کئے گئے؛ لیکن حکومت کی طرف سے جو کچھ کارروائی ہوئی اس کا باعث زیادہ تر چند غیر معمولی طور پر دور اندیش انفرادی عہدہ داروں کی جدوجہد تھی نہ کہ حکومت کی بغور مرتب کردہ کوئی جامع اور ٹھوس پالیسی۔ تاہم حکومت کی پالیسی میں بتدریج تغیر رونما ہوا؛ چنانچہ اس کی پہلی علامت یہ تھی کہ ۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن کی ایما پر ایک جداگانہ مرکزی محکمۂ صنعت و حرفت قائم ہوا۔ اس اثنا میں انفرادی صوبہ واری حکومتوں مثلاً حکومت ہائے صوبۂ متحدہ و مدراس نے صنعتی پالیسی کے لائحۂ عمل پیش کرنے شروع کر دیے تھے جس میں حکومت کی گہری امداد باہمی تعاون اور نگرانی ضروری تھی۔ چنانچہ جب حکومت مدراس کے حوصلے الونیم کی صنعت میں اپنے کامیاب تجربے کی وجہ سے بڑھ گئے تو اس نے اس کی بنا پر خود کو صنعتی ترقی میں روزافزوں سرگرم حصہ لینے کے اصول کا پابند کر لیا اور اس کے نتیجے کے طور پر دستی کرگھے کی پارچہ بافی اور کرومی چرم کی صنعت وغیرہ کو بہت بڑی حد تک فروغ ہوا۔ صنعتی و فنی تعلیم کی اشاعت و ترقی اور نگرانی کی غرض سے ایک خاص افسر کا تقرر عمل میں آیا۔ یوں تو ان سب مستحسن کوششوں کے بارے میں ہندوستان کی یوروپین تجارتی جماعت میں غرض مندانہ مخالفت پہلے ہی پیدا ہو چکی تھی لیکن لارڈ مارلے نے اس وقت کے وزیر ہند کے ۱۹۱۰ء کے مراسلے نے ان کوششوں کے راستے میں اچانک رکاوٹ پیدا کی۔ لارڈ مارلے اپنے عدم مداخلت کے مسلک پر مضبوطی سے جمے رہے اور نئی صنعتوں کو قائم کرنے کے بارے میں حکومت کی براہ راست جدوجہد کی مخالفت کی خواہ وہ تجربے اور مظاہرے کی خاطر کی جائے یا صنعتوں کو آخر کار رضاکی مہم جو افراد کے ہاتھوں منتقل کرنے کے مقصد سے۔ جس پالیسی کو وہ منظور کرنے کے لئے تیار تھے یہ تھی کہ سرکاری رقم پیدائش کے طریقوں کی ایسی اصلاح و ترقی سے عوام کو واقف کرنے کے لئے خرچ کرنی چاہیے جو یوروپی ممالک کی جدید سائنس اور طریق عمل کی بنا پر رونما ہو۔ اس سے آگے حکومت کو نہ جانا چاہیئے اور اس امر کو مہم جو افراد پہ

باب ۱۲

چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ یہ ثابت کر دکھائیں کہ اس اصلاح و ترقی کو کاروباری نقطۂ نظر سے فائدے کے ساتھ اختیار کیا جا سکتا ہے؟[1] لارڈ مارلے کے اس مشہور مقولے نے حکومت مدراس کے جوش کو ٹھنڈا کر دیا، چنانچہ اس نے بعد میں مل کر اپنے احکام کی اصلاح کی کوشش کی اور ضرورت سے زیادہ رجعت پسندی اختیار کی۔[2] لارڈ مارلے کے جانشین لارڈ کریو نے یہ بتلایا کہ حکومت مدراس نے اپنی کوششوں کو صنعتی مدارس کے قیام و انتظام تک محدود رکھ کر ۱۹۱۰ء کے مراسلے کی بنیاد پر بہت ہی پھونک پھونک کر قدم آگے بڑھایا۔ جدید وزیر ہند نے یہ اعلان کیا کہ وہ اس کے لیے تیار تھے کہ اس سے کسی قدر زیادہ دلیرانہ پالیسی اختیار کریں، لیکن اب حکومت ہند کی باری تھی کہ وہ اس بارے میں شبہات میں مبتلا ہو کہ وہ مظاہرے کے کارخانے قائم کرنے، مالی امداد کرنے اور صنعتوں کو دوسری شکلوں میں براہ راست مدد دینے کی تجاویز منظور کرنے میں کس حد تک حق بجانب تھی۔ حکومت کے راستے میں ایک اور رکاوٹ یہ تھی کہ ضروری انتظام اور ساز و سامان موجود نہ تھا۔ چنانچہ حکومت نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اسی چیز نے لارڈ مارلے کی منظورہ انتہائی محتاط پالیسی کو بھی عملی جامہ پہنانے سے باز رکھا تھا۔ اس کا صاف اور ترکی بہ ترکی جواب تو بلا شبہ یہی تھا کہ اس کو مطلوبہ انتظام اور ساز و سامان فراہم کر لینا چاہیے تھا۔ لیکن خواہ اس کے کچھ ہی اسباب ہوں، واقعہ یہ ہے کہ حکومت اس جوش و خروش سے کام لینے سے

---

[1] دیکھو صنعتی کمیشن کی رپورٹ، فقرہ (۱۰۸)

[2] پنڈت مدن موہن مالویہ اس رائے سے کلیۃً متفق نہیں ہیں جو صنعتی کمیشن کی اکثریت کی رپورٹ نے "لارڈ مارلے کے ۱۹۱۰ء کے مقولے سے پیدا شدہ حوصلہ شکن اثر" کے بارے میں پیش کی تھی۔ پنڈت جی یہ بتلاتے ہیں کہ گو لارڈ مارلے ایسے تجارتی کاروبار کے مخالف تھے جو سرکاری انتظامات کے تحت چلائے جائیں، تاہم لارڈ موصوف اس بات کے حامی تھے کہ سرکاری رقم ساز و سامان سے بخوبی آراستہ صنعتی و فنی مدارس کے قائم کرنے میں خرچ کی جائے۔ لیکن حکومت ہند اس سمت میں بھی کوئی کارنمایاں کرنے سے قاصر رہی (دیکھو صنعتی کمیشن کی رپورٹ صفحہ ۳۱۳ تا صفحہ ۳۱۴ روئداد مخالفت)۔

باب ۱۳

452

قاصر رہی جو قومی صنعتوں کے احیاء کے لئے سودیشی کی تحریک نے پیدا کر دیا تھا۔ یہ تحریک اپنے تعمیری پہلو کے لحاظ سے عمدہ اور مفید تحریک تھی لیکن کئی عاملین سے جن میں سرکاری سرپرستی کا نقدان کچھ کم اہم نہ تھا، اس کا زور توڑ دیا۔

۳۔ جنگ کے زمانے میں صنعتی ترقی۔

جنگ عظیم کے زمانے تک معاملات کی رواسی طرح رہی؛ جنگ عظیم مختلف حیثیتوں سے چشم کشا ثابت ہوئی اور اس نے ضروریات زندگی کے لئے بھی غیر ملکی رسد پر انحصار کرنے کے خطرے کا بہت زیادہ واضح احساس پیدا کر دیا۔ جب غنیم ملکوں سے درآمدی تجارت کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور متحدین نے بھی جنگ عظیم میں اپنی مصروفیت کی بنا پر اس تجارت سے اپنا ہاتھ قریب قریب بالکل کھینچ لیا تو ہندوستانی صنعتوں کی ترقی کے لئے بظاہر غیر معمولی مواقع پیش ہوئے۔ لیکن غیر ملکی حریفوں کی اس حقیقی طور پر کامل اگرچہ عارضی علٰحدگی سے جو موافق صورت حال رونما ہوئی اس سے کسی بڑی حد تک فائدہ اٹھانے کے لئے نہ تو حکومت تیار تھی اور نہ عوام چنانچہ ان کو یہ دیکھکر سخت اذیت اور کوفت ہوئی کہ جاپان اور ریاستہائے متحدہ امریکہ نے، جن کا حصہ اس ملک کی تجارت درآمد میں جنگ عظیم کے زمانے میں بہت بڑھ گیا تھا، ان مواقع سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ یہ دونوں ملک ہندوستانی بازار میں اپنے پیر مضبوطی سے جمانے کے قابل اس لئے ہوئے کہ وہ پہلے ہی صنعتی ترقی کی بہت بلند سطح پر پہنچ چکے تھے۔ اس کے برخلاف ہندوستان مختلف مشکلات میں پھنسا ہوا تھا، مثلاً ضروری کلیں اور ساز و سامان حاصل کرنے میں بہت دشواری تھی جن کو تیار کرنے کا طریقہ اس کو معلوم نہ تھا؛ فنی اور خصوصی ماہروں کی قلت یا کامل نقدان؛ ماہر مزدوروں، ریل کے واگنوں، ساحلی کشتیوں، کوئلے اور پتھر کے کوئلے کی کلوں اور کارخانوں وغیرہ کی قلت تھی[1]۔

علاوہ ازیں ملک کے معاشی ذرائع کو ترقی دینے کی فوجی اہمیت کو جنگ عظیم نے بہت نمایاں کر دیا۔ یہ محسوس کیا گیا کہ گو جنگ کے مشرقی میدانوں میں ہندوستان

---

[1] دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ Indian Munitions Board Industrial Hand-book صفحہ ۱۴

باب ۱۲

نے جو خدمات انجام دیں وہ قابلِ قدر تھیں لیکن اگر ہندوستان صنعتی حیثیت سے ترقی یافتہ ہوتا تو یہ خدمات اور بھی زیادہ قابلِ قدر ہوتیں۔ موجودہ زمانے میں صنعتی حیثیت سے ترقی یافتہ ملک کی پیداوار مقدار کے لحاظ سے نہیں تو نوعیت کے اعتبار سے جنگی اسلحہ و ساز و سامان کی فہرست سے اس درجہ مطابقت رکھتی ہے کہ ہندوستان کے قدرتی ذرایع کی ترقی تقریباً فوجی ضرورت کا معاملہ بن جاتی ہے[1]۔ ان تمام ملحوظات کے نتیجے کے طور پر ۱۹۱۶ء میں ہندوستانی صنعتی کمیشن کا تقرر ہندوستان کی صنعتی ترقی کے کل مسئلے کو جانچنے کے لیے عمل میں آیا۔ اس کمیشن کا کام یہ قرار دیا گیا کہ وہ صنعت و تجارت میں ہندوستانی اصل کو منفعت بخش طریقے پر لگانے کے نئے راستے بتلائے اور یہ مشورہ دے کہ حکومت کس طریقے پر صنعتی مہم جوئی کی مفید طریقے پر براہ راست ہمت افزائی کر سکتی تھی۔ اس کمیشن کی رپورٹ شایع شدہ ۱۹۱۸ء میں ہندوستان کو زیادہ خود مکتفی و خود کفیل بنانے کے مقصد سے ملک کی صنعتی ترقی کو آگے بڑھانے میں حکومت کی سرگرم امداد کی اہمیت پر خاص طور پر زور دیا گیا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کمیشن نے اس چیز کو ضروری خیال کیا کہ حکومت کو کافی انتظامی ساز و سامان مہیا کرنا چاہیے اور سائنس اور فنی معاملات کے بارے میں قابلِ اعتماد ماہرانہ مشورہ حاصل ہونا چاہیے۔ اس لحاظ سے کمیشن کی اہم سفارشوں میں سے ایک یہ تھی کہ خصوصی صنعتی و کیمیائی محکمے اور صنعتوں کی صوبہ واری مجلسیں قائم کی جائیں۔

45

۴۔ ہندوستانی مجلس اسلحہ۔

اس اثنا میں حکومت ہند نے فروری ۱۹۱۷ء میں ہندوستانی مجلس اسلحہ اس غرض سے قائم کی کہ خاص کر جنگ کی پیدا کردہ ضرورتوں کے لحاظ سے ہندوستان کے ذرایع کو ترقی دی جائے اور ان کی نگرانی کی جائے؛ ہندوستان میں جو اشیا اور مصنوعات تیار نہ ہوں ان کی طلب کو محدود اور منظم کیا جائے؛ اور ہندوستان کے صنعتی ذرایع کو جنگی اغراض کے کام میں لایا جائے تاکہ جہازی مال

[1] دیکھو مونٹے گو چیمسفورڈ رپورٹ، فقرہ ۳۳۷۔

کی مانگ میں کمی کرنے کا خاص مقصد پورا ہو۔ گو جاری کردہ ہدایات کے تحت بورڈ پر لازم تھا کہ اپنی جدوجہد کو سب سے مقدم مقصد یعنی خاصکر مشرقی جنگی میدانوں میں جنگ جاری رکھنے میں مدد دینے کے لئے وقف کر دے، لیکن مجلس مذکور مقررہ حدود کے اندر ملکی صنعتوں کو مختلف طریقوں سے ترقی دینے کے قابل ہوئی۔ مثلاً (۱) ہندوستان میں اشیا اور خام مال کی براہ راست خریداری کی گئی (۲) طریق مقدم اور فرمائشات وطن کی نگرانی کے ذریعے سے سلطنت متحدہ اور دیگر مقامات کی فرمائشوں کو ہندوستانی صناعوں کے ہاں بھیجا گیا، (۳) ان افراد اور فرموں کی امداد کی گئی جو درآمد کرنے یا باہر سے ماہروں یا ماہر مزدوروں کے حاصل کرنے کے خواہشمند تھے؛ (۴) ایسے اشخاص کے لئے معلومات اور ماہرانہ مشورے کی نشر و اشاعت کی گئی جو ہندوستان میں نئی صنعتیں قائم کرنے کے لئے تیار تھے۔ اس طریقے پر کئی صنعتوں خاص کر سوت، سن، لوہے اور فولاد کی صنعت، چرمی مصنوعات اور دیگر بے شمار صنعتوں اور حرفتوں مثلاً انجنیری کیمیاوی اشیا، معدنی ترشے، تیل، کاغذ، شیشہ، سمنٹ، چاقو، قینچی، کانٹے، زرخیزی بڑھانے والی کھاد، رنگ روغن، وارنش، آلات جراحی وغیرہ کی صنعتوں کے حق میں بہت بڑا محرک فراہم کیا گیا۔[1] مجلس اسلحہ کی طرف سے فرمائشات وطن اور صداقت نامۂ تقدم کے طریقے کے اختیار کرنے کے یہ معنی تھے کہ حکومت نے عارضی طور پر سودیشی کے اصول کو تسلیم کر لیا تھا؛ اور عدم مداخلت کی روایتی پالسی سے اس جدید انحراف نے یہ ثابت کر دیا کہ ہندوستان میں حکومت کی سرگرم مدد اور تعاون باہمی سے صنعتی ترقی کے سلسلے میں کیا کچھ کیا جا سکتا ہے۔ تمام صوبوں میں جنگ کے اختتام پر صنعتی کمیشن کی سفارش کے مطابق محکمہ جات صنعت و حرفت قائم کئے گئے اور مجالس اسلحہ کو مرکزی محکمۂ صنعت و حرفت میں ضم کر دیا گیا۔ کیمیاوی خدمات کی کمیٹی کا تقرر بھی صنعتی کمیشن کی سفارش کی بنا پر عمل میں آیا۔ لیکن بعد میں چل کر ایک کل ہند کیمیاوی خدمت کی تجویز ترک کر دی گئی، اور اس بارے میں صوبہ واری حکومتوں کو

لہ۔ دیکھو ایس، جی، پن ڈیکر کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان پر جنگ عظیم کے معاشی اثرات" صفحہ ۱۰۳ تا صفحہ ۱۰۹۔

آزادیٔ عمل کا موقع دیا گیا؛ چنانچہ جملہ صوبہ داری حکومتیں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ (بابت ۱۹۱۹ء) کے تحت صنعتی ترقی کی ذمہ دار بن گئیں۔ بلکہ اس مقام پر یہ بتا دیا جا سکتا ہے کہ صنعتی کمیشن نے جو اسکیم تیار کی تھی وہ اس خیال پر مبنی تھی کہ ابتداءً مرکزی حکومت کی طرف سے ہوگی؛ اس لئے یہ اسکیم مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کے ساتھ ٹھیک بیٹھ نہ سکی جن کا بنیادی خیال صوبہ داری خودمختاری تھا[1]۔

۵۔ زمانۂ بعد از جنگ کی صنعتی گرماگرمی۔ جنگ عظیم کے ختم ہونے کے ساتھ ہی ہر جگہ کچھ مدت کے لئے صنعتی جد و جہد اور گرم بازاری پوری تیزی کے ساتھ جاری رہی؛ جس کا باعث یہ توقع تھی کہ مصنوعات کی طلب جو جنگ کے زمانے میں پوری نہ ہوئی تھی، زور و شور کے ساتھ از سر نو رونما ہوگی؛ اور زمانۂ جنگ کے منافع کی اونچی سطح اور زر کی افراط کا سلسلہ جاری رہے گا۔ اس زمانے میں ہندوستان میں مصنوعات اور برآمد ہونے والی صنعتوں مثلاً روئی، پسن، سمنٹ، فولاد، لوہا، منگنیز، روغن دار تخم، چرم وغیرہ کی حد تک کچھ مدت تک سرسبزی اور خوشحالی کا دور دورہ رہا۔ جنگ کے زمانے میں نئی کمپنیوں کے کھلنے اور جاری ہونے کی رفتار بہت سست رہی جس کا باعث یہ تھا کہ نئی کلوں، پلانٹ، ذخائر اور فنی ماہروں کے حاصل کرنے میں دشواریاں پیش آئیں۔ لیکن جنگ کے اختتام کے بعد نئی کمپنیاں کھولنے کا باقاعدہ جنون شروع ہوا جو ۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۱ء میں خاص طور پر نمایاں رہا۔ اعلیٰ منصوبوں کا اعلان کیا گیا، اور صنعتی تمسکات کی قیمتیں اتنی بلند سطحوں پر پہنچ گئیں کہ اس سے پہلے کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اس دور میں ہندوستان میں جتنی انجمن ہائے سرمایۂ مشترک کی رجسٹری ہوئی ان کے اعداد جاذب توجہ ہیں۔ ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۵ء میں ۵۴۵۲ کمپنیاں برطانوی ہند اور دیسی ریاستوں میں درج رجسٹری ہوئیں جن کے ادا شدہ اصل کی مقدار ۷۶٫۰۸ کروڑ روپیہ تھی۔ کمپنیوں کی تعداد اور ادا شدہ اصل کی مقدار علی الترتیب ۱۹۱۸ء تا ۱۹۱۹ء میں ۹۸۷۲ اور ۱۰۶٫۶ کروڑ روپیہ؛

[1] دیکھو کلو کی کتاب محولۂ بالا باب ۳۔

باب ۱۳

۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۰ء میں ۳۶۶۸ اور ۲ر۲۳۲ کروڑ روپیہ؛ ۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۱ء میں ۸۰۰ر۴ اور ۴ر۱۶۴ کروڑ روپیہ؛ اور ۱۹۲۱ء تا ۱۹۲۲ء میں ۹۸ر۱۵ اور ۵ر۲۳۰ کروڑ روپیہ تھی۔ ۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۰ء میں جو نئی کمپنیاں درج رجسٹر ہوئیں ان کا منظورہ اصل قریب قریب ۲۷۵ کروڑ روپیہ تھا اور ۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۱ء میں درج رجسٹر شدہ کمپنیوں کے منظورہ اصل کی مقدار تقریباً ۲۶۴ کروڑ روپیہ تھی۔ بمبئی کی سوتی کپڑے کی گرنیوں کے ادا کردہ منقسوم ۱۹۱۸ء میں ادا شدہ اصل کا ۲۳ر۰ فیصد، ۱۹۱۹ء میں ۴۰ر۰ فیصد، ۱۹۲۰ء میں ۲ر۳۵ فیصد اور ۱۹۲۱ء میں ۳۰ر۰ فیصد تھے[1]۔ حصص کے بازار میں سٹے کا دور دورہ رہا۔ جیسا کہ حصص اور تمسکات کے دیسی دلالوں کی انجمن[2] نے اپنے بیان میں بمبئی کے تمسک صرافے کی تحقیقاتی کمیٹی سے نومبر ۱۹۲۲ء میں کہا: "جدید قائم شدہ کمپنیوں کے حصص کی قیمتیں غیر اصلی اور بناوٹی تھیں۔ چنانچہ ٹاٹا بنک کے حصص بڑھوتری کے ساتھ ۹۰ روپیہ پر بک رہے تھے حالانکہ ہر حصے پر صرف ۱۵ روپیہ ادا کیے گئے تھے اور کوئی سرمایہ محفوظ موجود نہ تھا۔ ٹاٹا آئل ملز کے حصے کی قیمت عرفی ۱۰۰ تھی لیکن گرنی کو چلانے کے لئے کلوں کی تنصیب سے قبل ہی اس کی قیمت فروخت بڑھوتری کے ساتھ ۵۷۵ روپیہ ہو گئی تھی۔ عوام کے اس جوش و جنون کی بنا پر کہ وہ ہفتہ عشرہ ہی میں بہت بڑا منافع حاصل کرنا چاہتے تھے تصور میں آنے والی ہر غرض کے لئے بے شمار نئی نئی کمپنیاں برساتی مینڈکوں کی طرح وجود میں آئیں[3]۔" حکومت کی زری پالیسی ہی روپے کی قدر مبادلہ میں ہیجانی تغیرات کا باعث تھی، اور اسی نے گرم بازاری اور اس کے بعد سرد بازاری کو بھی سخت بنا دیا تھا۔ روپے کی قدر بحوالہ اسٹرلنگ کے سریع اضافے نے خاص کر ۱۹۱۹ء میں اور ۱۹۲۰ء کے نصف اول میں درآمد کے حق میں بہت بڑے محرک کا کام کیا، لیکن ہندوستانی برآمدی اشیاء کی شدید بیرونی طلب کے باعث برآمدی تجارت

---

[1] دیکھو مجلس صنعت پارچہ بافی کی رپورٹ، جدول (۸۱)۔

[2] (Native Share and Stock Broker's Association).

[3] دیکھو بمبئی کے تمسک کے صرافے کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ صفحہ ۱۵۔

صردست بہت زیادہ متاثر نہیں ہوئی۔

۶۔ تجارتی کساد بازاری

لیکن گرم بازاری چند روزہ تھی، اگرچہ اس کی مدت مختلف صنعتوں میں مختلف تھی۔ تقریباً ۱۹۲۰ء کے وسط میں حالات کا رخ بدلا اور معاشی کساد بازاری کا طویل دور شروع ہوا۔ اکثر دوسرے ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی تجارتی دور کی عام علامتیں ظاہر ہوئیں۔ جنگ عظیم کی وجہ سے جو ناتوانی پیدا ہوئی اور انگلستان اور کئی دوسرے ملکوں میں زر کی جو تفریط رونما ہوئی اُس کے باعث استوار طلب اور اعلیٰ قیمتوں کی توقعات پوری نہ ہوئیں۔ علاوہ ازیں ۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۱ء میں روپے کی قدر مبادلہ میں یکایک بڑی کمی ہو جانے کی وجہ سے درآمد کرنے والے پریشانی اور مصیبت میں مبتلا ہو گئے، اس لئے کہ ان کو تو کامل امید تھی کہ شرح مبادلہ اعلیٰ رہے گی؛ اور دوسری طرف برآمد کرنے والوں نے شرح مبادلہ کی سابقہ اعلیٰ سطح کی پوری قوت کو اب محسوس کیا۔ پرانی صنعتوں کی توسیع اور نئی صنعتوں کا قیام جن کا خاکہ قیمتوں کی زیادتی اور گرما گرمی کے زمانے میں تیار کیا گیا تھا اب بازار کے لئے بار گراں ثابت ہونے لگا اور اس نے کساد بازاری کو اور بھی سخت کر دیا۔ کئی فرم اور کمپنیاں بند ہو گئیں اور جو تباہی سے بچ رہیں ان کے آثار بھی کچھ بہت اچھے نہ تھے۔ اس کے نتیجے کے طور پر ۱۹۲۴ء سے روپے کی قدر مبادلہ میں جو اضافہ ہوا اس نے تجارتی کساد بازاری کی مدت کو اور بھی بڑھا دیا اور ہندوستانی بازاروں میں غیر ملکی مسابقت کی قوت کو ایسے زمانے میں زیادہ کر دیا جب کہ اُس کو غیر ممالک کے سکوں کی کم قدری کی وجہ سے عمدہ موقع حاصل تھا۔ چنانچہ ٹیرف بورڈ کو آہنی و فولادی اور سوتی پارچہ بافی کی صنعتوں کی تائید کے بارے میں سفارشیں پیش کرتے وقت اس شدید مسابقت اور رکاوٹ کو ملحوظ رکھنے پر مجبور ہونا پڑا؛ اس لئے کہ ان صنعتوں کو قیمتوں کے گر جانے کی وجہ سے اب نقصانات عظیم برداشت کرنے پڑ رہے تھے، یا ادا شدہ اصل پر ۱۹۲۳ء میں ۴ء۹ فیصد اور ۱۹۲۵ء اور ۱۹۲۶ء میں ۲ء۲ فیصد جیسے حقیر مقسوموں پر قناعت کرنی پڑ رہی تھی۔ ان حالات میں تمسک کے صرافے انتہائی طور پر غیر ثبات پذیر ہو گئے، اور ان کی قیمتوں

میں نمایاں کمی کا میلان ظاہر ہوا۔ نیویارک کے بحران (۱۹۲۹ء) اور عالمی قیمتوں کے اچانک اتار نے ہندوستان میں کساد بازاری کو اور بھی زیادہ سخت کر دیا۔[1] چونکہ ہندوستان زیادہ تر زرعی ملک ہے اس لئے اس کو برطانیۂ عظمیٰ جیسے صنعتی ملکوں کے مقابلے میں زیادہ مصیبت جھیلنی پڑی۔ ۱۹۳۴ء کے بعد سے صنعت میں کسی حد تک بحالی رونما ہوئی ہے۔

۷۔ تامینی محصول کا نفاذ۔ لیکن جنگ عظیم کے زمانے میں ہندوستانی صنعتوں کو جو فروغ حاصل ہوا وہ بلحاظ نوعیت بڑی حد تک لازمی طور پر عارضی تھا، چنانچہ جب حکومت کی اغراض جنگ کی خریداریاں موقوف ہوگئیں اور نومبر ۱۹۱۸ء میں مہلت جنگ کے بعد دوسرے ملکوں سے معمولی تجارتی تعلقات از سر نو قائم ہو گئے تو یہ عارضی ترقی رک گئی۔ اس طرح ہندوستانی مصنوعات پر غیر ملکی مسابقت کی زد دوبارہ پوری قوت کے ساتھ پڑی، اس لئے کہ اول تو تامینی محصول کی شکل میں کوئی روک نہ تھی اور دوسرے یہ کہ جنگ عظیم کے زمانے میں مالی دباؤ کے تحت جو زائد محصول درآمد باغراض آمدنی عائد کیا گیا وہ بھی اب موجود نہ تھا۔ ان حالات میں کروڑگیری کی پالیسی کی نظر ثانی کے دیرینہ مطالبے نے اصرار اور تقاضے کی شکل اختیار کر لی۔ صنعتی کمیشن کے موضوع تحقیق سے کروڑگیری کی پالیسی کی بحث کو عوام کی خواہشوں کے بڑی حد تک خلاف، اس بنیاد پر خارج کر دیا گیا تھا کہ اس نازک موقع پر یہ مناسب نہ تھا کہ ہندوستان کی مالی پالیسی کی ترمیم کے مسئلے کو اٹھایا جائے۔ مونٹے گو چیمسفورڈ رپورٹ کے ممتاز مصنف اس خیال کی تائید میں تھے کہ ایسی صورت میں کہ ہندوستان میں آزاد تجارت کے نظریے کا کوئی بھی حامی نہ تھا، معقولیت اور انصاف کے ملحوظات کا اقتضا یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو اپنی کروڑگیری کی پالیسی کے بارے میں فیصلہ کرنے کی کامل آزادی حاصل ہونی چاہئے، اور یہ کہ حکومت کو اس بات کا کوئی حق حاصل نہ تھا کہ

---

[1] موجودہ عالمگیر معاشی کساد بازاری کے اسباب اور ہندوستان پر اس کے اثر کے اسباب کی بحث کے لئے دیکھو باب متعلقہ "تجارت ہند" کتاب ہذا کی جلد دوم میں۔

باب ۱۳

تجارت آزاد کے بارے میں اپنے خیالات ان سے زبردستی منوائے چنانچہ ان کی اسی تائید نے ہندوستان میں تامینی محصول کی حامی جماعت کو بہت تقویت پہنچائی۔ اسی انداز کی اور مساوی طور پر اہم وہ سفارش بھی تھی جو مشترکہ منتخب کمیٹی نے گورنمنٹ آف انڈیا بل (۱۹۱۹ء) کے بارے میں پیش کی تھی کہ مالی آزادی کے حق میں معمول قائم کیا جائے۔ چنانچہ اس سفارش کو بعد میں چلکر برطانوی پارلیمنٹ نے منظور کر لیا۔
جنگ عظیم نے اس مسئلے کو بہت نمایاں کر دیا تھا کہ برطانوی امپائر کے سامان کے حق میں ترجیحی طریق اختیار کرنے اور اس کی بنیاد پر امپائر کے مختلف اجزا کے درمیان مالی تعلقات کو منظم کرنے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ جب اس مسئلے پر غور شروع ہوا تو ہندوستان اور دوسرے ممالک کے درمیان محصول کے تعلقات کا عام مسئلہ از سر نو شد و مد کے ساتھ زیر بحث آیا۔ حکومت ہند نے فروری ۱۹۲۰ء میں مرکزی مجلس قانون ساز کی ایک کمیٹی مقرر کی تاکہ وہ یہ تحقیق کرے کہ آیا شاہی ترجیح قابل عمل اور معقول تھی یا نہیں اور ہندوستان کی آئندہ مالیاتی پالیسی کے بارے میں سفارش پیش کرے، لیکن کمیٹی مذکور نے موخرالذکر مسئلے کے بارے میں معین اور قطعی سفارشیں پیش کرنے سے اپنے آپ کو قاصر بتلایا اور یہ مشورہ دیا کہ اس کے لئے ایک خاص تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا جائے۔ اس کی بنا پر بالآخر اکتوبر ۱۹۲۱ء میں سر ابراہیم رحمت اللہ کی صدارت میں ایک مالی کمیشن (Fiscal commission) کا تقرر ہوا۔ کمیشن مذکور نے یہ سفارش کی کہ خصوصی ماہروں کی ایک جماعت کے زیر نگرانی جو ٹیرف بورڈ (مجلس کروڑگیری) کے نام سے موسوم ہو امتیازی تامین کی پالیسی پر عمل کیا جائے؛ اس سفارش کو حکومت نے ۱۹۲۳ء کے اوائل میں منظور کر لیا۔ چنانچہ اس پالیسی کے مطابق ایک ٹیرف بورڈ قائم کیا گیا تاکہ مختلف صنعتوں کی تامین کے مطالبات کو جانچے[1]۔
صنعتی ترقی سے حکومت کی بے اعتنائی ایک مدت دراز تک ملک کی معاشی آرزوؤں اور تمناؤں کے حق میں بظاہر وہی کام کرتی رہی ہے جو بودوں کے حق میں

457

[1] دیکھو جلد دوم کتاب ہذا باب ۲۔

باب ۱۳

پالا کرتا ہے۔ لیکن اب وہ قطعی طور پر ترک کر دی گئی ہے اور حکومت صنعتی میدان میں آزاد تجارت اور عدم مداخلت کے غیر نفع رساں اصول کو دہرانے کے بجائے صنعتی ترقی کو مستحکم بنیاد پر آگے بڑھانے کے لئے سعی بلیغ کر رہی ہے۔ لیکن غیر سرکاری رائے اس سے زیادہ جدوجہد پر زور دے رہی ہے جتنی کہ حکومت کی جانب سے عمل میں آ رہی ہے؛ تاکہ صنعتی ترقی کی رفتار اور زیادہ تیز ہو۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر حکومت کی طرف سے مناسب انتظام و نگرانی ہو تو نسبتاً قلیل مدت میں صنعت میں معقول توسیع و ترقی ہو گی۔ ہمیں مسٹر کلورٹ کے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے کہ "ہندوستانی صنعتوں کو مختصر مدت تک سرکاری طور پر مالی امداد دیکر یورپ کی ۲ سو سالہ صنعتی ترقی کی سطح تک پہنچانے کی کوشش کا نتیجہ ناکامی اور مایوسی کے سوا اور کیا نکل سکتا ہے"[1] چنانچہ انیسویں صدی میں جرمنی اور جاپان کی سریع صنعتی ترقی' اس قسم کے استدلال کو غلط ثابت کرتی ہے۔ اس کے مماثل دلیل سیاسیات کے میدان میں بھی عام طور پر پیش کی جاتی ہے' اور کہا جاتا ہے' کہ انگلستان کو جس چیز کے حاصل کرنے کے لئے دستوری ارتقا کے ایک ہزار برس لگے' ہندوستان میں ایک یا دو نسل میں حاصل نہیں کی جا سکتی۔ لیکن دوسرے ملکوں کے تجربے سے یقیناً فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے' اور اس کی بنا پر سیاسیات کی طرح معاشیات میں بھی ارتقا کی مدت میں کمی کی جا سکتی ہے۔

۴۔ ہندوستان کی صنعتی پسماندگی

یہ امر کہ صنعتوں کی حد تک ہندوستان کی موجودہ حیثیت و حالت بہت ہی پسماندہ ہے محتاج تشریح نہیں ہے۔ صنعتوں کی ترقی محدود ہے' چنانچہ پہلی بات تو یہ کہ ترقی ناہموار ہے' اس لئے کہ وہ صرف ان صنعتوں تک محدود ہے جن سے نفع بآسانی اور بلا خوف و خطر مل سکتا ہے۔ عام طور پر تجارت ہی کو نئی صنعتی مہموں پر ترجیح دی گئی ہے' اس لئے کہ وہ مشغل اصل کا منفعت بخش

---

[1] دیکھو ایک کتاب موسوم بہ (Wealth and welfare of the Punjab
صفحہ ۱۷۶۔

باب ۱۳

وسیلہ ہے۔ دوسرے یہ کہ جیسا کہ مالی کمیشن تبلاتا ہے، ترقی ملک کی وسعت، آبادی اور اس کے قدرتی ذرایع کے نمایاں شان نہیں ہوئی ہے[1] ملک میں جو صنعتیں مستحکم طریقے پر قائم ہیں مثلاً پارچہ بافی کی صنعتیں، تو سازوسامان، دنداٹرا اور کلوں وغیرہ کی رسد کی حد تک ان کا سہارا بھی قریب قریب پوری طرح غیر ممالک سے درآمد ہے۔ صنعتی حیثیت سے ترقی یافتہ ملکوں کی اس خواہش کی بنا پر کہ وہ وسیع ہندوستانی بازار پر تسلط حاصل کرنا چاہتے تھے نیز آزاد تجارت کی پالیسی کے باعث مذکورہ بالا سامان کی رسد سہولت کے ساتھ درآمد کی جا سکتی تھی، اور اسی سہولت نے ان صنعتوں کے قائم کرنے میں بہت بڑی دشواریاں پیدا کر دیں چونکہ ہندوستان میں کوئی محکمہ خریداری اشیا موجود نہ تھا۔ اس لئے حکومت تو یہ پالیسی اختیار کرنے کی ہمت افزائی ہوئی کہ مطلوبہ متفرق اشیا کے لئے "دفتر ہند" میں فرمائشیں روانہ کرے؛ لیکن اس پالیسی سے صورت حال کے سدھرنے کی کوئی امید نہ تھی۔ اس طرح ایک استوار صنعتی تنظیم کے لئے کل سازی اور کیمیاوی صنعتوں کی شکل میں جو اساسی ساز و سامان درکار تھا اس سے ہندوستان نے خود کو محروم پایا۔ آہن، فولاد، اور انجینیری کی صنعتیں بہت ہی گھٹیا پیمانے پر موجود تھیں۔ ہندوستان یہ فخر بھی نہ کر سکتا تھا" وہ کیل یا پیچ بنانے کی کل بنا سکتا تھا" گو وہ ریل کا انجن یا جہازی انجن تیار کر سکتا تھا بہ شرطیکہ اس کے مطلوبہ اجزا کا بیشتر حصہ غیر ممالک سے حاصل کر لیا جاتا[2] صنعتی اہمیت کے ترشول یا تیزاب اور الکلاہول کی تیاری کی کیمیائی صنعتیں قریب قریب مفقود تھیں اور اس طرح کاغذ، دیاسلائی، نیل، دھاگو اشیا، رنگ اور بنے ہوئے کپڑے جیسی ویسی مصنوعات کو غیر ملکی کیمیائی اشیا پر مجبوراً انحصار کرنا پڑا اور سخت مشکلات برداشت کرنی پڑیں۔ موجودہ حالت جنگ عظیم کے پیشتر کے زمانے کی حالت سے کسی قدر بہتر ہے لیکن کوئی بڑا نمایاں فرق نہیں ہوا ہے۔ صنعتی حیثیت سے ایک اور بڑی کمی یہ ہے کہ ہندوستان میں

[1] دیکھو مالی کمیشن کی رپورٹ، فقرہ (۳۱)۔
[2] دیکھو صنعتی کمیشن کی رپورٹ، فقرہ (۱۰۴)۔

صنعتی تربیت کی سہولتوں کی غیر اطمینان بخش نوعیت کے باعث فورمینوں، انجینیروں، فنی اور کیمیائی ماہروں کی قلت ہے، اور اس کے نتیجے کے طور پر غیر ملکی ہنرمند مزدوروں، فن دانوں اور خصوصی ماہروں پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔

۹۔ امکانی قوتیں اس طرح مختلف سمتوں میں کمی ہے جس کا پورا ہونا ضروری ہے، اور مذکورۂ بالا بے شمار مشکلات اور خرابیوں کو رفع کرنے کی غرض سے سخت محنت و کوشش کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ کام غیر ممکن نہیں ہے، خاص کر اگر حکومت آگے قدم بڑھائے اور پہلے سے زیادہ حوصلہ مندی اور ہمت سے کام لے۔ ہندوستان، جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، عظیم الشان قدرتی ذرایع یعنی نباتاتی، حیوانی اور معدنی دولت، کا مالک ہے؛ جیسا کہ اس کے جنگ عظیم میں حصہ لینے اور مینگنیز، ٹنگسٹن، ابرق، سن، کھوپرہ، لاکھ وغیرہ کی سربراہی کرنے سے ثابت ہوا۔ اس کی قوت کے ذرایع کا ذکر کیا جا چکا ہے اور ہم بیان کر چکے ہیں کہ اگرچہ قوت محرکہ کی پیدائش کی غرض سے کوئلے، جلانے کی لکڑی یا تیل کی حد تک اس کی حیثیت ویسی اطمینان بخش نہیں ہے جیسی کہ بعض اوقات خیال کی جاتی ہے؛

پھر بھی اس کے بڑے دریاؤں اور دریائی خطوں سے استفادہ کرنے اور صنعتی اغراض میں ان سے کام لینے کے بہت بڑے امکانات موجود ہیں۔ اس کے جنگلات اس کی بہت بڑی دولت ہیں؛ اور اگر جدید وسائل نقل و حمل کو ترقی دی جائے اور جنگلات کی پیداوار کی تحقیق کی جائے، نیز اس کے ساتھ ساتھ سرمایہ زیادہ مقدار میں مشغول کیا جائے تو ممکن ہے کہ صنعتوں کے لئے بہت بڑا محرک پیدا ہو جائے، جو ملک کے جنگلوں کی کثیر اور انواع و اقسام کی پیداوار سے کام لیں گی۔ انسانی قوت کی حد تک یہ صحیح ہے کہ یورپ کے مزدور کے مقابلے میں ہندوستانی مزدور کارکردگی میں گھٹیا ہے، مسلسل اور جی لگا کر محنت نہیں کرتا، لیکن مزدوروں کی تعداد کثیر ہے اور وہ یہ صلاحیت رکھتے ہیں کہ نظری و عملی فنی تربیت کے مناسب نظام کے تحت اور صنعتی رقبوں میں انتظام سکونت کی اصلاح، رفاہی کام اور مزدور سبھاؤں کی تنظیم وغیرہ کے ذریعے سے ان کی کارکردگی اور خوبی کار میں اصلاح و ترقی عمل میں لائی جائے۔ رہی قابل منتظموں کی قلت تو نیقوں نیچ کلورٹ مستقبل کا منتظم بہترین تربیت گرنی ہو، کے اندر اور مزدوروں میں رہ کر

باب ۱۲

جن کا وہ منتظم ہونے والا ہو حاصل کر سکتا ہے۔ یہ فن صنعتی فضا ہی میں سیکھا جا سکتا ہے۔[لہ]
چونکہ موجودہ زمانے میں ایسا ماحول اور ایسی فضا کسی بڑے پیمانے پر موجود نہیں ہے،
اس لئے ہندوستان کو جاپان کی مثال کی تقلید کرنی پڑے گی اور غیر ملکی منتظموں
کو حسب ضرورت درآمد کرنا پڑے گا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم یہ کہ ملک کے نوجوانوں
کو غیر ممالک میں روانہ کرنا پڑے گا تاکہ وہ ضروری تجربہ اور تربیت حاصل کریں۔
وہ وقت یقیناً آئے گا جب کہ مطلوبہ ماحول ملک میں پیدا ہو جائے گا اور ان عارضی
تدابیر کے اختیار کرنے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ یہ بات زمانہ دراز سے مشہور ہے کہ
ہندوستانی اصل بہت شرمیلا ہے لیکن پورے اعتماد کے ساتھ یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اگر
اس امر کا مناسب و معقول اطمینان و یقین ہو کہ اس کو محفوظ اور نفع بخش طریقے پر مشغول
کیا جا سکتا ہے تو اس کا یہ حجاب بتدریج کم ہوتا جائے گا۔ جنگ کے زمانے میں اور اس
کے بعد ہندوستانی زر کے بازار میں حکومت کے قرضے کے کاروبار کو نمایاں کامیابی
ہوئی ہے، اور زمانہ بعد از جنگ میں انجمن ہائے سرمایہ مشترک کی بہت بڑی تعداد کا
کامیاب افتتاح ہوا، نیز حال ہی میں یہ بات معلوم ہوئی کہ اسٹرلنگ کے تمسکات
میں ہندوستانی اصل کثیر مقدار میں مشغول ہے؛ یہ سب اس امر کے مزید ثبوت
ہیں کہ ہندوستانی اصل کا شرمیلا پن تیزی کے ساتھ کافور ہو رہا ہے۔ ملک میں
بنک کاری کے انتظام کی اصلاح و ترقی و توسیع داخلی بازار کی موجودگی کا یقین اور
اور ہندوستان کے صنعتی احیاء کے متعلق زمانہ بعد از جنگ کا جوش و خروش؛ یہ سب چیزیں
عوام کی پس انداز کردہ رقوم کو جدید صنعتوں میں نفع بخش طریقے پر مشغول کرنے میں
مزید مدد دیں گی۔ ہندوستانی ریلوے کمپنیوں کی امتیازی شرحوں کی پالیسی کو صنعتی کمیشن
اور مالی کمیشن دونوں نے ایک خرابی تسلیم کیا ہے اور اس کے متعلق ہندوستان کے
صنعتی و تجارتی طبقے کو دیرینہ شکایت رہی ہے؛ لیکن ریلوے کے بڑے بڑے نظامات
کی بتدریج سرکاری نگرانی و انتظام میں منتقل ہونے اور کرایہ کی جانچ کی کمیٹی قائم

460

لہ دیکھو ان کی تصنیف موسوم بہ (Weatfi and welfare of the Punjab)
صفحہ ۱۶۸۔

باب ۱۳

ہو جانے کی وجہ سے یہ توقع ہے کہ یہ شکایت رفع ہو جائے گی اور ریلوں کا انتظام صنعتوں کی ترقی میں زیادہ معین و ہمدرد بن جائے گا۔ موجودہ زمانے میں اندرون ملک سڑکوں کے ذریعے سے آمدورفت کا انتظام خاص کر دیہی رقبوں میں نہایت ناقص ہے، لیکن اس کی اصلاح کا مسئلہ زیر غور ہے اور اس کو حل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ چنانچہ بعض صوبوں میں سڑک بورڈ قائم کئے گئے ہیں اور انڈین روڈ ڈیولپمنٹ کمیٹی (۱۹۲۸ء) نے بعض مفید سفارشیں پیش کیں جن کو حکومت ہند نے مارچ ۱۹۲۹ء میں منظور کر لیا چنانچہ یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ اس کی وجہ سے مستقبل قریب میں سڑکوں کی تعمیر کا کام نہایت شد و مد کے ساتھ شروع ہو جائے گا۔[1] دستوری اصلاحوں نے حکومت کے طرز عمل اور روش میں ناگزیر طریقے پر تبدیلی پیدا کردی ہے، جس کی بنا پر جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں حکومت صنعت کی ترقی کی رفتار کو تیز کرنے میں زیادہ سے زیادہ سرگرمی کے ساتھ مدد دے گی۔

۱۰۔ صنعتی ترقی کے فوائد[2]

ہندوستان کو صنعتی ترقی سے جو فوائد حاصل ہوں گے وہ اس قدر بدیہی ہیں کہ انھیں باقاعدہ طور پر بیان کرنے کی بہ مشکل ضرورت ہے۔ ہمیں ہندوستان کی کثیر آبادی کے انتہائی افلاس اور ہمارے معاشی نظام کی متعدد کمزوریوں پر جو اس افلاس کا باعث ہیں تبصرہ کرنے کا کئی دفعہ موقع ملا۔

(۱) ان کمزوریوں میں سے ایک یہ ہے کہ عوام کی پیداآور جدوجہد صرف ایک ہی پیشے یعنی زراعت پر حد سے زیادہ مرتکز ہے۔ اس صورت حال کی اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ صنعتوں کو کافی وشافی ترقی دی جائے۔ اس کی بدولت آبادی مختلف قسم کے پیشوں میں زیادہ مساویانہ طریقے پر تقسیم ہو جائے گی اور قومی معیشت کی بنیاد زیادہ ثبات پذیر اور مستحکم ہوگی۔ موجودہ زمانے میں زراعت میں جو زائد از ضرورت آبادی مصروف ہے اس کے کچھ جزو کو ادھر سے ہٹا کر صنعتی ترقی

[1] دیکھو کتاب ہذا جلد دوم باب ۵۔
[2] دیکھو مالی کمیشن کی رپورٹ باب دوم۔

قحط کی ہلاکت آفرینی کو موجودہ زمانے کے مقابلے میں بہت گھٹا دے گی لے

(۲) دوسرے یہ کہ صنعتوں کے قائم ہونے سے قومی مقسوم میں اضافہ ہوگا، اور عوام اس قابل ہو جائیں گے کہ اپنے معیار زندگی کو بڑھائیں؛ معیار زندگی کے بڑھ جانے سے ان کی کارکردگی میں اضافہ ہوگا اور اس طرح ان کی پیداآور قابلیت کو ترقی ہوگی۔ اس طریقے پر عمل اور ردعمل کا ایک مفید دور و تسلسل قائم ہو جائے گا۔

(۳) تیسرے یہ کہ صنعتی ترقی، قومی مقسوم کے اضافے کے ذریعے سے عوام کی محصول ادا کرنے کی قابلیت میں اضافہ کر دے گی؛ اور حکومت کو اس قابل بنائے گی کہ وہ قومی احیاء کی ان تجاویز کی مالی امداد کرے جو رقم کے ٹوٹے کے باعث آج کل معرض التوا میں پڑی ہوئی ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ صنعتیں متنوع ہوں تو محصول کا طریق موجودہ زمانے کے مقابلے میں بہت زیادہ لچکدار بن جائے گا؛ اس لئے کہ مالگزاری جیسے زرعی محصولوں میں فوری توسیع کی صلاحیت نہیں ہے، لیکن دوسرے ذرایع پر عاید کردہ محصول، جس میں سب سے نمایاں مثال انکم ٹکس کی ہے، بڑی حد تک خودبخود وصول ہو جاتے ہیں اور سرکاری خزانوں میں زر کی کثیر مقدار زیادہ وقت کے بغیر جمع ہو جاتی ہے۔

(۴) صنعت کی توسیع و ترقی کا ایک اور اہم فائدہ یہ ہے کہ اس کا رد عمل قوم کے خصائل اور کردار پر نہایت مفید پڑتا ہے؛ اور وہ مختلف میلانات طبع اور قابلیتوں کے لئے نہایت وسیع میدان مہیا کرتی ہے۔ وہ ذہنی و عقلی جمود اور

لے۔ مالی کمیشن یہ بتلاتا ہے کہ صنعتی ترقی، قحط یا بارش کی عام قلت کے اثرات کو براہ راست زائل نہیں کر سکتی؛ اس لئے کہ قحط اس مفہوم میں صنعتوں میں کساد بازاری اور قوت خرید کی عام کمی پیدا کرتا ہے۔ امساک باراں کی وجہ سے زراعت سے جو محنت ہٹ کر بیکار ہو جاتی ہے اس کو صنعتیں جذب نہیں کر سکیں گی؛ اس لئے کہ وہ خود بڑی حد تک طلب کی کمی کا شکار ہوں گی۔ لیکن اس کی بنا پر یہ استدلال غلط ثابت نہیں ہوتا کہ صنعتی ترقی، خشک سالی کے براہ راست اثر کو اس وجہ سے بڑی حد تک زائل کر دے گی کہ زراعت میں معمولاً اتنی زیادہ آبادی مصروف نہ رہے گی جتنی کہ اب ہے۔

قدامت پسندی کے حق میں جو زیادہ تر زرعی ملک کی امتیازی خصوصیت ہوتی ہے، تریاق کا کام کرتی ہے؛ یہاں تک کہ زراعت خود صنعت کے نہج پر منظم ہو جاتی ہے جیسا کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ اور ڈنمارک میں ہوا ہے۔ عام طور پر دیکھا جائے تو صنعتی آبادی ذہنی و عقلی اعتبار سے زیادہ چست و چالاک ہوتی ہے؛ چنانچہ اسی وجہ سے شہر ہمیشہ تہذیب و شائستگی کا مرکز و محور رہے ہیں جیسا کہ میٹ لینڈ نے کہا ہے " جس وقت انسان سخت کسا ہوا ہو تو خیالات کی آمد ہوتی ہے"[1] موجودہ زمانے کی ضرورت سے زیادہ ادبی تعلیم میں عملی معاملات کو پوری طرح سمجھنے اور ان پر عبور حاصل کرنے کی حد تک جو کمی ہے اس کو صنعتی تربیت موثر طریقے پر پورا کر دے گی؛ اور لوگوں کو عام طور پر اس قابل بنا دے گی کہ ان نئی ذمہ داریوں کو جو سیاسی ترقی کی آیندہ منزل ان پر لازماً عائد کرے گی، اپنے دوش پر بہتر طریقے پر لیں۔

(۵) ملک کی صنعتی ترقی کی بدولت متوسط طبقے کی بے روزگاری کا سنگین مسئلہ بھی جو آج کل ہندوستان میں تکلیف دہ طریقے پر بڑے پیمانے پر موجود ہے بآسانی حل ہو سکے گا۔ نوجوانوں کو سرکاری ملازمت یا قانون اور طب وغیرہ جیسے گنجان پیشوں پر خاص طور پر انحصار کرنے کی ضرورت نہ رہے گی۔

(۶) ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ معاشی حیثیت سے زیادہ خود کفیل بننے کی فوجی اہمیت خود ہندوستان اور سلطنت برطانیہ کی حد تک کتنی عظیم ہے۔ اگر ہندوستان صنعتی ملک بن جائے اور اس کے مادی ذرایع سے مناسب طریقے پر فائدہ حاصل کیا جائے تو شاہی ترجیح سے قطع نظر کرتے ہوئے جس میں ہندوستان کا داخل ہونا کسی حال مناسب نہیں وہ نہ صرف معاشی حیثیت سے بلکہ سیاسی نقطۂ نظر سے بھی سلطنت برطانیہ کا زبردست پشت و پناہ بن جائے گا۔

(۷) علاوہ ازیں زر کا اندوختہ کرنے کی غیر نفع بخش عادت اگرچہ عام طور پر مبالغے کے ساتھ بیان کی جاتی ہے لیکن یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ وہ اس کے باوجود

[1] اقتباس از تصنیف کارسانڈرس صفحہ ۲۲۵ -

باب ۱۳

موجود ہے۔ ممکن ہے کہ شغل اصل کے میدان کی توسیع کی بدولت اور کثیر منافع حاصل کرنے کی توقع کے ساتھ جو صنعت کی توسیع و ترقی سے پیدا ہوگی یہ عادت ترک کردی جائے۔ جدید صنعت کے سرمایۂ مشترک کے نظام میں انفرادی طور پر پس انداز کردہ چھوٹی چھوٹی رقموں سے کام لیا جاتا ہے جو اس نظام کی عدم موجودگی میں بے کار پڑی رہتیں ایک اور قابل لحاظ امر یہ ہے کہ صنعتی کاروبار میں جو دولت حاصل ہوتی ہے اس کو اس سے زیادہ سرعت کے ساتھ بطور اصل دوبارہ مشغول کیا جاسکتا ہے جتنا کہ زرعی کاروبار کے منافع کی شکل میں حاصل کی ہوئی حاصل رقموں کو۔

(۸) آخر میں یہ کہ صنعت کی توسیع و ترقی قومی دولت کی پیداوار کو بڑھا کر عام طور پر ملک کے باشندوں اور خاص کر عوام کے اس طبقے کے مادی ذرایع میں اضافہ کرے گی جو صنعتی پیدائش میں مصروف ہے؛ اس لئے کہ صنعت میں بمقابلۂ زراعت اجرت اور منافع دونوں عام طور پر زیادہ ہوتے ہیں۔

۱۱۔ زراعت پر صنعت کا رد عمل

صنعتی توسیع و ترقی کا اثر زراعت پر قریب قریب پوری طرح مفید ہوگا۔ ہندوستانی زراعت کی انحطاط پذیری کا ایک سبب جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اصل کی کمی ہے۔ صنعتی منافع کی جمع شدہ رقموں کو زراعت میں مصروف کر کے یہ کمی پوری کی جاسکتی ہے۔ اس سلسلے میں یہ یاد دلانا مناسب ہوگا کہ صنعتی انقلاب کے زمانے میں انگلستان کی زراعت کی عظیم ترقی کو مالی امداد اسی منافع سے ملی جو بڑے بڑے تاجروں اور صناعوں نے حاصل کیا تھا۔ زمین پر اصل کو مصروف کرنے کا جو قومی میلان ہے وہ یقیناً کامیاب کاروباری منافع کے بیشتر حصے کو زراعت میں اسی طرح منتقل کرائے گا جس طرح انگلستان میں ہوا؛ اس لئے کہ زمین کی ملکیت سے عظیم سیاسی و معاشری اہمیت و حیثیت وابستہ کی جاتی ہے۔

زرعی اجرتوں پر اس کا یہ اثر پڑے گا کہ وہ بڑھ جائیں گی، خاص کر ان علاقوں میں جو صنعتی جد و جہد کے مرکزوں سے قریب ہیں۔ صنعتی ترقی کے نتائج میں سے ایک یہ ہوگا کہ شہروں اور بڑے قصبات کی تعداد بڑھ جائے گی؛ اور ہم پہلے یہ بیان کر چکے ہیں کہ شہری علاقوں کی قربت دیہی آبادی کو حیات تازہ بخشنے میں

بہت بڑا اثر ڈالے گی اور اس کو زیادہ ترقی پذیر بنائے گی۔ علاوہ ازیں صنعت کے لئے مطلوبہ اشیائے خام مہیا کرنے کی حیثیت سے زراعت کو مزید محرک ملے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ توسیع پذیر صنعتوں کی روزافزوں مانگ کو پورا کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ زرعی پیداوار تیار کی جائے گی۔

بعض اوقات یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ صنعتوں کی ترقی دیہی علاقوں کی آبادی کے ایک جزو کو وہاں سے ہٹا کر خوراک کی رسد کی کمی کا موجب ہوگی۔ لیکن اس امر کا لحاظ کرتے ہوئے کہ موجودہ زمانے میں صنعتی مزدوروں کی تعداد زرعی مزدوروں کی تعداد کے ایک فی صد سے بہت زیادہ نہیں ہے، اس کا قرینہ نہیں معلوم ہوتا کہ صنعتوں کی بہت سریع ترقی کے ساتھ بھی آبادی کی یہ تقسیم زراعت کے خلاف اور صنعت کی موافقت میں بہت زیادہ بدل جائے گی۔ دوسرے یہ کہ ۱۸۸۰ء کے قحط کمیشن کے مقرر ہونے کے بعد سے یہ خیال بہت عام طور پر پھیلا ہوا ہے کہ زمین پر مکمل طریقے پر کاشت کرنے کے لئے در اصل جتنی آبادی مطلوب ہے اس سے زیادہ تعداد اس وقت کام کر رہی ہے؛ اور اس لحاظ سے زائد آبادی کو زمین سے ہٹا لینے سے اشیائے خوردنی کی حقیقی رسد پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔ آخر میں یہ کہ ہم زراعت میں اصلاح و ترقی کے ایسے دور کے متوقع ہیں جو تھوڑی آبادی کو نہ صرف موجودہ پیمانے پر پیدائش کو برقرار رکھنے کے قابل بنائے گا؛ بلکہ جدید ترین طریقوں کو اختیار کر کے اس پیدائش میں اضافہ کرنے کی صلاحیت بھی پیدا کرے گا۔ ہمیں یہ بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ اشیائے خورد و نوش کی رسد کی کمی ایک حد تک اپنا آپ علاج کر لے گی؛ رسد کی کمی کے معنی یہ ہیں قیمتوں میں زیادتی ہو جائے اور قیمتوں کی زیادتی پیدائش کے حق میں محرک کا کام کرے گی۔ اس لحاظ سے بعض اوقات جو خوف ظاہر کیا جاتا ہے کہ صنعتی توسیع و ترقی کے نتیجے کے طور پر زراعت ایک تحتانی حیثیت حاصل کر لے گی بالکل بے بنیاد ہے۔ بہر حال ہمیں زراعت یا صنعت پر بے دلیل اور اندھا دھند عقیدہ نہ رکھنا چاہیئے۔ خواہ زراعت کو اول درجہ حاصل ہو یا دوم درجہ اس کا نفس معاملہ پر اس وقت تک اثر نہیں پڑ سکتا جب تک کہ قوم اپنی محنت اور اپنے اصل کو دونوں پیشوں میں ایسے طریقے پر تقسیم کرے جس کی

بنا پر بیشتر بین قومی تقسیم و عمل ہو؛ واقعہ یہ ہے کہ زراعت ہمارے ملک کے
حالات سے اس درجہ مناسبت رکھتی ہے کہ اس کو صنعت کی موافقت میں کلیۃً
نظر انداز کر دینا صحیح اور معقول تدبیری اصول نہیں ہو سکتا؛ اور اس بارے میں
شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہندوستان میں اس کی اہمیت ہمیشہ
برقرار رہے گی۔ یہ اہمیت اور بھی زیادہ ہو جائے گی اگر ہم زراعت کی موافقت
میں یہ عام اتفاقی دلیل کو تقویت دیں جیسا کہ ہم بخوبی دے سکتے ہیں؛ یعنی یہ کہ زراعت
کاشتکاروں کو خوش حال اور قوی رکھنے میں مدد دیتی ہے جو سلطنت کے
سب سے زیادہ طاقتور رکن ہیں؛ اس لئے کہ کاشتکار سیاسی استحکام میں
مدد دیتے ہیں اور خاص تجارتی و صنعتی آبادی والے ملک میں انتہائی سیاسی
و انقلابی خیالات کے سیلاب کا جو قرینہ ہوتا ہے اس کے لئے ایک بند کا کام
کرتے ہیں۔[1]

اس طرح زراعت بمقابلہ صنعت کی بحث مہمل اور بے نتیجہ ہے۔ ہم بیان
کر چکے ہیں کہ زراعت صنعتی ترقی کے ذریعے سے بہت بڑا فائدہ حاصل کر سکتی ہے؛

---

[1] موجودہ زمانے میں تمام ممالک کو شہروں میں رہنے والوں کی کثیر تعداد کی اتنی ضرورت نہیں ہے
جتنی کہ دیہی زندگی بسر کرنے والی کثیر آبادی کی۔ دیہی آبادی کی ضرورت نہ صرف مدافعت کی
غرض اور قومی صحت کے اغراض کے لئے ہوتی ہے بلکہ ایک پرآشوب زمانے کے تغیر پذیر نشوونما
میں سکون و ثبات پیدا کرنے کے لئے بھی ہوتی ہے۔ تاوقتیکہ دیہی زندگی بسر کرنے والے کافی
تعداد میں نہ ہوں جو اپنی شہری آبادی کی ضرورتوں کی سربراہی کر سکیں قوم کا زوال و انحطاط
یقینی ہے اور مرور زمانہ کے ساتھ وہ معدوم ہو جائے گی۔" دیکھو رائڈر ہیگرڈ کا قول جس کو
ل۔ جی۔ بیسر نے اپنی کتاب موسوم بہ (Economics of Agricultural Progress)
میں صفحہ ۹۳ پر نقل کیا ہے۔ یہاں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ انگلستان جیسے ملکوں پر
خاص طور پر صادق آتے ہیں جو اپنے قومی تحفظ کے لئے شہری آبادی کو بڑھانے اور ترقی دینے
میں حد اعتدال سے تجاوز کر گئے ہیں۔ ہندوستان میں موجودہ زمانے میں تحفظ کا انحصار
شہروں اور ان کی آبادی کو ترقی دینے پر ہے نہ کہ کم کرنے پر۔

باب ۱۳

اور یہ بھی مساوی طور پر صحیح ہے کہ صنعت کی خوشحالی و ترقی زراعت کی ترقی وخوشحالی سے وابستہ ہے بشرطیکہ ہندوستانی کسان ہی صنعتوں کی پیداوار کا بڑی حد تک خریدار ہو[1]

464

۱۲۔ صنعتوں کے لئے سرمایہ

اس پر دو عنوانوں کے تحت بحث کی جاسکتی ہے؛ (۱) ملکی سرمایہ اور (۲) غیر ملکی سرمایہ۔

(۱) ملکی سرمایہ۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ ملکی سرمایہ کی رسد مقدار اور حجم دونوں اعتبارات سے ترقی کر رہی ہے، اور یہ بات جنگ عظیم کے زمانے کے بعد سے خاص طور پر صادق آرہی ہے۔ چنانچہ اس کا ثبوت اس طرح ہم پہنچتا ہے کہ حکومتی قرضوں کی مقدار جو ۱۹۱۳ء تا ۱۹۱۴ء میں ۱۴۵ کرور روپیہ تھی، ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں بڑھ کر ۴۳۵ کروڑ روپیہ ہوگئی؛ اور ہندوستان میں رجسٹر شدہ سرمایہ مشترک کی انجمنوں کے ادا شدہ اصل کی مقدار ۱۹۱۳ء تا ۱۹۳۲ء کے درمیان۔ ۵ کروڑ سے ۲۵۷ کروڑ روپئے تک ترقی کر گئی[2] اگرچہ اس طرح جو صورت حال دکھائی دیتی ہے وہ اطمینان بخش ہے، پھر بھی ملکی سرمایے کے ذرائع کے اضافے اور مصروفیت کی مزید اصلاح و ترقی کی بہت بڑی گنجائش اور ضرورت ہے؛ جس کے بغیر ہندوستان میں صنعتی ترقی کی راہ میں بڑی رکاوٹ پیدا ہوگی۔ اس مسئلے نے اس واقعے کے مدنظر بہت اہمیت حاصل کرلی ہے کہ صنعتی جدوجہد چند شکلوں مثلاً سوتی کپڑے اور سن کی گزیوں کی صنعتوں تک محدود نہیں ہے؛ بلکہ وہ بہت سے بے شمار میدانوں کے لئے سرگرداں ہے جیسا کہ ٹاٹا اسٹیل اینڈ آئرن ورکس کے قائم ہونے اور بہت بڑی تعداد میں حوصلہ مندانہ تجاویز کے

---

[1] یہ مسئلہ زراعت بمقابلہ صنعت کا نہیں ہے؛ بلکہ دو بڑے پیشوں کے پہلو بہ پہلو ترقی پانے کا ہے جس میں زراعت کا پلہ ہمیشہ لازمی طور پر بھاری ہونا چاہیئے۔ دیکھو کیلورٹ کی کتاب موسومہ (Weadth and welfare of the Punjab صفحہ ۱۸۶۔

[2] دیکھو موازنہ حکومت ہند برائے ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء، صفحہ ۸۰ و غیر ملکی سرمایہ کی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ ۸، اور برطانوی ہند کا اعدادی خلاصہ برائے ۱۹۲۱ء تا ۱۹۳۳ء جدول نمبر ۲۶۲ و ۲۶۴۔

مرتب ہونے سے ظاہر ہوتا ہے؛ مثلاً مغربی گھاٹوں کی آبی قوت کے امکانات سے بڑے پیمانے پر استفادے کی تجویز؛ موجودہ فولادی کارخانوں میں اضافے کی تجویز؛ فولادی کارخانوں کی پیداوار کو مصنوعات کی شکل میں تبدیل کرنے کے لئے ذیلی کارخانوں کی تجویز؛ کلوں اور گرنیوں کے ساز و سامان کی تیاری کی تجویز وغیرہ[1] یہ سب تجاویز سرمایے کی بہت بڑی مقدار چاہتی ہیں؛ اور یہ ضروری ہے کہ موجودہ زمانے میں جتنا اصل بے کار پڑا ہوا ہے اس سے کام لینے کی مناسب تدابیر اختیار کی جائیں۔ اس امر کی تفہیم کی غرض سے کہ یہ کس طرح کیا جا سکتا ہے ہم (ا) مفصلات اور (ب) بڑے تجارتی شہروں میں دستیاب ہونے والے اصل کی ممکنہ مقدار اور نوعیت اور اس کے تشکل کے طریقے کی ابتدائی جانچ عمل میں لانی چاہئے[2]

365

(ا) مفصلات میں بنک کاری کی مناسب سہولتیں عملاً مفقود ہونے کے باعث سرمایہ کا کوئی انتظام بہ شکل موجود ہے۔ مشترک سرمایے کی تجارتی بنک کاری کی توسیع خاص مشکلات پیش کرتی ہے؛ اگرچہ اس اعتبار سے بڑے بڑے ضلاعی شہروں میں امپیریل بنک کی کئی شاخوں کے قائم ہو جانے کی وجہ سے صورت حال میں کسی حد تک سہولت پیدا ہو گئی ہے۔ ڈاک خانے کے سیونگ بنک نیز حال میں قائم شدہ امداد باہمی کے بنک دیہی پس اندازیوں کے ایک جزو کو کارآمد بنانے کے قابل ہوئے ہیں؛ لیکن بحیثیت مجموعی دیہی ساہوکار ہی کا بول بالا ہے؛ چنانچہ کسان، دستکار، اور ٹٹ پونجئے تاجر کی مقامی ضرورتوں کو تنہا وہی پورا کرتا ہے۔ بہت شاذ ہی ایسا ہوتا ہے کہ وہ سنے جوکھم کے کاروبار میں اپنے اصل کو مصروف کرتا ہے۔

---

[1]۔ دیکھو صنعتی کمیشن کی رپورٹ، فقرہ ۲۸۰۔

[2]۔ برطانوی ہند کے صوبوں میں مختلف قسم کی دیہی شہری گھریلو اور منظم صنعتوں کی موجودہ مالی سہولتوں کے جامع اور دلچسپ بیان کے لئے یہ مناسب ہوگا کہ بنک کاری کی مختلف صوبہ واری اور مرکزی تحقیقاتی کمیٹیوں کی رپورٹوں کا مطالعہ کیا جائے۔

باب ۱۲

اس میں شک نہیں کہ مقامی اصل سے کاروبار شروع کئے گئے ہیں؛ مثلاً خاص کر آٹے کی چکیاں، روئی پیدا کرنے والے علاقوں میں بنولہ نکالنے کی کلیں اور برما اور کورومانڈل ساحل کے چاول بونے والے ڈیلٹاؤں میں چاول کی گرنیاں قائم کی گئی ہیں۔ لیکن ان کی تعداد اس قدر بڑھ گئی ہے کہ ان سے جو نفع حاصل ہوتا ہے اس کے متعلق یہ بہ مشکل کہا جا سکتا ہے کہ کاروباری نقطۂ نظر سے وہ دلکشی رکھتا ہے۔ خوش حال کسان کی پس اندازیوں کا بڑا حصہ زیور اور اندوختوں کی شکل میں منقفل رہتا ہے؛ جیسا کہ اس واقعے سے ثابت ہوتا ہے کہ ۱۹۱۳ء تا ۱۹۲۴ء کے درمیان سونے اور چاندی کی خالص درآمد ہندوستان میں بقدر ۴۰۲ کروڑ روپیہ ہوئی[1] پیرکاری عہدہ دار اور پیشہ ور طبقے سرمایے کو زمین کو خریدنے یا گروی رکھنے کی شکل میں مصروف کرنے کو پسند کرتے ہیں؛ اور بنک کاری کی عادت، کسانوں کے مقابلے میں ان ہی طبقوں میں بہت زیادہ تیزی کے ساتھ ترقی کر رہی ہے۔

(ب) تجارتی شہروں میں اور احاطہ ہائے بمبئی، مدراس اور بنگال کے شہروں میں صورت حال کسی قدر زیادہ اطمینان بخش ہے۔ یہاں بنک کاری کی بہتر سہولتیں موجود ہیں اور پس انداز کردہ رقوم کو صنعتی و تجارتی کاروبار میں مصروف کرنے کی حد تک لوگوں میں زیادہ آمادگی اور مستعدی پائی جاتی ہے؛ اور عام طور پر دیکھا جائے تو بخوبی مرتب کردہ عمدہ اور منظم کاروباری تجویز، بشرطیکہ ذی حیثیت اور فنی معلومات رکھنے والے اشخاص اس کو بروئے عمل لائیں، مطلوبہ اصل کو اپنی طرف کھینچنے سے قاصر نہیں رہتی۔ لیکن اس صورت میں بھی مشکلات کلیتہً مفقود نہیں ہوتیں۔ موجودہ بنک کاری کا نظام صنعتی مالیے کے نقطۂ نظر سے بہت زیادہ غیر لچکدار یا غیر تغیر پذیر ہے۔ موجودہ قانون کے تحت امپیریل بنک کو اس بات کی ممانعت کی گئی ہے کہ طویل مدت کے لئے صنعتوں کو قرضہ دے یا جائداد غیر منقولہ کی گروی کی بنیاد پر رقم مستعار دے اور یہ قانون ۱۹۳۵ء میں ریزرو بنک آف انڈیا کے قائم ہونے کے بعد بھی

---

[1] دیکھو غیر ملکی سرمایہ کی کمیٹی کی رپورٹ۔

اس حد تک تبدیل نہیں ہوا ہے۔ علاوہ ازیں امپیریل بنک ۳۰ فیصد یا اس سے زائد رقم سیال اثاثہ کی کفالت کی بنیاد پر قرضہ دینے کے لئے رکھتا ہے۔ دوسرے بنکوں نے بھی اس طریقۂ عمل کی تقلید کی ہے جس سے صنعتی کاروبار کو سخت مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ مبادلہ بنک مبادلۂ خارجہ میں نفع بخش کاروبار کر رہے ہیں، اور اس میں ان کا تمام تر اصل مصروف و وقف ہے۔ علاوہ ازیں ان میں سے اکثر بنکوں کا اصل اور انتظام غیر ملکی ہے۔ یہ ان کو ہندوستانی صنعتی کاروبار کی امداد کرنے کے لئے ہاتھ بڑھانے سے باز رکھتا ہے، اس لئے کہ ان کو ملکی صنعتوں کی اور ہندوستانی حالات کی معلومات نہیں ہے، علاوہ ازیں یہ توقع بھی نہیں کی جا سکتی کہ ان کو ہندوستان کی صنعتی ترقی کی ضرورتوں سے بہت زیادہ ہمدردی ہوگی۔ ہندوستانی سرمایۂ مشترک کے بنکوں نے عام طور پر قدیم تجارتی بنک کاری سے وابستگی کا میلان ظاہر کیا ہے، جو چھوٹی مدت کے قرضے کے اصول پر مبنی ہے[1]، اور موجودہ صدی کے ابتدائی سالوں میں ان میں سے بعضوں نے (مثلاً پیپلز بنک آف لاہور جس کا دیوالہ ۱۹۱۳ء میں نکل گیا) معمولی تجارتی بنک کاری کو صنعتی بنک کاری سے ملانے کے بارے میں جو تجربے کئے وہ اس وجہ سے ناکام ثابت ہوئے کہ بڑی مدت کے کاروبار میں چھوٹی مدت کے قرضے پھنسا دیئے گئے تھے اور اسی کے ساتھ یہ غلطی بھی کی گئی تھی (جو بہت زیادہ عام طور پر بنکوں سے سرزد ہوئی تھی) کہ انھوں نے اپنی رقوم کے بہت بڑے حصے کو تنہا کسی ایک صنعت میں مصروف کر دیا تھا۔

صنعتی قرضے حاصل کرنے کی مشکلات کے باعث موجودہ زمانے میں اکثر بڑے صنعتی کارخانوں کو مینجنگ ایجنٹوں پر انحصار کرنا پڑتا ہے تاکہ وہ ابتدائی اور کاروباری سرمایہ مہیا کریں۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۳۰ء میں بمبئی کی سوتی کپڑے کی گرنیوں نے اپنے مجموعی قرضے کا ۱۲ فیصد اسی ذریعے سے حاصل کیا، اور احمد آباد

46

[1] دیکھو مرکزی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ ۳۳۹ تا ۳۴۰؛ نیز پی ایس لوکناتھن کی کتاب موسومہ بہ "ہندوستان میں صنعتی انتظام" باب ۵۔

باب ۱۳

کی گرنیوں کی حد تک یہ تناسب ۴۲ فیصد تھا۔ مینجنگ ایجنٹ اپنی زیر نگرانی گرنیوں کے بہت سے حصے اور ڈبینچر خرید تے ہیں چنانچہ ان ہی کے اعتبار پر بنک صنعتی کمپنیوں کو قرضہ دیتے ہیں[1]۔ ہندوستان میں مینجنگ ایجنسی کا طریقہ مغربی ممالک کے بخوبی منظم سرمایے کے بازار اور صنعتی بنک کاری کے طریقے کے بدل کے طور پر رائج ہے اور محض معاشی حالات کے دباؤ کے تحت وجود میں آیا ہے[2]۔ یہ کسی حال مکمل انتظام نہیں ہے اور اس میں کئی سنگین خرابیاں پائی جاتی ہیں[3]۔ بمبئی، احمد آباد اور اندور کی گرنیاں ایک اور ذریعے سے قرضہ حاصل کرتی ہیں اور وہ عوام کی امانتیں ہیں چنانچہ اکتوبر ۱۹۳۰ء میں عوام کا دیا ہوا قرضہ احمد آباد میں مجموعی مقدار کا کم و بیش ۳۹ فیصد تھا۔ لیکن یہ قرضہ حاصل کرنے کا ایک بہت ہی غیر اطمینان بخش اور خطرناک ذریعہ ہے اور اسی مناسبت سے اس کو "اچھے وقت کا ساتھی" کہا گیا ہے۔ جب زمانہ خراب ہوتا ہے تو یہ امانتیں اچھے اور برے دونوں کارخانوں سے واپس لے لی جاتی ہیں اور اس طرح صورت حال کو ایسے زمانے میں بد سے بدتر بنا دیتی ہیں جبکہ عارضی کساد بازاری کے دور کو عبور کرنے کے لئے ہر قسم کے ذرایع کی ضرورت ہوتی ہے۔ عوام کے لئے مشغولات اصل کے بارے میں مشورہ اور مدد حاصل کرنے کا کوئی مسلمہ طریقہ موجود نہیں ہے اور ہندوستان میں جو چھوٹی صنعتیں قائم ہوئیں وہ تباہ ہوگئیں جس کی وجہ سے صنعتی مشغولات میں عوام کا اعتماد متزلزل ہوگیا ہے چنانچہ یہی وہ مشکلات ہیں جو صنعتی ترقی کے میدان میں سرمایے کے بے روک بہاؤ میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں۔

467

اس طرح ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ شہروں میں بھی صنعتوں کو مسلسل بڑی مدت کے لئے مالی امداد دینے کا کوئی کافی و معقول انتظام نہیں ہے۔ چند صنعتی بنک قائم کئے گئے تھے لیکن ان میں سے اہم ترین بنک اور خاص کر وہ بنک جو ا ہندا ۔۔۔

[1] دیکھو مرکزی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ ۲۰۵۔

[2] دیکھو ایس جی ہنڈیکر کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان میں بنک کاری" صفحہ ۲۱۵۔

[3] اس طریق کی ابتدا اور اس کے کاروبار کا حال جلد دوم باب ۲ میں بیان کیا گیا ہے۔

نہایت امید افزا توقعات پیش کر رہا تھا یعنی ٹاٹا انڈسٹریل بنک نے بے نتیجہ اور غیر مشکور سعی کے بعد اپنے کام کے صنعتی پہلو کو بہت جلد ترک کر دیا۔ اور کچھ مدت تک معمولی تجارتی بنک کاری اور مبادلۂ خارجہ کے کاروبار پر قناعت کی، یہاں تک کہ آخرکار (۱۹۲۳ء میں) وہ سنٹرل بنک آف انڈیا میں ضم ہو گیا جو خالص تجارتی بنک ہے۔ ٹاٹا انڈسٹریل بنک کی مختصر زندگی اور ناکامی دوسرے اسباب کے منجملہ اس واقعے سے منسوب کی جا سکتی ہے کہ بنک گرم بازاری کے زمانے میں قائم ہوا اور اس کو غیر معمولی طور پر تکلیف دہ دور کا سامنا کرنا پڑا۔ علاوہ ازیں اس نے یہ غلطی کی کہ ایسے کاروبار اور کارخانوں کی کم و بیش مالی مدد کی اور ان کو ترقی دی جو مینجنگ ایجنٹس کی ایک فرم سے وابستہ تھے[1]۔

صنعتی کاروبار کی مالی امداد کرنے کی مشکلات خاص طور پر شد و مد کے ساتھ چھوٹے متوسط درجے کے آجروں کے بارے میں رونما ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ وہ بڑے صناعوں اور شرکت سرمایہ کے کارپوریشن (انجمن) کے برعکس تمسکات یا مستند اشخاص کی ضمانت نہیں پیش کر سکتے۔ امداد باہمی کا قرضہ ان کے لئے مناسب نہیں ہے بلکہ صرف گھٹیا دستکاروں مثلاً جلاہوں کے لئے مفید ہے۔ ان حالات میں اس امر کا سخت مطالبہ اور تقاضا کیا جا رہا ہے کہ حکومت کی طرف سے ضمانتی مقسوم، راست قرضوں، مکمل پیداوار کی خریداری وغیرہ صورتوں میں سے کسی نہ کسی صورت میں براہ راست یا بالواسطہ کچھ نہ کچھ مالی امداد کی جائے۔ صنعتی مالی امداد کے مسئلے پر ۱۹۱۶ء تا ۱۹۱۸ء کے صنعتی کمیشن نے اور ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۱ء کی بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی نے حال میں بہت تفصیل کے ساتھ تبصرہ کیا ہے۔

---

[1] دیکھو پی ایس لوکناتھن کی کتاب محولہ بالا صفحہ ۲۰۵ تا صفحہ ۲۵۹۔

باب ۱۳ 468

صنعتی کمیشن کی نظر میں سب سے پسندیدہ طریقہ یہ ہے کہ ہندوستان میں خصوصی صنعتی بنک قائم کئے جائیں۔ وہ یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ صنعتی بنکوں کا قائم کرنا جو مستحسن اصول پر کام کریں اتنی کافی قومی اہمیت رکھتا ہے کہ اس کی بنا پر سرکاری امداد حق بجانب قرار پاتی ہے۔ وہ یہ بتلاتا ہے کہ اس وقت اس بات کی ضرورت ہے کہ گھٹیا صناعوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے بنک کھولا جائے جو صنعتوں کے ایک خاصے وسیع دائرے کی کامیابی کے موقعوں کا اندازہ کرنے کے قابل ہو اور ایسی رقوم اپنے قبضے میں رکھے جنھیں وہ کچھ مدت تک ایسے تمسکات کی شکل میں بآسانی محفوظ رکھ سکتا ہو جو فوراً فروخت نہ ہو سکیں۔ کمیشن مذکور یہ بھی سفارش کرتا ہے کہ خصوصی ماہروں کی ایک کمیٹی قائم کی جائے جو اس بارے میں ایک قطعی تجویز مرتب کرے اور ایسے بنکوں کو سرکاری امداد دینے کے طریقوں کا تعین کرے۔ وہ یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ خواہ حکومت دوسرے طریقوں سے کچھ ہی امداد کرے اسے صنعتی بنکوں کو محکمہ جات صنعت و حرفت کی وساطت سے ماہرانہ مشورہ ضرور دینا چاہئے، تاکہ بنک ان صنعتی تجاویز کی کامیابی کے موقعوں کا اندازہ کر سکیں جو ان کی امداد کی طالب ہیں۔ صنعتی بنک اپنے طور پر ماہروں کی خدمات حاصل کرنے کے قابل نہ ہوں گے، اگر حکومت اس ضرورت کو پورا کرے تو بہت اچھا ہوگا۔[1] صنعتی بنکوں کے دستور اور اس کی ترکیب کے متعلق مسائل، نیز صوبہ واری صنعتی کارپوریشن اور ایک کل ہند صنعتی کارپوریشن کے قیام کی موافقت میں بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی سفارشوں پر جلد دوم کتاب ہذا میں "بنک کاری" کے متعلق باب میں بحث کی جائے گی۔[2]

صنعتی کمیشن یہ مشورہ دیتا ہے کہ ایسے بنکوں کے قائم ہونے تک موجودہ سرمایۂ مشترک کے بنکوں کو متوسط درجے کے صناعوں کی امداد قرضوں کی شکل میں کرنی چاہئے جو حکومت کی ضمانت کے تابع ہوں، اور قرضہ دینے سے قبل ناظم محکمۂ صنعت و حرفت اور اس کے خصوصی ماہروں کے عملے کی طرف سے درخواست گزاروں کی مالی حیثیت و حالت

---

[1] دیکھو صنعتی کمیشن کی رپورٹ، فقرہ ۲۸۷ تا ۲۹۲۔

[2] باب ۱؛ نیز دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ ۳۰۱ تا ۳۰۹۔

اور ان کے کاروبار کی ترقی کے امکانات کے بارے میں تحقیقات ہونی چاہئے کمیشن یہی سفارش کرتا ہے کہ حکومت کو چند صورتوں میں مثلاً افادۂ عامہ یا قومی اہمیت رکھنے والے کاروبار کی براہ راست مالی امداد ہمیشہ کرنی چاہئے۔ ایسی امداد مقسوموں کی ضمانت، نقد قرضے، پیداوار خرید لینے کے متعلق حکومت کی ذمہ داری یا حصص کے سرمایہ میں شرکت کی شکل اختیار کرسکتی ہے۔ امداد کی ان سب شکلوں کا مناسب حفاظتی تدابیر کے تابع ہونا ضروری ہے تاکہ حکومت کے مالی اغراض کا تحفظ ہو اور غیر ملکی اصل و آر مراعات حاصل کرنے سے باز رکھے جائیں۔ اس امر کا اب تک کوئی ثبوت پیش نہیں ہوا ہے کہ حکومت نے صنعتی مالی امداد کے متعلق صنعتی کمیشن کی پیش کردہ اہم ترسفارشوں پر سنجیدگی سے عمل شروع کیا ہے۔ صنعتی بنکوں کے افتتاح جیسی ناگزیر تجاویز کے غیر معین التوا کے کئی اسباب میں سے ایک حال کے زمانے کا مالی انقباض

469

ہے۔ یہ صحیح ہے کہ صنعتی قرضوں کے بارے میں ایک ایکٹ حال ہی میں پنجاب میں منظور ہوا ہے، اور مدراس، میسور، اور بہار و اڑیسہ میں صنعتوں کی سرکاری امداد کے بارے میں قوانین موجود ہیں[1] لیکن یہ ایکٹ صنعتی مالی امداد کے لئے بہت مفید اور کارآمد ثابت نہیں ہوئے ہیں، اور ان کے شرائط کے تحت بحیثیت مجموعی بہت ہی قلیل رقمیں بطور قرض دی گئی ہیں[2] اس لحاظ سے جداگانہ صنعتی بنکوں کی کمی ابھی تک محسوس کی جارہی ہے۔ ہندوستانی بنک کاری پر جامع تبصرہ حال ہی میں بنک کاری کی صوبہ واری و مرکزی تحقیقاتی کمیٹیوں نے کیا ہے، اور یہ صنعتی مالی امداد کی موجودہ

[1] بمبئی (فقرہ ۱۷۷)، بنگال (فقرہ ۱۷۱) اور صوبۂ متوسط (فقرہ ۱۳۱۴) کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹیوں نے اس امر کی پرزور سفارش کی ہے کہ صنعتوں کی سرکاری امداد کے ایکٹ مزید تاخیر کے بغیر منظور کرنے چاہییں، تاکہ صنعتوں کی امداد کی پالیسی پر موجودہ زمانے کے مقابلے میں زیادہ باقاعدگی کے ساتھ عمل کیا جاسکے۔ بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی (فقرہ ۳۱۱) نے اس سفارش کی پوری پوری تائید کی ہے۔

[2] مختلف صوبوں میں ان قوانین کے علدرآمد کے متعلق تفصیلی تبصرے کے لئے دیکھو "پانچویں صنعتی کانفرنس کی روئداد" (ہندوستانی صنعت و محنت کا اعلامیہ نمبر ۵)۔

مشکلات کے اطمینان بخش حل کی ضرورت پر مزید زور دینے میں مفید ثابت ہوا ہے۔ بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کے جاری کردہ سوال نامہ میں صنعتی بنکوں کے مسئلے اور ہندوستان کی بڑی صنعتوں کے لئے اعتباری سہولتیں مہیا کرنے کے بارے میں خاص طور سے زور دیا گیا تھا؛ چنانچہ اگر اس کی سفارشوں کو عملی جامہ پہنایا گیا تو، "اندازہ کیا گیا ہے کہ صنعتی مالیہ بہت زیادہ مستحکم اور ترقی پذیر بنیاد پر قائم ہو جائے گا" (دیکھو جلد دوم باب ۱)۔

۱۳۔ غیر ملکی سرمایہ

حال میں تامین کی پالیسی کے اختیار کئے جانے کے بعد سے غیر ملکی سرمایہ کے مسئلے نے بہت نمایاں حیثیت حاصل کرلی ہے عام طور پر یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ اگر غیر ملکی سرمایہ اور مہم جوئی کو تامین کی دیواروں کی آڑ میں بے روک ٹوک پناہ لینے کا موقع دیا گیا تو، قوم کو تامین سے حاصل ہونے والا فائدہ زائل ہو جائے گا۔ تجارت آزاد کے نظام کے تحت بھی ملک میں کئی کمپنیاں غیر ملکی سرمایے کی مدد سے قائم ہو گئی تھیں، جیسا کہ مندرجۂ ذیل جدول سے ظاہر ہوگا۔ واقعہ یہ ہے، جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، کہ ہندوستان میں صنعتوں کی موجودہ ترقی یافتہ حالت غیر ملکی سرمایہ ہی کی رہین منت ہے۔ غیر ملکی سرمایے کے بارے میں صحیح طریق کار کیا ہونا چاہئے اس مسئلے کو دو جماعتوں یعنی مالی کمیشن (سنہ ۱۹۲۱ء تا سنہ ۱۹۲۲ء) اور غیر ملکی سرمایے کی کمیٹی نے جانچا؛ موخر الذکر کا تقرر سنہ ۱۹۲۴ء میں مجلس قانون ساز کے مسودۂ قانون تامین فولاد کے مباحث کے سلسلے میں عمل میں آیا۔

۱۴۔ غیر ملکی سرمایے کی مقدار۔

ہندوستان میں غیر ملکی سرمایے کے تشغل کی مقدار کا صحیح اندازہ قائم کرنا مشکل ہے؛ لیکن تخمینی اندازہ قائم کرنے کے لئے کافی امدادی مواد موجود ہے۔ سب سے اول ہم ان سرمایۂ مشترک کی انجمنوں کے اعداد پر غور کر سکتے ہیں جو برطانوی ہند میں کاروبار کر رہی ہیں لیکن ملک کے باہر منظم ہوئیں[1]

[1] دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "برطانوی ہند کے اعدادی خلاصے برائے سنہ ۱۹۲۳ء تا سنہ ۱۹۲۴ء و برائے سنہ ۱۹۳۲ء تا سنہ ۱۹۳۳ء"۔

جدول (۱)

کمپنی کی قسم	۱۹۱۴ء		۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء	
	تعداد	ادا شدہ اصل	تعداد	ادا شدہ اصل
بنک کاری اور قرضہ	۱۳	۸۰۱،۱۵۰۵،۲۴۳۲ پاؤنڈ	۲۹	۹۰۶۴۷۹۴۴ پاؤنڈ
بیمہ	۴۰۹	۲۸۰،۶۵۷،۳۸ "	۱۴۰	۷۴۶۶۸،۷۶۸ "
جہازرانی	۱۲	۱۵۰۰،۱۰۸۶۵ "	۱۹	۴۱،۶۴۵۲۵۲ "
ریل اور ٹریموے	۱۰	۸۰۰،۱۱۸،۹۱۵ "	۱۸	۲۵۰۹۴۹۰۸ "
دیگر وسائل نقل و حمل	۰	۰	۱۱	۲۱۱۰۲۵۷ "
تجارتی و صنعتی کمپنیاں	۱۱۳	۱۱۴،۲۵۴،۳۳۳ "	۳۵۲	۳۰۸،۷۲۱۱،۶۵۲ "
چائے	۱۶۶	۱۷،۵۷۳۲۸۴ "	۱۷۸	۲۸۰۰۳۱۳۰ "
دوسری زرعی کمپنیاں	۲۲	۱،۱۶۵،۸۴۴ "	۲۵	۲،۹۵۹،۹۰۸ "
کوئلے کی کان کنی	۶	۱۳۹،۱۳۴ "	۴	۲۴۰،۰۰۰ "
سونے کی کان کنی	۳	۳۸۹،۸۳۰ "	۰	۰
دوسری معدنی اور کندگی کی کمپنیاں	۱۳	۵،۰۳۰،۹۹۹ "	۳۴	۱۹۵۰۶۰۹۰۲ "
سوت کی گرنیاں	۳	۴۰۰،۰۰۰ "	۴	۲۰۰،۰۰۰ "
سن	۹	۲،۴۲۸،۸۹۴ "	۵	۲،۲۵۲،۴۵۰ "
بنولہ دھنائی روئی یا مال اور گانٹھ بنانا وغیرہ	۱	۱۰۰،۰۰۰ "	۲	۱۵۰،۰۰۰ "
جائداد غیر منقولہ زمین اور عمارت	۰	۰	۵	۳۹۵،۴۸۱ "
شکر (بشمول گڑ)	۲	۳۰۶،۶۵۶	۱	۲۸۰،۰۰۰ "
دوسری کمپنیاں	۹	۵۵۴،۴۵۱	۳۰	۴۰۶۷۹۳۵۵ "
میزان (برطانوی ہند)	۴۷۹	۲۹۰،۷۷۳،۸۷۱	۸۵۷	۸۱۹۰۶۱۰۰۴
میزان (دیسی ریاستیں)	۳۸	۷،۶۲۴،۳۲۶	۴۴	۱۰،۹۸۲،۲۲۸
صدر میزان	۵۱۷	۲۹۸،۴۰۱،۱۹۷	۹۰۱	۸۳۰۵۹۲۲۴۲

باب ۱۳

اس کے بالمقابل ہندوستان میں (بہ شمول دیسی ریاستوں کے) رجسٹری شدہ سرمایۂ مشترک کی انجمنوں کے اعداد حسب ذیل ہیں :-

جدول (۲)

سنہ ۱۹۱۴ء تا سنہ ۱۹۱۵ء		سنہ ۱۹۳۲ء تا سنہ ۱۹۳۳ء	
تعداد	ادا شدہ اصل	تعداد	ادا شدہ اصل
	روپیہ		روپیہ
۲۵۴۵	۸۰،۷۸،۸۱،۵۷۲	۸۷۱۹	۲۸۶،۴۳،۳۰،۱۶۵

471

مذکورۂ بالا اعداد سے کئی دلچسپ واقعات کا انکشاف ہوتا ہے۔ سب سے اول ہندوستان میں غیر ملکی سرمایے اور مہم جوئی کا عظیم تفوق و امتیاز واضح طور پر منکشف ہوتا ہے۔ غیر ملکی سرمایے کی مجموعی مقدار ملکی سرمایے سے نسبتہً بہت بڑی ہے؛ اور یہ واقعہ کہ اول الذکر صورت میں کمپنیوں کی تعداد نسبتہً قلیل ہے اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ انفرادی غیر ملکی کمپنیوں کے سرمایے کی بنیاد زیادہ مستحکم اور معاشی حیثیت زیادہ قوی ہے۔ اس کے مقابلے میں سنہ ۱۹۱۴ء سے ہم اس قطعی میلان کا ثبوت پا رہے ہیں کہ غیر ملکی سرمایے اور مہم جوئی کی نسبت ہندوستانی مشغول سرمایے کی مقدار اور ہندوستانی کمپنیوں کی تعداد بہت زیادہ تیز رفتار کے ساتھ ترقی کر رہی ہے۔

اگرچہ مذکورۂ بالا اعداد عام طور پر قابل اعتماد معلوم ہوتے ہیں پھر بھی وہ بعض تحفظات کے تابع ہیں جن کا بیان ذکر کر دینا مناسب ہوگا۔ (۱) دونوں قسموں کی سرمایۂ مشترک کی انجمنوں کے صرف ادا شدہ سرمایے کا لحاظ کیا گیا ہے۔ اس میں ڈبینچر کے اصل کا اضافہ کرنا ضروری ہے؛ جس کا اندازہ ایسی کمپنیوں کی حد تک جو ہندوستان سے باہر رجسٹری شدہ ہیں لیکن ہندوستان میں کاروبار کر رہی ہیں،

باب ۱۳

ایک سو ملین پونڈ سے زاید کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس یہ ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ اکثر غیر ملکی کمپنیوں خاص کر بنک کاری بیمہ اور تجارتی اور جہاز رانی کی کمپنیوں کے مجموعی ادا شدہ اصل کا صرف ایک جزو جیسا کہ مندرجۂ بالا جدول میں بیان کیا گیا ہے ان کے کاروبار کی ہندوستانی شاخ میں مصروف ہے۔ (۲) گو کمپنی کے رجسٹر ہونے کے مقام کو سرمایے کے ماخذ کی تخمینی علامت کے طور پر لیا جا سکتا ہے پھر بھی غیر ملکی کمپنیوں کے اصل کی کچھ مقدار ہندوستانیوں کی اور ہندوستانی اصل کی کچھ مقدار ممالک غیر کے لوگوں کی ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ غیر ملکی سرمایے کی کمیٹی نے بتلایا ہے ہندوستانی باشندے غیر ملکی کمپنیوں اور غیر ہندوستانی انتظام کے تحت روپے کی شکل میں سرمایہ رکھنے والی کمپنیوں (مثلاً سن کی کرنیوں) دونوں میں اصل کے بڑے اور روز افزوں حصے کے مالک ہیں۔ علیٰ ہذا جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ممکن ہے کہ روپے کی شکل میں سرمایہ رکھنے والی ہندوستان میں رجسٹری شدہ کمپنیوں میں غیر ملکی حصہ داروں کی کثیر تعداد موجود ہو؛ اور انتظام غیر ملکی اشخاص کے ہاتھ میں ہو۔ اس کی صریح مثال کلکتے کی سن کی کرنیاں ہیں اس کی بکنگھم اینڈ کرناٹک کاٹن ملز اور کان پور کی اون کی کرنیاں ہیں۔ (۳) علاوہ ازیں مذکورہ بالا جدول میں صرف سرمایۂ مشترک کی انجمنوں کے اصل کو محسوب کیا گیا ہے؛ اور غیر ملکی یا ہندوستانی خانگی فرموں کے اصل کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔ (۴) ہندوستان میں جو غیر ملکی سرمایہ مصروف ہے اس کی مقدار کا زیادہ صحیح اندازہ قائم کرنے کی غرض سے یہ بھی ضروری ہے کہ ہندوستانی ریلوں کار ہائے آب پاشی وغیرہ کے لئے حکومت ہند کی جانب سے لئے ہوئے بہ شکل اسٹرلنگ قرضوں کو بھی محسوب کیا جائے۔ ان کی مقدار ۳۱ مارچ ۱۹۲۵ء کو ۳۰۵.۲ ملین پونڈ تھی؛ اور یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ یہ قرضے لندن میں بذریعۂ تمسک حاصل کردہ قرضۂ حکومت ہند (بہ شکل روپیہ) کے ساتھ ملا کر تقریباً سب کے سب غیر ملکی مشغل اصل کرنے والوں سے حاصل کئے گئے تھے۔

ہندوستان میں غیر ملکی سرمایے کی مقدار کے صحیح اندازے کے مسئلے سے قطع نظر کرتے ہوئے اس عام واقعے کے متعلق کوئی شبہ نہیں جس سے ہم یہاں زیادہ تر بحث کر رہے ہیں؛ یعنی یہ کہ اس ملک میں جتنا غیر ملکی سرمایہ کسی نہ کسی شکل میں مصروف ہے اس کی مجموعی

472

مقدار بہت زیادہ ہے۔ ہندوستان کے بڑے پیمانے کے اکثر اہم کاروبار؛ مثلاً: بنک، جہازراں کمپنیاں، ریلیں، بیمہ کمپنیاں، چائے اور کافی کے مزرعے، معدنی کمپنیاں و باغت چرم کی کمپنیاں وغیرہ، غیر ملکی سرمایے کی مدد سے چل رہی ہیں؛ اگرچہ حالیہ سالوں میں ہندوستانی سرمایہ اپنے لئے نت نئے راستے نکال رہا ہے، اور اس کی مجموعی مقدار میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ مغربی ہندوستان کی سوت کی گرنیوں کی صنعت، جو زیادہ تر ہندوستانی سرمایے کی مدد سے چل رہی ہے؛ ٹاٹا کے آہن و فولاد کے کارخانے؛ اور مغربی گھاٹ کے ٹاٹا کے کارہائے برقاب[1] ان سب سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی ہندوستانی سرمایہ سن کی گرنی، سمنٹ سازی، بنک کاری، دخانی جہازرانی، چائے کے باغوں وغیرہ جیسی صنعتوں میں روزافزوں معروف ہے لیے حکومت بھی قرضے حاصل کرنے میں ہندوستانی زر کے بازار پر روز بروز زیادہ انحصار کر رہی ہے؛ جیساکہ مذکورۂ بالا واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۳۱ مارچ ۱۹۱۴ء کو حکومت ہند کا (روپے کا) قرضہ ۱۴۵,۰۶ کروڑ تھا، اور وہ ۳۱ مارچ ۱۹۳۵ء تک بڑھ کر ۴۳۸,۲۳ کروڑ روپے تک پہونچ گیا؛ اس مقدار میں ہنڈیات خزانہ اور ڈاک خانے کے کیش سرٹی فکیٹ شامل نہیں ہیں[2]

۱۵۔ ہندوستان میں غیر ملکی سرمایہ: اہم تنقیح طلب امور۔

تامینی محصول کے نظام اور اعلیٰ محصول درآمد بغرض آمدنی کے تحت ہندوستان پر غیر ملکی سرمایے کا موجودہ تسلط اور اس کے بڑھنے کی توقع یہ سوال پیدا کرتی ہے کہ اس سرمایے کی درآمد کے بارے میں کھلے دروازے کی پالسی کا اختیار کرنا آیندہ کس حد تک مناسب ہوگا۔ غیر ملکی سرمایہ ہندوستان میں دو صورتوں سے داخل ہو سکتا ہے؛ یعنی (۱) قرضے کی غرض سے (۲) شغل اصل کی غرض سے۔ اول الذکر کی حد تک یہ بات متفقہ طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ ملکی سرمایہ جس وقت تک وافر مقدار میں اور کافی سرعت

---

[1] ٹاٹا کے زیر نگرانی کام کرنے والی برقابی کمپنیوں نے حال ہی (۱۹۲۹ء) میں ایک بڑے امریکن سنڈیکیٹ سے ایک معاہدہ کیا ہے جس کی رو سے موخر الذکر نے کمپنیوں کی ایکٹیوں میں نصف حصہ بقدر ۲۰ لاکھ روپیہ حاصل کیا ہے۔ یہ بہت کچھ مخالفانہ نقد و تبصرہ کا موضوع رہا۔

[2] نیز دیکھو جلد دوم باب (۱۱)۔

باب ۱۳

کے ساتھ دستیاب نہ ہو اس وقت تک ممالک غیر سے اصل مستعار لینے میں نہ صرف کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ ایسا کرنے میں قطعی فائدہ ہے اگرچہ اسی کے ساتھ ملک کے اندرونی ذرایع اصل کو مجتمع و مرتکز کرنے کی ہر ممکنہ کوشش بھی کرنی چاہئے۔

جاپان اور ریاستہائے متحدۂ امریکہ جیسے دوسرے ممالک اگرچہ خیالات اور پالیسی کے لحاظ سے نہایت قوی قومی جذبہ رکھتے ہیں پھر بھی انھوں نے غیر ملکی سرمایے کو اس شکل میں استعمال کرنے کی حد تک بہت افزائی کی ہے۔ علی ہذا تعلیم یافتہ غیر سرکاری ہندوستانی رائے عامہ نے غیر ملکی سرمایے کے استعمال کی اس مفہوم میں مخالفت نہیں کی ہے۔ چنانچہ آر سی دت سرکاری ریلوں کو مالی امداد کی غرض سے ملک سے باہر اصل مہیا کرنے کے اصول کو مستحسن اور مستحکم خیال کرتے تھے۔ باہر کا منتقل اصل کرنے والا اس صورت میں محض مقررہ شرح سود کا حق دار ہوتا ہے اور صرف باقی داری کی صورت میں نگرانی کے حقوق حاصل کرتا ہے۔ اس قسم کے غیر ملکی سرمایے کی مثالیں کئی سرکاری و بلدی قرضوں، بندرگاہوں کی انتظامی کمیٹی کے تمسکات (بونڈ)، خانگی کمپنیوں کے بونڈ اور ڈبنچروں اور بنک کے قرضوں میں ملتی ہیں[۱]۔ جیسا کہ ڈاکٹر سلیٹر نے کہا ہے "چونکہ بیرونی انتظام کا کوئی سوال نہیں ہے اس لئے قابل لحاظ اہم امور یہ ہیں۔ (ا) کیا نیا اثاثہ غیر ملکی قرضے کے ذریعے سے قائم کیا جا سکتا ہے، جس سے ہندوستانیوں کو براہِ راست یا بالواسطہ خالص سالانہ آمدنی مقررہ شرح سود کے علاوہ وصول ہو سکتی ہے؟ اور (ب) کیا ہندوستان کے مقابلے میں ملک سے باہر زیادہ فائدے کے ساتھ زر مستعار لیا جا سکتا ہے؟ اگر ان دونوں سوالوں کا جواب اثبات میں دیا جائے تو ظاہر ہے کہ غیر ملکی سرمایے کا استعمال مفید ہے"۔ لیکن غیر ملکی سرمایہ کی کمیٹی ایک تحفظ کا اضافہ کرتی ہے، اور وہ یہ کہ سرکاری اور نیم سرکاری قرضوں کی حد تک شرح سود میں غیر ملکی اور ملکی قرضے کے درمیان واحد قابل لحاظ امر نہ ہونا چاہئے۔ وہ یہ مشورہ دیتی ہے کہ مبادلے کے ملحوظات سے قطع نظر کرتے ہوئے غیر ملکی قرضوں کے مقابلے میں روپے کے قرضوں کو تا حد امکان ترجیح دینی چاہئے، خواہ موخرالذکر صورت میں شرح سود کسی قدر ناموافق ہی کیوں نہ ہو؛ اس کا مقصد یہ ہے کہ پس اندازی اور

478

---

[۱] دیکھو غیر ملکی سرمایے کی کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ (۱۷)۔

باب ۱۲

شغل اصل کی عادات پیدا کی جائیں' اور سرکاری تمسک کی شکل میں اعلیٰ درجے کی ضمانت اور ہندوستان میں صنعتی کاروبار کی ترقی کے لئے بنک کے قرضے کی کفالت کے طور پر عمدہ ضمانت کے بونڈ مہیا کئے جائیں۔[1]

لیکن غیر ملکی سرمایہ ملک میں معمولاً تخمینی کاروبار اور نفع اندوزی کی بنیاد پر داخل ہوتا ہے' اور غیر ملکی نگرانی و انتظام پر مبنی ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی قسم کے سرمایہ کے خلاف عام طور پر اعتراضات کئے جاتے ہیں۔

۱۶۔ غیر ملکی سرمایے پر اعتراضات۔ | غیر ملکی سرمایے کے بارے میں حسب ذیل اہم اعتراضات کئے جاتے ہیں۔[2]

(۱) پہلا بدیہی اعتراض یہ ہے کہ منافع ملک سے باہر چلا جاتا ہے۔ بعضوں کو یہ اعتراض اس قدر زبردست معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس بات کو روا رکھنے کی بجائے کہ ملک کے قدرتی ذرائع زیادہ تر اغیار کے اغراض کے لئے ترقی پائیں اور اغیار ان سے فائدے حاصل کریں یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ غیر ملکی سرمایے کی درآمد کا قطعاً ممنوع قرار دی جائے؛ خواہ اس کے نتیجے کے طور پر ملک کی صنعتی ترقی غیر معین مدت تک ملتوی ہی کیوں نہ ہو جائے یہ احساس اور جذبہ "کلیدی صنعتوں" یا ایسی صنعتوں کے بارے میں جو قومی تحفظ کے نقطۂ نظر سے اہم ہیں' اور ملک کے ان قدرتی ذرائع کے بارے میں جن کا افادہ ایک مرتبہ فائدہ حاصل کرنے کے بعد ختم ہو جاتا ہے' مثلاً کانیں' خاص طور پر قوی اور شدید ہے۔

474

(۲) دوسرا اعتراض یہ ہے کہ بیرونی فرم ڈائرکٹروں کی حیثیت سے اپنی ہی قوم کے افراد کے انتخاب کو ترجیح دیتے ہیں' اور اسی قسم کی جانبداری وہ اپنے اعلیٰ عملے کے ارکان کے انتخاب میں بھی برتتے ہیں؛ اس طرح ہندوستانیوں کو ذمہ دارانہ اور ذی اقتدار عہدوں پر ترقی کرنے کا کوئی معقول موقع ہی نہیں ملتا۔ یہ فرم ہندوستانیوں کو کارآموزوں کے طور پر تربیت دینا بھی ناپسند کرتے ہیں؛ اس طرح غیر ملکی سرمایے کے

---

[1] دیکھو غیر ملکی سرمایے کی کمیٹی کی رپورٹ' فقرہ (۱۷)

[2] دیکھو مالی کمیشن کی رپورٹ' فقرہ (۲۹۰)؛ اور اختلافی نوٹ فقرہ (۴۸ تا ۵۰)؛ نیز بیرونی اصل کی کمیٹی کی رپورٹ' فقرہ (۱۷)۔

متعلق جن اہم فوائد کا ادعا کیا جاتا ہے ان میں سے ایک زائل ہو جاتا ہے۔ (۳) آخر میں یہ کہ غیر ملکی سرمایہ کے خلاف یہ سیاسی اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ حقوق قائمہ و مستقلہ پیدا کرتا ہے جو عام طور پر ملک کی سیاسی و معاشی آرزوں اور حوصلہ مندیوں کے منافی ہوتے ہیں۔ غیر ملکی سرمایہ کو مرور زمانہ کے ساتھ تدریج محض اس کی خاتی مدافعت میں اور خالصتاً معاشی اسباب کی خاطر اس بات پر مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہندوستانی نقطۂ نظر کے زیادہ سے زیادہ مطابق بنائے۔ لیکن ایسی کوئی علامت ابھی تک کسی قابل لحاظ حد تک رونما نہیں ہوئی ہے۔

۷۔ غیر ملکی سرمایہ کے فوائد۔

لیکن مذکورۂ بالا نقائص کے باوجود کئی وجوہ کی بنا پر غیر ملکی سرمایہ کا چند تحفظات کے تابع خیر مقدم کرنا مناسب ہی نہیں بلکہ ضروری ہوگا۔ غیر ملکی سرمایہ کے فوائد میں سے ایک یہ ہے کہ اس کی مدد سے ملک کی صنعتی ترقی اور اس کے نتیجے کے طور پر اس کے مالدار بننے کی رفتار کو تیز کیا جا سکتا ہے۔ ملک ابتدا ہی سے فائدہ حاصل کرتا ہے، اس لئے کہ گو صنعتوں کا انحصار غیر ملکی سرمایہ پر ہوتا ہے وہ قومی دولت میں کم از کم کام کرنے والے مزدوروں کی اجرت کی شکل میں اضافے کا موجب ہوتی ہیں۔ اس بارے میں کوئی اٹل اصول نہیں ہے کہ نفع کا تناسب اجرت سے کیا ہو، لیکن اکثر صورتوں میں صنعتی کاروبار کی مجموعی خام آمدنی میں اجرت کی مد ہی بڑی مد ہوتی ہے۔ بہر کیف اگر ملک کو صنعتی حیثیت سے ترقی ہو تو اور غیر ملکی سرمایہ کی مدد سے صنعت کو ترقی دینے کے دو طریقوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہو تو ظاہر ہے کہ موخر الذکر طریقہ خالص معاشی نقطۂ نظر سے قابل ترجیح ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ ملک کو سب سے زیادہ فائدہ اس وقت ہوگا جب کہ نفع اور اجرت دونوں ملک کے اندر ہی رہیں، اور یہ بات نہایت اہمیت رکھتی ہے کہ ملکی ہم جولی جلت ممکنہ قدم آگے بڑھائے اور ملک کی صنعتی ترقی کا بیڑا اٹھائے چنانچہ اس کو ایسا کرنے کی ہمت افزائی کرنے کے لئے ہر ممکنہ سعی کرنی چاہئے۔ لیکن اس اثناء میں جس وقت تک اہل ملک اس کام کو سر انجام دینے کے لئے تیار و آمادہ نہ ہوں غیر ملکی سرمایہ داروں کو اس میں ہاتھ بٹانے کا موقع دینا چاہئے۔ اجرت خواہ اس کا تناسب مجموعی خام آمدنی سے ادنیٰ ہو یا اعلیٰ ملک کے حق میں خالص فائدہ ہوگی[1]۔

---

[1] دیکھو ہارسیں کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان میں معاشی تغیر" صفحہ ۲۲۰۔

لیکن اس سے زیادہ اہم فائدہ اس فائدے سے قطع نظر کرتے ہوئے جو کمائی ہوئی اجرت کی بنا پر قومی دولت کے فوری اضافے کی شکل میں رونما ہوتا ہے یہ ہے کہ غیر ملکی سرمایہ دار ملک میں فنی معلومات اور انتظام درآمد کرتا ہے جو صنعتی ترقی کے محرک کی حیثیت سے ضروری ہے۔ لیکن اس فائدے کو صرف اس وقت پوری طرح حاصل کیا جا سکتا ہے جبکہ بیرونی فرمیں صنعتی انتظام اور فنی مہارت کے بارے میں اہل ملک کی تربیت کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ اس سلسلے میں ہم یہ خیال ظاہر کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں کہ باوجود اس واقعے کے کہ یوروپین سرمایہ ایک مدت دراز سے ہندوستان کے صنعتی میدان میں سرگرم عمل رہا ہے اس کی موجودگی کے نتیجے کے طور پر مذکورۂ بالا نوعیت کا کوئی قابل قدر فائدہ رونما نہیں ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محض غیر ملکی سرمایے کو ملک کے اندر بے روک ٹوک داخل ہونے دینے سے لازمی طور پر یا ازخود وہ فوائد حاصل نہیں ہوتے جو اس سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ غیر ملکی کمپنیوں پر ایسے شرائط عائد کئے جائیں جن سے ملک کو صنعتی تعلیم حاصل ہو سکے۔ اس امر سے انکار کرنے کی کہ موجودہ زمانے میں ہندوستانیوں میں صنعتی قیادت و رہنمائی کے اوصاف اور صنعتی معلومات کا فقدان ہے کوئی مفید نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ لیکن وہ ان صنعتوں کو سیکھنے کے قابل ہیں جو مغرب انھیں ان اعتبارات سے سکھا سکتا ہے بشرطیکہ انھیں سیکھنے کی مناسب سہولتیں اور مواقع بہم پہنچیں۔ اور اگر وہ غیر ملکی صناعوں سے جدید ترین طریقوں اور نت نئے خیالات کے متعلق ضروری ابتدائی معلومات حاصل کرنے سے محروم رہ جائیں تو غیر ملکی سرمایے کو ملک میں صنعتیں قائم کرنے دینے کا اصلی مقصد فوت ہو جائے گا۔ گو ان تمام باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غیر ملکی مہم جوئی سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی غرض سے تدابیر اختیار کرنا ضروری ہے پھر بھی اس مہم جوئی کے افادے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی وجہ سے اکثر ممالک اس کی مخالفت کرنے کی بجائے اپنے راستے سے ہٹ کر اس کو اپنی جانب کھینچنے کے خاص تدابیر اختیار کرنا منفعت بخش پاتے ہیں۔ نیز یہی وجہ ہے کہ تامین کی حمایت بعض اوقات اس بنیاد پر کی جاتی ہے وہ (تامین) غیر ملکی سرمایے کو یہ ترغیب دیتی ہے کہ اس ملک میں مشغول ہونے کی کوشش کرے جو محصول کی سد راہ قائم کرتا ہے۔

باب ۱۱

غیر ملکی سرمایہ کا ایک اور فائدہ یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ نشو و نما کے ابتدائی مصارف برداشت کرتا ہے اور ملکی مہم جوئی اور حوصلہ مندی کا راستہ صاف کرتا اور کھولدیتا ہے۔[1] اس بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں غیر ملکی سرمایہ دار جو کثیر نفع حاصل کرتے ہیں جس کا اندازہ ۱۶ ملین پاونڈ سالانہ کیا گیا ہے[2] اس پر غور کرتے وقت ہمیں ان ابتدائی نقصانات کا بھی لحاظ کرنا چاہئے جو انھیں برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ اگر کوئی ملک صنعتی مہم جوئی اور کاروبار کے جوکھم اور خطرات برداشت کرنے میں اغیار کا ہمیشہ محتاج اور دست نگر رہتا ہے تو اس کی کمزوری کی علامت ہے۔

476

۱۸۔ غیر ملکی سرمایے پر مجوزہ بندشیں۔

غیر ملکی سرمایے کے فوائد اور نقائص پر غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ گو ہمیں اسے بہت زیادہ آزادی اور تواضع کے ساتھ درآمد کرنا چاہئے تاہم ملک کی صنعتی ترقی میں اس کو اب بھی نہایت ہی اہم حصہ لینا ہے، بشرطیکہ اس کے کاروبار مناسب نگرانی کے تحت لائے جائیں اور وہ بعض بندشوں کے تابع کیا جائے دو متضاد قسم کے ملحوظات میں مطابقت پیدا کرنے کی خاطر بندشیں سوچ کر نکالنی چاہئیں۔ ایک طرف تو غیر ملکی سرمایہ ٹھیک مطلوبہ مقداروں میں اور مطلوبہ قسم کا حاصل کرنا چاہئے۔ اگر بندشیں حد سے زیادہ سخت ہوں تو ممکن ہے کہ غیر ملکی سرمایہ دہشت زدہ ہو کر باہر چلا جائے اور ملک میں داخل نہ ہو جس سے ملک کو نقصان پہنچے۔ دوسری طرف بندشوں کا بالکل نہ ہونا یا ان کے عائد کرنے میں حد سے زیادہ نرمی و رعایت اپنے اندر یہ خطرہ رکھتی ہے کہ غیر ملکی سرمایہ ملک کو کوئی معقول فائدہ پہنچائے بغیر نفع بخش صنعت کے کل میدان پر قبضہ کرلے گا۔ لہذا حسب ذیل قسم کی بندشیں تجویز کی جاتی ہیں۔

(۱) غیر ملکی کمپنیوں کو روپیہ کے سرمایے کے ساتھ ہندوستان میں قائم اور رجسٹر کرنا چاہئے

[1] ہندوستان میں یوروپین مہم جوئی کی تاریخ ڈی ایچ بکانن کی کتاب موسومہ "ہندوستان میں اصلدارانہ کاروبار کی ترقی" باب ۷ میں مختصر طور پر بیان کی گئی ہے۔

[2] دیکھو غیر ملکی سرمایہ کی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ (۷)۔

باب ۱۳

تاکہ ہندوستانیوں کو شغل اصل کی سہولتیں حاصل ہوں اور انتظام ہندوستانی قومی اغراض کے ساتھ وابستہ رہے۔ یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ مشترک سرمایہ کی انجمنوں کی بجائے خانگی انجمنیں قائم کرکے اس بندش سے بچنے کی کوشش کی جائے؛ لیکن اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ جدید صنعتی کاروبار کے لئے جتنا کثیر سرمایہ ضروری ہوتا ہے اس کی سربراہی خانگی انجمنیں معمولاً نہیں کرسکتیں؛ اور یہ کہ اگر کسی صورت میں اس طرح بچنے کی بڑے پیمانے پر کوشش کا علم ہو تو اس کو روکنے کے لئے خاص قوانین وضع کئے جاسکتے ہیں۔

(۲) دوسرے یہ کہ ایسی کمپنیوں کے حصوں کا ایک تناسب ہندوستان کے شغل اصل کرنے والوں کے لئے محفوظ کر دینا چاہیے تاکہ انتظام میں کافی ہندوستانی نگرانی کا یقین ہو جائے۔ اس سے کم انتہائی بدلی ہوئی شکل یہ ہے کہ اس تناسب کو جملہ نئی کمپنیوں میں ایک معین مدت تک ہندوستانی شرکا کے لئے محفوظ کر دینا چاہیے۔ اس شرط کے خلاف یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ تاوقتیکہ ہندوستانیوں کے ابتداءً خرید کردہ حصص کی انتقال پذیری پر بندشیں عائد نہ کی جائیں وہ بالکل بے سود اور لاحاصل ہوگی۔ لیکن اگر آزاد انتقال پذیری میں مزاحمت پیدا کی جائے تو ہندوستانی حصہ دار گھاٹے میں رہے گا، اس لئے کہ اس کے حصص کا بازار محدود ہو جائے گا اور اس کے نتیجے کے طور پر ان حصص کی قیمت کم ہو جائے گی۔ دوسری طرف ہندوستان کے لئے حصص کے ایک مقررہ تناسب کو محفوظ کر دینے سے صنعت میں اصل کی مقدار اس حد تک محدود ہو جائے گی اور مسابقت میں کمی ہو جانے کی وجہ سے سرمایہ کی آمدنی میں اضافہ ہو جائے گا۔ لیکن اس کے معنی یہ بھی ہوں گے کہ اصل دار صارف کے نقصان سے فائدہ اٹھائے گا۔ آخر میں یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان بندشوں سے بچنے کی کوششوں کو روکنا عملاً ناممکن ہوگا۔[۱]

477

(۳) تیسری تجویز یہ پیش کی جاتی ہے کہ نظماء کا کچھ فیصد ہندوستانیوں کے لئے مخصوص کر دینا چاہیے، اور ترجیحاً ہندوستانی حصہ دار ہی اپنے نظماء کا انتخاب کریں۔ اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس بندش میں تنگ نظری اور فرقہ پرستی کی جھلک

[۱]۔ غیر ملکی سرمایہ کی کمیٹی کی رپورٹ، نقرہ ۲۱ تا ۲۳۔

باب ۱۳

دکھائی دیتی ہے؛ اس کے علاوہ وہ عمدہ کاروباری انتظام کے لئے مہلک ہے۔ لیکن اس کا جواب اس استدلال سے دیا گیا ہے کہ محض یہی خیال کہ غیر ملکی سرمایہ پر اس بنا پر بندش عائد کرنی چاہئے کہ وہ غیر ملکی ہے ایک طرح کی فرقہ واریت ہے جو دوسرے وجوہ سے بہر طور ضروری خیال کی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ انگلستان بھی اس فرقہ وارانہ ذہنیت سے آزاد نہیں رہا ہے جس کا مطلب غیر ملکی کے مقابلے میں کسی حد تک فرق و امتیاز قائم کرنا تھا۔ اس کی مثال کے طور پر پنڈت مالویہ انگلستان کے ماورائے بحر (اعتبار و بیمہ کے) ایکٹ بابت سنہ ۱۹۲۰ء کی شرط کی طرف اشارہ کرتے ہیں؛ جس کی رو سے قرضوں کی منظوری صرف ایسی فرموں تک محدود رکھی گئی جو غالب حیثیت سے انگریزی نوعیت رکھتی تھیں۔ علیٰ ہذا ہندوستان میں تجارت آزاد کے نظام کے تحت بھی حکومت خانگی کمپنیوں کے لئے مراعات منظور کرنے میں ایسی بندش کی ضرورت تسلیم کرچکی تھی۔

(۴) علاوہ ازیں یہ تجویز پیش کی جاتی ہے کہ سب کمپنیوں کے لئے خواہ وہ ہندوستانی ہوں یا غیر ہندوستانی یہ ضروری قرار دینا چاہئے کہ ہندوستانی کارآموزوں کی تربیت کے لئے سہولتیں بہم پہنچائیں اور خلاف ورزی کی صورت میں تعزیری محصول عائد کرنا چاہئے۔

یہ بات کم و بیش عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ غیر ملکی سرمایہ پر اس قسم کی کچھ بندشیں عائد کرنا اس کے نقائص کو گھٹانے اور اس کے فوائد کو بڑھانے کے لئے ضروری ہے۔ اس قسم کی بندشیں قانون تامین صنعت فولاد بابت سنہ ۱۹۲۴ء[1] کی شکل میں قانونی جواز حاصل کرچکی ہیں۔ لیکن کن کن صورتوں پر ان کا اطلاق ہونا چاہئے اس بارے میں اختلاف آرہا ہے۔ مثلاً مالی کمیشن اور غیر ملکی سرمایہ کی اکثریت کی رپورٹیں، ان بندشوں کو صرف اس وقت عائد کرنے کو ترجیح دیتی ہیں جب کہ مالی امداد کی شکل میں کوئی معین اور قطعی امداد کمپنیوں کو حکومت کی جانب سے ملے؛ ان شرائط کو تمام حالات میں بلا استثنا عائد کرنے کے بارے میں ان رپورٹوں کا عام اعتراض یہ ہے کہ وہ بہت زیادہ بوجھل ہو جائیں گی اور اس لحاظ سے ان سے بچنے کی کوشش کی جائے گی،

[1] Indian Steel Industry Protection act of 1920.

پااگر بچنے کی کوشش نہیں کی گئی تو وہ غیر ملکی سرمایے کو خائف کر کے یہاں سے قریب قریب بالکل باہر نکال دیں گی ۔ اس کے برخلاف مالی کمیشن کی اقلیت کی رپورٹ یہ استدلال کرتی ہے کہ تامین بذات خود ایک اہم مراعات ہے؛ یہ کہ مالی امداد جیسی قطعی مراعات کے ذریعے سے کاروبار کی سرپرستی کرنے اور عام تامینی طریق کا فائدہ اس کو پہنچا کر اس کی اعانت کرنے میں منطقی اعتبار سے کوئی فرق وامتیاز قائم نہیں کیا جاسکتا؛ اور رپورٹ یہ ظاہر کرتی ہے کہ مجوزۂ بالا بندشوں کا اطلاق تمام صورتوں میں کرنا چاہیے، خواہ مخصوص مراعات دی جائیں یا نہ دی جائیں ۔

مذکورۂ بالا بحث سے یہ عام نتیجہ رونما ہوتا ہے کہ اولاً ہندوستان کے موجودہ حالات میں غیر ملکی سرمایے کی ضرورت ایک حد تک اس غرض سے ہے کہ ملک کی صنعتی ترقی کی رفتار بڑھائی جائے اور مصارف کے ایثار کی مدت کم کی جائے (جو اس وقت تک بحال خود قائم رہے گی جب تک کہ تامینی محصول برقرار ہیں) اور ملک کو صنعت کا جدید ساز وسامان مہیا کیا جائے ۔ دوسرے یہ کہ غیر ملکی سرمایے کی درآمد پر اس طرح نگرانی قائم کرنی چاہیے کہ اس کی بدولت مصرحۂ بالا مقاصد بوجوہ احسن پورے ہوں ۔ رہا یہ امر کہ یہ نگرانی ٹھیک کس طریقے سے اور کن حالات میں قائم کرنی چاہیے تو یہ اصول سے زیادہ تفصیل کا معاملہ ہے ۔ مالی کمیشن کی مذکورۂ بالا اکثریت اور اقلیت کی رپورٹوں کے درمیان اختلاف آرا اس واقعے کی بنا پر رونما ہوتا ہے کہ اکثریت الحیاطئہ کی قائل نہیں ہے کہ بندشیں دانشمندانہ و موثر ہیں؛ اس کے برخلاف اقلیت بندشوں کی موافقت میں قطعی میلان ظاہر کرتی ہے ۔ لیکن غیر ملکی سرمایے کی تنظیم کے ذریعے سے قومی مقصد حاصل کرنے کی حد تک دونوں کی رایوں میں اساسی طور پر اتفاق ہے ۔

478

اس امر کا فیصلہ کہ پیش نظر مقاصد کو حاصل کرنے میں نگرانی وانتظام کے مجوزہ طریقے کس حد تک موثر ہوں گے، تجربے، آزمایش اور غلطی سے ہو سکتا ہے ۔ اگر کوئی خاص قسم کی نگرانی عملاً نقصان رساں پائی جائے تو ہر صورت حال کی مناسبت سے اس کو ہٹا لینا یا مصلح تجویز کرنا ہمیشہ ممکن ہے ۔ ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ اقلیت کی رپورٹ کے پیش کردہ طریقوں کے مطابق ابتدا میں مقابلۃً سخت بندشیں عائد کرنے کے نتیجے کے طور پر کوئی ناقابل تلافی نقصان رونما نہ ہوگا؛ اگر یہ بندشیں نامناسب پائی جائیں

باب ۱۳

تو ان میں حالات کے اقتضاء کے لحاظ سے تغیر و ترمیم کی جا سکتی ہے یا اعتدال پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ غیر ملکی سرمایہ کو جو ایسی بندشوں کے نتیجے کے طور پر جو تجربے کی رو سے حد سے زیادہ سخت ثابت ہوں خوفزدہ کر کے باہر نکال دینے کے بعد بندشوں میں حسب ضرورت و عند الضرورت نرمی و اعتدال پیدا کر کے واپس لانے کی ترغیب نہیں دی جا سکتی۔ لیکن غیر ملکی سرمایہ پر بندشیں عائد کرنے کی موافقت میں ابتدائی میلان غیر سرکاری ہندوستانی رائے عامہ کے مطابق ہوگا اور نہ صرف حکومت کی طرف سے دوستی کا اشارہ تعبیر کیا جائے گا، بلکہ اس امر کی علامت خیال کیا جائے گا کہ حکومت، ہندوستانی صنعتوں کی سرپرستی و ہمت افزائی کی پالیسی پر خلوص دل کے ساتھ کاربند ہونے کے لئے آمادہ ہے۔

غیر ملکی سرمایہ کی درآمد کی نگرانی میں بہت حزم و احتیاط سے کام کرنے کے حق میں جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ چونکہ غیر ملکی سرمایہ یورپ میں زمانہ بعد از جنگ کی تنظیم جدید و تعمیر نو کے لئے مطلوب ہے، اس لئے اب وہ ایسی آسانی کے ساتھ دستیاب نہیں ہو سکتا جیسا کہ جنگ سے پیشتر ہوتا تھا۔ موجودہ زمانے میں ہندوستان میں سرمایہ اتنی کثیر مقداروں میں بے سود پڑا ہوا ہے کہ اگر اس سے کام لینے کے مناسب ذرائع معلوم کر لیے جائیں تو ہندوستان غیر ملکی سرمایہ کے استعمال سے کلیتہً بے نیاز ہو جائے گا۔ بقول سر بیسل بلاکٹ یہ رجائی خیال بھی حق بجانب ہے کہ بہت تھوڑا عرصہ گزرے گا کہ ہندوستان نہ صرف غیر ملکی سرمایہ سے مستغنی ہو جائے گا، بلکہ اپنی اندرونی ضروریات تمام و کمال پوری کرنے کے بعد دوسرے ملکوں کو اپنی فاضل رقوم سے قرضے دے گا۔

479

۱۹۔ دستور جدید کے تحت غیر ملکی سرمایہ کی حیثیت۔

اس بارے میں کہ جس وقت دستور جدید عملی جامہ پہنے گا تو قومی مفاد کے نقطۂ نظر سے برطانوی سرمایہ کے کاروبار کی نگرانی کرنا کس حد تک ممکن ہوگا، نرمی شبہات کئے گئے ہیں۔ قانون حکومت ہند بابت ۱۹۳۵ء میں مندرجہ ذیل قرار دادیں امتیاز وغیرہ کے متعلق موجود ہیں۔

دفعہ ۱۱۱ میں یہ مذکور ہے کہ برطانوی رعیت جو سلطنت متحدہ میں سکونت پذیر ہو

باب ۱۳

کسی ایسے وفاقی یا صوبہ داری قانون کے عملدرآمد سے مستثنیٰ رہے گی جو (۱) برطانوی ہند میں داخل ہونے کے حق میں بندش عائد کرتا ہے؛ یا (۲) مقام ولادت، قوم، نسب، نسل، زبان، مذہب، سکونت، بود و باش کی جگہ یا مدت کے اعتبار سے سفر و سیاحت، سکونت، جائداد کے اکتساب، قبضہ یا فروخت، سرکاری عہدے پر تقرر یا کسی پیشے، تجارت، کاروبار یا صنعت کے چلانے کے بارے میں کوئی پابندی، ذمہ داری، بندش یا شرط عائد کرتا ہے۔

دفعہ ۱۱۲ میں اس کو ممنوع قرار دیا گیا ہے کہ برطانوی رعیت پر جو سلطنت متحدہ یا برما میں سکونت پذیر ہو یا ان مقامات میں رجسٹر شدہ کمپنیوں پر خواہ وہ قانون کی منظوری سے پیشتر رجسٹر ہوئی ہوں یا بعد، امتیازی محصول عائد کیا جائے۔

دفعہ ۱۱۳ کے تحت سلطنت متحدہ میں قانون کی منظوری سے پیشتر یا بعد قائم شدہ کمپنی اور کسی ایسی کمپنی کی مجلس انتظامی کے ارکان، اس کے حصص، اسٹاک، ڈبنچر، ڈبنچر اسٹاک یا بونڈ کے قابضوں اور کمپنی کے عہدہ داروں، ایجنٹوں اور ملازموں کے متعلق یہ سمجھا جائے گا کہ وہ وفاقی یا صوبہ داری قانون کے اس جز کی تعمیل کریں گے جو برطانوی ہند میں کاروبار کرنے والی یا کاروبار شروع کرنے والی کمپنیوں پر حسب ذیل امور کے متعلق شرائط یا پابندیاں عائد کرے:۔ (۱) کمپنی کی رجسٹری کا مقام یا اس کے رجسٹر شدہ دفتر کا محل وقوع یا زر کی شکل جس میں اس کا اصل یا قرضے کا سرمایہ ظاہر کیا جائے؛ یا (۲) کمپنی کی مجلس انتظامی کے ارکان، یا اس کے حصص اسٹاک وغیرہ کے قابضوں یا اس کے عہدہ داروں، ایجنٹوں یا ملازموں کا مقام ولادت، مذہب اور نسب اور ان کی زبان، نسل، سکونت کی جگہ یا مدت۔

مذکورۂ بالا معاملات میں سے کسی کے بارے میں شرائط کی پابندی کے تابع وہ تمام کمپنیاں محصول کی حد تک مراعات سے فائدہ اٹھائیں گی جو سلطنت متحدہ میں قائم ہوئی ہوں اور ہندوستان میں کاروبار کر رہی ہوں۔

دفعہ ۱۱۴ کے تحت برطانوی رعیت کے لئے جو سلطنت متحدہ میں سکونت پذیر ہو یہ ضروری ہوگا کہ وہ برطانوی ہند کے کسی ایسے قانون کی تعمیل کرے جو برطانوی ہند میں قائم شدہ کمپنی کی حد تک کمپنی کی مجلس انتظامی کے ارکان، یا اس کے حصص، اسٹاک،

باب ۱۳
480

ڈبنچر، ڈبنچر اسٹاک یا بونڈ کے قابضوں یا کمپنی کے عہدہ داروں، ایجنٹوں اور ملازموں کے مقام ولادت، نسل، نسب، زبان، مذہب، سکونت کے مقام یا مدت کے متعلق کسی قسم کے لوازم یا شرائط عائد کرے۔

مذکورۂ بالا کمپنیوں میں سے کسی پر وفاقی یا صوبے داری قانون کے تحت یا ذریعے سے جو محصول عائد کیا جائے اس سے کامل یا جزئی استثنا دیا اس کی بابت ترجیحی سلوک کا انحصار جس حد تک مذکورۂ بالا معاملات کے متعلق شرائط کی تعمیل پر ہو اس حد تک اور ایسی صورت میں جب کہ کمپنی کی مجلس انتظامی کے ارکان، اس کے حصص، اسٹاک، ڈبنچر، ڈبنچر اسٹاک یا بونڈ کے قابض اور اس کے عہدہ دار، ایجنٹ اور ملازم سلطنت متحدہ میں سکونت پذیر برطانوی رعیت ہوں، ایسی کمپنی پر شرائط کی تکمیل واجب ہوگی اور اس کے مطابق یہ سمجھا جائے گا کہ وہ استثناء یا ترجیحی سلوک کی مستحق ہے۔

دفعہ ۱۱۵ کے تحت سلطنت متحدہ میں رجسٹر شدہ کسی جہاز کے ساتھ قانون کی رو سے برطانوی ہند میں کسی ایسے سلوک کو روا نہیں رکھا جائے گا جو جہاز پر یا اس کے مالک، افسروں، ملاحوں، مسافروں یا سامان تجارت پر مضر اثر ڈالے اور جو برطانوی ہند میں رجسٹر شدہ جہازوں کے حق میں امتیاز سے کام لے۔

اس دفعہ کا اطلاق ہوائی جہازوں پر بھی ہوتا ہے۔

دفعہ ۱۱۶ کے تحت، ایسی کمپنیاں جو سلطنت متحدہ میں رجسٹر ہوئی ہوں اور ہندوستان میں کاروبار کر رہی ہوں ہر اس عطیے، مالی امداد و اعانت کی جو صنعت و تجارت کی ہمت افزائی کے لئے دی جائے اسی حد تک مستحق ہو سکتی ہیں جس حد تک کہ برطانوی ہند میں رجسٹر شدہ کمپنیاں۔

لیکن وفاقی یا صوبے داری مجلس قانون ساز ایکٹ منظور کر کے کسی کمپنی کے بارے میں جو اس ایکٹ کی منظوری کی تاریخ تک برطانوی ہند میں تجارت یا صنعت کے اس شعبے میں مصروف نہ ہو جس کی ہمت افزائی، مالی امداد و اعانت کی غرض و غایت ہے یہ لازم قرار دے سکتی ہے کہ کمپنی مالی امداد کی اس وقت تک مستحق نہ ہوگی جب تک کہ:-

(۱) کمپنی ہندوستان میں رجسٹر شدہ نہ ہو؛

اور (۲) کمپنی کے حصہ داروں کا اتنا تناسب جس کو ایکٹ مناسب قرار دے (جو نصف سے زاید نہ ہو) ہندوستان میں سکونت پذیر نہ ہو؛

اور (۳) کمپنی ایسی معقول سہولتیں بہم نہ پہنچائے جو ہندوستان میں سکونت پذیر برطانوی رعایا کی تربیت کے لئے تجویز کی گئی ہوں۔

اس دفعہ کے اغراض کے لئے سلطنت متحدہ میں قائم شدہ کمپنی کے متعلق اگر وہ ایسے جہازوں کی مالک ہو جو ہندوستانی بندرگاہوں سے غیر ممالک کو اور غیر ممالک سے ہندوستانی بندرگاہوں کو سامان تجارت لاتے اور لے جاتے ہیں، یہ متصور ہوگا کہ وہ ہندوستان میں کاروبار کر رہی ہے۔

دفعہ ۱۱۳ تا ۱۱۶ اس شرط کے تابع ہیں کہ سلطنت متحدہ میں قائم شدہ کوئی کمپنی یا وہاں کے سکونت پذیر اشخاص اس وقت تک کوئی سہولت حاصل نہ کرسکیں گے جب تک کہ سلطنت متحدہ کا قانون وہاں بھی ایسی کمپنیوں کو جو ہندوستان میں قائم ہوں اور سلطنت متحدہ میں کاروبار کر رہی ہوں اور اُن اشخاص کو جو وہاں سکونت پذیر ہوں جوابی سہولتیں عطا نہ کرے۔

481

دفعہ ۱۱۷ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ مذکورۂ بالا شرائط میں سے کوئی بھی موجودہ ہندوستانی قانون کے عملدرآمد کو متاثر نہ کرے گی۔

دفعہ ۱۱۸ میں مذکور ہے کہ اگر وفاق کے قائم ہونے کے بعد ملک معظم کی حکومت اور وفاقی حکومت کے درمیان کوئی معاہدہ ہو جس کی رو سے ایسے معاملات کے بارے میں جن کی حد تک سابقہ دفعات میں قرارواد موجود ہو، برطانوی ہند میں رہنے والی برطانوی رعایا اور برطانوی ہند میں قائم شدہ کمپنیوں کو سلطنت متحدہ میں، اور سلطنت متحدہ میں سکونت پذیر برطانوی رعایا و سلطنت متحدہ میں قائم شدہ کمپنیوں کو برطانوی ہند میں، مساوی سلوک کا یقین دلایا جائے تو ملک معظم کی حکومت یہ اطمینان حاصل ہونے پر کہ معاہدے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جملہ ضروری قوانین دونوں ملکوں میں نافذ ہو چکے ہیں، حکم بہ اجلاس کونسل کے ذریعے یہ اعلان کرسکتی ہے کہ ان دفعات کے اغراض اس حد تک جس حد تک کہ حکم میں صراحت کردی گئی ہو اس معاہدے اور وضع کردہ قانون کی رو سے اور کافی طور پر

پورے ہو گئے ہیں اور جب تک اس قسم کا کوئی حکم نافذ رہے ان دفعات کا عملدرآمد اس حد تک ملتوی رہے گا

مذکورۂ بالا دستوری شرائط کے علاوہ گورنر جنرل اور گورنروں کے "دستاویزات ہدایات" کی رُو سے ان اعلیٰ عہدہ داروں کو مسودہ ہائے قانون کی منظوری کے بارے میں وسیع امتیازی اختیارات حاصل ہیں جن کی بنا پر وہ اس قابل ہوتے ہیں کہ ایسے قانون کو نامنظور کریں جو اگرچہ بظاہر امتیازی نہ ہو لیکن ان کی دانست میں امتیازی نتیجہ پیدا کرتا ہو۔ اس بارے میں شبہ ہونے کی صورت میں کہ آیا کوئی خاص مسودۂ قانون امتیاز کے بارے میں قانون دستور کے مقاصد کے خلاف عمل کرتا ہے یا نہیں گورنر جنرل اور گورنروں کے لئے ضروری ہے کہ مسودۂ قانون کو ملک معظم کی منظوری کے لئے پیش کریں۔

ان شرائط کے مدنظر ظاہر ہے کہ جدید دستور کے تحت ملک کو کامل مالی آزادی اس معنی میں حاصل نہ ہوگی کہ ہندوستانی تجارت و صنعت کی ہمت افزائی کی غرض سے کروڑگیری اور مالی امداد سے پوری آزادی کے ساتھ کام لیا جا سکے گا۔ باہمدگر رعایت کا یہ اصول کہ ہندوستان میں برطانوی کاروبار پر اس وقت تک بندشیں عائد نہ کی جائیں گی جب تک کہ سلطنت متحدہ میں ہندوستانی کاروبار پر بندشیں عائد نہ کی جائیں لغو اور بےمعنی ہے اور اس لحاظ سے کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا کہ سلطنت متحدہ میں کوئی ہندوستانی کاروبار ہی نہیں ہے جو برطانوی کاروبار سے مسابقت کرے۔ اس اصول میں کوئی حقیقی معنی پیدا کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہندوستانی صنعت و تجارت کو سریع ترقی دی جائے یہاں تک کہ وہ برطانوی صنعت و تجارت سے طاقت و توانائی میں مقابلہ کر سکیں تجارتی امتیاز کے خلاف قراردادوں کا حرف بہ حرف مطالعہ کر کے قومی اغراض کے نقطۂ نظر سے اور ہندوستان میں کاروبار کرنے والے طاقتور برطانوی کارخانوں کی مسابقت سے بچاؤ کے طور پر جو کارروائی ضروری معلوم ہو اس کو اختیار کرنے میں نہایت غیر معمولی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس بات کا انحصار کہ آیا جدید دستور کے تحت صورت حال بہتر ہوگی یا بدتر اس امر پر ہوگا کہ جدید مجالس قانون ساز

493

باب ۱۳

اپنے مطمح نظر میں قدیم مجالس قانون ساز سے زیادہ ترقی پسند ہوں گی یا نہیں۔ اس کا انحصار اس امر پر بھی ہوگا کہ گورنر جنرل اور گورنروں کو جو وسیع امتیازی اختیارات دیئے گئے ہیں ان کو کس طریقے سے استعمال کیا جاتا ہے۔

۲۰۔ اصل کے ملکی ذرائع کو ترقی دینے کی ضرورت۔

یہ ظاہر ہے کہ عظیم ترین فائدہ اس وقت حاصل ہوگا جب ملک اس قابل ہو جائے گا کہ نئے اصل کے لئے اپنی ضرورتوں کو غیر ملکی ذرائع کے بجائے قریب قریب تمام تر ملکی ذرائع سے پورا کرے؛ اور جیسا کہ غیر ملکی سرمایہ کی کمیٹی خیال ظاہر کرتی ہے "غیر ملکی اصل کے مسئلے کا حقیقی حل ہندوستان ہی کے اصل کے ذرائع کی ترقی میں مضمر ہے" ہندوستان میں بے کار اصل کے جو ذخائر کثیر مقدار میں موجود ہیں ان کو کام پر لگانے کی غرض سے بنک کاری کی سہولتوں میں اضافہ و توسیع ضروری ہے[1] ہندوستانی بنک کاری کی ترقی و تنظیم کے اہم مسئلہ، اور بنک کاری کی مرکزی و صوبہ داری تحقیقاتی کمیٹیوں کی سفارشوں پر بنک کاری کے متعلق ایک جداگانہ باب میں بحث کی جائے گی[2]

غیر ملکی اصل کی بجائے دیسی اصل استعمال کرنے کے معنی یہ ہیں کہ صرف صنعتوں کی مالی امداد ہی ہندوستانیوں کو نہ کرنی چاہئے بلکہ ان کی ملکیت اور انتظام بھی ہندوستانی ہاتھوں میں ہونا چاہئے۔ چنانچہ موخر الذکر مسئلے پر اس باب کے آغاز میں بحث کی جا چکی ہے۔

تمت

---

[1] دیکھو غیر ملکی سرمایہ کی کمیٹی کی رپورٹ، سفارشوں کا خلاصہ۔
[2] دیکھو جلد دوم کتاب ہذا باب ۱۔

ضمیمہ

فہرست اصطلاحات

مع ترجمۂ انگریزی

ا

آجر	Employer
اجارہ	Monopoly
ادارۂ تحقیقات زرعی	Agricultural Research Institute
استحکام زر	Stabilization of money
اعتبار	Credit
احتکار	Corner
التوا و معافی مالگزاری	Suspension & Remission of Revenue
امتیازی تامین	Discriminate Protection
انجمن امداد باہمی	Co-operative Society
انجمن بنک کاری	Banking Union
انتظام سکونت	Housing

Preventive Checks	انسدادی مانعات
Positive Checks	ایجابی مانعات

ب

Substitution or Substitute	بدل
Market	بازار
Export Trade	برآمدی تجارت
Export Duty	برآمدی محصول
Exogamy	برون زواجیت
Bank	بنک
Banking	بنک کاری
Banking Enquiry Committee	بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی
Unemployment	بے روزگاری
Unemployment	بیکاری
Unemployment Insurance	بیمۂ امداد باہمی

پ

Absentee Landlord	پرباس زمیندار
Absentee Landlordism	پرباس زمینداری
Savings	پس انداز
Productive	پیداور
Productivity	پیداوری
Production of Wealth	پیدائش دولت

ت

تجارتی باغبانی	Market Gardening
تجارتی جہازوں کا بیڑا	Mercantile marine
تجاریت	Mercantilism
تحییز صنائع	Localisation of Industries
تدریجی محصول	Graduated Tax
تقسیم دولت	Distribution of Wealth
تقسیم عمل	Division of Labour
تصنیع۔ صنعتوں کو ترقی دینا یا ملک میں کارخانے کھولنا	Industrialisation
توازن تجارت	Balance of Trade
توازن طلب و رسد	Equilibrium of Demand & Supply
توطن	Migration
توطن داخلی	Immigration
توطن خارجی	Emigration

ث

ثبات قدر	Stability of Value

ٹ

ٹکس یا ٹیکس	Tax
ٹکس کے قوانین	Canons of Taxation

ج

جرعہ	Dose
جنسی مبادلت ۔ مبادلۂ اشیا ۔ بارٹر	Barter

چ

چور تجارت	Smuggling

ح

حقوق قائمہ	Vested Interests
حقیت اراضی	Land Tenure

خ

خرچ	Expenditure

د

درآمدی تجارت	Import Trade
درآمدی محصول	Import Duty
دوامی بندوبست	Permanent Settlement
درون زواجیت	Endogamy
دولت	Wealth

ذ

Caste System	ذات کا طریق
Sinking Fund	ذخیرۂ ادائی
Sources of Income	ذرائع آمدنی

ر

Usury	ربا (ربوٰ)
Supply	رسد
Joint Supply	رسد مشترک
Raiffeisen Society	رفیزن طرز کی انجمن
Current Account	رواں کھاتہ

ز

Overpopulation	زائد آبادی
Money	زر
Circulating Medium	زر رواں
Agricultural marketing	زرعی پیداوار کی فروخت
Agricultural Labour	زرعی محنت یا مزدور
Agricultural Commission	زرعی کمیشن
Fertility	زرخیزی
Land	زمین
Land Mortgage Bank	زمین گروی بنک

Zamindari Rent	زمینداری لگان

س

Credit	ساکھ
Public Debt	سرکاری قرضہ یا قرضہ عامہ
Coin	سکہ
Gross Interest	سود خام
Net Interest	سود خالص

ش

Imperial Preference	شاہی ترجیح
Rate of Interest	شرح سود
Birth Rate	شرح ولادت
Investment of Capital	شغل اصل
Schulze-Delitch Society	شولز ڈیلش طرز کی انجمن
Dairy Farm	شیر خانہ (دودھ گھر)
Dairy Farming	شیر سازی - (دودھ بیوپار)

ص

Consumer	صارف (خریدار)
Consumption of Wealth	صرف دولت
Co-Operative Apex Bank	صدر بنک امداد باہمی

صنعتیت	Industrialism
صنعتی اجارہ	Industrial Monopoly

ط

طلب	Demand
طلب مشترک	Joint Demand

ع

عاملین پیدائش	Factors of Production
عندالطلب ہنڈی	Demand Bill

غ

غیر تغیر پذیر طلب	Inelastic Demand
غیر قرضی انجمن	Non-Credit Society
غیر ملکی سرمایہ	External Capital

ق

قانون استقرار حاصل	Law of Constant Return
قانون بدل	Law of Substitution

قانون تقلیل افادہ	Law of Diminishing Utility
قانون تقلیل حاصل	Law of Diminishing Returns
قانون تکثیر حاصل	Law of Increasing Returns
قانون طلب	Law of Demand
قانون گریشم	Gresham's Law
قانون خلف اکبر	Law of Primogeniture
قدر	Value
قرضی انجمن	Credit Society
قرضداری۔ مقروضیت	Indebtedness
قوت خرید	Purchasing Power
قیمت	Price
قیمت متوازنہ	Equilibrium Price

(ک)

کتابچہ حقوق (کھیوٹ)	Record of Rights
کارہائے اصل	Capital Works
کارکردگی	Efficiency
کروڑگیری	Tariff (Customs)
کاشت خشکی	Dry Farming
کاشت عمیق	Intensive Cultivation
کاشت وسیع	Extensive Cultivation
کچی جستی دھات	Zinc Ores
کاروباری اصل یا سرمایہ	Working Capital
کاغذات اراضی	Cadastral Records

ل

Rent	لگان

م

Revenue	مالگزاری
Bounty	مالی امداد
Central Co-Operative Bank	مرکزی بنک امداد باہمی
Debt Conciliation Board	مجلس مصالحت قرضہ
Coal-Grading Board	مجلس درجہ بندی زغال
Munitions Board	مجلس اسلحہ
Fiscal	مالی
Financial	مالیاتی
Income tax	محصول آمدنی
Overpopulation	مفرط آبادی
Labour	محنت مزدور
Revenue Farming	مستاجری مالگزاری
Joint Family System	مشترک خاندان کا طریق
Risk Charges	مطالبات خطر
Depreciation Charges	مطالبات فرسودگی
Economic Rent	معاشی لگان
Competition	مسابقت ۔ مقابلہ
Profits	منافعہ

موازنہ، میزانیہ (بجٹ)	Budget

ن

نظریۂ قیمت	Price Theory
نقد پذیر کاغذی زر	Convertible Paper money
نقدی اعتبار	Cash Credit
نقل پذیری	Mobility
نہری نوآبادیات	Canal Colonies

و

ولفرم	Wolfram

ھ

ہنڈی	Bill of Exchange
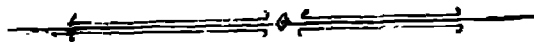
صحت نامہ

معاشیات ہند (جلد اول)

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۱	۲	۳	۴
۱۲	۳	انخبنیوں	انجینیوں	۱۶۳	حاشیہ سطر ۳	ص ۱۵۸ تا ص ۱۶۴	ص ۱۵۸ آتا ص ۱۶۴
۳۳	کالم (۵) نیچے سے	۱۹۳۰-۴۰ و ۹۵۹	۱۹۶۴-۴۰ و ۹۵۹	۱۶۵	۱۵	نیست	نیست ونابود
۳۷	۱	دورمں	دوریں	۱۷۰	۷	سنین	سنیں
۳۸	حاشیہ (سطر ۱)	ہند وستانی	ہندوستانی	"	۲۵	اکٹھا	اکھٹا
۴۱	" (سطر ۱)	۱۹۳۰ء	۱۹۳۳ء	۱۷۲	۶	اج کل	آج کل
۴۵	۲۱	چھپے	چشمے	۱۷۳	حاشیہ سطر ۲	منتظم	منظم
۵۴	۴	لیبشن	کمیشن	۱۷۴	حاشیہ سطر ۲	لہ	سکہ
"	۹	بمبتی	بمبئی	۱۷۵	۲۴	پشت وپناہ	پشت پناہ
۵۷	۳	۵٫۱ لاکھ	۱٫۵ لاکھ	۱۷۶	حاشیہ سطر ۲	بنرجی	بنرجی
ضمیمہ ۵ الف	تحت جدول	اصی	خاصی	۱۸۴	۷	دراصل کو	دراصل اس کو
	حاشیہ سطر ۳			۱۹۳	۹	درہم وبرہم	درہم برہم
۶۴	حاشیہ سطر ۱	ویلی	ذیلی	۱۹۴	۱۹	ہوتا	ہونا
۱۳۶	۲۴	نقسم	تقسیم	۱۹۵	۲۵	پیشتر حصہ	بیشتر حصہ
۱۴۳	۲	نیست	نیست ونابود	۱۹۸	۱۰	رعیتہ واری	رعیت واری
"	محاذی سطر ۶	108	108	۱۹۹	۶	طرع	طرح
"	۱۸	نیست	نیست ونابود	"	۲۲	کھارے	کمھارے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۱	۲	۳	۴
۲۰۱	۹	ابتدالی	ابتدائی	۲۴۰	حاشیہ سطر۱	دیکھو صفحہ مطبوعہ	دیکھو صفحہ ۶۸
۲۰۲	حاشیہ سطر۲	جانب ے	جانب سے			اوراق کے صفحہ کا	
۲۰۸	۴	ذہین	ذہن			حوالہ دیا جائے	
〃	۲۳	پینٹمن	پٹن	۲۴۲	۲۵	پٹنا	پٹنہ
۲۰۹	۸	نجارجی	خارجی تجارت	۲۴۶	۱۴	کیلئے میصر	کے لیے مصر
۲۱۰	۲ و ۳	کرہ وہ	کروہ	۲۷۲	حاشیہ سطر۳	Suger	Sugar
۲۱۲	۱۱	تنجور	ٹنجور	۲۷۹	۶	کھجور اور سرسوں کے	کھوپرے اور سرسوں
۲۱۴	۲۲ سطر عنوان	یالسی	پالسی			تیل کا	کے تیل کا
۲۱۷	۱۱ سطر عنوان	(۴) کل کی تی ہوئی	(۵) کل کی بنی ہوئی	۲۹۱	۲	امیون	افیون
		معنوعات کی سابقت	مصنوعات کی مسابقت	۲۹۵	جدول ۲	سنہ ۱۹۳۲	سنہ ۱۹۳۴
۲۱۸	سطر ۱ عنوان	(۵) حکومت ہند کی	(۶) حکومت ہند کی		کالم آخری	تا	تا
		عدم مداخلت کی پاسی	عدم مداخلت کی پالیسی		سطر ۳	سنہ ۱۹۳۵	سنہ ۱۹۳۵
۲۲۱	۱	مردشماری	مردم شماری	۲۹۶	سلسلہ جدول ۲	سنہ ۱۹۳۴	سنہ ۱۹۳۴ تا
۲۲۵	۱۴	پیدا ور	پیداآور		کالم آخری	سنہ ۱۹۲۵	سنہ ۱۹۳۵
۲۲۶	۲۰	بیان کرمناسب	بیان کرنا مناسب		سطر ۳		
۲۲۷	۳	بہت خاصہ	بہت خاصا	۲۹۷	محاذی سطر	105	109
〃	۲۳	خطہاے زمین	خطہائے زمین	〃	۱/۹	ٹیوپ	ٹیوب
۲۳۲	حاشیہ سطر۱	صفو ۱۹۸	صفحہ ۱۹۸	۳۰۰	۲۵	Eceenomic	Economic
۲۳۳	۴	امن وآمان	امن وامان	۳۰۵	۱۲	رونما ہوبایا	رونما ہوا
۲۳۶	۳	انزاے	ازالے	۳۰۶	عنوان سطر ۲	اشیائے خام کی	۱۰. اشیائے خام کی
〃	۱۱ و ۱۲	صنعتوں میں میں	صنعتوں میں			برآمد پر بندشیں	برآمد پر بندشیں
۲۳۸	۱۶	رد پے	روپے	۳۱۴	۴	موجود رسد	موجودہ رسد

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
١	٢	٣	٤
٣٢٦	سطر ۲ جدول کالم ٣	بہار راوڑیسہ	بہار واڑیسہ
٣٣٠	١٦	بینہ	مُبیّنہ
٣٣٤	١٣	دبن کے	دکن کے
٣٦٣	پیشانی کتاب	معاشیات ہند جلد دوم	معاشیات ہند جلد اول
٣٦٩	١٣	اختتاح	افتتاح
٣٨٠	١٠	کا ی	کافی
٣٨٢	٦	اہل وہ	اہل دِہ
٣٨٣	١٤	مبکنا	میکینا
٤٠٤	١٩	ذخیرد	ذخیرہ
٤١٥	٢٠ و ٢١	گرنی کے لے	گرنی کے
٤٣٩	حاشیہ سطر ٢	رعی قرضداری	زرعی قرضداری
٤٤١	٢	ابسی	ایسی
٤٥٠	١	غلطہ	غلط
٤٥٣	٥	وہ یہ ہے	وہ یہ ہے
٤٦٢	٦	زیادہ نزر گھٹایا	زیادہ گھٹایا
		ٹب پوچھیے	ٹ پوچھیے
"	١٠	صوبہ واری	صوبہ واری
٤٦٦	٢٠	پرونگنڈا	پروپگنڈا
٤٦٨	١٥	بذ لعہ	بذریعہ
٤٧٠	١٨	تیار تھا،	تیار تھا،

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
١	٢	٣	٤
٤٧٢	٩	پونجی	پونجی
٤٧٤	٢٠	طریں کارکو	طریق کارکو
٤٨٨	پیشانی کتاب	امداد داہمی	امداد باہمی
٤٩٨	حاشیہ سطر ٥	نیار	تیار
٥٤٨	٨	ونقوں	وقفوں
٥٥١	١١	بیجا	بیجا
٥٧١	١	بمبئی وکی	بمبئی کی
٥٩١	١٦	ستاق نظریں	مشتاق نظریں
"	١٧	مماتل	مماثل
٥٩٤	١٣	دبہات	دیہات
٥٩٧	١٥	نکلنے	نکلنے
٦٠٥	٢	پیداوا	پیداوار
٦٠٨	١١	١٧١٢ء تا ١٧١٩ء	١٧١٣ء تا ١٧١٩ء
٦٢٨	٧	جاندادون	جائدادوں
٦٣٢	٩	مساب	مساحت
٦٣٧	٤	اسرلیفورڈ	اسٹریفورڈ
٦٤٩	١٩	ے رعنہدار	کے زمیندار
"	٢٣	اکم ازکم	یا کم ازکم
٦٥٣	حاشیہ ٣	محول	محصول
٦٥٤	١٩	نظرئیے	نظریے
٦٥٥	٥	نظرئے	نظریے
٦٧٦	٢	اس لئے کہ	×

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
١	٢	٣	٤	١	٢	٣	٤
٦٧٧	١٩	عمدً	عمداً	٧٠٨	١٩	صنتی	صنعتی
″	″	میاری	معیاری	٧١٣	٣	پیدا وار	پیداوار
٦٧٩	١٢	سئے اور	سے اور	″	″	مزدہ روں	مزدوروں
٦٨٣	١٧	روپیہ	روپے	٧١٥	٩	کرور	کروڑ
٦٨٥	حاشیہ ١٥	سالنہ	سالانہ	٧٢٦	١	وین	سوطین
″	″ ١٦	امدیون	آمدنیوں	٧٣١	١	اہم فاد	اہم فائدہ
٦٨٧	١٨	حاملانہ	عاملانہ	٧٤٠	٩	حمل	عمل